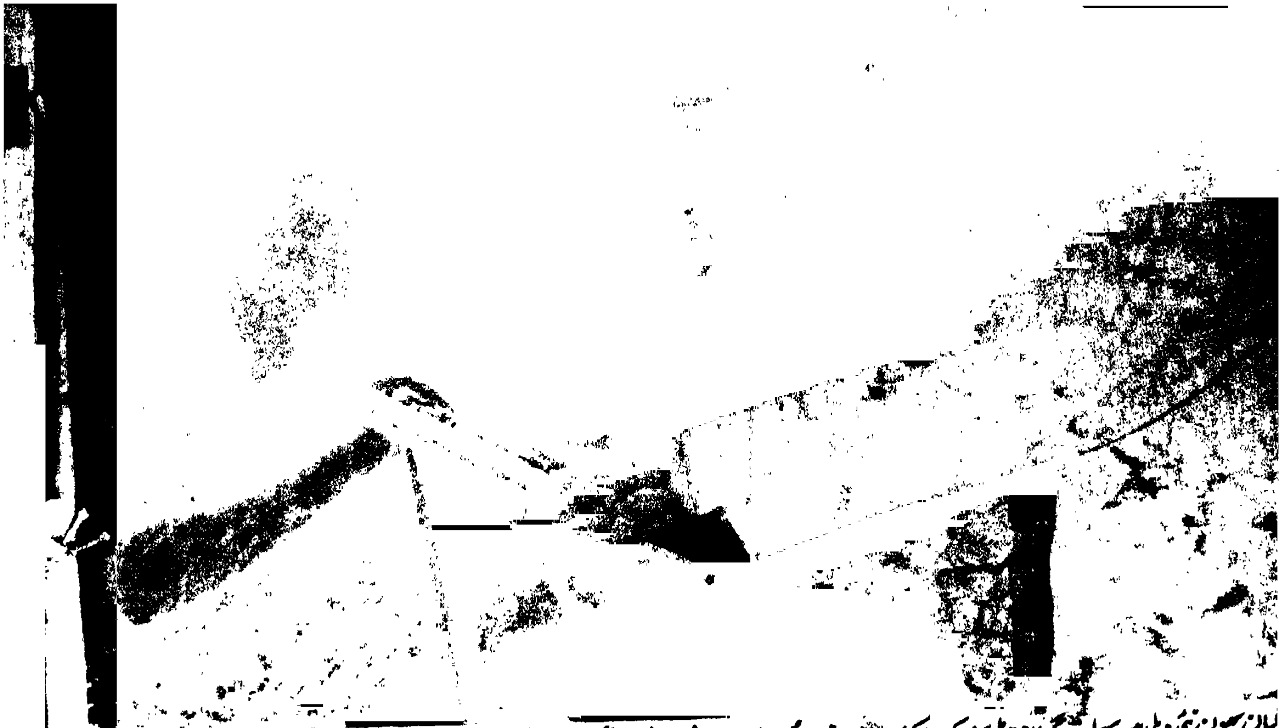




گیان بھون نئی دہلی میں بھارتیہ گیان پیٹھ کا ایک لاکھ کا ادبی انعام اُردو کے ممتاز شاعر جناب رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کو اُن کے شعری مجموعے "گلِ نغمہ" پر دیا گیا۔
م شریمتی اندرا گاندھی نے اُن کی شاعری کے منتخب ہندی مجموعے "بزمِ زندگی۔ رنگِ شاعری" کا اجرا کیا۔ اس موقع پر ان کی شاعری پر مبنی رقص و موسیقی کا پروگرام بھی پیش کیا گیا

۲۸ نومبر ۱۹۷۰ء کو وزیر اعظم ہند شریمتی اندرا گاندھی نے نئی دہلی میں کچھ مسلم ممبران پارلیامنٹ، سفرا اور ممتاز شہریوں کے ساتھ افطار میں شرکت کی۔



اردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

# آجکل

نئی دہلی



ایڈیٹر

ضیاء الحسن

سب ایڈیٹر

نند کشور وکرم

جلد ۲۹ شمارہ ۶

جنوری ۱۹۷۱ء

پوس ماگھ شک سمت ۱۸۹۲

قیمت فی پرچہ

سالانہ چندہ

ایک سال : ۷ روپے

۲ سال : ۱۲ روپے

۳ سال : ۱۷ روپے



ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

یوم جمہوریہ کی تقریب ہر سال ہمیں یاد دلاتی ہے کہ ملک کی تعمیر و ترقی کے لئے جہاں نئے نئے کارخانوں، زیادہ پیداوار، بہتر صحت اور تعلیم کے لئے کوشش کرنی ہے وہاں دوسری طرف ہمیں اپنے اخلاق و کردار کا جائزہ بھی لینا ہے۔ اپنی روزمرہ کی زندگی میں ہمیں اس بات سے زیادہ تکلیف نہیں ہوتی کہ ہمارے پاس آرام و آسائش کی چیزیں نہیں ہیں بلکہ اس سے زیادہ ہوتی ہے کہ سماج میں اکثر ایسے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے یا دفتروں، اسپتالوں یا تعلیم گاہوں میں ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں جو بڑی شدت سے ہمیں یہ احساس دلاتے ہیں کہ ہماری اخلاقی حالت بڑی پست ہو گئی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ غریبی اور بیکاری بہت سی خرابیوں اور برائیوں کی جڑ ہے لیکن یہ بھی درست ہے کہ خوش حال ممالک یا افراد بھی خرابیوں اور برائیوں سے پاک نہیں۔ مادی ترقی ہمیں آگے تو بڑھاتی ہے اوپر نہیں اٹھاتی۔

ہمارے مشہور سائنس داں ڈاکٹر ہومی بھابھا سے "ٹائم" میگزین کے ایک نامہ نگار نے سوال کیا تھا کہ ہندوستان میں جو سائنس اور ٹکنالوجی کے لحاظ سے ایک پچھڑا ہوا ملک ہے کس طرح آپ اور آپ جیسے دوسرے سائنس داں پیدا ہو سکے تو انہوں نے بڑا مسکت جواب دیا تھا: یہ صحیح ہے کہ ہندوستان نے موٹر کار یا ریفریجریٹر ایجاد نہیں کیا ہے اور نہ ہی یہ چیزیں دوسرے صنعتی ملکوں کی طرح ہندوستان میں وسیع پیمانے پر تیار کی جاتی ہیں لیکن سینکڑوں برسوں سے سال کے ان مہینوں میں جب اسے کام نہیں ہوتا تو ہندوستان کا کسان ایک درخت کے سائے میں بیٹھا سوچتا اور غور و فکر کرتا رہتا ہے۔ اسی فرصت اور فراغت نے ان دستکاریوں کو جنم دیا جن کی صناعی اور کاریگری نے دنیا سے اپنا لوہا منوایا۔ اسی غور و فکر نے ان فلسفیوں اور فلسفوں کو جنم دیا جنہوں نے انسان کو محبت، بھائی چارے اور رواداری کا پیغام دیا۔ حیات اور کائنات کے اسرار سے پردہ ہٹایا اور انسان کو انسان کی حیثیت سے جینا سکھایا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ان اخلاقی قدروں کو اپنی زندگی اور مزاج کا ایک حصہ بنا لیں اور ان روایات کے امین بن جائیں جو ہزاروں برسوں کے تجربے اور تفکر کے بعد ہم تک پہونچی ہیں۔ تب ہی ہم صحیح معنوں میں ایک پُرمسرت زندگی گزار سکیں گے۔

---

۲۱ نومبر ۱۹۷۰ء کو ممتاز ہندوستانی سائنسداں ڈاکٹر سی۔ وی۔ رامن کا ۸۲ برس کی عمر میں انتقال ہو گیا۔

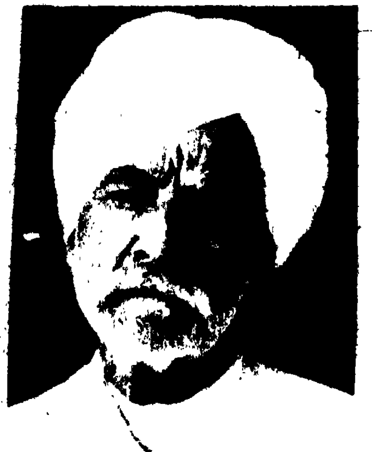
ڈاکٹر چندر شیکھر وینکٹا رامن ۷ نومبر ۱۸۸۸ء کو تامل ناڈو میں تروچراپلی کے مقام پر پیدا ہوئے۔ اپنی طالب علمی کے زمانے سے ہی وہ سائنسی تحقیق میں دلچسپی لینے لگے تھے اور سرکاری ملازمت (۱۹۰۷ء - ۱۷) کے زمانے میں بھی یہ شوق جاری رہا۔ ۱۹۱۷ء میں وہ فزکس کے پروفیسر ہوئے۔ ۱۹۲۱ء میں انہوں نے پہلا غیر ملکی دورہ کیا۔

۱۹۳۰ء میں روشنی کے انتشار سے متعلق اُن کی مشہور تحقیق پر فزکس کا نوبل پرائز عطا کیا گیا۔ وہ واحد ہندوستانی تھے جنہیں سائنس میں یہ انعام دیا گیا تھا۔

۱۹۳۴ء میں انہوں نے اپنی اکادمی قائم کی جس نے سائنس کی ترقی میں غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں۔ عالمی شہرت کے ہندوستانی سائنسداں ڈاکٹر بھابھا اور وکرم سارابھائی بھی اسی ادارے کے تربیت یافتہ تھے۔

# غبار کارواں

جوش ملسیانی



عالمِ وجود میں آنے کی تاریخ یکم فروری ۱۸۸۴ء ہے۔ مقامِ ولادت ملسیاں تحصیل نکودر ضلع جالندھر ہے۔ ملسیاں بہت بڑا گاؤں ہے۔ آبادی چار ہزار کے قریب تھی مگر ننانوے فیصد ناخواندہ۔ دستخط بھی نہ کر سکتے تھے۔ میرے والدین اور رشتہ دار بھی بالکل اَن پڑھ تھے کچے مکانات ہی میں آبادی کی بود و باش تھی بمشکل سے دس بارہ مکان پختہ ہوں گے۔ گلی کوچے گندے نالیاں متعفن صفائی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ تجارتی لحاظ سے بھی اس کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ میں جس گھر میں پیدا ہوا اُس پر مفلسی اور عسیر الحالی کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ آمدنی کے ذرائع مفقود تھے۔ والد پشادرر ہتے تھے۔ بادہ نوشی کی عادت نے بیکار رکھا تھا کہ ؎

پاک خور امروز و زنہار از پئے فردا منہ

کبھی طبیعت موج پر آئی تو کچھ بھیج دیا ورنہ کئی کئی مہینے بالکل خاموش رہتے تھے۔ شاید یہ سمجھتے تھے کہ برہمنوں کا گھر ہے دان کی چیزیں آتی رہتی ہیں یہ گزارہ ہو ہی جاتا ہوگا مگر یہ خیال باطل تھا۔ والدہ کو بھی ایک دو گھریلو دستکاریوں کی مشقت برداشت کرنی پڑتی تھی۔ کبھی چچا بھی جو نزدیک کے گاؤں میں دکان داری کرتے تھے، کچھ امداد کرتے تھے۔ مگر وہ برائے نام تھی۔ البتہ ارزانی کافی تھی۔ ڈیڑھ آنے میں تین چار افراد کا کنبہ دونوں وقت پیٹ بھر سکتا تھا۔ جبری کفایت شعاری سب کے لیے ضروری ہوتی تھی۔ بُرا بھلا کھانا جو میسر آتا تھا کبھی کھا لیا جاتا تھا کبھی زہر مار کر لیا جاتا تھا۔ مکان بھی بہت چھوٹا تھا اور وہ بھی کچا۔ رقبہ ڈیڑھ مرلے سے زیادہ نہ تھا صرف ایک کوٹھا جس کو کمرا کہنا لفظ کمرا کی تحقیر ہے۔ آگے چھوٹا سا صحن جس کا نصف حصہ سطر فہ دیواروں پر چھت ڈال کر کچن کے لیے روک لیا گیا تھا۔ باقی کو صحن کہا جا سکتا ہے۔ یہ بھی طول و عرض میں چھ سات فٹ سے زیادہ نہ تھا۔

کھلے مکانوں میں رہنے کا موقع ملا تو بارہا یہ سوچا کہ میرے بزرگ اتنے تنگ مکان میں کس طرح گزارا کرتے رہے۔ بیاہ شادی کے موقع پر رشتہ دار مہمانوں کو کہاں بٹھاتے ہوں گے۔ مرگ کے موقع پر صفِ ماتم کہاں بچھتی ہوگی۔ مسلسل بارشوں میں کہاں اُٹھتے بیٹھتے ہوں گے۔ اسی ڈربے میں میری پرورش بھی ہوئی۔ گاؤں بہت بڑا ہونے کے باوجود اسکول وہاں صرف پرائمری تک تھا۔ پانچ سال وہیں تعلیم پائی۔ فیس چار پانچ آنے سے زیادہ نہ تھی۔ وہ برداشت ہوتی رہی۔ مڈل اسکول چار میل کے فاصلے پر تھا۔ وہاں داخل ہوا۔ ہوسٹل میں رہنے کی استطاعت نہ تھی پیدل جاتا اور پیدل آتا تھا۔ سڑک کچی اور بعض جگہ ریتلی تھی۔ جوتا کبھی نصیب ہو جاتا تھا کبھی ننگے پاؤں ہی چلنے پھرنے پر مجبور ہونا پڑتا تھا۔ ایک دو مہربانوں نے گھر کی غریبی پر ہیڈ ماسٹر کو متوجہ کیا، فیس معاف ہو گئی۔ یہ معافی تین سال جاری رہی۔ پڑھنے کے لیے مستعمل کتب نصف قیمت پر خرید لی جاتی تھیں مگر یہ کفایت بھی گھر کے ضروری اخراجات پر بار تھی۔ میرا لباس بھی بہت مختصر ہوتا تھا کھادی کے ایک کرتے، کھادی کے ایک پاجامے اور کھادی کی ایک چادر میں موسم سرما بسر کرتا رہا۔ اگرچہ یہ ماحول تاریک ترین تھا مگر اس کا روشن پہلو اب میرے سامنے ہے۔ اسی ماحول نے صبر سکھایا، قناعت سکھائی، سادہ زندگی اور کفایت شعاری کی عادت کو طبیعتِ ثانیہ بنایا۔ گویا مفلسی اور ادبار کی زحمتیں عادت بن کر میرے لیے رحمت ثابت ہوئیں۔ خاص کر کفایت شعاری اور سادہ زندگی، آگے چل کر بہت مفید ثابت ہوئی: بچوں کی شادیوں اور مکان

ذخیرہ کی تعمیر میں کبھی مقروض ہونے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

چودہ سال کی عمر میں والد بھی وفات پا گئے۔ اب مصیبت شدید قسم کی ہو گئی۔ مستقبل کی فکر کلیجا توڑ رہی تھی۔ سبیلِ معاش کا غم کھائے جاتا تھا۔ بیس سال کی عمر تک یہی آشوبِ غم شاملِ حال رہا۔ اس آشفتہ حالی میں شاعری کا جوہر اگر اکتسابی ہوتا تو ضرور دب کر رہ جاتا۔ مگر وہ وہبی اور خداداد تھا اور پکار پکار کر کہہ رہا تھا ؎

وہ داغ ہوں جو کبھی شست و شو سے جا نہ سکے
وہ نقش ہوں کہ زمانہ جسے مٹا نہ سکے

یہ وہ پھول تھا۔ جو گرم ترین ہواؤں میں افسردہ تو بارہا ہوا مگر پژمردہ نہیں ہوا۔ یہ وہ چراغ تھا جسے آندھیوں کے رستے میں رکھ دیا گیا تھا۔ اس کا شعلہ تھرتھرایا تو سہی مگر بجھا نہیں۔

ان صبر شکن اور روح فرسا حالات کو ہر شخص شاعرانہ ذوق و شوق کا جانی دشمن سمجھے گا مگر ان مصائب و آلام کو بھی میں منجملہ محرکاتِ شاعری سمجھتا ہوں۔ انہیں کے احساس نے بیسیوں اشعار ایسے کہلوائے جنہیں براہِ راست میرے ذاتی تاثرات کہا جا سکتا ہے۔ مفلس کی عید کے عنوان سے جو نظم کہی، وہ اسی زمانے کی تخلیق ہے۔ مضمون ایک مفلس ہی کی زبان سے بیان کیا ہے۔ اس کے دو تین شعر ملاحظہ ہوں ؎

جو مجھے دینا تھا وہ دفتر میں پہلے لکھ لیا
اے مرے رزاق جنت میں کروں تو کیا کروں
اک یہی جانِ حزیں صبر آزما، درد آفریں
سوچتا ہوں شکرِ نعمت میں کروں تو کیا کروں
یہ وہ ہے دریائے غم جس کا کنارا ہی نہیں
ناخدا سے عرضِ حاجت میں کروں تو کیا کروں

ایک اور نظم غریبوں کی دُنیا کے عنوان سے ہے، وہ بھی اسی زمانے کی دین ہے۔ اس کے دو بند عرض کرتا ہوں ؎

خطا جو کسی کی خطاوار یہ ہیں
قصور اور کا ہو گنہ گار یہ ہیں
شفا جن سے بھاگے وہ بیمار یہ ہیں
نہیں جن کا چارہ وہ ناچار یہ ہیں
غریبوں کی دُنیا میں راحت نہ ڈھونڈو
غریبوں کی دُنیا میں راحت نہیں ہے

غریبوں کی حالت سنبھلتے نہ دیکھی
قضا ان کی بالیں سے ٹلتے نہ دیکھی
کبھی پھانس غم کی نکلتے نہ دیکھی
کبھی نبضِ صحت سے چلتے نہ دیکھی
غریبوں کی دُنیا میں راحت نہ ڈھونڈو
غریبوں کی دُنیا میں راحت نہیں ہے

بعض رباعیات میں بھی یہی رونا رویا ہے۔ ان کا ایک ایک شعر یہاں لکھ دینا کافی ہے۔

۱۔ زر دار کے عیب میں بھی ہے حسنِ قبول
بے زر کا ہنر بھی عیب ہو جاتا ہے
۲۔ زر دار کے گھر میں رنج و غم بٹتے ہیں
نادار کی دُنیا میں خوشی روتی ہے
۳۔ طالع کا عروج خوش نصیبوں کے لئے
ہر وقت کی افتاد غریبوں کے لئے

امیروں کی دنیا بھی لکھی۔ صرف عنوان مختلف ہے مگر ہے یہ بھی افلاس زدہ زندگی اور مفلوک الحالی ہی کی آواز۔ افسوس کہ یہ نظم گم ہو گئی۔ بہت سی تلاش کے باوجود دستیاب نہیں ہوئی۔ قوتِ حافظہ نے بھی وفا نہیں کی۔ صرف پہلا بند یاد رہ گیا ہے، وہ لکھے دیتا ہوں ؎

اٹھے ہیں تو ابرِ بلا بن گئے ہیں
چلے ہیں تو بادِ فنا بن گئے ہیں
نہ پوچھو کہ نخوت میں کیا بن گئے ہیں
یہ دنیا کے بندے خدا بن گئے ہیں
امیروں کے دل پر بھروسہ کریں کیا
امیروں کے پہلو میں دل ہی نہیں ہے

اس عسیر الحالی میں بارہا ایسا ہوا کہ گراں خاطری گراں جانی بن گئی اور امیر مینائی کا یہ شعر بارہا زبان پر آیا ؎

غم اٹھانے کو بہت تھے ترے بندے یارب
کیا کمی تھی اگر اک مجھ کو نہ پیدا کرتا

ایک اور شعر بھی اسی حلقے کی ایک کڑی ہے۔ یہ ایک مدت تک فراموشی کی آغوش میں سویا رہا۔ بیاض میں بھی نہیں تھا مگر قصبے کی ایک صحبت میں جب دو تین عزیزوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کا سامان کہاں ہے۔ ہم آپ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں تو ناگہانی طور پر یاد آگیا اور انہیں سنا دیا۔ شعر یہ ہے ؎

بے سرو ساماں ہوں لیکن بے سروساماں نہیں
ساتھ لے کر اپنی بے سامانیاں آیا ہوں میں

جس حال کی اس مسلسل فلاکت اور پامالی نے بچپن کے کھیل تماشے خواب و خیال رہنے دیے، عنفوانِ شباب میں بھی رنگینیٔ صحبت کبھی نصیب نہ ہوئی بادِ بہاری کے ہر جھونکے سے یہی کہتا رہا ؎

تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

خواجہ حافظ کا یہ مشہور مصرع: ہنگامِ تنگ دستی در عیش کوش و مستی کبھی میری سمجھ میں نہیں آیا۔ خدا جانے اس کا مفہوم ان کے ذہن میں کیا تھا۔ تجربہ کر رہا تھا کہ یہ مضمون حقیقت کے خلاف ہے، کہاں تنگ دستی اور کہاں عیش۔ یہ تو کنگالی میں پھاگ کھیلنے والی بات ہے۔ یہ قول سراسر ناقابلِ تسلیم ہے۔

اب اس مفلوک الحالی کا بیان چھوڑ کر اپنی دوسری مشکلات کی داستان گزارش کرتا ہوں۔ اسے سن کر بھی اہلِ ادب بہت حیرت زدہ ہوں گے اور کہیں گے کہ اس قسم کے دیہاتی ماحول میں ایک آدمی شاعر، ادیب اور نقاد کس طرح بن سکتا ہے۔ خاص کر ایسی تنگ دستی اور زبوں حالی میں، جو نہ کوئی ادبی کتاب خرید سکتا ہے، نہ کوئی ادبی رسالہ منگوا سکتا ہے، جس کو صاحبِ ذوق کی صحبت بھی نصیب نہ ہوتی ہو، جسے کوئی ایسی چیز کبھی کہیں سے مستعار نہ مل سکتی ہو جسے چوبیس گھنٹوں میں دو تین منٹ کے لئے بھی اردو میں بات کرنے یا سننے کا موقع نہ ملتا ہو۔ پنڈت ہری چند اختر نے میری ادبی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انہوں نے ایسے پس ماندہ علاقے میں زندگی بسر کی ہے کہ جس کی زمین کو کھودا جائے تو کسی ادیب یا شاعر کی ہڈی تک برآمد نہ ہو سکے۔ صرف ایک فی صدی آبادی اردو میں شُدبُد رکھتی تھی۔ اس میں بھی کوئی تیسری جماعت تک پڑھا ہوا تھا کوئی چوتھی پانچویں تک۔ اس شُدبُد کا استعمال بھی ہیر رانجھا، سوہنی مہینوال اور پورن بھگت کے قصے پڑھنے تک محدود تھا۔ پانچویں پاس آدمیوں کی تعداد دس بارہ سے زیادہ نہ تھی۔ چند آدمی کچھ پڑھے ہوئے تھے لیکن ان کا کوئی نام بھی نہ جانتا تھا۔ صرف دو آدمی ایسے تھے جن کی فارسی دانی گلستاں کے آسان آسان حصوں تک محدود تھی۔ میں صرف انہیں کا ہم صحبت تھا۔ ان میں ایک تو دیا کشن بحر اچھپری الفت تخلص تھے۔ میرا کافی احترام کرتے تھے مگر میرے کسی شعر کو مشق کر دہراتے تھے تو اسے ناموزوں کر دیتے تھے۔ تلفظ بھی صحیح نہ ہوتا تھا۔ غلط کا لام ساکن کر دیتے تھے۔ ذبح اور نزع کو بکسرۂ اول پڑھتے تھے جم کو بضمۂ اول بولتے تھے۔ انجام کا الف بکسرۂ اول کہا کرتے تھے۔ میں انہیں ٹوکتا تو غیاث اللغات لے بیٹھتے تھے۔ وہاں وہی کچھ لکھا ہوا پاتے تھے، جو میں انہیں بتاتا تھا۔ اس شکست پر کہہ دیتے تھے کہ چھاپے نے تو لفظ لفظ پر جھونپڑی ڈال رکھی ہے۔ دوسرے صاحب پنشنر ڈاکٹر جھنڈے خاں تھے۔ ان میں یہ خاص وصف تھا کہ کسی مریض کے لئے دو ڈیڑھ آنے سے زیادہ قیمت والی دوا تجویز نہ کرتے تھے۔ بیماروں کے ہمدرد تھے۔ مولانا روم کی مثنوی کے شیدائی تھے مگر یہ بھی غلط پڑھتے تھے۔ بعض دفعہ پڑھتے ہی پڑھتے میں مصرع کو ساقط البحر بنا دیتے تھے۔ ایک دو آدمی ایسے بھی تھے کہ فارسی کی چیدہ کتابیں، مینا بازار اور پنج رقعہ بھی ان کے پاس تھیں مگر دو سطریں بھی سمجھ نہیں سکتے تھے۔ سمجھنا تو درکنار ان کو صحیح پڑھ ہی نہیں سکتے تھے۔ بس یہ تھی اس آبادی کی تعلیمی کائنات جس میں پرورش پانے کے لئے قدرت نے مجھے مجبور کر دیا تھا۔

اسکول میں چوتھی جماعت ہی سے فارسی شروع ہو جاتی تھی۔ پانچویں میں گلستاں کے دو باب انتخابی شکل میں شاملِ نصاب تھے۔ مجھے اردو فارسی کے مضامین سے خاص دلچسپی تھی۔ گلستاں کے بہت سے شعر انہیں دنوں میں مستقل طور پر یاد ہو گئے تھے۔ حافظہ بہت اچھا تھا۔ اردو کی پہلی کتاب میں مولانا محمد حسین آزاد کی جو نظمیں شاملِ درس تھیں، وہ سب مجھے زبانی یاد ہو گئی تھیں۔ اب بھی ان کے کچھ حصے حافظے میں ہیں۔ ان میں دو نظمیں تو سالم کی سالم اب تک یاد ہیں۔ ظاہر ہے کہ اردو فارسی کی نظم سے مجھے قدرتی لگاؤ تھا اور شاعرانہ ذوق کی یہ بنیادی علامت تھی۔ مڈل سکول میں داخل ہوا۔ تو وہاں ان مضامین سے دلچسپی اور بھی بڑھ گئی۔ باوا سنگت سنگھ بیدی ہیڈ ماسٹر تھے۔ اگرچہ شاعر نہ تھے مگر اچھے صاحبِ ذوق اچھے نکتہ شناس اور اچھے سخن فہم تھے۔ پڑھاتے تھے تو محاسنِ شعری بھی بیان کرتے تھے۔ فارسی اور اردو کے مضامین انہیں کی تدریس میں شامل تھے۔ کبھی کبھی تین چار آسان بحروں کے ارکانِ تقطیع بھی بتا دیتے تھے۔ بعض اوقات ایک دو شعروں کی تقطیع بھی کر دیتے تھے۔ انہیں کے ادبی ذوق نے پہلی بار میرے جذبۂ شاعری کو متحرک کیا اور وہ نیم بیداری کے عالم میں انگڑائیاں لینے لگا۔ عمر ابھی بارہ تیرہ سال ہی کی تھی۔ طبیعت نے بُرا بھلا شعر کہنے پر مائل کر دیا۔ میرے ہم جماعت

طلبا نے میرے شعر سن کر پیش گوئی کر دی کہ یہ ضرور شاعر بنے گا۔ دیوانِ ذوق کا کچھ حصّہ بھی انہوں نے پڑھایا۔ ایک دن اسی دیوان کی ایک غزل پڑھا رہے تھے اس غزل کا یہ شعر ہے

تفنگ و تیر تو ظاہر نہ تھا کچھ پاس قاتل کے
الٰہی پھر جو دل پر تاک کر مارا تو کیا مارا

پڑھ کر مجھ سے پوچھنے لگے کہ بتاؤ کیا مارا؟ میں نے فوراً کہہ دیا کہ تیرِ ادا مارا۔ یہ جواب سن کر وہ اور میرے ہم جماعت بہت خوش وقت ہوئے اور بابا جی نے زندہ باش کہا۔ یہ تھے میرے ابتدائی محرکاتِ شاعری، جن کا سلسلہ یہاں کی تعلیم ختم ہونے پر تہی دستی اور تنگ حالی نے منقطع کر دیا۔ انہیں دنوں میں والد کا انتقال ہوا۔ فکرِ معاش اور بھی روح فرسا ہو گئی۔ چچا نے اپنی دکان میں نون تیل بیچنے کا دھندا اختیار کرنے کے لئے مشورہ دیا۔ دو تین مہینے تو میں نے اس مشورے پر عمل بھی کیا مگر یہ مقام ایک چھوٹا سا گاؤں تھا علمی و ادبی اشتغال نے مجھے بیزار کر دیا۔ آخر یہاں سے اٹھا تین سال سبیلِ معاش کی تلاش میں ادھر اُدھر ناک ٹوئیے مارتا پھرا۔ اس عالم میں بھی شاعرانہ ذوق نے میرا دامن جو اگرچہ صد چاک تھا نہ چھوڑا۔ وہ ڈھائی سو شعر اس مدت میں کہہ ڈالے مگر اساتذہ اُردو کا کلام پڑھنے کا جب بھی موقع ملا، ذوقِ صحیح اور وسعتِ نظر نے کہہ دیا کہ جو کچھ کہا ہے۔ وہ کچھ بھی نہیں۔ اس آواز کو جو صداقت کا پیغام تھی، سن کر یہ ذخیرہ چاک کر دیا اور ملسیاں کو خراب آباد سمجھ کر چھوڑ دینے کا ارادہ کر لیا۔ اب بھی میں اُسے خراب آباد ہی کہا کرتا ہوں۔ میری ایک غزل کا مقطع یہ ہے

کیا کرو گے جوشؔ تم جا کر وہاں ٭ ملسیاں اب بھی خراب آباد ہے

معاشی مشکلات کا مسئلہ حل کرنے کی کوشش اور مسلسل ناکامیوں کے بعد پیشۂ مدرسی اختیار کرنے کے لئے جالندھر کے ٹریننگ اسکول میں داخل ہو گیا۔ یہاں وظیفہ ملتا تھا۔ ہوسٹل کا بل ڈھائی تین روپے ماہانہ سے زیادہ نہ تھا اس لئے گزارہ ہو جاتا تھا۔ یہاں کی درسی کتابوں میں میر و سودا، ناسخ و آتش اور ذوق و غالب کا کلام پڑھ کر بہت خوش وقت ہوا۔ ان اساتذہ کے کلام نے جذبۂ شاعری کو جھنجھوڑ کر پھر سے بیدار کر دیا۔ اسے نئی زندگی عطا کی۔ ان بزرگوں کے کلام نے مجھے بتایا کہ شعر کیا ہوتا ہے۔ شاعری کی عظمت سے کیا مراد ہے۔ خوش بیانی اور تر زبانی کسے کہتے ہیں۔ شباب کی ابتدا تھی اس نے طبیعت غزل کی طرف خود بخود مائل ہو گئی [illegible] اور سنِ بلوغ کے باوجود شبابیات [illegible] نہیں پھٹک سکی۔ یہ شعر اسی زمانے کی یادگار ہے

امیر وہ نہیں جس کا کہ دل فقیر نہیں
فقیر وہ نہیں جس کا کہ دل امیر نہیں

یہاں سے فارغ ہو کر اور ڈویژن بھر میں اوّل رہ کر چار سال جالندھر میں ملازمت اختیار کر لی۔ یہاں کا ادبی ماحول میرے لئے خوش گوار تھا۔ زبان اور فن کے ادبی شکوک رفع کرنے کے مقصد سے کسی قابل شاعر کی ضرورت محسوس ہوئی۔ حضرت داغؔ کے نامور شاگرد نسیم بھرت پوری کا دیوان کہیں سے مل گیا [illegible] پڑھ کر انہیں سے خط و کتابت شروع کر دی۔ وہ فراخ دلی سے میرے [illegible] جواب دیتے تھے میرے بعض اشعار کی داد بھی دیتے تھے انہوں نے میرے رنگِ طبیعت کو پسند کیا اور حضرت داغؔ دہلوی سے اصلاح حاصل کرنے کا مشورہ دیا۔ [illegible] میں پہلے ہی حضرت داغؔ کے رنگِ سخن کا گرویدہ تھا مگر رسائی [illegible] کی ضرورت تھی۔ یہ مشکل بھی موصوف نے اپنی سفارش سے حل کر دی اور [illegible] میں یہ سلسلہ قائم ہو گیا اسی سال مجھے بڑی جماعتوں کی تدریس کے قابل بنانے کے لئے ٹریننگ کالج لاہور میں طلب کر لیا گیا۔ یہ انتخاب بالکل یقینی تھا کیونکہ میں ڈویژن بھر میں اوّل رہا تھا۔ وظیفہ یہاں بھی ملتا تھا گزر اوقات میں کوئی دشواری نہ تھی یہاں پہنچا تو لاہور کی ادبی فضاؤں نے میرے [illegible] جذبۂ شاعری کو پھر [illegible] عطا کی پہلی دفعہ لاہور ہی میں مشاعرہ دیکھنے کا موقع ملا شوقِ سخن [illegible] خوب اُبھرا۔ ہر مشاعرے میں شامل ہوتا اور پڑھتا رہا۔ کالج میں [illegible] پروفیسر بھی شاعرانہ دل و دماغ رکھتے تھے۔ وہ بھی اپنا کلام سنا کر مجھے متحرک کرتے رہتے تھے یہاں سے فارغ ہو کر ملازمت کے سلسلے میں پھر دیہاتی زندگی میرے حصّے میں آئی۔ چونکہ میں بیس سال ایسی زندگی کا خوگر رہا تھا اس لئے اب یہ بارِ خاطر نہیں تھی۔ وجہ یہ کہ تلاشِ معاش کے تفکرات اب گلوگیر نہ تھے۔ [illegible] حسبِ فرصت مشقِ سخن کرتا رہا۔ لکھنؤ کا رسالہ پیام یار [illegible] شروع کر دیا تھا اس میں مشہور اساتذہ وقت کا کلام بھی جو میرے [illegible] تھا شائع ہوتا تھا۔ ادبی دل بستگی اور استفادے کے لئے [illegible] کو پھر پرواز عطا کرتا رہا۔ اب سکونت بھی ملسیاں سے نکودر ضلع جالندھر میں منتقل کر لی تھی۔ یہ مقام ضلع کی ایک تحصیل کا صدر مقام ہے [illegible] تھا

[illegible] کی طرح خوب آیا۔ بھی معاشی اطمینان کی وجہ سے ہر قسم کی ادبی کتابوں کا مطالعہ بھی اب شروع کر دیا گیا۔ منشی فاضل اور ادیب فاضل کے امتحان بھی دیئے۔ عروض کی کتابیں بھی غور سے مطالعہ کیں۔ ان میں جواہر العروض اور بحر الفصاحت قابلِ ذکر ہیں۔ اس مطالعے کا نتیجہ یہ ہوا کہ طبیعت ہر بحر میں خواہ وہ سالم ہو یا مزاحف، بالکل صحیح رفتار سے چلتی تھی۔ پیچیدہ بحروں میں ناکام نہ ہوتی تھی۔ ناموزوں مصرع زبان پر آتا ہی نہیں تھا۔ اس مطالعے سے میں نے محسوس کیا کہ سبب اور وتد کی دو دو قسموں کے ہوتے ہوئے فاصلہ وغیرہ (چار حرفی اور پنج حرفی الفاظ کی عروضی تجزی) بالکل بے ضرورت ہے۔ سبب اور وتد ہی تمام الفاظ پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ ان امتحانوں میں فارسی کی متعدد کتابوں کو مطالعہ کرنے کا اتفاق ہوا۔ گلشن راز نے حقیقت و مجاز کا مفہوم سمجھایا۔ عرفان کے راز بتائے۔ شعر العجم نے فارسی ادب کی پوری تاریخ ذہن میں مرتب کی۔ چہار مقالہ اور درّہ نادرہ نے فارسی زبان کے سنگستان دکھائے۔ اس زبان میں چند اور سنگستان بھی حاشرانہ نظر سے دیکھے۔ مثلاً مینا بازار، پنج رقعۂ ابوالفضل، سہ نثر ظہوری وغیرہ۔ حیرت ہوئی کہ اس قسم کے پتھر فارسی کے دامن میں کیوں بھرے گئے۔ دیوانِ نظیری نیشاپوری قصائد قاآنی، قصائد عرفی بھی ان امتحانوں کے لئے پڑھے۔ نظیری کے تغزل اور قاآنی کی بے پناہ روانیِ کلام نے بتایا کہ شاعرانہ عظمت کیا ہوتی ہے۔ فلسفہ کی ایک کتاب روح الاجتماع بھی اس امتحان کے نصاب میں شامل تھی۔ ایسا خشک مضمون پہلے کبھی نہ دیکھا تھا، کم بخت بار بار رٹنے پر بھی محفوظ نہ رہتا تھا۔ کتاب علم التعلیم میں ایک حصہ علم الحواس بھی تھا۔ ویسے تو یہ بھی خشک تھا مگر اتنا نہیں کہ دماغ کو بالکل خشک کر دے۔ گلستاں بوستاں سالم کے علاوہ سکندر نامہ بری، شاہ نامہ، غالب کا فارسی دیوان، امیر خسرو کی ایک مثنوی، یہ کتابیں بھی دیکھیں۔ مگر جزوی صورت میں اخلاق جلالی اور اخلاق ناصری نے انسانیت کا نقش دل و دماغ پر بٹھا دیا۔ انوار سہیلی کے سیاست آموز بیان بہت پسند آئے۔ اردو نثر کی کتابوں میں سے فسانۂ آزاد اور فسانۂ مبتلا زبان کے لحاظ سے سبق آموز ہوئے۔ اس فضیلت میں توبۃ النصوح کو بھی برابر کا حصہ دار پایا۔ آبِ حیات اور نیرنگِ خیال کی تو دنیا ہی دوسری تھی۔ ناقدانہ نثر نگاری کا اعجاز قدم قدم پر محسوس کرتا پایا گیا۔ ناول اور افسانے پڑھنے کی طرف طبیعت کبھی مائل نہیں ہوئی۔ البتہ شرر کے رسالے کے بہت سے ناول پڑھے۔ اس شوق کی وجہ یہ ہے کہ شطرنج کا شوق ایسی کتابوں سے لگاؤ پیدا کرتا رہا۔ شطرنج میں بھی تو حسنِ خیال کی جولانیاں لازم ہوتی ہیں۔

اردو میں میر تقی اور سودا نے آہ اور واہ کا منظر پیش کیا۔ سودا کی قصیدہ گوئی کو عرفی اور خاقانی سے ٹکراتے دیکھا۔ ہجویات میں انوری سے مصافحہ کرتے بھی دیکھا۔ دیوانِ ذوق اور دیوانِ غالب کی امتیازی خوبیاں زیرِ غور رہیں۔ غالب کے اردو خطوط میں شاعری ہی شاعری دیکھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ وزن اور بحر سے بالکل بے نیاز ہے۔ فن اور زبان کے بہت سے نکات ان میں حل شدہ پائے جاتے ہیں۔ حضرت داغ کے چاروں دیوان امیر مینائی کے دونوں دیوان بڑے شوق سے مطالعہ کئے مگر زبان کا ریاض حضرت داغ ہی کے کلام بلاغت نظام سے ہوتا رہا۔ سب سے زیادہ رہنمائی انہیں کی زبان نے کی۔ دلی کے مشاعروں میں شامل ہوا تو بعض اصحاب نے یہ کہا کہ چھ سات سال تو دلی ضرور رہے ہوں گے، ورنہ پنجاب کے ایک گوشے میں رہ کر ایسی زبان کبھی نہ لکھ سکتے۔ میں نے جواب میں کہا کہ میں جب بھی دلی آیا ہوں، تین چار دن سے زیادہ نہیں ٹھہرا۔ یہ جواب سن کر وہ حیران ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ اتنا ریاض تو فوق العادۃ ہی کہا جا سکتا ہے۔

بہت سے تنقیدی مضامین اور فنی مباحث بھی زیرِ مطالعہ رہے اور حالی کی تالیف یادگارِ غالب اور مولانا محمد حسین آزاد کی تصنیف منیف آبِ حیات لاہور میں مجھے دورانِ تعلیم میں بطور انعام ملی تھیں۔ ان کتابوں سے بھی بہت سا استفادہ ہوا اور بہت سی وسعتِ نظر حاصل ہوئی۔ ان کے علاوہ معرکہ شرر و چکبست، مرزا یگانہ کی تصنیف غالب شکن، صبر رام پوری اور مولانا احسن کے فنی مباحث بھی پڑھے۔ حضرت داغ کے کلام پر جو اعتراضات مسلسل طور پر اودھ اخبار میں شائع ہوتے رہے اور جن کے جوابات نسیم بھرت پوری نے نہایت قابلیت سے لکھ کر تازیانہ کے نام سے کتابی صورت میں شائع کئے، مشعلِ راہ ثابت ہوئے۔ ملک بھر کے بڑے بڑے مشاعرے بھی محرک رہے۔ مشاہیر شعراء اردو سے مجالست و موانست کا موقع بھی ملا۔ بے خود دہلوی، نواب سائل، کیفی دہلوی، نوح ناروی۔ دل شاہ جہاں پوری، ساحر دہلوی، مہر گوالیاری ان سب اصحاب سے ادبی تعلق بھی، ان اصحاب سے ملاقاتیں بھی ادبی گفتگو تک محدود تھیں۔ یہ میری ادبی زندگی کو خوب

چنانچہ تھیں۔ سائل دہلوی، بیخود اور نواب سائل کی قیام گاہیں ادبی اکھاڑے تھیں۔ انھیں غالب اور ذوق کے زمانے کی مٹی ہی یادگار کہا جا سکتا تھا۔ ان بزرگوں کی وفات تو دہلی کو ختم کر گئی۔ اب میں کبھی دلی آتا ہوں تو یہی مصرع زبان پر آجاتا ہے۔

دلی میں سب ملے مجھے دلی ملی نہیں

مجھ سے محرکاتِ شاعری پوچھے گئے ہیں۔ چھوٹے بڑے میں نے تمام محرکات بیان کر دیئے ہیں مگر میں تین چار محرکات کو مراتب بالاتر سمجھتا ہوں۔ سب سے بڑا محرک تو موزونیِ طبع۔ ذوقِ سلیم اور وجدانِ صحیح ہے جو خداداد تھا اور قدرت نے بڑی فیاضی سے میرے دل و دماغ میں ودیعت کیا تھا۔ اس کے بعد دوسرا بڑا محرک سعدی اور حضرت داغ کا کلام ہے۔ سعدی نے پند و موعظت کے خشک ترین میدان کو اتنا سرسبز و شاداب کیا کہ اس کی بہار کو بہارِ بے خزاں کہنا چاہیئے۔ سعدی کے سیکڑوں جواہر پارے میری کشتِ ادب کی آبیاری کرتے رہے ہیں اس نام ور بزرگ کی روح اگر یہ کہے کہ ذا فنی بعدی۔ تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔ سعدی کا جواب پیدا کرنے میں بعض اہلِ قلم نے قلم کو اٹھایا مگر شکستہ پا ہو کر رہ گئے۔ اُن کی محنتِ شاقہ کا نتیجہ بہروپ ہی کہا جا سکتا ہے۔

دوسرا بڑا محرک ہے حضرت داغ کی سحر نگاری، شوخ بیانی۔ طرزِ بیانی فصاحت۔ بلاغت اور معاملہ بندی یا تغزل میں اُن کا مدِ مقابل اس زمانے میں کوئی نہ تھا۔ انھیں کے فیضان نے مجھے پرِ پرواز عطا کیے۔ تیسرا بڑا محرک لاہور ہے جس کی ادبی زندگی میرے لئے ادب آموز تھی۔ باقی محرکات جو میں نے بیان کئے ہیں، میرے لئے ان کا درجہ ان کے بعد ہے۔ اگرچہ میری تعلیمی ترقی اور ادبی دست گاہ میں وہ محرکات بھی کافی وزن رکھتے ہیں۔ اُن کے فیض و کرم کا بھی مجھ پر بڑا احسان ہے۔

حضرت داغ کی معجز نگاری اگرچہ میرے لئے سب سے بڑی محرک تھی مگر میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ اپنے میلانِ طبیعت کے زیرِ اثر اُن کا اندازِ سخن اس حد تک اپنی طبیعت میں جذب نہیں کر سکا جس قدر نوح ناروی، سجر شاہ جہاں پوری اور بیخود بدایونی نے جذب کیا تھا۔ اس میں کوتاہی اور تقصیر کی کوئی بات نہیں غالب کے ہم شاگردوں میں ایک سے بھی ان کا اندازِ سخن کو قبول نہیں کیا مگر اس حقیقت کے باوجود میری ہر غزل میں تین چار ایسے شعر ضرور پائے جاتے ہیں جن پر داغ کے رنگ کی چھاپ صاف نظر آتی ہے۔ اور یہ ماننا پڑتا ہے کہ یہ اندازِ انھیں کا فیضانِ سخن ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

پی لوگے تو اے شیخ ذرا گرم رہوگے ؛ ٹھنڈا ہی نہ کر دیں تمہیں جنت کی ہوائیں

وہ کلا بھی کچھ کہیں گے [illegible]

[illegible]

شوخ [illegible]

[illegible]

سخت جاں [illegible]

وار کرنا سوچ کر [illegible] سنبھل کر دیکھ کر

میں نے کہا تو یہ تھا کہ تقصیر ہو معاف

اس کے جواب میں [illegible]

ممکن ہے فرشتوں سے کوئی [illegible]

میں اتنا گنہ گار کبھی ہو نہیں سکتا

اے پردہ نشیں [illegible]

میں گر تو نہیں ہوں [illegible]

کہا تم نے شناسی نے اسے اتنا بتا جاؤ

یہ وعدے ہیں کہ فقرے ہیں یہ باتیں ہیں کہ گھاتیں ہیں

کوئی دم ساز کوئی ہے جاں باز ؛ آپ کے ساز باز نے مارا

باتوں باتوں میں جو میں کچھ کہہ گیا ؛ ہنس کے فرمانے لگے کیا بات ہے

جنت اک چیز ہی سہی لیکن ؛ حشر تک انتظار کیا معنی

اس قدر جورِ حسیناں سے رہا تو فرسودہ ؛ حوریں آئیں تو ہمیں بھاگ کر بلائیں آئیں

بدگمانی کی بھی عادت ہے زمانے کو بہت ؛ مجھ کو اچھا نہ کہیں گے تو وہ اچھا ہوگا

گلا نہیں ہے اگر آپ مجھ کو بھول گئے ؛ مرے خدا کو بھی عادت ہے بھول جانے کی

جو عکس یہ دیکھو گنہ گاروں کی فہرست ؛ پہلے نمبر میں تمہارا نام ہے

# غزلیں

## [illegible]

[illegible] اُبھرتے بڑا ہی تھا سوال [illegible]
[illegible] ہشت [illegible] کمال [illegible]

دگل کدوں کو میسر [illegible] نہ چاند [illegible]
ترے وصال کی خوشبو، ترے جمال [illegible]
قلر اشارہ کناں لب حریف [illegible]
وہ جذب شوق کا عالم یہ عرض [illegible]

بھریں تو اور ہوں گہرے گھٹیں تو [illegible]
ہے ان دنوں یہی زخموں کے اندمال کا [illegible]
ذرا سی دیر کو چہرے دمک تو جاتے ہیں
خوشی کا رنگ ہو یا ہو غم و ملال کا رنگ

زمانہ اپنی کہانی سنا رہا تھا ہمیں
اُبھر گیا مگر آغاز میں مآل کا رنگ
کوئی زباں کوئی طرزِ ادا نہ کام آئی
ہے لاجواب ابھی تک ہر اک سوال کا رنگ
[illegible] ہیں شش و پنج میں سبھی چہرے
[illegible] ہیں کتنا بساطِ حال کا رنگ
[illegible] ہی چاک گریباں سے روز و شب کی نمود
مرے ہی رنج سے عبارت ہے [illegible] رنگ
اسیر وقت ہے تو، میں ہوں وقت سے آزاد
ترے عروج سے اچھا مرے زوال کا رنگ
[illegible] تحفۂ حق میری فکر ہے آزاد
مثالِ قوس قزح ہے مرے خیال کا رنگ

## عزیز قیسی

سب کو یقیں ہے ہم سا کوئی دوسرا نہیں
تلو تکدوں میں اُن کے کہیں آئینہ نہیں
خود کیوں نہ بڑھ کے سنگ زنوں کو پکاریے
مدت سے اس گلی میں تماشا ہوا نہیں
وہ کھُل کے آ گیا تھا یہ خنجر لیے ہوئے
ورنہ کس آستیں میں خنجر چھپا نہیں
رُکتے ہیں کوچہ کوچہ تو پھرتے ہیں شہر شہر
اب تک تو ہم کو اپنا ٹھکانہ ملا نہیں
تنہائی کا ہے جن کو گلہ کون ہیں وہ لوگ
مجھ کو گلہ ہے میں کبھی تنہا ہوا نہیں
ملتے ہیں ایک ایک سے باہیں پسار کے
کیا کیجیے کہ اپنا کوئی آشنا نہیں
مجبوری کچھ تو ہوگی کہ سجدہ گزار ہیں
گر ہم خدا نہیں ہیں تو تم بھی خدا نہیں
قیسی سدا ملے ہیں، سر رہ، یہاں وہاں
گھر کس جگہ ہے اُن کا کسی کو پتہ نہیں

# تصویر

زاہدہ زیدی

رینگتی بے دلی ، گمشدہ آگہی
سرنگوں فکر ، منتشر احساس
مضمحل جسم ، منتظر آنکھیں
گرتی مٹی ، چٹختی دیواریں
جلتے تلوے ، بھٹکے راہ گزار
زخمی افکار ، ٹوٹتی اقدار
ٹھٹھرے الفاظ ، بے کفن معنی

سب لوازم بکھر آج یکجا ہیں
ایک سادہ ورق اٹھا لاؤ
اور پھر خانۂ تصادم سے
نئی تصویر اک بنا لاؤ

وہ جب [illegible]

پھر اپنی آنکھوں سے ... دیکھا
[illegible]

# پتھر پتھر

وہ ایک لڑکی کہ طائر توش تھی
نرم ہیں غزال وحشت صید عجب پر
ختن ختن جیسے ہنس رہے تھے
وہ ایک بدن کہ جس سے بندش
بجس نہ پائیں زیب کے لب کھل رہے تھے
وہ ایک ناگن جو ہر سپیرے کی
دشمن بہ بدست ہو رہی تھی
وہ جاگتی تھی کہ صاحبان کہف کے
غاروں میں سو رہی تھی
رواں دواں عمر کے آئینہ کو یہ ہیم
غرور و نخوت کے پتھروں سے
کچل کچل کر، وہ کور چشموں کے جیسے سرمہ لگا رہی تھی
وہ اب بھی بیتے برس کے خوابوں سے زندگی کو رجھا رہی تھی

---

وہ چہرہ تھا رائج الوقت سکہ
مگر کسی ایسی سلطنت کا جو ہاتھ سے کوئی پل میں نکلے
بدن کی قوسیں کہ دست بیکار سال و سن تھر تھرا سنبھلے
میں اس کی ظلمات روح میں کل پتے سیاحت اتر پڑا تھا
وہ شور تھا ، بھیڑ تھی وہ ریلا
وہ کوئی کہرام تھا کہ میلا
میں محو نظارہ تھا اکیلا
کہ یوں بھی انجان اجنبی تھا ، سراپا حیرت بنا کھڑا تھا

---

پھر اپنی آنکھوں سے میں نے دیکھا
قطار اندر قطار پتھر کے بت کھڑے مسکرا رہے تھے
وہ دیوداسی بدن چرائے
لجائے ، شرمائے ، رسمسائے
چٹکتی پوروں کا پیار لے کر
کنواری کلیوں کا ہار لے کر

[illegible]

ضیاء احمد بدایونی

# علی گڑھ



## — چند یادیں

**وقت** کو گزرتے کیا دیر لگتی ہے۔ کہنے کو تو نصف صدی سے زیادہ زمانہ گزرا مگر کل کی سی بات معلوم ہوتی ہے جب میں اپنے وطن بدایوں کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں پڑھتا تھا۔ اسی زمانے میں میرے چند عزیز ایم اے او کالج علی گڑھ میں زیر تعلیم تھے۔ یہ لوگ جب تعطیل میں گھر آتے تو علی گڑھ کی خوشگوار یادیں سوغات میں ساتھ لاتے اور ہم لوگوں کو وہاں کے واقعات سناتے۔ انھیں میں ایک صاحب تھے جو مجھ سے تین چار سال بڑے ہوں گے۔ نہایت سنجیدہ و شائستہ، مہذب و متین، دیندار اور اخلاص شعار۔ وہ جب مجھ سے ملتے تھے تو کالج اور بورڈنگ ہاؤس کی زندگی کا نقشہ کھینچ دیتے تھے۔ طلبہ کا رکھ رکھاؤ، اساتذہ کا اپنے شاگردوں سے میل جول، انگریز پروفیسروں کا بے تکلف لڑکوں کے کمروں پر آنا، ان کی مشکلات سننا اور دکھ درد میں بھی ان کا ہاتھ بٹانا، بیماری میں اپنی کوٹھی سے پرہیزی کھانا پکوا کر خود لانا اور اپنے سامنے پیار اور شفقت سے کھلانا، کالج کے طلبا کو اپنے یہاں چائے پر بلانا، مَین کا اور ان کی لیڈی کا کمال محبت سے پذیرائی کرنا اور چلتے وقت برآمدے تک مشایعت کو جانا، غرض ایک عجیب اپنائیت کی فضا تھی جس کی نظیر کسی دوسری درسگاہ میں نہیں ملتی تھی۔ عزیز موصوف جب تک یہ باتیں کرتے میں ہمہ تن گوش بن کر سنتا اور دل ہی دل میں علی گڑھ دیکھنے کا شوق پرورش پاتا۔ سچ پوچھیے تو علی گڑھ میرے خوابوں کی بستی بن گیا تھا۔

کیا خبر تھی کہ یہ خواب ایک دن حقیقت کا روپ اختیار کرے گا اور چند سال بعد مجھے استاد کی حیثیت سے اسی مرکز علم و ادب میں آنا ہوگا جو میرے خوابوں کی بستی تھا۔ ہوا یوں کہ جب میں الٰہ آباد یونی ورسٹی سے فارسی میں ایم اے کرنے اور پھر وہاں فارسی ادب میں ریسرچ کے دو سال گزارنے کے بعد وطن آیا تو ایک دن میرے محترم کرم فرمانے جو مجھ سے بے حد خلوص رکھتے تھے فرمایا کہ قریشی صاحب آئے ہوئے ہیں، وہ تمھیں یاد کرتے تھے۔ یہ سن کر مجھے تعجب ہوا کیونکہ اب تک مجھے قریشی صاحب سے تعارف کی عزت بھی حاصل نہ تھی۔ بہرحال میں ان کی خدمت میں گیا۔ بڑے تپاک سے پیش آئے اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد کہا کہ ہمارے یہاں ایک جگہ خالی ہوئی ہے۔ آپ آجائیں تو اچھا ہے۔ میں نے موصوف کی پیش کش کو شکریے کے ساتھ قبول کیا اور علی گڑھ جا کر مسلم یونی ورسٹی انٹرمیڈیٹ کالج میں لیکچرار کی حیثیت سے کام شروع کر دیا۔ یہ دسمبر ۱۹۲۹ء کی بات ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ قریشی صاحب کون بزرگ تھے۔

---

۱؎ قریشی صاحب کی زوجۂ ثانیہ بدایوں کے خاندان سادات سے تھیں۔ اسی سلسلے میں موصوف اکثر بدایوں آتے رہتے تھے۔

پروفیسر عبدالمجید قریشی کا وطن تو پنجاب تھا لیکن وہ علی گڑھ میں طالب علمی اور ملازمت کا طویل زمانہ گزار چکے تھے اور صرف یہ بلکہ وہاں کی زندگی میں اس قدر رچ بس گئے تھے کہ یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ اور علی گڑھ لازم و ملزوم بن گئے تھے مشہور تھا کہ یونیورسٹی نے ڈاکٹر ضیاء الدین کو پیدا کیا، ڈاکٹر ضیاء الدین نے قریشی کو اور قریشی نے حافظ عثمان کو۔ یہ سب حضرات ریاضی میں امتیازی مرتبہ رکھتے تھے۔ غرض دو اور دو چار کی ممارست نے قریشی صاحب کو حقیقت پسندی سکھائی اور اسی کی بدولت ان میں زندگی کے اقدار پر گہری نظر ڈالنے کی ادا آئی۔ اسی کے ساتھ ان کو فلسفہ و ادب سے بھی خاصا ذوق تھا۔ شاید اسی کا اثر تھا کہ وہ بیک وقت ایک بالغ نظر مدبر بھی تھے اور پاکیزہ جذبات کا پیکر بھی مولانا روم نے جو کہا ہے کہ

کار پاکاں روشنی و گرمی است

خدا نے دماغ کی روشنی اور دل کی گرمی دونوں موصوف کی ذات کے اندر جمع کر دی تھیں۔ کشیدہ قامت، بارعب چہرہ اور شاندار مونچھیں۔ یہ تھے قریشی صاحب جو میرے علی گڑھ آنے کا باعث ہوئے۔ کبھی کبھی ایسا ہوا کہ لڑکوں نے ڈائننگ ہال کے انتظام سے ناراض ہو کر اسٹرائیک کر دی اور تمام ارباب حل و عقد اس گتھی کو سلجھانے سے قاصر رہے مگر قریشی صاحب نے جو سمجھتے تھے کہ کہاں نرمی کا محل ہے اور کہاں گرمی کا، منٹوں میں اپنے ناخن تدبیر سے اس عقدے کو یوں حل کر دیا کہ سب دنگ رہ گئے۔ علی گڑھ میں بڑے عظیم الشان مشاعرے ہوئے جن کا سہرا دو شخصوں کے سر رہتا۔ قریشی صاحب اپنی وجاہت سے طلبہ کے جوش و خروش کا بار سنبھالتے اور مولانا احسن مارہروی، نازک مزاج شعرا کی خاطر و مدارات کر کے کام نکالتے۔ میں نے ایسے افراد بہت کم دیکھے ہیں جن سے طلبا ایک طرف ڈرتے ہوں اور دوسری طرف ان کا دم بھی بھرتے ہوں۔ یہ بات قریشی صاحب میں پائی۔

جس کالج میں پہلی بار میرا تقرر ہوا اس کے پرنسپل قریشی صاحب ہی تھے۔ مڈ کلاس یونی ورسٹی کے اور دو اسکول کے ملا کر انٹرمیڈیٹ کالج کی تشکیل عمل میں آئی تھی۔ یونی ورسٹی اور اسکول کا دائرہ عمل اس سے الگ تھا۔ کالج کے اساتذہ میں چند اصحاب ایسے تھے جن کے علمی اکتسابات اور مخلصانہ تعلقات کی یاد اب تک دل میں جاگزیں ہے۔ ان میں مشتاق احمد صاحب خلف نواب وقار الملک مرحوم عبدالشکور صاحب، ڈاکٹر ناظم صاحب، محمد حاذق صاحب اور شیخ علی سجاد صاحب

مرحوم صحت سے قابل رشک [illegible]
عربی کی مہارت سے [illegible] کا سامنا ہوتا ہے) اس پر طرہ یہ کہ [illegible] چکا تھا۔ تاہم کلاس لینا ضروری تھا۔ [illegible] دکھائی مگر جلد ہی ان کو یہ آٹ سمجھ میں [illegible] ہیں) ان کا احترام اور میری تقسیت حرب [illegible] علی گڑھ کے طویل زمانہ قیام میں ارباب اختیار [illegible] مقبول اور اپنے شاگردوں میں محترم رہا [illegible] کہ علی گڑھ کے طلبا اپنے اساتذہ کا صحیح جائزہ لیتے [illegible] ہوتا ہے یا خواہ مخواہ رعب جماتا ہے یا کام کرتا [illegible] میں اڑا دیتے ہیں لیکن اگر کوئی ٹھکانے کا آدمی [illegible] دل سے عزت کرتے ہیں۔

میں جب علی گڑھ پہنچا ہوں تو [illegible] آفتاب احمد خاں تھے وہ ایک جمیل و شکیل انسان تھے اور [illegible] معلوم ہوتے تھے۔ بلکہ انگریز کا تو صرف رنگ گورا ہوتا ہے۔ صاحب زادہ صاحب ہر طرح ایک پیکر جمال تھے۔ بچپن سے ان کی قابلیت، علمیت، مذہبیت، دیانت داری اور حق پسندی کے چرچے کانوں میں پڑے تھے۔ مذہب سے لگاؤ تو شدید سے تھا لیکن آخر میں تو مذہب ان کی پوری زندگی پر چھا گیا تھا۔ [illegible] کی سچی لگن رکھتے تھے اور دونوں کو با معروف پر چھا جانے کے [illegible] بعض لوگ کہتے ہیں کہ مرحوم میں ضد اور اپنی رائے پر اصرار تھا [illegible] میں ہر اصول پرست اور حق پسند کو یہ مرحلہ پیش آتا ہے۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ مرحوم فالج کے حملے سے صاحب فراش اور نشست و برخاست سے معذور تھے [illegible] میں اچانک سنا کہ صاحبزادہ صاحب نے ایک [illegible] تمام ممبران کورٹ اور دوسرے ذمہ داران [illegible] گویا تھا جس نے علی گڑھ کی ساکن فضا میں [illegible] تصویر حیرت بنا ہوا تھا۔ ہر ایک کی زبان پر یہ [illegible] کا مضمون کچھ اس قسم کا تھا۔

" میں نے اپنی وائس چانسلری کے زمانے میں [illegible] کوشش کی کہ فلاں فلاں امور میں اصلاحات [illegible] پر پردہ داشت

[illegible] صدیق حسن [illegible] میری [illegible] کی راہ میں روڑے اٹکاتے رہے۔ اپنے انتخاب کے فوراً بعد جب علی گڑھ پہنچا تو یونی ورسٹی کی مسجد میں گیا (یہاں جوتوں کی کوئی حفاظت نہ تھی) اور موذن کی مسجد سے غیر حاضری دیکھ کر حیرت ہوئی۔ امام صاحب بھی غیر حاضر تھے آخر بمشکل چار پانچ طالب علم جو آ گئے تھے ان کے ساتھ فریضہ نماز ادا کیا۔ جب جناب ناظم دینیات سے اس عاصی نے کمی کی وجہ پوچھی اور دینیات سے متعلق بعض مسائل پر گفتگو کی تو وہ کوئی جواب نہ دے سکے۔ مدعا یہ ہے کہ وہ یہ بھی نہ بتا سکے کہ ایک ناظم کے ذمے کیا فرائض ہوتے ہیں۔ ان وجوہ سے مجبور ہو کر میں یہ پمفلٹ شائع کرتا ہوں کہ ارباب اقتدار جلد اصلاح کی طرف متوجہ ہوں۔"

علیا حضرت سلطان جہاں بیگم والیۂ بھوپال ایک دردمند اور بیدار مغز رئیسہ اور علی گڑھ کی چانسلر تھیں اور مرحومہ کے فرزند نواب حمید اللہ خاں جو اعیانِ ملک میں ملی حمیت اور گہری بصیرت کا بے مثال نمونہ اور یونی ورسٹی کے اولڈ بوائے تھے اُن کے مشیر کار تھے۔ جب اُن کی نظر سے یہ تحریر گزری تو اُن کے حکم سے ان شکایات مندرجہ بالا کی تحقیق کے لئے رحمت اللہ کمیشن کا قیام عمل میں آیا جس کے صدر سر ابراہیم رحمت اللہ اور ارکان دو ممتاز ماہر تعلیم انگریز تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کمیشن کے مصارف اٹھارہ ہزار روپے ہوئے جو اس زمانے میں بڑی رقم سمجھے جاتے تھے اور جو بیگم صاحبہ نے اپنی جیب خاص سے عطا فرمائے۔ ڈیڑھ دو سال کی مسلسل تگ و دو اور بند کمرے میں ذمہ دار اصحاب کی شہادتوں کے بعد خدا خدا کر کے کمیشن کی رپورٹ منظر عام پر آئی جس کا ماحصل یہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو اُن کی خدمات سے سبکدوش کیا جائے اور ادارے کا چارج بانیٔ کالج کے نامور پوتے سید راس مسعود کو سونپا جائے جو اس زمانے میں مملکت دکن کی تعلیمات کے اعلیٰ افسر تھے۔ منجملہ دوسری اصلاحات کے اساتذہ کا ردوبدل اور انٹرمیڈیٹ کالج کی موقوفی بھی عمل میں آئی۔ اس موقع پر صرف دو اُستاد کالج سے یونی ورسٹی میں ترقی پر لئے گئے۔ شیخ عبدالرشید اور راقم سطور۔ یہ غالباً ۱۹۲۹ء کی تعطیل گرما کا واقعہ ہے۔

سید راس مسعود کے نام نے درحقیقت جادو کا کام کیا۔ دیکھتے دیکھتے علی گڑھ کی فضا یکسر علمی و تعلیمی ہو گئی۔ اساتذہ میں ذمہ داری کا احساس اور طلبہ میں اپنے فرائض کا پاس پہلے سے دوچند ہو گیا۔ ادھر ادھر دیکھو علمی چرچے، جہاں جاؤ تحقیق کے جلوے۔ نئے وائس چانسلر اپنی اصلاحی تجاویز کو روبہ عمل لانے کے لئے ایک مشہور ماہر تعلیم مسٹر ہارن کو پرو وائس چانسلر کی حیثیت سے ساتھ لائے تھے جنہوں نے بڑی سرگرمی کے ساتھ حالات کو سدھارا مگر افسوس کہ ایک سال کے اندر ہی علی گڑھ کی لو کا شکار ہو گئے۔ "خوش درخشید و لے دولت مستعجل بود۔"

علی گڑھ آکر راس مسعود نے اپنی پالیسی کے بارے میں جو پہلی زبردست تقریر کی وہ عمر بھر بھولنے والی نہیں۔ وہ جس طرح ایک طلیق اللسان Conversationalist تھے اسی طرح ایک جادو بیان مقرر بھی۔ جب بولتے تھے ایسا لگتا تھا کہ ایک لشکر جرار دھاوا مارتا چلا آ رہا ہے۔ اُن کو اُردو اور انگریزی پر بے نظیر قدرت تھی۔ تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ اپنے مرحوم دادا کی امانت کی نگہداشت کرتے ہوئے ممکن ہے کہیں مجھ سے فیصلہ کرنے میں غلطی ہو جائے مگر میری نیت ہمیشہ نیک ہو گی۔

اب میں یونی ورسٹی کے شعبۂ فارسی میں منتقل ہو گیا۔ جہاں مدت تک لیکچرر اور ریڈر کے فرائض انجام دیتا رہا۔ یونی ورسٹی کی فضا کالج کی فضا سے ملی جلتی تھی۔

---

نوٹ: یہ جو کہا گیا محض قول نہ تھا بلکہ پورے طور پر عمل سے ہم دوش۔ میں سمجھتا ہوں کہ مرحوم کے کنفت میں قول یا عمل کے الفاظ ہی نہ تھے۔ میں نے سرسید اور جسٹس محمود کو نہیں دیکھا۔ البتہ سید راس مسعود کو دیکھ کر کچھ اندازہ ہوا کہ عالی دماغ اور عالی ظرف ایسے ہوتے ہیں۔ ان سے پہلے نواب مزمل اللہ خاں صاحب (بھیکم پور) جو ایک نرم مزاج، علم دوست اور فیاض رئیس تھے، منصب وائس چانسلری پر فائز تھے اور تمام سیاہ و سفید کا اختیار ڈاکٹر صاحب (ڈاکٹر ضیاء الدین) کے ہاتھ میں تھا اور یونی ورسٹی کے معاملات پرانے ڈھرے پر چل رہے تھے۔ سید راس مسعود اور مسٹر ہارن کا آنا تھا کہ بالکل کایا ہی پلٹ گئی اور تمام امور میں خواہ تعلیمی ہوں یا انتظامی، کمیشن کی سفارشات کے مطابق عمل ہونے لگا۔ حکومت میں ان کا یہ وقار کہ بڑے بڑے گورنمنٹ آف انڈیا کے یورپین افسروں کو آدھا نام لے کر پکارتے تھے۔ والیانِ ملک میں یہ اعزاز کہ اعلیٰ حضرت نظام سے یونی ورسٹی کے لئے لاکھوں لاتے تھے۔ پبلک لیڈروں میں یہ وقعت کہ اُن کی دعوت پر کبھی گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال اور کبھی علی برادران اور علامہ اقبال علی گڑھ آتے اور کئی کئی دن ان کے مہمان رہتے۔ یہ بھی سنا دوں کہ سید صاحب مرحوم کی خدمت میں میری باریابی کی تقریب کیونکر ہوئی۔ بات یہ تھی کہ سید صاحب لمبی تعطیل گزار کر یورپ سے تشریف لا رہے تھے اور اُن کے اعزاز میں اکان کالج نے ڈنر

کو زندگی یہاں زیادہ بھرپور، مکمل اور ہمہ جہتی نظر آتی تھی گیا کالج میں رہتا تھا
اور یہاں درس و تدریس کا کام یا ادبی دلچسپی ہمدرد تھے۔ رفقائے کار قدردان
اور طلبا قدرشناس۔ پھر اور کیا چاہئے۔ اس سے زیادہ کی کبھی ہوس ہی نہ کی۔

[illegible] ایک دام [illegible]
کا سوال ہے۔ بلکہ ایک [illegible]
حیثیت رکھتا ہے اور شاید [illegible]

---

کا اہتمام کیا تھا میرے مخلص کرم فرماؤں میں مرحوم عبدالعزیز پوری صاحب نے اصرار کیا کہ اس تقریب مسعود پر نظم ضرور ہونا چاہئے۔ بھی حاذق صاحب نے فرمایا کہ میں خوش الحانی کے ساتھ مینٹا دائز سے پڑھ دوں گا۔ میں کہ بڑے لوگوں کے یہاں حاضر باشی اور معزز مہمانوں کی آمد پر قصیدہ نگاری خلاف وضع سمجھتا تھا اور اب بھی سمجھتا ہوں عذر کرنے لگا۔ بالآخر اُن کا اصرار میرے انکار پر غالب آیا اور میں نے ارتجالاً غالب کی زمین میں فارسی کے چند اشعار بطور تہنیت و تبریک لکھ لئے جب شب کو مجمع حضار میں پڑھے گئے تو سب نے بے حد پسند کئے اور سید راس مسعود کمال درجہ متاثر ہوئے۔ چنانچہ نظم کے اختتام پر مجھے طلب کیا اور نہایت اخلاق سے پرسش حال کر کے فرمایا کہ مجھ سے ملتے رہنا۔ مرحوم کی عادت تھی کہ جب کسی نئے شخص سے ملتے تو اس کا امتحان ضرور لیتے اور اس خوبی کے ساتھ کہ پتہ نہ چلتا کہ امتحان ہو رہا ہے میں جب پہلی بار کوٹھی پر حاضر ہوا تو یاد ہے کہ انہوں نے مجھ سے غالب کا حسب ذیل شعر دریافت فرمایا۔

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیٔ جا کا
گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

جب میں نے صحیح مطلب بتایا تو بہت محظوظ ہوئے۔ اُن کے ذہن میں اُردو کلاسیکل لٹریچر کو مغربی GET UP کے ساتھ ارزاں قیمت پر گھر گھر پھیلانے کی اور ملک کے گوشے گوشے سے نوادر کتب لاکر علی گڑھ میں جمع کرنے کی ایک بڑی اسکیم تھی جس کو ظاہر کر کے فرمایا کہ آیا تم اس میں مجھے مدد دے سکتے ہو میں نے عرض کی کہ جہاں تک میرے امکان میں ہے حاضر ہوں افسوس کہ ان کی عمر نے وفا نہ کی اور یہ اسکیم قول سے فعل میں نہ آسکی۔ وہ علی گڑھ سے بددل ہو کر بھوپال تشریف لے گئے، اور وہیں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

راس مسعود کے علی گڑھ چھوڑنے پر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد جو پہلے پرو وائس چانسلر رہ چکے تھے۔ وائس چانسلر منتخب ہوئے۔ اگرچہ راس مسعود اور ڈاکٹر صاحب میں نظریاتی اختلاف تھا مگر ڈاکٹر صاحب کے دماغ کی رسائی، معاملہ فہمی اور کارگذاری میں کوئی شبہ نہ تھا۔ وہ ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور غریب طلبہ کی مشکلات خوب سمجھتے تھے۔ وہ علی گڑھ کو ہر لحاظ سے [illegible] ہے کہ علی گڑھ پروفیسر [illegible] والوں کا TACT (مردم شناسی) مسلم ہے۔ ڈاکٹر صاحب TACT کا کامل نمونہ تھے۔ TACT کا ایک قصہ یاد آیا جو ایک [illegible] سے بیان فرمایا تھا۔ کہنے لگے کہ ایک مرتبہ کسی سرکاری [illegible] کے سر پرست سوا دو اعلیٰ انگریز عہدہ دار بھی تھے۔ قیام کہیں [illegible] ہوئے ڈاک بنگلے اور ایک لیڈر سے [illegible] ایک ساتھی سے کہا۔

ڈاکٹر! اس وقت چائے کی سخت طلب ہے۔ تم کہا کرتے ہو کہ علی گڑھ والے بڑے Tactful ہوتے ہیں اگر چائے پلا دو تو جانیں۔ میں نے جواب دیا ٹھہریے سب انتظام ہوا جاتا ہے۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ چپراسی نے خبر دی کہ کوئی صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ بلایا تو معلوم ہوا کہ علاقے کے تحصیلدار ہیں اور ہم لوگوں کی آمد کی خبر اخبار میں پڑھ کر کئی میل سے ملاقات کے لئے آئے ہیں۔ یہ کسی زمانے میں علی گڑھ میں طالب علم رہے تھے۔ میں نے اُن سے پوچھا کیا یہاں چائے کا بندوبست ممکن ہے۔ بولے۔ جی میں لیتا آیا ہوں۔ ذرا دیر میں میز ناشتے کے سامان، مکھن، توس، کیک اور پھلوں سے بھر گئی۔ میں نے دونوں ساتھیوں کو آوازیں دی اور وہ یہ لوازم دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ ڈاکٹر صاحب پر لوگ اعتراضات بھی کرتے تھے لیکن اعتراض کے ساتھ ہی اُن کے دو وصفوں کا اعتراف بھی کرتے تھے یعنی اپنے مخالفوں کو بھی نقصان نہ پہونچانا اور علی گڑھ چھوڑنے سے پہلے کے زمانۂ قیام میں فرزندانِ درسگاہ کے کام آنا اکثر دیکھا گیا ہے کہ [illegible] اور فوراً نیز لباس تبدیل کئے اپنے دفتر میں بیٹھ کر [illegible] ہو گئی کہ گھر کے اندر بیوی پر سکرات کا عالم ہے اور وہ باہر دفتر میں [illegible] میں کسی آنے والے معزز مہمان کی پذیرائی کے لئے ہدایات دے رہے ہیں۔ سرشاہ سلیمان کی وائس چانسلری کا دور بھی [illegible] اوصاف کے حامل تھے جو کسی قوم کے لئے بھی باعث نازش ہو سکتے ہیں۔ قانون، ریاضی، سائنس عربی اور اُردو میں اُن کی [illegible] دماغ اور

خریب سمارا بنے امیر زادے سے تہذیب زادے متوسط طبقہ اور غریب ہر
طبقے سے لڑکے تھے۔ مگر سب کی فطرت جدا، مزاج جدا، طبیعت جدا،
ضرورت جدا، تاہم سب سے بڑے خلوص کا جواب خلوص سے دیتے تھے۔ بلکہ ایسا
ہوتا کہ وہ لوگ اپنی ضروریات بیان کرتے یا اپنی ذاتی مشکلات میں مشورہ
لینے کے لئے میرے مکان پر آتے ہیں اور میں اپنی تمام مصروفیات چھوڑ

---

کر بات اس قدر محبت سے کام کرتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔ ادھر آپ نے اپنی بات تمام نہیں کی اُدھر انہوں نے آپ کا مافی الضمیر سمجھ کر جواب دینا شروع کر دیا۔ بے مثال قابلیت اور اعلیٰ دنیاوی اعزاز کے باوجود وہ اسلامیت، مشرقیت اور کسر نفسی کا مکمل نمونہ تھے۔ مشہور ہے کہ جب وہ بیرسٹر ہو کر ولایت سے آئے اور اپنے والد صاحب کی خدمت میں الٰہ آباد حاضر ہوئے تو لوگوں نے دیکھا کہ جب والد صاحب کے سامنے گئے تو انہوں نے کمال ادب سے ان کی نعلین اٹھا کر سامنے رکھ دیں۔ یہ دیکھ کر والد نے اسی وقت ان کے روشن مستقبل کی پیش گوئی کر دی۔ چنانچہ وہ جوڈیشل سروس کے اونچے سے اونچے مناصب پر سرفراز ہوئے۔ علی گڑھ کی وائس چانسلری کے زمانے میں وہ دہلی سے ہر ہفتے میں دو دن کو تشریف لاتے اور اپنے سفر اور قیام کے مصارف کا بار خود اٹھاتے۔ حتیٰ کہ ڈائننگ ہال کے کھانے کے دام اپنی جیب سے دیتے اور رات کو کونسل کے کمرے میں آرام کر لیتے۔ نواب اسمٰعیل خاں ایک بھاری بھرکم پُر وقار شخصیت والے وائس چانسلر تھے مگر وہ زیادہ دنوں تک وائس چانسلر نہ رہ سکے۔ اُن کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین آئے۔

ذاکر صاحب جس بلند و بالا شخصیت کے مالک اور دل و دماغ کی جن عظیم صلاحیتوں کے جامع تھے اس سے ایک دنیا واقف ہے۔ لیکن صحت کے روز افزوں انحطاط نے مجبور کر کے علی گڑھ چھوڑنے پر مجبور کیا اور بعد کو حکومت ہند کے اصرار نے ان کو اپنی جانب کھینچ لیا۔ جہاں گورنری نیابت اور صدارت اُن کی پذیرائی کی منتظر تھیں۔ زیدی صاحب ڈاکٹر ذاکر حسین کے نقش قدم پر چلے اور خاصے کامیاب رہے۔ اُن کے بعد بدرالدین طیب جی کا زمانہ آیا اور علی گڑھ کے لئے نئی بشارت لایا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ ایک آئی سی ایس یہاں کیا کامیاب ہو گا مگر طیب جی نے اپنی بے لاگ، گہری مدبرانہ، اور ہمدردانہ روش سے اس طرح کام کیا کہ علی گڑھ والے اُن کو آج تک محبت اور عزت سے یاد کرتے ہیں۔

پانچ چھ سات گھنٹوں تک اُن کے کام میں منہمک رہا ہوں حقیقت یہ ہے کہ اس عظیم قومی درس گاہ کو محض اینٹ اور چونے کی عمارت تصور کرنا بڑی غلطی ہوگی۔ یہ سرسید اور اُن کے لائق رفقاء[2] کے خوابوں کی تعبیر ہے۔

یہ وہ درس گاہ ہے جس نے ہر زمانے میں بڑے بڑے مردان کار پیدا کئے۔ آفتاب احمد خاں، سید طفیل احمد، میر ولایت حسین اور حبیب اللہ جیسے فدایان ملت۔ ڈاکٹر ضیاء الدین، ڈاکٹر ولی محمد، ڈاکٹر عبدالحق، مولوی عزیز مرزا جیسے فاضل، محمد علی برادران، رفیع احمد قدوائی، راجہ مہندر پرتاپ، خواجہ غلام الثقلین، سر رضا علی، ڈاکٹر محمود، خواجہ عبدالمجید، سابق صدر پاکستان محمد ایوب، شیخ عبداللہ، عبدالرب نشتر، نواب صاحب بھوپال جیسے ممتاز رہنما۔ ڈاکٹر ذاکر حسین۔ غلام السیدین اور عبداللہ جیسے ماہرین تعلیم۔ مولانا ظفر علی، میر محفوظ علی۔ قاضی عبدالغفار۔ مولوی عنایت اللہ۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری۔ سجاد حیدر۔ سلطان حیدر۔ جوش۔ محمد ناظر۔ حسرت موہانی، فانی بدایونی جیسے کاملان ادب و شعراسی کی آغوش کے تربیت یافتہ ہیں۔ یہ وہ درس گاہ ہے جس کو ایشیا[3] میں مسلمانوں کا سب سے بڑا قومی و ثقافتی مرکز کہنا چاہئے۔ یہ دراصل سرسید کی علی گڑھ تحریک کا سب سے بڑا مظہر ہے۔

سرسید نے کن حالات کے تحت اس تحریک کی بنا ڈالی اُس کی تفصیل میں جانے کا نہ وقت ہے نہ ضرورت۔ کیونکہ سرسید کے سوانح اور درس گاہ کی تاریخ پر لکھنے والوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ البتہ اتنا یاد رکھنا چاہئے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکام رہنے کے بعد قوم کا حال سراسر تباہ تھا اور اُس کا مستقبل تمام تر تاریک نظر آتا تھا۔ بالکل یہ کیفیت تھی جیسے گھٹا ٹوپ اندھیرا چھائی ہو، بجلی چمک رہی ہو، بادل گرج رہے ہوں، سمندر میں طوفان برپا ہو اور ایک شکستہ کشتی بھنور میں پھنس گئی ہو۔ ؎

شب تاریک و بیم موج و گردابے چنیں ہائل

---

[1] انہیں مخلصانہ تعلقات کا اثر ہے کہ اب بھی اس زمانے کے طلبہ جو اکثر بفضلہ اعلیٰ مناصب علم و عمل پر فائز ہیں جب مل جاتے ہیں تو انتہائی ارادت سے پیش آتے ہیں۔ [2] سید کے رفقاء میں چراغ علی، سمیع اللہ خاں، محسن الملک، وقار الملک، زین العابدین، نذیر احمد۔ ذکاء اللہ، حالی، شبلی، مشہور ہیں جن کو نورتن کہا جائے تو بجا ہے۔ [3] ایشیا کی قید اس لئے لگائی کہ افریقہ میں جامع ازہر مسلمانوں کا سب سے بڑا علمی مرکز ہے۔

سکتی ہے ایسی حالت میں کشتی اور اُس کے ملاح پر جو کچھ گزرتی ہوگی سبکساران ساحل اسس کا کیا اندازہ کر سکتے ہیں۔ یہ کشتی ملت کی کشتی تھی اور یہ ملاح سرسید۔

سرسید نے ۱۸۵۷ء کی شورش کے تباہ کن اثرات بچشم خود دیکھے یوں تو تمام ہندوستانیوں کو ناکامی کا خمیازہ اٹھانا پڑا مگر مسلمان خاص طور سے انگریز کے انتقامی جوش کا نشانہ بنے کیونکہ ہر چند ہندو مسلمانوں کی شورش کا واحد مقصد حکومت مغلیہ کے اقتدار کو بحال کرنا تھا۔ ادھر انگریز حاکم مسلمانوں سے نفرت، ادھر مسلمانوں کو انگریزوں سے وحشت۔ اس کے علاوہ انہوں نے اندازہ کیا کہ مسلمان مذہب کی جگہ توہمات میں گھرے ہوئے ہیں، جدید تعلیم کو کفر سمجھتے ہیں ادب میں تکلف اور لایعنی خیالات کے عادی ہیں، سیاست سے بیگانے اور بیہودہ رسموں کے دلدادہ ہیں اس لئے انہوں نے طے کیا کہ ان کو مذہب، تعلیم، ادب، سیاست اور سماج کے جدید عملی حقائق سے روشناس کیا جائے اسی تحریک کا ایک مظہر ایم اے او کالج تھا جو اب خدا کے فضل سے یونیورسٹی بن چکا ہے۔ اس پر قوم کی طرف سے جس قدر ان کی مخالفت ہوئی اس سے کون ناواقف ہے۔ ان امور کی تفصیل یہاں غیر ضروری ہے۔ البتہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان کے بارے میں جو چند غلط فہمیاں ہیں ان کی طرف اشارہ کر دیا جائے۔

کہا جاتا ہے کہ ان کا مطمع نظر صرف یہ تھا کہ مسلمانوں کو بڑے بڑے عہدے مل جائیں۔ ہمارے خیال میں معترض حضرات نے یا تو حقیقت کو سمجھا نہیں یا سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے اسٹریچی ہال کا سنگ بنیاد رکھے جانے کے وقت لارڈ لٹن سے صاف کہا تھا کہ "مجھے اُمید ہے کہ یہ پودا کبھی درخت بن جائے گا جس کی شاخیں برگد کی طرح دُور دُور پھیلیں گی اور یہاں سے فارغ ہونے والے ملک کے طول و عرض میں آزاد تحقیق رواداری اور اخلاق کا پیام پہونچائیں گے"۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کو غلامی کا سبق پڑھایا۔ لیکن اعتراض کرنے والے ان کی کتاب "اسباب بغاوت ہند" دیکھ لیتے تو ایسا کہنے کی جرأت نہ کرتے۔

کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ہندو مسلم تفرقہ کا بیج بویا۔ مگر یہ الزام بھی عدم واقفیت پر مبنی ہے۔ خود سرسید رقم طراز ہیں: "میں نے بار بار کہا ہے اور پھر کہتا ہوں کہ ہندوستان ایک دُلہن کی مانند ہے جس کی خوبصورت اور رسیلی دو آنکھیں ہندو اور مسلمان ہیں۔ اگر وہ دونوں آپس میں نفاق رکھیں گے تو وہ پیاری دلہن بھینگی ہو جائے گی"۔

میرے زمانے میں جو اساتذہ [illegible] کی ہستی کسی یونیورسٹی کے لئے [illegible] حبیب۔ تعلیمات میں پروفیسر حبیب الرحمٰن [illegible] ڈاکٹر [illegible] معاشیات میں ڈاکٹر ای کے صدیق [illegible] ڈاکٹر [illegible] خاں، شعبہ دینیات میں مولانا سلیمان اشرف [illegible] میں مولانا معین، اردو میں پروفیسر رشید احمد صدیقی اور مولانا احسن مارہروی وغیرہم کے علمی و عملی کمالات کے بیان کے لئے ایک دفتر چاہئے مگر بخوف طوالت چھوڑتا ہوں۔ البتہ یہ نہیں ہو سکتا کہ اپنے شعبے (فارسی) کے ذکر کے بارے میں چند جملے کہے بغیر گزر جاؤں۔ شعبہ فارسی کے صدر ڈاکٹر ہادی حسن تھے جن کو قدرت نے غیر معمولی ذہن اور حافظہ عطا کیا تھا۔ خوش قد، خوش رو، خندہ پیشانی کہ بات کریں تو منہ سے پھول جھڑیں۔ [illegible] کہنے پر آئیں تو روتوں کو ہنسائیں۔ جب وہ اسپیچ دیتے تھے تو ہزاروں کے مجمع پر مکمل سکوت چھا جاتا تھا ―――― وہی کسی نے کہا ہے: "کسی کی آنکھ میں جادو تری زبان میں ہے۔" شاید ان میں دونوں باتیں تھیں۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ جب وہ انگریزی میں تقریر ختم کر چکے تو فاضل صدر جلسہ مسٹر ریڈیاٹ پرو وائس چانسلر نے اعتراف کیا I can not express myself so beautifully as Dr. Hadi Hasan has done اسی طرح جب وہ فارسی میں گل افشانی گفتار پر آتے تو اچھے اچھے ایرانی [illegible] تصویر حیرت بن جاتے۔ یونیورسٹی میڈیکل کالج کے لئے قوم سے پچاس لاکھ کی رقم وصول کر لینا ڈاکٹر ضیاء الدین کی کوشش اور ڈاکٹر ہادی حسن کی [illegible] کا ثمرہ تھا۔ ہادی صاحب کی موت تمام احباب کے لئے ایک سانحہ تھی۔

شعبے کے دوسرے اُستاد [illegible] حمید الدین خاں تھے۔ جو بفضلہ بقید حیات ہیں۔ وہ [illegible] وقت کے اتنے پابند اور اصول کے اتنے سخت [illegible]

---

ف میں سید صاحب کی [illegible]

ہو [illegible] آخر اللہ [illegible] آخر اللہ کر پانچ منٹ
[illegible] پشت [illegible] جادہ جا۔ نہایت
[illegible] مزاجی پر محمول کرتے
ہیں۔ [illegible] ہوں۔ یاد [illegible] وقت انشاء کے
[illegible] دوستوں کے دو سب ساتھیوں پر شفیق
[illegible] کے عام
ماحول [illegible] کے پاس [illegible] نہیں کیا۔ مجھے خود
[illegible] بات نکل چلی آئی ورنہ
[illegible] علی گڑھ کی فضا بے تعصبی
میں اور اس کے طلبہ امن پسندی میں مثالی حیثیت کے مالک ہیں۔ شروع سے
علی گڑھ کے دروازے بغیر امتیازِ مذہب و قوم ہر ایک کے لیے کھلے رہے ہیں
شاید لوگوں کو یہ معلوم ہو کر تعجب ہوگا کہ ایم اے او کالج کے سب سے پہلے
گریجویٹ بابو ایشوری پرشاد ساکن ضلع علی گڑھ تھے۔ وہاں کے طویل زمانہ
قیام میں میں نے اساتذہ کو بھی پرکھا اور طلبہ کو بھی پرکھا۔ لیکن بات چیت میں۔
بیٹھکوں میں، مل کر رکھاؤ میں کبھی یہ سوال نہیں اُٹھا کہ فلاں مسلمان ہے اور فلاں
ہندو یا عمرو سنی ہے اور زید شیعہ۔ غور کیجیے تو یہ بڑی بات ہے۔ جبکہ عیدین میں
جب اہلسنت کا جمِ غفیر دوگانہ پڑھ کر مسجد سے باہر آتا ہے اور شیعہ حضرات
نماز کے لیے داخل ہوتے ہیں تو وہ دیکھنا نظر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔

یہ ہر جگہ نوجوانوں کی قانون شکنی حد سے تجاوز کر چکی ہے۔ علی گڑھ والوں کا ڈسپلن
ضرب المثل ہو گیا ہے۔ اشتعالی صورتیں کہاں نہیں ہوتیں لیکن فیصلہ سوادِ اعظم کو دیکھ کر کیا
جاتا ہے۔ ہمیں یاد ہے کہ جب گاندھی جی اور علی برادران نے ترکِ موالات
فیصلہ کیا جب یورپ نے ترکی کے مردِ بیمار کا خاتمہ کرنا چاہا جب بہار اور
ٹہ میں قیامت خیز زلزلہ آیا جب علی گڑھ میں سیلاب نے ستم ڈھایا تو یہی
گڑھ کے فرزند تھے جو خدمتِ خلق کے جذبے سے سرشار اور سرفروشی کو
ار ہو گئے۔ آخر میں شاعر کا ہم نوا ہو کر مجھے یہی کہنا پڑتا ہے کہ

دارم دلے ز آبگینہ نازک نہاد تر
آہستہ پا بنہ کہ سرِ خار نازک است (غالب)

# دل بلی

واہی

چلتے چلتے دفعتاً پٹری بدلنے کا چلن ÷ ہے سیاست کے قلابازوں کا ایک مشہور فن
فائدہ ہوتا ہے وقتی طور پر اس کھیل میں ÷ گو ثقہ حضرات کہتے ہیں اسے بھٹیارپن
شاعروں نے بھی اسے اپنا لیا ہے آج کل ÷ کارآمد دیکھ کر یہ نسخۂ آہن شکن
ہو رہا ہے اس قدر مقبول یہ نسخہ کہ اب ÷ دل بدلتے رہتے ہیں دن رات اربابِ سخن
نت نیا بہروپ لازم ہے پئے اظہارِ ذات ÷ جب نظر کے سامنے ہو فن برائے مکر و فن
وہ زمانہ جبکہ بزمِ شعر تھی اک رزم گاہ ÷ چھوڑ دی تھی ہر نئے شاعر نے رفتارِ کہن
گھولتے رہتے تھے وہ حضرات جامِ شعر میں ÷ نغمۂ بلبل کے بدلے شورشِ دار و رسن
ہوٹلوں میں بیٹھ کر ہوتا تھا ذکرِ انقلاب ÷ اپنے سر باندھے رہتے تھے تخیل میں کفن
اُن میں کچھ لیڈر صفت تھے اور کچھ والنٹیر ÷ جھنڈے میں سُرخا گئے جس طرح اہلِ زاغ و زغن

نعرہ بازی میں اگر ہوتے تھے لیڈر پاؤ سیر
اُن کے ہر والنٹیر کا وزن ہوتا ڈیڑھ من

رفتہ رفتہ شور و غوغائے سخن کا جب تھما ÷ ڈھل گیا جب ماہِ نخشب میں حوادث کا گہن
آ گئے کچھ اور کرتب باز، بزمِ شعر میں ÷ اک ذرا سا جانتے تھے جو گرہ بندی کا فن
سونگھ کر موسم کی بُو، اور رُخ ہوا کا دیکھ کر ÷ کینچلی بدلی ہر اک والنٹیر نے دفعتاً
صبحدم دیکھا تو ٹیڈی سوٹ میں ملبوس ہیں ÷ پھینک کر چکے ہیں اپنا انقلابی پیرہن
سر کے بالوں کی سفیدی ہو گئی غرقِ خضاب ÷ تہہ بہ تہہ غازہ لگا کر دور کی رُخ کی شکن
شاعری کی عمر تھی گو بیس یا پچیس سال ÷ لیکن اپنے فن میں بالقصد لائے بالپن
کر دیا بہرِ صدارت پیش اپنے آپ کو ÷ جب بنائی چند نومشقوں نے کوئی انجمن
اس طرح مشق پیشہ کرتے کرتے یہ والنٹیر ÷ بن گئے اب خام ذہنوں کے امامِ فکر و فن

اُن کا مقصد ہے اگر کچھ تو حصولِ منفعت
انقلابی شاعری ہو یا معانیِ سخن

کشمیری کہانی

# مغلی عفارا

علی محمد لون

لاتھر آج مرگیا

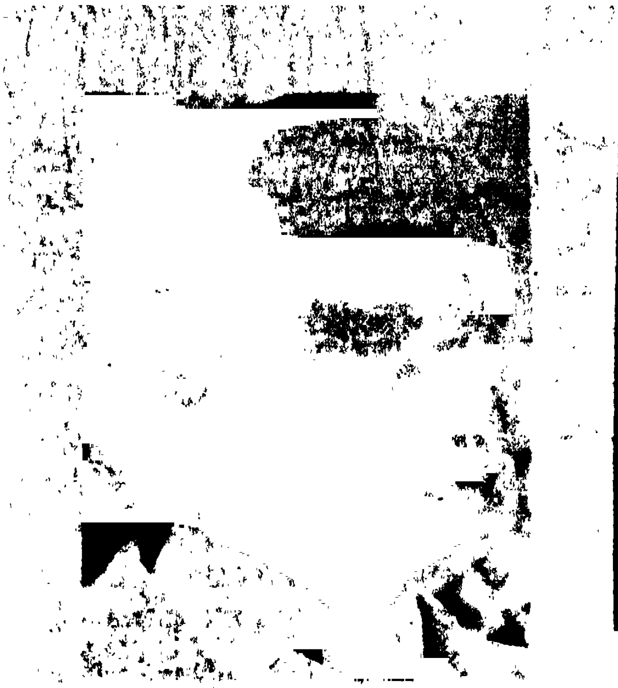
سلطان سوداگر اور محمد وطوائی اُس کے جنازے میں شامل تھے۔ سلطان سوداگر کی پگڑی اُسی کے سر پر بڑی ڈھیلی ڈھیلی سی لگ رہی تھی۔ محمد وطوائی کے سارے بال سفید ہو چکے تھے اور اُس کی کمر دوہری ہو گئی تھی۔ میں نے سلطان سوداگر سے لاتھر کی موت کا سبب پوچھا۔ تو وہ بولا۔

" میرے عفارا کی آہ لے ڈوبی اِسے "

یہ سن کر میں نے محمد وطوائی کی طرف دیکھا۔ جیسے اُس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ بات کیا ہوئی۔ اُس نے بھی یہی جواب دیا۔

" میرے عفارا کی آہ لے ڈوبی اِسے "

عفارا سلطان سوداگر کا تھا یا محمد وطوائی کا۔ اس بات کا فیصلہ میں آج بھی نہ کر سکا اور اُن دنوں بھی نہیں کر سکا تھا جب عفارا ہمارے محلے کے بازار میں شیر کی طرح دہاڑا کرتا تھا اور سب اِس سے خوف کھایا کرتے تھے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب کشمیر پر قبائلیوں نے ہلّہ بول دیا تھا اور کشمیریوں کو مغل بادشاہوں کی غلامی کے بعد پہلی بار بندوق اُٹھانے کا موقع ملا تھا۔ معمولی فوجی تربیت حاصل کرنے کے بعد کشمیری سپاہیوں کی چھوٹی بڑی ٹولیاں محاذِ جنگ پر جاتی تھیں اور ہندوستانی سپاہیوں کے شانہ بہ شانہ ملک کے بچاؤ میں شامل ہوتی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ملک کے اس حصے کا نظامِ حکومت اور عام لوگوں کی روزمرہ زندگی ایک شدید بحران کا شکار تھی۔ حملہ آوروں کو



شکست دینے کا کام تدریجی طور پر کیا جاتا تھا اور اس کے بعد دوسرے مسئلوں کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ حالات اس حد تک بگڑے ہوئے تھے کہ کئی معاملوں میں نراجیت کا سا احساس ہوتا تھا کوئی کسی کا پرسانِ حال نہ رہا تھا اس لیے جو سپاہی محاذوں سے گھروں کو لوٹ آتے وہ اپنے ہتھیار ساتھ ہی لایا کرتے تھے۔ تھری ناٹ تھری کی رائفلیں کندھوں سے لٹکائے اور کالے کالے فوجی جوتے پہنے ہوئے یہ لوگ گلیوں اور بازاروں میں شور مچاتے ہوئے گزرا کرتے تھے۔ گلی کوچوں اور بازاروں میں فوجیوں کا یوں گزرنا ہی دراصل اس کہانی کو جنم دینے کا ذمہ دار ہے۔

معلوم نہیں ملک کے دوسرے حصوں میں پلنے والے عام کتوں کا کیا عالم ہے۔ لیکن اپنے یہاں کے عام یا بازاری کتوں کی ایک بُری عادت یہ رہی ہے کہ وہ ہمیشہ موٹر سائیکل اور سپاہیوں کے پیچھے بھونکتے ہوئے دوڑتے ہیں۔ آج بھی ایسا ہوتا ہے اور شاید ہمیشہ ایسا ہوتا رہے گا۔ قبائلی حملے کے دنوں میں بھی ایسا ہی ہوا۔ محاذوں سے واپس آنے والے سپاہی کتوں کی اس عادت سے واقف تھے اس لیے وہ ہر کتے کو اپنی گولی کا نشانہ بنایا کرتے جو ان پر بھونکتا تھا۔ کتوں نے یہ صورتِ حال دیکھ لی تو وہ کچھ دیر سپاہیوں سے دُور دُور ہی رہنے لگے۔ لیکن اب سپاہیوں کو کتوں کے شکار کرنے کا چسکہ پڑ چکا تھا اور وہ اس تاک میں لگے رہتے

تھے کہ کب کوئی آوارہ کتا سامنے سے گزرے اور وہ اُسے گولی کا نشانہ بنا دیں۔ اکثر ایسا ہی ہوا کرتا تھا کہ یہ سپاہی دکانوں کے سامنے، گلی کے نکڑ پر، انگنوں میں سوئے ہوئے کتوں کو ٹھوکریں مار مار کر جگایا کرتے اور اس سے پہلے کہ کتا اچھا خاصا بھونکتا گولی اس کے اندر چلی جاتی اور چیخ کے نکلنے سے پہلے ہی بے چارے کی جان نکل جاتی۔

مگر مغلی اور عفارا سپاہیوں کی ذرا بھر بھی پروا نہ کرتے۔ اس لئے نہیں کہ وہ کوئی اونچی ذات کے کتے تھے۔ یا اس لئے بھی نہیں کہ وہ کسی بڑے آدمی کے پالتو تھے۔ وہ دونوں بالکل بازاری کتے تھے، نیچی ذات کے۔ لیکن سلطان سوداگر اور محمد و حلوائی کے پیار، دلار کی وجہ سے وہ بیچارے بازار کے مشہور اور جانے پہچانے کتے تھے جس طرح معمولی تربیت پانے کے بعد ہمارے سپاہی بڑے بھروسے اور اعتماد کے ساتھ محاذوں پر لڑنے جاتے تھے اس طرح سلطان سوداگر اور محمد و حلوائی کی دیکھ بھال اور محبت سے ان کتوں کو بھی اپنے آپ پر ایک اعتماد سا پیدا ہوا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ عام بازاری کتوں کی نسبت زیادہ باتمیز اور عقلمند بھی تھے۔ اس عقل اور تمیز کی بدولت یہ جانتے تھے کہ سپاہی ان کو چھیڑنے کی جرأت نہیں کریں گے۔ بازار کے دو لڑاکو دکاندار ان کے مالک تھے اور ان ہی کے برتے پر یہ جہاں بھی اور جدھر بھی جس سپاہی کو بازار میں چلتا دیکھتے، آگا پیچھا دیکھے بغیر اس پر بھونکتے اور اُسے بھگانے میں ایک نامعلوم سی حیوانی خوشی محسوس کرتے۔ سپاہی بھی اس بات سے باخبر تھے اس لئے وہ بھی چُپ رہتے اور کوئی خاص قدم نہ اٹھانے میں ہی خیریت سمجھتے تھے۔ انہوں نے کبھی بھی مغلی عفارا کو چھیڑنے کی ہمت نہ کی کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ سلطان سوداگر اور محمد و حلوائی کی موجودگی میں ایسا کرنا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے برابر ہوگا۔ اور پھر سارے بازار کے دکاندار اور آوارہ لڑکے سلطان سوداگر اور محمد و حلوائی کی دیکھا دیکھی اُلٹا سپاہیوں کو ہی اپنے طنز و مزاح کا شکار بنا دیتے۔ مغلی اور عفارا جیسے اس بات کو پوری طرح جانتے تھے۔ اس لئے وہ میاں بیوی اپنی دموں کو اوپر اٹھائے سارے بازار میں اس طرح گھوما کرتے تھے جیسے کہ اس بازار کی ساری زینت انہی کے دم قدم سے تھی۔

لیکن وجہ صرف اتنی ہی نہ تھی کہ سلطان سوداگر محمد و حلوائی اور بازار والوں کو ان کتوں سے بہت زیادہ اُنس تھا۔ اس کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ قبائلی حملہ سے ہی جو اُتھل پُتھل واقع ہوئی، اُس میں ہمارے سماج کے سبھی طبقوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا لیکن پسماندہ طبقہ کے جوان اور نوجوان خاص طور پر دوسروں کی نسبت زیادہ دلجمعی اور بھروسے کے ساتھ نئے حالات کا ساتھ دیتے رہے کم از کم ہمارے محلے میں تو یہی صورت حال تھی۔ شروع شروع میں تو سبھی لوگ حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کے لئے کمربستہ ہو کر اُٹھے لیکن جوں ہی حالات ذرا سازگار ہونے لگے تو پڑھے لکھے اور کاروباری لوگ واپس اپنی اپنی سابقہ جگہوں اور کام پر چلے گئے۔ روزگار اور تعلیم کے ذرائع سے محروم طبقے کے نوجوان دلجمعی کے ساتھ فوج میں برابر شامل ہونے گئے اور سچ تو یہ ہے کہ پہلے پہل بھی اسی طبقہ کے نوجوان محاذوں پر زیادہ کامیاب رہے تھے۔ ہمارے محلے ہی کی مثال لیجئے۔ رحمان ہمارے محلے کے چماروں کا لڑکا تھا لیکن اس کا نشانہ کبھی خطا نہ ہوتا تھا۔ چالیس گز کی دوری سے کانٹے دار تار کو نشانہ بناتا اور اُس کے دو ٹکڑے کر کے چھوڑ دیتا۔ اس طرح کمہاروں کا جمال کسی گھڑا کے اندر چراغ جلا کر گھڑا کے دہانے سے باہر اس کو نشانہ بناتا اور گولی کی آواز نکلنے کے ساتھ ہی چراغ بجھ جاتا۔ اس کے مقابلے میں لاتھر پڑھا لکھا بھی تھا، اور اچھے گھرانے کا بھی۔ لیکن اس کا نشانہ ٹھیک نہ تھا سلطان سوداگر اکثر اُس کے نشانے کے بارے میں کہتا تھا۔

"ارے کس کی بات کرتے ہو؟ یہ تو دو گز کی دوری سے ہاتھی کو بھی نشانہ نہیں بنا سکتا۔"

خیر یہ تو بات ہی سے بات نکل آئی تھی۔ بات دراصل یہ تھی کہ سپاہیوں میں اکثر جوان پسماندہ ذاتوں اور طبقوں سے تعلق رکھتے تھے اس لئے بھی لوگ اُن کی کوئی خاص قدر نہ کرتے تھے۔ سپاہی بھی اس بات سے واقف تھے اور اس لئے بھی وہ مغلی اور عفارا کو چھیڑنے کی جرأت نہ کرتے لیکن لاتھر اس لحاظ سے کسی سے کم تر نہ تھا اس لئے وہ کسی کی پروا نہ کیا کرتا تھا۔

لاتھر کا وہ نام نہ تھا جو کہ لوگوں نے مشہور کر رکھا تھا اس کا اصلی نام حبیب جان تھا۔ وہ لیفٹننٹ لاتھر کیسے بن گیا۔ وہ ابعد میں پتہ چلے گا۔ وہ شکل و صورت سے خاصا خوبصورت تھا۔ گلابی رنگ تھا اُس کے چہرے

بالکل صاف شفاف [illegible] اور بال کسی حد تک بھورے۔ قد
سا تھا اس نے جب [illegible] فوجی وردی پہنی تو [illegible] بالکل
لا گورا سا نظر آنے [illegible] جیسے کہ تازہ تازہ ولایت سے
ہو۔ سلطان سوداگر اور محمد و حلوائی نے اسے ایک دن جو فوجی وردی
سے گزرتے دیکھا تو وہ ایک دوسرے کو آنکھ مارنے لگے سلطان
نے محمد و حلوائی سے پوچھا۔
ارے یہ کون لاتھر صاحب آیا ہے ادھر؟"
بھئی یہ تو اپنا حبیب جان ہے۔"
کون یہ؟ یہ حبیب جان ہے؟"
سلطان سوداگر کو یقین نہ آیا۔ اس نے ایک بار پھر حبیب جان کو سر
تا نکھ دیکھا لیکن حبیب جان تو اتنا اکڑا ہوا جا رہا تھا کہ اس نے
سوداگر کی طرف دیکھنا گوارا نہ کیا اور چھاتی تان کے ناک کی
سیدھ چلا گیا۔ اس کی خوش قسمتی یہ تھی کہ اس وقت منگلی اور معارا وہاں
نہ سلطان سوداگر اور محمد و حلوائی حبیب جان کو چھٹی کا دودھ یاد
سلطان سوداگر پیچ و تاب کھانے اور ہاتھ کاٹنے لگا۔ اس نے
سے کہا۔
محمد و دیکھا۔ اس نے تو میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔"
کیسے دیکھتا سلطان۔ یہ تو سوچتا ہوگا کہ بندوق اٹھائی اور بڑا

افسوس تو یہ ہے کہ منگلی معارا اس وقت یہاں نہیں ہیں۔ ورنہ
ر آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جاتا۔
وقت ہی بُرا آیا ہے نہیں تو کل تک کوئی تھوکتا بھی نہ تھا اس پہ"
سلطان سوداگر غصے میں بل کھاتا رہا لیکن بے بسی کی حالت میں اسے
۔ ہاں اس نے اپنے دل میں ٹھان لی کہ اس سپاہی کی اکڑ فوں دور
ہے نہیں تو سلطان سوداگر کی ساری ساکھ مٹی میں مل جائے گی۔ خیر اس
س سے کچھ بھی نہ بن سکا لیکن نفرت اور حسد کے مارے اس نے زور
ی۔
شتنر لفٹین لاتھر!"
س پھر کیا تھا دو ہی دن میں حبیب جان کا نام لوگ بھول گئے اور
دہلی

وہ لیفٹنٹ لاتھر کے نام سے بدنام ہو گیا۔ حبیب جان [illegible]
پہچانا بھی گئی اور وہ کچھ چڑچڑا ہو گیا۔
ایک دن لیفٹنٹ لاتھر [illegible]
کے ساتھ اسٹین گن بھی تھی اور اس کی وردی پر ایک [illegible]
ولایتی گورا سا خوبصورت، سُندر اور سجیلا [illegible]
بجا شکوہ سیدھے اپنے گھر جا رہا تھا [illegible] اسٹین گن اور [illegible] وردی
ہمیشہ پھول کی نمائش کے لئے بازار میں آیا۔ اپنی [illegible]
کو دعوت دے سکتا ہے۔ سلطان سوداگر نے [illegible]
اُس کے منہ پر شیطانی مسکراہٹ ناچ اٹھی۔ منگلی معارا [illegible]
آپس میں کھیل رہے تھے۔ بڑا پیارا تھا اِن کا یہ کھیل۔ وہ ایک دوسرے
پر پل پڑتے، ایک دوسرے کو گراتے، یوں ہی جھوٹ موٹ [illegible]
کو کاٹتے اور دیر دیر سے غراتے تھے۔ سلطان سوداگر نے جلد ہی
لیفٹنٹ لاتھر کو اپنی دکان کے نزدیک آتے دیکھا، اس نے کتوں کو
آواز دی۔
"منگلی معارا!"
آواز سنتے ہی کتے اپنا کھیل بھول گئے۔ وہ چونک پڑے اور
اپنی دموں کو اوپر اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ سلطان سوداگر نے انہیں
شہ دی۔
"ہُش ش!"
منگلی اور معارا دونوں ایک ساتھ بھونکنے لگے اور سلطان سوداگر
اپنی دکان چھوڑ محمد و حلوائی کی دکان میں یہ کہتے کہتے گھس گیا۔
"میں نے تو اسے چڑانے کے لئے لیفٹین لاتھر کہا تھا۔ یہ تو سچ
مچ لیفٹین بن بھی گیا۔"
منگلی اور معارا بھانپ گئے کہ سلطان سوداگر نے لیفٹنٹ لاتھر
کی طرف اشارہ کیا تھا اور وہ دوڑ کر اُس کی اور [illegible]
کی طرف دوڑتا ہے۔ لاتھر نے دور سے ہی کتوں کو اپنی طرف آتے دیکھا
اُس نے کاندھے سے اسٹین گن اتاری لیکن اس سے پہلے [illegible]
پوزیشن لے کر کوئی کاروائی کرتا منگلی اور معارا دونوں ایک ساتھ اس
پر پل پڑے۔ اسٹین گن ایک طرف جا گری اور لاتھر [illegible]

بعد نہ صحیح نکلی۔

"میرے خدا - مار ڈالا"

اس پر سلطان سوداگر اور محمد و حلوائی نے زور سے قہقہہ لگایا۔ دوسرے دکان دار بھی زور زور سے ہنس پڑے۔ بچوں اور لڑکوں کی ایک چھوٹی موٹی فوج سی مغلی اور عفارا اور لاتھر کے ارد گرد حلقہ بنا کے کھڑی ہو گئی۔ خوش قسمتی سے سلارام کی دکان بند تھی اور لاتھر نے اس دکان کے تھڑے پر چھلانگ لگائی اور جب مغلی اور عفارا اُس کی ٹانگوں کو کھینچنے اور کاٹنے کی کوشش کرنے لگے تو لاتھر کے منہ سے بڑی بے ہودہ سی چیخیں بلند ہوئیں۔

"ہائے ماں، ہائے ابا۔" لاتھر کی چیخ و پکار سُن کر بازار والے کچھ شرمندہ سے ہو گئے لیکن بچوں اور لڑکوں نے زور زور سے تالیاں بجا کر آواز لگائی۔

"ہے ہے ہے ہے ہے ہے :"

بچوں کی "ہے ہے" سُن کر مغلی اور عفارا نے محسوس کیا کہ شاید کوئی تماشا ہو گیا ہے اس لئے وہ دونوں لاتھر کو چھوڑ بچوں کا حلقہ توڑ کر باہر نکل گئے اور ایک بار پھر پہلے کی طرح ایک دوسرے سے پیار کرنے میں مشغول ہو گئے۔ کتوں اور بچوں کو جانے دیجئے۔ سلطان سوداگر کو یہ احساس ہوا کہ سب ٹھیک نہیں ہوا۔ گھنڈی ہے تو کیا ہوا۔ ہے تو اپنے ہی محلے کا۔ لوگ اگر اسے اس طرح چیختے چلاتے اور ہائے ہائے کرتے سنتے تو کیا وہ بھی اپنے لئے شرمندگی بات نہ ہوتی؟ سلطان سوداگر ادھر اپنے دل میں ہی سوچ رہا تھا اور اُدھر لاتھر یکبار بولا :۔

"ہے سلطان سالے! مزا چکھاؤں گا تمہیں بھی اور تمہارے ان کتوں کو بھی"

مغلی اور عفارا نے جب لاتھر کو غصے میں بولتے ہوئے سُنا تو وہ ایک بار پھر اپنا کھیل کود بھول بھال کر لاتھر کی طرف دوڑے۔ لاتھر اپنی ایئر گن اٹھا چکا تھا۔ اس لئے اب کی بار اُسے بھاگنے ہی میں اپنی خیریت نظر آئی۔

بازار کے سبھی دکان داروں اور بچوں نے لاتھر کے یوں بھاگنے پر زور سے تالیاں بجائیں، سیٹیاں بجائیں اور ہے ہے کی آوازیں دیر تک لاتھر کا تعاقب کرتی رہیں۔ پھر اس کے بعد لاتھر جب تک گھر میں رہا۔ بازار کی طرف بھولے سے بھی نہ گزرا۔ گزرتا بھی کیسے۔ ایک طرف مغلی عفارا اُس کی جان کے دشمن، دوسری طرف سارا بازار اور پھر شیطان بچوں کی ٹولیاں۔

اُس کے بعد لاتھر وردی پر دو پھول لگائے چھٹی پر آگیا۔ مطلب یہ کہ وہ واقعی لیفٹننٹ بن گیا تھا۔ سلطان سوداگر اور محمد و حلوائی کو یہ بات ناگوار گزری اور پھر لاتھر نے اب کی بار کمربند سے پستول بھی لگا یا تھا۔ اس دن لاتھر بے دھڑک بازار میں آیا۔ مغلی اور عفارا اس وقت نہ جانے کہاں تھے۔ نہیں تو اس کی ساری اکڑ دھری کی دھری رہ جاتی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لاتھر نے پہلے ہی یہ دریافت کر لیا ہو کہ مغلی اور عفارا اس وقت سلطان سوداگر کی دکان کے سامنے نہیں ہیں۔ اس لئے وہ بڑے رعب کے ساتھ آیا اور سلطان سوداگر پر برس پڑا۔

"کہو سلطان کہاں چھپا رکھا ہے کتوں کو؟"

سچ تو یہ ہے کہ سلطان سوداگر کچھ ڈر ہی گیا۔ سوچنے لگا کہ اگر کہیں غصے میں لاتھر نے پستول نکالا اور داغ دیا تو خواہ مخواہ جان پر آ بنے گی۔ چاہے گولی نہ بھی مارے لیکن ساری اکڑ تو نکال ہی دے گا۔ اس لئے اس نے نرم لہجے میں کہا۔

"کہئے لیفٹننٹ صاحب۔ طبیعت کیسی ہے؟"

"طبیعت؟ تمہارے مطلب؟"

"لاتھر نے جل بھن کر جواب دیا۔ محمد و حلوائی نے محسوس کیا کہ سلطان سوداگر کچھ ڈر گیا ہے اس لئے اس نے اپنی دکان سے چلا کر پوچھا۔

"کیوں بے سلطان؟ تو اِس طرح رُک رُک کر بول کیوں رہا ہے؟"

"ارے نہیں تو۔ ہم بھائی آپس میں باتیں کر رہے ہیں:"

"شٹ اپ" لاتھر نے چلا کر کہا! تو اور میری برابری کرتا ہے؟ کتا کہیں کا؟"

محمد و حلوائی سے رہا نہ گیا۔ اُس نے پہلے سے بھی زیادہ زور سے آواز دی۔

"بات کیا ہے سلطان؟ یہ آدمی کا ہے کو انگریزی بگھار رہا ہے"

اب لاتھر محمد و حلوائی کی طرف مڑ گیا اور آنکھوں سے شعلے برساتا ہوا بولا:

" ابے او محمدو سالے ! تو چُپ رہ نہیں تو مار مار کے تیرا کچومر نکال دوں گا۔ تو کون ہے بیچ میں بولنے والا ؟ "

اس سے پہلے کہ محمدو حلوائی اس گالی کا جواب دیتا سلطان سوداگر نے بگڑتے ہوئے حالات کو محسوس کر کے لاتھر سے کہا۔

" دیکھئے لیفٹیننٹ صاحب۔ جانے دیجئے اب جو ہوا سو ہوا۔ ہمارے ساتھ آپ کا کیا لین دین نہیں ہے۔

" کچھ نہیں۔ لیکن تم نے اُن کمینے کتوں سے میری توہین کرائی۔"

" اچھا ان کی طرف سے میں معافی مانگتا ہوں۔ بس ؟ "

سلطان سوداگر ابھی مشکل سے معافی مانگ ہی چکا تھا کہ جانے مغلی کہاں سے آگیا اور اُس نے لاتھر کی ٹانگوں کے درمیان منہ لے جا کر آہستہ سے "عف" کی۔ لاتھر بھیری کی طرح بدک گیا اور اُس نے فوراً پستول نکال لیا اور چار قدم دُور جا کر نشانہ ٹھیک کرنے لگا۔ مغلی ایک شیرنی کی طرح سینہ تانے اُس کے سامنے کھڑی رہی۔ سلطان سوداگر اور محمدو حلوائی دونوں نے بیک وقت دکان سے چھلانگ لگائی اور وہ دونوں ایک ساتھ مغلی کے سامنے ہو گئے۔ سلطان سوداگر اب غصے میں بھنا کر بولا :

" او حبیب جان ! تجھے کس بات کا گھمنڈ ہو گیا ہے۔ کیا پستول ہاتھ میں لے کر یہ سمجھتا ہے کہ ناحق کسی کا خون کر دے گا۔ ؟ "

لاتھر نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ محمدو حلوائی زور زور سے سب کو سُناتا ہوا بولا۔

" سلطان۔ میں بھی دیکھوں۔ کس مائی کے لال میں ہمت ہے، جو ہماری مغلی پر ہاتھ اُٹھائے گا ! "

اب تو سارا بازار اُمڈ پڑا اور لاتھر کے ارد گرد لوگوں نے گھیرا ڈال دیا۔ لاتھر بھانپ گیا کہ حالات خراب ہو رہے ہیں اس نے کچھ کہے سُنے بغیر گھر کی طرف چل دیا۔ مغلی نے ایک بار پھر زور سے "عف" کی اور نہ جانے عفارا کہاں سے چھلانگتا چھلانگتا ہوا آگیا پھر دونوں نے لاتھر کو آڑے ہاتھوں لیا۔ لاتھر نے پستول نکالا اور گولی داغ دی۔ گولی مُغلی کے سر پر جا لگی اور وہ ڈھیر ہو گئی۔ عفارا نے لوتھر کی گردن کو دبوچنے کے لئے چھلانگ لگائی۔ لیکن لاتھر نے پستول کے کُندے سے اُس کے سر پر زور سے چوٹ ماری۔ عفارا چیخ کر پیچھے گر پڑا اور لاتھر دُم دبا کر بھاگ اٹھا۔

عفارا ہوش میں آ تو گیا لیکن ایسا لگتا تھا جیسے پاگل ہو گیا ہو۔ کھانا پینا بھول بھال کر وہ بین کرنے اور رونے لگا۔ انسانوں ہی کی طرح اُداس اور غم زدہ ہو گیا۔ وہ مغلی کی لاش کے ارد گرد گھومتا رہا۔ اُسے سونگھتا رہا، چاٹتا رہا۔ لیکن جب مغلی کے مردہ جسم میں کوئی حرکت نہ ہوئی تو وہ آسمان کی طرف منہ اٹھا کر زور زور سے رونے لگا۔ سلطان سوداگر اور محمدو حلوائی نے لاکھ کوشش کی کہ مغلی کی لاش کو وہاں سے ہٹائیں لیکن عفارا نے انہیں ایسا کرنے سے روکا۔ جوں ہی مغلی کے قریب آتے۔ عفارا غرا کر کاٹنے کو دوڑتا۔ جیسے وہ سچ مچ ہی پاگل ہو گیا ہو۔ عفارا کی یہ حالت دیکھ کر سلطان سوداگر اور محمدو حلوائی بھی آپے سے باہر ہو گئے اور انہوں نے لاتھر کو مار نے کا عہد کیا اور وہ اس کے گھر کی طرف چل پڑے لیکن وہ اس سے پہلے ہی بھاگ چکا تھا۔

مُغلی کی موت کے بعد عفارا وہ پہلے والا عفارا نہ رہا وہ چالاک بیدار اور بہادر عفارا۔ اس کی تو جیسے کمر ہی ٹوٹ گئی۔ وہ روز بروز سوکھنے لگا وہ اب کسی کے پچکارنے پر خوش نہ تھا اور نہ ہی کسی کے اکسانے پر دوڑتا۔ اُس کی دم بھی ٹوٹ سی گئی۔ کان لٹک سے گئے اور آنکھیں بھی سکڑتے سکڑتے تقریباً بند ہی ہو گئیں۔ سلطان سوداگر اور محمدو حلوائی نے لاکھ جتن کئے کہ عفارا ایک بار پھر زندگی کی طرف لوٹ آئے لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ الغرض سب عفارا کی طرف سے ناامید ہو گئے۔

تین مہینوں تک ایسی حالت رہی اور عفارا دھیرے دھیرے موت کے منہ کی طرف کھسکتا رہا۔ اسی زمانے میں لاتھر ایک بار پھر گھر لوٹ آیا۔ وہ بازار سے گزرا۔ عفارا سو رہا تھا۔ اس نے جیسے کچھ سونگھ لیا ہو۔ جوں ہی لاتھر اس کے قریب سے گزرا، عفارا نے منہ اوپر اٹھا لیا پہلے لاتھر کی طرف ٹُوٹ کے دیکھا اور پھر بمشکل ایک ٹانگ پر کھڑا ہو کر لاتھر پر بھونکا۔ لاتھر اب وہ پہلا سا بزدل نہ رہا تھا۔ وہ بھی اپنی جگہ پر ڈٹ کر کھڑا رہا اور جوں ہی عفارا نے اُس کی طرف چھلانگ لگائی۔ لاتھر نے اُسے گردن سے پکڑ کر زمین پر پٹک دیا اور خود کچھ کہے بغیر ہی گھر کی طرف چل دیا۔

عفارا کانپتے کانپتے ایک بار پھر اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے سارے
بدن میں کپکپاہٹ سی دوڑ گئی اور وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھا کر لاتھر کے گھر
طرف جانے لگا۔ تھوڑی دور چل کر اس نے اپنے جسم کو زور سے جھٹک دیا
بلنے کیا بات ہوگئی۔ کہ اتنی زور سے پوری انگڑائی لی اور زور سے چلایا۔۔۔
"حث : "

اس کے بعد وہ شیر کی طرح اس کی طرف دوڑا، جدھر لاتھر چلا گیا
تھا۔ سلطان سوداگر اور محمود حلوائی بھی اس کے پیچھے دوڑ پڑے۔ پھوڑ
ماڈ کر سارے دکان دار بھی لاتھر کے گھر کی طرف جانے لگے اور لاتھر کے گھر کے
نگن میں جمع ہو گئے۔ عفارا مکان کے ارد گرد دوڑ رہا تھا اور اندر جانے کا
ستہ تلاش کر رہا تھا۔ دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں اور لاتھر دوسری
منزل کی کھڑکی سے آنگن کی طرف دیکھ دیکھ کر پستول کی گولیاں بھر رہا تھا۔

عفارا نے جونہی لاتھر کو دیکھا وہ چند قدم پیچھے چل کر دوڑا اور
ڑکی کی طرف چھلانگ لگائی۔ لاتھر نے گولی داغ دی۔ لیکن نشانہ خطا ہو
ا۔ سلطان سوداگر چیخ کر بولا۔

"ہو حبیب جان ! او ہتیارے ! کیا اب اس بیچارے کی بھی جان
نا چاہتا ہے۔ یہ تو پہلے ہی مر چکا ہے"

سلطان سوداگر کی بات سن کر سب لوگ اس کی طرف داری
نے لگے اور لاتھر کو گالیاں دینے لگے۔ کچھ لڑکوں اور بچوں نے تو
روازوں اور کھڑکیوں پر پتھر پھینکنا شروع کئے تو لاتھر نے کھڑکی بند کر دی
لطان سوداگر نے عفارا کو پکڑ کر واپس اپنی دکان کے پاس لے جانا
اہا لیکن عفارا ایک نہ مانا۔ سلطان سوداگر زبردستی کرنے لگا تو عفارا
نے اسے کاٹنے کی کوشش کی۔ آہستہ آہستہ سبھی لوگ چلے گئے لیکن سلطان
وداگر اور محمود حلوائی رات بھر عفارا کے پاس ہی رہے۔ صبح کا تارا نکلا۔
فارا مر گیا۔ اس کی نظریں اسی کھڑکی کی طرف دیکھ دیکھ کر جم گئی تھیں جہاں سے
تھر نے گولی چلائی تھی۔

---

لاتھر مر گیا۔

سلطان سوداگر اور محمود حلوائی کو یہ یقین ہے کہ اسے عفارا کی آہ
ڈوبی۔ میں نہیں جانتا کہ کسی انسان پر کتے کی آہ بھی پڑتی ہے

لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ لاتھر کے مرنے کے بعد جب بھی کوئی اس کا نام
لیتا ہے تو سب کو وہ دن یاد آتا ہے جب عفارا لاتھر کے برآمدے میں اس
کا انتظار کرتے کرتے موت سے ہم کنار ہوا تھا۔

## غزل

مدت سے منتظر ہوں توجہ کچھ اب تو ہو
چشم کرم نہیں ہو تو چشم غضب تو ہو

بادہ نہیں تو خالی ہی ساغر اچھالیے
کچھ اہتمام محفل جشن طرب تو ہو

تسکین قلب کا کوئی سامان چاہیے
جب "جان میکدہ" نہیں بنت عنب تو ہو

ہر رات ہی کی گود میں پلتی ہے صبح نو
جو طالب سحر ہے وہ مانوس شب تو ہو

عذر گنہ ہے واقعی بدتر گناہ سے
مجرم ہوں یہ بھی سچ ہے مگر کچھ سبب تو ہو

منزل کا پانا غیر یقینی نہیں مگر !
کچھ ذوق جستجو تو ہو حسن طلب تو ہو

واحد بیان ذات ضروری سہی مگر
احساس فن ہو، مقصد شعر و ادب تو ہو

**واحد پریمی**



# تہذیب و تمدن

سلطانہ آصف فیضی

ہر دور کا اپنا ایک فیشن اور طور طریقہ ہوتا ہے۔ نہ صرف لباس میں بلکہ معاشرت، طرز رہائش، خیال و گفتگو میں ۔ ایک عربی کہاوت ہے کہ آدمی اپنے ماں باپ سے زیادہ اپنے دور سے قریب ہوتا ہے چنانچہ ہمیں آئے دن اس کا مشاہدہ ہوتا ہے کہ سیدھے سادے ماں باپ کا لڑکا زلفیں بڑھانے میں، تنگ لباس زیب تن کرنے میں اور سگریٹ پھونکنے میں اپنے زمانے اور دور سے زیادہ قریب ہے۔ نہ صرف ظاہری تتبع میں بلکہ اپنے خیال، نظریے اور قدروں میں بھی اپنے دور کی پیداوار ہے۔

آج کل بہت سے لفظ عام طور پر استعمال ہوتے ہیں مثلاً کمیونزم، سوشلزم، کلچر، ترقی، نفسیات اور ذہنی انجماد جن کو ہم سمجھتے کم ہیں اور بولتے زیادہ ہیں۔ یہ الفاظ اخباروں میں پڑھتے ہیں، تقریروں میں سنتے ہیں، اور آپس میں بولتے ہیں۔ ان لفظوں کو سن سن کر ہماری الجھنیں بڑھتی جاتی ہیں مگر آج کے دور میں ان الفاظ کے معنی و مطالب سے واقفیت میں تمدن کی نشانی ہے۔

تہذیب کیا چیز ہے جس کو انگریزی میں سوی لائی زیشن Civillsation کہتے ہیں جو ایک لاطینی لفظ Civis سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہوتے ہیں "ایک شہری" تو گویا تہذیب وہ حالت ہے جو ایک شہری کے شایانِ شان ہو جو وحشت کے دور سے نکل کر ایک منظم زندگی گزارتا ہو اور جو اپنے اور دوسرے شہری کے حقوق و فرائض سے واقف ہو جس کے اطوار احسن اور طبیعت سلجھی ہوئی ہو۔ جو خلیق، شائستہ اور متواضع ہو۔ جو غیر متمدن حالت سے نکل کر انسانیت کے حدود میں آگیا ہو۔ غرض کہ تہذیب کے دو معنی ہیں ایک تو انسانی ذہن کا ارتقاء و سُدھار اور دوسرا انسانوں کے ذہنی نفاست و شعور کی بالیدگی سے بنی ہوئی معاشرت، ایسی ہی سوسائٹی متمدن کہلاتی ہے

تہذیب کے بعد آیئے کلچر کے معنی سمجھنے کی کوشش کریں۔ کلچر کا ماخذ ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنی ہیں زمین میں ہل چلانا اور بیج بونا جس کا مطلب ہوا انسان کی ذہنی تربیت۔ اس طرح کلچر گویا مصنوعی عمل ہے۔ جو انسانی ذہن کو بتدریج تربیت دے کر اس کو چمکا دیتا ہے، اس کو جلا دیتا ہے اس کو صحیح مذاق سے آشنا کر کے لطیف و نفیس خیالات سے اس کو مزین کرتا ہے۔ گویا ذہنی ارتقا کی تربیت کلچر ہے۔ بیکن لکھتا ہے کہ انسان کے روحانی وسعت کا نام کلچر ہے۔

صحیح معنی میں تہذیب و کلچر وہ چیز ہے جو انسان میں اونچے اقدار پیدا کرے جہاں عقل کی حکمرانی ہو۔ ٹائلر اپنی کتاب Primitive Culture میں اس کی وضاحت کچھ اس طرح سے کرتا ہے کہ کلچر ایک پیچیدہ عمل کا مجموعہ ہے جس میں ایک سوسائٹی کے افراد کی طبیعت۔ ایمان و اعتقاد، ہنر، اخلاق، قانون، رسم و رواج اور عادت و اطوار سب داخل ہیں۔ اس

---

اس مضمون کا ماخذ A. A. A. Fyzee کی کتاب Islamic Culture Bombay, 1944 ہے

علاوہ ازیں کلچر کے معنی بہت وسیع اور خارجی ہیں۔ داخلی معنی میں کلچر وہ چیز ہے جہاں انسان اپنے خیالات کو صحیح تناسب میں جانچنے کا سلیقہ رکھتا ہو اور لطیف ذہنی لطافتوں سے محظوظ ہونے کا اہل ہو۔

کلچر کا عمل سے کیا واسطہ ہے ؟ انسانی عمل کی دو شکلیں ہیں۔ ایک تو عملی اور دوسری ذہنی و فکری۔ کلچر کا ذہنی اور فکری طریق عمل سے واسطہ ہے۔ لہٰذا ہمارا طریقۂ عمل ہماری اعتقاد پر منحصر ہے۔ کلچر اور عملی زندگی ایک دوسرے سے پیوستہ ہونے کے باوجود دو علحدہ چیزیں ہیں۔ اپنے دور و وقت کے مطابق علم حاصل کر لینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ مختلف چیزوں کی قدر و قیمت کا اندازہ حاصل کرنا، زندگی کو صحیح زاویئے سے جانچنا، خیالات کو متوازن اور بے لاگ طریقے سے پرکھنا کلچر سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ سب سے اہم اور ضروری امر یہ ہے کہ کسی دوسرے کے نظرئے اور فکری نصب العین سے آپ کو اختلاف ہو تب بھی اس کے خیال کی قدر کرنا۔ چنانچہ مذہب، زبان، قومیت اور وطن یہ وہ ڈوریاں ہیں جن سے ایک ملک و قوم کی تہذیب و کلچر کا رنگین جامہ تیار ہوتا ہے ایک خاص وقت میں ملک کی جو ذہنی سطح قائم ہو جائے وہ کلچر ہے۔ اسی لئے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مختلف تاریخی ادوار میں اور مختلف ملکوں میں ہم تہذیب و کلچر کا معیار بھی جداگانہ پاتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ کلچر کے کسی ایک پہلو پر ضرورت سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ مثال کے طور پر دورِ وسطیٰ میں صرف مذہب ہی کو کلچر کا دروازہ سمجھا جاتا تھا۔ فنِ تعمیر میں بہترین کلیساؤں کی تعمیر یا آرٹ میں مذہبی پہلو پر حد سے زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ آج یہ خیال بالکل بدل چکا ہے۔ اس لئے مذہب پر ضرورت سے زیادہ زور دینا یا سیاسی مطالبے کے لئے اس کی اہمیت کو بڑھانا سماج کو متعصب بناتا ہے جس کے نتیجے میں سماجی زندگی میں لڑائی جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔ اس بات کی طرف خاص طور پر اشارہ کرنا مقصود ہے کیونکہ آج کل ہمارے ملک میں بھی کچھ لوگ مذہب کو غیر معمولی ہوا دے رہے ہیں اور اس کی بنیاد پر کلچر کی عمارت تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ غرض کہ تہذیب کا دائرہ عمل ہماری روزمرہ کی زندگی ہے اور کلچر کا تعلق ہمارے معصفا اور مجلّیٰ باطن سے ہے۔ دُنیا کی ہر زبردست تہذیب کسی قانون کے تابع رہی چنانچہ دنیا کے کلچر کی عظیم الشان تہذیبیں پھلی پھولیں اور پھر مرجھا گئیں۔ دیکھا گیا ہے کہ ہر تاریخی دور میں تہذیب کا ایک مرکز ہوا کرتا تھا جہاں سے اُس کی روشنی ہر طرف پھیل جاتی تھی۔ چنانچہ گزشتہ چار پانچ صدی میں تہذیب اپنے سابقہ مرکز یعنی بغداد، سمرقند اور دہلی سے ہٹ کر مغرب یعنی لندن، پیرس اور آکسفورڈ میں پہونچ گئی ہے۔

"اسلامی تہذیب" یا عربوں کی تہذیب صرف خالص مسلمانوں کی یا کسی ایک مذہبی فرقہ کی پیداوار نہ تھی بلکہ اس کی ترقی میں مسلمان، یہودی، عیسائی دہریئے سب کی سعی و کوشش شریک تھی وہ سب کی انتھک محنت کا نتیجہ تھا۔ مسلمان فرمانرواؤں کے درباروں میں عیسائی طبیب و شاعر بھی پوری طرح نمایاں تھے۔ اگر مسلمان عالموں نے اپنے علم سے تہذیب کو چمکایا تو یہودی فلسفیوں کا حصہ بھی کم نہ تھا چنانچہ ایک ہی مذہب نے نہیں بلکہ بہت سے مذہبوں نے مل کے اسلامی تہذیب کی تعمیر میں شرکت کی اسی طرح نہ صرف ایک قوم بلکہ بہت سی قوموں کے افراد کا اس تعمیر میں حصہ تھا۔ عرب سریانی، ایرانی، ترک ہسپانی۔ مصری اور ہندوستانی۔ ہر ایک نے تہذیب کی شمع کی لو تیز کی بہت باریکی سے دیکھا جائے تو شاید ایرانیوں اور ترکوں کا اس میں زیادہ حصہ ہے۔ اس لئے اسلامی تہذیب کی عظمت و ترقی کو صرف عربوں کے قومی اقتدار یا خالص مذہبی جذبے پر محمول نہ کرنا چاہئے۔ اس تہذیب میں ہندوستان کا بھی کم حصہ نہ تھا۔

عام طور پر جو عربی ہندسے رائج ہیں وہ ہندوستان سے گئے ہیں۔ پھر وہ یورپ میں رائج ہوئے۔ علم الجبرا عربوں نے ہندوستان سے سیکھا۔ مغل بادشاہوں کی عالیشان تعمیرات کی خوبصورتی اسلامی اور ہندوستانی فنِ تعمیر کا مشترک عمل ہے۔ ہند کے مسلم صوفیائے کرام جن کی ہندو اور مسلمان یکساں تعظیم و تکریم کرتے تھے قدیم ہندو فلسفہ سے بھی متاثر ہوئے۔ اسلام کے چند زبردست فقیہ و محدث ہندوستان نے پیدا کئے۔

کسی ملک کے لوگوں کا دوسرے ملک کے لوگوں سے میل جول کلچر کا پہلا ضروری لازمہ سمجھا جاتا ہے۔ جب تک مسلمانوں کے پاس تجارت کے راستے کھلے رہے تو اُن کا اقتدار عیسائیوں سے زیادہ رہا۔ جب یہ راستے اُن کے ہاتھوں سے چھن گئے تو کلچر کی باگ ڈور بھی ان سے چھن گئی۔ کلچر کو بڑھانے میں صرف قومیت یا مذہب ہی کا ہاتھ نہ تھا بلکہ تجارتی میل جول اور قومی جوش بھی شامل تھے۔ اور بقول ایک مستشرق عالم بارٹولڈ اسلامی کلچر کی فوقیت زیادہ تر تجارتی شاہراہوں نے بڑھائی اور لوگوں کے آپس کے میل جول نے اس کے مواقع فراہم کئے۔

اس کی دو مثالیں پیش کرتی ہوں۔ ایک تو دسویں صدی کا بغداد لے لیجئے۔ بغداد کا دوسرا نام "دارالسلام" تھا۔ اس کو خلیفہ منصور نے دریائے دجلہ کے کنارے آباد کیا تھا۔ بغداد کے لفظی معنی ہیں "خدا کا عطیہ" جو عباسیوں

کا دارالسلطنت رہا ہے۔ اس شہر کی تاریخ کے ساتھ بہت سے رومان اور قصے کہانیاں وابستہ ہیں کیونکہ اُس کے نام کے ساتھ ہارون الرشید کا نام ذہن میں آجاتا ہے۔

کوفہ اور بصرہ کے بعد یہاں علم صرف و نحو کا نیا مدرسہ شروع ہوا اور پھر یہاں سے یونانی علوم اور سائنس کی ترقی کی ابتدا ہوئی۔

خلیفہ منصور اور خلیفہ مامون کی علم کی سرپرستی و سخاوت کے زیر سایہ یونانی علوم نے فروغ حاصل کیا۔ اس طرح سے عربی کلچر میں ایرانی، یہودی، عیسائی اور سابعین کی مدد سے یونانی فلسفہ شامل ہونے لگا۔

الجبرا کا علم یونانیوں کے پاس نہیں تھا۔ اس لئے وہ ہندوستان سے لیا گیا۔ کوفہ، بصرہ اور حراں کے مدرسے بغداد کی تابانی کے سامنے ماند پڑنے لگے۔ یہیں دسویں صدی میں وہ زبردست فلسفیانہ کتاب تصنیف ہوئی جو ۵۰ قطعات پر مشتمل تھی۔ اور جس کا نام "رسائل اخوان الصفا" تھا۔ یہاں سے یہ کتاب پہلے پہل ہسپانیہ پہونچی پھر فارسی میں ترجمہ کی گئی۔ اس کتاب میں دوسری بہت سی باتوں کے علاوہ نو افلاطونی فلسفہ کے عنصر بھی شامل تھے۔ اس کتاب کے مصنف کا نام ایک معمہ رہا۔

"لوگارتم" (جو علم حساب کا ایک قاعدہ ہے) ایک یوروپی لفظ سے نکلا ہے، جو خود "ال خوارزمی" نام کا بگاڑ ہے۔ ال خوارزمی وہ زبردست ترک ماہر ہندسہ تھا جو خوارزم کا رہنے والا تھا۔ ایک دوسرے عالم البطانی تھے جو حراں کے رہنے والے تھے۔ اُنہوں نے علم مثلث کو پختگی تک پہنچا کر سائنس کی ایک الگ شاخ بنا دی۔

چار صدی آگے بڑھئے تو چودھویں صدی میں ابن خلدون جیسے مورخ کی عالمانہ تصنیف نظر آتی ہے اس کا مقدمہ عالمگیر شہرت حاصل کر چکا ہے۔ اور تاریخ نویسی میں ایک ادبی کارنامہ مانا جاتا ہے اس کی علم تاریخ سات جلدوں پر مشتمل ہے۔ وہ عربوں کی برتری کا سبب اُن کی ذہانت و ذکاوت کے علاوہ اُن کا مختلف قوموں سے میل جول اور تبادلۂ خیالات کو قرار دیتا ہے۔ مسلمانوں کے تہذیب و تمدن کی تعریف کرتے ہوئے وہ یہ بھی پیشین گوئی کرتا جاتا ہے کہ اس کو بھی ایک دن زوال آنے والا ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ ایک جگہ بتلاتا ہے کہ جس طرح دُنیا کی دوسری قومیں پیدا ہوئیں جواں ہوئیں اور پھر ان پر زوال آگیا۔ اسی طرح تاریخ و قدرت کے اس اٹل قانون سے یہ کلچر بھی بچ نہیں سکتا۔

اب آئیے اپنے گھر کو دیکھیں جو سولہویں صدی میں بابر ہندوستان آیا۔ اس کے بعد پانچ مغل بادشاہوں نے یکے بعد دیگرے اس ملک پر حکومت کی مگر انہوں نے اس کو اپنا لیا۔ یہیں پیدا ہوئے یہیں رہے اور یہیں مر کر دفن ہو گئے اور آج وہ جو کچھ اپنے بعد چھوڑ گئے۔ فن عمارت۔ آرٹ اور پینٹنگ میں وہ ہندوستانی اور مسلم کلچر کا ایک حسین امتزاج ہے۔ اکبر کے دربار میں جو نورتن تھے اس میں ہندو مسلم دونوں تھے جنہوں نے ساتھ مل کر ہندوستانی کلچر کو مالا مال کیا۔ سنیا ایک یونانی تھا جو ماہر فن تعمیرات تھا۔ اس نے استنبول میں سلطان سلیم کی مشہور مسجد بنائی۔ (۱۵۶۶-۷۴ء) اس نے ایران کے فن تعمیر سے بہت سے اثرات لئے تھے۔ اکبر نے اس کے شاگرد یوسف کو ہندوستان بلایا۔ چنانچہ اس زمانے کی شاہی عمارتیں ایرانی، ترکی اور ہندوستانی فن تعمیر کا ایک خوبصورت امتزاج ہیں۔ فن تعمیر میں اسی امتزاج کے ارتقاء نے تاج محل کی صورت میں فن تعمیر کو انتہا تک پہونچا دیا۔

اسی طرح سے قلمی مصوری کا آرٹ ایران اور ہندوستان میں ترقی یافتہ تھا اور آقا میرک اور بہزاد کی بنائی ہوئی قلمی تصاویر کا مقابلہ فرانجلیکو اور دوسرے عہد وسطیٰ کے اُستادانِ فن سے کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ابوالفضل لکھتا ہے کہ جب فتح پور سیکری بن رہا تھا اس وقت شاہی فن کاروں میں میر سید علی مسکین قلم کے ساتھ بساون۔ یشونت۔ تارا۔ مہیش اور کیم کرن بھی فن کاروں میں شامل تھے۔

جس طرح تاریخ ایک عہد اور اُس زمانے کے لوگوں کے تجربات کی کہانی ہے اسی طرح تہذیب و کلچر بھی ایک عہد اور دور کی پیداوار ہے۔ اس لئے کلچر خواہ اسلامی ہو یا ہندوی اس کی تعمیر میں مذہب کو ضرورت سے زیادہ اہمیت نہیں دینا چاہئے۔ صحیح کلچر کی پرکھ اس دور کے انسانوں کی خوبیوں اور نمایاں کارناموں کے ذریعے کی جانی چاہئے۔ اور اُن کی قومی مذہبی، ادبی اور تاریخی خوبیوں کا اندازہ لگا کر پرکھنا چاہئے۔ ذہانت و ذکاوت فکر و قدر عالمگیر چیزیں ہیں۔ اور انسانیت کے سماجی و اخلاقی مسائل اس قدر یکساں ہیں کہ ہم کو ہر وقت انسانیت کی عام بہبود و اصلاح کی طرف نظر رکھنی چاہئے۔




دارالمصنفین (شبلی اکیڈمی) اعظم گڑھ ایک خالص علمی وتحقیقاتی ادارہ ہے، اس کا اصل مقصد علوم وفنون خصوصاً اسلامی علوم، ہندوستان کی تاریخ، اُردو زبان وادب کی خدمت، اُن کے متعلق تحقیقات اور تالیف وتصنیف، مغربی زبانوں اور جدید علوم کی مفید کتابوں کا ترجمہ واشاعت اور اہل مصنفین اور اہل قلم کی جماعت تیار کرنا ہے، ظاہر ہے کہ اس قسم کی خالص علمی جماعت کا قوم وملک کے عام عملی کاروبار اور مشاغل نیز ہنگامہ آرا رجد وجہد سے زیادہ واسطہ اور سروکار نہیں ہو سکتا بلکہ وہ ہر طرح کے مالی طمع وفریب اور دُنیاوی عیش وعشرت سے بے نیاز اور بے پروا ہو کر قوم کی ذہنی نشو و نما، اس کی دماغی تربیت اور علم وفن کی مفید مقدس خدمت کا فرض انجام دینے میں مشغول رہتی ہے۔

لیکن علامہ شبلی مرحوم اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ اُن کی شخصیت بڑی جامع، ہمہ گیر اور پُرکشش تھی اس لئے ملک وقوم کی کوئی انجمن، کوئی ادارہ، کوئی تحریک اور کوئی جماعت ان سے بے نیاز نہیں رہ سکتی تھی۔ قدرت نے اُن کو بڑا احساس، ذہین، بیدار دماغ اور دردمند دل عطا کیا تھا اس لئے قوم وملک کے اہم مسائل ومعاملات کو نظر انداز کر دینا اُن کے لئے ناممکن تھا لہٰذا فطری طور پر وہ قوم پرورانہ خیالات کے حامل اور ملک ووطن کی آزادی واتحاد کے نہایت پرجوش حامی تھے۔ انہوں نے اپنے ملی، قومی وسیاسی مضامین اور نظموں میں قوم وملک کی آزادی کی کوششوں کو سراہا ہے اور ہندو مسلم اختلافات کی خلیج دور کرنے کی پُرزور کوشش کی ہے۔

قدرتی طور پر اُن کے یہ خیالات اُن کے تلامذہ اور دارالمصنفین کے کارکنوں میں بھی منتقل ہوئے، خصوصاً دارالمصنفین کے منیجر اور اس کے انتظامی امور کے ذمہ دار مولوی مسعود علی ندوی مرحوم کو تو پبلک کاموں اور سیاسی و قومی اشغال کا فطری ذوق تھا، خود علامہ شبلی مرحوم نے اپنے خطوط میں اُن کے ان اوصاف وکمالات کا ذکر واعتراف کیا ہے، چنانچہ انہوں نے اپنے اُستاد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ملک وقوم کی اصلاح وترقی کو اپنا نصب العین بنایا اور آزادی واتحاد کی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم نے دارالمصنفین کے جشن طلائی کے موقع پر خطبۂ صدارت دیتے ہوئے فرمایا تھا۔

• ملکی سیاست کے میدان سے دارالمصنفین کو بحیثیت ایک علمی و ادبی ادارے سے کوئی تعلق نہیں رہا لیکن شخصی حیثیت سے اس کے مراد و مرشد مولانا شبلی نعمانی سچے اور پکے قوم پرست مسلمان تھے اور اُس کے کارساز وکارپرداز مولوی مسعود علی صاحب ندوی بھی اُن کے ہی نقش قدم پر چلتے رہے اور دونوں نے اتحاد وآزادی کا ساتھ دیا اور تفریق اور غلامی کے رجحانات کی شدید مخالفت کی، اس لئے دارالمصنفین کے گوشہ نشین کارکنوں

میں قومی آزادی اور قومی یک جہتی کے جذبات روح و رواں کی طرح سما گئے اور اُن کی تائید اور ہمدردی، اتحاد اور آزادی کے سب علمبرداروں خصوصاً قوم پرور مسلمانوں کے لئے قوت اور فیضان کے سرچشمے کا کام دیتی رہی"۔

علامہ شبلی مرحوم کے علمی جانشین اور دارالمصنفین کے پہلے ناظم مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کا ذوق اگرچہ خالص علمی تھا تاہم علامہ مرحوم کی طرح اُن کی شخصیت بھی نہایت جامع تھی اور انہوں نے دارالمصنفین کو نہ صرف ملک گیر بلکہ عالمگیر شہرت بخشی۔ اُن کے گوناگوں کمالات نے اُن کی ذات کو بھی ہر شخص، ہر ادارہ اور ہر جماعت کا مرکزِ توجہ بنا دیا تھا، اس لئے عملی سیاسیات کی خارزار سے دامن کش رہنا اُن کے لئے بھی ناممکن تھا، انہوں نے اپنے اُستاد کے سیاسی مسلک کو اختیار کر کے اتحاد و آزادی کی تحریک کا ساتھ دیا۔ اس زمانے میں قوم و ملک کی اصلاح و ترقی کی جو تحریکیں اور آزادیٔ وطن کی جد و جہد کرنے والی جو تنظیمیں بھی قائم ہوئیں اُن سب کو سید صاحب کی جانب اور سید صاحب کو ان کی جانب متوجہ ہونا پڑا، یہ الگ بات ہے کہ قومی اشغال اور سیاسی تحریکوں سے وابستہ رہنے کے باوجود بھی وہ اُس کی آلودگیوں اور آلائشوں سے بالکل محفوظ رہے اور انہوں نے علمی شان و وقار کو ہمیشہ قائم و برقرار رکھا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں۔

"سید صاحب نے شروع سیاست میں حصہ لیا اور جنگ بلقان سے لے کر تقسیم ہندوستان تک ہر طرح کی سیاسی اور قومی تحریکوں کی نیچ اُونچ میں شریک رہے، کم خوش نصیب ایسے ہوں گے جنہوں نے سید صاحب کی طرح سیاست میں مسلسل حصہ لیا ہو اور سیاست کی آلائشوں سے پاک رہے ہوں۔ سیاست کے وسیلے سے کسی منصب پر پہنچنے کے کبھی درپے نہ ہوئے، انہوں نے اپنے لئے جو بلند سطح پہلے دن اختیار کر لی تھی اسی پر آخر دم تک قائم رہے۔" (معارف سلیمان نمبر ص۱۴۲)

سید صاحب کی باقاعدہ قومی اور سیاسی زندگی اس وقت شروع ہوتی ہے جب ۱۹۱۴ء کے آخر میں ترکی نے جنگ عظیم میں شرکت کا فیصلہ کیا، اس کے اس فیصلہ کا اعلان کرنا ہی تھا، کہ مسلمانانِ ہند میں بھی جوش اور ہیجان پیدا ہو گیا اور اُن کے کئی سیاسی لیڈر قید و بند میں ڈال دیئے گئے۔ اس موقع پر جو نیا گروہ اُن کی قائم مقامی کے لئے آگے بڑھا۔ اس میں مولانا سید سلیمان ندوی بھی تھے۔ ۱۹۱۶ء میں علمائے بنگالہ کے کلکتہ کے سالانہ اجلاس کی جس میں تمام رہنمایانِ ہند شریک تھے [illegible] کی اور نہایت موثر خطبہ پڑھا، یہ پہلا خطبہ تھا جس میں جنگ کے [illegible] کے باوجود مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کا نام جو اس زمانہ میں [illegible] جرات اور بیباکی کے ساتھ لیا گیا تھا، اس خطبے سے لوگوں کے دلوں سے انگریزوں کا رعب اٹھنے اور کم ہونے لگا۔

۱۹۱۹ء کا سال ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے بڑا پُر آشوب تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد اسلامی ممالک خصوصاً ترکی پر نہایت سخت وقت آیا، اس کے حصے بخرے کر دیئے گئے، ترکی کا سلطان قسطنطنیہ میں اتحادیوں کے ہاتھوں بے بس ہو رہا تھا، ایسے نازک اور پُر آشوب وقت میں ہندوستان کے چند بہادر، غیور اور دردمند مسلمان رہنماؤں نے اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر مجلسِ خلافت کے نام سے ایک مرکزی مجلس بمبئی میں قائم کی جس کی شاخیں آناً فاناً پورے ملک میں قائم ہو گئیں اور جس نے آگے چل کر ہندوستان کی آزادی کی جد و جہد میں عظیم الشان قربانیاں اور حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے، اس مجلس کی روح رواں تو علی برادران (مولانا محمد علی مولانا شوکت علی مرحومین) تھے لیکن مولانا سید سلیمان ندوی ناظم دارالمصنفین اور مولانا مسعود علی ندوی منیجر دارالمصنفین بھی اس میں بہت پیش پیش رہے اور جب ترک موالات کی تحریک شروع ہوئی اور مجلس خلافت اور کانگرس کے پلیٹ فارم مشترک ہو گئے تو اِن دونوں حضرات نے بھی ملک کا طوفانی دورہ کیا، سید صاحب نے قومی و ملی جلسوں میں ولولہ انگیز تقریریں کیں اور اخبارات و رسائل میں نہایت پرجوش انقلابی مضامین لکھے۔

جب مجلس خلافت کا پہلا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں ہوا تو اس میں سید صاحب کی موثر اور پُرسوز تقریر نے علماء اور ارباب سیاست کے درمیان حلقۂ اتصال کا کام کیا اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور چودھری خلیق الزماں کے اختلافات کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر ختم کر دیا۔ ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی مرحوم کی سرکردگی میں جو وفد خلافت یورپ کے لئے روانہ ہوا تھا اس کے تین ممبروں میں ایک سید صاحب بھی تھے۔ یہ وفد نیشنلزم اور پین اسلام ازم کو متحد کر کے ہندوستان کی آزادی کی جنگ لڑنے چلا تھا۔

مولانا سید سلیمان ندوی اور مولوی مسعود علی ندوی کی کوششوں سے اعظم گڑھ میں کانگرس کمیٹی قائم ہوئی جس کے ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۳ء تک

آج کل [illegible] صدر اور [illegible] سکریٹری ہیں۔ مولوی مسعود صاحب کی سرکردگی میں جب [illegible] (ضلع اعظم گڑھ) میں ایک لاکھ کے بدیسی کپڑوں کا بائیکاٹ کیا گیا تو گاندھی جی نے اس [illegible] دارالمصنفین کو سوراج آباد کا اور پنڈت جواہر لال نہرو نے اعظم گڑھ کو گاندھی کا اسٹرونگ ہولڈ قرار دیا۔ [illegible] میں احمد آباد کی کانگریس میٹنگ میں سید صاحب کو اس کی ورکنگ کمیٹی کا ممبر نامزد کیا گیا۔ اور جمعیۃ علمائے ہند کی مجلس عاملہ کے بھی وہ رکن مقرر کئے گئے۔ مولوی مسعود علی صاحب بھی اِن دونوں قوم و وطن پرور جماعتوں کی ورکنگ کمیٹی کے رکن تھے۔

پہلی ڈکٹیٹر شپ کے موقع پر گاندھی جی نے اپنی گرفتاری کے وقت مولانا سید سلیمان ندوی ناظم دارالمصنفین کو اس رائے کے ساتھ ڈکٹیٹر نامزد کیا تھا کہ "ندوی بڑے سچا تر ہیں، ان کو بھی سات آدمیوں میں لے لیا جائے۔"
[illegible] میں آخری نمک ستیہ گرہ کے موقع پر ڈاکٹر انصاری مرحوم نے اپنی گرفتاری کے وقت مولانا مسعود علی ندوی منیجر دارالمصنفین کو ڈکٹیٹر نامزد کیا تھا۔

جب گورنمنٹ ایڈ کی واپسی کی تجویز منظور کی گئی تو دارالمصنفین کے ناظم اور منیجر نے انتہائی مخالفتوں کے باوجود دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) کی جس کے اہم عہدوں پر اس زمانے میں یہ دونوں حضرات نہ صرف فائز تھے بلکہ حقیقی اور اصل کرتا دھرتا تھے۔ پانچسو⁰ ماہوار کی امداد واپس کر دی۔

دارالمصنفین کے کارکنوں ہی کے اہتمام میں پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک ہزار والنٹیروں کے ساتھ قانون شکنی کی جس کی صوبہ کانگریس کے سیکریٹری کی حیثیت سے وہ خود اور ضلع کانگریس کے سکریٹری کی حیثیت سے مولوی مسعود علی صاحب قیادت کر رہے تھے۔

جب گیا میں سوراج پارٹی کا قیام عمل میں آیا تو اس پر پہلا مسلم دستخط مولانا مسعود علی ندوی منیجر دارالمصنفین کا تھا۔ اس کے بعد اعظم گڑھ کو پورے صوبہ میں نمایاں حیثیت حاصل ہو گئی اور پنڈت موتی لال نہرو نے شبلی اکیڈمی کو سوراج پارٹی کا مرکز قرار دیا۔

منیجر دارالمصنفین کے اہتمام اور نگرانی میں احمد آباد کے بعد پہلا پنڈال شدّ کھدر کا اعظم گڑھ میں بنایا گیا جس میں پندرہ ہزار آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی اور جس کو تمام اکابر ہند نے حیرت اور دلچسپی سے دیکھا۔

دارالمصنفین کے ایک اہم رکن رکین اور مولانا شبلی مرحوم کے ممتاز اور نامور شاگرد رشید مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم بھی تھے۔ اُن کو اگرچہ سیاسی ہنگامی اور عملی کاموں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی تھی تاہم نظری حیثیت سے ہم اُن کا سیاسی مسلک بھی اپنے استاد کے مسلک کے موافق رہا۔ انہوں نے فرقہ پرور جماعتوں کو کبھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا اور اُن کی نگاہ توجہ کا مرکز بھی وہی علم بغاوت تھا جو سرفروشان آزادی نے برطانوی جبر و استبداد کے خلاف بلند کر رکھا تھا۔

دارالمصنفین کے دوسرے تمام رفقاء و مصنفین بھی ہمیشہ ذہنی اور نظری اعتبار سے اپنے برادر مرشد علامہ شبلی نعمانی مرحوم کے نقطۂ نظر سے ہم آہنگ رہے، اور سب قومی تحریکوں اور آزادی و حریت کی راہ میں جدوجہد کرنے والی جماعتوں سے یک گونہ وابستہ رہے۔ خصوصاً مولانا ابوالحسنات ندوی مرحوم، مولانا ابوالجلال ندوی، سید نجیب اشرف ندوی مرحوم، مولانا ریاست علی ندوی، مولوی محمد اویس ندوی، اور جناب یحییٰ اعظمی وغیرہ قوم پروری اور اتحاد و آزادی کی تحریک میں عملاً بھی نہایت سرگرم تھے۔ مولانا ابوالحسنات کا اگرچہ عین عالم شباب میں انتقال ہو گیا تھا تاہم تحریک خلافت اور ترک موالات کی تائید میں انہوں نے بعض مضامین اور رسالے لکھے تھے۔ مولانا ابوالجلال ندوی کو قوم پروری میں بڑا غلو تھا۔ سید نجیب اشرف ندوی مرحوم جب بی اے کے دوسرے سال میں تھے تو خلافت اور ترک موالات کی تحریکیں زوروں پر چل رہی تھیں۔ وہ قومی اور ملی جذبے سے اسقدر سرشار ہوئے کہ اپنی تعلیم چھوڑ کر ان تحریکوں میں شریک ہو گئے۔ اسی زمانہ میں وہ دارالمصنفین سے وابستہ ہوئے جو اس وقت ایک اہم علمی ادارہ ہونے کے ساتھ ساتھ قومی سرگرمیوں کا بھی مرکز بنا ہوا تھا۔ یہاں آکر مرحوم نے خلافت تحریک میں پورا حصہ لیا اور اپنی تنظیمی صلاحیت کا ثبوت بھی دیا۔ کم سنی کے باوجود انہوں نے خلافت اور کانگریس کے کارکنوں کی بڑی اچھی رہنمائی کی۔
مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی اُن کی والدہ بی اماں، گاندھی جی، پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو جب جب اس ضلع کے دورے پر آتے تو مرحوم ان کے ساتھ ہوتے۔ بی اماں تو ان کو اپنے بیٹے کی طرح چاہنے لگی تھیں۔ وہ جلسوں میں تقریریں بھی کرتے۔ بعض موقعوں پر ان کی تقریریں اتنی باغیانہ اور آتش بار ہوتیں تو مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم کہتے کہ یہ ایک روز ہم سب کو پھانسی کے تختے پر پہونچا دیں گے۔ انہوں نے سوراج سے متعلق گاندھی جی کے بعض انگریزی اور گجراتی رسالوں کے ترجمے بھی کئے تھے۔

مولانا سید ریاست علی ندوی، مولانا سید سلیمان ندوی کے شاگرد رشید دارالمصنفین کے مشہور مصنف اور قوم پرور مسلمان ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ قومی و

سیاسی سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لیا۔ اعظم گڑھ میں ضلع کانگریس کمیٹی اور جمعیۃ علمائے ہند دونوں کے برسہا برس تک صدر اور سکریٹری رہے۔ ہندوستان کے دوسرے وزیر اعظم لال بہادر شاستری اور الگورائے شاستری وغیرہ اُن کے خاص اور بے تکلف دوستوں میں تھے۔

جناب یحییٰ اعظمی دبستانِ شبلی و سہیل کے مشہور پختہ مشق شاعر اور عرصہ دراز سے دارالمصنفین سے وابستہ ہیں۔ انہوں نے اپنے اُستاد مولانا اقبال احمد خاں سہیل مرحوم اور دارالمصنفین کے مصنفین و رفقاء کی طرح ہمیشہ اتحاد و آزادی کی تحریک کا ساتھ دیا۔ نوائے حیات اور نوائے عصر کے نام سے اُن کے کلام کے دو مجموعے شائع ہوئے ہیں، ان سے ان کی قوم پروری اور حب الوطنی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کی ولولہ انگیز اور پرجوش قومی، ملی اور سیاسی نظموں کو مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے اکابر رہنماؤں نے بھی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔

دارالمصنفین کی علمی، تحقیقی اور تاریخی کتابوں میں بھی ہندو مسلم ایکتا اور ملک کی آزادی و اتحاد کے جذبہ کو ابھارنے اور فروغ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ علامہ شبلی کے مجموعہ مقالات و رسائل میں اس نوع کے متعدد مضامین شامل ہیں اور مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنی مشہور و معرکۃ الآرا کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو ان کا وہ عہد زریں یاد دلایا ہے جب دونوں گوناگوں تعلقات میں جکڑے ہوئے تھے، یہ کتاب دراصل ان لکچروں پر مشتمل ہے جو سید صاحب نے ۱۹۲۹ء میں ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کی دعوت پر دئے تھے۔ اس کا ایک لکچر سن کر پنڈت جواہر لال نہرو نے فرمایا تھا: "مولانا آپ نے تو متعدد سنسکرت کتابوں کو اُردو میں منتقل کر دیا ہے۔"

دارالمصنفین کی اس اہم خصوصیت کا ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم نے اس کے جشن طلائی کے خطبہ صدارت میں ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:۔

"اس مکتب فکر کے مصنفوں نے جہاں کہیں اسلامی تہذیب کے تعلقات قدیم یونانی ایرانی اور ہندی تہذیب سے دکھائے ہیں وہاں فصل کے بجائے وصل کے پہلو کو ابھارا ہے اور قصۂ سکندر و دارا نہ سنانے پر حکایت مہر و وفا بیان کرنے کو ترجیح دی ہے۔ ہندوستان میں تاریخ نگاری کے اس تاریک دور میں جب ہمارے اکثر مورخ اپنے مجازی استاد ازل کے کہے ہوئے کو طوطی صفت دہرایا کرتے تھے اور قرونِ وسطیٰ کے ہندوستان کو ایک بحرِ طوفان خیز بنا کر پیش کرتے تھے جس میں اسلامی تہذیب اور ہندو تہذیب کے دھارے ایک [illegible] دارالمصنفین کے مورخوں نے [illegible] تصادم نہیں بلکہ امتزاج [illegible]"

دارالمصنفین کی قوم پروری اور وطن دوستی کی وجہ سے [illegible] رہنماؤں اور آزادی و حریت کے علمبرداروں نے اس کے کارکنوں سے [illegible] روابط و تعلقات رکھے، تحریک خلافت اور [illegible] تقریباً تمام مشاہیر رہنما اس کے مہمان ہو چکے ہیں اور اب بھی وہ [illegible] ہندو اور مسلمان لیڈر آنے میں بڑی خوشی محسوس کرتے ہیں۔

گاندھی جی اپنے دورے کے سلسلے میں جب اعظم گڑھ تشریف لائے تو گو انہوں نے دارالمصنفین میں قیام نہیں کیا تاہم کارکنان دارالمصنفین سے ملنے کے لئے وہ یہاں خود آئے، جس وقت گاندھی جی یہاں آئے اس وقت لوگ مغرب کی نماز ادا کر رہے تھے، چونکہ اس زمانہ میں دارالمصنفین کی مسجد تعمیر نہیں ہوئی تھی اس لئے نماز ایک کھلی جگہ میں ہو رہی تھی۔ گاندھی جی یہ دیکھ کر وہیں کنارے گھاس پر نہایت خاموشی کے ساتھ بیٹھ گئے اور اپنے ساتھیوں کو بھی اشارے سے مودب اور خاموش رہنے کی تاکید کی۔ بعد میں لالٹین کی روشنی میں ان کو کتب خانہ دکھایا گیا۔ دارالمصنفین کے ایک رفیق نے اُن کے سامنے دستخط کے لئے اپنی یادداشت کی کتاب پیش کی تو انہوں نے اُردو میں دستخط کیا۔

پنڈت موتی لال نہرو اور پنڈت جواہر لال نہرو کا تو دارالمصنفین بے تکلف گھر ہی تھا، یہ لوگ جب یوپی کے مشرقی اضلاع کا دورہ کرتے تو اعظم گڑھ ضرور آتے اور ہمیشہ دارالمصنفین ہی میں قیام کرتے، مولوی مسعود علی صاحب بھی دورے میں ان لوگوں کے ہمراہ ہو جاتے تھے۔ کبھی کبھی پروگرام کی تبدیلی کی وجہ سے ان لوگوں کو اعظم گڑھ پہنچنے میں دیر ہوتی اور کھانے کا وقت ہو جاتا تو مولوی مسعود علی صاحب شبلی منزل سے کھانا منگوا کر راستے میں ہی وقت پر کھلا دیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ جواہر لال اور مولانا محمد علی کی اندارہ میں ٹرین چھوٹ گئی تو اعظم گڑھ کے مشہور قومی کارکن امجد علی غزنوی سابق ایم۔ ایل۔ اے کے والد اسد علی خاں صاحب نے جو سرکاری ملازم اور ریلوے میں اوور سیر تھے، ان قومی رہنماؤں کو اپنے ٹھیلے پر بٹھا کر اندارے سے پھپنا پہونچا دیا، اس کی وجہ سے ان لوگوں کے پروگرام میں زیادہ تاخیر نہیں ہوئی، البتہ اسد علی خاں صاحب اس الزام میں معتوب قرار پا کر سرکاری ملازمت سے برخاست کر دئے گئے، مولوی مسعود علی ندوی دارالمصنفین بھی اس سفر

یہ ان ہی کی رہنمائی کے ساتھ ساتھ رہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے اس ادارہ سے نفس واپسیں تک اپنا تعلق برقرار رکھا اور اپنے عزیز دوست مولانا مسعود علی ندوی کو ہمیشہ یاد رکھا اور برابر ان کو خطوط بھی لکھتے رہتے تھے۔ پنڈت جی دار المصنفین کے لائف ممبر بھی تھے۔ ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد دار المصنفین کی مالی حالت خراب ہو گئی تو پنڈت جی کے ایماء اور مولوی مسعود علی صاحب کی کوششوں سے مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم نے اپنی وزارت تعلیم سے ساٹھ ہزار کی یکمشت رقم اس کو عطا کی۔

مولانا ابو الکلام آزاد کو شروع ہی سے اس ادارہ سے بڑی دلچسپی رہی ہے اس کے اغراض و مقاصد کا خاکہ تیار کرنے میں ان کا بھی ہاتھ رہا ہے، جناب رفیع احمد قدوائی کو بھی اس ادارے سے بڑا تعلق خاطر تھا اور وہ بھی اس کے محسنوں اور لائف ممبروں میں تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم اس کی مجلسِ انتظامیہ کے باقاعدہ ممبر تھے۔ انہوں نے اس کے جشنِ طلائی کی صدارت منظور فرما کر خاص طور پر اس سے اپنے گہرے تعلق اور غیر معمولی اخلاص کا ثبوت دیا۔

اس موقع پر مسز سوچیتا کرپلانی نے جو اس وقت اتر پردیش کی وزیر اعلیٰ تھیں۔ دار المصنفین کی قدر دانی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی حکومت کی طرف سے اس کو دس ہزار روپے کی رقم عطا کی۔ اس وقت بھی دار المصنفین کی مجلس انتظامیہ کے صدر مشہور قومی رہنما ڈاکٹر سید محمود ہیں۔ مرکزی وزیر جناب فخر الدین علی احمد صاحب اس کی مجلس انتظامیہ کے ممبر ہیں اور اتر پردیش کے موجودہ گورنر ڈاکٹر گوپالا ریڈی اس کے لائف ممبر ہیں۔

دار المصنفین کے گوشہ نشین کارکن پہلے کی طرح اب بھی ملک کی سالمیت اور قومی اتحاد و یکجہتی کا مفید کام نہایت خاموشی سے انجام دے رہے ہیں اور اس کے موجودہ ذمہ دار شاہ معین الدین احمد ندوی اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے محبانِ وطن اور قوم پرور رہنماؤں سے مخلصانہ روابط و مراسم قائم ہیں اور وہ اسلامی علوم و فنون کی خدمات انجام دینے کے ساتھ ساتھ اتحاد اور یکجہتی کے ضروری اور اہم کام سے بھی غافل نہیں ہیں۔ شاہ صاحب ہر مہینے معارف کے شذرات میں قومی و سیاسی مسائل پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے قوم و ملک کو اصل ترقی، حقیقی آزادی اور ملک کی سالمیت و اتحاد کی جانب برابر متوجہ کرتے رہتے ہیں اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے عہد وسطیٰ کے ہندوستان کے متعلق تاریخی کتابوں کا جو سلسلہ شروع کیا ہے۔ ان سے بھی ایکتا، قومی یکجہتی، اور ہندو مسلم میل ملاپ کے کاز کو فروغ دینے میں بڑی مدد مل رہی ہے۔ صوبائی اور مرکزی حکومتوں نے اُن کی بعض کتابوں پر انعامات بھی دیئے ہیں۔

دار المصنفین کے قومی و ملکی خدمات اور اتحاد و آزادی کے بارے میں اس کے کارنامے اظہر من الشمس ہیں۔ اس کے بانی پہلے ناظم و منیجر نے قوم و وطن کی آزادی اور اتحاد کی جد و جہد میں اس وقت حصہ لیا تھا جب موجودہ سیاستدان اور لیڈر پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، تحریکِ آزادی کے جو قدیم رہنما باقی رہ گئے ہیں وہ اس کی گزشتہ شاندار خدمات سے پوری طرح باخبر ہیں لیکن نئی نسل کے لوگوں کو اس کی ان گزشتہ خدمات اور کارناموں سے کوئی خاص واقفیت نہیں رہ گئی ہے۔ اس لئے یہ "داستانِ کہن" دہرانے کی ضرورت پیش آئی ؎

اس واسطے چھیڑا ہے پروانوں کا افسانہ
شاید ترے کانوں تک پیغامِ عمل جائے

## غزل

بیان ظفر

جاگتے در ہیں یہاں پر نہ کھُلا پٹ کوئی
تیری بستی ہے کہ ویران سا مرگھٹ کوئی

اُف یہ انساں ہیں کہ پتھر کی تراشی مورت
دل میں نرمی ہے نہ آنکھوں میں لگاوٹ کوئی

جب کبھی آتی ہے عارض پہ حیا کی سُرخی
اپنے ہاتھوں کو بنا لیتا ہے گھونگھٹ کوئی

سانس رنگینیٔ ماحول کی رک جاتی ہے
جب ہٹا دیتا ہے چہرے پہ گری لٹ کوئی

میری تنہائی کو پہناتی ہے خوشبو کا لباس
بسترِ یاد پہ مہکی ہوئی سلوٹ کوئی

رات بھر دل میں سُلگتے رہے زخموں کے الاؤ
رات بھر یونہی بدلتا رہا کروٹ کوئی

شام کے ساتھ ہی اک درد مرے دل میں خمار
ایسے آتا ہے کہ ہوتی نہیں آہٹ کوئی

فرزانہ احمد

# کڑواہٹ

وہ غسل خانے میں بیٹھی کپڑے دھو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ کہنیوں تک صابن کے روپہلی جھاگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس کا جسم پسینے میں شرابور ہوا جا رہا تھا اور اس کے لمبے لمبے کالے بال بھیگ کر اس کے چہرے اور شانوں سے چپک گئے تھے وہ بڑی تندہی سے رگڑ رگڑ کر کپڑے دھو رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ کاش وہ اپنے منہ کی کڑواہٹ بھی اسی طرح رگڑ رگڑ کر دُور کر سکتی کاش ان کپڑوں کی طرح اس کے ماضی سے بھی زندگی کا سارا میل کٹ جاتا اور پھر سے ایک بار ایک نئے اور اُجلے مستقبل کی جستجو اس کے دل میں نئی اُمنگ نئے ولولے اور نئے جذبات جگا دیتی۔ لیکن اس کے منہ کی یہ کڑواہٹ اُسے مستقبل کے اُجالوں سے دُور بہت دُور ماضی کے تنگ و تاریک ویرانوں میں گھسیٹ رہی تھی اور اُس کے حلق سے ہوتی ہوئی یہ کڑواہٹ جیسے اُس کے سارے جسم میں کسی زہر کی مانند سرایت کر گئی تھی اور یہ اب اس کے بدن کا ایک ایک عضو، ایک ایک جوڑ اُس کے زہر کی کڑواہٹ سے دکھ رہا تھا۔ اس کے سینے میں جیسے ایک آگ تھی جس کے لپکتے ہوئے شعلوں سے اس کا سارا وجود تپ رہا تھا، سلگ رہا تھا۔

اُس نے دفعتاً صابن کے اُبلتے ہوئے جھاگ سے اپنے ہاتھ نکال لیے اور اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ اُس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو اُمڈ آئے۔ اُس زمانے میں جب وہ کالج کی ایک الہڑ شوخ اور بے پروا طالبہ تھی تو میکبتھ کے بارے میں پڑھا تھا کہ کس طرح اسکاٹ لینڈ کے بادشاہ کو قتل کرنے کے بعد اُس نے اپنے خون سے لت پت ہاتھوں کو بڑی حسرت سے دیکھ کر کہا تھا: "یہ خون کے داغ اب کسی طرح بھی مٹائے نہیں جا سکتے۔ ان دھبوں کو دُنیا کے سارے سمندروں کا پانی بھی نہیں دھو سکے گا۔"

کیا اس کی قسمت میں بھی یہی لکھا تھا۔ کیا اس کا بھی یہی انجام ہونے والا تھا۔ کیا یہ کڑواہٹ، اس کے منہ کا یہ کسیلا پن، اس کے ماضی کی تلخیوں کو ایک بدنما داغ کی طرح ہمیشہ یونہی اُبھارتا رہے گا۔ کیا اس کا ضمیر ہمیشہ اُسے اسی طرح آواز دے کر کہے گا کہ تم خونی ہو۔ ہاں تم نے خون کیا ہے۔ پاسِ وفا کا، پیار کے اس مقدس رشتے کا جس کے فنا ہو جانے کے بعد زندگی میں سوائے تلخی اور کڑواہٹ کے کچھ اور نہیں رہ جاتا۔

اُس نے صابن سے بھرے ہاتھوں پر اپنی پیشانی ٹیک لی اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ کتنی بڑی نادانی کی تھی اُس نے۔ کیسا پاگل پن تھا وہ۔ اُف میرے خدا۔ یہ کڑواہٹ۔ اور اُس نے بڑی زور سے غسل خانے کے پکے فرش پر تھوک دیا۔

اُس کی زندگی کی کتاب کو بہ آسانی دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا تھا اور ان دونوں کے بیچ میں ایک موٹی سی لکیر کھینچی جا سکتی تھی جس کے ایک طرف تو خوشیوں کی گود میں بتائے ہوئے جوانی اور الہڑ پن کے وہ خوش گوار دن تھے جب وہ ایک بدمست ہرنی کی طرح صحرا صحرا



فرزانہ احمد

گلشن گلشن گھوما کرتی تھی۔ ایک اعلیٰ خاندان اور اُونچے گھرانے کی ہونہار اور قابل لڑکی جس کے حسن کی شمع جس محفل میں جل جاتی تو لوگ دیوانہ وار پروانوں کی مانند اُس پر نثار ہونے کی آرزو میں اپنے تن من دھن کی بازی لگا دیتے۔ اُس بے فکری کے زمانے میں اُسے ایسا لگتا جیسے اُس کی زندگی ایک میٹھا، مدھر اور سُریلا سا گیت ہو جو کبھی نہ ختم ہونے والا —

پھر دُوسری طرف اُس کی زندگی کا وہ باب شروع ہوتا تھا جہاں آکر مسرتوں اور شادمانیوں کے رنگین اجالوں کو قسمت کی تیرگی نے اپنے سائے میں آہستہ آہستہ جذب کر لیا تھا۔ یہاں تک کہ اُس کی خوشیوں اور مسرتوں سے بھرپور ہنستی مسکراتی دُنیا کو گہن لگ گیا تھا۔ اور اب مایوسی کے اس گہرے اندھیرے میں اُمید کی ایک ہلکی سی کرن بھی کہیں دکھائی نہیں پڑتی تھی۔ جس کی ضیا سے اُس کی بے نور ہوتی زندگی میں خوشی کی کوئی لَو ٹمٹمائی —

کہاں گئے وہ اُمنگوں بھرے خوشیوں سے سرشار شب و روز — کہاں گئے وہ اُس کی زندگی کے اُجالے — عندلیب نے سوچا — ایسا لگتا تھا کہ جیسے جو کچھ اُس نے دیکھا جو کچھ سُنا تھا وہ سب ایک خواب تھا۔ ایک رنگین سپنا — جو پلک جھپکنے میں یوں ٹوٹ کر بکھر گیا کہ وہ اپنی آرزوؤں اور ارمانوں کے ریزے چنتی رہ گئی۔

وہ مستی بھرے دن — جب اُس کی زندگی کسی سبک رفتار اور پُرسکون پانی کی سطح پر بہنے والی ناؤ کی طرح خراماں خراماں چلی جارہی تھی کہ اچانک نجم کی آمد نے اُس کی زندگی کی کشتی کو ایک تیز و تند گرداب میں ڈال دیا اور اُس نے اپنی زندگی کے پتوار جذبات کے اس بہتے طوفان کے حوالے کر دیئے اور حالات کے بھنور میں پھنستی چلی گئی — ڈوبتی چلی گئی —

نجم ایک سادگی پسند آدمی تھا — اُس کی صورت شکل، رہن سہن، یہاں تک کہ اُس کے عادات اطوار نہایت ہی سادہ اور عامیانہ درجے کے تھے۔ وہ معمولی کپڑے پہنتا۔ معمولی کھانا کھاتا اور معمولی رستوراں میں معمولی سی کافی یا چائے پیتا — لیکن نجم کے اس عام سے چہرے کے پیچھے ایک غیر معمولی دماغ تھا، ایک غیر معمولی شخصیت تھی جو ایک مقناطیس کی طرح ہر آدمی کو اپنی جانب کھینچ لیتی۔ عندلیب بھی نجم کی اس مقناطیسی کشش کے دائرے میں آکر نکل نہ سکی اور پھر اُس کی طرف ایسی کھنچی جیسے لوہے کا ایک معمولی ٹکڑا [illegible]

نجم سے مل کر عندلیب [illegible] گئی کہ وہ ایک اعلیٰ خاندان کی [illegible] وہ یہ بھی بھول گئی کہ اُسے اپنی تعلیم پوری کر [illegible] ڈویژن حاصل کر کے اپنے ماں باپ کی [illegible] ہے۔ جب اُن کا سر فخر سے اُونچا ہو جاتا [illegible] احباب و عزیز و اقارب سے کہتے [illegible] ہے۔ ہماری عندلیب [illegible] حسن کا مقابلہ کوئی کر سکتا ہے؟" اور پھر وہ [illegible] سے اور بڑی دھوم دھام سے اپنی اکلوتی لڑکی کا بیاہ [illegible] کے کسی معزز اور رئیس گھرانے کے کسی تہذیب یافتہ ہونہار [illegible] سے کر دیتے جو عندلیب کی زندگی پر بہار بن کر [illegible]

لیکن عندلیب کو پہلے ہوش ہی کہاں تھا۔ [illegible] اسے تو صرف اتنا یاد تھا کہ وہ نجم سے بے انتہا محبت کرتی ہے۔ [illegible] کی گہرائیوں سے اُسے پیار کرتی ہے۔ اُسے لگتا جیسے نجم اور وہ ایک دوسرے کے لئے بنائے گئے ہوں۔ جیسے وہ جنم جنم کے ساتھی ہوں اور دنیا کی کوئی طاقت اُن دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتی۔

سرمستی کے اسی عالم میں عندلیب سارے بندھنوں کو توڑ کر سارے رشتوں کو بھلا کر اور اپنی زندگی کے خوابوں کے [illegible] ایک نیا جہاں بسانے کے لئے نجم کے ساتھ نکل پڑی۔ محبت کی اُن انجان راہوں پر جہاں سے گزر کر اُسے ایک ایسی منزل تک پہونچنا تھا جہاں اُس کی آرزوؤں اور تمناؤں کی انجمن [illegible] اُس کی منتظر تھی۔

پہلے پہل تو نجم جیسے غیر معمولی دل و دماغ والے انسان کی بیوی بن کر زندگی گزارنا عندلیب کو بڑا ہی اچھا لگا۔ بڑا ہی [illegible] لگا۔ گو نجم ایک معمولی سے دفتر میں ملازم تھا لیکن محبت کا [illegible] —

عندلیب اور نجم ایک دُوسرے کی محبت میں [illegible] دنیا و مافیہا کی کچھ خبر ہی نہ رہی۔ جب نجم جذبات کا ایک طوفان اپنی آنکھوں میں چھپائے بڑی میٹھی نظروں سے عندلیب کی طرف دیکھتا تو عندلیب [illegible]

دل سے یہی دعا نکلتی کہ کاش یہ انمول لمحے، یہ زندگی کے رس میں ڈوبی ہوئی رنگین ساعتیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اُس کی باہنوں میں مقید ہو جاتیں اور وہ اپنی ساری عمر ایک دلفریب اور حسین خواب کے سائے تلے گزار دے۔

لیکن جب یہ خوبصورت سپنا ٹوٹا تو عندلیب نے دیکھا کہ اُس کے لٹے ہوئے سہانے سپنے اندھیری رات کی خوشیوں کی نذر ہو چکے تھے اور وہ ایک مریل روتی بسورتی ہچکیاں لیتی لڑکی کی ماں بن چکی تھی ــــ

پھر نہ جانے کیسے عندلیب کی ہنستی مسکراتی پُر بہار زندگی میں تلخ حقیقتوں کا زہر گھلتا گیا ــ گھلتا چلا گیا ــــ اب عندلیب میں نہ وہ شوخی رہی تھی، نہ وہ چلبلا پن، اور نہ ہی حالات سے سینہ سپر ہو کر مقابلہ کرنے کی اُمنگ ــــ وہ بجھی بجھی سی افسردہ سی دن بھر گھر کے کام کاج میں لگی رہتی۔ وہ سوچتی کیا ایسی دن کے لئے اُس نے نجم سے شادی کی تھی کیا اسی لئے اُس نے اپنوں سے رشتہ توڑا تھا اور ایک نئے اور انجان شہر میں آ کر اپنی دُنیا بسائی تھی، کہ سارا دن وہ چولہے چکی میں لگی رہے۔ اس کے یہ کومل کومل خوب صورت ہاتھ آٹا گوندھنے، جھاڑو لگانے، برتن مانجھنے اور ایک دم روتی کلبلاتی بچی کے گندے کپڑے دھونے کے لئے تو نہیں بنے تھے اور جس کے لئے یہ سب کیا تھا وہ بھی اس سے دُور دُور سا رہنے لگا تھا۔ نجم کو اب اپنی کتابوں اور پڑھنے لکھنے سے فرصت ہی کہاں تھی جو وہ اُس سے پیار محبت کی باتیں کرتا۔ اُس کے نرم ملائم ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگا کر کہتا کہ "تم تو اِس گھر کی رانی ہو تمہیں اتنا کام نہیں کرنا چاہئے۔" اُس کی زندگی تو بس گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر تک محدود تھی۔ رات آٹھ بجے جب وہ آفس سے لوٹتا تو تھک کر اس قدر چور ہوتا کہ کھانا کھا کر سیدھے بستر پر جا لیٹتا اور پھر صبح ہی کی خبر لیتا۔ صبح نو بجے تک اخبار کو جونک کی طرح چاٹ ڈالتا اور پھر دفتر کو روانگی کا وقت سر پر آ کھڑا ہوتا ــ بس یہی تھا اُن کی زندگی کا معمول۔ عندلیب کو اب اس گھر کی کوئی چیز بھی ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ اس گھر کے در و دیوار جیسے اُسے کاٹ کھانے کو دَوڑ رہے تھے اس چار دیواری میں اس کا دم گھٹنے لگتا اور وہ ایک بے بس پنچھی کی طرح پر پھڑ پھڑا کر اس قید خانے سے باہر نکلنے کے خواب دیکھا کرتی۔

عندلیب نے سوچا ایک زمانہ وہ تھا جب اُسے نجم کے ساتھ ایک معمولی سے ریستوران میں ٹوٹی پھوٹی سی پیالی میں چائے پی کر ایک گونہ خوشی ہوتی جیسے وہ اس ٹوٹی پیالی سے نہیں بلکہ اپنی امی کے ولایت سے منگوائے ہوئے خوب صورت سیٹ کی پیالی میں چائے پی رہی ہو۔ اور پھر جب وہ دونوں محبت کے نشے میں سرشار ہاتھوں میں ہاتھ دیئے باہر نکلتے اور نجم اُسے بڑے پیار سے اُس بوڑھے پان والے کی گندی دکان سے ٹھنڈا میٹھا رس میں ڈوبا ہوا بنارسی پان کھلاتا تو عندلیب کی خوشی کی انتہا نہ رہتی ــــ لیکن آج جب وہ اپنے گھر میں اپنی ٹوٹی ہوئی چائے دانی اور بے رنگ چائے کی پیالیوں کو دیکھتی تو اُسے اُبکائی سی آنے لگتی اور اُس کا جی چاہتا کہ یہ سب برتن ایک ایک کر کے فرش پر دے مارے اور پھر اُن کی ٹوٹی ہوئی کرچیوں کے بیچ میں بیٹھ کر خوب قہقہے لگائے۔ اتنا ہنسے اتنا ہنسے کہ اُس کے آنسو نکل آئیں ــــ اور پھر وہ اتنا روئے کہ اُس کا سارا گھر اُن آنسوؤں کے سیلاب میں بہہ جائے۔

پھر ایک دن ایک حادثہ ہو گیا ــــ اُس روز اُس کی عزیز ترین دوست ناظمہ کی شادی ہو رہی تھی۔ ناظمہ اس کے پڑوس میں ہی رہتی تھی۔ عندلیب صبح ہی سے اپنی سہیلی کی شادی میں جانے کی تیاری میں لگی ہوئی تھی۔ شام ہوتے ہوتے اس نے گھر کا سارا کام کاج پورا کر لیا۔ بچی کو کھانا کھلا کر اور سُلا کر اُس نے اپنا گلابی جوڑا نکالا جسے کبھی وہ پہنتی تھی تو نجم مبہوت سا ہو کر اُسے تکتا رہ جاتا تھا ــــ لیکن اب ــــ اب تو نجم کو خبر بھی نہ ہوتی تھی، کہ وہ کیا پہنتی ہے کیا کھاتی ہے اور کیسے جیتی ہے۔ اور آج بھی نجم نے کہہ دیا تھا کہ وہ گھر ہی پر رہے گا اُسے شادی بیاہ کے ہنگاموں سے گھبراہٹ ہوتی تھی ــــ چنانچہ عندلیب اکیلی ہی چلی گئی۔

ناظمہ اپنے کمرے میں سُرخ جوڑے میں گٹھری سی بنی بیٹھی تھی۔ برات آنے میں ابھی دیر تھی۔ گھر کے سب لوگ کام کاج میں مصروف تھے۔ عندلیب ناظمہ کے پاس جا کر بیٹھ گئی اور اُسے چھیڑنے لگی کہ اچانک ایک اجنبی اُن کے کمرے میں داخل ہو گیا ــــ لانبا سا چھریرا بدن ــــ گورا رنگ ــــ نیلی نیلی آنکھیں اور چہرے پر ایک دلآویز مسکراہٹ ــ جانے کیوں عندلیب کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ دونوں کی آنکھیں ایک لمحہ کے لئے چار ہوئیں اور پھر عندلیب نے گھبرا کر نگاہیں جھکا لیں۔ کوئی اس کے کانوں میں کہہ رہا تھا "چشم بد دُور۔ اگر بجائے ناظمہ کے اس سُرخ جوڑے میں آپ ہوتیں تو واللہ غضب ہو جاتا۔"

اچانک ناظمہ نے اپنا گھونگھٹ ہلکے سے کھسکا دیا۔ "انور تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آؤ گے۔" ناظمہ نے اُسے ڈانٹا۔ اور پھر بڑے پیار سے عندلیب کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہنے لگی "بُرا مت ماننا۔ یہ میرے چچا زاد بھائی ہیں انور ـــ ابھی ابھی جرمنی سے لوٹے ہیں اور سمجھتے ہیں یہاں کی لڑکیاں بھی اُدھر کی طرح بے باک ہوتی ہیں ـــ جان نہ پہچان بس چھیڑے جائیں گے۔" لیکن انور پر اس لیکچر کا ذرّہ برابر بھی اثر نہیں ہوا۔ اُس نے اُس بے باکی سے اپنی نیلی نیلی آنکھوں کو عندلیب کے چہرے پر جماتے ہوئے کہا۔ "ارے میں کوئی غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں۔" اور اس سے پہلے کہ ناظمہ اُسے مارے دوڑتی وہ وہاں سے رفوچکر ہو چکا تھا ـــ

شادی کے اُس ہنگامے میں سارا وقت عندلیب کو ایسے لگا کہ جیسے دو نیلی نیلی آنکھیں اس کا تعاقب کر رہی ہوں۔ بار بار اُس کے کانوں میں وہی الفاظ گونجتے۔ "اگر اس سُرخ جوڑے میں آپ ہوتیں تو غضب ہو جاتا ـــ اگر آپ ہوتیں تو ـــ" اور گھبرا کر عندلیب نے اپنے کان بند کر لئے۔ توبہ توبہ اُسے کیا ہو گیا تھا۔

گھر آ کر بڑی دیر تک عندلیب اپنا سراپا آئینے میں دیکھتی رہی۔ کیا ہوا اگر وہ اب ایک الہڑ دوشیزہ نہیں رہی تھی۔ کیا ہوا اگر اُس کے گھنے کالے بالوں میں کہیں کہیں اِکا دُکا چاندی کا تار چمکنے لگا تھا اور اس کے گالوں کے گلاب اب زرد پڑنے لگے تھے۔ وہ اب بھی بے حد حسین تھی۔ اُس کی گہری جھیل جیسی سیاہ آنکھیں اُس کی ریشمی پلکیں اور اُس کے کنول کی پنکھڑی ایسے گلابی ہونٹ سب اس بات کا ثبوت تھے کہ اب بھی جس طرف اُس کی نظر اُٹھ جائے لوگ دل تھام کر رہ جائیں گے۔

ناظمہ کی شادی اور رخصتی کے بعد بھی انور ناظمہ کے گھر ٹھہرا ہوا تھا۔ ناظمہ نے اُسے بتایا تھا کہ وہ اور چند ہفتے وہاں رہے گا۔ اس نے مختلف جگہوں پر نوکری کے لئے درخواست دے رکھی تھی اور جیسے ہی کہیں بات بن جائے گی۔ وہ چلا جائے گا۔

عندلیب کو ہر دم چھیڑنا اب انور کا دستور بن گیا تھا۔ وہ کسی نہ کسی بہانے اُس کے گھر آ جاتا یا کسی کو بھیج کر عندلیب کو بلوا لیا کرتا اور عندلیب کے لاکھ منع کرنے پر بھی اپنی حرکتوں سے باز نہ آتا۔

ایک دن عندلیب ناظمہ کی [illegible] انور نے اُس کا راستہ روک لیا عندلیب [illegible] تو انور بڑی گمبھیر آواز میں بولا ـــ عندلیب [illegible] کر الگ رہو گی۔ میں اتنا بُرا تو نہیں ہوں۔ [illegible] کی آواز میں بے پناہ حسرتوں کا ہجوم پنہاں [illegible] انور کی طرف دیکھا۔ انور کی آنکھوں میں اُس کے دل کا [illegible] آیا تھا۔ عندلیب کو لگا جیسے یہ ایک پل ایک صدی میں تبدیل ہو گیا ہو۔ وہ دونوں پتھر کی مورتیوں کی طرح کھڑے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ پھر انور کہیں دور سے بولا۔ "عندلیب مجھے تم سے بہت کچھ کہنا ہے کیا میں اُمید کر سکتا ہوں کہ تم مجھے اس کا موقع دو گی؟"

"لیکن انور ـــ" عندلیب ہچکچاتے ہوئے بولی "یہ سب غلط ہے تم بھول رہے ہو کہ میں ایک شادی شدہ عورت ہوں۔ ایک بچی کی ماں ہوں اور . . . . ."

"میں سب جانتا ہوں" انور نے اس کی بات کاٹ کر کہا اور میں وہ سب بھی جانتا ہوں۔ جو تم مجھے بتانا نہیں چاہتی ہو میں تمہارا دکھ بانٹنا چاہتا ہوں عندلیب۔ بتاؤ کیا میں تمہیں اچھا نہیں لگتا ـــ؟" اور انور نے بے خودی کے عالم میں اُس کا ہاتھ تھام لیا ـــ عندلیب کے جسم میں جیسے بجلی کوند گئی۔ وہ لرز کر رہ گئی۔ اُس کے پیر لڑکھڑانے لگے اور وہ وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔

رات اُس نے بڑی بے چینی کے عالم میں گزاری جب بھی آنکھیں بند کرتی انور کا سنجیدہ چہرہ اُس کے ذہن کے پردے پر اُبھرنے لگتا۔ اور اُس کی درد میں ڈوبی ہوئی آواز اُس کے کانوں میں گونجنے لگی۔

دوسرے دن ناظمہ کا ننھا منا بھائی اُس کے لئے ایک رقعہ لے آیا۔ کانپتے ہاتھوں سے جب عندلیب نے اسے کھولا تو اندر انور کی تحریر تھی۔ لکھا تھا "تم سے آخری بار التجا کر رہا ہوں کہ آج آ کر میرے دل کا حال سُن جاؤ۔ پھر میں تم سے کبھی کچھ نہ مانگوں گا اور تمہاری دُنیا سے دُور چلا جاؤں گا۔ خدا کے لئے میری خواہش کو ٹھکرا نہ دینا۔ آج رات میں اپنے کمرے کے پیچھے والے برآمدے میں تمہارا انتظار کروں گا ـــ

ـــ انور ـــ"

وقت تک سو چکی تھی۔ وہ کیا کرے۔ دل و دماغ کی کشمکش جاری تھی۔ ایک اسے جھنے پر مجبور کر رہا تھا اور دوسرا اس کے قدموں میں بیڑیاں ڈالتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اسے یہ سب نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن کوئی انجانی طاقت اسے بار بار انور سے ملاقات کرنے پر اکسا رہی تھی۔

جب نجم آفس سے واپس آتے ہی کھانے سے فارغ ہو کر سونے کی تیاری کرنے لگا تو عندلیب نے کہا — "بہت دن سے نادرہ کا کوئی خط نہیں آیا ہے۔ ذرا انور سے پوچھ آؤں کیا بات ہے۔" نجم نے نیند سے ڈوبی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھا اور سر ہلا دیا۔ اور عندلیب دھڑکتے دل اور لرزتے قدموں کے ساتھ انور کے کمرے کی طرف چلی۔

برآمدے تک پہنچتے پہنچتے اس کے ہاتھ پیر برف کی طرح سرد ہو گئے۔ سر چکرانے لگا اور اگر انور نے آگے بڑھ کر اسے مضبوط بازوؤں کا سہارا نہ دیا ہوتا تو وہ برآمدے میں دھڑکتی چوکی سے ٹکرا کر گر پڑی ہوتی۔ انور نے آہستہ سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے اپنے کمرے میں لے آیا۔

"تمہیں کیا کہنا ہے مجھ سے انور" اس نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"تم اچھی طرح جانتی ہو جو میں تم سے کہنا چاہتا ہوں" انور نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں عندلیب — بے پناہ محبت — تمہارے بغیر میری زندگی ویران رہے گی۔ کسی لق و دق صحرا کی طرح —"

"باتیں بنانی تو خوب آتی ہیں تمہیں —" عندلیب نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے پیار بھری نظروں سے انور کی طرف دیکھا۔ ایک دم سے اس کا خوف نہ جانے کہاں رفوچکر ہو گیا تھا۔ وہ انور کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو۔ کاش تم مجھے پانچ سال پہلے ملے ہوتے۔"

"خدا کے لئے عندلیب مجھ پر رحم کرو ورنہ میں تباہ ہو جاؤں گا۔"

انور اس کے بالکل قریب آ گیا تھا اتنا قریب کہ اس کی گرم گرم سانسوں کی تپش سے اس کا چہرہ جھلس رہا تھا اور پھر انور نے اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا اور اپنے جلتے ہوئے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔ اس کے ہاتھ آہستہ آہستہ عندلیب کے جسم پر پھیلنے لگے۔ اور عندلیب کو ایسا لگا جیسے ہزاروں ننھی ننھی چیونٹیاں اس کے بدن پر رینگ رہی ہوں۔ اور پھر سبھی دوریاں، سبھی فاصلے ہوا میں تحلیل ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔

اچانک برابر والے کمرے کی گھڑی کی ٹن ٹن نے عندلیب کے دل و دماغ میں طوفان سا برپا کر دیا۔ اسے ایک جھٹکا سا لگا جیسے وہ کوئی خواب دیکھتے دیکھتے جاگ پڑی ہو۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ دور بہت دور کسی بچے کے رونے کی آواز مستقل اس کے کانوں میں سیسہ پگھلا رہی تھی اور گھڑی کی ٹن ٹن مستقل اس کے کانوں میں سیسہ پگھلا رہی تھی جیسے آنے والے خطرے سے اسے خبردار کر رہی ہو — عندلیب نے ایک جھٹکے سے اپنے آپ کو انور کی گرفت سے چھڑا لیا، کانپتے ہاتھوں سے اپنی ساری کی شکنیں ٹھیک کیں اور بجلی کی سی سرعت سے کمرے سے باہر نکل آئی۔ انور اسے پکارتا ہی رہ گیا لیکن عندلیب نے گھر آ کر ہی دم لیا —

گھر میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مکمل سکوت — جیسے پُرزور آندھی اور طوفانی بارش کے ختم جانے کے بعد سکون چھا گیا ہو — نجم کبھی کا سو چکا تھا اور اس کی ننھی منی بیٹی بھی نیند کی دیوی کے زانو پر سر رکھے خوابوں کی دنیا میں گم تھی۔ عندلیب نے آئینے میں اپنے اجڑے ہوئے چہرے کا جائزہ لیا۔ دہشت زدہ آنکھیں، بکھرے ہوئے بال، بے رنگ اور غم و رنج سے سُرخ چہرہ۔ اس نے اپنا منہ نوچ لیا۔ یہ اچانک وہ دنیا کی بدصورت ترین عورت میں کیسے تبدیل ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا طوفان پھٹ پڑنے کے لئے بے قرار تھا اور اس کے منہ میں ایک عجیب سی کڑواہٹ پھیل رہی تھی جیسے کسی نے بہت ہی کڑوی دوا اس کے حلق میں انڈیل دی ہو اور اس کے حلق سے ہوتی ہوئی یہ کڑواہٹ اس کے سارے جسم میں زہر کی مانند پھیل رہی ہو — پھر وہ زار و قطار رونے لگی۔ اس نے اپنا منہ دوسری طرف نفرت سے پھیر کر فرش پر تھوک دیا — اُف یہ کڑواہٹ — آخ تھو — آخ تھو —

آج کل کے مئی ۱۹۷۰ء کے شمارے میں نیشنل گیلری آف ماڈرن آرٹ سے متعلق انیس ناروی کا مضمون شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں شامل تصویریں نیشنل گیلری آف ماڈرن آرٹ نئی دہلی سے حاصل ہوئی تھیں اور اُن کے شکریہ کے ساتھ شائع کی گئی ہیں۔

# غزلیں

## حسرت شادانی

جنوں بخیر، ہر آفت سے کامراں نکلے
تلاشِ منزلِ جاناں میں ہم جہاں نکلے

ہم آگئے ہیں رسن و دار تک محبت میں
تمہارے قول فقط زیبِ داستاں نکلے

ستم شعار طلب نے ہر اک ستم کے بعد کہا
ہمارے دل کے ابھی حوصلے کہاں نکلے

نکلنا، اُن کا سجاکر وہ مانگ میں افشاں
کہ جیسے شب میں ستاروں کا کارواں نکلے

نہ جانے کون سی طاقت تھی جس نے روک دیا
جنوں کی راہ میں ہم جب بھی ناگہاں نکلے

میری تباہی کا افسانہ بن گئے، ہمدم
وہ بال و پر جو پسِ شاخِ آشیاں نکلے

لگا کے خانۂ حسرت میں آگ، کہتے ہیں
اس آگ سے نہ کبھی دیکھنا دھواں نکلے

## ضیا ساحری

رات رُک جاتی ہے جب ذہنِ پریشاں کے قریب
درد کے پھول مہکتے ہیں رگِ جاں کے قریب

کتنے دل ٹوٹ کے بکھرے ہیں تمہیں کیا معلوم
آج حالات کے جلتے ہوئے زنداں کے قریب

آس کے دشت سے برہنہ قدم آئے ہوئے
خواب لیٹے ہیں اُمیدوں کے شبستاں کے قریب

دل کے جلنے کی مہک سے سب ہی گھبراتے ہیں
کون رُکتا ہے، سلگتے ہوئے انساں کے قریب

دردِ دل، دردِ وفا، دردِ محبت کی قسم
رات بھر یاد تری تھی دلِ ویراں کے قریب

عمر تو شر ہے ٹھہروگے تو جل جاؤ گے
میری تپتی ہوئی سانسوں کے بیاباں کے قریب

تھی کشش ایسی نگاہوں میں غزالاں کی ضیاء
لُٹ گیا حسنِ بہار آکے گلستاں کے قریب

## [illegible]

رہا طلب میں [illegible]
تاریکیوں سے [illegible]
دلِ آپ کا بھی [illegible] سے کل حیات [illegible]
اس میں ہے زندگی [illegible] آپ [illegible] دل [illegible]
ہر موج بن کے [illegible] پہ [illegible]
ساحل کے اعتماد پہ [illegible] تو [illegible]
زم زم کا واقعہ بھی ہے انساں کا معجز[illegible]
صحرا کی گرم ریت سے پانی نچوڑ[illegible]
رکھئے خودی کا پاس [illegible] زندگی کے سا[illegible]
ہر سنگِ آستاں پہ نہ سر اپنا پھوڑ[illegible]
غم ہو یہ خوشی ہے جہانِ حیات میں [illegible]
درکار ہے خوشی تو نہ غم سے منہ موڑ[illegible]

## رضا اشک بستی پوری

فصلِ گل بھی آئی ہے اور رات بھی سنگی [illegible]
پھر بھی ان فضاؤں میں کیفیت جلن کی ہے

کیا پتہ کہ یہ کیسے پیار کا جنازہ ہے
لوگ یوں تو کہتے ہیں پالکی دُلہن کی ہے

ہائے کیا صحرا ہے اک یہ کسی کی تربت [illegible]
آہ یہ گلِ تنہا! جانے کس چمن کی ہے

یہ جو ذبح انساں کی [illegible] زبانی [illegible]
کچھ نہ پوچھ یہ سب سازش شیخ و برہمن کی [illegible]

تو میری سہیلی ہے، تو جبا [illegible] ہو
تجھ سے کیا چھپانا [illegible] کیا من کی [illegible]

# دکنی لوک گیت

محمد انیس قمر



عوامی ادب اپنی خاص اصطلاح میں وہ ادب ہے جس کے خالق بحیثیت مجموعی محض عوام ہی ہوتے ہیں۔ یعنی جس کا کوئی جانا پہچانا خالق نہ ہو بلکہ جو نسل در نسل، سینہ بہ سینہ تخلیق پا تا منتقل ہوتا چلا آیا ہو اور جو ابھی تک ضبط تحریر میں نہ آیا ہو۔ ہندوستان کے اور علاقوں اور دیگر زبانوں کی طرح دکن اور دکنی کا دامن بھی عوامی ادب کے ہیرے موتیوں سے بھرا پڑا ہے۔ لیکن ماہرین لسانیات اور محققین علم و ادب کی نگاہ جوہر شناس نے اس طرف ہنوز کوئی خاص اور باضابطہ توجہ نہیں کی ہے۔

بلا کسی خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسانی تہذیب و تمدن اور علم و ادب کے شعوری ارتقا سے پہلے انسانی احساسات و جذبات کا وسیلہ اظہار نثر سے زیادہ نظم ہی کے پیرائے میں رہا ہے۔ ایسے اولین دور میں ظاہر ہے کہ ہم علم و فن کے اداروں اور مدارس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس لئے ایسے دور میں تخلیق پایا ہوا علم و ادب انفرادی سے زیادہ اجتماعی نوعیت کا حامل ہوگا۔ جو مختلف ادوار، مختلف علاقوں اور مختلف نسلوں میں تقسیم ہوتا رہا ہوگا۔ اس تقسیم کے ساتھ ساتھ اس میں کمی و بیشی کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ دکنی، عوامی ادب اور لوک گیتوں کی تاریخ بھی ایک ایسے ہی دور کی یادگار ہے جس کے آغاز اور ابتدائی مرحلوں کو پوری طرح پردۂ خفا سے باہر لانا مشکل ہے۔ لیکن یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ دکنی بالکلیہ ایک عوامی زبان تھی اور ہے اور اس کا عوامی ادب بالخصوص لوک گیت کسی اور زبان کے سرمایہ کی بہ نسبت کچھ کم مالا مال نہیں ہیں۔ آج بھی دکن کے طول و عرض میں ان کو بالکل صحیح و سالم رنگ و روپ میں نہ سہی مگر کچھ مسخ شدہ حالت یا کچھ ترمیم و اضافے کے ساتھ دیکھا سنا جا سکتا ہے۔ ان میں گھرانوں، فرقوں اور علاقوں کی تبدیلی اور مرور مدت کے ساتھ ساتھ بدلے ہوئے مزاج اور لب و لہجہ کا فرق بھی نمایاں ہوتا رہتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کا یہ خیال درست ہے کہ گیت مزاجاً نسوانیت کی غنائی اظہار کی ایک صورت ہے اور گیت عورت کے جسم کا اظہار نہیں بلکہ اس کی پکار ہے۔ لیکن اگر گیت کی تعریف یہی قرار دی جائے تو میرے خیال میں گیت کی صنف سخن کے ساتھ پورا پورا انصاف نہیں ہو سکتا کیونکہ اس میں نہ صرف مردانہ احساسات و جذبات کا گرم گرم تموج ہی ملتا ہے۔ بلکہ ساز و نے کے تال و سُر پر رقص کرتی، عورتوں کی جماعتوں، ٹولیوں اور مردوں کی ٹکڑیوں اور دلوں کے شوخ و سنجیدہ تصورات و خیالات سماجی و مذہبی مسائل و معاملات، تصوف و تشکر، عبادت و ریاضت کی لوازمات کے علاوہ انگڑائیاں لے کر بیدار ہونے والی شوخیوں و شرارتوں اور کھیل کود کی رنگ برنگی دلچسپیاں بھی نظر آتی ہیں۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ گیت بہ اعتبار موضوعات و مضامین اور بہ لحاظ اسالیب و آہنگ غزل کی طرح بلکہ غزل سے بھی بہت زیادہ وسیع، متنوع و مختلف ہوتے ہیں۔ یہ لوک گیت وقتی اور عوامی ہونے کی وجہ سے بڑی حد تک زبان و بیان اظہار و ابلاغ کے قواعد و شرائط سے بے نیاز ہوتے ہیں۔

بے محل نہ ہوگا اگر میں دکنی لوک گیتوں کی بعض خصوصیات کی طرف اشارہ کرتا چلوں۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ گیت کا دامن بڑا وسیع اور کشادہ اور اس کا آنچل بڑا رنگا رنگ ہوتا ہے۔ یوں تو دکنی لوک گیتوں میں دکنی زبان کی عامیانہ اور دیہی خصوصیات بھی ملتی ہیں۔ مگر ان میں فنکارانہ ذہانت، عالمانہ مہارت کی کمی کے باعث کہیں قواعد و زبان کی غلطیاں پائی جاتی ہیں تو کہیں بے وزن و بے بحر مصرعوں کی تک بندی بھی ملتی ہے جو برس ہا برس کے تصرف اور موسیقی کے عمل کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ان گیتوں کو خواہ وقتی جذبات و احساسات کی ظرف میں بہنے والے چشموں سے تعبیر کریں جو اپنی روانی کے آپ مالک ہوتے ہیں۔ یا طبیعت کی آزاد روی اور مزاج کی بے ساختگی کے پرچموں سے تشبیہ دیں جو اپنی آن بان سے لہراتے ہیں۔ مگر فکر و خیال کے ان مرقعوں میں عوامی زندگی کی چھاپ بڑی گہری ہوتی ہے۔ ویسے تو دکنی لوک گیتوں کی کئی قسمیں ہیں جن میں سے ہر ایک

تمیم ایک علیحدہ مضمون کا مطالبہ کرتی ہے مگر ہم یہاں صرف چند ہی نمونے پیش کریں گے

## ڈھولک کے گیت

دکنی لوک گیتوں میں جو گیت آج بھی بجوت و بآسانی دستیاب ہوتے ہیں ان میں ڈھولک کے گیت نہ صرف بڑے دلچسپ اور پُر لطف ہوتے ہیں بلکہ یہ ہماری سماجی زندگی کے رسم و رواج کا ایک لازمی جز بن چکے ہیں۔ یہ بات تحقیق طلب ہے کہ ہماری تہذیب میں ڈھولک کب ایجاد ہوا اور پہلا ڈھولک کا گیت کب اور کہاں گایا گیا ہو سکتا ہے کہ یہ حضرت امیر خسرو کے بعد جب کہ ہمارے معاشرے میں موسیقی اور شاعری کے تال میل کا احیاء عمل آیا تھا کسی وقت کہیں رواج پا گیا ہو جس کی روایت آج بھی شمال اور دکن میں بلا لحاظ مذہب و ملت تقریباً ہر گھرانے میں چلی آ رہی ہے۔ دکھ درد کی حالتوں میں اظہار غم کرنا اور نشاط و انبساط کے موقعوں پر اظہار مسرت کرنا فطرت انسانی کا خاصہ ہے۔ خوشیوں کی ہر تقریب مثلاً شادی بیاہ، بسم اللہ خوانی عقیقہ، گل پوشی، عید و تہوار وغیرہ میں اعلیٰ طبقات اور ادنیٰ طبقات میں یکساں طور پر ڈھولک کے گیتوں کا رواج ہے۔ طبقہ امراء و نوابین میں یہ خوشگوار فریضہ مراثنوں کے حصہ میں آتا تھا جو آج کے بدلے ہوئے حالات میں مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ خوشیوں کے موقعوں پر آج بھی گھر گھر ڈھولک بج اٹھتے ہیں۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ان گیتوں کا سلسلہ کم عمر بچیوں سے شروع ہو کر شادی شدہ و غیر شادی شدہ بوڑھی اور بیوہ خواتین کے بھی ذوق و شوق اور ان کی گہری دلچسپیوں کے باعث رات رات بھر چلتا رہتا ہے۔

خواہ وہ دولہا ہو کہ دلہن یا کوئی اور پھول پہننے والا اس کی گل پوشی کی رسم کی ادائیگی، تہذیبی روایت کے مطابق صندل لگا کر شروع کی جاتی ہے اور ساتھ ہی شریکِ محفل تقریباً تمام خواتین ڈھولک پر یہ گیت چھیڑتی ہیں ؎

صندل لگاؤ او مرے ہریالے بنے او مرے شہزادے بنے
تیرے صندل کو لاگے ہیرے جو لاگے رے
موتی لاگے رے بنے او مرے ہریالے بنے او مرے شہزادے بنے

پھر اس کے فوری بعد پھول پہناتے وقت گایا جانے والا جو مشہور گیت ہے اس کے بول یوں ہیں۔

دیوان میں پہنانے ہار کیا خوش [illegible] کے
مالی نے لایا دونا مالن نے [illegible]
اماں نے پہنانے ہار کیا خوش [illegible] کے

کبھی کبھی یہ گیت بھی گایا جاتا ہے ؎

پھولوا پہنانے آئی آج رے۔
میں تو پھولوا پہنانے آئی
- پھولوا پہنانے آئی منجھا بٹھانے آئی آج رے
میں تو پھولوا پہنانے آئی

اور جب گل پوشی کی رسم انجام پا جاتی ہے تو پہلے پھول پہنانے والی خاتون پھر شریکِ محفل تمام خواتین کچھ سکے دولہے دولہن یا پھول پہننے والے پر سے وارتی ہیں اور بلائیں لیتی ہیں۔ اس موقع پر سب کو یہ گیت [illegible] یاد آ جاتا ہے ؎

بنے پہ سے کیا کیا واروں گے ماں
دولے پہ سے کیا کیا واروں گے ماں
ہیرے بھی واری موتی بھی واری
بنے پہ سے منگا واروں گے ماں

شادی بیاہ کے ایسے سینکڑوں گیت مروج ہیں جن کا پیرایہ خوبصورت غنائیت پُر کیف ہوتی ہے اور پھر ڈھولک کی تھاپوں کا زیر و بم جوان دلوں کی آرزوؤں و امنگوں کی شیریں رس بھری آوازیں ایک مسحور کن ماحول پیدا کر دیتی ہیں جیسے دلہن کو مانجھے بٹھاتے وقت کا یہ گیت ؎

نیچے اوپر چبوترا دولن بی کا منجھا
بنا یوں کو بیجا سجاؤ ذرا اچھا
ہاتھاں پاواں لال، ہتھیلیوں میں تارے
بنا پوچھا بی بی کو، کون سہیلیاں سنوارے
مارس کے بال بڑے، شوکی شال پہ گرے
ہلو کھو تو شوبا سے، موگرا ڈال کو پاسے

اسی قسم کے دو گیت اور ملاحظہ ہوں ؎

تجھے تیند و گی گے ہریالی بنو، شہزادی بنو
تجھے منجھا بٹھانے تری اماں کر [illegible] گے ہریالی بنو شہزادی بنو۔

تجھے حمام کرانے تری بہناں کھڑیں گے ہریالی بنو شہزادی بنو
تجھے کپڑے پہنانے تری ملانیاں کھڑیں گے ہریالی بنو شہزادی بنو
تیرے سہرا بندھانے ترے باوا کھڑیں گے ہریالی بنو۔ شہزادی بنو
تیرے گودوا بٹھانے ترے ماموں کھڑیں گے ہریالی بنو۔ شہزادی بنو
تجھے نیندو لگے گے ہریالی بنو شہزادی بنو

دلہن کھڑی جی کمرے میں
ہلسی جی من من میں
پیا کے گھر جانا ہے
گلا ترا نکلس سجے
چمرا پیا کے وداع کردوں
پھولوں سے گلا بھر دوں
پیا کے گھر جانا ہے

کاناں تیرے جھمکے سا جے
آ ٹرن پیا کے وداع کردوں
پھولوں سے گلا بھر دوں
پیا کے گھر جانا ہے
ہاتھاں تیرے پہونچی سا جے
جوڑا پہنا کے وداع کردوں
پھولوں سے گلا بھر دوں
پیا کے گھر جانا ہے

ان کے علاوہ ڈھولک کے گیتوں میں طنز و مزاح کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے۔ خاص کر سمدھنوں کا ایک دوسرے پہ حملہ کرنا مصرعوں مصرعوں میں فقرے کسنا اور طعنے دینا۔ سالیوں اور بہنوئیوں کے مذاق و دل لگی کی باتیں اور بہت ساری دلچسپ باتیں، مختلف تشبیہات و استعاروں کے سہارے بیان کی جاتی ہیں جیسے ڈھولک کی شوخ و شنگ تھاپوں اور ہمجولیوں کے قہقہوں میں خوشی و مسرت کے غیر مغلوب جذبات میں دولہے والے دلہن کی ماں کا مذاق دیکھئے کس طرح اڑاتے ہیں ؎

جھلّے سے توڑے انار سمدن سالو اوڑھے
سمدن کے آنکھاں دیکھو املی کے چنیے دیکھو
کیا خاصہ کاجل لگائے سمدن سالو اوڑھے
سمدن کے ہاتھاں دیکھو ادرک کے پنجے دیکھو
کیا خاصہ جھلّے جمائے سمدن سالو اوڑھے
سمدن کے بالاں دیکھو ٹوٹی سو جھاڑو دیکھو
کیا خاصہ گجرا لگائے سمدن سالو اوڑھے

اب میں دلہن کی ماں بھی طیش میں آکر ساری مصروفیات کو بھول

بھال کے کمر کس لیتی ہے اور حلق صاف کر کے اپنی ٹولی کے ساتھ ڈھولک کے محفل کی رونق اور دلچسپی کو اور بڑھا دیتی ہے ؎

اگے ماں آگئے بنے کے لوگ
لوگ آتے بولے فرش کرائی
زمین پہ بیٹھنے کے لوگ
لوگ آتے بولے بریانی پکائی
دلیے کے کھانے کے لوگ
لوگ آتے بولے لین منگائی
سندھی کے پینے کے لوگ
اگے ماں آگئے بنے کے لوگ

## چکی نامے

چکی ناموں کا شمار بھی دکنی لوک گیتوں کی قدیم اصناف سخن میں ہوتا ہے جنکی ایک واضح روایت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز اور ان کے بعد اُن کے معتقدین و متابعین کے ہاں بھی مختلف رسالوں اور تصانیف میں ملتی ہے۔ بیسویں صدی کے ایسے سائنسی ترقیات کے زمانے میں آج بھی ہندوستان کے پس ماندہ، کم ترقی یافتہ دیہی رقبہ جات میں رات گئے یا صبح سویرے سکوت اور سناٹے کے عالم میں آبادیوں کے مختلف گوشوں سے چکی پیسنے کی مخصوص و مستقل آوازوں کے ساتھ جفاکش عورتوں کے میٹھے میٹھے بول بھی سنائی دیتے ہیں۔ ان چکی ناموں میں اکثر و بیشتر عرفان و تصوف، محنت و ریاضت کی زندگی کی عکاسی پائی جاتی ہے۔ گو کہ ان میں تصوف کا رنگ غالب رہتا ہے، مگر پھر بھی ان میں بھی گھریلو زندگی اور دیہی معاشرت کے روزمرہ کے تجربات بھی مل جاتے ہیں۔ مثلاً

؎ اندھیری رات تاروں میں
بھائی رہتے میں چاند چاندنی میں
اجلی اجلی یہ کون پیر کی درگاہ
سن کے درود بھیجی خواجہ کا گلبرگہ
اندھیری رات تاروں میں
نیسونا زنگیوں کی نیوڑگے ماں ڈالی

نو تو دو بھائی بہین ہے نیچے والی
اللہ کی درگاہ میں فرشتوں کی بھیڑ
اس میں میرے پیر صاحب دستگیر
اندھیری رات تاروں میں
دھپکارے کی دھوپ نہیں دیتی ہے سایہ
بن چھتری کے آیا بھائی کا منہ کملایا
اندھیری رات تاروں میں
سورج منہ پھیرا گورو گھر کو آیا
میرا جی گھبرایا لال گھر کیوں نہیں آیا
اندھیری رات تاروں میں
بھائی مراجیو۔ بھاوج میری ناندو
چندن کے ناؤں کو      لال گنوائے باندو
اندھیری رات تاروں میں
گھنگرو کی کاٹھیوں کا      بیل آیا باڑے میں
دوڑ کے بلا لیوں گی      بھائی آیا بولا نے
اندھیری رات تاروں میں
زمین کو اساں کو      نیئں لگی ہے سیڑھی
پیر کی ہمت بڑی      دامن پکڑ کر کھڑی
اندھیری رات تاروں میں

چکی نامے ڈھولک کے گیتوں کی بہ نسبت زیادہ طویل نظمیں ہوتی ہیں۔ اسی لئے چکی نامے ڈھولک کے گیتوں کی بہ نسبت زیادہ طویل نظمیں ہوتی ہیں اس لئے ایک ہی چکی نامے میں مختلف مضامین باندھے جاتے ہیں۔ جن کو موقع محل کے اعتبار سے گانے والیاں اپنی اپنی پسند سے برتتی رہتی ہیں۔ مثلاً ذیل کے چکی نامے کو دیکھئے۔ اپنے روایتی صوفیانہ انداز سے شروع ہو کر معاشرتی زندگی کی کن کن روایات کو سمیٹے ہوئے اور کہاں ختم ہوتا ہے ؎

اللہ صاحب کی رات جاگی ہے ماں
میرے من کی مراداں میں پائی
خواجہ خضر کے جہاز چھوڑائی ہے ماں
تخت رواں پہ ناچ کرائی
حضرت بی بی کی سینک کھلائی ہے مل
تارا منڈل کے گوٹے لگائی

پھر شادی بیاہ کے معاملات ۔
بیٹی مٹکنے گئی تو      ذات پوچھیں میری
بھاؤ چندن چوکی      کھولوں کی نات پھیری
اللہ صاحب کی رات
شب گشت نکلیا بناماں      شب گشت میں ٹھنیاں
بازو سے بھو منیاں ماں      اڑیں ہے سوما لال

بھائی، بھاوج، دیور، دیورانی اور نند کے تذکرے
بھائی کے گھر کو گئے تو      بھاوج اڑی میری
رکھ لے ساڑی چولی      بھائی سے لی کو چلے
دیورانیاں جٹھانیاں      بل چلے پانی کو
رستے دلو جائے کو      دیور کی رانی کو
نند کا ہے ناطہ      مجھے نہیں ہے سہاتا
سالو کی بھریوں میں      سر دائے کا کانٹا

اور دامادوں سے شکایت
دامادوں کا کھاتا      دودھ پہ کی ملائی
گاؤں سارا ڈھونڈ لئی      ایکساں کالی گائی
داماد آتا گھر کو      مرغا مرغی کالی
اس کے منہ میں ماٹی      ایک نہ چھوڑا لوئی

جاگیردارانہ نظام زندگی کے ہمارے معاشرے کی بعض تہذیبی جھلکیاں
چوڑی والے داتا      چوڑیاں پہناؤ مجھے
کچہری میں راجا      انعام دیں گے مجھے
درباری راجے کو      دربار میں بیٹھیں گے
الماس کے طرے کو      جوہری پرکھیں گے
کونا پینا ہے ماں      نئیں ہوتا رہے ہے
دل کو تکہ کو بھیجی      باندیوں لاؤ جا کے

اور پھر آخر میں فن کا وہی ابتدائی مذہبی رنگ

اللہ کی بندگی    میں ہوتی ہے رے
کیا کرتے کیا جانو    میں قدر تو تیرے سے
اللہ صاحب کی رات

اس طرح مختلف رنگوں اور مختلف مزاجوں کے اور بھی بیسیوں چکی نامے ہیں جو اب تک ہمارے اس ترقی یافتہ دور میں اسلاف عہد رفتہ کی یادگار بن کے رہ گئے ہیں بجز بہت ہی چھوٹے قصبوں اور دیہاتوں کے اب ہماری شہری زندگی میں گھروں میں چکیوں کے پیسنے کا رواج ہی باقی نہیں رہا اس لیے چکی ناموں کی تخلیق پر اب ایک روک لگ گئی ہے۔

## لوریاں

ڈھولک کے گیتوں اور چکی ناموں کے بعد دکنی لوک گیتوں کی ایک قابل ذکر صنف سخن لوریوں پر مشتمل ہے۔ ان کا بنیادی موضوع محدود ہونے کی وجہ سے ان میں دیگر لوک گیتوں کا سا تنوع اور تعدد نہیں پایا جاتا اور اس وجہ سے ان کی بازیافت بھی نسبتاً کم ہی رہی ہے ان کے اظہار و بیان کا موضوع بچپن اور نیند ہی ہوتا ہے۔ یہ ممتا کے گہرے سمندر اور میٹھے سروں کی دھیمی لہروں پہ ڈولنے والے سپنوں کے سفینوں کے لیے مخصوص ہیں۔ فی الحال دکن میں اردو لوریوں کے چند ٹکڑوں کو بطور نمونہ درج ذیل کیا جاتا ہے۔

او او ہائی ماں    او او ہائی گے
نیند کو آتیا تانا    نیند کے کرتا بہانے
یہ نیند گھولے تانے    باداں نیندوں میں
جھو ہائی ماں
مرے گھر میں نانا    گھر دیتا نورانا
اللہ کی درگاہ میں    بیبیوں کی شکرانا
نانی کا نواسہ    ناریل بن میں پیاسا
نانی بیجے خاصہ    دودھ بھرا بتاشہ
میرے گھر کے پیچھے    میرا تن کا گلہ
وہ دن دکھاؤ اللہ    تانے کی بسم اللہ جھو ہائی ماں

اس کے علاوہ کوئی اور رشتہ دار خاتون جیسے پھوپھی وغیرہ بچی کو پالنے میں ڈالتے ہوئے جب کبھی لوری گاتی ہے تو اس میں یوں اضافہ کرتی جاتی ہے

بھائی تیری بیٹی    شال اوڑھ کے سوتی
پھوپی بل بل جاتی    بھتیجی بہو ہوتی
بھائی تیری بیٹی    دے میرے بیٹے کو
کچھ نئیں مانگتی تھوڑا    جہیز میں ہاتھی گھوڑا
جھو ہائی ناں

ان لوریوں میں ہمارے بیشتر فن پاروں کی طرح سماج میں طبقاتی رکھ رکھاؤ، رہن سہن اور اونچ نیچ کی دلچسپ کشمکش بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ جیسے یہ لوری کیا ہمارے جاگیردارانہ ماحول کی آئینہ دار نہیں ہے۔

او میرے رانی کے جائیے    سو جا للو ہاشے
میرے لالہ کو بھوک جو لاگے    کیا رے کروں پکوان
چھوٹی بڑی چڑیاں پکڑا منگوائی    لونگوں کا دوں کی بگھار
او میرے رانی کے جائیے . .
رانی کا جایا راجا کنوریا    باندی کا جایا غلام
گھوڑی کا جایا ال بچھیڑا    کھیلے کا چوگان
اور میرے رانی کے جائیے . . .

ان لوریوں کے علاوہ جن میں ماں کی محبت آرزوؤں و ارمانوں کی چٹکی چاندنی اور اس کے خوابوں کی رنگین بہاریں نظر آتی ہیں لیکن ایسی لوریاں بھی ملتی ہیں جو لوری کے بنیادی موضوع سے ہٹ کر کہی گئی ہوں ایسی لوریوں میں بعض اوقات دلچسپ مکالماتی انداز بھی پایا جاتا ہے جیسے ۔

خاتون : پاؤں کے پنیزب رکھ لے رے بھولی۔ ندیا اتا رو پار۔ اے بھولی گنگا اتا رو پار

بھولی :۔ پاؤں کے پنیزب نئیں ہونا بی بی چلنا ہمارے ساتھ۔ اجی بی بی چلنا ہمارے ساتھ۔ دن کو کھلاؤں گا بھونی کھچڑی رات کو اوڑھول گا شال۔ اجی بی بی رات کو اوڑھوں گا شال۔

خاتون : جل جائے تیرا شال دوشالہ ماس میں بھیوں کے باس۔ اے بھولی اس میں جنکوں کی باس۔
پاؤں کے پنیزب رکھ لے رے بھولی . . . .

## الاؤ کے گیت

بہمنی سلطنت کے قیام کے ساتھ ہی دکن میں ہندایرانی مذہب و

وثقافت اور زبان وتہذیب کا رنگ گہرا ہونے لگا تھا۔ ان علاقوں کے حاکم ایران وترکستان سے آئی ہوئی نسلوں سے تعلق رکھتے تھے ان کے حلقہ احباب اور حکومتی نظم ونسق میں ایرانی اور ترکی نسل کے افراد کو نمایاں مقام حاصل رہتا تھا۔ اور خاص کر فارسی علم وادب کے سلسلے میں بھی ایرانی علماء کی بڑی آؤ بھگت کی جاتی تھی۔ چونکہ شاہی خاندان کا تعلق ہمیشہ اہل تشیع حضرات ہی سے رہا اس لئے محرم کی تقاریب کو ان علاقوں میں خاص اہمیت دی جاتی رہی۔ تقریباً سارے ملک میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے بڑے خلوص وپیار اور عقیدت کے جذبات سے ایک دوسرے کے نظریات وعقائد کا احترام کرتے ہوئے محرم جیسے تہواروں کا بھی مشترکہ دلچسپیوں کے ساتھ اہتمام کرنا شروع کیا۔ اس طرح محرم میں آج بھی تقریباً سارے دکیش میں ہندو مسلم دونوں دوش بدوش نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے کی تحقیق میں ہمیں الاؤ کے گیت (جس کو دکنی میں الاوے کے گیت کہتے ہیں۔) دکنی اور دکنی سے زیادہ کنڑی، مرہٹی، تلگو وغیرہ زبانوں میں ملتے ہیں۔ خاص طور پر کرناٹک کے علاقوں میں خصوصی اہتمام سے الاؤ کھیلنے اور اس کے گیت گانے میں بڑے جوش وخروش سے مظاہرہ کیا جاتا ہے جو ایک خالص کرناٹک اثر معلوم ہوتا ہے۔ عاشورہ خانوں میں اور ان کے آس پاس علموں اور تعزیوں کے جلوس وسواریوں کے وقت پُرہجوم میلے لگتے ہیں اور ان میلوں میں رنگ برنگ کے شملوں، سفید کرتے اور دھوتیوں کو بلا لحاظ مذہب وملت تقریباً سب ہی من چلے لوگ اور زندہ دل انسان زیب تن کرتے ہیں جو باہمی خلوص وپیار یگانگت واتحاد کی نشانیاں ہوتی ہیں۔ ان دنوں جگہ جگہ عورتوں اور مردوں کی علیحدہ علیحدہ ٹکڑیاں، عاشورہ خانوں کے صحنوں میں الاؤں کے ارد گرد یا افتادہ میدانوں میں الاوہ کھیلتی اور الاوے کے گیت گاتی نظر آتی ہیں۔ جن کی زبان مخلوط اور مقامی آب ورنگ، لب ولہجہ الفاظ اور محاورے کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ دکنی لوک گیتوں کی یہ ایک نمایاں خصوصیت ہے۔

مثلاً کرناٹک میں ؎

سیاں اللہ بندالا عشق الانا

یا پھر تلنگانہ میں ؎

اماں بی بی فاطمہ لالہ

مہاراشٹر میں نوجوانوں کی محلہ واری ٹولیاں اپنے اپنے مخصوص ملبوسات میں سج دھج کر آتی ہیں اور الاوہ کھیلنے اور اس کے گیت گانے کے فن میں اپنی مہارت اور خوبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہ صرف خود ہی خوشی ومسرت حاصل کرتی ہیں بلکہ دوسروں کو بھی مسرور ومحظوظ ہونے کا سامان کرتی ہیں۔

الاؤ کے گیت واقعات کربلا کے علاوہ دیگر مقامی مذہبی، سیاسی و سماجی حادثات وحکایات پر بھی مشتمل ہوتے ہیں۔ ان میں طنز ومزاح و ظرافت کی دلچسپ آمیزش بھی ہوتی ہے جو دیکھنے اور سننے سے تعلق رکھتی ہے۔ چھٹے نظام حیدرآباد میر محبوب علی خاں کے دور حکومت میں ایک بار دریائے موسیٰ میں جو شہر حیدرآباد کے بیچ سے بہتا ہے ایک بھیانک طغیانی آئی تھی جس سے پایۂ تخت کو زبردست دھکا پہونچا تھا۔ اس واقعہ کو بھی الاؤ کے گیتوں میں بیان کیا جاتا ہے

الاؤ کے گیتوں کا تذکرہ "کلغی وطرے" کے بغیر تشنہ ہے۔ دراصل یہ مخصوص قسم کے الاؤ کے گیتوں کی ایک مقامی اصطلاح ہے۔ مختلف ٹولیاں ان کو سوال وجواب کے انداز میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے جذبے کے تحت پیش کرتی ہیں۔ بزرگان دین کے معجزات وکرامات کے تذکروں کے علاوہ بعض اوقات ان میں ذہانت وفراست کی آزمائش کی پہیلیاں اور چٹکلوں کے قسم کی چیزیں بھی بیان کی جاتی ہیں جن کا جواب دینا مقابل کی دوسری ٹکڑی پر لازم ہوجاتا ہے۔ اس طرح یہ سلسلہ بعض صورتوں میں کئی دنوں تک جاری رہتا ہے۔ یہاں اس قسم کی کوئی مثال رقم کرنا مشکل ہے۔

اس طرح دکنی لوک گیتوں کی اور بہت سی قسمیں ہیں جیسے جھن براکھانہ، جھولے اور کھیل کود کے گیت وغیرہ لیکن ملک کی معاشی ومعاشرتی علمی وادبی ترقیات کے ساتھ ساتھ ہماری تہذیب وتمدن کے معاروں کی رفتار وروش میں بھی زبردست تبدیلیاں رونما ہورہی ہیں عوامی اور دیہی زندگی کے ہر شعبہ حیات میں انقلابی تغیرات ظہور پذیر ہورہے ہیں، اشاعت علم، صحافت کی ترقی، ریکارڈس، لاؤڈ اسپیکرز، ٹیپ ریکارڈ ریڈیو، ٹیلی ویژن کی ایجادات اور ہماری تہذیبی وسماجی زندگی کے مختلف رسوم ورواجوں اور تفریحات پر بھی فلمی گیتوں کی بے پایاں اثر اندازی سے ہندوستان کی مختلف زبانوں کے عوامی گیتوں وغیرہ کی طرح دکنی لوک گیت بھی شدید طور پر متاثر ہورہے ہیں۔ تعجب نہیں کہ مزید پچاس ساٹھ برسوں بعد ان کی سرچشمے بھی پوری طرح خشک ہوجائیں۔

## دلی کا پرانا قلعہ

رام پرکاش راہی

زمانے ڈھل گئے معاملات کی تحریر باقی ہے
پرانے حسن کی ٹوٹی ہوئی تصویر باقی ہے
نہ وہ شمشیر باقی ہے نہ وہ توقیر باقی ہے
مگر تاریخ میں لپٹی ہوئی تعمیر باقی ہے
فضائے ہست کے راہی مقام بود پر پہنچے
نقوش رہگزر میں پرتو رہگیر باقی ہے
جو شہرت عام تھی پہلے گئی صدیوں کے مدفن میں
مگر آثار میں سمٹی ہوئی تشہیر باقی ہے
بقا کے خواب سارے ڈھل گئے خواب مسلسل میں
یہ ان خوابوں کی پتھرائی ہوئی تعبیر باقی ہے
عیار عام صرف کم نگاہی ہے تو رہنے دو
دل شاعر کی آنکھوں میں ابھی تنویر باقی ہے
طلائی نقرئی تحریر کے سانچے میں ڈھلنے کو
رگ تخیل پر اک نشتر تاثیر باقی ہے
یہ بنیادوں کی گہرائی یہ دیواروں کی بے باکی
جہاں تمہید قائم ہے وہاں تعمیر باقی ہے
یہ بے ترتیب پتھر، جھاڑیاں، کھنڈرے یہ ہریالی
کہیں تخریب قائم ہے کہیں تعمیر باقی ہے
سرشک یاد ناممکن سہی دنیا کی آنکھوں میں
زبان حال پر اک عالم تقریر باقی ہے
یہ خلوت زار رعناؤں سے وابستہ رہے راہی
مگر اب تو فقط اک خواب بے تعبیر باقی ہے

## غزل

یوسف جمال

سوز افروز غلش زاروں میں ڈھونڈو مجھ کو
لالہ و گل میں نہیں خاروں میں ڈھونڈو مجھ کو

میں گلستاں کی فضاؤں میں ملوں گا نہ کبھی
کوہساروں پہ کبھی غاروں میں ڈھونڈو مجھ کو

سوز میں ڈوبے ہوئے نغموں کا خالق ہوں میں
ساز کے ٹوٹے ہوئے تاروں میں ڈھونڈو مجھ کو

اونچے محلوں میں ملے گا نہ کبھی میرا وجود
چھوٹے کاشانوں کی دیواروں میں ڈھونڈو مجھ کو

مجھ کو ساحل کی ہواؤں میں نہ پاؤ گے کبھی
آؤ دریاؤں کی منجدھاروں میں ڈھونڈو مجھ کو

حال کے لمحوں کی تصویر دھندلی ہے بہت
دور ماضی کے فسوں کاروں میں ڈھونڈو مجھ کو

کون ہوں میں مرے اشعار بتا دیں گے جمال
سر قرطاس جگر پاروں میں ڈھونڈو مجھ کو

# نئی کتابیں

## "سروچراغاں" (شعری مجموعہ)

مصنف — مقصود عرفان

ناشر :- قصرِ ادب پبلیکیشنز، پری گھاٹ بھوپال

قیمت : تین روپے    صفحات ۱۴۳

مقصود عرفان کے شعری مجموعہ "سروچراغاں" سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ترقی پسند نقطۂ نظر کے ایک خوش گو اور کہنہ مشق شاعر ہیں یہ شعری مجموعہ گیارہ نظموں، چھتیس غزلوں اور کچھ قطعات پر مشتمل ہے اور اس میں دو تعارفی مضامین بھی شامل ہیں۔ مصنف کی شخصیت پر قمر جمالی کا ایک مختصر مضمون اور شاعری پر اختر سعید کا مضمون۔ اختر سعید کے الفاظ میں: "بحیثیت مجموعی ان کے ہاں اجتماعی مقصد کی لگن نظر آتی ہے جس کا رشتہ انسان دوستی سے ملتا ہے۔"

زبان کی روانی اور براہ راست اظہار مقصود عرفان کی شعری تخلیقات کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ان کی نظموں میں پر جوش خیالات، خوبصورت الفاظ اور کامیاب ترکیبوں کی کمی نہیں لیکن ان میں مرکزی تجربہ اور موضوعات کے اعتبار سے بڑی حد تک یکسانیت اور سطحیت ہے۔ فورم یا ہئیت کے اعتبار سے بھی یہ نظمیں کم و بیش ڈھیلی ڈھالی اور سپاٹ ہیں۔ ان نظموں کے موضوعات، اندازِ بیان اور نقطۂ نظر میں ترقی پسند تحریک کے اکثر سر برآوردہ شاعروں کی جھلک نظر آتی ہے۔ "آج کی رات" میں مجاز کا اثر نمایاں ہے "دو نظریے" فیض کی نظم "دو عشق" کی یاد تازہ کرتی ہے۔ "کونسا گیت سنوگی" اختر سعید کے الفاظ میں جاں نثار اختر کی نظم "کونسا گیت سنوگی انجم" کے اجمال کی تفصیل ہے اور بہا عنصر یہ اور تشبیہ فراز، اندازِ فکر، آہنگ اور دلکشی کے اعتبار سے سردار جعفری کی نظموں کا عکس ہیں۔ اختر سعید، مقصود عرفان اور ان کے پیش رو ترقی پسند شعراء کے نقطۂ نظر اور اسلوب کی مشترک خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "اصل خیالات کی یکسانیت کا سبب حالات کی یکسانیت تھی اگر جلتی ہوئی ریت پہ سب ہی مسافروں کے تلوے جھلسا رہی ہو تو آبلوں کا ذکر بھی عام ہوگا۔" لیکن یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ یہ خطرہ اس شاعری میں زیادہ پیدا ہوتا ہے جس کے محرک خارجی تاثرات ہوں اور جس کی بنیاد متعین خیالات اور مروجہ نظریات پر ہو۔ مقصود عرفان کی شاعری بھی بڑی حد تک اسی قسم کی شاعری ہے۔ اس میں تلاش، ذات، تلاش معنی، نفسیاتی کشمکش اور تشکیک کے عناصر کی کمی کا احساس بڑی شدت سے ہوتا ہے اسی لئے دورِ حاضر کی نمائندہ شاعری میں اسے جگہ نہیں دی جا سکتی۔ تاہم یہ کہنا سراسر غلط ہوگا کہ مقصود عرفان کی شاعری تمام تر صدائے بازگشت ہے۔ اس شعری مجموعے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وہ ایک پرخلوص اور کامیاب شاعر ہیں اور اُن کی شاعرانہ صلاحیتوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ان صلاحیتوں کا اظہار اُن کی غزلوں میں زیادہ بھرپور ہوا ہے۔ اِن غزلوں میں داخلیت اور انفرادیت کی کمی نہیں۔ ان کا مستقل موضوع حسن و عشق کی کیفیات ہیں اور تفکر اور خارجی ماحول کے شعور کی آمیزش نے اس کو ایک خاص توازن اور شگفتگی عطا کی ہے۔ اِن کی غزلوں کے بیشتر اشعار بڑے ترشے ہوئے ہیں۔ الفاظ کا ترنم، ترکیبوں کا حسن، لہجے کی شائستگی ایک پُراثر سادگی اور سوز و گداز اُن کے اچھے اشعار کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

آخر میں، اُردو شاعری کے اِن "پرستاروں" سے، جو تہذیبی سرگرمیوں سے رابطہ تو قائم رکھنا چاہتے ہیں لیکن شاعری میں کسی نئے تجربے کی تپش اور نئے احساس کی چوٹ برداشت نہیں کر سکتے۔ گزارش ہے کہ وہ چند مشہور ترقی پسند شاعروں کے کلام سے شعریت کے آخری قطرے نچوڑنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ مقصود عرفان جیسے شاعروں کی طرف بھی توجہ فرمائیں۔

(زاہدہ زیدی)

## منور لکھنوی شخصیت اور شاعری

مولف : راج نراین رآز
ناشر : نصرت پبلشرز وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنو ۳۔
قیمت : ۷ روپے ۵۰ پیسے

---

سال میں جناب منور لکھنوی کی یاد منائی گئی اور اس موقع پر موصوف کی یات وشاعری اور علمی و لسانی خدمات کا تجزیہ اور احاطہ کرنے والے مقالات شتمل اس کتاب کا اجرا کیا گیا۔ اس تالیف کے مولف راج نراین راز نے تگ دو اور کدو کاوش کے بعد ایک معیاری اور وقیع کتاب کو خاصے اچھے ڈھنگ ے زیور طباعت سے آراستہ کرکے پیش کیا یہ صرف اُن کی ایک علمی و ادبی رست ہے بلکہ اُردو ادب میں منور لکھنوی کے حقیقی مقام و مرتبہ کے تعین کرنے ں مددگار بھی ثابت ہوگی۔ منور لکھنوی کی شخصیت، شاعری اور دیگر علمی و ادبی بات کے تعلق سے مراہم موضوع پر راج نراین راز نے واقعی ان حضرات مقالات اکٹھا کئے ہیں جو اپنے اپنے میدان کا خاصہ تجربہ گہرا شعور و راک بھی رکھتے ہیں۔ اس طرح مختلف زمروں اور عنوانوں کے تحت ۱۹ الات کو یکجا کرکے منور لکھنوی کی حیات اور ان کے کارناموں کے مطالعہ مکمل بنایا گیا ہے۔ شخصیت کے عنوان کے تحت جو مقالات پیش کئے گئے ہیں میں منور لکھنوی کے داستانِ حیات بھی ایک ہے جس کو خود منور صاحب نے نہایت پر اثر انداز میں سپرد قلم کیا ہے۔ گوپی ناتھ امن صاحب نے پنے مضمون، منور جیسا میں نے انہیں دیکھا میں جو باتیں کہی ہیں اور انداز سے کہی ہیں بڑی دلچسپ اور معلوماتی ہیں۔ سید آفاق حسین آفاق مضمون بھی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ شاعری کے زمرے میں شمیم حنفی، لیم اختر اور راج نراین رآز کے مقالات جامع ہیں۔ تنقید کے سلسلے میں لکھے مقالات ومضامین میں شہاب جعفری اور عطاء اللہ پالوی کے مقالے نیب منور کی قومی نظمیں اور منور، کائنات دل کی روشنی میں قابلِ ذکر ہیں۔ تراجم باب میں نسیم عرفاں (شارب ردولوی) گیت گووند (علی جواد زیدی) سمبو (جگن ناتھ آزاد) شکنتلا (محمود ہاشمی) نے اس کتاب کی علمی و اہمیت اور افادیت اور بڑھا دی ہے۔

سادہ مگر خوبصورت گرد پوش، مضامین کا حسن ترتیب، مولف کے نستہ مذاق و ذوق کی دلیل ہے۔ کتابت وطباعت بھی مناسب اور گوارا ہے۔

(ابوالفیض سحر)

## گرمیٔ اندیشہ : صغیر احمد صوفی

گرمیٔ اندیشہ جناب صغیر احمد صوفی کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ صوفی صاحب نے اُردو شاعری کے دو سے دیکھے ہیں۔ یہ صوفی صاحب کی سلامت روی ہے کہ انہوں نے نہ تو ترقی پسندی کی بلند آہنگی سے بے جا اثر لیا اور نہ موضوعات میں وسیع رومانویت برتی اور اب جب کہ نئی شاعری کی جدتوں اور بدعتوں کا دور دورہ ہے، انہوں نے اپنی شاعری کو چلتا سکہ نہیں بنایا۔ ایسے دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ صوفی صاحب نے اپنے فن کو اپنی ذات کے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ فیشن سمجھ کر اختیار نہیں کیا۔ ان کے یہاں پایا جانے والا سلامت روی کا یہ جذبہ، اعتدال اور توازن ہی وہ بنیادی عناصر ہیں جنہوں نے صوفی صاحب کے شعری کردار کی صورت گری میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ صوفی صاحب کی غزلوں اور نظموں میں سانس لینے والا شخص اس اعتبار سے صحت مند اور لائق رشک ہے کہ وہ حالات و عوامل میں ایک منطقی ربط پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ نہ مایوس لمحوں میں منہ بسورتا ہے۔ اور نہ مسرور لمحوں میں جامے سے باہر ہوتا ہے۔ وہ نہ محض جذبہ ہے اور نہ محض ذہن، بلکہ ان دونوں کا ایسا امتزاج ہے جو نہ صرف صحت مند انسانوں کی پہچان ہے بلکہ جو شعری تخلیق کے لئے بھی ازبس ضروری ہے۔

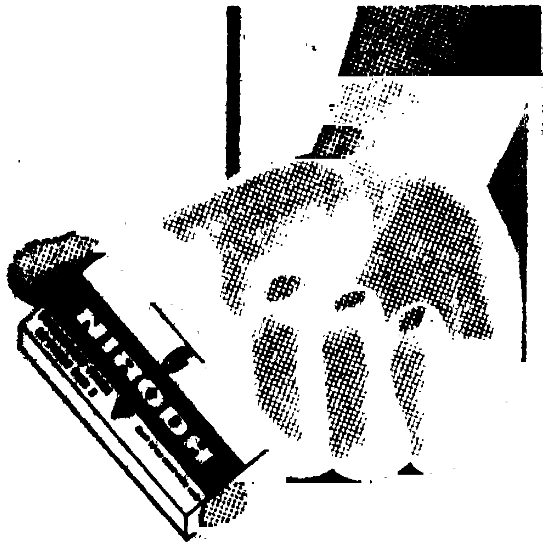
گرمیٔ اندیشہ میں غزلیات کے ساتھ ساتھ نظمیات بھی شامل ہیں۔ اُن کی نظمیں پابند ہیں۔ ان کی غزلوں نظموں کی زبان اور اسلوب کے خدو خال بیشتر مانوس ہیں۔ انہوں نے ہیئتی تجربے نہیں کئے۔ اسالیب وتراکیب میں آزادی یا یوں کہیئے کہ بے راہ روی سے کام نہیں لیا۔ شاید اس لئے کہ انہوں نے ان مانوس پیرایوں کو اپنے فکر و فن کے اظہار کے لئے ناکافی نہیں پایا اور اپنی جگہ یہ امر واقعی دامن توجہ کھینچتا ہے۔ اس کے باوجود بقول ڈاکٹر خلیل الرحمان "پورے مجموعے کے مطالعے کے بعد جس شخص کے خدو خال ذہن میں اُبھرتے ہیں، وہ آج ہی کا انسان ہے، تنہا، تلاش، مجبوری، محرومی احساس، اجنبیت، غم رفاقت، تشنگی اور مسلسل کشمکش کا شکار ...."

۲۰x۸/۲۲ کے ۱۰۸ صفحات کے اس مجموعے کے دام پانچ روپے ہیں۔
ملنے کا پتہ : پی پی پبلی کیشن ۹۹۳ بازار چتلی قبر دہلی ۶۔

(راج نراین رآز)

---

**ضروری اطلاع** دسمبر کے شمارے میں صفحہ ۴۴ سے صفحہ ۴۶ تک کی کتابوں پر تبصرہ جناب بسمل شمس ملسیانی کا ہے سہواً ان کا نام شائع نہ ہو سکا۔




صرف
5 پیسے
خرچ کر کے
آپ اپنے کنبے
کو
محدود رکھنے
کی طاقت
حاصل کر سکتے ہیں

## نرودھ استعمال کیجئے

فیملی پلاننگ کیلئے
اعلیٰ کوالٹی کے
ربڑ کنڈوم
15 پیسے کے 3
سرکاری امداد سے کم دام

### بچوں کی پیدائش میں وقفہ کیلئے

لیکن اب بچوں کی پیدائش اتفاق کی بات نہیں
یہ آپ کے اختیار میں ہے۔ نرودھ
استعمال کرنے سے آپ کے بچے تبھی
ہونگے جب آپ چاہیں گے، اتفاق
سے نہیں۔

### بچہ اور ماں کی صحت کیلئے

ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ بچے کو شروع کے تین
برسوں میں زیادہ توجہ درکار ہوتی ہے
پھر بچے کی پیدائش کے بعد ماں کو اپنی
صحت بحال کرنے میں بھی وقت لگتا ہے۔
نرودھ استعمال کر کے آپ اگلے بچے کی
پیدائش ملتوی کر سکتے ہیں۔

نرودھ (کنڈوم) اعلیٰ کوالٹی کے ربڑ سے
بنتا ہے۔ دنیا بھر میں لوگ اسے استعمال
کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ فیملی پلاننگ کا آسان
و محفوظ طریقہ ہے۔ اس کے استعمال سے
صحت پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا۔

نرودھ ہر جگہ ملتا ہے:
پرچون، اسٹور، کریانہ فروش،
کیمسٹ، جنرل مرچنٹ، پان فروش
وغیرہ کی دوکانوں پر بکتا ہے۔





نومبر ۱۹۷۰ء کو وگیان بھون نئی دہلی میں صدر جمہوریہ ہند
ی وی وی گری نے خلائی سائنس کی بین اقوامی
ل کے ۱۳ویں جنرل اجلاس کا افتتاح کیا اور
اس میں غیر معمولی کارنامے انجام دینے والے
دکو ۱۹۶۹ء کے انعامات دیئے۔

بائیں سے دائیں) بی وی وولینو اور
وی کمرونیو (سوویت یونین) نیل اے آرم
انگ اور چارلس کون راڈ (جونیئر) (امریکہ)
ایل ارستی (اسپین)

مبر ۱۹۷۰ء کو فلموں کے سالانہ انعامات کی تقسیم
سترہویں قومی تقریب مدراس میں ہوئی جس میں
د فلمی فنکاروں کو ایوارڈ دیئے گئے۔ تقریب
ارت مرکزی وزیر اطلاعات ونشریات نے کی
یر میں) تامل ناڈو کے وزیر اعلا شری کرونانِدھی
ستانی فلموں کی سابقہ مشہور و ممتاز اداکارہ
پلانی کو داداصاحب پھالکے ایوارڈ دے
ہیں۔



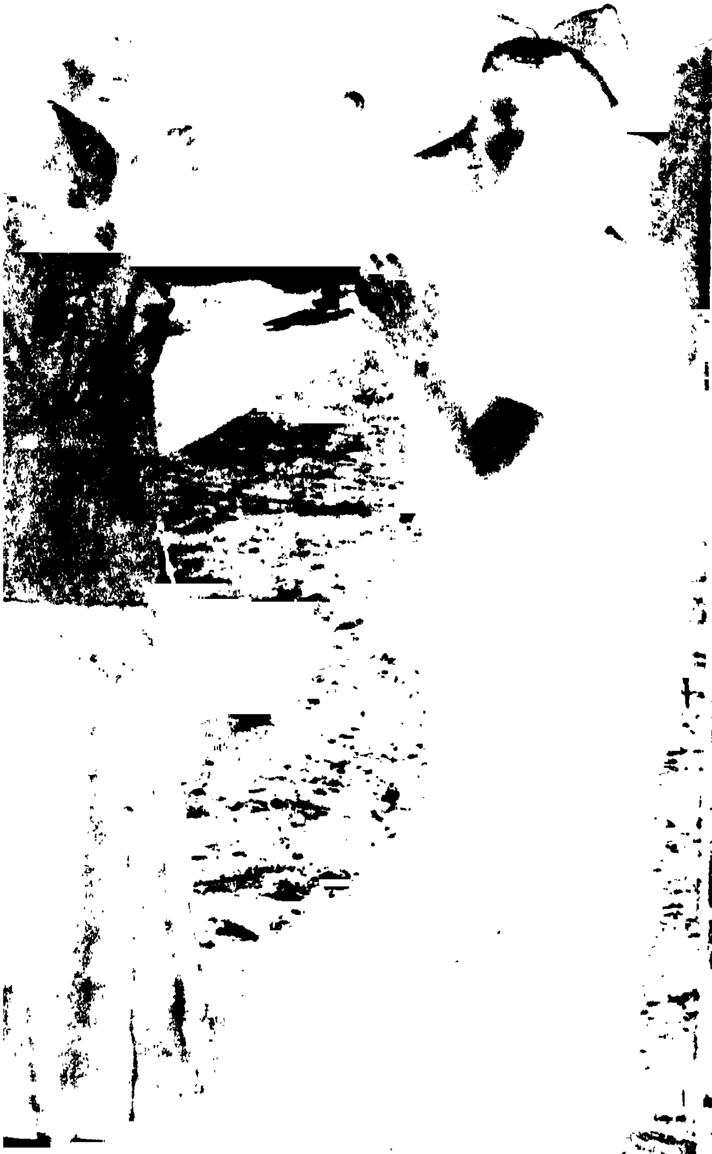
ہندوستان کے مشہور سائنسداں سی وی رامن

(۷ نومبر ۱۸۸۸ء — ۲۱ نومبر ۱۹۷۰ء)

Vol. 29 No. 6 AJKAL (Monthly) January 1971

Edited and Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi.
Printed by Skylark Printers, 11355 Idgah Road, New Delhi-55
Regd. No. D-509





بنکاک میں منعقد چھٹے ایشیائی کھیلوں میں حصہ لینے والے ہندوستانی کھلاڑی جب بھارت لوٹے تو ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ ۲۴ دسمبر کو تمغے حاصل کرنے والے کھلاڑی وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی سے ملنے بھی گئے۔

نیچے (دائیں طرف) طلائی تمغہ حاصل کرنے والے ہندوستانی کھلاڑی جوگندر سنگھ گولہ پھینکتے ہوئے

(بائیں طرف) ۴۰۰ کلومیٹر کی دوڑ میں طلائی تمغہ حاصل کرنے والی خاتون کمل جیت سندھو وزیراعظم کے ساتھ۔



اردو کا مقبول عام مصور ماہنامہ

# آجکل

نئی دہلی

ایڈیٹر
شہباز حسین

*

سب ایڈیٹر
نند کشور وکرم

جلد ۲۹ شمارہ ۷
فروری ۱۹۷۱ء
ماگھ پھاگن شک سمہ ۱۸۹۲

سرورق: مس گورچرن اروڑہ

سالانہ: ہندوستان میں: سات روپے
دیگر ممالک سے ۱۰ شلنگ ہپنس یا [illegible]

فی پرچہ ہندوستان میں: ۶۰ پیسے
دیگر ممالک سے: ۱ شلنگ یا ۱۵ سینٹ





مضامین اور ترسیل زر کا پتہ
شہباز حسین ایڈیٹر آجکل (اردو) پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

شائع کردہ: ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

# ملاحظات

مقامِ مسرت ہے کہ بنکاک میں منعقد چھٹے ایشیائی کھیلوں کے مقابلے میں ہندوستان نے چھ طلائی، نو نقرئی اور دس کانسی کے تمغے حاصل کئے اور وہ پانچویں نمبر پر رہا۔ اس مقابلے میں ایشیا کے ۱۸ ممالک کے تقریباً ۱۰۰۰ کھلاڑیوں نے حصہ لیا۔ ہندوستانی کھلاڑیوں میں پہلا طلائی تمغہ جوگندر سنگھ نے حاصل کیا جنہوں نے ۱۷،۰۹ میٹر تک گولا پھینک کر ایشیائی ریکارڈ قائم کیا۔ بھارت کے مشہور پہلوان بھارت کیسری، ماسٹر چندگی رام کو بھی کشتی میں طلائی تمغہ ملا۔ کماری کمل جیت سندھو واحد ہندوستانی خاتون ہیں جنہیں سونے کا میڈل ملا۔ ۴۰۰ میٹر کی دوڑ میں اوّل آئیں۔ ایتھلیٹک پروین کمار نے ۶۲ر۵۲ میٹر کے فاصلے تک چکر پھینک کر نیا ریکارڈ قائم کیا۔ پچھلا ریکارڈ بھی انہیں کا تھا۔ پانچواں طلائی تمغہ مہندر سنگھ نے ۱۶ر۱۱ میٹر اونچی چھلانگ لگا کر حاصل کیا۔ چھٹا طلائی تمغہ باکسنگ میں ہندوستان کے باز ہو سنگھ کو ملا جنہوں نے کے بازی میں ایران کے عمر فالحی کو شکست دی۔ لابھ سنگھ واحد ہندوستانی کھلاڑی تھے جنہیں دو نقرئی تمغے حاصل ہوئے۔

---

ہندوستان میں ہندی کے بعد سب سے زیادہ اخبارات اُردو میں شائع ہوتے ہیں۔ پریس رجسٹرار کی تازہ ترین رپورٹ برائے ۱۹۶۹ء کے مطابق ہندوستان میں ۱۰۲۸۱ اخبارات و رسائل شائع ہو رہے تھے جن میں روزنامہ اخبارات کی تعداد ۶۵۰ تھی ان میں سے ہندی اخبارات کی تعداد ۱۸۶ اور اُردو اخبارات کی ۹۸ تھی۔ انگریزی اخبارات کی تعداد صرف ۶۹ تھی۔ گزشتہ برس کے مقابلے میں اس برس ۶۶۳ اخبارات کا اضافہ ہوا علاوہ بریں دنیا میں سب سے زیادہ اخبارات بھی ہندوستان سے ہی شائع ہوتے ہیں۔

تعداد کے لحاظ سے اُردو اخبار و رسائل کی تعداد خاصی ہے مگر اشاعت کے لحاظ سے زیادہ تر اُردو اخباروں کی حالت تسلی بخش نہیں ہے۔ یہ مسئلہ ایسا ہے جس پر بڑی سنجیدگی سے دھیان دینے کی ضرورت ہے۔

---

حسبِ سابق ہم نے اس شمارے میں بھی غالب سے متعلق مضامین اور نظمیں شامل کی ہیں۔ اُمید ہے آپ انہیں پسند کریں گے۔

ہم نے "غبارِ کارواں" کا جو سلسلہ شروع کیا ہے۔ اسے بے حد پسند کیا گیا ہے اور یہ سلسلہ جاری رہے گا اور ہر ماہ آپ کسی ادیب یا شاعر کے تاثرات و خیالات پڑھتے رہیں گے۔

ہمارے پڑھنے والے سائنس سے متعلق مضامین کی اشاعت کا برابر تقاضا کرتے رہتے ہیں۔ اس موضوع پر ہمیں بہت کم مضامین موصول ہوتے ہیں۔ ایسے اہلِ قلم جو سائنس کے مختلف پہلوؤں پر دلچسپ اور معلوماتی مضامین لکھ سکیں وہ ہمیں ضرور بھیجیں۔

---






علامہ اقبال کا ایک شعر ہے۔

وہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیل کو آدابِ فرزندی

اس سوال کا جواب کہ مجھے زندگی میں کن شخصیات اور کون کون سی کتابوں نے متاثر کیا ہے، اسی شعر میں پوشیدہ ہے۔ کتاب بھی دراصل فنکار کی شخصیت ہی کا مظہر ہوتی ہے۔ اس لئے تاثر انسان ہر حالت میں شخصیت ہی کا قبول کرتا ہے خواہ وہ بالواسطہ ہو یا کتاب کے واسطے سے۔ اسی اصول کے تحت جب میں اپنی زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو اس نتیجہ پر پہنچتا ہوں کہ سب سے زیادہ اور سب سے گہرا اثر جو میری زندگی نے قبول کیا وہ میرے والد کی شخصیت کا ہے خواہ یہ اثر میں نے براہِ راست قبول کیا ہو گھر کی چار دیواری کے اندر یا ان کی تصانیف کے ذریعے سے۔

ابھی میں بچہ ہی تھا، لفظ شعر کے مفہوم سے بھی شاید آگاہ نہیں تھا شعر کی تہوں تک پہنچنا تو دور کی بات رہی میں والدِ محترم کو کچھ نہ کچھ گنگناتے سنا کرتا تھا ایک شعر سنتے سنتے مجھے زبانی یاد ہو گیا یہ تھا۔

اُڑالی قمریوں نے طوطیوں نے عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری

اس وقت مجھے یہ کہاں معلوم تھا کہ یہ شعر کس کا ہے اور یہ بھی کون جانتا تھا کہ یہ شعر آگے چل کے مجھے یہاں تک متاثر کرے گا کہ میں اپنے خالق (علامہ اقبال) کے تخلیقی شہ پاروں کا عاشق بن جاؤں گا اور میری اپنی شاعری کے متعدد پہلوؤں میں سے ایک پہلو یہاں تک پہنچے گا کہ نیاز فتح پوری، عبدالماجد دریابادی، اسد ملتانی، اور پروفیسر یوسف سلیم چشتی ایسے نقادوں کو اس پر کلام اقبال کا گمان ہوگا۔

اسی بچپن ہی کے زمانے کی بات ہے میں شاید تیسرے درجے میں پڑھتا تھا والد نے ایک کتاب کھول کے میرے سامنے رکھی اور اس میں ایک غزل پڑھنے کو کہا میں نے وہ غزل انہیں پڑھ کے سنا دی انہوں نے کہا اب تم امتحان میں پاس ہو۔ میں اس بات کا مطلب کچھ نہ سمجھا لیکن یہ واقعہ مجھے کئی برس تک یاد رہا اور آج بھی یاد ہے چنانچہ ایک بار میں نے والدِ محترم سے پوچھا کہ اس امتحان کا کیا مطلب تھا تو انہوں نے کہا کہ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم شعر موزوں پڑھ سکتے ہو یا نہیں اور وہ غزل تھی۔

کوئی اُمید بر نہیں آتی : کوئی صورت نظر نہیں آتی

گویا والد نے سب سے پہلے میری طفولیت بلکہ بچپن کے زمانے میں، شعوری یا تحت الشعوری طور پر جن دو شاعروں کو میرے احساس سے متعارف کرایا وہ غالب اور اقبال تھے۔ وہ یقیناً اس بات سے آشنا تھے کہ یہ عمر نہ غالب کو سمجھنے کی ہے اور نہ اقبال کو لیکن غالباً وہ اس بات پر عمل کر رہے تھے کہ مسلمان گھروں میں جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اسی وقت اس کے کان اذان سے آشنا کر دیئے جاتے ہیں۔ آخر یہ سب عمل بے مصرف نہیں ہے۔ ہمارے گھر میں اذان نہ سہی غالب اور اقبال کا ذکر ہی سہی۔

ابھی میرے پوری طرح اقبال کے زیرِ اثر آنے میں بڑی دیر تھی۔ میں پانچویں درجے میں تھا۔ دارالاشاعت لاہور نے حفیظ جالندھری کا مجموعۂ نظم "ہندوستان ہمارا"

شائع کیا۔ یہ کتاب بچوں کے لئے تھی ۔ [illegible] میں اس وقت آئی جب والد کے ہمراہ میں ایک مشاعرے میں بھیرے گیا اور وہاں اگلے دن حفیظ صاحب نے اس کتاب کی دو ایک نظمیں اپنے مخصوص انداز میں ہمیں سُنائیں ۔ "ہندوستان ہمارا" کی نظمیں سُنانے کی وجہ یہ تھی کہ مشاعرے سے واپسی پر مجھ سے والد نے پوچھا "کہو مشاعرہ کیسا رہا" میں نے صاف صاف بتا دیا کہ میری سمجھ میں کوئی نظم نہیں آئی۔ اُنہوں نے کہا "حفیظ صاحب کا کلام بھی؟" میں نے کہا "ان کا ایک ہی مصرع میری سمجھ میں آ رہا تھا: میرا سلام لے جا" کہنے لگے "یہ مصرع بھی معنوی اعتبار سے تم نے نہیں سمجھا ہوگا کیونکہ اس نظم کا جو مرکزی خیال ہے تم اس سے آشنا نہیں ہو چنانچہ اگلے دن جب والد اور میں حفیظ صاحب سے ملنے اُن کی قیام گاہ پر پہونچے تو والد نے شکایت کی کہ جگن کا تو اس مشاعرے میں آنا بے کار ہی رہا۔ یہ کہتا ہے کہ کوئی نظم میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اس پر انہوں نے مذکورہ کتاب "ہندوستان ہمارا" نکالی اور اس میں سے وہ حصہ اپنے مخصوص انداز سے پڑھ کے سُنایا جب لچھمن سروپ نکھا کی ناک کاٹ ڈالتا ہے اور وہ چیختی چلاتی راون کے دربار میں واپس پہنچتی ہے۔ مجھ پر اس نظم کا اتنا اثر ہوا کہ گھر واپس پہنچتے ہی والد سے کہہ کے وہ کتاب میں نے لاہور سے منگوالی اور اسے اتنی بار پڑھا کہ یہ ساری کتاب مجھے زبانی یاد ہو گئی اور جب میں آٹھویں درجے کے ڈویژنل امتحان میں بیٹھا تو تاریخ کے پرچے میں تمام سوالات کے جوابات میں نے نظم میں دیئے اور یہ جوابات "ہندوستان ہمارا" ہی کی نظموں پر مشتمل تھے۔

مجھے اس امر کے اعتراف میں کسی قسم کے تکلف سے کام نہیں لینا چاہیئے کہ جہاں میرا زبان و بیان کے اعتبار سے بشکل شاعری کا ایک حصہ، اقبال کے اسلوب سے متاثر ہے وہاں آسان اور سلیس شاعری کا ایک حصہ ایسا ہے جو حفیظ جالندھری کے اثر سے آزاد نہیں۔

اسی زمانے میں والد نے مجھے لاہور سے ایک اور کتاب منگوا کر دی۔ یہ ڈاکٹر عابد حسین کی ترجمہ شدہ مہاتما گاندھی کی خود نوشت سوانح حیات تھی "تلاشِ حق"۔ یہ غالباً نثر کی پہلی قابلِ ذکر کتاب تھی جو میری نظر سے گزری۔ بچوں کے لئے لکھی ہوئی کتابوں کے علاوہ مثلاً سوتے جاگتے کا قصہ، ابوالحسن، حکایاتِ شیریں وغیرہ۔ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ کتاب ہر حالت میں اپنے مصنف کی شخصیت ہی کا پرتو ہوتی ہے۔ جہاں تک "تلاشِ حق" کا تعلق ہے یہ اصول اور شدت کے ساتھ کار فرما تھا۔ خود ڈاکٹر عابد حسین کی زندگی بھی گاندھی جی کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ ہندوستان میں جن شخصیتوں نے گاندھی جی سے متاثر ہو کر تیاگ کی زندگی بسر کرنے کی کوشش کی ہے، ان میں جامعہ کے اساتذہ کا نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب کا تیاگ دل نہا سجائے کا تیاگ [illegible] لیکن [illegible] خواہوں کی پیش کش موجود [illegible] اپنی سادگی [illegible] نہیں۔ گویا "تلاشِ حق" میں [illegible] والے پر یہ کتاب بعد [illegible] کا اثر [illegible] کتاب کے [illegible] اوّل اوّل اپنے ملک کی تاریخ [illegible] "ہندوستان ہمارا" [illegible]

کم عمری میں "تلاشِ حق" کے مطالعے [illegible] ہمارے ذہن کو ایک خاص راستے پر لگا دیا اور ایک مدت تک [illegible] ایمان رہا کہ ملک میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد ہی سے [illegible] ہندوستانی تہذیب حفاظت بھی ہو سکتی ہے اور اس کی روایات میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے لیکن ملک کی تقسیم اور اس کے بعد کے واقعات نے مجھے اس انداز سے سوچنے پر مجبور کیا کہ مختلف تہذیبی دھاروں کو اگر ہمیں ایک مشترکہ تہذیب کا روپ دینا ہے تو اس کے اجزائے ترکیبی میں ہندو تہذیب اور مسلم تہذیب کو جزوِ اعظم کے طور پر نہیں بلکہ سماج وادی نظریئے کو جزوِ اعظم کے طور پر شامل کرنا ہوگا ورنہ مسلم تہذیب کی لچک کی کمی اور ہندو تہذیب کی قدامت ایک دوسرے پر مسلط ہونے کی کوشش میں اس ملک کے مستقبل کے بخیئے اُدھیڑ دیں گی۔

"تلاشِ حق" کے بعد میں جس کتاب سے متاثر ہوا وہ ڈانٹے کی ڈیوائن کامیڈی تھی۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ ابتدا میں جن دو کتابوں نے مجھے متاثر کیا وہ دونوں ترجمے تھے۔ ڈیوائن کامیڈی کا بھی ترجمہ ہی میری نظر سے گزرا تھا۔ مترجم تھے کارلائل، اوکے زورکل اسٹیڈ اور اگر میں کہوں کہ ڈانٹے خوش نصیب تھا کہ اسے یہ تین مترجم میسر آئے تو غلط نہ ہوگا۔

اس نظم میں کئی ایسے مقام آئے جنہیں پڑھ کر میں اکثر آبدیدہ ہو جاتا بالخصوص جب میں اس مقام پر پہنچا جب بیٹریس کو ڈانٹے جنت میں ریا اعراف — مجھے اب صحیح یاد نہیں رہا) اپنی سہیلیوں کے ساتھ بیٹھا ہوا دیکھتا ہے تو آنسو ضبط نہ ہو سکے اور میں کوشش کے باوجود اس کو مکمل طور پر نہ پڑھ سکا۔ اگرچہ میری اپنی زندگی میں بیٹریس بہت آگے چل کے داخل ہوئی لیکن حسن کے تعلق سے ڈانٹے کے اور میرے احساس میں جو مطابقت موجود تھی ہر بار میرے آبدیدہ ہو جانے کا باعث بنتی تھی۔

لیکن اس کتاب میں رسول اللہ اور حضرت علی کا ذکر جس طرح سے ڈانٹے نے کیا ہے وہ مجھے کبھی پسند نہیں آیا۔ مذہب کی بنا پر کسی شاعر کا اس قدر تنگ دل ہو جانا میری سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا۔ رسول اللہ اور حضرت علی تو خیر [illegible]

سے عقیدت اسے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن ڈانتے نے اپنے استاد ورجل کو جنت میں بار پانے کی اجازت نہیں دی تھی حالانکہ ورجل حضرت عیسیٰ مسیح کی پیدائش سے پہلے ہی اس دنیا میں آکر جا چکا تھا۔

اس کے باوجود ڈانتے کے خیالات اور تصورات نے مجھے بے حد متاثر کیا اور میری بڑی خواہش رہی کہ اردو نظم میں اس طرح کی ایک کتاب لکھوں لیکن اول تو اتنا بڑا کینوس میری سمجھ میں آیا نہیں تھا اور اگر کبھی میرے ذہن میں تانا بانا بنا بھی تو موضوع کو ہاتھ لگانے کا حوصلہ نہ ہوا۔

پریم چند کا ناول "نرملا" بھی اسی زمانے میں میں نے پڑھا اور پہلی بار اُنھیں میں ایک Powerful قلم سے آشنا ہوا۔ اب مجھے اس ناول کی تفصیل تو یاد نہیں لیکن اتنا یاد ہے کہ اس ناول میں ایسے حصے بکثرت تھے جنہیں پڑھ کے بے اختیار میرے آنسو اُمڈ اُمڈ آتے تھے بالخصوص لڑکے کا گھر چھوڑ کے بورڈنگ ہاؤس میں داخل ہونا اور اس کا گھر میں یہ کہلا کے بھیجنا کہ اب مجھے گھر سے کھانا یا دودھ نہ بھیجا جائے۔ انتہائی دردناک قصہ ہے اور اُسے پڑھتے وقت آنسوؤں کو روک لینا میرے بس میں نہ تھا۔

اتفاق کی بات ہے کہ مجھے یکے بعد دیگرے ایسی ہی کتابوں نے متاثر کیا جو المیہ کی ذیل میں آتی ہیں۔ کچھ مدت بعد شیکسپیئر کا ڈرامہ "ہملٹ" میں نے پڑھا۔ اس میں اوفیلیا کے کردار نے میرے ساتھ وہی سلوک کیا جو ڈیوائن کامیڈی میں بیٹریس نے کیا تھا۔

اس وقت تک اقبال کے کلام سے میرا تعلق خاصا گہرا ہو چکا تھا اور اس کا شاہکار "جاوید نامہ" بھی میری نظر سے گزر چکا تھا۔ "جاوید نامہ" پر ڈیوائن کامیڈی کا اثر بڑی حد تک موجود ہے لیکن یہ دیکھ کر جاوید نامہ کا مرتبہ میری نظر میں ڈیوائن کامیڈی سے کہیں اونچا ہو گیا کہ جہاں ڈیوائن کامیڈی میں ڈانتے نے غیر عیسائی شخصیتوں کے ذکر میں خواہ وہ رسول اللہ ہوں یا حضرت علی یا ڈانتے کے اپنے پیرو مرشد ورجل، انتہائی تعصب اور تنگ نظری کا مظاہرہ کیا ہے وہاں اقبال نے جاوید نامہ میں غیر مسلم شخصیتوں مثلاً شیوجی مہاراج، بھرتری ہری، اور نہرو خاندان پر محبت اور عقیدت کے وہ پھول نچھاور کئے ہیں جن کی خوشبو سے عالم انسانیت ہمیشہ مشکبار رہے گا۔ اگر دنیا کے گنہ گار حضرت عیسیٰ مسیح کی قربانی کی بدولت بخشے جا سکتے ہیں تو اقبال کے اس اندازِ فکر کی بدولت ڈانتے کے تعصب اور تنگ نظری کا گناہ بھی یقیناً اس وقت تک بخشا جا چکا ہوگا۔

اقبال کی تصانیف ہی نے مجھے تمام تصانیف سے زیادہ متاثر کیا اور انہی کا ذکر میں بڑی تفصیل سے کرنا چاہتا ہوں مگر تابِ گفتار کہتی ہے نہیں۔ یوں تو اقبال اور اقبال کی تصانیف پر میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں نثر میں بھی اور نظم میں بھی۔ "اقبال اور اس کا عہد" کے نام سے ایک کتاب بھی موجود ہے لیکن بقول غالب حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ اور پھر اقبال کی تصانیف کا ذکر ایک ایسے مقالے کا جزو کیسے بنے جو مختلف شخصیتوں اور تصانیف کے بارے میں لکھا جا رہا ہو۔

اسی طرح اپنے والد کی شخصیت کا جو اثر میں نے قبول کیا ہے اس کے ذکر کے لئے بھی ایک علاحدہ مقالہ ہی درکار ہے۔ جس دامنِ شفقت میں میں نے پرورش پائی ہے اس کے اثر سے میری زندگی اور میرا ذوق کیونکر بے گانہ رہ سکتا ہے۔ شعر و ادب کی بات تو الگ رہی میرے گھر کے لوگ اور میرے احباب اکثر مجھ سے یہ کہتے ہیں کہ میرے اُٹھنے بیٹھنے اور کھانے پینے کا انداز بالکل وہی ہے جو میرے والد کا تھا بلکہ حیرت کی بات یہ ہے کہ اب جبکہ میری عمر پچاس سے تجاوز کر چکی ہے اکثر وہی ادویہ میرے استعمال میں آ رہی ہیں جو والد استعمال کیا کرتے تھے۔

یہ مقالہ میرے اساتذہ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال (مرحوم) پرنسپل اورینٹل کالج ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، سید عابد علی، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم اور آقا بیدار بخت کے ذکر کے بغیر نامکمل رہے گا جن کے قدموں میں بیٹھنے کا اگر مجھے اتفاق نہ ہوتا تو میں فارسی ادب سے قریب قریب بیگانہ ہی رہتا اور میری شاعری کا شاید وہی انداز ہوتا جو فارسی نہ جاننے والے اُردو شعراء کا ہے اور جو مجھے بڑی حد تک ناپسند ہے۔ اسی طرح سے مولینا صلاح الدین احمد، ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی، شیر محمد اختر، قیوم نظر، یوسف ظفر اور قتیل شفائی کا ذکر بھی یہاں میں ضروری سمجھتا ہوں جن کے بغیر لاہور کی ادبی زندگی میرے لئے اتنی پُرکیف نہ بن سکتی جتنی پُرکیف اور دلکش وہ بنی اور جس کی یاد آج بھی میرے دل میں چٹکیاں لے رہی ہے۔

موجودہ دور کے شعراء میں میں جوش سے بھی متاثر ہوا ہوں، جگر سے بھی اور فراق سے بھی۔ اِن تینوں کی شخصیت سے بھی اور ان کی شاعری سے بھی اور اُن کی زندگی کے اس پہلو کو میں نے ہمیشہ ان کی کمزوری پر محمول کیا ہے کہ انہوں نے ایک دوسرے کے حق میں کبھی کلمۂ خیر نہیں کہا سوائے ایسے موقعوں کے جہاں کوئی مصلحت کارفرما ہو۔ ان تینوں کو یہ گمان رہا اور جوش اور فراق کو ابھی تک ہے کہ اُردو نے اُن سے بڑا شاعر پیدا نہیں کیا ہے۔ ویسے مولانا انہوں نے غالب کو اپنے پر ترجیح دی ہے۔ اگرچہ اس میں بھی میرے نزدیک کبھی خلوص شامل نہیں رہا۔ اقبال کی شاعرانہ عظمت کو انہوں نے کبھی تسلیم نہیں کیا لیکن میں سمجھتا

---

نہ اگرچہ ڈانتے نے اپنی کتاب کا نام "طربیہ" رکھا ہے لیکن دراصل وہ ہے المیہ ہی۔ (ع۔ ف۔ ع)

شائع کیا۔ یہ کتاب بچوں کے لئے تھی ۔ اور میرے علم میں اس وقت آئی جب والد کے ہمراہ میں ایک مشاعرے میں پہنچ گیا اور وہاں اگلے دن حفیظ صاحب نے اس کتاب کی دو ایک نظمیں اپنے مخصوص انداز میں ہمیں سنائیں۔ "ہندوستان ہمارا" کی نظمیں سنانے کی وجہ یہ بھی کہ مشاعرے سے واپسی پر مجھ سے والد نے پوچھا "کہو مشاعرہ کیسا رہا" میں نے صاف صاف بتا دیا کہ میری سمجھ میں کوئی نظم نہیں آئی۔ انہوں نے کہا "حفیظ صاحب کا کلام بھی؟" میں نے کہا "ان کا ایک ہی مصرع میری سمجھ میں آ رہا تھا: میرا سلام لے جا۔" کہنے لگے یہ مصرع بھی معنوی اعتبار سے تم نے نہیں سمجھا ہوگا کیونکہ اس نظم کا مرکزی خیال ہے تم اس سے آشنا نہیں ہو۔ چنانچہ اگلے دن جب والد اور میں حفیظ صاحب سے ملنے اُن کی قیام گاہ پر پہنچے تو والد نے شکایت کی کہ جگن کا تو اس مشاعرے میں آنا بے کار ہی رہا۔ یہ کہتا ہے کہ کوئی نظم میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اس پر انہوں نے مذکورہ کتاب "ہندوستان ہمارا" نکالی اور اس میں سے وہ حصہ اپنے مخصوص انداز سے پڑھ کے سنایا جب لچھمن سروپ نکھا کی ناک کاٹ ڈالتا ہے اور وہ چیختی چلاتی راون کے دربار میں واپس پہنچتی ہے۔ مجھ پر اس نظم کا اتنا اثر ہوا کہ گھر واپس پہنچتے ہی والد سے کہہ کے وہ کتاب میں نے لاہور سے منگوالی اور اسے اتنی بار پڑھا کہ یہ ساری کتاب مجھے زبانی یاد ہوگئی اور جب میں آٹھویں درجے کے ڈسٹرکٹ امتحان میں بیٹھا تو تاریخ کے پرچے میں تمام سوالات کے جوابات میں نے نظم میں دیئے اور یہ جوابات "ہندوستان ہمارا" ہی کی نظموں پر مشتمل تھے۔

مجھے اس امر کے اعتراف میں کسی قسم کے تکلف سے کام نہیں لینا چاہئے کہ جہاں میرا زبان و بیان کے اعتبار سے بشکل شاعری کا ایک حصہ، اقبال کے اسلوب سے متاثر ہے وہاں آسان اور سلیس شاعری کا ایک حصہ ایسا ہے جو حفیظ جالندھری کے اثر سے آزاد نہیں۔

اسی زمانے میں والد نے مجھے لاہور سے ایک اور کتاب منگوا کر دی۔ یہ ڈاکٹر عابد حسین کی ترجمہ شدہ مہاتما گاندھی کی خود نوشت سوانح حیات تھی: "تلاش حق"۔ یہ غالباً نثر کی پہلی قابلِ ذکر کتاب تھی جو میری نظر سے گزری۔ بچوں کے لئے لکھی ہوئی کتابوں کے علاوہ مثلاً "سوتے جاگتے" کا قصہ، "ابوالحسن"، "حکایاتِ شیریں" وغیرہ۔ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ کتاب ہر حالت میں اپنے مصنف کی شخصیت ہی کا پرتو ہوتی ہے۔ جہاں تک "تلاشِ حق" کا تعلق ہے یہ اصول اور شدت کے ساتھ کار فرما تھا۔ خود ڈاکٹر عابد حسین کی زندگی بھی گاندھی جی کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ ہندوستان میں جن شخصیتوں نے گاندھی جی سے متاثر ہو کر تیاگ کی زندگی بسر کرنے کی کوشش کی ہے، ان میں جامعہ کے اساتذہ کا نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب کا تیاگ [illegible]

کا تیاگ [illegible] ہے لیکن [illegible] تنخواہوں کی پیشکش موجود ہو، اپنی سادہ زندگی [illegible] نہیں۔ گویا "تلاشِ حق" میں مصنف [illegible] والے پر یہ کتاب دو آتشہ کا اثر رکھتی [illegible] اوّل اوّل اپنے ملک کی تاریخ کے مطالعے کا شوق [illegible] "ہندوستان ہمارا" کی بدولت [illegible]

کم عمری میں "تلاشِ حق" کے مطالعے نے میرے سوچ بچار کے ڈھنگ کو ایک خاص راستے پر لگا دیا اور ایک مدت تک [illegible] میرا یہ ایمان رہا کہ اس ملک میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد ہی سے صحیح ہندوستانی تہذیب کی حفاظت بھی ہو سکتی ہے اور اس کی روایات میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے لیکن ملک کی تقسیم اور اس کے بعد کے واقعات نے مجھے اس انداز سے سوچنے پر مجبور کیا کہ مختلف تہذیبی دھاروں کو اگر ہمیں ایک مشترک تہذیب کا روپ دینا ہے تو اس کے اجزائے ترکیبی میں ہندو تہذیب اور مسلم تہذیب کو جزوِ اعظم کے طور پر نہیں بلکہ سماج واد کے نظریے کو جزوِ اعظم کے طور پر شامل کرنا ہوگا ورنہ مسلم تہذیب میں لچک کی کمی اور ہندو تہذیب کی قدامت ایک دوسرے پر مسلط ہونے کی کوشش میں اس ملک کے مستقبل کے بخیے ادھیڑ دیں گی۔

"تلاشِ حق" کے بعد میں جس کتاب سے متاثر ہوا وہ ڈانٹے کی ڈیوائن کامیڈی تھی۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ ابتدا میں جن دو کتابوں نے مجھے متاثر کیا وہ دونوں ترجمے تھے۔ ڈیوائن کامیڈی کا بھی ترجمہ ہی میری نظر سے گزرا تھا۔ مترجم تھے کارلائل، اوکے زوراٹ اسٹیڈ اور اگر میں کہوں کہ ڈانٹے انتہا خوش نصیب تھا کہ اسے یہ تین مترجم میسر آئے تو غلط نہ ہوگا۔

اس نظم میں کئی ایسے مقام آئے جنہیں پڑھ کر میں اکثر آبدیدہ ہو جاتا تھا بالخصوص جب میں اس مقام پر پہنچا جب بیٹرس ڈانٹے کو جنت میں (یا اعراف میں — مجھے اب صحیح یاد نہیں رہا) اپنی سہیلیوں کے ساتھ بیٹھا ہوا دیکھتا ہے تو میرے آنسو ضبط نہ ہو سکے اور میں کوشش کے باوجود اس کو مکمل طور پر نہ پڑھ سکا۔ اگرچہ میری اپنی زندگی میں بیٹرس بہت آگے چل کے داخل ہوئی لیکن فا[illegible] حسن کے تعلق سے ڈانٹے کے اور میرے احساس میں جو مطابقت موجود تھی ا[illegible] ہر بار میرے آبدیدہ ہو جانے کا باعث بنتی تھی۔

لیکن اس کتاب میں رسول اللہ اور حضرت علی کا ذکر جس طرح سے ڈانٹے نے کیا ہے وہ مجھے کبھی پسند نہیں آیا۔ مذہب کی بنا پر کسی شاعر کا اس قدر تنگ دل ہو جانا میری سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا۔ رسول اللہ اور حضرت علی تو غیر مسلما[illegible]

[illegible] کوئی تعلق نہیں تھا لیکن ڈانٹے نے اپنے استاد ورجل کو جہاں بہشت میں [illegible] نہیں تھا مسلمان نہیں تھا اور ورجل حضرت عیسیٰ مسیح کی پیدائش سے پہلے ہی اس دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔

اس کے باوجود ڈانٹے کے طرز فکر اور سحر بیان نے مجھے بے حد متاثر کیا اور میری بڑی خواہش رہی کہ اردو نظم میں اس طرح کی ایک کتاب لکھوں لیکن اس کا اتنا بڑا کینوس میری سمجھ میں آ ہی نہیں سکا اور اگر کبھی میں نے ذہن میں خاکا بنایا بھی تو موضوع کو ہاتھ لگانے کا حوصلہ نہ ہوا۔

پریم چند کا ناول "نرملا" بھی اسی زمانے میں میں نے پڑھا اور پہلی بار اردو میں میں ایک Powerful قلم سے آشنا ہوا۔ اب مجھے اس ناول کی تفاصیل تو یاد نہیں لیکن اتنا یاد ہے کہ اس ناول میں ایسے حصے بکثرت تھے جنہیں پڑھ کے بے اختیار میرے آنسو امنڈ امنڈ آتے تھے بالخصوص لڑکے کا گھر چھوڑ کے بورڈنگ ہاؤس میں داخل ہونا اور اس کا گھر میں یہ کہلا کے بھیجنا کہ اب مجھے گھر سے کھانا یا دودھ نہ بھیجا جائے انتہائی دردناک قصہ ہے اور اسے پڑھتے وقت آنسوؤں کو روک لینا میرے بس میں نہ تھا۔

اتفاق کی بات ہے کہ مجھے بعد ازاں بھی ایسی ہی کتابوں نے متاثر کیا جو المیہ کی ذیل میں آتی ہیں۔ کچھ مدت بعد شیکسپیئر کا ڈرامہ "ہملٹ" میں نے پڑھا۔ اس میں اوفیلیا کے کردار نے میرے ساتھ وہی سلوک کیا جو ڈیوائن کامیڈی میں بیٹریس نے کیا تھا۔

اس وقت تک اقبال کے کلام سے میرا تعلق خاصا گہرا ہو چکا تھا اور اس کا شاہکار "جاوید نامہ" بھی میری نظر سے گزر چکا تھا۔ "جاوید نامہ" پر ڈیوائن کامیڈی کا اثر بڑی حد تک موجود ہے لیکن یہ دیکھ کر جاوید نامہ کا مرتبہ میری نظر میں ڈیوائن کامیڈی سے کہیں اونچا ہو گیا کہ جہاں "ڈیوائن کامیڈی" میں ڈانٹے نے غیر عیسائی شخصیتوں کے ذکر میں خواہ وہ رسول اللہ ہوں یا حضرت علی یا ڈانٹے کے اپنے پیر و مرشد ورجل، انتہائی تعصب اور تنگ نظری کا مظاہرہ کیا ہے وہاں اقبال نے "جاوید نامہ" میں غیر مسلم شخصیتوں مثلاً شیو جی مہاراج، بھرتری ہری، اور نہرو خاندان پر محبت اور عقیدت کے وہ پھول نچھاور کیے ہیں جن کی خوشبو سے عالم انسانیت ہمیشہ مہکتا رہے گا۔ اگر دنیا کے گنہگار حضرت عیسیٰ مسیح کی قربانی کی بدولت بخشے جا سکتے ہیں تو اقبال کے اس انداز فکر کی بدولت ڈانٹے کے تعصب اور تنگ

* اگرچہ ڈانٹے نے اپنی کتاب کا نام "طربیہ" رکھا ہے لیکن دراصل یہ المیہ ہے (ع ن [illegible])

[illegible] بھی یقیناً اس وقت تک بخشا جا چکا ہوگا۔

اقبال کی تصانیف ہی نے مجھے تمام تصانیف سے زیادہ متاثر کیا اور انہی کا ذکر میں بڑی تفصیل سے کرنا چاہتا ہوں مگر تاب گفتار کہتی ہے بس۔ یوں تو اقبال اور اقبال کی تصانیف پر میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں نثر میں بھی اور نظم میں بھی۔ "اقبال اور اس کا عہد" کے نام سے ایک کتاب بھی موجود ہے لیکن بقول غالب حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ اور پھر اقبال کی تصانیف کا ذکر ایک ایسے مقالے کا جزو کیسے ہے جو مختلف شخصیتوں اور تصانیف کے بارے میں لکھا جا رہا ہو۔

اسی طرح اپنے والد کی شخصیت کا جو اثر میں نے قبول کیا ہے اس کے ذکر کے لئے بھی ایک علیحدہ مقالہ ہی درکار ہے۔ جس دامن شفقت میں میں نے پرورش پائی ہے اس کے اثر سے میری زندگی اور میرا ذوق کیونکر بیگانہ رہ سکتا ہے۔ شعر و ادب کی بات تو الگ رہی۔ میرے گھر کے لوگ اور میرے احباب اکثر مجھ سے یہ کہتے ہیں کہ میرے اٹھنے بیٹھنے اور کھانے پینے کا انداز بالکل وہی ہے جو میرے والد کا تھا بلکہ حیرت کی بات یہ ہے کہ اب جبکہ میری عمر پچاس سے تجاوز کر چکی ہے اکثر وہی ادویہ میرے استعمال میں آ رہی ہیں جو والد استعمال کیا کرتے تھے۔

یہ مقالہ میرے اساتذہ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال (مرحوم) پرنسپل اورینٹل کالج، ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، سید عابد علی، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور آغا بیدار بخت کے ذکر کے بغیر نامکمل رہے گا جن کے قدموں میں بیٹھنے کا اگر مجھے اتفاق نہ ہوتا تو میں فارسی ادب سے قریب قریب بیگانہ ہی رہتا اور میری شاعری کا شاید وہی انداز ہوتا جو فارسی نہ جاننے والے اردو شعرا کا ہے اور جو مجھے بڑی حد تک ناپسند ہے۔ اسی طرح سے مولانا صلاح الدین احمد، ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی، شیر محمد اختر، قیوم نظر، یوسف ظفر اور قتیل شفائی کا ذکر بھی یہاں میں ضروری سمجھتا ہوں جن کے بغیر لاہور کی ادبی زندگی میرے لئے اتنی پرکیف نہ بن سکتی جتنی پرکیف اور دلکش وہ بنی اور جس کی یاد آج بھی میرے دل میں چٹکیاں لے رہی ہے۔

موجودہ دور کے شعرا میں میں جوش سے بھی متاثر ہوا ہوں، جگر سے بھی اور فراق سے بھی۔ ان تینوں کی شخصیت سے بھی اور ان کی شاعری سے بھی۔ اور ان کی زندگی کے اس پہلو کو میں نے ہمیشہ ان کی کمزوری پر محمول کیا ہے کہ انہوں نے ایک دوسرے کے حق میں کبھی کلمۂ خیر نہیں کہا سوائے ایسے موقعوں کے جہاں کوئی مصلحت کارفرما ہو۔ ان تینوں کو یہ گمان رہا اور جوش اور فراق کو ابھی تک ہے کہ اردو نے ان سے بڑا شاعر پیدا نہیں کیا ہے۔ ویسے موتا انہوں نے غالب کو اپنے پر ترجیح دی ہے۔ اگرچہ اس میں بھی میرے نزدیک کبھی خلوص شامل نہیں رہا۔ اقبال کی شاعرانہ عظمت کو انہوں نے کبھی تسلیم نہیں کیا، لیکن میں سمجھتا

چونکہ اقبال کے بارے میں وقت اپنا فیصلہ دے چکا ہے اور انہیں اُردو کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا جا چکا ہے۔ جوش، جگر اور فراق کا شمار اچھے شعراء میں ہے اور ہوتا رہے گا۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی دور میں بھی فردوسی، سعدی، رومی، کالی داس، تلسی داس، بھرتری ہری، شیکسپیر، دانتے، گوئٹے، ٹی ایس ایلیٹ، غالب اور اقبال کی طرح بڑے شاعر تسلیم کئے جائیں کیونکہ ادب کے بڑے ہونے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ بڑی فکر کا حامل ہو اور بڑی فکر سے ان تینوں کا کلام خالی ہے۔

لیکن یہ سب کچھ کہنے کے باوجود یہ دعویٰ کہ میں فراق کے کلام سے متاثر نہیں صحیح نہیں۔ فراق کی غزل سے (نظم سے نہیں) میں یقیناً متاثر ہوا ہوں اور اپنے ہر پسندیدہ شاعر کی طرح اُن کے بھی اکثر اشعار مجھے یاد ہیں۔ مثلاً

یونہی سا تھا کوئی جس نے مجھے مٹا ڈالا
نہ کوئی نور کا پُتلا نہ کوئی زہرہ جبیں

نہ کوئی وعدہ نہ کوئی یقیں نہ کوئی اُمید
مگر ہمیں تو ترا انتظار کرنا تھا

کچھ آدمی کو بھی مجبوریاں ہیں دُنیا میں
ارے وہ دردِ محبت سہی تو کیا مر جائیں

ہزار بار زمانہ اِدھر سے گذرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہگذر پھر بھی

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست
آہ اب مجھ سے تری رنجشِ بے جا بھی نہیں

ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

منزلیں گرد کی مانند اُڑی جاتی ہیں
وہی اندازِ جہانِ گزراں ہے کہ جو تھا

کسی کی بزمِ طرب میں حیات بٹتی تھی
اُمیدواروں میں کل موت بھی نظر آئی

کہاں ہر ایک سے بارِ نشاط اٹھتا ہے
کہ یہ بلا بھی ترے عاشقوں کے سر آئی

فضا تبسمِ صبحِ بہار تھی لیکن
پہنچ کے منزلِ جاناں پہ آنکھ بھر آئی

[illegible]
ترے شباب کی [illegible]

تم مخاطب بھی ہو قریب بھی ہو
تم کو دیکھیں کہ تم سے بات کریں

اس دور میں زندگی بشر کی
بیمار کی رات ہو گئی ہے

یہ فراق کے کمالِ شعر کی انتہا ہے اور اُردو [illegible] سے متاثر نہ ہوگا لیکن یہاں اس پر روشنی [illegible] کی عام سطح نہیں۔

اچھے اشعار جدید شاعروں کے یہاں بھی مل جاتے ہیں اور ان سے بھی میں اثر پذیر ہوا ہوں۔ مثلاً

پھیلا ہوا تھا شہر میں تنہائیوں کا جال
ہر شخص اپنے اپنے تعاقب میں غرق تھا (سلطان اختر)

وہ چور رات مجھ کو بڑے ادب سے سلام کر کے چلا گیا
اُسے کیا خبر مرے دل میں بھی کبھی آرزوئے گناہ تھی (احمد مشتاق)

انہی لوگوں سے مل کر خوش ہوا ہوں
انہی لوگوں سے ڈرتا بھی رہا ہوں (محمد علوی)

لوگ کہتے ہیں سیاہی کے سمندر میں کہیں
اور بھی ایک چمکتا ہوا دن ڈوب گیا (خورشید احمد جامی)

وہ نہیں ہے نہ سہی ترکِ تمنا نہ کرو
دل اکیلا ہے اُسے اور اکیلا نہ کرو (محمود ایاز)

کبھی مائل بہ رقابت کبھی مائل بہ گریز
زندگی ہم سے ملی تیری اداؤں کی طرح (ممتاز راشد)

دامِ خوشبو میں گرفتار صبا ہے کب سے
لفظ اظہار کی اُلجھن میں پڑا ہے کب سے (عبدالسلام امجد)

اگر میں نے تجھے دُنیا پہ قرباں کر دیا تو کیا
یہاں انسان جینے کے لئے کیا کیا نہیں کرتا (نثار ناسک)

عظمت کی بلندی پہ میں جس سمت گیا ہوں
دیکھا ہے ترے پاؤں کا پہلے سے نشاں ہے (خاقان خاور)

چراغِ بزم ابھی جانِ انجمن نہ بجھا
کہ یہ بجھا تو ترے خد و خال سے بھی گئے (حامد عزیز مدنی)

[illegible]
ہو کے بے دیکھا وہی پتھر نظر آیا
ایک بے تو تسلی ہر ایک ڈھنگ ہے (خالد احمد)

وطن سے پھرتے ہوئے بے گئے بھول کے ساتھ
ہم مکاں میں ویسے شاید کوئی رہتا نہیں (افتخار نسیم)

وہ گلے والوں سارا گاؤں میں ڈوبا ہوا
نزدیک بھی آج تک نہ کے دل میں کبھی ذرا دیکھ (حامد جیلانی)

بے بس ہی انسان کا معیار نہیں ہے
کسی بھی سمت سے ابھرے ستارۂ آواز (محمد جلیل عالی)

نہیں یہ قید کہ وہ آسماں سے ظاہر ہو
اٹھائے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہے وہ
خدا جانے کس گھڑی زندگی کی شام ہو جائے (البشیر بدر)

مری آنکھیں سلامت ہیں تو پھر ہیں
پرائے خواب لے کر کیا کروں گا (اعجاز گل)

شہرِ دل میں رات کوئی سوداگر بن کر آیا تھا
نقدِ دل و جاں سونپ کے اس کو صبح بہت پچھتائے ہم (زبیر رضوی)

پھر تو یاروں سے بلا سنگِ ملامت ہی سہی
کس نے اس شہر میں یوں دادِ وفا پائی ہے (رضی اختر شوق)

یہ اشعار زیادہ تر میرے بعد کی نسل کے شعراء کے ہیں اور میں اُن سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ نئی نسل کے شعراء کی یہ فہرست مکمل نہیں ہے اور فہرست مکمل کرنا میرا مقصد بھی نہیں ہے۔ یہ تمام اشعار مجھے پسند ہیں اور ظاہر ہے کہ زبانی وہی اشعار یاد رہیں گے جو پسند ہوں گے اور ساتھ ہی یہ کہنے کی بھی اجازت چاہتا ہوں کہ یہ اشعار یا فراق صاحب کے جو اشعار میں نے درج کیے ہیں میرے نزدیک عظیم شاعری کے نمونے نہیں ہیں اور یہی فرق ہے جو میری نظر میں ایک بڑے شاعر کو محض اچھے شاعر سے ممتاز کرتا ہے۔ بڑی شاعری کے دو ایک نمونے میرے نزدیک یہ ہیں۔

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل نہ بن جائے (اقبال)

تو کفِ خاک و بے بصر میں کفِ خاک و خود نگر
کشتِ وجود کے لیے آبِ رواں ہے تو کہ میں (اقبال)

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکوں (اقبال)

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی (غالب)

بیدل پائے تماشہ کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں (غالب)

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے (غالب)

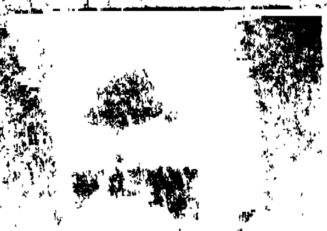
ہماری شاعری کو عظیم بنانے کا سہرا بحیثیت مجموعی نظم کے سر ہے غزل کے سر نہیں۔ اگر عظیم شاعری کے تعلق سے نظم اور غزل دونوں موضوعِ بحث ہوں تو غزل چاہے حافظ کی ہو یا غالب کی نظم کے مقابلے میں ایک فروتر صنف قرار پائے گی۔

اب آخر میں اپنے اُستاد شمس العلماء مولینا تاجور نجیب آبادی مرحوم کا ذکر کر کے رخصت ہوتا ہوں۔ مولینا تاجور مرحوم کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف مجھے سب سے پہلے ۱۹۳۲ء میں حاصل ہوا اور ۱۹۴۵ء تک میری اُن کی خدمت میں حاضری کا یہ عالم رہا کہ اگر وہ بھی لاہور میں ہیں اور میں بھی تو شاید ہی کوئی دن ایسا گزرتا ہو جب میں اُن کے یہاں حاضر نہ ہوتا ہوں۔ جہاں تک اشعار میں تصحیح کا تعلق ہے مولینا نے میری دو یا تین غزلوں یا نظموں کو اس انداز سے دیکھا ہو اور وہ اس انداز کی تصحیح کے قائل ہی نہیں تھے جسے "اشعار بنانا" کہتے ہیں۔ ہاں بات بات میں انہوں نے مجھے ادب اور ادب کی باریکیوں سے آشنا کرنے کی کوشش کی۔ "بالِ جبریل" انہوں نے مجھے سُنانے کی خاطر اوّل سے آخر تک پڑھی اور اقبال کی خوبیوں اور خامیوں سے مجھے آگاہ کیا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ یہ خامیاں اقبال کے سیلِ شعر میں خس و خاشاک کی طرح بہہ جائیں گی لیکن تمہارے کلام میں ہوں گی تو سطح پر تیرتی نظر آئیں گی اس لئے تم ان سے اجتناب کرو۔

مولینا مرحوم کا کوئی مجموعۂ کلام یا مجموعۂ نثر آج یادگار کے طور پر ہمارے سامنے نہیں ہے یہ بھی ہم لوگوں ہی کی خطا ہے جو اپنے آپ کو ان کا شاگرد کہتے ہیں لیکن حقِ شاگردی ادا کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ خدا کرے پاکستان میں اُن کے کسی شاگرد کو ان کا کلام اور مقالاتِ نثر جمع کرنے کی توفیق حاصل ہو اور وہ یہ کام سرانجام دے دے کیونکہ ان کی نظمیں غزلیں اور مقالات وہاں کی لائبریریوں میں تو دستیاب ہو جائیں گے لیکن اگر یہ کام نہ بھی حاصل ہو سکے تو مولینا کی تصانیف ان کی وہ جیتی جاگتی تصویریں ہیں جنہیں دُنیائے ادب اختر شیرانی، کرپال سنگھ بیدار، خاطر بریلوی اور احسان دانش کے نام سے جانتی ہے اور اگرچہ میں اپنے آپ کو مولینا کی خاکِ پا کے برابر بھی نہیں سمجھتا لیکن :۔

گرچہ خردیم نسبتے است بزرگ
ذرّہ آفتاب تابانیم

کے مصداق چاہتا ہوں کہ اپنا نام بھی اس فہرست میں شامل کروں۔



اے شاعرِ یکتا، اسداللّٰہی و غالب
اے قلزمِ مواجِ معانی و مطالب
تھی فکر میں تیری پرِ جبریل کی پرواز
تھا عالمِ غیبی کا ہم آہنگ ترا ساز
ہر فلسفہ و منطق و افسانہ و افسوں
آتے تھے ترے ذہن میں یوں غیب سے مضموں
جس طرح دمِ فکر برستے ہوں مسلسل
میخانۂ تخئیل پہ الہام کے بادل
فطرت کا ہر اک راز تری فکر میں ضم تھا
کیا خامہ و قرطاس ترا لوح و قلم تھا
اسرارِ مشیت کہیں ہوتے ہیں رقم بھی
کیا تیرے نہاں خانے کا گوشہ تھا عدم بھی
اُس فکر کے عالم میں قلم تیرا رواں تھا
جس فکر کے عالم میں زماں تھا نہ مکاں تھا
پیدا ہے ترے شعر سے اک شرعِ محبت
وہ شرع کہ مستغنیٔ ہر مذہب و ملت
تھا وحدتِ ادیان کا حامل ترا مسلک
ایمان کا ہر جادۂ منزل ترا مسلک

## بسمل سعیدی

آتا جو سمجھ میں کبھی [illegible] سے سبب
کچھ اندازہ ہوتا ترے [illegible] کے سبب
باوصفِ کہن، تازہ ہے [illegible]
ساقی ترے میخانے کا ساقی [illegible] ہے
اللہ رے یہ نشہ و جوش ہے [illegible]
ساغر ہے ترا میکدۂ حافظ و خیام
دلّی میں ترے دم سے پھول [illegible]
شیراز و سمرقند و صفاہان [illegible]
گویا ترے اشعار میں ہیں [illegible]
عرفیؔ و ظہوریؔ و نظیریؔ [illegible]
فردا ترا یوں تھا ترے امروز [illegible]
جس طرح رگِ تاک میں افشردۂ انگور
ضوبار ترا کوکبِ عظمت ہے ترے بعد
دنیا میں ترے شعر کی شہرت ہے ترے بعد
جو نقش نظر میں ہے تری، رنگ کے [illegible]
مجموعۂ بے رنگ ہے اردو کے ہیں وہ رنگ
باعث تری شہرت کا ہے اردو کا وہ دیوان
تھا جس میں تجھے مطلع و مقطع بھی نہ آسان
معراج تو معلوم نہیں تیری غزل کی
افلاک سے اونچی ہے زمیں تیری غزل کی
نالوں سے تری [illegible] کے فلک ہیں متاثر
الہام کے نغموں سے ملک ہیں متاثر
ہر چند کہ جبریلِ امیں کی ہے زباں اور
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

وفات بھی نام کے آگے درج کی جاتی ہے۔

| تاریخ وفات | اسماء |
| --- | --- |
| یکم شعبان ۱۲۳۳ھ / ۹ جولائی ۱۸۱۸ء | ۱۔ فتح حیدر سلطان |
| یکم شوال ۱۲۲۳ھ / یکم دسمبر ۱۸۰۸ء | ۲۔ عبدالخالق سلطان |
| ۴ ربیع الثانی ۱۲۲۶ھ / ۲۸ اپریل ۱۸۱۱ء | ۳۔ محی الدین سلطان |
| ۲۲ جمادی الاول ۱۲۳۳ھ / ۳۰ مارچ ۱۸۱۸ء | ۴۔ معز الدین سلطان |
| | ۵۔ محمد یاسین سلطان |
| ۲۴ رمضان ۱۲۶۱ھ / ۲۷ ستمبر ۱۸۴۵ء | ۶۔ محمد سبحان سلطان |
| ۲۴ جمادی الثانی ۱۲۵۰ھ / ۲۵ ستمبر ۱۸۳۴ء | ۷۔ شکر اللہ سلطان |
| ۶ جمادی الثانی ۱۲۴۹ھ / ۲۰ اکتوبر ۱۸۳۳ء | ۸۔ سرور الدین سلطان |
| ۱۴ شوال ۱۲۵۸ھ / ۲۱ نومبر ۱۸۴۲ء | ۹۔ جامع الدین سلطان |
| ۲ رمضان ۱۲۵۳ھ / یکم دسمبر ۱۸۳۷ء | ۱۰۔ منیر الدین سلطان |
| ۹ جمادی الثانی ۱۲۸۹ھ / ۱۱ اگست ۱۸۷۲ء | ۱۱۔ محمد سلطان |
| ۱۰ شعبان ۱۲۳۹ھ / ۱۱ اپریل ۱۸۲۴ء | ۱۲۔ احمد سلطان |

اس فہرست سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان شہید کے صرف دو بیٹے شہزادہ یٰسین سلطان (پانچویں فرزند) اور شہزادہ محمد سلطان (گیارہویں فرزند) ۱۸۴۸ء تک بقید حیات تھے۔ ان شہزادوں کو کلکتہ میں نہایت عزت و احترام اور آرام و آسائش کے ساتھ رکھا گیا تھا۔ ان میں سے بعضوں نے ادبی اور مذہبی امور میں خاصی دلچسپی لی۔ غالباً غدر کے بعد انگریزوں نے ان پر سے بہت سی پابندیاں اٹھادی تھیں۔ یہی وہ زمانہ ہے کہ خانوادۂ سلطان شہید سے مرزا کے مراسم پیدا ہوتے ہیں۔ اس خاندان کے دو افراد کے نام ہمیں مرزا غالب کے خطوط میں بھی ملتے ہیں۔ ان میں سے ایک تو اشرف شاہزادگان میسور اعلیٰحضرت سلطان محمد بہادر کا نام ہے۔ دوسرا سلطان زادہ بشیر الدین میسوری کا ہے۔ القاب: اشرف شاہزادگان۔ اعلیٰحضرت سلطان محمد بہادر ہے۔ یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ شہزادہ تھا نہ کہ سلطان زادہ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ شہزادہ سلطان محمد کے نام اپنے خط کو مرزا نے 'عرضداشت' کہا ہے۔ یہ شہزادہ سلطان محمد ٹیپو سلطان

# اور
# شہزادگان

مئی ۱۷۹۹ء میں سلطان ٹیپو کی شہادت کے بعد سلطان شہید کے اہلِ خاندان کو گرفتار کر لیا گیا تھا لیکن اس کے فوری بعد ملک کے دوسرے علاقائی حکمرانوں سے کیے گئے معاہدوں سے استحصال کے طور پر انگریز حکمراں جنوبی ہند میں مختلف ریاستوں کے حصے بخرے کرنے میں مصروف تھے ان ہی حالات میں ۱۸۰۶ء میں میسور میں آزادی کی ایک دوسری لہر اٹھی جو ٹیپو سلطان کے بیٹے شکر اللہ سلطان کے زیر سایہ تھی لیکن یہ لہر بھی فرو کر دی گئی۔ اس کے بعد لارڈ منٹو نے ٹیپو سلطان شہید کے تمام اہلِ خاندان کو کلکتہ میں منتقل کر دیا۔ جہاں مستورات کے علاوہ سلطان شہید کے بھائی کریم شاہ بہادر اور بارہ لڑکے شامل تھے ان لڑکوں کے نام بہ اعتبار عمر یہ ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی تاریخ



محمد سلطان عرف شہزادہ غلام محمد

شہید کے وہی بیٹے ہیں جن کا نام مذکورہ بالا فہرست میں گیارہ نمبر پر محمد سلطان دیا گیا ہے یاد رہے کہ شاہزادے سلطان کا لفظ اپنے نام سے پہلے لکھا کرتے تھے اور شہزادگان میسور اپنے نام کے بعد۔ مرزا غالب کے دوسرے مکتوب الیہ سلطان زادہ بشیر الدین میسوری ہیں۔ سلطان زادہ بشیر الدین میسوری، سلطان شہید ٹیپو سلطان کے ساتویں بیٹے شکر اللہ سلطان کے فرزند تھے۔

خانوادہ سلطان شہید سے غدر کے بعد کے حالات میں مرزا کا تعلق پیدا کرنا اس لحاظ سے اہم ہے۔ ایک تو یہ کہ اس زمانہ میں مرزا انگریزوں کی نظر میں مشتبہ تھے اور دستنبو میں مختلف مصلحتوں کے ذریعہ انہوں نے اس کی کوشش کی تھی کہ حکومت برطانیہ کے عتاب سے اس ضعیف العمری میں محفوظ رہیں۔ کیونکہ اس کے بغیر مرزا کی زندگی بسر مشکل تھی۔ اس زمانہ میں مرزا نے ہر طرح کی سیاسی احتیاط سے کام لیا تھا لیکن محسوس ہوتا ہے کہ جب انھیں شہزادگان میسور کی علم دوستی کا علم ہوا تو انہوں نے ساری مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کے ان شہزادوں سے بے تکلف خط و کتابت شروع کردی۔

افسوس ہے کہ مرزا اور شہزادگان میسور میں خط و کتابت کب اور کن حالات میں شروع ہوئی اس کا پتہ نہیں چلتا۔ ہمارا قیاس ہے کہ یہ تعلق ۱۸۵۷ء کے لگ بھگ پیدا ہوا اور مرزا کے آخری دم تک باقی رہا۔ مرزا کی خط و کتابت سب سے پہلے سلطان شہید ٹیپو سلطان کے پوتے شہزادہ بشیر الدین ابن شہزادہ شکر اللہ سلطان سے شروع ہوئی۔ یہ تعلق خالص ادبی تھا۔ شہزادہ بشیر الدین توفیق تخلص کرتے تھے اور اردو و فارسی نظم و نثر میں خاصی دستگاہ حاصل تھی۔ خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ توفیق اپنا فارسی کلام مرزا سے رجوع کرتے تھے۔

شہزادہ بشیر الدین توفیق میسوری کے نام مرزا کے خطوط اگرچہ بے تکلف ہیں لیکن ایسی عقیدت اور ایسے احترام میں ڈوبے ہوئے ہیں جیسے یہ خطوط کسی برسر اقتدار خاندان کے شہزادہ کو لکھے گئے ہیں۔ ان خطوط میں مرزا شہزادہ بشیر الدین میسوری کو پیر و مرشد اور بندہ پرور سے مخاطب کرتے ہیں۔ شہزادہ بشیر الدین میسوری کے نام اگرچہ ہمیں کل چھ خط مل سکے ہیں جن میں سے پانچ اردو میں ہیں اور ایک فارسی میں لیکن غالباً مرزا نے ان کے علاوہ اور کئی خطوط شہزادہ بشیر الدین کو فارسی میں لکھے تھے جو نہیں مل سکے۔ ۶ اکتوبر ۱۸۶۲ء کو مولوی نعمان احمد ساکن مہوہ ضلع سیتاپور کے نام غالب اپنے ایک خط میں اس طرح لکھتے ہیں۔

"برسوں سے خطوط فارسی لکھنے چھوڑ دیئے۔ اب شہزادہ بشیر الدین
نبیرہ ٹیپو سلطان مغفور کے سوا کسی کو فارسی خط نہیں لکھتا اور یہ
موافق ان کے حکم کے ہے اور وہ مطاع ہیں اور میں مطیع"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلطان زادہ [illegible]
کہ مرزا انھیں فارسی ہی میں خط لکھا کرتے [illegible]
فارسی خط ملتا ہے جو غالباً مراسم خط و کتابت کے ابتدائی [illegible]
میں غالب نے نبیرہ سلطان شہید [illegible]
القاب سے مخاطب کیا ہے اور اپنے آپ کو [illegible]
انکسار آمیز الفاظ کے ساتھ پیش کیا ہے [illegible]

بنام سلطان زادہ بشیر الدین میسوری

رباعی

عشق است رخش سرخ گل و نسرین را ؛ [illegible]
وزمن کہ گدائے کوچہ میکدہ ام ؛ [illegible]

مورکف دست سلیمان یعنی بندہ کہ سلطان [illegible] کا نظر کردہ ہے نوید وصول و بشارت قبول کے پہونچنے پر اس فکر میں پڑا ہے کہ نغمۂ آفریں کہا جائے اور قسمت پر کس قدر ناز کیا جائے۔ سلطان کی سپاس گزاری یہ ہے کہ نامہ شرف افزا کار است [illegible] اس نے اس غمزدہ کو مسرت و شادمانی کا [illegible] ہما جائے ہمایوں نشان کا سایہ مرحلہ آب و گل کا [illegible] و دل کے لئے طغرائی دارائی ہے۔ [illegible] برسا رہا تھا۔ اس قدر موتی برسائے کہ قلم میں گوہر سخن کا [illegible] یہ زمانہ ہے کہ اگر دانشور سخن کی داد دے [illegible] تو ایک زمانہ سے سر سخن سنجی نہیں رکھتا [illegible] عمر سبک سیر کے بہترین حصہ کے جو مرحلے گزر گئے۔ پچاس سال دہلی کے نیک مجنوں کے ساتھ مہرورزی اور عشق بازی کا ہنگامہ گرم کیا اور اس میں کتنے دوستاں تکمیل فراہم ہوئے۔ ناگاہ چرخ تیز گرداں نے ان پیوندہائے روحانی کو اس طرح قطع کیا کہ رگ جان سے خون بہہ نکلا اور [illegible] کی گنتی نہیں کر سکتا حوادث کی اس تیز بارش اور اس ناسزا [illegible] باقی بچ رہے۔ [illegible] چند خستہ تن اور میں کہ مرنے والوں کے داغ سے افسردہ تباہ و پژمردہ ہوں۔ بس جیتا ہے اور خستہ حالوں پر خون رونا ہے۔ زمانہ کا مارا ہوا ہوں۔ شہر آرائی اہل شہر کا ماتم دار ہوں۔ گزشتہ [illegible] میں نثر کے تین مجموعے پنج آہنگ، مہر نیم روز اور دستنبو [illegible] گزر چکے ہیں۔ تیسرا ابھی تعجب نہیں ہے کہ وہاں پہنچ چکا ہو اور اگر نہ پہنچا ہو تو اس کی رسید سے آگاہ کروایئے۔ اردو شاعری ایک سخنے سے زیادہ نہیں ہے [illegible]

... ہے کہ دیوان فارسی کے شہسواروں کے سامنے اس کا
... یہ عرض ہے کہ کلیات فارسی میرے پاس
ہے اگر آپ کو دیوان مطبوعہ ہو گا اور کلیات کا ادعا ہے۔ سخن کوتاہ اگر کوئی دستیو
ہے تو ... ہو یا مجموعہ نظم فارسی اور اگر یہ ہے تو دونوں نسخے بھیجا کروں ... کرم
کر کے بھیج ... ہوتا ہے ... ہر نہ کوئی کی طلب میں عذر
... ہے ... کا بطریق نہیں ہے۔
یہ مسرا ... بستر پر ہوں ... مگر ... پوش ہوں نہ کتاب فروش
... کرنے والا ہوں ... وصل کرنے ... آزاد جو کچھ شہزادوں کو
بھیجتے ہیں وہ نذر ہوتی ہے۔ اور شہزادے جو کچھ آزادوں کو بخشتے ہیں وہ تبرک
ہوتا ہے ... نہیں ہے ... ہے ... جو کچھ میں نے بھیجا ہے
وہ ... ہے اور جو کچھ بھیجیں گا ارمغان ہوگا ... معذبا روز
دو شنبہ ... (ترجمہ)

سلطان زادہ توفیق میسوری کے خط کے ملنے پر مرزا کی مسرت کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ وہ اس کے وارد ہونے کو "شبہ جہاں" ... پڑھنے کے مترادف سمجھتے ہیں اور اس کی وصول سے اپنے آپ کو ... فرمان روا جانتے ہیں اور سلطان زادہ کے خطوط کو ... سمجھتے ہیں۔

یہ خط مرزا نے اس وقت لکھا جب بقول ان کے "عمر سبک سیر کے بہترین حصے کے چھ مرحلے گزر گئے"۔ گویا یہ خط انہوں نے ۱۸۶۵ء کے اواخر یا ۱۸۶۶ء کے اوائل میں لکھا۔ ممکن ہے کہ مرزا کے علمی مرتبہ اور ان کی شہرت کے پیش نظر سلطان زادہ توفیق نے مرزا کو خط لکھنے میں خود پہل کی ہو اور اس کے جواب میں مرزا کا یہ پہلا خط ہو۔

گویا مرزا نے قیمت لینا پسند نہیں کیا اور سلطان زادہ کے مقام کے اعتراف کے طور پر کتابیں تحفتاً بھیجیں۔

خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلطان زادہ توفیق کے تعلقات مرزا شہاب الدین خان ثاقب سے بھی تھے۔ توفیق میسوری نے ایک دفعہ بجائے غالب کو خط لکھنے کے ثاقب کو خط لکھا جس میں مرزا کی بابت کچھ لکھا تھا۔ مرزا پر اس کا بہت اثر ہوا۔ انہوں نے فوراً ایک معذرت نامہ لکھا جس میں اس کا اظہار کیا ہے کہ توفیق کا خط نہ آنے سے جی گھبرا رہا ہے اور جب تک انہیں اپنے خط کا جواب نہیں ملے گا انہیں آرام نہ آئے گا اور خدا اور رسول کے واسطے مرزا نے معافی چاہی۔ توفیق میسوری کا خط وصول ہونے پر مرزا کو جو مسرت ہوتی اور خط نہ ملنے اور ڈاک میں کھو جانے پر جو اذیت ہوتی اس کا اندازہ توفیق کے نام مرزا کے ایک خط کے جملوں سے لگایا جا سکتا ہے۔

"آج شنبہ ۱۶ جون ۱۸۶۶ء بارہ بجے عنایت نامہ آیا۔
سرنامہ دیکھ کر سفیدۂ صبح مراد سمجھا۔ ننگا ایک
چھوٹی سی خس کی ٹٹی کے پاس بیٹھا ہوا تھا خط پڑھ
کر وہ حال طاری ہوا کہ اگر ننگا نہ ہوتا تو گریبان پھاڑ
ڈالتا۔"

کہنے کو یہ صرف چند ہی خطوط ہیں لیکن ان میں عقیدت، محبت، لطف و عطا، علمی مباحث، دلکش لطائف، مرزا کی علمی زندگی، ان کی تصنیف، ان کے مزاج اور ان کی سوچ کے کتنے ہی گوشے ان چند سطروں میں سموئے گئے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ان خطوط کا ایک ایک حرف غالبیات کا ایک گنجینہ ہے اور جدا جدا طور پر تحقیق و تجزیہ کا مستحق ہے۔ ان میں جو شخصی اور تہذیبی گہرائی ہے وہ سلطان زادہ میسوری سے غالب کی گہری عقیدت کی غماز ہے۔

توفیق، سلطان شہید ٹیپو سلطان کے پوتے تھے۔ مرزا سے ان کے مراسم قائم ہونے کے تقریباً دس برس گزر جانے کے بعد مرزا نے ایک خط بعنوان عرض داشت شہزادہ محمد سلطان کو لکھا۔ اس مراسلہ نگاری میں پہل مرزا ہی نے کی ہے۔ شہزادہ محمد سلطان ٹیپو سلطان شہید کے گیارہویں فرزند تھے جو مارچ ۱۷۹۵ء کو میسور میں پیدا ہوئے۔ شہزادہ محمد سلطان جن کو غالب اعلیٰحضرت سلطان محمد بہادر لکھتے ہیں۔ عام طور پر شہزادہ غلام محمد کے نام سے علمی دنیا میں معروف ہیں۔ شہزادہ غلام محمد کا انتقال ۱۱ اگست ۱۸۷۲ء کو کلکتہ میں ہوا۔ یہی شہزادہ محمد سلطان ہیں جنہوں نے ۱۸۶۴ء میں اپنے دادا حیدر علی اور اپنے والد سلطان ٹیپو کے عہد کے میسور اور خاندانی حالات پر مشتمل ایک ہزار صفحات کے لگ بھگ تاریخ مرتب کی اور مشن پریس کلکتہ سے چھپوا کر شائع کی۔ یہ کتاب "کارنامہ حیدری" یا "سیر سروری" یا "مآثر صفدری" یا "تواریخ گنبد" کے مختلف ناموں سے موسوم کی گئی ہے۔ لیکن ان سب میں یہ کتاب "کارنامہ حیدری" ہی کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔ اس کتاب میں شہزادہ محمد سلطان کی ایک بہت واضح اور خوبصورت شبیہ بھی شامل ہے جو اپریل ۱۸۴۲ء کو تیار کروائی گئی تھی۔ یہ کتاب شہزادہ محمد سلطان نے اپنے انگریز دوست سر تھامس میڈوک جو کونسل آف انڈیا کے صدر نشین اور بنگال کے ڈپٹی گورنر تھے، کو ہدیۃً پیش کرنے کے لیے لکھی تھی۔ چنانچہ اس کا انتساب بھی سر تھامس میڈوک کے نام ہے۔ ظاہر ہے کہ ۱۸۶۴ء میں اس کتاب کی اشاعت کے بعد شہزادہ سلطان محمد بہادر کی شہرت ملک کے طول و عرض میں پھیل گئی۔

مرزا غالب نے بھی اپنی ستر برس کی عمر میں یعنی ۱۸۶۶ء کے اواخر یا ۱۸۶۷ء

کے مثل میں شہزادہ سلطان محمد بہادر کو خط لکھا اور اپنی تصنیفات مطبوعہ پیش کش پارسل کے ذریعہ سے بھیجیں۔ اور یہ چاہا کہ اس سلسلہ جنبانی سے خط وکتابت کا آغاز ہو۔ پتہ نہیں اس سلسلہ جنبانی کا نتیجہ کیا نکلا۔ تاہم اس معاملے میں مرزا کا پورا خط قابل ملاحظہ ہے۔

عرضداشت بہ اسم سامی اشرف شاہزادگان صبور۔ اعلیٰحضرت سلطان محمد بہادر

رباعی

"سبحان اللہ شان اعلیٰحضرت ؛ بادشاہ فلک آستان اعلیٰحضرت
خواہم کہ بر آن عتبہ نہم روئے نیاز ؛ در زمرہ بندگان اعلیٰحضرت

اس سبب سے کہ اس نگارش کا آغاز تسبیح اسم مقدس باری ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ عریضہ فقیر مزار کا نہ امیدواری ہے۔ ان سب امیدوں میں سے منجملہ ایک یہ بھی ہے کہ اس گناہ کو معاف فرمائیں گے اور اس پر متانت فرمائیں گے کہ جب وہ میرا روشناس نہیں تو اس نے اندازہ ادب پر نظر کیوں نہیں رکھی اور جس جرأت کے تحت یہ خط لکھا ؟ یقیناً چند ورق دود دل کو شعلہ سے سیاہ کئے ہیں اور ان کے نظارے کے لئے کسی والا نظر کی تلاش کی ہے۔ خدایگان ہمہ داں (یعنی شہزادہ سلطان محمد بہادر) کی نظرگاہ کی نشاندہی کی اور کہا کہ اگر پیش کش لے جانے کی تاب نہیں ہے تو سررشتہ ڈاک سے بھیج۔" شوق کی گرم خوئی نے خرد کی مزید رہنمائی کی اور اس ارمغان کے بھیجنے والے نے دور سے زمین بوسی کی اور آستانہ پر اپنی پیشانی گھسی۔

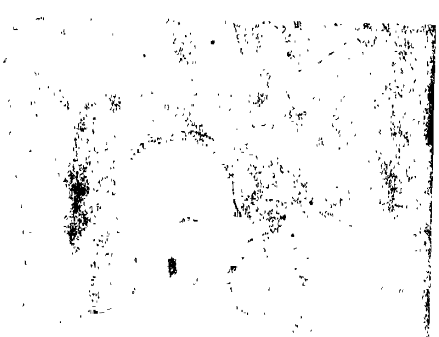
شادم کہ توئی ما بتو ہنگامہ کنم گرم
ورنہ زکجا یافتی قیصر و جم را

واضح رہے کہ دس سال کی عمر میں موزونی طبع کے آثار نے ظہور پذیر کیا اور پچاس برس تک کہ نثر و نظم کا تھوڑا سا سرمایہ اکٹھا ہو گیا۔ زبان نے انداز گزارش اور قلم نے آئین نگارش پایا۔ اب جبکہ عمر گزراں ستر کو پہنچ چکی خاطر ناشاد میں خیال گزرا پچاس سالہ سودوں کو لکھوایا اور مصارف طبع کی عدم استطاعت کے باوجود ان کو چھپوایا اور ان ہی مطبوعہ نسخوں میں سے ایک نسخہ بسبیل پارسل بھیجا۔

عرضداشت اور پارسل کی روانگی کا دن ایک ہی ہے میں سمجھتا ہوں کہ خط پہلے پہونچے گا اور پارسل اس کے بعد۔ اگر پارسل پہنچنے کے بعد خط اور پارسل دونوں کے پہنچنے کی مجھ کو آگہی نہ ہو تو ان کے پہنچنے اور نہ پہنچنے کے بارے

میں دو دل رہوں گا ... نہیں مانگتا۔ یہ آزادی ہے ... کا عنوان ہے۔ وجود مسعود خدایگان کی ... سلیمانی سے بڑھ کر ہے۔"

مرزا غالب نے اس خط کے عنوان میں شہزادہ سلطان محمد بہادر کو اعلیٰحضرت کے القاب سے مخاطب کیا ہے ... بادشاہ فلک آستاں کہا ہے اور یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ وہ ان کی بندگی میں شامل ہو جائیں۔ اور ان کی تو جہات پر اپنا سر نیاز ... ٹیکنا چاہتے ہیں۔ خانزادہ سلطان محمد شہید سے مرزا کے یہ تعلقات کسی مطلب و استغاثہ کے لئے نہیں تھے بلکہ قطعاً بے غرضانہ تھے۔ یہ تعلقات سلطان محمد شہید سے مرزا کی عقیدت و محبت کے آئینہ دار ہیں اور اہل ... ہیں جس پر ناز کر سکتے ہیں۔



# غالب نما

**فضا ابن فیضی**

میرے دیدہ ورو! آساں نہیں غالب ہونا
بڑی پیچیدہ و دشوار ہیں راہیں اس کی
اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
آئینہ تو نہیں، ذہن اس کا نگاہیں اس کی

وہ سخن شیوہ وہ صورت گر وجدان و شعور
اس نے لفظوں کو معانی کے خط و خال دیئے
رکھ سکا اپنی خراشوں پہ نہ مرہم، لیکن
غالبِ شعر میں لوح اور قلم ڈھال دیئے

پہلے اتنا تھا کسے عظمتِ فن کا احساس
فکر کو اس نے یہ پنہائی و گیرائی دی
اپنی خاطر نئے معیار تراشے اس نے
شاعری کو نیا افسوں، نئی رعنائی دی

اس کے پاس آئی تو تخئیل کو معراج ملی
اس کے آہنگ کے کانٹے پہ تلی صنفِ غزل
گرد گرد اس کی نگاہوں میں رہا جلوۂ گل
اس کی گفتار کی موجوں سے دھلی صنفِ غزل

دی "حکیمانہ نظر" اس نے سخن دانوں کو
معجزہ اس کا ہے اردو ئے معلّٰی کی تراش
بن سکا کون یہاں اس کی ذہانت کا حریف
یہ بداعت یہ بلاغت یہ توازن یہ تلاش

"خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھئے"
اس کی شوخی میں متانت کے جو پہلو نکلے
کتنی طرار ہے آرائشِ معنی کی نمود
جیسے اترا کے کسی کنج سے آہو نکلے

گرمئ جوشِ قدح سے ہے چراغاں اس کا
اس کی آشفتگئ غم میں شرر گھول گئی
آنکھیں ملتے وہ مرے عہد کے فن کار اٹھے
اس کی آواز تو صدیوں کی گرہ کھول گئی

حسنِ اظہار کی یہ شیوہ گری عام کہاں
اک نیا طرزِ بیاں ڈھونڈ نکالا اس نے
کچھ اسے دے نہ سکا جو بجز اک جبرِ حیات
اپنے آغوش میں اس دور کو پالا اس نے

اپنے "حسرت کدۂ جاں" کا وہ زندانی تھا
اس کے لہجے میں غمِ زندگی لو دیتا ہے
کر گئی اس کو گداز اس کی برشتہ نفسی
شمع جلتی ہے تو فانوس بھی لو دیتا ہے

اس کے چبھتے ہوئے تیور کی کھنک میں گھل کر
اک نئی لے، نئی آواز، غزل میں ابھری
ایک بھرپور توانائیٔ معیار لئے
اک نئے عہد کی آواز غزل میں ابھری

شوخئ نغزِ بیدل کی بہار ایجادی
سامنے اس کے اب آتے ہوئے شرماتی ہے
جو مرے جسم میں ہے شعر و بصیرت کی وہ روح
اس کے جذبے کی صداقت کی قسم کھاتی ہے

میرا ہم پیشہ و ہم مشرب و دمساز تھا وہ
بوسۂ لب کی طرح شہد ہیں باتیں اس کی
جس کے بازو پہ کھلیں اس کے سخن کے گیسو
نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی



# تلمیذ و نبیرۂ غالب

# خواجہ فخرالدین حسین سخنؔ دہلوی

خواجہ سید فخرالدین حسین سخنؔ تلمیذ و نبیرۂ غالب کے متعلق اب تک جتنے مضامین میری نظروں سے گزرے ہیں وہ نہ صرف تطلعی تشنہ ہیں بلکہ تضادسے بھرپور ہیں۔ تشنگی کا سبب تو یہ ہے کہ کسی نے پوری یکجہتی کے ساتھ سخنؔ کی پوری زندگی کی تفصیل کو جمع کرنے کی کوشش نہیں کی۔ لوگوں کے پاس جو ماخذ ہیں وہ سروش سخن اور دیوان سخنؔ کے علاوہ مرقع فیض مصنفہ صفیر بلگرامی (بنام سلطان مرزا) تنبیہ صفیر مصنفہ سخن (بنام سردار مرزا) اور خمخانۂ جاوید جلد چہارم کا صفحہ ۱۳۹ ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مرقع فیض اور تنبیہ صفیر سے بڑھ کر ناقابلِ اعتماد کوئی کتاب نہیں ہو سکتی اور ساری الجھنیں انہیں کتابوں کو حقیقی ماخذ تسلیم کر لینے سے ہے۔

سنہ ۱۹۵۸ء کے فروغِ اردو کے سہارے عابد علی عابدؔ نے بھی سخنؔ پر کچھ رائے زنی کرنی چاہی لیکن وہ خالی ہاتھ میدان میں کود پڑے تھے۔ قاضی احمد میاں اخترؔ جوناگڑھی خمخانۂ جاوید جلد چہارم صفحہ ۱۳۹ کی بدولت ایک مضمون لکھ سکے۔ ستے اطلاعات پھیلائے ادب میں جمالی صاحب [illegible] معلوم ہوتا ہے کہ وہ [illegible] تک [illegible] کہ انہوں نے مضمون لکھنا ہی اپنا مقصود رکھا ہے [illegible] کی زحمت گوارا نہیں کی ہے۔

پاکستان میں ترقی ادب لاہور کی طرف سے [illegible] کے عنوان سے سروش سخن کا نیا نسخہ [illegible] میں شائع ہوا۔ اس پر مقدمہ خلیل الرحمٰن داؤدی نے لکھا ہے۔ یہی پہلے شخص ہیں جنہوں نے معقول ڈھنگ سے سوچنے کی کوشش کی ہے لیکن شاید وہ جفاکوشیوں سے تنگ آگئے اور نہایت مختصر باتوں کے باوجود مضمون کو تشنۂ تکمیل چھوڑ کر متن کی ادارت میں لگ گئے۔

تنبیہ صفیر کی عبارتوں سے ہی واضح ہے کہ یہ کتاب مرقع فیض سے مشتعل ہو کر لکھی گئی تھی یہی وجہ ہے کہ سردار مرزا کے نام کی مہر کے باوجود کوئی یہ تسلیم نہیں کرتا کہ یہ سخنؔ کے علاوہ کسی اور کی تصنیف ہے۔ مرقع فیض میں جذبات غضب کی نمائش نہیں ہے۔ اس سے اس کی واقعیت کا دھوکا ہو سکتا ہے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ تنبیہ صفیر کی دوسری قسط توضیح مقال تھی اور مرقع فیض کی دوسری قسط عشرستان خیال۔ توضیح مقال کی اشاعت کے بعد صفیر نے تہذیب المقال لکھی۔ یہ کتاب اس قضیہ کی آخری قسط ہے۔ اس میں صفیر صاحب یوں رقمطراز ہیں۔

"بنائے اول گلدستۂ سخندانی ہے جس کے سلسلہ مرقع فیض لکھا گیا، ایک کتاب تنبیہ صفیر لکھ کر شائع کی گئی جس نے جواب میں دو جلدوں میں ایک رسالہ لکھا مگر اس کو مشہور نہ کیا کہ تہذیب مانع آئی . . . ایک رسالہ لکھا . . . اس میں کسی کا نام نہیں جو کوئی چاہے اپنے اوپر ڈال لے"! اس سے یہ تو واضح ہو جاتا ہے کہ مرقع فیض بھی مشتعل ہو کر لکھا گیا ہے اگر ایسا ہے تو گلدستۂ سخندانی کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔

گلدستۂ سخندانی کو پہلی بار جو میں نے شروع سے آخر تک دیکھا تو کہیں پر کسی نقطۂ نظر سے کوئی اشتعال انگیز بات نظر نہیں آئی۔ بادی النظر میں ہر قاری یہی سمجھ سکتا ہے کہ یہ گلدستہ صفیر اور سخنؔ کی مشترک کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ سرورق پر جو عبارت ہے وہ اس طرح ہے۔

"الحمدللہ کہ این گلشن بے خزاں یعنی مشعار میر فرزند احمد صاحب صفیرؔ بلگرامی شاگرد میر امان علی سحرؔ مرحوم و نظم گہربار جناب مولوی خواجہ سید محمد فخرالدین حسین خاں صاحب بہادر سخنؔ دہلوی تلمیذ رشید جناب نواب اسداللہ خاں غالب

ہوئیں دستیاب ہوئیں ۔۔۔ صحت و۔۔۔ باہتمام سید ۔۔۔ کریم مہتمم مطبع محمدی چھپ کر شائع ہوا ۔"

اس سلسلے میں ایک کہانی ہے۔ یہ کتاب ۱۲۹۳ھ میں چھپی تھی یہ وہ زمانہ تھا جب پٹنہ میں بڑے اہتمام کے ساتھ کمزور سکر یٹ بہادر رنجی کی سرپرستی میں مشاعرے ہوتے تھے ۱۲۹۳ھ کے پانچ مشاعروں کے گلدستے تحفۂ انجمن رنجی کے عنوان سے شائع بھی ہوئے تھے ان مشاعروں میں شاعروں کی جو ترتیب قائم کی جاتی تھی ان میں شاد کو اول درجہ حاصل تھا۔ سخن کا شمار شاد کے بعد تھا جبکہ صفیر کا مقام اساتذہ کی صف میں سب سے نیچے تھا۔ اس کا سبب یہی تھا کہ صفیر بہت زیادہ بکلاتے تھے ممکن ہے یہ خیال رہتا ہو کہ ان کا کلام سننے سے اہل بزم میں ہی بغاوت حاصل کرلی جائے۔ صفیر اس سے آزردہ ہوتے تھے وہ رنجی جیسے رئیس کی شکایت نہیں کرنا چاہتے تھے۔ البتہ یہ علی الاعلان کہتے تھے کہ استادی میں ان کا مقام سخن اور شاد سے بلند ہے۔ سخن نے ایک ہی طرح میں کہی ہوئی اپنی اور صفیر کی غزلوں کو یکجا کرکے ایک گلدستہ کی شکل میں چھپوا دیا اور ارباب ذوق میں مفت تقسیم کرادیا۔ مقصود یہ تھا کہ سخن سنج حضرات خود ہی فیصلہ کرلیں کہ دونوں میں کون بہتر شاعر ہے۔ سب سے پہلی غزل دونوں کی درج کی جاتی ہے۔

### صفیر

جوانانِ رضا میں پر ہے سایہ ربِ سبحاں کا
بنا طغرائے بسم اللہ ہے تاجِ اپنے دیواں کا
سراپا بندھ گیا جس وقت مضمونِ قدِ جاناں کا
لقب ہو جائے گا دیوان محشر اپنے دیواں کا
حسینوں نے لیا دل اٹھتے اٹھتے بزمِ عشرت سے
چلا ہے تخت یہ پریوں کے جھرمٹ میں سلیماں کا
الٰہی ہو صفیرِ خستہ کو حسنِ قبول ارزاں!
رہے منظورِ اربابِ نظر ہر شعر دیواں کا

### سخن

مرا سینہ تجلی گاہ ہے انوارِ یزداں کا
فروغِ داغِ دل خورشید ہے گردونِ عرفاں کا
بہارِ خلد اک کانٹا جنوں میں میرے داماں کا
فضائے لامکاں گوشہ مرے چاکِ گریباں کا
خیالِ کوچۂ جاناں سے تفریح کیا کم ہے
کہ ناحق تذکرہ کرتے رہیں گلزارِ رضواں کا
سخن ملکِ سخن میں شاہِ معنی نے کیا جلوہ
ہوا موزوں لقب دیوانِ خاص اب اپنے دیواں کا

## مختصر حالاتِ زندگی

سخن ۱۸۳۹ء میں ۱۰ جولائی کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابھی چھوٹے تھے کہ والدہ نے انتقال کیا اور والد (خواجہ جلال الدین حسین عرف حضرت صاحب سجادہ نشین خانقاہ چشتیہ لکھنؤ) نے لکھنؤ میں دوسری شادی کرلی۔ نانی قلعۂ معلیٰ سے وابستہ تھیں وہیں چودہ برسوں تک ان کی پرورش ہوئی۔ نانی کی طرف سے مرزا غالب سے ان کی کوئی قرابت مندی تھی جس کی وجہ سے وہ غالب کو نانا کہتے تھے اور ان کے ساتھ تمام عمر پرستش کی حد تک عقیدت رکھتے رہے۔ غالب بھی ان پر مشفق و مہربان تھے۔ سخن کی ذہانت کو دیکھ کر غالب نے ان کی تربیت میں بھی حصہ لیا اور نہ صرف شاعری میں غالب کا تلمذ ان کو حاصل ہوا بلکہ غالب کی مصنفہ کتابوں کے سمجھنے میں بھی خود مصنف سے استفادہ کا ان کو موقع حاصل ہوا۔ سوانح باقر میں مولوی سید مطاحسین لکھتے ہیں :۔ "خواجہ صاحب (سخن) سے حضرت باقر کی ملاقات ۱۲۷۴ھ (۱۸۵۸ء) میں شروع ہوئی۔ اس وقت تک حضرت غالب کی تصنیفیں شائع نہیں ہوئی تھیں لیکن خواجہ صاحب ان کے عزیز اور شاگرد تھے اس لئے استاد کی تصانیف کی نقلیں ان کے پاس تھیں جب آرہ آئے اپنے ہمراہ لائے تھے ۱۲۷۴ھ یا ۱۲۷۵ھ میں حضرت باقر کو خواجہ صاحب سے حضرت غالب کی مہر نیمروز اور دستنبو ملی اور نظر سے گزری۔ اسی زمانہ میں انہوں نے خواجہ صاحب کے پاس اردو اور فارسی کلام کا ایک مجموعہ بھی دیکھا (کلیات نظم غالب فارسی ابھی شائع نہیں ہوئی تھی۔)"

۱۲۶۹ھ میں جب ان کی نانی کا انتقال ہوگیا تو وہ دہلی سے لکھنؤ اپنے والد کے پاس چلے آئے۔ یہاں سوتیلی ماں سے نباہ نہ ہوا تو مشفق چچا خواجہ بشیر کے پاس چلے آئے۔ فارسی ادب کی تکمیل انہیں سے کی۔ عہد واجد شاہی میں خواجہ بشیر مہتمم فوجداری کل ممالک محروسہ اودھ تھے۔ ۷ مارچ ۱۸۵۶ء کو جب واجد علی شاہ جلاوطن کردیئے گئے تو خواجہ بشیر بھی اپنے عہدہ سے برطرف کردیئے گئے۔ انہیں دنوں مرزا ابراہیم جو سخن کے حقیقی بہنوئی تھے لکھنؤ گئے ہوئے تھے انہیں کے ساتھ یہ بھی آرہ چلے آئے فوراً ہی ۱۸۵۷ء کا انقلاب رونما ہوا۔ سخن کی پرورش قلعۂ معلیٰ میں ہوئی تھی اس لئے آرہ میں یہ صلاح ٹھہری کہ جب تک حالات ناسازگار رہتے ہیں، انہیں روپوش رکھا جائے۔ مرزا ابراہیم

کے والد مرزا صدیق سارن میں صدر اعلیٰ کے عہدہ پر فائز تھے۔ انہوں نے اپنی وفاداری سے ارباب حکومت کا دل جیت لیا تھا اس لئے زیادہ دنوں تک سخن کو گوشہ نشیں رہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ ۲۷ رمضان المبارک ۱۲۷۵ھ مطابق ۲۲ مئی ۱۸۵۹ء کو سخن کا عقد مرزا ابراہیم کی بڑی صاحبزادی تحفہ بیگم سے ہوگیا۔

شہر آرہ میں مولوی باقر علی باقر سے سب سے پہلی ملاقات ۱۲۷۰ھ میں ہوئی۔ مولوی باقر ایک خدا ترس اور عابد و زاہد انسان تھے وہ علم دین میں خصوصی ملکہ رکھتے تھے۔ سخن اگرچہ رند مشرب تھے لیکن مولوی باقر کی صحبت کے اثر سے وہ حضرت قیام اصدق چشتی کے مرید ہوگئے۔ مرقع فیض کی روایت کے مطابق ۱۲۷۵ھ میں سخن اور صفیر کا تعارف ہوا۔ سخن نے ۱۲۷۶ھ میں سروش سخن کی تصنیف کا کام تمام کر دیا تھا۔ باقر نے پوری داستان بالاستیعاب پڑھ کر تاریخ تصنیف لکھی تھی "نہے سرچشمہ حسن و لطافت" سخن کے ہی توسط سے حضرت باقر نے ۱۲۷۶ھ میں مرزا غالب سے باضابطہ تلمذ اختیار کیا۔

۱۰ جولائی ۱۸۶۱ء کو سخن سینئر پلیڈر کے امتحان میں کامیاب ہوئے اور ۴ ستمبر سے وکالت شروع کرنے کی ان کو اجازت مل گئی۔ وکالت کے پیشہ میں ان کو کوئی کامیابی نہیں ملی اس لئے وہ ملازمت کی طرف مائل ہوئے۔ ایک قصیدہ شاہ آباد کے ضلع مجسٹریٹ مسٹر جی ایف بلگز کی خدمت میں صنعت توشیع میں پیش کیا جو سروش سخن کے دوسرے ایڈیشن مطبوعہ ۱۸۹۱ء میں صفحہ ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰ پر درج ہے پہلا مطلع اور مقطع یہ ہیں۔

جوش پر آپکے جنوں خیز وہ آئی ہے بہار
نکہت گل سے ہوا نشۂ جام سرشار
دل گزرگاہ خیالِ سخن آرائی ہے
اب سنے مطلع نو باعزو وقار

دوسرا مطلع

اے شہ تخت نشیں اے مہ خورشید عذار
فیض سے تیرے ہوا سارا جہاں پُر انوار
آخری شعر: تو سلامت رہے دُنیا میں بصد جاہ و حشم
ترے احباب رہیں شاد ترے دشمن خوار

نومبر ۱۸۶۱ء سے دسمبر تک دو مہینوں کے لئے منوا صاحب نے ایک عارضی جگہ پر منصفی کی خدمت انجام دی لیکن باضابطہ تقرر کی صورت نہ نکلی تو وہ خواہشمند ہوئے کہ ان کو لکھنؤ میں جاکر وکالت کرنے کی اجازت دی جائے۔ اپنے مواقف فضا کا جائزہ لینے کے لئے وہ ۱۸۶۲ء میں لکھنؤ پہنچے۔ وہیں رہ کر سروش سخن کی طباعت مطبع نولکشور

ہے کہ اُلٹی [illegible]
تاریخ [illegible] قطعہ [illegible]

بعد اے [illegible]
گل گلستاں [illegible]

اس کے علاوہ آٹھ اور شاعروں کے قطعات [illegible] موجود ہیں
سخن کو ۱۸۶۶ء میں [illegible] اجازت مل [illegible]
اس وقت برہان قاطع اور قاطع برہان کی بحث [illegible] شاگرد عبدالصمد فدا کے مقابلہ پر سخن اور باقر [illegible] ہوئے تھے غالب کے پاس ان کی ایک ایک تحریر پہنچی رہتی تھی غالب [illegible] کے غبار سے بکلا گئے تھے لیکن ان دونوں دو اور شاگردوں کی وفاداری سے دل ٹھنڈا محسوس کر رہے تھے۔ سخن نے ذی الحجہ ۱۲۸۲ھ میں جنگنامہ دل آشوب حصہ اول حصہ دوم کے عنوان سے سارے قطعوں اور جوابوں کو اکٹھا کر کے منشی سنت پرشاد کے مطبع واقع آرہ سے شائع کرا دیا۔ جس میں جو خمسہ لکھنوی کو سخن نے چڑھا دیا ہے تو اپنے صاحب دیوان ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ غالب سے اپنے دیوان کے لئے تقریظ بھی اسی وقت لکھوائی ہوگی۔ جیسا صفیر میں بھی یہی کہا ہے کہ ۱۲۸۲ھ تک دیوان مکمل ہو چکا تھا۔

۱۸۷۱ء میں سخن منصف سوئم کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ ۱۸۸۱ء کی مئی میں انہوں نے تہذیب النفوس حصہ اول کی تالیف کا کام شروع کیا۔ ۱۸۸۳ء میں یہ کتاب چھپ کر بازار میں آئی اور ڈائرکٹر تعلیمات صوبجات مغربی وشمالی ہند (یوپی) نے اس کو نصاب تعلیم میں داخل کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ دو برس کے بعد دوسرا حصہ بھی چھپ گیا اور محکمہ تعلیمات میں اس کو بھی وہی مقبولیت حاصل ہوئی۔

۱۲۹۰ھ سے ۱۲۹۱ھ تک منیر اور سخن کے معرکے گرم رہے پھر خود بخود ٹھنڈے پڑ گئے ؎

معرکہ جب ہوگیا ہے اے سخن
فکر سے حالِ سخنداں کھل گیا

سخن ۱۸۸۸ء سے ۱۸۹۱ء تک ہزاری باغ میں منصف اول کے عہدے پر رہے۔ یہاں شاعروں کی سرگرمی کا امکان نہ تھا اور نہ علمی اور ادبی مباحث کے مواقع تھے اس سے سخن آزردہ تو ہوئے لیکن یہاں رہ کر انہوں نے اپنی انگریزی کی استعداد ابھارلی۔ یہیں رہتے ہوئے ان کی زوجۂ اول تحفہ بیگم کا انتقال ۱۸۸۸ء میں ہوا اور ۱۸۹۱ء میں دیوان کی طباعت سے فارغ ہوئے۔

[illegible] میں ان کو درجہ اول
[illegible] تھے یہاں انہوں نے
[illegible] جولائی [illegible] میں
[illegible] اردو کی کچھ زور سفارش
[illegible] کی ترسیم ہوگی۔

[illegible] اب بحیثیت پنشن یافتہ
[illegible] میں تہذیب النفوس تیسری جلد شائع ہوئی اور
[illegible] کے امتحان کے نصاب میں داخل ہوگئی۔

سخن [illegible] مطابق [illegible] میں اپنے وقف کردہ واقع پٹنہ سیٹی میں
[illegible] سے رخصت ہوگئے اور مشہور شاعر راسخ کے پہلو میں دفن ہوئے۔

سخن کے تصانیف میں دیوان اور تہذیب النفوس بہت ہی کمیاب ہیں۔
ان کی مستقبل قریب میں کوئی اشاعت نہ ہوئی تو ان کے نایاب ہوجانے کا
اندیشہ ہے۔

سخن کی تصنیفات

۱۔ سروش سخن (داستان بجواب فسانۂ عجائب)
۲۔ دیوانِ سخن
۳۔ تہذیب النفوس ۔ تین جلد
۴۔ تنبیہ صغیر
۵۔ توضیح المقال
۶۔ گلدستۂ سخندانی

پس ماندگان :- پہلی بیوی تحفہ بیگم کے بطن سے شادی ۱۸۵۵ء
(۱) دختر (زوجہ مرزا محمد سعید آروی (۲) خواجہ محی الدین پیدائش ۱۸۶۲ء
(۳) خواجہ سراج الدین پیدائش [illegible] وفات ۱۹۲۳ء
(۴) سردار بیگم متوفی [illegible] (۵) محمودہ بیگم متوفی ۱۹۲۳ء
(۶) دوسری بیوی دختر بخت علی کے بطن سے (شادی ۱۸۹۰ء)
(۱) خواجہ معین الدین (۲) خواجہ رضی الدین (۳) خواجہ
حمید الدین (۴) خواجہ حفیظ الدین (۵) عمدہ بیگم زوجہ شاہ
محمد یعقوب مونگیر (۶) زوجہ خلیل احمد ریٹائرڈ چیف جسٹس
اڑیسہ



# سات قطعے

حسن نعیم

(۱)

شہر یار وقت کا یا عشق کا حملہ ہوا
یا وفا لوگوں کا گھر ہر دور میں لوٹا گیا

(۲)

یہ غنیمت ہے کہ سر پہ زیرِ مہر و ماہتاب
آندھیاں اٹھیں تو خیمہ ناچ کا کر اُڑ گیا

(۳)

کچھ خطوط دست میں تھا کچھ کتاب نجم میں
جو نہ ہونا تھا وہ اپنے پاس تھا لکھا ہوا

(۴)

اُن کی حسرت بھی وہی تھی جو تھی اپنی آرزو
اتفاقاً ایک دن اس بات کا شبہ ہوا

(۵)

اس کی اپنی طول عمری کس قدر بے کیف تھی
وہ مرا تو کن دھنوں میں رات بھر باجہ بجا

(۶)

جب ہوا میں رقص کرتی جا رہی تھی اک پتنگ
جانے کس کے دل کا ٹکڑا چھت سے گر کر مر گیا

(۷)

کس طرح قطبین ملتے، مل گئے پھر بھی حسنؔ
عشق کا اُن کو نشہ تھا عشق کا ہم کو نشہ

مولانا آزاد کا نام تو ہم بچپن سے سنتے آئے تھے۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ چودہ برس کی عمر میں وہ عربی، فارسی، فلسفہ اور دینیات کی مذہبی تعلیم پوری کر کے اور عالم کی پگڑی بندھوا کر ہندوستان آگئے تھے اور اٹھارہ بیس برس کی عمر میں "الہلال" اور "البلاغ" جیسے مشہور اُردو اخباروں کے ایڈیٹر ہو گئے تھے۔ ان اخباروں کے سیاسی مضامین نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا میں پڑھے جاتے تھا۔

مولانا کے بارے میں اتنی باتیں اتنے برسوں سے سنتے آ رہے تھے کہ اُن کی تصویر جو ہم نے اپنے دماغ میں بنا رکھی تھی وہ یہ تھی کہ لمبی سفید داڑھی ہے اُن کی، اُجلی جبہ نما قسم کی عبا قبا پہنے ہیں اور سر پر مولانا کی شاندار سفید پگڑی ہے۔



ایک بار طالب علمی کے زمانے میں سوچا کہ پنڈت جواہر لال نہرو سے ملاقات کی جائے۔ سو ہم علی گڑھ سے خورجہ چلے گئے تاکہ دہلی سے الہ آباد جاتے ہوئے پنجاب میل میں ہم پنڈت جی کے ڈبے میں چڑھ جائیں

اور علی گڑھ تک ان سے باتیں کرتے جائیں۔ ___ ڈبہ کافی بڑا تھا اور اُس میں پنڈت جی کے علاوہ ایک اور صاحب بیٹھے تھے۔ کالی اچکن کی شیروانی، سر پر قراقلی ٹوپی۔ اور گورے چٹے چہرے پر ایک فرنچ کٹ چھوٹی سی داڑھی۔

پنڈت جی نے کہا۔ "بھئی ان سے ملو۔ یہ مولانا آزاد ہیں۔"

ہم سب نے بڑے ادب سے مولانا کو سلام کیا اور اُن کے سامنے قاعدے سے خاموش بیٹھ گئے کیونکہ ہم پنڈت جی سے بڑی بے تکلفی سے بات چیت کرتے تھے جیسے وہ ہماری ہی عمر کے نوجوان ہوں۔

پنڈت جی نے یہ بات بھانپ لی اور کہا۔

"بھئی مولانا آزاد سے مت گھبراؤ۔ دراصل ان کی عمر تقریباً وہی ہے جو میری ہے۔ صرف لوگوں پر رعب جمانے کے لیے انہوں نے داڑھی رکھ چھوڑی ہے۔"

اور اس پر سب ہنس پڑے اور مولانا بھی بے اختیار مسکرا دیئے۔ اور اس کے بعد ہم باتیں کرتے رہے، پنڈت جی سے سوال و جواب ہوتے رہے بے تکلفی کے ساتھ جیسے کوئی اپنے ساتھی سے بات چیت کرتا ہے۔ کچھ سوال مولانا سے بھی کئے۔ مگر اس طرح جیسے کسی علم والے، پروفیسر یا گرو سے سوال پوچھتا ہے، بڑے ادب کے ساتھ۔

اور مولانا بھی ہمیں جواب دیتے رہے جیسے کہ بزرگ چھوٹوں کو سمجھاتے ہیں۔ وہ ہر بات کہنے سے پہلے "میرے بھائی" ضرور کہتے تھے۔ "میرے بھائی یہ تو صحیح ہے۔" "میرے بھائی یہ تو سراسر غلط ہے۔" لیکن انداز اُن کا ایسا ہی تھا جیسے میرے جیسے بزرگ ہمارے کالج میں کرسی پر بیٹھے لیکچر دے رہے ہوں اور ہم اُن کے سامنے بیٹھے ہوئے طالب علم ہوں۔

[illegible] سے باتیں کر رہے تھے اتنے میں مولانا نے [illegible] سیب نکال کر ان کو ایک [illegible] کے لیے [illegible] ہم کن انکھیوں سے کبھی سیب کی طرف دیکھ رہے تھے منہ میں پانی آ رہا تھا [illegible] مولانا [illegible] سے اور بڑی نفاست سے سیب چھیل رہے تھے کاٹ کر انہوں نے چاقو کی نوک پر ایک [illegible] پنڈت جی کی طرف بڑھایا۔ اس پر پنڈت جی نے کہا کیا یہ تو ڈومینین اسٹیٹس ( Dominion Status ) ہے جو سنگین کی نوک پر رکھ کر انگریز ہمیں دینا چاہتے ہیں: مولانا نے برجستہ جواب دیا: "سنگین کی نوک سے ہاتھ بڑھا کر سیب کا ٹکڑا لے لیجئے۔"

ایک بار شملہ کانفرنس کے موقع پر جب مولانا کانگرس پریذیڈنٹ تھے میں نے کہا آپ کا ایک انٹرویو چاہیے۔ بولے "میرے بھائی پھر تو سویرے پانچ بجے آنا پڑے گا آپ کو؟" پانچ بجے صبح وہ بھی شملہ میں! پھر بھی میں کسی نہ کسی طرح وقت پر پہونچ ہی گیا۔ دیکھا کہ مولانا نہائے دھوئے برآمدے میں بیٹھے چائے پی رہے ہیں۔ فوراً میرے لئے بھی چائے بنائی۔ دونوں پیالیوں میں نہ دودھ نہ شکر۔ صرف سنہری رنگ کی سبز چائے۔

میں نے پوچھا "مولانا۔ آپ چائے میں دودھ نہیں ڈالتے ؟"
کہنے لگے "دودھ سے چائے کا رنگ خراب ہو جاتا ہے۔"
اور میں نے کہا "اور شکر ؟"

وہ بولے "اس سے چائے کا مزا خراب ہو جاتا ہے۔ چائے پینی ہے تو کسی ملاوٹ کے بغیر صاف شفاف چائے ہی پینی چاہیئے۔" یہ اُن کا مسلک چائے ہی کے بارے میں نہیں تھا۔ اُن کی زندگی کا فلسفہ بھی یہی تھا کہ سیاسی زندگی ہو یا ذاتی زندگی اُس میں مکر، جھوٹ، کھوٹ ملاوٹ، ریاکاری، فریب کا دخل نہ ہونا چاہیئے۔

مولانا کی سب سے بڑی خصوصیت اُن کی یہی نفاست اور وضعداری تھی۔ اتنا صاف شفاف آدمی میں نے اور نہیں دیکھا۔ جب بھی ملو لگتا تھا کہ ابھی ابھی نہا دھو کر نکلے ہیں۔ یہ صفائی اور نفاست جسم یا شریر کی ہی نہیں دل کی آتما کی بھی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ آدمی گوشت پوست کا نہیں بلور کا بنا ہوا ہے جس میں سے علم کا نور اور گیان کی روشنی جھلکتی ہے ●

## ندا فاضلی

چار چھ دن میں
میری آنکھوں نے
پی لیا اس کے پورے چہرے کو
وہ بھی شاید مری طرح مجھ کو
اپنی آنکھوں سے پی چکا ہوگا
وہ بھی بے چہرہ
میں بھی بے چہرہ
صرف آنکھوں کے خول باقی ہیں
جن کے اندر جمی ہوئی آنکھیں
بس یونہی چند بار دیکھیں گی
اور پھر رفتہ رفتہ
کچھ دن میں
یہ بھی اک دوسرے کو پی لیں گی

کتنے دن بعد ملے ہو
چلو اس شہر سے دُور !!
کسی پربت کے کنارے
کسی جھرنے کے قریب
ٹوٹتے پانی کو پی کر دیکھیں
بھاگتے دوڑ لمحوں سے چرا کر کچھ وقت
صرف اپنے لئے جی کر دیکھیں
کوئی دیکھے نہ ہمیں
کوئی نہ سنتے پائے
تم بھی جو چاہے کہو
میں بھی بلا خوف و خطر
ان سبھی لوگوں کی تنقید کروں
جن سے مل کر مجھے ہر روز خوشی ہوتی ہے۔

# شاد عارفی — ایک مطالعہ

شاد عارفی کے نام کے ساتھ آج تک ان کا ایک مخصوص کردار وابستہ رہا ہے اور شاد عارفی کے مداحوں، دوستوں اور ان کے کلام کا مطالعہ کرنے والے اکثر لوگوں نے شاد عارفی کو عام طور پر اسی مخصوص کردار کے چوکھٹے میں رکھ کر دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہمارے ذہنوں میں شاد عارفی کی ایک غیر حقیقی تصویر مرتب ہو گئی ہے۔ یہ غیر حقیقی تصویر کچھ اس قسم کی ہے۔ شاد عارفی بہت بڑے طنز نگار ہیں، وہ سماجی برائیوں کو اپنے تیر و نشتر کا نشانہ بناتے ہیں، ان کی طبیعت میں برہمی اور جھنجھلاہٹ کے عناصر غالب ہیں، وہ اخلاقی زوال کے نوحہ خواں ہیں، وہ ہماری توجہ سماج کے ناسوروں اور اس کے گلے سڑے عناصر پر مرکوز کرنا چاہتے ہیں، ان کا اسلوب لاثانی ہے، ان کی زبان و بیان پر قدرت بے مثال ہے وغیرہ وغیرہ۔

مندرجہ بالا جملوں میں سے قریب قریب ہر جملہ اپنی اپنی جگہ صحیح ہو سکتا ہے لیکن شاد عارفی کے کلام کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ ان کا طنز نگار کا رول نہایت مشکوک ہے اور محض اسلوب کا لطف اور چٹخارہ ہے۔ اس دعوے کو ثابت کرنے سے پہلے میں اپنی پوزیشن کو مختصراً واضح کرنا چاہتا ہوں۔ میرا عقیدہ ہے کہ انسان چونکہ سماجی جانور ہے اس لئے اس کی فکر پر اس کی نجی اور سماجی زندگی اثر انداز ہوتی ہے اور اس کے کردار کی تشکیل کرتی ہے۔ اس کا ردِ عمل اثر اندازی اور تشکیل کے عمل میں جنم لیتا ہے۔ شاعر بھی چونکہ انسان ہے اس لئے اس اصول کی زد سے باہر نہیں ہے لہٰذا اس کا کلام نجی اور سماجی ردِ عمل کی پیداوار ہے لیکن میں اپنے عقیدے کو تنقیدی معیار کے طور پر استعمال کرنا نہیں چاہتا ہوں۔ شاد عارفی کے سلسلہ میں یہ احتیاط اس لئے ضروری ہے کیونکہ ان کا مقبول عام Image امیج ان کی Legend کا پروردہ ہے، حقیقی نہیں ہے۔ طنز نگار، مزاح نگار، صاحبِ اسلوب وغیرہ الفاظ اور اصطلاحات کو تھوڑی دیر کے لئے بے مصرف سمجھ کر میں الگ رکھ دینا چاہتا ہوں۔ تاکہ شاد عارفی سے ملاقات کرتے وقت میرے اور ان کے درمیان کوئی دیوار حائل نہ ہو۔

شاد عارفی آخر کیا چاہتے ہیں؟ ان کو کون سی باتیں اور قدریں عزیز ہیں؟

[illegible] مقصودات کا [illegible] "بدایات" و مختلف [illegible] نفرت جبر ہے شاد عارفی [illegible] زندگی کی خواہشوں سے پاک [illegible] سمجھتا ہو اور شاد عارفی کے [illegible] اس قسم کی بیوی صرف اپنے شوہر سے [illegible] خارجی اثرات سے محفوظ رکھا گیا ہو اور [illegible] ہو۔ یہ آدرش صورت حال ہے لیکن یہ آدرش [illegible] اور شاد عارفی کا Obsession ہے [illegible] تمام نسبتوں کا منبع ہے۔ شاد عارفی کا دوسرا جواب [illegible] کے خاکہ کا ہے۔ یہ انسان کا جواب ہے۔ یہ جواب [illegible] کے علاوہ "دسہرا اشنان"، "واپسی"، "[illegible]"، "[illegible]"، "بسنت" "نظم" اور شاعری [illegible] اور دلفریب شاعرانہ جذبے کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ شاد عارفی کے دوسرے جواب کا تجزیہ [illegible] پیش کیا گیا، ان کے مقبول عام جواب کا تجزیہ خاندان کے دوسرے جواب [illegible] منظر میں پیش کر سکتا ہے۔

شاد عارفی سماج کے جس طبقے کا عام طور پر ذکر کرتے ہیں وہ [illegible] عام میں نام نہاد "شرفا" کا طبقہ کہلاتا ہے۔ شاد عارفی کی شاعری میں یہ طبقہ ہندوستانی مسلمانوں کی معاشرتی مشکلات اور تضادات کا مظہر ہے۔ اس طبقے کے مسائل شاد عارفی کی شاعری میں بار بار جلوہ ساماں آتے ہیں۔ میاں بیوی کا مسئلہ اور غیر ازدواجی جنسی تعلقات کا مسئلہ۔ شاد عارفی کو احساس ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کا وہ طبقہ جو اخلاقی بحران کا شکار ہے یا تو اقتصادی طور پر پچھڑا ہوا ہے یا اقتصادی فارغ البالی کی غلط روش سے آلودہ ہے۔ شاد عارفی اپنے پورے طنزیہ کلام میں یہ فیصلہ نہیں کر پائے کہ وہ "لذت گناہ" کے خلاف ہیں یا "عذرِ گناہ" کے خلاف ہیں۔ وہ مسلمانوں کے اخلاقی نظام کو معاشرے کے لئے [illegible] سمجھتے ہیں اور اس نظام سے انحراف کے تمام [illegible] بناتے ہیں۔ [illegible] نظام چاہے مسلمانوں کا ہو یا ہندوؤں کا پاکستان اور مذہب کا زیادہ تر اقتصادی مجبوریوں کے تابع ہوتا ہے۔ مسلمان گھرانوں کی لڑکیاں [illegible] تعلیم حاصل کریں،

[illegible] سے ملیں اور اپنی مرضی سے شادی کرلیں تو وہ یقیناً [illegible] نہیں کرتیں۔ محض اقتصادی فارغ البالی سے فیض یاب ہوکر [illegible] کی کوشش کرتی ہیں۔ وہ گھٹا ہوا معاشرہ جس کی پیدا کی ہوئی [illegible] شاد عارفی کو پسند ہے دراصل ان تمام غلاظتوں کو پیدا کرتا ہے جو شاد عارفی کو سخت ناگوار گزرتی ہیں اور جن کے خلاف وہ مسلسل [illegible] اظہار کرتے ہیں۔

غیر ازدواجی تعلقات بجائے خود کھوکھلی اخلاقی اقدار بذاتِ خود قطعی طور پر اہم نہیں ہیں۔ ان کی اہمیت صرف اس لئے ہے کیونکہ ان سے معاشرے کی مخصوص صورتِ حال پر روشنی پڑتی ہے۔ شاد عارفی اصل مرض کو اپنی توجہ کا مرکز بنانے کی بجائے علامتِ پر اپنی پوری قوت صرف کر دیتے ہیں اس لئے ان کا طنز نگار کا رول بنیادی سطح پر ہی مشکوک اور کمزور ہو جاتا ہے۔ مزید یہ کہ وہ جن باتوں کے خلاف ہیں ان کو پسند بھی کرتے ہیں اور ان کا ذکر بڑے چٹخارے سے کرتے ہیں۔ ان کا غم و غصہ حقیقی ہوتے ہوئے بھی غیر حقیقی محسوس ہوتا ہے اور محض اسلوب کا انتظام نظر آتا ہے۔

میں شاد عارفی کے عام Obsessions میں سے صرف دو کا ذکر کروں گا۔ غیر ازدواجی جنسی تعلقات کا ذکر ان کے اعصاب پر سوار ہے۔ وہ غیر ازدواجی جنسی تعلقات کا ذکر نہ صرف بار بار کرتے ہیں بلکہ چٹخارے سے کرتے ہیں۔ ان کا دوسرا Obsession یہ ہے کہ ہر وہ عورت جو دلکش یا کسی حد تک نیم عریاں لباس میں رہ گزر پر یا میلے یا نمائش میں نظر آتی ہے، رنڈی یا بیسوا ہے اور اخلاقی گراوٹ کی کسی انتہائی صورتِ حال کی مظہر ہے۔

شاد عارفی کے پہلے Obsession کی کچھ مثالیں ملاحظہ کیجئے۔

ہفتہ بھر میں اک دن "ایسی لغزش" عیب نہیں
ظاہر ہے پاپا، ماں کو حاصل علم غیب نہیں
کالی راتوں کی باتوں سے واقف صبح و شام نہیں

جاتی ہوں گھبراتے کیوں ہو کیا اندھیاری گھور نہیں
دو دل راضی کے بارے میں قاضی کا کچھ زور نہیں
لو یہ دس کا نوٹ تمہاری اُجرت ہے انعام نہیں

(شوفر)

بڑی ماسٹرنی ۔ ۔ ۔ ۔ ہے شوفر کی ۔ ۔ ۔ وہ
سپیدہ ۔ ۔ ۔ غلام محرّر کی ۔ ۔ ۔ ۔ وہ
سکندر کی یہ ہے ۔ مہندر کی ۔ ۔ ۔ وہ
یہ خلاصنیں ۔ ۔ ۔ ۔ سارے دفتر کی ۔ ۔ ۔ وہ

(نمائش ۱۱)

"ہمہ تن خلق و اطاعت ہے مری گھر والی
کل جو موقعے کی نزاکت سے کھلی شہ پالی
بام پر جاکے ذرا دیر ہوا کھا آؤں
اور پھر پیٹ کا ہلکا نہیں، کمرہ خالی

(سالی)

غیر ازدواجی جنسی تعلقات کا ذکر شاد عارفی کے ہاں زیادہ تر نظموں میں ملتا ہے۔ مندرجہ بالا نظموں کے علاوہ یہ ذکر "نمائش ۱، ۲، ۳، ۴"، کشمیری بھکارن "مال روڈ"، مرے محلے کے دو گھرانوں سے ہے گناہوں کا فیض جاری، مال زادیاں اور دلال "غمازہ" بھی اس راہ سے کوئی گیا ہے، "مرید کی بیوی"، مہترانی اور دھوبی اور خان صاحب کے مکالمے میں کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ غیر ازدواجی تعلقات کے مجرموں میں میاں بیوی، سالی، سلیج، مہترانی، ملازمہ، ملازم، شوفر، بھکارن، بیرا، افسر کی بیوی، ماتحت کی بیوی وغیرہ وغیرہ کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں۔ شاد عارفی کے اس کلام کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ جس سماج کے اخلاقی زوال کے وہ نوحہ خواں ہیں مکمل طور پر جنسی بے راہ روی کا شکار ہو چکا ہے۔ مجھے غیر ازدواجی تعلقات کے ذکر پر قطعاً اعتراض نہیں کیونکہ طنز نگار کے طور پر شاد عارفی کا فرض ہے کہ وہ سماجی غلاظتوں کی عبرت ناک تصویر پیش کریں۔ مجھے اعتراض اس بات پر ہے کہ ان کا غم و غصہ غیر حقیقی ہے۔ ان کی اصل مشکل ان کی محرومی ہے۔ اس لئے جنسی تعلقات یا فعل کی تفصیل جہاں بھی ان کے کلام میں آتی ہے چٹخارے کا واضح عنصر اُبھر کر سامنے آجاتا ہے اور ان کے طنزیہ کردار کو مشکوک بنا دیتا ہے۔ دو مثالیں ملاحظہ کیجئے۔

کروٹیں سی کروٹیں بستر پہ میرے سامنے
اور ٹھنڈے سانس ہر ہر بار تیرے سامنے
ہونٹ دانتوں میں دباکر آنکھ دے کر بار بار
چاہتی تھی مجھ سے تنہائی میں قرب ناگوار
تیز بوسوں کے لئے پیاسے ارادے بے قرار

(غمازہ)

سناؤں کیا وہ کیا ساعات رنگینِ محبت تھے
مجسم رونقِ شمع مجسم تھی جہاں میں تھا
قدِ بالا پہ "باڈی" اور پیٹی کوٹ نار تھی
مگر سورج مکھی سرو چراغاں تھی جہاں میں تھا

محبت وہ [illegible] حسن ہو ناز بیداری
بچھاشہ ہر حسین اغواہ عریاں تھی جہاں میں تھا

(وہ کافرہ)

شاد عارفی کے کلام میں "سیاڈیوں" کا ذکر کئی مقامات پر ہے جس نے دوسری مثال شاد عارفی کے سلسلے میں ایک نکتہ ثابت کرنے کے لئے پیش کی ہے۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ وہ رومانی محبت، جنسی محبت اور غیر ازدواجی جنسی تعلقات اور زندگی کی سبھی لذتوں کو پسند کرتے تھے۔ جوں جوں وہ اس سے محروم ہوتے گئے ان کی تلخی میں اضافہ ہوتا گیا اور وہ اس Pretence کو حقیقی سمجھنے لگے جو نہایت مصنوعی غیر حقیقی اور بے کار تھا۔ وہ نہ تو مجسم اخلاق تھے نہ مصلح قوم و ملت بلکہ صرف شاعر تھے۔ ان کے شاعرانہ کردار کا حقیقی جلوہ ان کے طنزیہ کلام میں نہایت مجروح شکل میں نظر آتا ہے۔ شاد عارفی اس LEGEND کا شکار ہو گئے جس کا آغاز انہوں نے خود کیا اور جس کا پھیلاؤ ان کے معتقدوں اور مداحوں کے ہاتھوں میں آیا۔ "وہ کافرہ" اس تضاد کی نمائندہ مثال ہے جس نے ان کی شخصیت کے دو ٹکڑے کر دیئے تھے اور تمام عمر غلط جذبے کی نمائش اور پرورش میں مصروف رہے۔

شاد عارفی کا دوسرا Obsession ان کے پہلے Obsession سے بھی زیادہ مضحکہ خیز ہے — ہر عورت کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھنے کا Obsession۔ شاد عارفی کی نمائش کے سلسلے کی نظمیں پڑھ کر اکثر محسوس ہوتا ہے کہ راہگذر، بازار یا نمائش میں کام یا تفریح کے لئے جانے والی ہر عورت بیسوا ہے اور انتہائی اخلاقی انحطاط کی علامت ہے۔ یہ Obsession ہمارے دور کے کچھ جدید شاعروں کے ہاں بھی نظر آتا ہے۔ کام یا تفریح کے لئے آزادی سے گھومتی ہوئی خوبصورت عورتیں عمومی طور پر ایک حسین منظر پیش کرتی ہیں جو یقیناً کسی قابلِ مذمت اخلاقی قدر کی مظہر نہیں ہے۔ اس Obsession کی تہ میں بھی شدید محرومی کا جذبہ کارفرما ہے۔ یہ Obsession ہرگز شعری رویہ نہیں ہے اور کسی مثبت یا منفی اخلاقی قدر کو ثابت نہیں کرتا۔

شاد عارفی کے غیر حقیقی کردار پر ہماری توجہ چونکہ مسلسل رہی ہے اس لئے ان کی شاعری کا ایک اہم حصہ ہماری نظر سے اوجھل ہو گیا ہے۔ اس حصے میں جو کلام شامل ہے وہ حقیقی شاد عارفی کو ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ یہ شاد عارفی جو حسن سے لذت یاب ہو سکتا ہے، دوستوں کی محبت کو پسند کرتا ہے، درد مند دل رکھتا ہے، عورت کو بیسوا یا رنڈی نہیں سمجھتا، غیر ازدواجی جنسی تعلقات کو برا نہیں سمجھتا اور یہ قدر توفیق ان سے لطف اندوز ہوتا ہے یا ہونے کی خواہش رکھتا ہے یہ ایک Genuine انسان کا کردار ہے جو نہ تو کسی مصنوعی Obsession

[illegible] ہے اور [illegible]
[illegible] ہے جس شاد عارفی کے [illegible]
شاد عارفی کی نظم "والپسی" [illegible]

والد کی [illegible]
بھرے [illegible]
میری [illegible]
ماما کی [illegible]
آ کے برابر [illegible]
شاد لبس [illegible]

کس قدر معصوم اور دلفریب ہے یہ منظر [illegible] شاد عارفی کی نظر سے اس منظر کو دیکھا جائے تو اس میں غیر ازدواجی تعلقات اور اخلاقی قوانین کی خلاف ورزی کے عناصر نظر آتے ہیں۔

پھڑ پھڑاتی ہیں جیسے [illegible] میں
بجتے ہیں ساغر شراب ناب میں
رہتی ہیں عام سب کے [illegible] میں

پھولوں کے جھرمٹ میں ہم ہیں اور آم
کر رہے ہیں تیز چاقو اپنے کام
ذائقہ چکھتے ہے۔ تیغ ہے شام

(امرود)

کس قدر روشن اور صحت مند ہے یہ منظر یقیناً یہ کوئی دوسرا شاد عارفی ہے۔

شام کا گیسو کھلی آنکھوں پہ جادو کر گیا
آنکھ ملتا تھی کہ نظارہ پلٹ کر رہ گیا
طور کا جلوہ چراغوں میں سمٹ کر رہ گیا
مختلف آنچل ہوا کے رخ پہ لہرانے لگے
روشنی میں سایوں کے رنگ گہرانے لگے
یہ دوالی کے مناظر [illegible]
یا الٰہی تاقیامت یہ [illegible]

(دیوالی)

یہ شاعر ایک تو کسب مسرت کے مفہوم فن سے واقف ہے:
ایک استشہاد دیکھئے۔

پھر بیریوں کی آڑ میں سینے کی حد سے دور
پہنچا ہوں اس امید میں آئے گی وہ ضرور
کھو جانے گی کہیں۔ بیر پانے کے واسطے

یہ ناؤ رہ گئی جو کنارے پہ ٹوٹ کے
ریتی میں دب چکی ہے جو کوسی میں چھوٹ کے
کافی ہے ولولوں میں بہانے کے واسطے
(دسہرہ اشنان)

عمر اندوہی جنسی فصل کنار دریا شکستہ ناؤ میں شاعر کو ولولوں میں بہرحال بہا سکتا ہے۔ چاہے وہ کتنا ہی اس کے خلاف کیوں نہ ہو۔ یہ شاد عارفی محض انسان ہے۔ نقاب نہیں اس لئے معصوم ہے۔

شکار ماہی، نظم بسنت۔ یہ سب نظمیں ایک حقیقی شاد عارفی کی تصویریں ہیں جو کسی PRETENCE کا شکار نہیں ہے۔ شاد عارفی کے کلام کا ایک اور قابل ذکر حصہ ابھی باقی ہے اس کا ذکر نہ کرنا اس کے ساتھ بے انصافی ہوگی۔ شاد عارفی، طنز نگار، شاد عارفی گوشت پوست کا انسان — شاد عارفی کی کچھ نظمیں ایسی ہیں جہاں شخصیت کا تضاد ختم ہو گیا ہے: "اندھیر نگری، اور ابھی جبلپور جل رہا ہے" حقیقی جذبے ردعمل اور اظہار کی نمائندہ مثالیں ہیں۔ اندھیر نگری، اقدار کی شکست اور ان کے کھوکھلے پن کی نظم ہے، اور ابھی جبلپور جل رہا ہے" ایک مجروح جذبے کی پراسرار اور کربناک تصویر ہے۔ یہ غصے اور جھنجلاہٹ کی نظم نہیں بلکہ دل کی آواز ہے۔

شاد عارفی اسلوب کے سلسلے میں بہت سی غلط فہمیوں کا شکار تھے کاریگری اور شاعری بہرحال دو الگ الگ کام ہیں۔ انہیں عمر بھر اپنی استادی کا رعب جمانے کا شوق رہا۔ یہ شوق غالباً ان کے شاگردوں کے لئے مفید رہا ہو لیکن ان کے اپنے اسلوب پر کچھ مستقل اثرات چھوڑ گیا۔ زیادہ سے زیادہ اجنبی اور کھردرے الفاظ کو باندھنے اور کھپانے کی خواہش ان پر اکثر حاوی ہو جاتی ہے۔ یہی شوق ان سے ضرورت سے زیادہ تفصیلات کا مطالبہ بھی کرتا ہے اور وہ اسے پورا کرنے میں کوئی تامل محسوس نہیں کرتے۔ کچھ جذباتی اور اسالیبی Obsession کی طرح Obsession بھی ان کا مستقل Inverted Commas ہیں۔ وہ اسے کاماز کا استعمال متواتر کرتے ہیں اور بلا ضرورت کرتے ہیں۔ اکثر اوقات اس استعمال کا کوئی محل نہیں ہوتا۔ شاعری کی زبان ہر قسم کی لچک کی اہل ہے۔

محض مخصوص مفہوم کی نشان دہی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ الفاظ مختلف اور متضاد مفاہیم کے خود متحمل ہوتے ہیں۔ شاد عارفی غالباً اس بات سے پوری طرح واقف نہیں تھے کہ کوئی لفظ دوہرے Inverted Commas کے اندر رکھا جاتا ہے تو اس کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ شاد عارفی اکثر اوقات صرف مخصوص الفاظ کی نشاندہی کرنے کے لئے کاماز لگا دیتے ہیں جو قطعی طور پر غیر ضروری ہوتے ہیں۔

۱۔ چاہتی ہے مجھ کو "تشہیر ہوس" میں گھیر دے
۲۔ اس ساری میں "سلوٹ" اس سلئے "میں جھول نکالا جائے۔
۳۔ وہ "سوریا پدھا" وہ "ہری اوم" کی جا پیں

شاد عارفی کے کلام میں سینکڑوں مصرعے ایسے ہیں جن میں کاماز کا استعمال سراسر غیر ضروری اور بے کار ہے۔

شاد عارفی کے طنزیہ کلام کا سب سے بڑا عیب مزاح کی کمی ہے مزاح طنز کو مقبولیت کا جوہر بخشتا ہے۔ تلخی مخالف ردعمل پیدا کرتی ہے۔ شاد عارفی کے بیشتر کلام پر تلخی، جھنجلاہٹ اور اخلاقی Obsession کا غلبہ ہے اس لئے بیشتر کلام مجروح ہو گیا ہے۔ اسلوب کا چٹخارہ ان کی زبان پر مستقل طور پر موجود رہتا ہے اور وہ اکثر اسلوب کی مجبوریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان کے کلام کا وہ حصہ جن میں تلخی کم ہے اور اس کی جگہ بذلہ سنجی، بردباری، دردمندی، معصومیت اور مسرت نے لے لی ہے۔ شعری حسن سے روشن اور منور ہو گیا ہے۔ حقیقی شاد عارفی سے ہماری ملاقات ان کے پورے کلام کے اسی حصے میں ہو سکتی ہے۔

نوٹ :۔ یہ مقالہ میں نے مظفر حنفی کے ایما پر لکھا تھا اسے وہ شاد عارفی کی شاعری اور شخصیت سے متعلق ایک زیر ترتیب مجموعہ مضامین میں شامل کرنا چاہتے ہیں: مظفر حنفی کا شاد عارفی سے قریبی تعلق تھا اور وہ ایک عرصے سے اُن کی شاعری اور شخصیت پر کام کر رہے ہیں اس مقالے کے بارے میں اپنے ردعمل کا اظہار مظفر حنفی نے میرے نام ایک خط میں کیا ہے یہ خط قارئین کی دلچسپی کے لئے اور شاد عارفی کی شاعری کو مناسب پس منظر میں رکھنے کے لئے مقالے کے ساتھ پیش خدمت ہے۔

مظفر حنفی کا خط

" پہلے تو عید کے سلسلے میں مبارکباد قبول فرمائیے اور پھر مضمون کے لئے بہت بہت شکریہ۔ شاد مرحوم پر بہت سے مضمون لکھے گئے لیکن جس مخصوص زاویئے پر آپ نے روشنی ڈالی ہے وہ اب تک اچھوتا تھا۔ بحیثیت مجموعی مجھے مضمون بے حد پسند آیا اور اس کی بیشتر باتوں سے بے اتفاق ہے واقعی شاد عارفی عملی طور پر جنسی ناآسودگی کا شکار تھے۔ کڑے مذہبی ماحول نے انہیں غیر ازدواجی جنسی تعلقات سے بچائے رکھا اور ازدواجی زندگی کے انہیں بارہ چودہ مہینے میسر آئے ان میں سے زیادہ عرصہ ان کی اہلیہ کی بیماری

...میں ... یہاں یہ بھی عرض ہے کہ انھوں نے کم و بیش ... سال کی عمر پائی ... ہے کہ ان کی نظموں کے مجموعہ "انفیر نجمی" میں "سویرا" والوں نے بیشتر وہی نظمیں انتخاب کی ہیں جو براہِ راست یا بالواسطہ جنس سے متعلق ہیں۔ مرحوم کے منظوم کلام کا بیشتر حصہ نظموں کی شکل میں ہے اور کم غزلیات کی شکل میں ہے۔ ان نظموں میں ایسی نظمیں جو "انفیر نجمی" میں شامل ہیں (رہائش وغیرہ کے قبیل کی) ان کا اوسط پانچ سات فیصد سے زائد نہیں ہے۔ "واپسی"، "دسپوا شتان"، "دلیاں" جیسی نظمیں ساٹھ فی صد اور باقی ماندہ خالص طنزیہ نظمیں ہیں مثلاً "انکلیں تقلم" (انفیر نجمی) مثلاً پرانا قلعہ، سماج، روٹی، اختلافات حیوانِ ناطق، سطحیات و عینیات، رسمی قید خانے، جبر و قدر، گاؤں، گریہ دریا، مالن، گوالن، بحث، دیہاتی لاری، مندرجہ ذیل سبق، نفسیاتِ سر، غدار، حریت، شہر سے دور، گیہوں نے کہا، دیکھنے والا ہو تو، ایک تصویر دیکھ کر۔ آج کل، موجِ تبسم، اور ایسی ہی تقریباً ڈیڑھ سو نظمیں۔ میں نے ان کی ایسی نظموں کا مجموعہ ترتیب دیا ہے۔

دوسری بات یہ کہ عام طور پر شاد عارفی کے سلسلے میں جو مضامین لکھے گئے ہیں وہ ان کی غزلیات کو سامنے رکھ کر لکھے گئے ہیں اور وہ بھی آخری دور کی غزلیات جن میں خالص طنز برتا گیا ہے چنانچہ ناقدین کی نگاہ میں وہ ایک طنز نگار ہی ہیں ان کی نظمیں بہت کم زیرِ بحث آئیں۔ خیال یہ ہے کہ اُن کا پورا کلام منظرِ عام پر آنے کے بعد ایک مربوط اکائی کی شکل میں سچی تنقید کا مطالبہ کرے گا اس تفصیل سے کہیں آپ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ میں شاگردانہ عقیدت کے تحت مرحوم کی وکالت کر رہا ہوں جب کہ آپ کا یہ مضمون صد درجہ پسند ہے۔

البتہ میں آپکے اس خیال سے متفق نہیں ہوں کہ مزاح کی کمی طنزیہ کلام کی خامی ہے اور یہ بات میں محض غزل کی حد تک محدود رہتے ہوئے کہہ رہا ہوں۔ میرا خیال یہ ہے کہ اُردو غزل میں خالص طنز (اِکا دُکا چھینٹے تو ہر شاعر کے کلام میں مل جاتے ہیں) سے بہت کم کام لیا گیا ہے اور جہاں اُسے برتا بھی گیا ہے تو مزاح کی آمیزش کے ساتھ جس نے طنز کی دھار کو کند کر دیا اور چٹخارہ بڑھا دیا۔ اگر میرا خیال غلط ہے تو خود مجھے بھی اپنے کلام میں محتاط رہنا ہوگا۔"

مظفر حنفی

## آخری چیخ ..... آزاد گلاٹی

...

تمام ... کو ...

... 

سب ... ہوں

کہ ... ہو ...

کہ میرا ... ہے

سمندروں کا ... پایا

سراب ... کر۔ ۔ ۔

میں چیختا ہوں

وجود کا میرے ایک اک حصہ

مسِ ... گیا ہے۔

تمام فصلوں کی جڑ کو سیلاب ... کر۔ ۔ ۔

میں دن ... چیختا ہوں

کہ پیاسے سورج نے ۔ ۔ ۔

منتوں کا ... پیا ...

تمام ... میں آگ کا خیمہ ... تان کر۔ ۔ ۔

اب میں چیختا ہوں

مجھے بچاؤ

کہ موم کا اک مکان ... بنا رہا ہوں۔

ہرے بھرے موسموں کی ساری ہواؤں کو

برف کی چٹانوں میں قید کر کے۔ ۔ ۔

میں چیختا ہوں

کہ نیلے اور سفید سے ... کا نام ... لکھ دیا ہے

یکسر ... نے

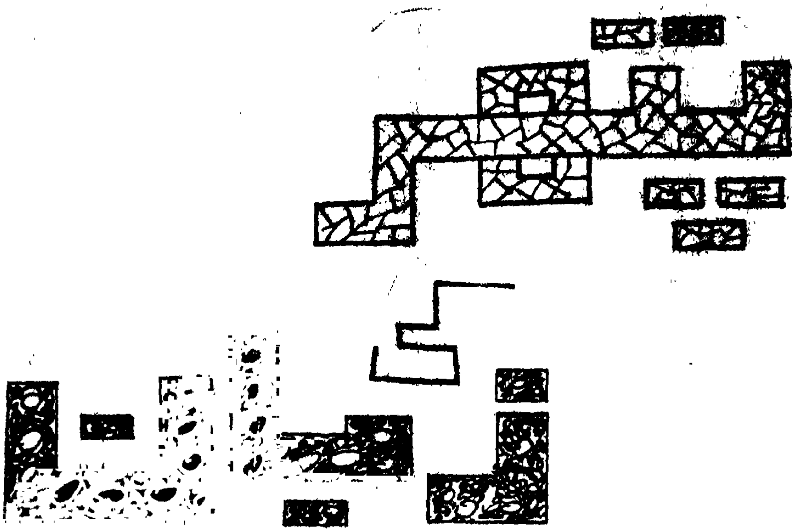
تمام تہذیب لفظ و معنی کو

ایک پیرایۂ بیاں میں اسیر کر کے۔ ۔ ۔

میں چیختا ہوں

مجھے مری ذات سے نکالو

کہ میں نے آزادیوں کا مطلب غلط لیا تھا



احمد یوسف

قدموں کی نیچے کی دُنیا نے کہا ـــ "کوئی دم میں دلیزاد آتے ہی ہوں گے ـــ وہ گھمسان کا رن پڑے گا کہ میرا سینہ پھٹ جائے گا اور آسمان ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر جائے گا۔ گرد و غبار خون کے دریا میں بہہ جائیں گے۔"

"تب ہی میں اپنے بچوں سے کہوں گی کہ وہ اپنی اپنی قبروں میں جا بسیں"

"کل بھی یہی ہوا تھا ـــ لذتیں عروج پر پہنچ کر منہ کے بل گرتی ہیں"

"بس اب دلیزاد آتے ہی ہوں گے ـــ میں مسلسل جاگ رہی ہوں اور اب لمبی تان کر سونا چاہتی ہوں کہ نیند اور تھکن سے میرے پپوٹے بے حال سے ہو گئے ہیں" ـــ

جبھی تو میرے نیچے کہیں نہ کہیں سے آہی جائیں گے اور یہ کھیل پھر سے شروع ہو جائے گا ـــ

"لیکن اب کہ دلیزاد آتے ہی ہوں گے"

شگی محافظوں نے پنے بیتے اس کنارے سے اس کنارے تک پھیلا رکھے ہیں جن پر کہانیاں سیکڑوں اور ہزار ہا قلموں نے محفوظ کر دی ہیں۔

سر چھنواں آنکھیں آمر یا ڈنی، تو مار باڑی کے بعد ایک بڑا سوالیہ نشان بنا دیتی ہیں لیکن ایک بڑی مترنم سی ذہنی رو والہانہ انداز میں آتی ہے اور اسے ایک خوبصورت سے لول میں بدل جاتی ہے۔ پھر ایک دوسری رَو جو اس کا تعاقب کرتی ہوتی ہے، کوچہ و بازار سے ہوتی ہوئی ایک دوڑتے بھاگتے شہر کی شاہراہ چل کر پہنچ جاتی ہے ـــ بغلوں میں سرخ میلے دبے ہیں آنکھیں اپنے اندر کے دھڑکتے دلوں کو باہر کھینچ لائی ہیں ـــ

جہاں انگڑائیاں لیتا ہوا اپنا کل ہے۔ ہاتھوں میں چلتی ہوئی صبح کا نقیب ـــ ابلے ابلے بالوں والے نوجوان مشرق کے اس شہر میں ہیں اور بعید مشرق میں بھی ہیں جہاں کا آسمان شہبازوں کی زد میں آگیا ہے اور اب وہ ان کی تلاش میں ہیں۔

مسلسل تعاقب ـــ ازل سے ابد تک ـــ

اور وہ سنگ و آہن کی بلند و بالا عمارتیں، جہاں آنکھیں اگر نیچے سے اوپر تک کا سفر کرتی ہیں تو ٹوپیاں فٹ پاتھ پر آ رہتی ہیں لیکن اُن کے سائے میں پناہ بھی ملتی ہے اور مصر کے ایک حکیم کے اقوال زریں بھی ملتے ہیں پر یہ کہ سنگ و آہن کی دیواریں طور نہیں بن سکتی ہیں ـــ وہی ایک عام آدمی کے روز و شب ـــ

[illegible] مانے کہتے ہیں کہ جہاں آبادی کے ایک چھوٹے سے حصے کے دلوں میں بے اطمینانی کے سانپ رینگ رہے ہیں وہاں ایک بڑے حصے کے دل میں شادمانی کے نقارے بھی بج رہے ہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ ایک چھوٹا حصہ اگر سرخوشی کے عالم میں جھوم رہا ہے تو ایک بڑا حصہ کرب و آلام کی وادیوں میں گم ہے —

آگے —

میرے گھر میں بس ایک بول چال۔ کھانا پینا، رہن سہن ایک —

اندر اور باہر کے عقیدے ایک — میرے گھر میں —

سارا زور میرے پہ ہے —

یہ آواز کس شناسائی سی کیوں لگ رہی ہے —

نجز بکتا خیالوں والے نوجوانوں کا ایک گروہ — دلدل میں ایک گم کردہ تاریخ کے چند اوراق پریشاں — سروں پر بنے کی کتابیں —

پھٹے جاقوؤں کی زبان کہہ رہی ہے — فاسد لہو بہہ جانے دو، تب ہی ایک جیسی صورتیں پیدا ہوں گی۔

گاتے بجاتے — میرا گھر، میرا گھر کرتے ہوئے رواں دواں ہیں۔

دو قدم اور —

اس کی پیٹھ پر ایک تھیلا بندھا ہے، جس میں پیپسی کولا، کوکا کولا اور بیئر کی ٹھنڈی بوتلیں بجی ہیں۔ اس کی ڈھیلی داڑھی قدرے اوپر کو اٹھی ہے اس کے نوخش وضع لانبے کوٹ میں کتے ہی ننگ صف بہ صف کھڑے ہیں۔ اس کی چمپاتی ٹائی اس کے سینے پر چمک رہی ہے اور اس کے ہلکے پھلکے جوتے خاموشی سے سفر کر رہے ہیں۔

وہ چمکتی آنکھوں سے چاروں اور دیکھتا ہے۔ تب گاتی گاتی کرتا کاندھے اُچکاتا — آزاد تصور، اعلیٰ اخلاقیات اور خواب جوتے ہیں کے درس دیتا ہے۔

بالآخر وہ سیٹیاں بجا کر، اور اونچی فیلٹ کو دھیرے سے اٹھا کر "بائی" کرتا ہوا ایک طرف کو روانہ ہو جاتا ہے۔

اور آگے —

سینما کے پوسٹر۔

مخصوص کمزوریوں کے علاج —

دو یا تین بچے —

ایک جہانِ معانی سے آگے ایک جہانِ معانی —

سناٹے کے جبڑوں کو چیرتی ہوئی ایک سائیکل وہیں پر آ رکی۔ ایک نوجوان نے سائیکل کو اسٹینڈ پر کھڑا کیا — پینٹ کے بٹن کھولے اور نہایت بے باکانہ انداز میں خشک پتوں کو روندتا دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا — وہ اردگرد سے بالکل ہی بے تعلق تھا۔

یہ تک نہیں دیکھا اس نے کہ ایک ادھیڑ شخص پاس ہی بیٹھا ہوا پیشاب کر رہا ہے

---

## نذرِ غالب

[illegible]

[illegible] نہیں
دیکھ کر بھی [illegible] دوست
بے نیازِ [illegible] آیا ہے [illegible]
وقت کی رفتار [illegible] تھا دوست
اس مسیحا دم کا [illegible] ہے کرم
ہے شفا بخشِ جہاں [illegible] دوست
پھول [illegible] آتا ہے نظر
اور یوں لگتے ہیں [illegible] دوست
دم تو لیتے ہیں کبھی [illegible] چھاؤں میں
سایۂ [illegible] دیوارِ دوست
رنجش و آزردگی [illegible] سے جیتے نہیں
دوست ہی ہوتے ہیں [illegible] اور دوست
نظروں نظروں ہی میں گم ہوتے ہیں [illegible]
"کون لاسکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست"
آدمی بر حق اگر ہو ایک نہ ایک دن بالضرور!
آتی ہے دشمن میں بھی [illegible] دوست
بے نیازِ رنج و غم [illegible] بے نیازِ روزگار
مست رکھتی ہے ہمیں [illegible] یارِ دوست



# رواداری

اہل کشمیر کی ایک اہم قومی روایت رواداری کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے یہ واضح کرنا بیجا نہ ہوگا کہ کشمیریوں نے رواداری کے اُس منفی تصور کو اپنانے پر ہی قناعت نہیں کی جس کا ماحصل بس یہی کچھ ہے کہ مختلف خیالوں، نظریوں اور عقیدوں کے پیروکاروں کو ایک دوسرے سے اُلجھنا اور دست و گریبان نہیں ہونا چاہیے، ایک دوسرے کے معاملوں میں دخل اندازی سے پرہیز کیا جائے اور اپنی اپنی راہ پر چلتے ہوئے دوسروں کے عقائد کو بھی "برداشت" کیا جائے۔ مرنجان مرنج قسم کے منفی تصور سے مختلف نسلوں، مذہبوں اور عقیدوں کے ماننے والوں میں اگرچہ آویزش اور باہمی چپقلش کا اندیشہ تو باقی نہیں رہتا لیکن پھر بھی بیچ کی خلیج برابر منہ کھولے قائم رہتی ہے اور مغائرت کے پردے، دلوں کے میل سچائی بھلاء اور یگانگت میں حائل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس کی کو محسوس کر کے اہل کشمیر نے شعوری طور پر رواداری کے تصور کو ایک اثباتی تصور بنانے کی کامیاب کوشش کی۔ نسلی، مذہبی اور فکری اختلافات کو ایک طرف رکھ کر انہوں نے آگے بڑھ کر ایک دوسرے کا ہاتھ تھاما اور ایک دوسرے کو گلے لگایا۔ اس طرح ایک دوسرے کے دل کو ٹٹولنے، کچھ سیکھنے، کچھ سکھانے کا وہ عمل شروع کیا جس میں افضل اور اشرف قدریں قبولِ عام کی سند حاصل کر لیتی ہیں۔ اس عمل کی بدولت اہل کشمیر ایک ایسے ملے جلے کلچر کی بنیادیں استوار کر سکے جس کا ڈھانچہ مقامی مزدور ہے لیکن جس کا گوشت پوست اور رنگ روپ جانے کہاں کہاں کے خمیرے تیار ہوا ہے۔

[illegible]

کمل ذرائع کے اعتبار سے کشمیر اگرچہ ہمالہ کے سلسلہ ہائے کوہ سے گھرا ہوا ایک الگ تھلگ خطۂ ارضی دکھائی دیتا ہے لیکن ہندوستان کے شمال میں یہ سرحدی ریاست وسط ایشیا میں دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ علاقہ کی سرحدیں کئی ملکوں سے ملتی ہیں۔ پہاڑوں سے محصور ہونے کے باوجود زمانۂ قدیم سے تجارتی قافلے کشمیر سے ہو کر چینی ترکستان اور وسط ایشیا کو بھی جایا کرتے تھے اور چین، تبت اور دوسرے ممالک کو گلگت، سرینگر اور لداخ تو خاص طور پر ہندوستان کے بیرونی ممالک کے ساتھ تجارت میں FORWARD POSTS مانے جاتے تھے۔ اطراف و اکناف سے آئے ہوئے تجارتی قافلے یہیں اُترتے تھے اور تجارتی مال کا تبادلہ کرتے تھے۔ ظاہر ہے جہاں دیس دیس سے آئے ہوئے لوگ آکر مل جائیں۔ وہاں تجارت کے ساتھ ہی ساتھ خیالات و نظریات و دیگر ثقافتی قدروں کا تبادلہ بھی شروع ہو جاتا ہے اور تاجروں کے پیچھے پیچھے سیاحوں، جہاں گردوں، محققوں اور مورخوں کے قافلے بھی چل پڑتے ہیں۔ چینی سیاح اوکانگ، ہیون سانگ اور شہرۂ آفاق ابن بطوطہ جیسے جہاں گرد کشمیر کے راستے ہی سے ہندوستان آئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ آریوں کے ہندوستان میں داخل ہونے سے پہلے کشمیر میں ناگ قبیلوں کے لوگ رہتے تھے جو بظاہر کھیتی باڑی کے ہنر سے آگاہ تھے بلکہ بھیڑ بکریاں پال کر اور مچھلیاں پکڑ کر زندگی گزارتے تھے۔ ان کی بولی پشاچی تھی جبکہ سوں، جھیلوں دریاؤں کے علاوہ وہ خاص خاص قسم کے درختوں کو بھی پوجتے تھے۔ ان لوگوں کی معاشی زندگی کی جھلکیاں ہمیں ان کی ایک مقدس کتاب نیل مت پران سے ملتی ہیں جو خوش قسمتی سے زمانے کے دست برد سے بچتی بچاتی ہم تک پہنچ پائی ہے۔

جب آریوں نے ہندوستان میں داخل ہو کر سپت سندھو میں ڈیرے ڈال دیئے۔ تو کشمیر بھی آریوں کی یورش سے بچ نہ سکا۔ کچھ آریہ تو پنجاب اور اس کے نواحی علاقوں سے کشمیر میں داخل ہو گئے اور کچھ پامیر کی بلندیوں کو پھاند کر براہِ راست وسط ایشیا سے وادیٔ کشمیر میں پہنچ گئے۔ اور لداخ۔ بلتستان اور دردستان میں آباد ہو گئے۔

آریوں کا کشمیر میں وارد ہونا دو مختلف تہذیبوں کی شاید پہلی ٹکر تھی لیکن ایسا لگتا ہے کہ خوش قسمتی سے یہ ٹکر جنگ و جدل اور کشت و خون پر منتج نہ ہوئی بلکہ دونوں تہذیبوں نے آگے بڑھ کر ایک دوسرے کا ہاتھ تھاما۔ ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کی۔ ایک دوسرے کے دل میں جگہ پیدا کر لی۔

چونکہ آریوں کی ویدک تہذیب نسبتاً توانا تر تھی۔ اس میں نیاپن بھی تھا اور ترقی پسندی کے عناصر بھی۔ قدرتی طور پر یہ تہذیب ناگوں کی تہذیب پر حاوی ہو گئی۔ چنانچہ ناگوں نے ویدک دیوی دیوتاؤں کی پرستش شروع کر دی۔ گلہ بانی چھوڑ کھیتی

ماتمی کو اپنا [illegible] کو مذہبی کتاب بنا لیا گیا اور اپنی سماجی زندگی کی تنظیم بھی آریوں کی سماجی زندگی [illegible] لیکن اگر ناگوں نے آریوں سے بہت کچھ لیا تو آریوں نے بھی ناگ تمدن کی بہت سی باتیں قبول کر لیں [illegible] اور ضیاؤں کی پرستش اور ناگ پوجا کے علاوہ پشاچ [illegible] اور اس کے رسم الخط کے علاوہ بہت سے مقامی رسم و رواج آریوں نے قبول کر لئے جن کی شباہت آج تک کشمیریوں کے ریتی رواج میں ملتی ہے۔ رفتہ رفتہ نسلی اختلافات کی نشانیاں مٹ گئیں اور دو تمدنوں کے ادغام و امتزاج سے ایک نئی چیز ابھر آئی جسے ہم کشمیر کے مشترکہ تمدن کا نقش اول کہہ سکتے ہیں۔

پھر بدھ مت کے سیلاب نے سالم برصغیر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اولوالعزم اور حقیدت مند بودھ بھکشوؤں کا کشمیر میں بھی خیر مقدم کیا گیا۔ ان کے اپدیشوں کو جوش و ہوش سے سنا گیا۔ جو قائل ہوئے وہ بدھ مت اختیار کر بیٹھے جو زیادہ راسخ تھے اور برابر اپنے دھرم پر قائم رہے انہوں نے بھی بدھ مت کو عزت و احترام کی جگہ دی۔ اشوک اعظم کے عہد حکومت میں تو کشمیر اس شہنشاہ کی وسیع و عریض سلطنت کا ایک انگ بن گیا اور بودھ مت کو کشمیر میں خاصہ عروج حاصل ہوا۔ بدھ مت پہلا تبلیغی مذہب تھا جس سے اہل کشمیر کو دوچار ہونا پڑا تھا۔ لیکن کشمیر کے عوام اور حکمراں دونوں نے نہایت وسیع القلبی کے ساتھ اس نئے مذہب کا خیر مقدم کیا — رواداری کا عالم یہ تھا کہ ہندو بھی گوتم بدھ کو بھگوان وشنو کا اوتار مان کر دیگر ہندو دیوی دیوتاؤں کے ساتھ پوجنے لگے۔ کشمیر کی تواریخ میں جگہ جگہ اس کا ذکر ہے کہ ہندو حکمرانوں نے بہت سے بودھ وہار تعمیر کروائے اور ان وہاروں کے لئے سبا گریں مقرر کیں۔ کلہن اپنی راج ترنگنی میں لکھتے ہیں کہ راجہ ہرش ہندو دھرم کا پکا معتقد تھا لیکن اس کے باوجود وہ اور اس کے خاندان کے بھی افراد بلاناغہ ہندو دیوی دیوتاؤں کو پوجنے کے ساتھ ہی ساتھ بدھ وہاروں میں جا کر پرستش کیا کرتے تھے۔

کوشاں خاندان کے سب سے بڑے حکمراں کنشک کے عہد حکومت میں تو کشمیر بدھ مت کا ایک اہم ترین مرکز ہی بن کے رہ گیا۔ تخت نشین ہوتے ہی کنشک نے کشمیر کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا جس کا پایۂ تخت پرش پُر یا پشاور تھا۔ فتوحات کے ذریعہ کنشک نے مشرقی ترکستان، کاشغر، ختن اور یارقند کو بھی اپنی سلطنت میں ملا لیا اور شمالی ہند میں بنارس کے علاقے تک اپنی قلمرو میں شامل کر لئے۔ اتنی بڑی سلطنت میں — جہاں کئی ایک نسلی و لسانی گروپ اور کلچرل اکائیوں کو ایک ہی رشتے میں منسلک کر دیا گیا ہے، مختلف تمدنی تحریکوں کا ایک دوسرے سے متاثر ہونا ایک قدرتی بات ہے۔

اس عہد میں بدھ دھرم کے فلسفہ اور عمل میں پیدا ہوئے تضاد کو ختم کرنے کے لئے کشمیر میں ہی کنڈل ون کے مقام پر تیسری تبتی بودھ مجلس بلائی گئی جس کی نگران

[illegible] اور [illegible] یہ کشمیر [illegible] دھرم ایک محدود [illegible] کے باعث بدھ دھرم کی تبلیغ [illegible] نہ پایا کہ [illegible] سے آزاد [illegible] ہندو فلسفیوں نے اہم [illegible] کا حسین امتزاج کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

کنشک [illegible] فن تعمیر کا بھی بہت دلدادہ تھا [illegible] کے علاوہ اس نے کشمیر میں بھی بدھ وہار تعمیر کروائے اور [illegible] کے پاس کنشک پور (کانسپور) نام کا ایک شہر بسایا [illegible] وہ تمام خصوصیات شامل تھیں جن کو گاندھارا آرٹ [illegible] کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس طرح ادب اور فن کے نئے نئے [illegible] باب ہو گئے۔

بودھ اور ہندو تمدنوں کے اس [illegible] امتزاج کے متعلق ہیون سانگ اور اوکانگ رقمطراز ہیں۔

گو کشمیر کی سماجی زندگی کے مختلف شعبوں پر بدھ مت کی گہری چھاپ پڑی اور یہاں بدھ عبادت گاہیں اور عمارتیں پائی جاتی ہیں — لیکن اس کے باوجود بدھ مت اور شیومت آپس میں گھلے ملے ہوئے ہیں۔ ایک سو سے زائد بدھ خانقاہیں ایسی ہیں جن میں بدھ اور شیو دونوں کو پوجا جاتا ہے۔

چودھویں صدی کے آغاز میں کشمیری معاشرے کو ایک اور تمدن اور عقیدہ سے سابقہ پڑا جو بدھ مت کے برعکس ایک بیرونی ملک میں پروان چڑھ کر کشمیر آیا تھا۔ یہ عقیدہ تھا اسلام۔

ویسے تو مسلمان للتا دتیہ کتاپید کے عہد حکومت سے پہلے ہی کشمیر پہنچ گئے تھے کہا جاتا ہے کہ کشمیر کی سرزمین پر قدم رکھنے والا پہلا مسلمان حمیم بن سامع تھا جو سندھ کے حکمراں راجہ داہر کا ایک [illegible] محمد قاسم نے سندھ پر چڑھائی کی اور داہر کو شکست دے کر ہلاک کر ڈالا تو راجہ داہر کا بیٹا جیاسنگھ حمیم کے ساتھ بھاگ کر کشمیر میں پناہ گزین ہو گیا۔ حمیم کے کشمیر پہنچنے پر اور چودھویں صدی کے آغاز تک اکا دکا مسلمان کشمیر آتا رہا۔ لیکن [illegible] مسلم فتوحات کا سلسلہ جاری رہا [illegible] مسلمانوں نے [illegible] سے خالی کرا کے زیر نگیں کر لیا تھا۔ اور رفتہ رفتہ اسلام ہندوستان میں پھیل گیا۔ تاہم مسلمانوں کی [illegible]

[illegible] کشمیر میں بہت سے ہندو [illegible] تھے ہی اس وقت جب تبت سے آئے پناہ گزین [illegible] رینچن نے کشمیر کے تخت و تاج پر قبضہ جما لیا اور اسلام قبول کر کے سلطان صدر الدین [illegible] کہلایا اور جب کچھ ہی عرصے کے بعد سوات سے آئے ہوئے ایک مسلمان شاہ میرزا نے [illegible] اور کوٹہ رانی سے سلطنت چھین کر سلطان شمس الدین کے لقب سے تاج شاہی اپنے سر پر رکھا تو اس طرح سلاطین کشمیریاں کا سلسلہ شروع ہو گیا جنہوں نے [illegible] سے [illegible] تک حکومت کی۔

اسلامی سلطنت قائم ہوتے ہی مسلمان مبلغ جوق در جوق کشمیر پہنچنے لگے۔ ان میں علماء بھی تھے صوفی بھی۔ کشف و کرامات والے درویش بھی اور جنونی مولوی بھی۔ ان پہلے پہلے آنے والوں میں سہروردی سلسلے کے صوفی بھی شامل تھے اور وہ سادات بھی جن کو آزاد خیالی اور وسعت کے باعث تیمور شاہی نظام میں شک کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا اور جو تیموری عتاب سے بچنے کے لئے اپنا وطن چھوڑ کر کشمیر بھاگ آئے۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشت سید جلال الدین بخاری، سید تاج الدین، سید حسن سمنانی، امیر کبیر میر سید علی ہمدانی اور ان کے فرزند ارجمند میر محمد ہمدانی جیسی برگزیدہ ہستیاں اسی دور میں کشمیر آئیں۔ ان نو واردوں اور کشمیر میں رہنے والوں کا دینی عقیدہ مختلف تھا، زبان مختلف تھی، رہن سہن کھانا پینا اور لباس مختلف تھا اور انداز فکر و بیان بھی مختلف تھے۔ ظاہر کہ جہاں دو یکسر جداگانہ اور مختلف معاشرے تاریخی حادثہ کے باعث ایک دوسرے سے مل جائیں ابتدائی دور میں ان کے درمیان کشاکش پیدا ہونا کوئی انہونی سی بات نہیں ہے خاص کر جب دونوں فریق اپنے اپنے معاشرے کو عقیدے اور فلسفے کو افضل تر اور دوسرے سے فائق سمجھتے ہوں چنانچہ تبلیغ اسلام نے شدت اختیار کر لی جو ہندو اپنا مذہب ترک کرنے پر رضامند نہ ہوئے، انہیں ذمی قرار دیا گیا اور ان سے جزیہ وصول کیا جانے لگا۔ ردعمل کے طور پر بہت سے ہندو وطن چھوڑ کر چلے گئے، اور اس طرح دار و گیر کا ایک چکر چل پڑا۔ دین اور دھرم پر جب دنیاوی مفادات، مادی اغراض اور سیاسی مصلحتیں حاوی ہو جائیں تو قدرتی طور پر مذہب تلاش حق اور روحانی ترقی کے جادۂ مستقیم سے ہٹ کر مفاد خصوصی کا آلہ کار بن کر رہ جاتا ہے اور انسانی زندگی کے تاریک گوشوں کو حق و صداقت کے نور سے منور کرنے کے بجائے دین و مذہب تفرقہ و نزاع کا سرچشمہ بن کر رہ جاتا ہے لیکن چونکہ حقیقت لاکھ پردوں میں چھپانے پر بھی چھپ نہیں سکتی اور دیر سویر ہمیشہ حق کو باطل پر فتح لازمی ہے کشمیر میں بھی یہی کچھ ہوا اور دین کے نام پر بھڑکائی ہوئی آگ آہستہ آہستہ بجھ گئی۔

ہوا یوں کہ آبادی کا بہت سا حصہ اسلام تو قبول کر چکا تھا لیکن محض کلمہ پڑھ لینے سے اُن کے سارے طور طریقے انداز فکر اور خیالات بدل نہ پائے۔ وہ مشرف بہ اسلام ہوئے لیکن اپنے آبائی مذہب کی بہت سی باتیں ساتھ لے کر نتیجے کے طور پر کشمیر میں اسلام کا ایک نیا روپ ابھرنے لگا۔ جو اس کے عربی روپ سے قدرے مختلف تھا۔

آبادی کے اجزائے ترکیبی میں اس انقلاب کے باعث جنونی قسم کے مبلغوں کے تعصب کی دھار بھی کند ہونے لگی اور وہ بھی کثیر نومسلم آبادی کے جذبات سے متاثر ہونے لگے۔

چونکہ اسلامی حکومت کی جڑیں بھی دریں اثنا مضبوط ہو چکی تھیں حکمراں طبقہ کو بھی اب اس بات کی چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی کہ مذہب کو سیاست کا آلہ کار بنا دیا جائے۔

عرصہ تک ایک ساتھ رہنے کے باعث ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کی زبان بھی سیکھ لی اور ایک دوسرے کے خیالات سے بھی واقف ہو گئے، اس طرح تفہیم و مفاہمت کی راہیں کھل گئیں۔

سہروردی، نقشبندی اور قادری سلسلے کے صوفی بزرگوں کا جو گروہ کشمیر آیا اُن کے فلسفہ تصوف اور ویدانت اور بدھ مت میں بہت سی باتیں مماثل تھیں۔ ان عالم پایہ بزرگوں نے ہندو سنتوں اور بھکتوں سے راہ و رسم بڑھائی، خیالات کا تبادلہ کیا۔ جلد ہی ایک نہایت خوش گوار اور توانا تحریک شروع ہو گئی جس نے رواداری، یگانگت، پاکیزہ زندگی اور اخوت کی لافانی قندیلیں فروزاں کر دیں۔ اسی تحریک کی پیداوار ہے وہ رشی سلسلہ جس کی بناء پر کشمیر کو "رشیوں کی پھلواری" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جس کے بانی میاں لل عارفہ اور شیخ نورالدین ولی کو مانا جاتا ہے بلکہ بعض محققوں کا خیال ہے کہ رشی سلسلہ درحقیقت ایک بغاوت تھی جس کا پرچم رواداری کے کشمیری متوالوں نے تعصب، تنگ نظری اور انسان اور انسان میں تفرقہ روا رکھنے والوں کے خلاف بلند کیا۔ سکندر بت شکن جیسے متعصب اور سلطان نورالدین ولی جیسے صوفی کو شک اور ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھنا اس سلسلے میں ایک معنی خیز بات ہے۔

لیکن دار و گیر، کشت و خون اور مناقشات و منافرت کے ایک جاں گسل دور میں سے گزرنے کے بعد کشمیریوں کا اصلی کردار پھر اُبھر چکا تھا۔ اہل کشمیر نے اپنے مستقبل کی راہیں متعین کر لی تھیں چنانچہ وادی کے گوشے گوشے میں رشیوں نے اپنے اڈے جما کر صلح کل اور امن و آشتی کا پرچم بلند کیا۔ ایسے بزرگوں میں لل دید اور شیخ نورالدین کے علاوہ سید مہول، بابا نصیر الدین، روپہ بھوانی، بابا بام الدین، شیخ حمزہ مخدوم، پیر پنڈت پادشاہ مشکل کشائے ہر دو جہاں، ریشہ پیر، بابا زین الدین، بابا شکر الدین، بابا لطیف الدین اور کئی اور اولیا کے نام قابل ذکر ہیں۔

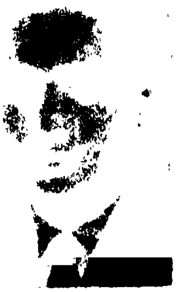
ایسے ہی ماحول میں سلطان علی شاہ کے جانشین شاہی خان نے آنکھ کھولی جو بعد میں سلطان زین العابدین کے نام نامی سے تخت نشین ہوئے۔ تخت نشین ہوتے ہی بڈشاہ نے مذہب کی بناء پر رعایا کے مختلف فرقوں کے درمیان امتیاز برتنے کی پالیسی ترک کر دی۔ جزیہ وصول کرنے کی بدعت ختم کی۔ گاؤکشی ممنوع قرار دے کر ہندو رعایا کے مذہبی احساسات کی تشفی کی جو ہندو اس کے باپ دادا کے عہد حکومت میں وطن چھوڑنے

پرمجبور ہوگئے تھے ان کو واپس بلالیا اور ہندوؤں کے مذہبی رسوم پر لگی ہوئی پابندیاں ہٹالیں۔ تصوف اور بھکتی مارگ پر چلنے والے لوگوں اور ان کے طرزِ عمل کی حوصلہ افزائی شروع کردی۔ سلطان زین العابدین ایک ایسا فرمانروا تھا جس نے اپنی رعایا کی زبان کشمیری نہ صرف خود سیکھی بلکہ اس میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی شروع کروایا۔ مختلف فرقوں کو ایک دوسرے کے قریب تر لانے کی غرض سے فارسی کی بہت سی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کروایا۔ خود بھی بادشاہ کو سنسکرت پر اچھا عبور حاصل تھا اور سلطان اکثر یوگ وششٹ اور دیگر مقدس ہندو گرنتھوں کی تفسیریں ہندو عالموں سے سنا کرتے تھے۔ ہندو، بودھ اور جین تیوہاروں میں سلطان خود بھی شریک ہوتے تھے اور ایسے موقعوں پر یاتریوں کو سرکار کی طرف سے کھانا مفت تقسیم کیا جاتا۔ اس منصف مزاج سلطان نے رعایا کی سود و بہبود کے لئے دست کاریوں کو نہ صرف فروغ دیا بلکہ بیرونی ممالک سے ماہر کاریگر منگوا کر قالین بافی، پیپر ماشی جیسی دست کاریوں کی بھی ترویج کی۔ زراعت کی ترقی کے لئے نہریں کھدوائیں۔ کئی قسم کے پھلدار درخت باہر سے منگوا کر کشمیر میں لگائے۔ علم و ادب کو فروغ دینے کے ساتھ ہی فنِ تعمیر کو بھی بڑھاوا دیا۔ نوشہر میں عالی شان عمارتوں کا ایک محلہ تعمیر کیا اس میں سلطان نے محل سرا اور محلات دربار بھی تعمیر کرائے جس کو زینہ دب یا راز دانی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ زینہ گیر، زینہ پور، زینہ کوٹ اور دیگر بہت سے مقامات آباد کئے۔

بڈشاہی دور کو کشمیر کے مرکب تمدن کے ارتقاء میں ایک سنگ میل مانا جاتا ہے کیونکہ یہی وہ زمانہ ہے جب نفاق و تعصب کے بیرونی اثرات کے خلاف اہلِ کشمیر کی بغاوت واضح طور پر سامنے آئی اور اہلِ کشمیر نے بھائی چارۂ یگانگت، رواداری اور امن و آشتی کا نیا شوالہ تعمیر کرنے کی کوشش شروع کی۔ اس کوشش کو کامیاب بنانے میں کشمیری زبان نے گاڑی کے پہیوں کا کام سرانجام دیا۔ کشمیری ادیبوں اور شاعروں نے اسی عوامی زبان میں صلح جوئی، امن و آشتی اور میل ملاپ کے لافانی گیت گائے۔ رہن سہن میں، لباس و سنگھار میں، تفریح اور شادی غمی کے رسوم کے معاملے میں دونوں فرقے ایک ہو گئے۔ اندازِ فکر میں یکسانیت پیدا ہوگئی، اور دین کی حقیقی روح کو ذہن نشین کرکے ہندوؤں اور مسلمانوں نے پہلو بہ پہلو عبادت گاہیں تعمیر کیں۔

گو بڈشاہ کے بعد سلطان حیدر شاہ کے عہدِ حکومت میں اور پھر افغانوں کی ہولناک حکمرانی کے دوران اتحاد و اتفاق کی اس تحریک کو ختم کرنے کی کئی بار کوشش ہوئیں لیکن انتہائی مظالم برداشت کرنے کے باوجود کشمیریوں کو جادۂ مستقیم سے ہٹایا نہ جاسکا۔ اس کے بعد بھی سکھا شاہی کے ایام میں اور پھر برطانوی سامراج کے دوران کشمیریوں کو فرقوں کی خانہ بندی میں تقسیم کرنے کی ریشہ دوانیاں جاری رہیں چنانچہ اپنا الو سیدھا کرنے کے لئے برطانوی ہند کے پولیٹیکل آفس اور کشمیر کے کچھ انگریز [illegible] نے DEVIL AND ROSE [illegible] ہو گئیں ان کے حلقے میں دیکھے۔

[illegible] میں کشمیر [illegible] انتہائی ہیجانی دور میں بھی [illegible] کو وحشت اور بربریت کے ان [illegible] ملک کے [illegible] کیا تھا۔



جو مجھ کو چھوڑنے کل رات گھر تک آئے تھے
مجھے خبر ہے وہ رسوائیوں کے سائے تھے
چمن کے گرد جو مجھ کو دکھائی دیتے ہیں
یہ قافلے بھی تو صحرا سے ہو کے آئے تھے
تمہارے آتے ہی سب روشنی میں ڈوب گئے
مرے قریب ابھی بے شمار سائے تھے
تمہارے پاؤں کے کانٹے نکال دوں آؤ
مگر یہ راہ میں کس کے لئے بچھائے تھے
اب اور چھائیں گھٹائیں تو دور جام چلے
برس کے کھل گئے بادل جو گھر کے آئے تھے
تمہیں کو اب مری بے باکیوں کا شکوہ ہے
کبھی تمہیں نے مرے حوصلے بڑھائے تھے
زمانے بھر کی تو باتیں پڑوسیوں سے ہوئیں
کسی نے یہ نہ بتایا کہ آپ آئے تھے
انہیں بھی راہ نماؤں کو سونپ آیا ہوں
جو راستے کبھی اپنے لئے بنائے تھے
نہ تھا یقین جو تم کو کسی کے آنے کا
تو پھر یہ پھول شبستاں میں کیوں سجائے تھے

# غزلیں

## پیام فتحپوری

غمِ حیات پہ اک نو بہ نو نکھار آیا
نصیبِ عشق ، ترا غم بھی سازگار آیا

وہ وحشتِ عشق ہو صحرائے غم کہ مقتل ہو
ہمیں حیات کی ہر اک ادا پہ پیار آیا

جنوں کی رسم چلی ، ہر طرف چراغ جلاؤ
مناؤ جشن کہ پھر عشق سوئے دار آیا

مژہ سے پھول برستے ہیں آج دامن میں
غمِ حبیب ہے یا موسمِ بہار آیا

جو بوالہوس تھے وہی جان و دل بچا کے چلے
میں انجمن میں تری زندگی بھی ہار آیا

ہمارے ایک تبسم سے کھا گیا ہے شکست
کبھی قریب اگر رنجِ روزگار آیا

فسانہ تھا مری بربادیوں کا محفل میں
خبر نہیں ترا کیوں نام بار بار آیا

ہزار غم تھے پہ احساسِ بے کسی تو نہ تھا
میں رو پڑا جو کوئی یارِ غمگسار آیا

پیامؔ عشق میں جینا تو راس آ ہی گیا
ہم اہلِ عشق کو مرنا بھی سازگار آیا

## شاہد ماہلی

رگ رگ میں میری پھیل گیا ہے یہ کیسا زہر
کیوں ڈوبنے لگا ہے دھندلکوں میں سارا شہر

مجھ کو جھنجھوڑ دیتی ہیں لمحوں کی آہٹیں
اُٹھتی ہے میرے جسم میں اک بے بسی کی لہر

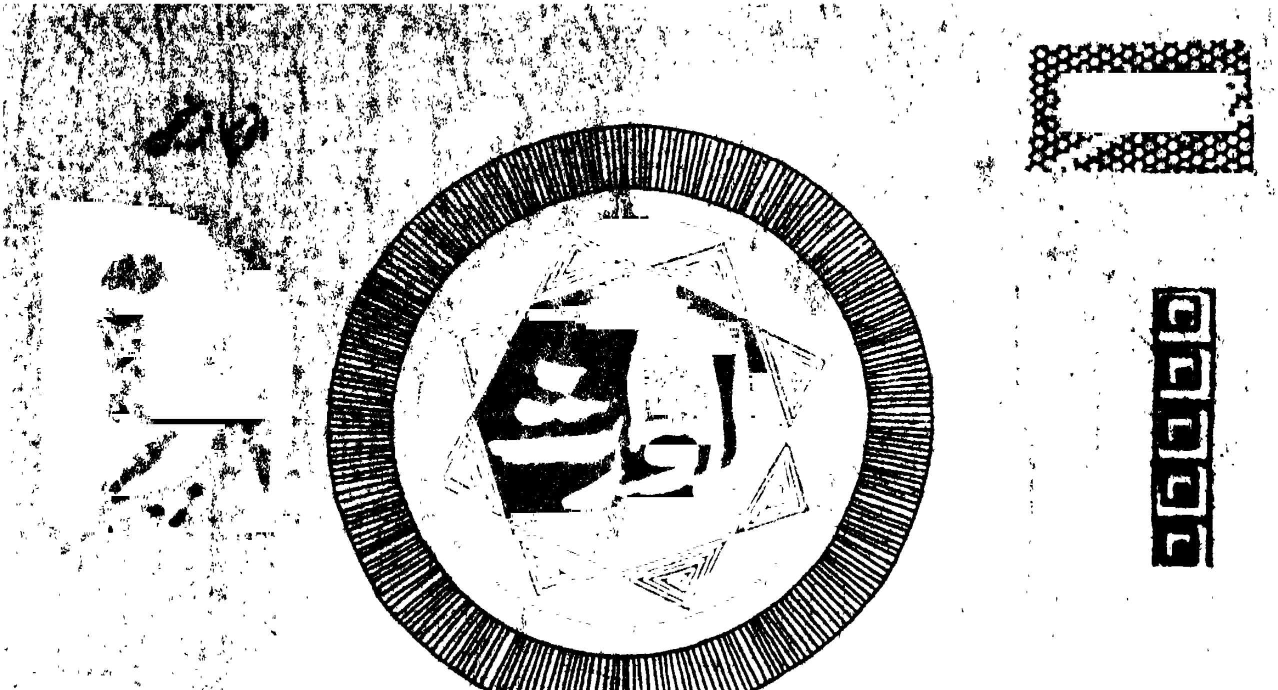
یہ شب مرے وجود پہ یوں ٹوٹ پڑتی ہے
جیسے کوئی بلا ہو کہ آسیب ہو کہ قہر

پھوٹا نہ مدتوں سے کوئی چشمۂ اُمید
سوکھی پڑی ہوئی ہے مری خواہشوں کی نہر

چہرے پہ وقت کی میں سیاہی ملا کروں
مجھ کو یہی ملا ہے مشیت سے کارِ دہر

## نصیر پرواز

آنکھوں میں اضطراب کا منظر نہ پھینکیے
موجیں خموش ہیں کوئی کنکر نہ پھینکیے
مانا کہ آپ کو بھی غمِ تشنگی نہیں!
اوروں کی طرح ہاتھوں سے ساغر نہ پھینکیے
چہرے کو نفرتوں کا لبادہ اُڑھائیے
مجھ کو یقیں کی غار میں ہنس کر نہ پھینکیے
اجزائے ذوق و شوق کہاں منتشر ہوئے
خاکِ خودی میں مجھ کو مکرر نہ پھینکیے
پھر گھر میں گھس پڑے گا ہوا تیز گر چلی
لوؤں کا خوف گھر کے برابر نہ پھینکیے
کچھ تو خیال کیجیے اُجلے لباس کا
کیچڑ میں نیک نامی کا پتھر نہ پھینکیے
مانا کہ زندگی کا الم لازوال ہے
رسوائیاں حیات کی گھر گھر نہ پھینکیے
رقصاں گلی گلی ہیں اندھیروں کی تلخیاں
یہ روشنی شعور کے اندر نہ پھینکیے
حیرت میں پڑ گیا ہے میرا خوابِ آگہی
دریائے دل میں غم کا سمندر نہ پھینکیے
جسموں کے ہر کتاب رہی لذتِ گناہ
روحوں پہ تو عذاب کا محشر نہ پھینکیے
بچپن کے چند ٹوٹے کھلونوں کو دیکھ کر
کہتے ہیں دوست ہے یہی بہتر نہ پھینکیے
بے نام خواہشیں جو ازل سے خموش ہیں
گھبرا کے ان کو ذہن کے باہر نہ پھینکیے
بھرنے لگے ہیں پھر مری بے چارگی کے زخم
حاضر ہے پھر بدن مرا نشتر نہ پھینکیے
پروازؔ گھل نہ جائے پشیمانیوں کا زہر
اس روشنی میں جسم سے چادر نہ پھینکیے



" آخر سویرا ہوا" نرس سندراما کی زبان سے نکلا۔ ہاں صبح ہوئی، ہلکا اُجالا برف کے پتلے پردے کے اندر سے جھانکتا ہوا کھیل رہا تھا۔ ہاسپٹل کے آنگن کے فوارے سے کمان کی طرح پانی اونچائی تک اڑ کر نیچے گر رہا تھا۔ وہ پانی آس پاس ہریالی پر گلاب چھڑک کر سوئے ہوئے پھولوں کو جگا رہا تھا۔ پھولوں کی پنکھڑیاں ننھے بچوں کی آنکھوں کی طرح ڈرتے ڈرتے کھل رہی تھیں۔ سفید، لال، پیلے پھولوں سے بھری رنگ برنگی دنیا کو نرس اپنی نیند بھری آنکھوں سے دیکھنے لگی۔

یکایک اس کے پاس ایک سفید بادل آیا، وہ بادل نہیں تھا، سفید ساری تھی۔ وہ پاس والے وارڈ کی نرس شاردا تھی۔

" اوہ ہو، کیا سویرا ہو گیا؟" بیماروں کا ٹمپریچر دیکھنے کے لئے شاردا پاس کے وارڈ میں چلی گئی۔ بالٹی کی کھڑکھن کے ساتھ آواز آئی۔ " نرس ماں، کافی " وہ ہاسپٹل کا ملازم تھا اور بیماروں کے لئے صبح کی کافی لایا تھا۔ کونے والے نل سے پانی بہہ رہا تھا۔ جمائی لیتے ہوئے ایک ایک کر کے سب بیمار جاگ اٹھے" اماں، نرس ماں، کہہ کر کوئی عورت زچگی کے وارڈ میں تڑپ رہی تھی۔

سندراما زچگی کے وارڈ کے دروازے کے پاس ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ آدھی سوئی اور آدھی جاگتی ہوئی اپنا کام ختم کر کے آتی ہوئی شاردا سندراما کو ہلا کر پوچھنے لگی؟ "کیوں ری رات کو سوئی نہیں کیا؟"

سندراما نے آنکھیں کھولدیں۔ بھنویں سکوڑ کر چڑچڑاہٹ سے اس نے جواب دیا۔ "نیند! کہاں ہے نیند! یہ بولنا [illegible] کر کیسے سو سکتی ہوں؟"

سننے والی کے سینے سے ہمدردی کا دریا بہہ نکلا۔ "ہائے! کیا وہ مر گئی؟"

شاردا سے ہمدردی کے بول سن کر غصہ پر قابو پاتے ہوئے سندراما نے دھیمے سے جواب دیا۔ صبح کے تین بجے۔ نہ جانے سینچر کا سایہ کیسے پڑ گیا۔ [illegible] بھر رات کی ڈیوٹی پر لگی رہی، کوئی نہیں مرا، لیکن ڈیوٹی کی [illegible] بات ؟"

نوزائیدہ بچی زور سے رونے لگی۔ رونے [illegible] وہ بھی [illegible] رہی رات جاگی ہوئی سندراما اپنے من ہی من کہہ رہی تھی۔ "نرس کو بے بس ہونے دو۔ تم یہیں بیٹھی رہو۔"

وہ پھر اونگھنے لگی، بچی اور بھی زور سے رونے لگی۔ غصہ سے اٹھ کر سندراما پالنے کے پاس آئی، زور سے جھلانے لگی۔ آنکھیں بند کئے لیٹی بچی کے منہ پر اُجالا ناچنے لگا۔

بچی بہت سندر تھی۔ لیکن پیدا ہوتے ہی اس نے [illegible] تھا ایک لمحے کے لئے سندراما کے من [illegible] پسیج [illegible]

پالنے سے تھوڑی دور پر اس کی ماں [illegible] ہوئے اس کے منہ پر سفید چادر اوڑھا دی گئی تھی۔ اس بے جان جسم کو دیکھ کر سندراما کا جسم کانپ اٹھا۔ رونگٹے کھڑے ہو گئے [illegible] سے چیخنے لگی۔

" شاردا اس [illegible] کا پتہ [illegible]"

پتہ لینے کے بے شمار دا چلی گئی۔ سندر اما کی نظر باہر آنگن میں کھلے پھولوں کی جانب گئی۔ ایک سرخ پھول کے پاس ہی ایک اور پھول کھلنے کے بعد مرجھا گیا تھا اور زمین کی طرف جھک گیا تھا۔

سندر اما نے "ہوں" کہتے ہوئے سانس چھوڑی۔

پیچھے سے شاردا نے کہا "پتہ نہیں ہے سسٹر، مریض کے لوگوں نے پتہ نہیں دیا ہے۔"

"یہ عجیب بات ہے کیا اس کا کوئی نہیں ہے؟ — بچی، ماں، باپ، دوست کیا کوئی نہیں تھا؟" اس طرح کے بے شمار سوالات اس کے ذہن میں اُبھرے۔

سات بج گئے۔ صبح کی ڈیوٹی کی نرس آ پہنچی۔

"دیکھو بہن ایک مریض مر چکا ہے، پتہ نہیں کہاں کا ہے؟ ڈاکٹر کے آتے ہی بتا دینا — اس وارڈ کی میری ذمہ داری ختم ہوئی، اب میں چلی" کہتے ہوئے سندر اما وارڈ کے باہر آئی۔

نامعلوم کیوں اس کا من اُداس تھا۔ "تیرا من پتھر کی مانند کٹھور ہے" — اکثر اس کی سہیلیاں کہا کرتی تھیں۔ اس نے کئی مریضوں کو مرتے دیکھا تھا۔ سکرات کے کرب کے بعد مریض دم توڑتا تو اس کو لگتا کہ یہ اچھا ہوا اس کی جان چھوٹی۔

تیسرے دن وہ دوسرے وارڈ میں گئی۔ ایک بار سارے وارڈ کو دیکھ کر اس نے فخر سے کہا تھا "ٹھیک ہے" — وہ وارڈ زچگی کے بعد ماں بچہ کی دیکھ ریکھ کا تھا۔ وارڈ کے دونوں طرف پندرہ پندرہ پلنگ تھے۔ ان بستروں پر صاف چادر اوڑھے بچوں کی دنیا میں اپنے کو بھلا کر سوئی ہوئی مائیں تھیں۔ ان کے پیروں کے پاس ہی بیڈ سے لگے پالنے تھے۔ اِن پالنوں میں روتے، ہنستے، کھیلتے کھیلتے سوئے ہوئے ننھے ننھے بچے تھے۔ یہ پالنے اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر جھول رہے تھے ایسا لگتا تھا مانو روتے ہوئے بچوں کو لوری سُنائی جا رہی ہے۔

اس کو دیکھتے ہوئے سندر اما کی نظر آخری پالنے پر گئی جس کے قریب کوئی بیڈ نہیں تھا۔ تعجب سے وہ اس کے قریب گئی اور جھانکنے لگی۔ ایک ننھی بچی مست سو رہی تھی۔ اس وارڈ کی پچھلے مہینے والی نرس سندر اما کو چارج دے کر جانے والی تھی۔ اس سے سندر اما نے پوچھا "یہ کس کی بچی ہے؟"

اُس نے جواب دیا "یہ ہاسپٹل بے بی ہے اس کی ماں مر چکی ہے۔ دیکھو بہن اس کے بعد اس بچی کی دیکھ ریکھ تمہارے ہاتھ میں ہے، اس بات کو آپ سے کہنے کے لئے ڈاکٹر نے کہا تھا۔"

سندر اما نے بے چینی سے ناک سکوڑی۔ بار بار اس بچی کو دیکھا اُسے یاد آگیا۔ لیبر وارڈ میں پڑا ہوا مردہ، رونے والا بچہ۔

"شاردا اس مریض کا پتہ لادو۔"

"پتہ نہیں ہے سسٹر، مریض کے لوگوں نے پتہ نہیں لکھوایا تھا۔"

کیا یہ وہی بچی ہے؟

"کاشی یاترا کے بعد بھی سنیچر کا سایہ دُور نہیں ہوا . . . ." اس طرح کہتی ہوئی سندر اما وہیں رہ گئی۔

وارڈ سے تقریباً ملا ہوا رتن گندھ کا پیڑ تھا۔ ڈال ڈال کھل کر مسکراتے ہوئے پیلے پیلے پھولوں سے لدی ہوئی تھی۔ ہوا کے جھونکے کے ساتھ ہی سارا پیڑ ایک ساتھ مسکرا اٹھتا اور پھولوں کی بارش ہونے لگتی۔

وارڈ کی کھڑکیوں کی راہ سے ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ہی پھول اور روشنی اندر آ جاتے۔ جب کبھی پھول بچوں پر پڑتے، مائیں اُن کو ہٹا دیتیں۔ مگر زیادہ تر پھول اس اکیلے پالنے پر ہی گرا کرتے تھے۔ اس وقت بچی رونے لگی۔ اس وقت راگ اور سُر ملانے کے لئے دوسرے بچے بھی اپنے مختلف ساز بجانے لگے۔

سندر اما وارڈ میں تھی۔ بچوں کا رونا سنتے ہی غصہ میں آگئی۔ "کیا کر رہی ہو بچوں کو خاموش کراؤ" وہ چلائی۔

مائیں ہوشیار ہو کر اپنے بچوں کو سمجھانے لگیں۔ ایک گاؤں کی عورت اپنے قریب کے بستر پر لیٹی ہوئی دوسری عورت سے کانا پھوسی کرنے لگی۔ "یہ نرس بہت جلنے والی ہے۔"

مگر رونے کی آوازیں نہ رکیں۔ یہ دیکھ کر سندر اما اُٹھ کر چلی آئی۔

"کون رو رہا ہے، کس کا بچہ ہے۔ میری آواز سے نہیں ڈرنے والا بچہ کون ہے۔"

وہ چلتی ہوئی آئی اور آخری پالنے کے پاس رک گئی۔ "ابا! کتنی ہمت ہے لڑکی کی" — اس بچی پر اس کو بے حد غصہ آیا۔ روتی ہوئی بچی کو وہ اپنے کھردرے ہاتھ سے تھپکنے لگی۔ اس کے جواب میں بچی چیخنے لگی۔ ایک ماں نے جو لیٹی ہوئی تھی دھیرے سے کہا "نرس ماں، گود میں لے لو۔"

سندر اما آپے سے باہر ہو گئی اور غصہ سے اس نے کہا۔

"چپ، سو جا"۔ اس یتیم بچی کی طرف اس کی بے مروتی کو دیکھ کر وارڈ کی سبھی مائیں مایوس ہو گئیں۔ بچی روتے روتے تھک کر سو گئی۔ تب ایک ماں نے کہا۔

"تو جیسے بچی کو کوکھ میں لئے ہوتی تو پتہ چلتا!"

دوسری نے کہا "یتیم بچی ہائے افسوس، یتیم بچی۔"

سندر اما اسی طرح کھڑی رہی گویا اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔ نہ چاہنے پر بھی یہ آواز اس کے کانوں میں پڑی تھی جو نہ مٹنے والی کسک چھوڑ گئی۔

کام ختم ہوا، سانجھ آئی اور رات بھی آگئی لیکن دن کو سنی ہوئی بات کیڑے کی طرح اس کے من کو کرمینے لگی۔ اس رات اس کو بہت دیر تک نیند نہیں آئی۔
بیاہ اور بچوں سے اس کو اتنی نفرت تھی اس طرح اس نے پچیس برس بتا دیئے تھے۔ یہ بھی ایک زندگی تھی! — اس طرح سوچتے ہوئے اس کی آنکھ لگ گئی۔

دن بیت گئے۔ بچی کو نہلانا، کپڑے پہنانا، پالنے میں سلانا اور جھلانا، سب کام اس کی قسمت میں لکھا ہوا تھا۔ پہلے دو دن کا کام میکانکی انداز میں پیدا ہو گیا تھا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ وارڈ میں آتے ہی ایک لمحہ کے لئے سُندر آما پالنے کے پاس کھڑی ہو گئی۔ آنکھ پھاڑ کر دیکھتی ہوئی بچی مسکرا رہی تھی۔ وہ مسکراہٹ چاندنی کی طرح تھی۔ اس کے گالوں میں گڑھا پڑ رہا تھا۔ سیاہ آنکھیں، گھنگھریالے بال — من کے تاروں کو کسی نے چھیڑ دیا۔
بچی کو سُندر آما نے گود میں لے لیا۔ بچی کا ہاتھ اس کے سینے پر کھیل رہا تھا۔ اس کا ننھا کسی چیز کی تلاش کر رہا تھا۔ بچی کے اس عمل سے سُندر آما کو ایک عجیب انجانا تجربہ ہو رہا تھا۔ پھر بھی اپنی ہار کو چھپانے کے لئے سُندر آما سب پر خفا ہوئی۔
"آج مجھے کیا ہوا ہے؟" اس بات کو سوچ کر وہ اپنے آپ کو کوسنے لگی۔
اس نے اپنے آپ کو مضبوط کر سا لیکن پھر بھی ہار اس کی تھی۔
ایک دن سُندر آما بچی کو کھلا رہی تھی۔ اتنے میں کسی کی پکار سُنائی دی۔ گھبرا کر سُندر آما نے بچی کو پالنے میں لٹا دیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کسی اجنبی کی نگاہ اس پر اس کی ایسی حالت میں پڑے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اسے کسی نے نہیں پکارا تھا۔ وہ اس کے من کا واہمہ تھا۔
دوسروں کی آنکھ بچا کر بچی کو پیار کرنے والی کو خود پر غصہ آتا اس سے اس کا منھ سرخ ہو جاتا۔
"کیا میں اس ننھی بچی کی داسی ہوں" ایک لمحہ کے لئے اس خیال نے اس کے من کو ٹھیس پہونچائی۔
"اس بچی کو میں کبھی پیار نہیں کرتی" سُندر آما نے اپنے من میں فیصلہ کر لیا۔ اپنے اس خیال کو تقویت دینے کے لئے بچی کے گال میں چھونے کے لئے اپنا ہاتھ اس کی طرف لے گئی۔ آگے بڑھی ہوئی انگلیاں دھیمے سے بچی کے گال تھپتھپانے لگیں۔
بچی روئی نہیں مسکرانے لگی۔
اپنی اس غیر یقینی حالت سے بچنے کے لئے کام کا بہانہ کر وہ وہاں سے چل دی۔

پھر [illegible] اس [illegible] چھلکنے لگی۔
اس بچی سے سُندر آما کو پیار [illegible] پھلنے سے پھل برس رہے [illegible] لگیں اب وہ بچی کا ہونا سہہ نہیں [illegible] تھی . . .
وہ پیاری بچی ہاسپٹل میں ایک تماشہ [illegible] دیکھنے کے لئے دوسرے وارڈوں سے نرسیں آیا کرتی تھیں۔ کوئی اسے [illegible] تو سُندر آما اُسے زور سے ڈانٹتی "اس کو چھوڑ دو۔"
"نہایت خستہ ورثے کے نام سے مشہور سُندر آما کے حکم کی کوئی خلاف ورزی نہیں کر سکتا تھا پھر بھی کوئی ایک نرس پوچھ جاتی "[illegible]" ایسے کیوں کہہ رہی ہو؟ کیا بچی کا نام نہیں رکھا گیا سُندر آما؟"
بچی کا نام رکھنے کا حق اس کا ہے یہ سن کر سُندر آما کو بے حد خوشی ہوئی
"نام کیوں نہیں ہے؟ ہاسپٹل بے بی کا میں نے نام رکھا ہے جوہی۔ دیکھو تو سہی اس کا دہانہ کلی کی طرح ہے کہ نہیں۔"
ایک نرس نے مسکراتے ہوئے اس کو چھیڑا "کیا سچ مچ جوہی ہے؟"
"ہاں یقیناً اس کا نام 'جوہی' ہی ہے۔"
اس کے بعد بھی وہ سب بچی کے نئے نئے نام تجویز کرنے لگیں جن کو سن کر اس کے غصہ کا پارہ چڑھ گیا اور اس نے کہا "بس چلو جاؤ۔ بچی کا نام رکھنے کا حق میرا ہے۔ بچی کو پالنے والی میں ہوں، تم نہیں۔"
سُندر آما نے بچی کے کپڑے سلانے کے لئے سوچا۔ بچی مسکرائی۔ مانو اس اس کو اس بات کا پتہ چل گیا۔ بڑی ڈاکٹر نے ایک دن بچی کا سادہ فراک دیکھ کر کہا تھا: "گھر میں ریشم کے دو ایک ٹکڑے ہیں۔ بھیج دیتی ہوں، بچی کو فراک سلا کر پہنا دو۔"
سُندر آما نے ان کپڑوں کو بھی سلا لیا۔ اس سے اُسے تسلی نہیں ہوئی اپنے پاس جو روپیہ تھا اس میں سے کچھ روپے لے کر بچی کے سوئٹر کے لئے اون لانے کے لئے سُندر آما دکان گئی۔ گلابی رنگ کا اون اس کو پسند آیا۔ وہ رنگ بچی پر کھلتا تھا۔ گلابی سوئٹر پہنی ہوئی بچی کا تصور کرتی ہوئی اس نے اون خرید لیا۔ بچی کا سوئٹر تیار ہو گیا۔ ایک نرس نے [illegible] کا ایک فراک لا دیا۔ اسی طرح سے ایک ماں نے جو وارڈ میں تھی [illegible] کا ایک ڈبہ دیا اور کہا کہ یہ

ہاسپٹل بنا دینے کے لئے ہے۔" وہاں سندرا کو پسند نہیں تھا مگر بچی کے سکھ کے پیش نظر اس نے پہلے سے انکار نہیں کیا۔ بچی کی چیزیں دن بدن بڑھنے لگیں۔ دواؤں کی بڑی الماری کا ایک حصہ اس کے لئے کافی نہیں رہا تھا۔

"بچی گول مٹول ہو تیار ہو گئی تھی اپنے دبلے پتلے بچے کا موازنہ کرتے ہوئے ایک دائی نے کہا تھا ماں نہ رہنے پر بھی یہ بچی کتنی تندرست ہے۔" اس بات کو سن کر سندرا آنا شیشے کی طرح بکھر گئی "چپ رہو نظر نہ لگا۔"

مہینہ بیت رہا تھا۔ ڈیوٹی کا آخری دن قریب آ رہا تھا۔ سندرا آنا کے من میں ہلچل مچنے لگی۔ کوکھ میں نہ معلوم کیوں درد کی ٹیسیں اُٹھنے لگیں۔ مگر کو وہ سنبھل چکی تھی اپنے درد کو چھپانے کے لئے اس نے غصے کا سوانگ رچا لیا۔ ہر دن سے زیادہ وہ مریضوں پر غصہ کرنے لگی۔ اگلے مہینے اُسے دوسرے وارڈ میں جانا تھا۔ پیاری جوہی، جس کو اس نے جتن سے پالا تھا۔ اب میں اُسے پیار نہیں کر سکتی۔ کھلا نہیں سکتی۔ کل سے میں اجنبی ہوں، یہاں دوسرے وارڈ کی نرس آ جائے گی۔ اس خیال سے وہ کانپ گئی۔

اتنے سال میں اکیلی رہی اس کے بعد میں کیوں اکیلی نہیں رہ سکتی۔ اس بچی کو بھولنا کون بڑی بات ہے؟

مگر وہ جہاں بھی بیٹھتی اس کے سامنے بچی کی تصویر گھومنے لگتی۔ وہ کسی بھی بچے کے رونے کی آواز سنتی تو لگتا کہ جوہی رو رہی ہے۔ من میں بچی کے کھیلوں کا تصور آتا۔

"نہیں میں اسے کبھی نہیں بھول سکتی۔" سندرا آنا سے کھانا نہیں کھایا گیا۔ رات میں نیند تک اس کے پاس نہیں پھٹکی۔

آخر وہ دن بھی آ گیا۔ سندرا آنا سینہ میں جذبات کا طوفان چھپائے اس پالنے کے پاس آ کر رک گئی۔

معصوم جوہی منہ میں انگلی لئے روشنی کو تک رہی تھی۔ بچی کو اس حالت میں دیکھ کر اس کے من میں دکھ اُمڈ آیا، آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"اب تک میں اس بچی کی ماں بنی تھی آج سے جوہی یتیم ہو گئی۔" پالنے پر ہاتھ رکھ کر سندرا آنا وہیں کھڑی ہو گئی۔ اُسے ایسا لگا مانو اس کے سینے میں دھڑکن سدا کے لئے رک گئی ہو۔ سنسار کے سارے کاروبار سدا کے لئے رک گئے ہوں۔

نہ معلوم اس طرح کتنا سمے بیت گیا۔ سندرا آنا سنبھل کر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ہوئی بڑے ڈاکٹر کے کمرے کی اور چلی۔ سوکھے ہونٹوں کو تر کرتی ہوئی سندرا آنا نے کہا

"ڈاکٹر! اس ہاسپٹل سے بچی کو مجھے دیدو، میں اسے پال کر بڑا کروں گی۔"

ڈاکٹر کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔ وہ غیر یقینی سے ایک لمحے کے لئے سندرا آنا کو دیکھتی رہیں اور پھر اُن کے ہونٹوں پر دھیمی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ (ترجمہ: اعجاز الدین فیروز)

# غزل

## (نذرِ غالب)

مکاں میں قید ہیں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
عجیب لوگ ہیں بس اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

کوئی تو آشنا چہرہ نظر سے گزرے گا
ہم اپنے شہر کی ہر رہ گزر کو دیکھتے ہیں

نہ قافلوں کا پتہ ہے نہ دشت و صحرا ہیں
ہے گرد چار طرف ہم جدھر کو دیکھتے ہیں

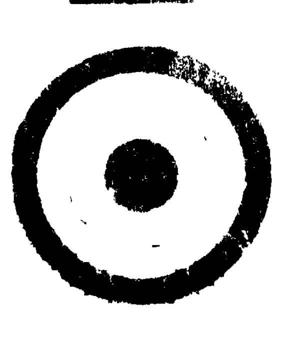
کسی کے منتظر وہ بھی تو ہیں ہماری طرح
ہم اپنی راہ کے ہر اک شجر کو دیکھتے ہیں

سفر طویل ہے دشتِ وفا ہے اور تو ہے
ہم ایک بار تجھے پھر سفر کو دیکھتے ہیں

ہمارے واسطے نکلے گا آفتاب نیا
یہ سب سے پہلے ہم اٹھ کر سحر کو دیکھتے ہیں

جعفر عسکری

محمود علی



# کا جدید طریقۂ تعلیم

گزشتہ سال جون جولائی میں ایک سمینار منعقد ہوا تھا جس میں پرائمری، سیکنڈری اور ٹیچرس ٹریننگ اسکولوں کے اساتذہ اور محکمۂ تعلیم کے سائنس سے متعلق افسران کو سائنس پڑھانے کے جدید طریقوں کی تربیت دی گئی۔ اس کام کے لئے جناب ڈاکٹر رچرڈ نیزل ( Dr. Richard Netzel ) اور پروفیسر گارڈن پیٹرسن (Gordon Peterson) صاحب امریکہ سے تشریف لائے تھے۔ یہ حضرات دو مختلف نصابوں کی نمائندگی کرتے ہیں جن کا تجربہ اس وقت امریکہ کے کنڈر گارٹن اور پرائمری اسکولوں میں کیا جا رہا ہے ابھی تک ان کے جو نتائج نکلے ہیں وہ نہایت



گارڈن پیٹرسن

تسلی بخش ہیں۔ ان میں خاصیات ہیں ... اور ... پڑتا ہے پھر بھی وہ دوسرے ... کے مقابلے میں ... یہ نصابات سائنس کے موجودہ ... سے بالکل مختلف ہے۔ پہلے مظاہر قدرت کے باضابطہ علم کو جس میں حقائق، قاعدے اور مساوات وغیرہ شامل ہوتے، سائنس کہا جاتا ... ایک مخصوص طریقہ کار سے حاصل کیا جاتا ہے جو سائنس کی ... سائنس کے جدید تصور میں انسان کے قدرتی ماحول کا علم اور وہ طرز عمل جس سے یہ علم حاصل کیا جاتا ہے، دونوں ہی شامل ہیں۔

اس وقت تک سائنس کے جو بھی نصابات تیار کئے گئے ان کا مقصد بچوں کو سائنس کے اصولوں، فارمولوں، نظریات وغیرہ سے واقف کرانا تھا۔ سائنسی طریقہ کار یا طرز عمل کا کہیں کوئی ذکر نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طلباء نے سائنس کا علم تو حاصل کر لیا لیکن سائنسی طریقہ کار نہ سیکھ سکے جس سے سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ یہ تحصیل کر کسی تحقیقی کام کے قابل نہ بنے اور نہ ان کی روزمرہ زندگی پر سائنس کا کوئی اثر پڑا۔ ان کے انداز تفکر اور طرز عمل میں کوئی نمایاں فرق نہ آیا۔

موجودہ دور میں سائنس ترقی یافتہ ممالک کے کلچر کا ایک حصہ بن چکی ہے اور ترقی پذیر ممالک کے کلچر میں رفتہ رفتہ شامل ہوتی جا رہی ہے۔ ان ممالک میں ایک صنعتی سماج کی تشکیل ہو رہی ہے جس میں صرف وہی افراد مناسب جگہ حاصل کر سکیں گے، جن کا انداز تفکر اور طرز عمل سائنٹفک ہو کیونکہ صنعتی سماج کی بنیاد سائنس پر ہے۔ اس لئے صرف یہی افراد اس سماج کی ترقی میں بھی معاون ہو سکتے ہیں۔ اب معمولی خواندگی کافی نہیں ہے بلکہ سائنسی خواندگی (Scientific Literacy) کی ضرورت ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہر فرد کو سائنس کا بنیادی علم ہو جس سے وہ اپنی روزمرہ زندگی میں فیض حاصل کر سکے اور ساتھ ہی ساتھ اس کا انداز فکر اور طرز عمل سائنٹفک ہو۔

اسی ضرورت کے پیش نظر دو منصوبے تیار کئے گئے جو S.A.P.A. (Science, A Process Approach) اور (S.C.I.S Science Curriculum Improvement Study) یعنی کے نام سے مشہور ہیں۔

S.A.P.A. کنڈر گارٹن سے درجہ ششم تک سائنس کی تعلیم کا ایک بالکل اچھوتا طریقہ پیش کرتا ہے۔ یہ طریقۂ تعلیم گانے (Gagne) کے نظریہ پر مبنی ہے۔ اس ماہر تعلیم کا نظریہ یہ ہے کہ سائنس داں اپنی تحقیقات کے لئے کچھ مخصوص طریقوں کو استعمال میں لاتا ہے مثلاً مشاہدہ کرنا (Observing)

خصوصیات کے لحاظ سے درجہ بندی کرنا (Classification) پیمائش کرنا (Measuring) پیشگوئی کرنا (Prediction) مفروضہ قائم کرنا (Formulating Hypothesis)

اپنے بچپن کا مطالعہ کرتا اور آخر میں سے قوانین مرتب کرتا۔ ان ہنر مندیوں (Skills) کو برسوں کی مشق کے بعد سیکھتا ہے اور ان ہی کی مہارت پر سائنس کا دارومدار ہے۔ اس لئے آج یہ تجویز کرتا ہے کہ بچوں کو یہ ہنر اپنی بہت سادہ اور آسان شکل میں کنڈر گارٹن ہی سے سکھلانا شروع کر دیے جائیں۔ چند سالوں کی مشق سے وہ انہیں سیکھ جائیں گے اور بنیادی طور پر ایک سائنسداں کی طرح سے کام انجام دینے لگیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہر بچہ آگے چل کر سائنسداں بن جائے گا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ سائنس کے طریقۂ کار سیکھ جائے گا جو سائنس کو سمجھنے کے لئے انتہائی ضروری ہے۔ دوسرے یہ طریقۂ کار جن کا تعلق ذہن سے ہے رفتہ رفتہ بچے کے دماغ کا ایک جزو بن جاتے ہیں جس کی وجہ سے دوسرے مضامین کو بھی سیکھنے میں آسانی ہوتی ہے اس کے علاوہ یہ ذہنی ہنر زمانہ حال اور مستقبل دونوں ہی میں بچے کو زندگی کے روز مرہ مسائل حل کرنے میں معاون ہوتے ہیں۔

ماہر تعلیم، ماہر نفسیات اور سائنسدانوں نے کافی غور و فکر اور تحقیق کے بعد آٹھ بنیادی طریقۂ کار (Basic Process) اور پانچ مجموعی طریقۂ کار (Integrated Process) تلاش کئے ہیں۔ مذکورہ طریقے کنڈر گارٹن سے چھٹی جماعت تک سکھا دیئے جاتے ہیں جس کے نتیجے میں وہ سائنسی طریقۂ کار سیکھ جاتا ہے اور ایک سچے سائنسداں کی طرح کام کرنے لگتا ہے۔ بنیادی اور مجموعی طریقۂ کار اور ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

## بنیادی طریقۂ کار

۱۔ مشاہدہ (۲) خصوصیات کے اعتبار سے درجہ بندی کرنا (۳) اعداد کا استعمال (۴) پیمائش (۵) وقت اور مکان کا تعلق (۶) ترسیل (۷) پیشگوئی (۸) نتیجہ اخذ کرنا

## مجموعی طریقۂ کار

۱۔ افعالی تعریف مرتب کرنا (Defining Operationally)

۲۔ مفروضہ ترتیب دینا (۳) متعلقہ مواد کی تشریح کرنا

۴۔ متاثر کرنے والے حالات کو منضبط کرنا (Controlling Variables) (۵) تجربہ کرنا

## مشاہدہ :-

وہ علم جو انسانی حواس خمسہ کے ذریعہ حاصل کیا جاتا ہے، مشاہدہ کہلاتا ہے اس کی مشق کرانے کے لئے ایسے مشاغل تجویز کئے گئے ہیں جن میں بچے کو اپنے حواس کو استعمال کرنے کی ضرورت پڑتی ہے مثلاً چیزوں کا رنگ، ان کی شکل و صورت اور چمکدار ہونے یا نہ ہونے میں تمیز کرنا۔ دو چیزوں کو چھو کر یہ معلوم کرنا کہ کس کا درجۂ حرارت کم ہے اور کس کا زیادہ، یا یہ بتانا کہ ان میں کونسی چیز چکنی کونسی کھردری، سخت یا ملائم ہے۔ مختلف ذائقوں اور آوازوں میں فرق کرنا وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح اپنے حواس کا ٹھیک استعمال آجاتا ہے۔ ان مشاغل کی ترتیب کچھ اس طرح ہے کہ ان کا آغاز مختلف اشیاء اور ان کی خصوصیات کی تمیز کرنے سے کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد طبیعاتی نظاموں میں تبدیلی مثلاً پانی کا بھاپ بننا یا بھاپ کا پانی بننا وغیرہ دیکھنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ پھر منضبط مشاہدہ کرایا جاتا ہے۔ جیسے دو برتنوں میں برابر مقدار میں پانی لے کر ایک میں نمک ملا دیتے ہیں اور دوسرے کو سادہ رکھتے ہیں دونوں برتنوں میں پانی کو اس حد تک گرم کرنے کو کہا جاتا ہے کہ وہ ابلنے لگتا ہے۔ تھرما میٹر کی مدد سے دونوں کا نقطۂ ابال معلوم کرنے کو کہا جاتا ہے۔ اس تجربہ سے بچے کو پتہ چلتا ہے کہ جس پانی میں نمک گھلا ہوتا ہے وہ کم درجۂ حرارت پر ابلتا ہے اس قسم کے مشاہدات کو ہی منضبط مشاہدہ کہتے ہیں۔ اس سے اگلا قدم مختلف مشاہدات کو ترتیب دینے کی مشق کرانا ہوتا ہے۔ انجام کار بچہ مشاہدہ کا فن سیکھ جاتا ہے۔

## درجہ بندی کرنا

خصوصیات کے اعتبار سے اشیاء کی درجہ بندی کرنے اور پرکھنے کی ضرورت قدم قدم پر پڑتی ہے۔ کیونکہ سائنسدانوں نے پیڑ پودوں، کیڑے مکوڑوں، جانداروں اور بے جان چیزوں کی درجہ بندی مختلف طریقوں سے کی ہے مثلاً پھول اگانے والے اور نہ اگانے والے پودے، گھاس پھوس، جھاڑی اور درخت وغیرہ۔ اسے سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ بچوں کو یہ علم ہو کہ ایک ہی قسم کی چیزوں کی درجہ بندی ان کی مختلف خصوصیات کے اعتبار سے مختلف ہو سکتی ہے

اس مشق کی ابتداء بالکل سادہ طریقے سے کی جاتی ہے مثلاً کنڈر گارٹن کے بچوں کو مختلف رنگوں، شکل و صورت وغیرہ کے بٹن دے دیئے جاتے ہیں اور ان سے ایک قسم کے بٹنوں کو الگ کرنے کو کہا جاتا ہے وہ مختلف طریقوں سے ان کی چھٹائی کرتے ہیں۔ مثلاً کوئی ایک ہی رنگ کے بٹن الگ الگ کرتا ہے، کوئی شکل و صورت کے لحاظ سے اور کوئی بچہ مختلف خصوصیات کا ایک ساتھ خیال رکھ

کرائیں جاتے ہیں تاکہ وہ مشاہدات و معلومات کو ترتیب کے ساتھ ٹھیک جانچ سکیں کہ بچے ان سوالوں کے مختلف جواب دیتے ہیں لیکن پھر استاد کی مدد سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہر چیز مختلف خصوصیات کے اعتبار سے مختلف ہو سکتی ہے۔

اس طرح درجہ بندی سادہ چیزوں، جیسے طبیعاتی اور حیاتی نمونوں سے شروع ہوکر کی معلومات پر تقسیم تک پہونچ کر تدوین اور جدول تیار کرنے تک پہونچتی ہے۔ اس کی ابتدا روزمرہ کی چیزوں کو جسامت کے اعتبار سے ترتیب دینے اور شمار کرنے سے کی جاتی ہے۔ اس کے بعد ان کو تقسیم کرنا یا ان کے خاکے اور نقشے وغیرہ کا استعمال سکھایا جاتا ہے۔

## پیمائش

مختلف پیمانوں کو ترتیب دینے سے شروع کرکے لمبائی، رقبہ، حجم، وزن، درجہ حرارت اور رفتار وغیرہ معلوم کرنے کے طریقے اور ان کے پیمانوں تک کے استعمال سے واقف کرا دیا جاتا ہے۔

## وقت و مکان کا تعلق

ریل گاڑی زمین پر چلتی ہے، ہوائی جہاز ہوا میں اڑتا ہے اور راکٹ خلا میں سفر کرتا ہے۔ ان سب کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہونچنے میں وقت لگتا ہے اس طرح حرکت، وقت اور مکان ایک دوسرے سے متعلق ہیں۔ اس تصور کو واضح کرنے کے لئے پہلے چیزوں کی صورت شکل سے آشنا کرایا جاتا ہے پھر مختلف حرکات دیکھنے کا موقع دیا جاتا ہے جیسے چیز کا نیچے حرکت کرنا، ایک طرف سے دوسری طرف جانا، سیدھے ٹیڑھے میڑھے راستے پر گولائی میں یا سیدھے خط پر چلنا۔ اس کے بعد خطی اور زاویائی رفتار نکالنی سکھائی جاتی ہے جو تجربات اس سلسلے میں کئے جاتے ہیں وہ وقت و مکان کے تعلق کی وضاحت کر دیتے ہیں اور بچہ اس رشتہ کو بخوبی سمجھ لیتا ہے۔

## ترسیل

جو بھی علم حاصل کیا جاتا ہے اُسے دوسروں تک پہونچانے کی بھی ضرورت ہوتی ہے اس کا ایک طریقہ زبان ہے۔ الفاظ کے ذریعہ اُسے دوسروں تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ سائنس کا کام صرف اس واحد ذریعہ سے نہیں چل سکتا۔ سائنس کے حقائق کی ترسیل گراف، مختلف شکلوں اور تصویروں وغیرہ سے بھی کی جاتی ہے چنانچہ آسان مشاغل کے ذریعہ یہ سب چیزیں بچے کو سکھا دی جاتی ہیں۔

## پیش گوئی

[illegible] آپ جانتے ہیں کہ ایک شخص کی جیب خالی ہے [illegible] بتا کر [illegible] چنانچہ اگر کوئی شخص آپ کو بتاتا ہے کہ آپ پیش گوئی کر سکتے ہیں [illegible] سامنا کرنا پڑے گا۔ آپ کی یہ پیش گوئی [illegible] اس شخص کی جیب خالی ہے، دوم ریستوران میں کھانا [illegible] لیکن اس کی حیثیت صرف امکانی ہے۔ اگر اس ریستوران میں [illegible] تو کوئی پریشانی نہ ہوگی۔ سائنس کی سب پیش گوئیاں امکانی ہوتی ہیں۔

ابتدا میں بچوں کو پیش گوئی کی مشق کے لئے حاصل کردہ مواد کو گراف کی شکل میں ظاہر کرنا سکھایا جاتا ہے۔ اس گراف کو آگے یا پیچھے کی طرف بڑھا کر وہ بات بھی بتائی جا سکتی ہے جس کا مشاہدہ براہ راست نہیں کیا گیا۔ مثلاً اگر مختلف سے مختلف تک گیہوں کی فی کیاریوں کا جو اس عرصہ میں بڑھتی رہیں ایک گراف بنا لیں تو اس کی مدد سے مستقبل میں گیہوں کے پیداوار کی پیش گوئی کی جا سکتی ہے اور یہ بھی بتایا جا سکتا ہے کہ گذشتہ میں کیا ہوا ہوگا بشرطیکہ باقی حالات یکساں رہے ہوں۔

## نتیجہ اخذ کرنا

مشاہدات کی بنا پر نتیجہ اخذ کرنا عملی تجربات سے سکھایا جاتا ہے مثلاً بچوں کو چینی، نمک، کوئلہ، کھریا وغیرہ کو الگ پانی میں ڈالنے کو کہا جاتا ہے۔ چینی اور نمک تھوڑی دیر میں غائب ہو جاتے ہیں لیکن کوئلہ تیرتا رہتا ہے اور کھریا بھی غائب نہیں ہوتی۔ اس سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ چینی اور نمک پانی میں گھل جاتے ہیں لیکن کوئلہ اور کھریا نہیں گھلتے ہیں۔

## اعمالی تعریف مرتب کرنا

اعمالی تعریف ایسی تعریف کو کہتے ہیں جو دیئے گئے تجربات کی طرف اشارہ کرتی ہے جس سے وہ شئے بلا مغالطہ پہچانی جا سکے۔ مثلاً کاربن ڈائی آکسائڈ کی غیر اعمالی تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ یہ ایک گیس ہے جو کاربن اور آکسیجن کے کیمیائی اتحاد سے بنتی ہے جس میں ان کا تناسب ۱:۲ ہوتا ہے۔ اس تعریف سے کاربن ڈائی آکسائڈ کا آسانی سے پہچاننا بہت مشکل ہے چنانچہ اس کی اعمالی تعریف یہ ہوگی کہ یہ ایک گیس ہے جس میں شفاف چونے کا پانی ڈالنے سے دودھیا ہو جاتا ہے۔ اس طرح بچہ کاربن ڈائی آکسائڈ کی شناخت خود کر سکتا ہے اس قسم کی تعریفات مرتب کرنے کے لئے بچوں کو عملی مسائل دیئے جاتے ہیں مثلاً بجلی کے ایک سرکٹ میں سوئچ لگانے کو کہا جاتا ہے اور پھر سوئچ کی اعمالی تعریف

صیغہ کی جاتی ہے۔ پھر وہ اس کی تعریف بیان کرتا ہے کہ سوئچ ایک ایسی چیز ہے کہ اگر اسے اس قسم کے سرکٹ میں لگایا جائے جیسا اس نے تیار کیا ہے تو اس کے ذریعہ بلب کو جلایا یا بجھایا جا سکے۔ اس تعریف سے دوسرا شخص سوئچ ذرا شناخت کر سکتا ہے۔

## مفروضہ مرتب کرنا

مشاہدات کی بنیاد پر جو قیاس کیا جاتا ہے اسے مفروضہ کہتے ہیں۔ اس کی تصدیق مزید مشاہدات اور تجربات سے کی جاتی ہے۔ اگر یہ اُن پر پورے اُترتے ہیں تو مفروضہ قائم رہتا ہے ورنہ اس میں ترمیم کر دی جاتی ہے یا اسے رد کر دیا جاتا ہے۔ مفروضات مرتب کرنا اس طرح سکھایا جاتا ہے کہ بچہ تجربوں کے دوران جو واقعات دیکھتا ہے اُسے اس کی وجہ کا اندازہ لگانے کو کہا جاتا ہے اور پھر اس قیاس کی تصدیق تجربات سے کرائی جاتی ہے تو وہ تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ مثلاً بچہ تجربہ کر کے یہ مشاہدہ کرتا ہے کہ لوہے، تانبے اور نکل میں سے بجلی آسانی سے گزر سکتی ہے۔ اس مشاہدہ کی روشنی میں یہ مفروضہ مرتب کرتا ہے کہ دھاتوں میں سے بجلی آسانی سے گزرتی ہے۔ اس کی جانچ کرنے کے لیے وہ مزید دھاتوں کے ساتھ وہی تجربات کرتا ہے اور اس طرح اپنے مفروضہ کو قابل اعتماد بنا دیتا ہے۔

## متعلقہ مواد کی ترجمانی کرنا

مشاہدہ سے حاصل شدہ مواد کو مختلف صورتوں میں منتظم کیا جاتا ہے۔ کبھی یہ بیانیہ ہوتا ہے، کبھی گراف کی شکل میں۔ کبھی اعداد و شمار کی صورت میں۔ چنانچہ اس کا مشق گراف کی شکل سے رجحان دریافت کر کے، یا بیان کی ہوئی باتوں سے سوالات بنوا کر یا اسی قسم کے دوسرے طریقوں سے کرائی جاتی ہے۔

## متاثر کرنے والے حالات کو منضبط کرنا

اگر کسی واقعہ پر کئی چیزیں اثر انداز ہوتی ہیں۔ ان میں چند چیزوں کا اثر بیک وقت دیکھنا ہوتا ہے صرف انہی کو اثر انداز ہونے دیا جاتا ہے اور دوسرے باقی چیزوں سے محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً بیج سے انکھوا پھوٹنے کے لئے گرمی، ہوا اور پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر بیج پر صرف گرمی اور ہوا کا اثر دیکھنا ہوتا ہے تو اسے پانی سے دُور رکھنا ہوگا۔ چنانچہ اسی قسم کے مسائل سے دوچار ہونے پر بچہ ان چیزوں پر قابو پانا سیکھ جاتا ہے جن کے اثر کو اس تجربہ میں دور رکھنا ہے۔ اسی قسم کے عملی تجربات کی کارکردگی متاثر کرنے والے حالات کو منضبط کرنا کہلاتی ہے۔

## تجربات کرنا

مسائل کو حل کرنے کے لئے تجربات کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس نے اس فن کو سکھانے کے لئے شروع میں آسان اور پھر مشکل مسائل بچہ کے سامنے رکھے جاتے ہیں جنہیں حل کرنے کے لئے وہ تجربات خود سوچتا ہے اور کرتا ہے۔ مثلاً یہ مسئلہ ہو سکتا ہے کہ کھانا پکانے کے برتن جلد گرم ہونے کے اعتبار سے پیتل کے مناسب ہوں گے یا تانبے کے۔ اس کا جواب دینے کے لئے ایسا تجربہ کرنا پڑے گا جس سے یہ پتہ چل سکے کہ ان دھاتوں میں سے کون سی دھات جلد گرم ہوتی ہے اور کون سی دیر میں۔ چنانچہ اس کے لئے یہ کیا جا سکتا ہے کہ ایک ہی موٹائی اور لمبائی کے تانبے اور پیتل کے تار لے جائیں اور ان میں ایک ہی دوری پر موم کی ایک ایک گولی چپکا دی جائے۔ اس کے بعد ان دونوں کے ایک ایک سرے کو بیک وقت ابلتے پانی میں ڈال دیا جائے۔ جس تار سے چپکی ہوئی گولی پہلے گر جائے وہ جلد گرم ہوا۔ اس تجربہ سے انہیں اپنے مسئلہ کا حل مل جائے گا۔ اسی طرح کے مسائل کے حل تلاش کرنے کی کوشش سے بچے تجربات کرنا سیکھ جاتے ہیں۔

## تدریسی ادب (Instructional Literature)

استادوں کے لئے مضمون اور درس و تدریس سے متعلق مخصوص کتابیں لکھی گئی ہیں اور ہر طریقۂ کار کو سکھانے کے لئے بہت سی مشقیں تیار کی گئی ہیں جن کی خصوصیات یہ ہیں۔

۱۔ سرورق پر یہ بتایا گیا ہے کہ اس مشق کے کرانے سے پہلے پچھلی کون کون سی مشقیں ضروری ہیں اور یہ مشق آگے آنے والی کن مشقوں کے لئے تیار کرتی ہے۔

۲۔ ہر مشق کے مقاصد عملی ہیں اور ضمناً اس کے اختتام پر حاصل ہو جاتے ہیں۔

۳۔ مشق میں کام آنے والے ضروری سامان کی فہرست دی گئی ہے تاکہ اسے پہلے سے فراہم کر لیا جائے۔

۴۔ وہ نئے الفاظ لکھ دیئے گئے ہیں جن کا مشق میں استعمال ہونے کا امکان ہے تاکہ استاد ان کی تشریح کے لئے تیار رہے۔

۵۔ اس کے بعد بہت تفصیل کے ساتھ اس مشق کو بچوں سے کرانے کا طریقہ بیان کیا گیا ہے جو صرف استاد کی رہنمائی کے لئے ہے۔ اس میں موقع و محل کے مطابق ترمیم کی جا سکتی ہے۔

۶۔ ہر مشق کے آخر میں بچوں کا امتحان لینے کے لئے دو قسم کے آزمائشی مسائل تجویز کئے گئے ہیں۔ پہلے مسئلہ کا حل کئی بچے مل کر خود تلاش کرتے ہیں اور دوسرے مسئلے کا حل بچہ انفرادی طور پر تلاش کرتا ہے۔ یہ دونوں ہی قسم کے مسائل بچے کے لئے نئے ہوتے ہیں اور انہیں حل کرنے کے لئے مشق کے دوران حاصل کردہ واقفیت اور تجربہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان مسائل کو کامیابی کے ساتھ حل

کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مشق کے مقاصد حاصل ہو گئے۔

## نصاب کی خصوصیات

۱۔ یہ بچے کو کسی کتاب کے پڑھنے کی ضرورت نہیں ہوتی البتہ کسی مضمون کو یاد رکھنے کی شعوری کوشش کرنی پڑتی ہے وہ سب کچھ عملی طور پر سیکھتا ہے۔ اس وجہ سے زبان کی استعداد اس کی راہ میں حائل نہیں ہوتی۔

۲۔ ہر مشق کے مقاصد کچھ عملی کام سیکھنے سے متعلق ہیں اس لئے مشق کے فوراً ہی بعد اس بات کی جانچ کی جا سکتی ہے کہ بچے نے عملی حصہ کہاں تک سیکھا۔ عموماً یہ مقاصد حاصل ہو جاتے ہیں لیکن اگر کوئی کمی محسوس کی جاتی ہے تو مشق پھر سے کرائی جاتی ہے۔

۳۔ ہر مشق میں بچے کا امتحان بھی شامل ہے۔ آخر میں ایسے مشاغل تجویز کئے گئے ہیں جن سے بچے کی کامیابی کا بخوبی پتہ چل جاتا ہے۔

۴۔ باوجودیکہ سائنس کی واقفیت پر زور نہیں ہے پھر بھی بچہ فزکس، کیمسٹری، بائیلوجی، اسٹرالوجی وغیرہ کا کافی علم حاصل کر لیتا ہے۔

۵۔ مذکورہ طریقہ کار سیکھنے سے بچہ ایک سچے سائنسداں کی طرح کام کرنا سیکھ جاتا ہے اس کا یہ طرز عمل اسے خود علم حاصل کرنے کے قابل بناتا ہے اور روزمرہ زندگی کے مسائل کو حل کرنے میں معاون ہوتا ہے۔

## دوسرا نصاب۔ ایس۔ سی۔ آئی۔ ایس

(Science Curriculum Improved Study)

منصوبہ کے تحت تیار کیا گیا ہے۔ سائنسی تعلیم کے متعلق دونوں کا ایک ہی فلسفہ ہے اور دونوں اس خیال کے حامی ہیں کہ ابتدائی درجوں میں تعلیم بچوں کے ذاتی تجربات پر مبنی ہونی چاہئے۔ استاد کو زیادہ زور بچوں میں حصول علم کا شوق پیدا کرنے اور ان طریقوں پر دینا چاہئے جن سے بچے خود علم حاصل کر سکیں۔ فرق اتنا ہے کہ ایس۔ اے۔ پی۔ اے سائنسی طریقہ کار پر زیادہ زور دیتا ہے اور ایس سی آئی ایس معلومات کو زیادہ اور طریقہ کار کو کم اہمیت دیتا ہے لیکن انہیں نظر انداز نہیں کرتا البتہ اس کی حیثیت ثانوی ہے۔

اس نصاب کو اس طرح تیار کیا گیا ہے کہ پہلے سائنس کے اس مواد کو منتخب کر لیا گیا جو بچوں کے لئے ضروری اور مناسب سمجھا گیا اور بعد ازاں یہ سوچا گیا کہ ان کے لئے کون کون باتیں سکھائی جا سکتی ہیں۔ طریقہ تدریس میں انہیں سکھانے کی طرف پوری توجہ کی گئی ہے۔ چونکہ اس نصاب میں زیادہ زور سائنسی واقفیت پر ہے اس لئے یہ ہمارے موجودہ نصاب کے قریب ہے۔ اس کے دو اہم مقاصد ہیں۔

۱۔ بچوں کو اس قابل بنانا کہ وہ [illegible] کے بنیادی تصورات حاصل کر سکیں اور یہ جان لیں کہ سائنس [illegible] کے مشاہدات انسان کی تخلیقی صلاحیت [illegible]

۲۔ کسی نظریہ کے قائم ہونے کے بعد [illegible] تجربات سے پرکھا جائے۔ ان مقاصد کے [illegible] طرح ہے۔

کلاس روم کو ایک تجربہ گاہ کی شکل دے دی جاتی ہے۔ جہاں بچے تجربہ کر کے خود علم حاصل کرتے ہیں۔ انہیں ضروری سامان مہیا کیا جاتا ہے جس کی مدد سے وہ کبھی استاد کی رہنمائی میں اور کبھی اپنی مرضی کے مطابق مشاہدات اور تجربات کرتے ہیں۔ ہدایت دینے کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب بچوں کے بھٹک جانے کا اندیشہ ہوتا ہے ورنہ وہ عموماً اپنی عقل و فہم کے مطابق ہی کوئی مناسب نتیجہ اخذ کیا کرتے ہیں۔

سامان کا انتخاب اس ہوشیاری سے کیا جاتا ہے کہ اس کے ذریعہ جو تجربات اور مشاہدات ممکن ہیں وہ بچوں کو اس مضمون کی طرف لے جائیں جس کا علم حاصل کرانا اس سبق کا مقصد ہے۔ اس قدم کو تفتیش (Exploration) کہتے ہیں۔ مثلاً مقناطیسی تفاعل (Magnetic Interaction) سے متعارف کرانا ہو تو بچوں کو دو دو مقناطیسی سلاخیں (Bar Magnets) دے دی جاتی ہیں اور ایک ایک کھلونا گاڑی۔ انہیں ہدایت کی جاتی ہے کہ ایک مقناطیس کو گاڑی میں رکھ دیں اور دوسرے کو رفتہ رفتہ اس کے قریب سامنے سے لائیں۔

مقناطیس کی خصوصیت یہ ہے کہ اگر اس کی ایک سلاخ کو کسی دھاگے سے باندھ کر اس طرح لٹکایا جائے کہ وہ گھوم سکے تو جب بھی یہ ٹھہرے گی اس کا ایک سرا شمال اور دوسرا جنوب کی طرف ہوگا۔ اس لئے انہیں مقناطیس کے شمالی اور جنوبی قطبین کہتے ہیں۔

متضاد قطبین یعنی شمالی اور جنوبی ایک دوسرے کو کشش کرتے ہیں اور یکساں ایک دوسرے کو دور ہٹاتے ہیں چنانچہ جب بچوں کے مقناطیس کے متضاد سرے ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں تو گاڑی کی طرف حرکت کرتی ہے اور جب یکساں سرے قریب آ جاتے ہیں ان کی گاڑی دور بھاگتی ہے۔ اب ان کا تجسس بیدار ہو جاتا ہے اور وہ مزید تجربات کرتے ہیں۔ ان کے ذہن میں مختلف سوالات [illegible] سائنس سیکھنے کی [illegible]

...سے عملی طور پر جڑی ہے اور دوسرے سے دور بھاگتی ہے۔ وہ آپس میں بات چیت کرتے ہیں اور مختلف مفروضات قائم کرتے ہیں۔ اب استاد انھیں ... کی ... سے بتا دیتا ہے۔ وہ ان کے ساتھ وہی تجربات کرتا ہے لیکن ... پہلے حاصل نہیں ہو سکے۔ اس طرح وہ اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ ... پہلے دی گئی تھیں۔ وہ ان وجہ کی سلاخوں سے مختلف ہیں ... کئی بچے اپنی سابقہ واقفیت و تجربہ کی بنیاد پر یہ بتا سکتے ہیں کہ پہلے والی ... مقناطیسی ہیں۔ اگر وہ نہیں بتا سکتے تو استاد بتا دیتا ہے کہ وہ پختہ لوہے کی بنی ہیں اور انھیں مقناطیسی بنا دیا گیا ہے۔ پھر انھیں مزید تجربات کرائے جاتے ہیں جن سے مقناطیسی نقاط کا تصور ... واضح ہو جاتا ہے۔ ایسے ابتدائی قدم کہتے ہیں۔ کچھ ... یہاں پر بچے نئے اصول و قوانین معلوم کرتے ہیں۔

آخر میں کچھ ایسے مسائل دیئے جاتے ہیں جن کے حل کرنے کے لئے اس سے قبل حاصل شدہ واقفیت و تجربہ سے استفادہ کرنا پڑتا ہے۔

ان نصابات کا مطالعہ ہمیں اپنے تعلیمی نظام کے متعلق جن باتوں کی ترغیب دیتا ہے۔ ان میں زیادہ اہم حسب ذیل ہیں۔

(۱) تعلیم کے سبھی مدارج کے مقاصد نہایت واضح طور پر طالب علموں کے کردار اور طرز عمل کے اعتبار سے متعین کئے جانے چاہئیں۔ ہر تعلیمی ادارے کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اس کا طالب علم فارغ التحصیل ہونے کے بعد کیا کر سکے گا نہ کہ یہ کہ وہ کیا کیا جانتا ہوگا۔ صرف مضمون سے واقفیت کا معیار کافی نہیں۔ اس بات کی جانچ کرنے کے لئے کہ اس کے طرز عمل اور کردار پر کیا اثر پڑا، ادارے کے پاس مناسب طریقے ہونے چاہئیں۔

۲۔ مضمون کے واقفیتی پہلو پر کم اور اس سے متعلق ہنر مندیوں پر زیادہ زور دیا جانا چاہئے۔

۳۔ تمام نظام تعلیم کو زیادہ جمہوری بنانے کی ضرورت ہے جس میں طالب علم کو تنقید کرنے، استاد سے متفق ہونے یا نہ ہونے کی پوری آزادی ہو۔ اس کے بغیر اس کی تخلیقی صلاحیت ابھر نہیں ہو سکتی۔

۴۔ طالب علم کو ہر درجہ پر سبق میں زیادہ سے زیادہ حصہ لینے کا موقع دیا جائے اور انھیں ایسا قابل بنایا جائے کہ وہ خود علم حاصل کر سکیں۔

۵۔ سائنس کی تعلیم عام تعلیم کا ایک جزو ہونی چاہئے اور بالکل ابتدائی درجوں سے دی جانی چاہئے۔ تاکہ وہ سائنسی طریقۂ کار جلد از جلد سیکھ جائیں۔ اب ہماری تعلیم کا مقصد صرف خواندگی نہیں بلکہ سائنسی خواندگی ہونا چاہئے۔

# غزل

**فلک مظفر نگری**

ہم پر الزام ہیں آپ ہی کے لئے
یہ بھی تسلیم ہے دوستی کے لئے

گلستاں میں شباب بہاراں رہا
گل ترستے رہے اک ہنسی کے لئے

بات اک روز آکر قضا پر رُکی
کتنا سوچا گیا زندگی کے لئے

خونِ دل بہہ گیا اشک بن کر سبھی
کیا جلاؤں میں اب روشنی کے لئے

ہائے اس کو اندھیرے میں رکھا گیا
خون جس نے دیا روشنی کے لئے

خون کرتے رہے ہر تمنا کا ہم
کیا یہ کم ہے تمہاری خوشی کے لئے

ہم غریبوں کی کیا آبرو ہے فلکؔ
ہم نے کچھ بھی کیا ہو کسی کے لئے

## تمنا کا دوسرا قدم — صہبا وحید

ضخامت: ستو سلاسی ۲۰۰ صفحات، قیمت: پانچ روپے
ناشر: نیو لٹریچر، ۵۸ الستی نظام الدین، درگاہ، نئی دہلی ۱۳

اُردو میں شعری مجموعے اس کثرت و سرعت سے شائع ہوتے ہیں کہ ان کا تعاقب مشکل ہو گیا ہے اسی لئے بعض اوقات قارئین کو متوجہ کرنے کے لئے "تقریبِ اجراء" کی بدعت چل پڑی ہے۔ مجموعوں کی اس ریل پیل میں کئی نوجوان شعرا محروم توجہ رہ جاتے ہیں۔ صہبا وحید کچھ ایسے نوجوان بھی نہیں ہیں لیکن بزمِ شہرت میں نو وارد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تقریباً ایک دہائی سے شعر کہہ رہے ہیں۔ اس مدت میں اُن کا ذہن برابر ارتقائی منزلیں طے کرتا رہا ہے اور ان کا فن بھی بنتا سنورتا رہا ہے۔

"تمنا کا دوسرا قدم" اُن کے دوازدہ سالہ تخلیقی کارناموں کا نچوڑ ہے اس میں نظمیں زیادہ اور غزلیں کم ہیں۔ نظموں میں طویل نظمیں، منظوم افسانے اور تراجم شامل ہیں۔ مجموعے کی طویل ترنظم "تمنا کا دوسرا قدم" ہے اور اسی کو صہبا نے عنوانِ کتاب کے لئے منتخب بھی کیا ہے۔ یہ ایک خوبصورت نظم ہے جسے شاعر نے فنکارانہ چابکدستی سے ایک تخیلی تسلسل میں پرو دیا ہے طنز اظہار میں جدت، محض تجرباتی نہیں ہے بلکہ بعض مقامات پر تخیلی بھی ہے۔ کچھ اچھی تشبیہیں فراہم کی ہیں۔ "نقلوں کی طرح بکھرے ہوئے آرزو کے روپے" کچھ اچھی ذہنی تصویریں ابھاری ہیں: "نیلی پیلی روشنی کے ٹیڑھے میڑھے نقوش"، "روح کی گہرائیوں میں تیرتی تنہائیاں" "کشکول آرزو میں شکستہ سے خواب تھے" مختلف بحروں کا استعمال، قوافی کی مختلف ترتیب، اسلوب کی ناہمواری، سبھی چونکاتے ہیں۔ لیکن وحدتِ اثر میں مخل نہیں ہوتے۔ بعض مقامات محلِ نظر ہیں۔ مثلاً "ایک گہری دھند میں کھوتے چلے ہیں" شاید وہ "کھونے لگے ہیں یا کھوتے چلے جاتے ہیں" کہنا چاہتے تھے اس طرح شیکسپیر کے ALL THE PERFUMES OF ARABIA کا ترجمہ "عرب کی ساری خوشبو" درست نہیں غالباً وہ "اور عرب کی سب خوشبوئیں" کہنا چاہتے تھے لیکن یہ جزوی تسامح حسنِ نظم پر اثر انداز نہیں ہوتے۔

شاعر نے ارادھنا کا کردار بھی تخلیق کرنے کی کوشش کی ہے اور اسے ارادھنا میں استعمال کیا ہے اگرچہ ماحول نائٹ کلب اور بال روم کا سا ہے لیکن یہ محبوبہ عام ہندی محبوباؤں سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہے۔ وہی گرمی و نرمی اس کے قرب میں بھی محسوس کی جاتی ہے۔ نئی فضا کا احساس ارادھنا کے علاوہ "غانیہ" اور "نہ شبنم نہ شب پرستم" میں بھی ہوتا ہے۔

کئی غزلوں میں نیاپن تو ضرور ہے لیکن وہ رچاؤ اور گیرائی نہیں ہے جو غزل کو دوسرے اصناف سے ممتاز کرتی ہے۔

بعض اوقات صہبا کے [illegible] درجلیے (۲) موجب گریہ [illegible] (۳) [illegible] کی برنائیاں (۴) میری [illegible] ہوتا ہے لیکن مجموعی حیثیت سے صہبا [illegible]

## مزاجِ آب و گِل — مصنف: [illegible]

ناشر: گلستان آرٹ اکیڈمی، [illegible]
(اتر پردیش) قیمت: چھ روپے ضخامت: [illegible]

حسن شمیر طباع بھی ہیں اور ایک [illegible] شاعر بھی ہیں اور مصور بھی اور فنونِ لطیفہ کے دونوں میدانوں میں [illegible] انداز میں وارد ہوتے ہیں۔ میں ان کو بہت دنوں سے جانتا ہوں ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتا ہوں۔ اس لئے میں ان کے اس نئے مجموعے میں اُن کی بے چین شخصیت کی نشاندہی آسانی سے کرسکا۔

اشتہار کی زبان میں افراط و تفریط جائز ہے لیکن بعض اشتہار جو جز و کتاب ہو، محض اشتہار نہیں رہ جاتا بلکہ ایک تعارف بھی بن جاتا ہے اور افراط و تفریط کی بدمزگی کا سامان بھی۔ بہرحال، اس اشتہار میں کتاب کو "اردو شاعری کا [illegible] انگیز کارنامہ" کہا گیا ہے اس میں "عالمی ادب کی تمام تر رعنائیاں موجود ہیں جو آپ کی نگاہ کو حیرت اور استعجاب میں ڈالنے پر مجبور کریں گی۔ آپ انگشت بدنداں ہو کر اس کتاب کی ہر سطر پر اپنی نگاہ ڈالیں گے" عبارت کے نشیب و فراز سے قطع نظر اس قسم کی افراط، استعجاب سے زیادہ تشکیک کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔

ابتدا میں اس کتاب کو ڈانس ڈرامہ بھی کہا گیا ہے جو موسیقی اور رقص کے ساتھ پسِ پردہ یا اسٹیج سے پڑھا جا سکتا ہے۔

اس کتاب کا مطالعہ ان دعاوی کے پسِ منظر میں ہی کرنا چاہئے۔ مزید رہنمائی کے لئے مصنف نے شروع میں ایک مقدمہ بھی [illegible] مصنف کے عنوان سے تحریر کیا ہے شروع ہی میں یہ تنبیہ کی گئی ہے کہ اُردو اور ہندی دونوں زبانوں میں شاعری بول چال کی زبان میں نہیں ہوتی "ظاہر ہے کہ اسٹیج اور فلم کے لئے [illegible] طویل نظم کو بول چال کی زبان ہی میں ہونا چاہئے۔ اس زبان کے کچھ نمونے دیکھئے۔

(۱) تاریخ کے ہونٹوں پہ یاد کی قندیلیں لگی ہیں۔
(۲) سفید سفید راتوں میں تھپتھپے لگے ہوئے ہیں
— پھول نکلے ہوئے ہیں
برق پا آواز ہوتی ہے

فروزاں ہوتی ہے قندیل
بجھ جاتی ہے قندیل

(۳) تاج محل سے بیمار انسانوں کی رونت ٹپکتی ہے

(۴) تاریخ ابھی تخلیق کے قہقہوں سے محروم نہیں ہے۔

اور اس کے بعد اس "عرض مصنف" کو پیش نظر رکھئے کہ اُردو اور ہندی دونوں کی شاعری "ناقی کے تقید خانے" میں بند ہے۔ لیکن قندیل اور سفید یا "رونت" وغیرہ بھی تاج محل کے آزاد خانے نہیں ہیں۔ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اس قسم کے متفرقانہ اور شاعرانہ گوشے شہیر کے یہاں کم ہیں۔ وہ علی العموم اپنے بنائے ہوئے پیمانوں کے اندر ہی رہتے ہیں۔

(۱) محنت کش طبقہ کے ہمدرد اور بھی خواہ چائے خانوں میں بیٹھے ہوئے ہیں۔
لوگ ان کے مسائل پہ غور کرتے ہیں۔

(۲) کروڑوں انسانوں کے خون سے نقش ابھارا گیا ہے۔

تمہاری دوکانوں میں یہ خون بہت آسانی سے مل سکتا ہے۔

شاعر نے اپنے کو قدیم ڈکشن سے ہی آزاد نہیں کیا ہے بلکہ تمام عروضی پابندیوں سے بھی آزاد کر لیا ہے اور اس میں نظم آزاد اور نثر لطیف کا فرق بھی ختم ہو گیا ہے۔ یہ ایک نیا تجربہ ہے جس سے وہ لوگ مزید بدکیں گے جو شاعری کو صرف خیال و موضوع سے نہیں بلکہ ہیئت اور مجموعی جمالیاتی تاثر کے پیمانوں سے بھی ناپتے ہیں۔

اس طویل تخلیق کو جس صنف ادب کا بھی نمایندہ مانا جائے لیکن اتنا تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس میں اسٹیج کئے جانے کی صلاحیتیں موجود ہیں۔ اسٹیج کے لئے اُردو شاعری میں جدید سرمائے کا فقدان ہے لیکن اسٹیج کی ضرورتوں اور تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر کی جانے والی شاعری کے عناصر ترکیبی کیا ہوں، اس پر غور و فکر کی ضرورت ہے۔ شہیر کا کام اس سمت ایک قدم ہے لیکن ایسا قدم جس میں لغزشیں زیادہ ہیں۔ اُردو شاعری جن عروضی اشکال اور غنائی آثار کا مجموعہ ہے ان سے یکسر نگاہ موڑ کر شعر کو نثر نما بنا دینا اس مقصد ہی کو فوت کر دینا ہے جس کو لے کر شاعر نے آغاز سفر کیا تھا۔ جن شہیر کے یہاں شاعرانہ احساس ہے لیکن ہیئت سے کلیتہً اغماض اور مقصدیت کی بہتات فن کو مجروح بھی کر دیتی ہے۔

اس مجموعے میں نئے ڈکشن کا استعمال خصوصیت سے قابل توجہ ہے۔ شہیر نے اس سلسلے میں کامیاب تجربہ کیا ہے اگر وہ غنائی اور وہ عروضی پہلوؤں پر نظر ثانی کر کے کوئی نیا پیمانہ یا سانچا بنا سکیں تو زیادہ توانا تخلیقیں اُبھر سکتی ہیں۔

(علی جواد زیدی)

## سراوِل کے سفیر — شعری انتخاب

قیمت — تین روپیہ

ناشر — مولانا آزاد لائبریری، بیج راجپورہ، کوٹہ نمبر ۶

"سراوِل کے سفیر" راجستھان کے جدید شعراء کا شعری انتخاب ہے جس میں ابن رضا، احتشام اختر، خلیل تنویر، شاہد عزیز، ظفر غوری، ظفر احمد پرواز، عابد ادیب، عقیل شاداب، فضل المتین، مخمور سعیدی اور ممتاز راشد کے منتخب کلام پیش کئے گئے ہیں۔ کتاب کی ابتداء میں "آئینہ داران دشت" کے عنوان سے شمس الرحمٰن فاروقی کا دیباچہ قابل توجہ ہے جس میں موصوف نے شعری انتخاب پر تبصرہ کم اور اپنی عظمت کا مظاہرہ زیادہ کیا ہے۔ یہ سوال اٹھانا ہی غلط ہے کہ شاعری کس جگہ سے ہو رہی ہے۔ اُردو شاعری کا حلقہ ہمیشہ وسیع رہا ہے جس کا سلسلہ حیدرآباد سے لاہور اور کلکتہ سے گجرات تک پھیلا رہا ہے۔ پھر موصوف نے ان جدید تر شعراء پر کچھ جدید شعراء کا اثر تلاش کیا ہے۔ میرے خیال میں یہ ریمارک قبل از وقت ضرور ہے۔ "سراوِل کے سفیر" صاف ستھرا انتخاب ہے جس میں نظمیں اور غزلیں شامل ہیں مگر غزلوں کا انتخاب نظموں سے عمدہ ہے۔ کچھ نظمیں بے حد کمزور ہیں۔ خلیل تنویر، شاہد عزیز کی نظمیں اور احتشام اختر، ممتاز راشد کی غزلیں قابل توجہ ہیں۔ مخمور سعیدی کا کلام اپنی پختگی اور برجستگی کی وجہ سے سب سے بہتر ہے۔ اس خوبصورت انتخاب کے لئے مرتبین مبارک باد کے مستحق ہیں۔ جنہوں نے کچھ ابھرتے ہوئے نوجوان شعراء کی حوصلہ افزائی کی ہے۔

کتابت اور طباعت میں سادگی اور سلیقہ ہے۔

## تنقید اور تشخیص (تنقیدی مضامین)

مصنف: ارشد کاکوی — ناشر: عظیم الشان بک ڈپو، پٹنہ ۶

قیمت: پانچ روپے پچاس پیسے

"تنقید اور تشخیص" ارشد کاکوی مرحوم کے چودہ مضامین کا مجموعہ ہے جو اگست ۱۹۷۰ء میں پہلی بار شائع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ "پیش گفتار" کے عنوان کے تحت جناب عطا کاکوی نے پیش لفظ لکھا ہے۔ اس مجموعے میں ارشد مرحوم کے ان مضامین کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو ہند و پاک کے مختلف ادبی جریدوں میں بکھرے پڑے تھے۔ پہلا مضمون "نشاط رفتہ" کے عنوان کے تحت ہے جس میں ڈاکٹر عندلیب شادانی کے مجموعۂ کلام پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد تین مضامین "جمیل مظہری ایک مطالعہ"، "غلط یہ لفظ" اور "شعلۂ ندا" علامہ جمیل مظہری سے متعلق ہیں۔ آخری مضمون یعنی "شعلۂ ندا" ایک مکتوب ہے جو جمیل مظہری کو لکھا

گیا ہے جس میں رضوی صاحب کی شاعری پر بحث کی گئی ہے۔ بیکل ناتھ آزاد اور شکیل بدایونی کی شاعری پر دو مضامین بڑی کاوش سے لکھے گئے ہیں۔ "ایک نئی آواز" کے عنوان سے احمد عظیم آبادی کی شاعری پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ "شعر یا ترنم" کے عنوان کے تحت مصنف نے ماہنامہ "آج کل" میں چھڑی ہوئی بحث پر تبصرہ کیا ہے جس میں شاعروں کی اہمیت اور شعر کو ترنم سے پڑھنے کی افادیت پر بحث کی گئی ہے۔ "غالب کے دو شعر" کے عنوان کے تحت ان کے دو مشہور شعر

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

اور

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

کی تشریح کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ "مکتوب نیاز۔ شیفتہ کی شاعری" "کچھ وحشت (کلکتوی) کے بارے میں" "اثر لکھنوی کی غزل گوئی" اور "رباعیات شاد" (عظیم آبادی) پر مصنف نے طبع آزمائی کی ہے۔

ارشد کا اسلوب بڑا دلکش ہے، جس موضوع پر بھی بحث کا آغاز کیا ہے۔ اسے بڑے مدلل اور فکر انگیز انداز میں انجام تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ مجموعہ اردو ادب کے طالب علموں کے لئے سود مند ثابت ہوگا۔

کتابت اور طباعت گوارا ہے۔ قیمت کچھ زیادہ ہے۔

## بھول ہی بھول (مزاحیہ ڈراموں کا مجموعہ)

مصنف: اطہر افسر   قیمت: تین روپیہ

ناشر: نسیم بک ڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ

"بھولے ہی بھولے" اطہر افسر کے مزاحیہ ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ یہ ڈرامے ملک کے مختلف سماجی اداروں کی جانب سے اسٹیج کئے جا چکے ہیں۔ ان میں بیشتر ملک کے مختلف ادبی جریدوں میں شائع بھی ہو چکے ہیں۔ اطہر افسر اردو زبان کے جانے پہچانے ڈرامہ نگار ہیں۔ یوں تو اردو ڈرامہ نگاری بہت پیچھے ہے مگر چند نام ایسے ضرور ہیں جنہوں نے کچھ قابل تعریف کوششیں کی ہیں۔ ان میں اطہر افسر بھی ہیں۔ ڈراموں کے ساتھ یہ ٹریجڈی ضرور ہے کہ جو ڈرامہ اسٹیج پر نہایت کامیاب رہتا ہے۔ وہی پڑھتے وقت نہایت پھیکا سا معلوم ہوتا ہے پھر بھی اس مجموعے کے کچھ ڈرامے نہایت دلچسپی سے پڑھے جائیں گے جن میں بھولے ہی بھولے، حیدر بھائی تو، حضرت پہلے وغیرہ خاصے دلچسپ ہیں۔

کتابت طباعت اچھی ہے۔ گیٹ اپ گوارا ہے۔

## گل ہائے رنگ رنگ (مجموعہ کلام)

مصنف: عطا کاکوی   قیمت:

ناشر: عظیم الشان بک ڈپو پٹنہ ۴

"گل ہائے رنگ رنگ" عطا کاکوی کے متفرق اشعار کا مجموعہ ہے جس میں شاعر نے عنوانات کے تحت اشعار کا انتخاب کیا ہے جیسے آشیانہ و فغاں قفس اور آشیاں، بلبل اور چمن، حسن و عشق، شمع اور پروانہ وغیرہ وغیرہ۔ ان فرسودہ اور روایتی مضامین کو شاعر نے اپنے طور سے محسوس کرنے کی کوشش کی ہے چونکہ غزل کے اشعار معنوی طور پر منفرد ہوتے ہیں اس لئے ایک ہی موضوع پر ہر شعر اپنے اندر ایک الگ گنجینۂ معنی کا طلسم رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے عطا کاکوی صاحب کامیاب ہیں اور ان کا یہ تجربہ ادبی حلقوں میں سراہا جائے گا۔

## جمال غزل (مجموعہ کلام) مصنف: عطا کاکوی

"جمال غزل" عطا کاکوی صاحب کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ غزلوں میں روایتی رنگ ہوتے ہوئے بھی موجودہ دور کے مسائل سے شاعر بالکل ناآشنا نہیں ہے۔ ہر قسم کے اشعار ہیں مگر لہجہ سنجیدہ، متصوفانہ اور فلسفیانہ ہے۔ غزلوں کا اسلوب دلکش ہے جس میں احساس کی سچائی اور تازگی جھلکتی ہے مثلاً

ترے حضور زماں و مکاں کی قید نہیں
یہ شش جہات ہیں کیا ماہ و سال ہے کیا

## دو دل درد بھرے (ناول)

مصنف: صالح محمد ثاقب   قیمت: ایک روپیہ ۵۰ پیسے

ملنے کا پتہ: شنکر بک اسٹور ڈیگ (راجستھان)

"دو دل درد بھرے" صالح محمد ثاقب کا مختصر ناول ہے جو قومی یکجہتی جیسے اہم موضوع کو لے کر لکھا گیا ہے۔ ناول کا فن جتنا آسان معلوم ہوتا ہے اتنا ہی مشکل ہے۔ ایک مضبوط اور مربوط پلاٹ کے ساتھ ساتھ ناول میں پُرکشش اسلوب کی بھی ضرورت پڑتی ہے جو کہانی کو حقیقت کے قریب لائے۔ کسی

آدرش یا اخلاق کے سہارے ناول نگاری کے فن کو کامیاب نہیں بنایا جاسکتا۔ ضرورت ہوتی ہے جیتے جاگتے کرداروں کی جو کہانی میں زندگی کی حقیقی عکاسی کرسکیں۔ دو دِل درد بھرے کی سب سے بڑی کمزوری یہی ہے کہ اس میں کرشن اور گیتا جیسے مثالی کردار بھی متحرک نہیں بن سکے ہیں۔ پھر بھی صالح محمد ناشب کا یہ ناول قابلِ قدر ضرور ہے کیونکہ اس پُرآشوب دور میں ایسے ناولوں کی سخت ضرورت ہے جو قومی یکجہتی کو فروغ دے سکیں۔ ناول کی کتابت، طباعت اور گٹ اپ خوبصورت ہے۔

## فغانِ درد (مجموعۂ کلام) مہتہ درد دہلوی

قیمت : تین روپے پینتیس پیسے

ملنے کا پتہ: نیشنل پبلشرز ۴/۱۳ پریم نگر ڈبل اسٹوری نئی دہلی ۱۸

"فغانِ درد" مہتہ درد دہلوی کا مجموعہ کلام ہے جس میں نظمیں، غزلیں، قصیدے نعتیں، قطعات اور رباعیات وغیرہ شامل ہیں۔ درد صاحب کہنہ مشق شاعر ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ایک پُرانے قومی کارکن بھی ہیں اس لئے ان کی شاعری اُن کے قومی شعور اور حب الوطنی کے جذبے سے لبریز ہے۔ چونکہ آدمی پُرخلوص ہیں اور دل محبت اور ہمدردی سے سرشار ہے اس لئے انہوں نے ملک وسماج میں جو کچھ دیکھا ہے اُسے سیدھی سادی زبان میں پُرخلوص ڈھنگ سے بغیر کسی تصنع کے بیان کر دیا ہے۔ جہاں انہوں نے خارجی موضوعات سے ہٹ کر داخلی موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے وہاں وہ زیادہ کامیاب ہیں ان نظموں میں اثر بھی ہے اور زبان وفن کے لحاظ سے بھی قابلِ قدر ہیں۔ شکوہ، سچی بات، حسن اور ایمان، سرزمین کربلا، جمنا دہلی، نالۂ درد وغیرہ قابلِ ذکر نظمیں ہیں۔

غزلیں روایتی انداز میں کہی گئی ہیں۔ چونکہ وارداتِ قلب بیان کئے گئے ہیں اس لئے اس میں خلوص بھی ہے اور کہیں کہیں اثر بھی ہے مگر انفرادیت نہیں ہے جسے اُن کا مخصوص لہجہ کہا جاسکے۔ محسوسات کو پُرخلوص ڈھنگ سے بیان کر دینا ہی اچھی شاعری نہیں ہے بلکہ ان محسوسات کو انفرادی ڈھنگ سے مخصوص لب ولہجہ کے ساتھ بیان کرنا بھی اچھی شاعری کے لئے ضروری ہے پھر بھی کچھ شعر ایسے مِل جائیں گے جو دل کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔

## تابشِ انجم (مجموعۂ کلام)

مصنف: انجم لدھیانوی — قیمت: تین روپیہ

ملنے کا پتہ: ادارہ ایالی عیسیٰ نگر نئی لدھیانہ

"تابشِ انجم" انجم لدھیانوی کا مجموعۂ کلام ہے جس میں غزلیں، نظمیں، گیت اور مناجات وغیرہ سبھی کچھ شامل ہیں۔ انجم صاحب جواں سال شاعر ہیں اور آپ نے کہنہ مشق شاعر منور لکھنوی مرحوم سے فیض بھی اٹھایا ہے۔ پیشے کے لحاظ سے معلم اور مذہبی لحاظ سے مسیحی ہیں۔ اس لئے شاعری میں اخلاقی پہلو ہر جگہ نمایاں ہے۔ آپ نے ہر موضوع پر طبع آزمائی کی کوشش کی ہے۔ عوامی مذاق کا ہر سامان آپ کے کلام میں مِل جاتا ہے مگر انجم صاحب کی اُردو شاعری سے دلچسپی کو دیکھتے ہوئے میرا نیک مشورہ ہے کہ انہیں شاعری سے اپنی وابستگی برقرار رکھنے کے لئے ابھی بہت کچھ کرنا ہوگا۔ اساتذہ کے کلام سے لے کر موجودہ شاعری کے رجحانات کا بغور مطالعہ بھی کرنا ہوگا اپنی شاعری میں گہرائی اور گیرائی پیدا کرنے کے لئے پوری اُردو شاعری کی تہوں میں جھانکنا ہوگا۔ پھر بھی اُن کی کاوش قابلِ قدر ہے۔ آخر میں جناب منور لکھنوی مرحوم کے مشورے کو دہراؤں گا جو انہوں نے مجموعہ کی ابتدا میں بطور تعارف لکھا تھا۔

"انجم صاحب کے کلام سے میں نے اندازہ لگایا کہ اُن کی طبیعت موزوں ہے اُن میں شعر کہنے کی صلاحیت ہے اور اگر وہ احتیاط کے ساتھ شعر گوئی کی طرف مائل ہوں تو جلد ایک اچھے شاعر بن سکتے ہیں"۔

(شاہد ماہلی)

## ہندوستان کی مسجدیں

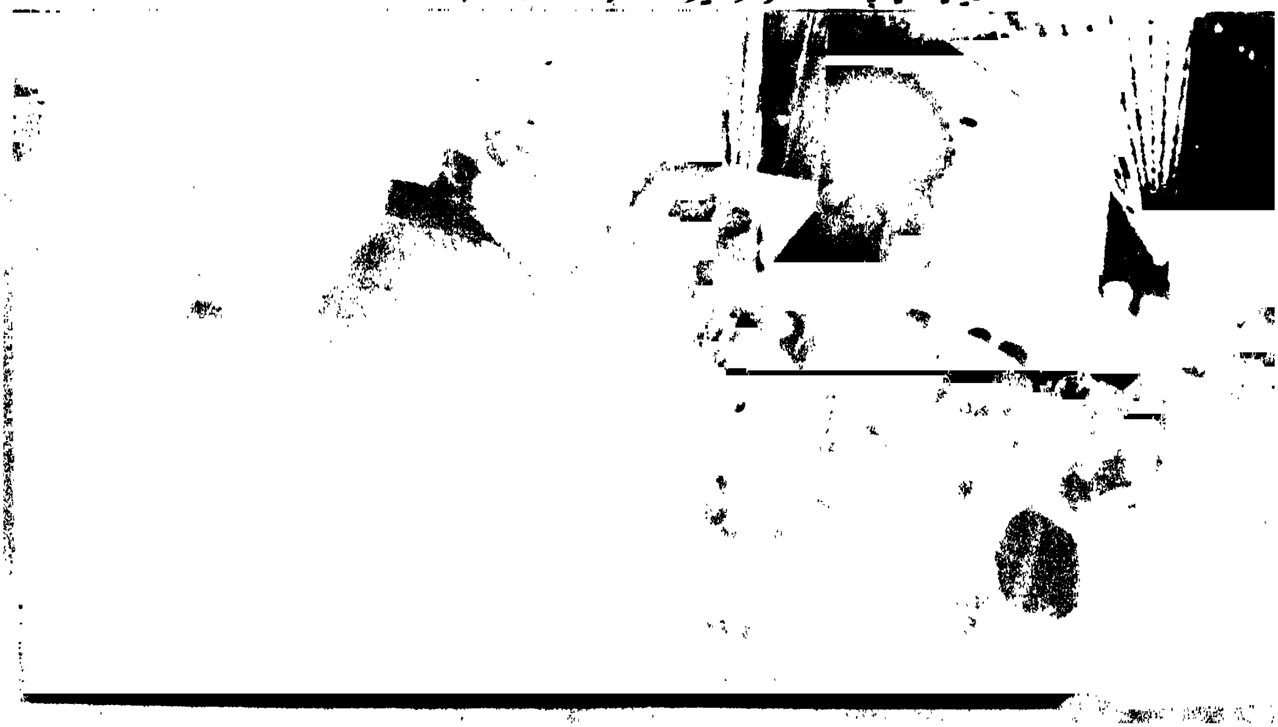


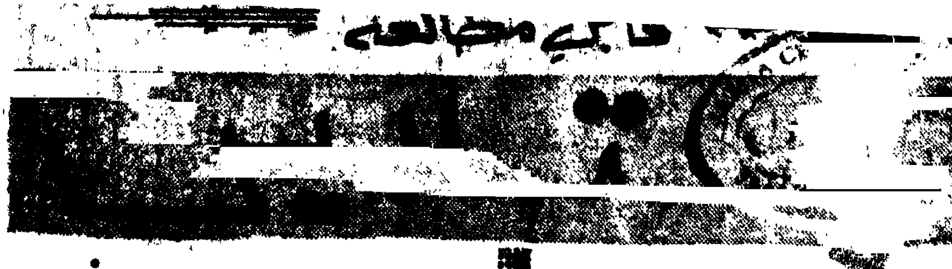
بچوں کی پیدائش میں وقفہ کیجئے
بچوں کی پیدائش اتفاق کی بات نہیں
یہ آپ کے اختیار میں ہے۔ نرودھ
استعمال کرنے سے آپ کے بچے تبھی
ہوں گے جب آپ چاہیں گے، اتفاق
سے نہیں۔
بچہ اور ماں
کی صحت کیلئے
ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ بچے کو شروع کے تین
برسوں میں زیادہ توجہ درکار ہوتی ہے۔
پھر بچے کی پیدائش کے بعد ماں کو اپنی
صحت بحال کرنے میں بھی وقت لگتا ہے۔
نرودھ استعمال کر کے آپ اگلے بچے کی
پیدائش ملتوی کر سکتے ہیں۔
نرودھ (کنڈوم) اعلیٰ کوالٹی کے ربڑ سے
بنتا ہے۔ دنیا بھر میں لوگ اسے استعمال
کرتے ہیں کیونکہ یہ فیملی پلاننگ کا آسان
و محفوظ طریقہ ہے۔ اس کے استعمال سے
صحت پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا۔
نرودھ ہر جگہ ملتا ہے۔
پرچون، اسٹور، کریانہ فروش،
کیمسٹ، جنرل مرچنٹ، پان فروش
وغیرہ کی دکانوں پر بکتا ہے۔
صرف
آپ
اپنے
نرودھ
فیملی پلاننگ
15



...مطابق ۱۹۷۰ اکتوبر دہلی میں فرقہ پرستی کے خلاف چوتھے قومی کنونشن کا انعقاد ہوا جس کا افتتاح وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے کیا
(تصویر میں) شریمتی اندرا گاندھی اجلاس کو خطاب کر رہی ہیں۔

۱۷ دسمبر ۱۹۷۰ء کو عرس محل نئی دہلی میں حضرت امیر خسرو کا ۶۶۵ واں عرس منایا گیا جس میں حسب سابق پاکستانی زائرین بھی شریک ہوئے۔
(تصویر میں) ایک پاکستانی شاعر حضرت امیر خسرو کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے۔





| | |
|---|---|
| ہمارا جھنڈا | ایک روپیہ |
| بھارت آج اور کل | ۷۵ پیسے |
| دو شہروں کی کہانی (چارلس ڈکنس) | ۵ روپے |
| جوالا مکھی (ناول، اننت گوپال شیوڑے) | ۲ روپے ۵۰ پیسے |
| ہندوستان کا دستور | ۲ روپے |
| آئینہ غالب | ۵ روپے |
| آج کل کی کہانیاں | ۳ روپے ۵۰ پیسے |
| وطن کے نغمے | ایک روپیہ ۷۵ پیسے |
| امرجوت | ۲ روپے |
| سائنس کے چند پہلو | ایک روپیہ ۷۵ پیسے |
| ہمارے نہرو | ۳ روپے ۵۰ پیسے |
| گنجینۂ غالب | ۴ روپے ۵۰ پیسے |
| ہندوستان کی مسجدیں | ۲ روپے ۵۰ پیسے |
| مہاتما گاندھی کی کہانی (رنگین تصویروں میں) | ۲ روپے ۵۰ پیسے |
| اچھا شہری (بچوں کے لئے) | ایک روپیہ |
| نہرو رادھا کرشنن کی نظر میں | ایک روپیہ |
| ابوالکلام آزاد | دو روپے |
| ہندوستان کی تاریخ (بچوں کے لئے) | ۳ روپے ۷۵ پیسے |
| ہندوستان کی نامور ہستیاں (حصہ اول) | ۲ روپے ۲۵ پیسے |
| ہندوستان کی نامور ہستیاں (حصہ دوم) | ۲ روپے ۵۰ پیسے |
| ہندوستان کی نامور ہستیاں (حصہ سوم) | ۲ روپے ۵۰ پیسے |
| سوامی وویکانند (بچوں کے لئے) | ایک روپیہ ۵۰ پیسے |
| جواہر لال نہرو (خراج عقیدت) | ۲ روپے ۵۰ پیسے |
| ہندوستان میں تعلیم کی از سر نو تنظیم (ڈاکٹر ذاکر حسین) | ایک روپیہ [illegible] پیسے |
| ہندوستانی ڈرامہ (صفدر آہ) | ۳ روپے [illegible] پیسے |
| پنڈت نہرو سے بات چیت (تیبر منڈے) | ۲ روپے |
| ندیا کنارے (علی عباس حسینی) | ایک روپیہ |
| کلچر یا تہذیب کا مستقبل (ڈاکٹر رادھا کرشنن) | ۷۵ پیسے |

آج کل کے خریداروں کو ۲۰ فی صد رعایت ہوگی
محصول ڈاک ہمارے ذمہ ہوگا

اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی اور تمام علاقائی زبانوں میں کتابیں شائع ہوتی ہیں

فہرست کتب مفت طلب کیجئے

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

Vol. 29 No. 7 A J K A L (Monthly) February 1971

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi.
Printed by Skylark Printers, 11355 Idgah Road, New Delhi-55
Regd. No. D-509

# آجکل

مارچ ۱۹۷۱ء

۶۰ پیسے

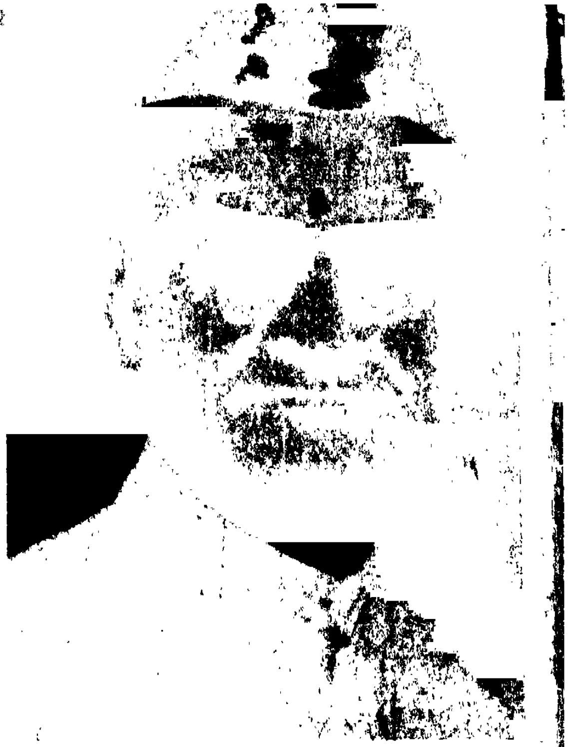




## پدم شری کا اعزاز پانے والے اُردو شعراء



جوش ملسیانی



جناب حیات اللہ انصاری

آپ کے ناول "لہو کے پھول" کو ساہتیہ اکادمی نے اُردو کی بہترین تخلیق قرار دیا ہے

ساحر لدھیانوی





غلام ربانی تاباں

اردو کا مقبول عام مصور ماہنامہ

# آجکل

نئی دہلی

ایڈیٹر
شہباز حسین

سب ایڈیٹر
نند کشور وکرم

جلد ۳۹ شمارہ ۸
مارچ ۱۹۸۱ء
پھاگن چیتر شک ۱۹۰۲
جمادی الاول جمادی الثانی

سالانہ: ہندوستان میں ساتھ روپے
دیگر ممالک سے [illegible]
فی پرچہ ستر پیسے
دیگر ممالک سے [illegible]

فہرست



مضامین اور ترسیل زر کا پتہ
شہباز حسین ایڈیٹر آجکل [illegible] پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

ناشر: ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

# ملاحظات

۲۰ جنوری ۱۹۷۱ء کو وزیر اعظم ہند شریمتی اندرا گاندھی نے وشاکھاپٹنم میں فولاد کے ایک کارخانے کا سنگِ بنیاد رکھا۔ یہ کارخانہ ۵ ارب روپے کی لاگت سے تعمیر ہوگا اور اس سے لگ بھگ ۱ لاکھ ۵۰ ہزار افراد کو روزگار ملے گا۔ ملک میں تعمیر و ترقی کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے پیشِ نظر لوہے اور اسپات کی مانگ میں بڑی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔

آزادی کے وقت ملک میں فولاد کے صرف دو ہی کارخانے تھے جن کی سالانہ پیداوار پندرہ لاکھ ٹن تھی۔ اس کمی کو مدِنظر رکھتے ہوئے جنوری ۱۹۵۴ء میں ہندوستان اسٹیل لمیٹیڈ کی داغ بیل ڈالی گئی جس کے زیرِ انتظام رورکیلا، بھلائی اور درگاپور میں اسپات کے تین کارخانے کھولے گئے، پرائیویٹ سیکٹر کے دو کارخانوں کی پیداوار بڑھانے کے لئے مالی امداد دی گئی۔ اس طرح ۱۹۶۱ء تک ملک میں ۶۰ لاکھ ٹن فولاد پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا کی گئی۔ مزید ضرورتوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے تیسرے پلان کی مدت ۱۹۶۱-۶۶ء میں بھلائی کے کارخانے کی پیداواری صلاحیت ۲۵ لاکھ، اور رورکیلا کی ۱۸ لاکھ ٹن اور درگاپور کی ۱۶ لاکھ ٹن مقرر کی گئی۔ مگر فولاد کی مانگ میں اضافہ جاری ہے لہٰذا بوکارو میں اسپات کا ایک بہت بڑا کارخانہ زیرِ تعمیر ہے۔ چوتھے پلان کے اختتام تک اسپات کی مانگ ۱۵۰ لاکھ ٹن تک پہونچ جانے کی توقع ہے۔ اس خیال کے تحت جنوبی ہندوستان میں سیلم، ہوسپٹ اور وشاکھاپٹنم کے مقام پر تین متوسط درجے کے کارخانے کھولنے کی منظوری دی گئی ہے جس میں وشاکھاپٹنم کے کارخانے کی تعمیر شروع ہو گئی ہے۔ ایسی بنیادی صنعتیں ملک کی خوشحالی کی ضامن ہیں۔

---

حال میں ساہتیہ اکاڈمی نے ہندوستان کی مختلف علاقائی زبانوں کے لئے انعام دینے کا اعلان کیا ہے ان میں اُردو کے ممتاز صحافی، افسانہ نویس اور ناول نگار جناب حیات اللہ انصاری کا ناول "لہو کے پھول" بھی شامل ہے۔

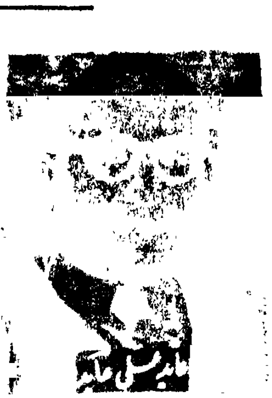
"لہو کے پھول" اردو کا ضخیم ترین ناول ہے جو پانچ جلدوں میں ہے اور ۲۶ صفحات پر محیط ہے۔ اس قابلِ قدر تصنیف کو ادبی حلقوں میں بے حد سراہا گیا تھا۔ ادارہ اس اعزاز پر مصنف کو مبارکباد پیش کرتا ہے۔

---

اچھے شاعر کے لئے اچھا انسان ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ بات ہر جگہ درست ہو یا نہ ہو مگر جناب شاہد عزیز رائش صدیقی پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ مرحوم ملک کے ممتاز اور منفرد شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بڑی دل نواز شخصیت کے مالک تھے اور سادگی اور شرافت، انکسار و استغنا، اور نیکی و اخلاص کا مجسمہ تھے۔ اس زمانے میں بہت کم انسان ایسے ہوتے ہیں۔

۲۲ اور ۲۳ جنوری کی درمیانی شب میں شاہجہاں پور (یوپی) کے ایک مشاعرے میں شریک تھے کہ دل کا دورہ پڑا جس سے جانبر نہ ہو سکے۔ ان کی موت واقعی ایک عظیم سانحہ ہے۔ ؎ ابھی تو کوشش پر آمادہ تھی بھری محفل یہ کہاں پہ تو نے کہانی کا اختتام کیا (رائش)

---



پاکستان کے ممتاز اُردو ادیب اور شاعر جناب عابد علی عابد کا ۲۰ جنوری کو لاہور میں انتقال ہو گیا۔ آپ کی عمر ۷۰ سال تھی۔

آپ نے مختلف حیثیتوں میں اُردو کی اہم خدمت انجام دی ہے۔ اُن کی موت اُردو کے لئے ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔

---

ادارہ آجکل ممتاز شاعر جناب [illegible] کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔



# خودکلامی

علی جواد زیدی

میں نہ کہوں تو کون کہے گا؟
صحراؤں کے دُکھ کی کہانی، قبروں کے مایوس فسانے
ارض و محشر کا دردِ جدائی، بستیوں کے جگ مگ ویرانے
پتی پتی سوکھی ہوئی سی، گوشہ گوشہ اُجڑا ہوا سا
بستی بستی گھائل سپنے، لاکھ شکاری، لاکھ نشانے
میں نے سمیٹے دامن دامن، کانٹوں میں مدفون تبسم
دل نے بکھیرے صحرا صحرا، پھولوں کے محبوس ترانے
دیدۂ نسیاں نے بھی دیکھی، سوکھے دریاؤں کی روانی
چشمِ تمنا میں بھی ناچے، اُجڑے ہوئے غمگین زمانے
بے خود محفل کیا سمجھے گی، تشنہ لبوں نے کیا کیا دیکھا
چھلکے ہوئے تو پھر بھی غنیمت، لیکن یہ چھلکے پیمانے!

میں نہ کہوں تو کون کہے گا؟
میں نے تو بچپن بھی دیکھا ہے، ولولۂ لشکرِ سرکش کا
یہ میری گودی میں کھیل ہے، میں نے اسے چلنا سکھلایا
یہ روٹھی تو منایا میں نے، مچلی تو بہلایا میں نے
روئی تو گانا گایا میں نے، گرنے لگی تو میں نے سنبھالا
اس کی خاطر تتلایا ہوں، اور خود بچہ کہلایا ہوں
مہد سے محفل تک لایا ہوں، طفلِ تابہ شبابِ دانا
بات کرے گی سب سے چھپا کر، راز کہے گی کانوں میں جاکر
بھول بنے گی باہر آکر، مصلحتوں کا ڈال کے پردا
جس پہ یہ سب بیتی ہو وہ جانے، اس پاگل دنیا کی کہانی
ڈوبنے والا ہی پائے گا، اس اُلٹی گنگا کا کنارا

میں نہ کہوں تو کون کہے گا؟
چھوٹی سی تھی دل کی انگنائی، جس میں گھٹا دکھ دردِ جہاں کا
سانس چلی جب اندر دیکھا تیر لگا جب باہر جھانکا
تیر چلیں یا پتھر برسیں، دل جل جائیں، نظر پھنک جائے
پھر بھی کافر آس نہ ٹوٹے، حوصلہ تو دیکھو انساں کا
رام اور کرشن کی لے گونجے گی، سقراط و عیسیٰ اٹھیں گے
شبیر و موسیٰ ابھریں گے، میں شک کرنے والا کہاں کا
انسانی امید کے نغمے، نانک اور گوتم چھیڑیں گے
گاندھی کی صورت دھارے گا، وقت کا تیور ترچھا بانکا!
آج بھی کوئی ہمت باندھے، اِس سے اپنے اُس کو ٹوکے
آج بھی کوئی ہنس کر کر لے، استقبال غم و حرماں کا

میں نہ کہوں تو کون کہے گا؟
ایک بھیانک خاموشی میں، چاند ہمارا کھویا کھویا
اک میلی سی چادر اوڑھے، جاگا جاگا سویا سویا
گھبرایا سا اُلجھا اُلجھا، ہانپ رہا ہے کانپ رہا ہے
اکثر شاید یہ بھی ہوا ہے، خود بھی رویا میں بھی رویا
جھوٹی محبت، جھوٹے ہی آنسو، عشق و محبت پہلو بہ پہلو
چاند! مگر پھر بھی تھے تنہا، تو نے غبارِ غم بھی تو دھویا
تاریکی میں لپٹی دنیا، سہمی سہمی ڈول رہی ہے
ڈول رہی ہے، بول رہی ہے "اب وہ کاٹو جو پہلے بویا"
میں نہ کہوں تو کون کہے گا، دنیا جھوٹی چاند بھی جھوٹا
یہ تاریکی فکرِ سحر ہے، یہ خاموشی اک لبِ گویا
میں نہ کہوں تو کون کہے گا؟



میری پیدائش آگرہ میں ۱۹۰۸ء میں ہوئی میرے والد ڈاکٹر محمد ابرار حسین صاحب مرحوم کو اس کی بڑی فکر تھی کہ تعلیم کے ساتھ میری تربیت اور نگہداشت بھی خاطر خواہ طور پر ہونی چاہئے۔ اسی بنا پر میری ابتدائی تعلیم مکان پر ہی ہوئی۔ ایک مولوی صاحب جو میرے اتالیق تھے فارسی عربی پڑھاتے تھے اور ایک ماسٹر صاحب شام کے اوقات میں دو گھنٹے انگریزی حساب اور جغرافیہ کی تعلیم دیتے تھے۔ میری خوش قسمتی تھی کہ مولوی صاحب جن کا نام خورشید علی تھا اور ماسٹر صاحب دونوں ہی اُردو ادب و شعر کا ذوق رکھتے تھے اس سے خود مجھ میں اُردو شعر و شاعری اور اس کے ادب کے مطالعہ کا شوق پیدا ہو لیکن اس زمانے میں میرے ادبی اور شعری مطالعہ کا شوق پرواز مرزا داغ دہلوی کے مختلف دیوانوں اور ہلکے پھلکے افسانوں اور ناولوں تک محدود رہا۔ مکان پر تین برس تک تعلیم پانے کے بعد والد صاحب نے فیصلہ کیا کہ اب میں پہلے عربی اور اسلامی علوم و فنون کی تکمیل کروں اور اس کے بعد انگریزی کے امتحانات پاس کر کے اسے بھی پورا کر لوں۔ اس تجویز کے ماتحت مجھ کو پہلے مراد آباد اور پھر دیوبند بھیج دیا گیا جہاں چھ برس رہ کر میں نے نصاب کی تکمیل کی یوں تو الحمد للہ دیوبند میں جس سے بھی درس لیا وہ اپنے فن کا مسلم استاد اور ماہر تھا لیکن یہاں سب سے زیادہ میں جن سے متاثر ہوا وہ تین استاد تھے ایک مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی۔ جو منطق اور فلسفہ کے امام تھے دوسرے مولانا محمد اعزاز علی جن کو عربی زبان اور اس کے صرف و نحو پر غیر معمولی عبور حاصل تھا اور تیسرے مولانا محمد انور شاہ الکشمیری رحمۃ اللہ علیہم اوّل الذکر دونوں اساتذہ کے فیض درس و تعلیم سے عربی زبان و ادب کے مطالعہ کا ذوق اور کسی مسئلہ پر بحث کرتے وقت منطقی اور فلسفیانہ استدلال کا سلیقہ تھوڑا بہت تو کچھ پیدا ہو ہی گیا تھا لیکن جب مولانا محمد انور شاہ الکشمیری کے درس بخاری میں پہنچا تو بالکل یہ محسوس ہوا کہ گویا ایک کوچۂ تنگ سے نکل کر اچانک ایک نہایت وسیع و عریض اور سرسبز و شاداب چمن میں آ پہنچا ہوں جہاں جلوۂ گل کی فراوانی، چشم کو ہر رنگ میں وا ہو جانے کی دعوت دے رہی تھی۔ کہنے کو یہ درس حدیث کی ایک کتاب (صحیح بخاری) کا تھا لیکن اسلامی علوم و فنون کا وہ کونسا شعبہ تھا جس کے مسائل زیر بحث نہ آتے ہوں اور شاہ صاحب ان پر نہایت سیر حاصل محققانہ گفتگو نہ کرتے ہوں۔ ان کا مطالعہ جس قدر وسیع تھا حافظہ بھی ایسا ہی تھا۔ دوران تقریر میں کتابوں کے حوالے کے ساتھ ان کی عبارتیں بھی نقل کرتے چلے جاتے تھے۔ پھر اُن کے ہاں نقل ہی نہیں تھی، بلکہ مختلف کتابوں اور اُن کے مصنفین سے متعارف کراتے اور اُن کے کارناموں پر نقد و تبصرہ فرماتے تھے۔ حضرت شاہ صاحب



سعید احمد اکبرآبادی

کی نجی گفتگو بھی علمی اور ادبی انداز کی ہوتی تھی اس بنا پر خصوصیت سے درس اور اس کی صحبت کا اثر یہ ہوا کہ مجھ میں علمی اور فنی مسائل پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے اور تحقیق سے کام لینے کا جذبہ اور سلیقہ پیدا ہوا نصاب تعلیم میں جو کتابیں داخل تھیں میں انہیں کا پابند نہیں رہا بلکہ ہر فن کی درسی کتابوں کے ساتھ دوسری غیر درسی کتابیں بھی پڑھتا رہتا تھا۔ حصول علم کے لئے اگر بے تعصبی شرط اولین ہے تو مجھ کو اعتراف کرنا چاہئے کہ مجھ میں اس خو کا پیدا ہونا شاہ صاحب کی ہی دین ہے۔

شاہ صاحب کے درس سے ایک اور فائدہ یہ ہوا کہ طبیعت دقت پسندی کی خوگر ہو گئی اور سوقیانہ شاعری اور سستے قسم کے افسانوں سے ابا کرنے لگی۔ اسی زمانہ میں میں نے اردو ادب کا مطالعہ کیا تو اُردو کے عناصر خمسہ میں سے کوئی نہیں تھا جس کی اکثر و بیشتر کتابیں میں نے نہ پڑھی ہوں۔ ان کے علاوہ پنڈت رتن ناتھ سرشار کا فسانۂ آزاد اور سیر کہسار، عبدالحلیم شرر کے تاریخی ناول، راشد الخیری کے مختصر افسانے، خواجہ حسن نظامی کے تخیلی مضامین اور نیاز فتحپوری کے انشائیے اور شہاب کی سرگزشت یہ سب کتابیں پڑھ ڈالیں لیکن سب سے زیادہ طبیعت جس سے متاثر ہوئی وہ مولانا شبلی نعمانی کی شخصیت ہے میں نے مولانا کی اکثر و بیشتر کتابیں پڑھی ہیں لیکن الفاروق اور شعر العجم وہ کتابیں ہیں جنہوں نے طبیعت پر بہت گہرے اور دور رس اثرات پیدا کئے ۔ الفاروق تحقیق کا شاہکار (

[illegible] تصنیف و تصنیفات [illegible] کو کوئی جواب اب تک پیدا نہیں ہوا ہے [illegible] ہے اور جس میں میرا خیال ہے [illegible] کہ [illegible] کو [illegible] جو ان کا شاہکار تھا اسی کا حصہ [illegible] شاعری [illegible] اور وسعتوں کا خصوصیات اور ان کے [illegible] اور پھر اس کے بعد [illegible] اور حیرت زبان میں [illegible] ہے اور اس میں زبان و بیان کے وہ عجیب و غریب نازک اور لطیف نکتے پیدا کئے ہیں کہ بے ساختہ سطر سطر پر داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ شبلی تاریخ کا ذوق اور اس کا دسیع مطالعہ رکھتے تھے۔ اور ساتھ ہی منطق اور فلسفے کے بہت اچھے عالم تھے شعر و ادب کا ذوق فطری تھا طبیعت میں جودت [illegible] بلا کی تھی۔ ان سب چیزوں نے بیک وقت جمع ہو کر اردو زبان کے کلاسیکل مصنفین میں شبلی کی شخصیت کو بہت بلند اور نمایاں کر دیا ہے۔ مجھے اس کا یقین ہے کہ دقیق سے دقیق علمی مباحث کو جس قدرت کلام کے ساتھ دلآویز شگفتہ زبان میں شبلی لکھ سکتے تھے وہ ان کے جانشین سید سلیمان صاحب ندوی اور خلیفہ عبدالحکیم اور مولانا عبدالسلام ندوی کو بھی وہ بات نصیب نہ ہوئی۔ میرے نزدیک اگر کوئی طالب علم پی ایچ ڈی میں داخلہ لیتا ہے تو میں اس کو شروع کے دو تین مہینوں میں مولانا شبلی کی خاص خاص کتابیں غور اور توجہ سے پڑھنے کا مشورہ دیتا ہوں تاکہ اسے معلوم ہو سکے کہ کسی موضوع پر گفتگو کرتے وقت کس طرح اس کے مختلف اجزاء اور عناصر کا تجزیہ کر کے ہر ہر چیز پر الگ الگ بحث کی جاتی ہے اور اس کے لئے اسلوب نگارش کس قسم کا ہونا چاہئے ہیں یہ محسوس کرتا ہوں کہ حضرت شاہ صاحب نے مجھ میں جس علمی و تحقیقی ذوق کی تخم ریزی کی تھی اس کی آبیاری مولانا شبلی کی کتابوں نے کی۔ اسی کا یہ اثر تھا کہ دیوبند کی طالب علمی کے زمانے ہی میں میں قاہرہ سے المقتطف اور الہلال جو بلند پایہ علمی ماہنامے تھے منگوانا اور بڑے شوق سے ان کا مطالعہ کرتا تھا اور اردو رسائل میں نگار اور معارف زیر مطالعہ رہتے تھے۔ جیسا کہ شروع میں عرض کر آیا ہوں اردو شعر و شاعری کے میرے مطالعہ کا آغاز داغ کے دواوین سے ہوا تھا لیکن اب غالب، مومن اور میر کے کلیات و دواوین مطالعہ میں رہتے تھے۔ غالب کی متعدد شرحیں بھی پاس رہتی ہیں لیکن شعر کے سمجھنے میں بجائے شرح کے خود اپنے ذوق پر بھروسہ کرنے کا عادی رہا ہوں۔ اس بنا پر شرح سے استفادہ کی نوبت کم ہی آتی تھی۔

جس زمانہ کا یہ ذکر ہے اس زمانہ میں مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ اقبال دونوں کا غلغلہ بلند تھا۔ مجھ ایسے حساس اور شعر و ادب کے ذوق رکھنے والے طالب علم کے لئے کیونکر ممکن تھا کہ ان سے بے اعتنائی برتتا چنانچہ ان دونوں کو بھی میں نے پڑھا اور بار بار پڑھا۔ مولانا ابوالکلام کا الہلال (دور اول) اور البلاغ تو کبھی کے بند ہو چکے تھے لیکن ان جرائد کے مختلف مضامین کتابی صورت میں طبع ہو کر ملتے تھے۔ ان کے علاوہ مولانا کا تذکرہ، مسئلہ خلافت اور ترجمان القرآن ان کا بھی زیر مطالعہ رہتا تھا لیکن مجھ پر سب سے زیادہ اثر تذکرہ اور ترجمان کا ہوا۔ تذکرہ کہنے کو سوانح عمری ہے۔ ورنہ درحقیقت اردو ادب میں انشاء اور خطابت کا شاہکار ہے۔ یہی وہ انشاء ہے جس کی نسبت مولانا حسرت موہانی نے کہا تھا:

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
شعر حسرت میں وہ مزا نہ رہا

تذکرہ کے بعض مقامات بار بار پڑھنے سے یہاں تک کہ پڑھنے کے صفحے زبانی یاد ہو گئے تھے اور ایک اثر یہ ہوا کہ میری تحریر میں بھی یہ رنگ جھلکنے لگا۔ میری عمر پندرہ سولہ برس کی ہوگی جب ایک صاحب ایک روزنامہ سیاست کے نام سے نکالتے تھے۔ انہوں نے بقرعید کے موقع پر ایک خاص نمبر قربانی نمبر کے نام سے شائع کرنے کا اعلان کیا میں نے بھی ایک مضمون لکھا اور پڑھتے ڈرتے ایڈیٹر صاحب کو بھیج دیا مضمون پر میں نے اپنا نام تو لکھا تھا لیکن کچھ خوف اور کچھ شرم سے اپنا پتہ نہیں لکھا تھا جب یہ شاندار خاص نمبر چھپ کر آیا تو اب تک یاد ہے مجھے یہ دیکھ کر کس قدر خوشی ہوئی ہے کہ میرا مضمون (جو عمر میں پہلی مرتبہ طبع ہوا تھا) بڑے اہتمام سے نمایاں طور پر شائع ہوا تھا اور میرے نام کے ساتھ حضرت مولانا لکھا تھا درحقیقت یہ سب کچھ نتیجہ تھا اس بات کا کہ مولانا ابوالکلام کی تحریریں بکثرت پڑھنے کی وجہ سے میری تحریر میں ابوالکلامیت پیدا ہو چلی تھی لیکن یہ رنگ نبھ نہیں سکتا تھا (اور سچ تو یہ ہے کہ خود مولانا سے نہیں نبھ سکا) اس لئے جب طبیعت علمی اور سنجیدہ مضامین پڑھنے کی طرف مائل ہوئی تو یہ رنگ ڈھلتا اور صاف ہوتا چلا گیا۔ رہا ترجمان القرآن تو اس میں سورہ فاتحہ کی تفسیر میرے نزدیک تفاسیر کے پورے ذخیرہ میں ایک گل سرسبد کی حیثیت رکھتی ہے اور اس نے فکری اعتبار سے ایک ایسی راہ دکھائی ہے جو درحقیقت ہے تو قرآن کی ہی راہ لیکن لوگوں نے اس کو نظر انداز کر رکھا تھا۔ وحدت دین قرآن کا وہ موضوع فکر ہے جس کو بار بار مختلف پیرایۂ بیان سے بیان کیا گیا ہے اور دعوت محمدی میں اس کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی کی ہے۔ لیکن کیسی عجیب اور حسرت انگیز بات ہے کہ علمائے تفسیر نے اس مضمون کو سب سے کم شائستۂ اعتنا سمجھا ہے۔ علمائے سلف میں سب سے پہلے شاہ ولی اللہ ہیں جنہوں نے اس موضوع پر اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں وضاحت اور تفصیل سے لکھا ہے اور شاہ صاحب کے بعد پھر مولانا کا ہے حق یہ ہے کہ مولانا نے تو اس پر قلم ہی توڑ دیا ہے۔

اردو شاعروں میں قدیم و جدید سبھی اور تھوڑے سب ہی پڑھ ڈالے ہیں۔ لیکن غالب اور اقبال دو ایسے شاعر ہیں جن کو صرف پڑھا نہیں ہے بلکہ میں نے انہیں زندگی کے سنگلاخ سفر میں اپنا رفیق ساتھی اور رہنما بنا لیا ہے۔ طبیعت پر جب کبھی رنج و غم فکر و تشویش یا اداسی یا پژمردگی کی کیفیت طاری ہوتی ہے میں نے اقبال کی کوئی نظم یا غزل پڑھنی شروع کر دی ہے یا دیوان غالب ہاتھ میں لے کر گنگنانے لگا ہوں اور میں نے محسوس کیا ہے کہ جیسے اداسی اور دل گرفتگی کے بادل چھٹ رہے ہیں اور دل میں عزم و حوصلہ اور ایمان و ولولہ کی چاندنی چھٹک رہی ہے۔ غالب نے موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟ کہہ کر زندگی کا ایک رخ بیان کیا ہے لیکن اقبال نے:

در دشتِ جنون من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

اور

"زمانہ باتو نسازد تو با زمانہ ستیز" کا نعرہ فکر و غم اور حوادثِ روزگار کا مقابلہ کرنے کا عزم اور حوصلہ بخشتا ہے گویا ایک مہمیز کا کام کرتا ہے اور دوسرا اس حقیقت کے لیے فلسفہ شفا کا کام کرتا ہے۔ غالب اور اقبال دونوں زندگی اور اس کے معاملات و مسائل کو ایک خاص نقطۂ نظر سے دیکھنے کا سلیقہ پیدا کرتے ہیں۔ ایک ایسا خاص نقطۂ نظر جس کے آئینہ میں زندگی ایک بار گراں اور بوجھ نہیں بلکہ ایک عطیۂ خداوندی اور نعمتِ حقیقی نظر آتی ہے۔

میں نے تاریخ، فلسفہ، شعر و ادب اور اسلامیات پر عربی، فارسی، اردو اور انگریزی میں سینکڑوں کتابیں اعلیٰ اور بلند پایہ مصنفین کی پڑھی ہوں گی اور ظاہر ہے کہ کوئی عمدہ کتاب اپنا اثر کیے بغیر نہیں رہتی۔ ان سب کا ذکر نہ ممکن ہے اور نہ ضروری۔ عربی زبان و ادب میرا خاص اور محبوب مضمون رہا ہے۔ اور اس کا ذوق طبعی اور فطری ہے فارسی شعر و ادب سے بھی مجھے بڑی دلچسپی رہی ہے خاقانی، انوری، عرفی، نظیری اور قاآنی کو خود پڑھا ہی نہیں بلکہ برسوں تک علی گڑھ یونیورسٹی میں آنرز اور ایم اے (فارسی) کی کلاسوں کو ان کا درس دیا ہے لیکن جہاں تک عقیدت اور ارادت کا تعلق ہے وہ مجھے سب سے زیادہ خواجہ حافظ سے رہی ہے۔ رنج و غم کی کیفیت ہو یا کسی قسم کی پریشانی اور تشویش کی، ہر حالت میں دیوانِ حافظ میرا مونس و ہمدم اور غم خوار ثابت ہوا ہے بلکہ بعض مواقع پر حضرت لسان الغیب نے میری بروقت رہنمائی کرکے نقصانِ عظیم سے بچا لیا ہے۔ اس سلسلے کے واقعات تو کئی ایک ہیں لیکن یہاں دو واقعے بیان کروں گا۔ بہت عرصہ پہلے کی بات ہے بدایوں کے ایک رئیس میرے بڑے بے تکلف اور عزیز دوست تھے۔ اس زمانہ کے رئیس عموماً جیسے ہوتے تھے سب کو معلوم ہے یعنی زندہ دل اور رنگین طبع۔ ایک مرتبہ انہوں نے مجھ کو آموں کی فصل میں انبہ خوری کے لیے بدایوں مدعو کیا اور میں وہاں پہنچ گیا۔ پہلا دن تو خیریت سے گزرا لیکن دوسرے روز کیا ہوا؟ شب کے دس ساڑھے دس بجے کا وقت ہوگا میں حسبِ معمول سونے کے لیے پلنگ پر لیٹ گیا تھا کہ اتنے میں یہ دوست آئے اور مجھے اپنے ساتھ ایک نہایت آراستہ و پیراستہ کمرہ میں لائے۔ یہاں پہنچا تو دیکھا کہ عالم ہی کچھ اور ہے۔ محفلِ نشاط گرم ہوئی ہے اور ایک نازنین ماہ روئے خوش جمال

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن
اُمنگوں کی راتیں مرادوں کے دن

اپنے سازندوں کے ساتھ رونقِ بزم ہے۔ گانا شروع ہوا تو محسوس ہوتا تھا پوری فضا نغمہ بار ہوگئی ہے اور ؎ ساقی بہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بنغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

کا منظر تھا۔ دوسرے دن میں بدایوں سے رخصت ہوگیا۔ لیکن یہ صحبتِ شب بلا سے رواں ہوگئی۔

—

[illegible]
[illegible]

میں نے اپنے دوست کا [illegible]
بات [illegible]
بہا [illegible]
بڑی [illegible]
ہو رہی تھا۔ ؎ من گدا [illegible]
کہ دست [illegible]

اس شعر پر نظر آنا تھا کہ [illegible] پھر کبھی ادھر کا رخ کیا اور نہ کبھی خیال ہی آیا۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ انگلو عربک کالج دہلی میں [illegible] ایک لیکچرر کی پوسٹ کا اشتہار ہوا۔ ایک درخواست [illegible] کالج کی انتخابی کمیٹی میں اختلاف ہوگیا۔ نواب [illegible] میرے حامی تھے اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی رائے ایک اور امیدوار کے حق میں [illegible] زیادہ بڑھا اور مصالحت کی کوئی صورت ہی پیدا نہیں ہوئی [illegible] لیکچرر کی پوسٹ میں تبدیل کر دیا جائے۔ یہاں مجھ کو یہی بات [illegible] بڑا قلق ہوا۔ اسی پریشانی اور دل گرفتگی کے عالم میں دیوانِ حافظ سے فال نکالی تو یہ شعر نکلا

گرچہ منزل بس خطرناک ست و مقصد ناپدید
ہیچ راہے نیست کز انیست پایاں غم مخور

یہ شعر پڑھتے ہی سکون سا ہوگیا اور خدا کی شان [illegible] درخواست اور [illegible] کے بغیر سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی کے پرنسپل مسٹر [illegible] کالج کو آپ کی ضرورت ہے۔ میں درخواست کرتا ہوں آپ ہمارے کالج میں [illegible] قبول کریں۔ چنانچہ میں لیکچرر ہوگیا اور ایک برس کے [illegible] منتقل کر دیا گیا۔

دیوبند سے فراغت کے بعد میں [illegible] جو تحریک اصلاحِ مدارس کے سلسلے میں دارالعلوم سے منسلک ہو گئی تھی۔ [illegible] کے ساتھ ڈابھیل ضلع سورت کے مدرسہ جامعہ اسلامیہ میں مدرس ہو کر ڈابھیل چلا گیا۔ [illegible] کی بات ہے یہاں میں کم و بیش تین برس رہا ہوں۔ یہ زمانہ قیام [illegible] کے لیے گاندھی کا مشہور مارچ کیا تھا۔ یہ غالباً [illegible] کی بات ہے [illegible] سلسلہ میں گاندھی جی ہمارے جائے قیام ڈابھیل سے [illegible] اس وقت نام یاد نہیں آتا، یہاں سے گزرنے والے تھے [illegible] عطاء الرحمٰن سیوہاروی مرحوم، مفتی عتیق الرحمٰن صاحب [illegible] نے اس موقع پر

[illegible] خدمت میں حاضر ہوئے تو ایک بہت ہی [illegible] کے گاؤں میں ایک بہت ہی
[illegible] لیکن آج یہاں ہزاروں انسانوں کا مجمع تھا۔ کانفرنس لگی ہوئی تھی
[illegible] اور جنگل میں منگل کا سماں تھا۔ گاندھی جی کی عظمت سے میں پہلے سے واقف
تھا لیکن اس دن اندازہ ہوا کہ حقیقتہً وہ اپنے علم اور عقل اور ذہنی صلاحیتوں کے
لحاظ سے کتنے بڑے انسان ہیں اور انہوں نے کس ریاضت اور محنت سے اپنے آپ کو بنایا
تھا۔ ہم جب اس گاؤں میں پہنچے تو گاندھی جی اس وقت تک نہیں آئے تھے تھوڑی ہی
دیر کے بعد دور سے چند اشخاص کا قافلہ آتا ہوا نظر آیا اب غور سے دیکھا تو گاندھی جی آگے
آگے لکڑی ہاتھ میں لئے تیز تیز قدم اٹھاتے چلے آ رہے ہیں اور چند لوگ جو ان کے ساتھ ہیں۔
خیال تھا کہ گاندھی جی بارہ میل پیدل چل کر آ رہے ہیں۔ اس لئے یہاں پہنچ کر وہ آرام کریں گے اور
سستائیں گے۔ لیکن یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ گاندھی جی کا اس وقت نہ سانس
پھولا ہوا تھا اور نہ تھکن کے مارے ان پر اضمحلال کا کوئی اثر تھا۔ وہ یہاں پہونچے، نہائے دھوئے
اپنی غذا کھائی (اس وقت دن کے بارہ بجے کا وقت ہوگا) اور پھر بالکل تازہ دم ہوکر ایک
شامیانے کے نیچے جہاں پہلے سے اُن کی نشست کا انتظام تھا آکر بیٹھ گئے۔ اس وقت
عام ملاقات کی اجازت نہیں تھی لیکن ہم نے اطلاع کرائی تو انہوں نے فوراً بلا لیا ہم اندر گئے
تو دیکھا ایک ٹانگ پر ٹانگ رکھے گاندھی جی بالکل سیدھے بیٹھے چرخہ کات رہے ہیں اور سیٹھ
جمنا لال بجاج اور تین چار اور اشخاص ان کے سامنے بیٹھے ہیں۔ کمال یہ تھا کہ اُن میں سے
دو صاحبوں کو بیک وقت بعض ضروری خطوط املا کرا رہے تھے۔ باقی اصحاب سے تحریک کے
سلسلہ میں بعض اہم معاملات پر گفتگو بھی کرتے جاتے تھے اور ادھر ہاتھ چرخہ چلانے میں
مصروف تھے۔ یہ تینوں کام بیک وقت نہایت منظم اور باقاعدہ ہو رہے تھے۔ کیا مجال کہ
کسی میں کوئی رخنہ پیدا ہو جائے۔ ہم تینوں خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے مسکراتے ہوئے
ہمارا استقبال کیا اور اپنے قریب بٹھا لیا شروع میں ہمارے مدرسہ کا کچھ حال اور ہمارے
اساتذہ کی خیریت دریافت کی اور پھر بولے کہ میں نے اخبار میں پڑھا ہے کہ مولانا محمد انور شاہ نے
پشاور میں تقریر کرتے ہوئے ایک حدیث بیان کی ہے جس میں پیغمبر صاحب نے فرمایا ہے کہ تین
چیزوں پر کوئی ٹیکس نہیں لگایا جا سکتا اور وہ ہیں نمک، گھاس اور پانی۔ یہ کہنے کے بعد گاندھی جی نے
ہم سے پوچھا کیا یہ خبر صحیح ہے اور کیا [illegible] حضرت محمد صاحب نے ایسا فرمایا ہے۔ ہماری طرف
سے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے جواب دیا۔ ہاں گاندھی جی! یہ حدیث بالکل صحیح ہے۔
[illegible] کر گاندھی جی کا چہرہ خوشی کے مارے چمک اٹھا اور وہ بولے تو مجھ کو اب بھی اس بات کا یقین
[illegible] کہ میں نے جو قدم اٹھایا ہے وہ بالکل درست ہے۔ اس کے بعد فرمایا اچھا، میں اپنا آدمی آپ
کے ساتھ بھیج دوں گا۔ آپ وہ حدیث مع حوالے کے اصل عربی کے لفظوں میں اور پھر اس کا اُردو
[illegible] کر کے میرے پاس بھیج دیں چنانچہ وہ آدمی ہمارے ساتھ آیا اور ہم نے وہ حدیث مع
[illegible] بھیج دی۔ گاندھی جی کو اس واقعہ سے اتنی خوشی ہوئی کہ جب سہارنپور میں ایک عظیم الشان

جلسہ میں انہوں نے تقریر کی (اور اس جلسہ میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے بھی تقریر کی تھی) تو
انہوں نے ہم لوگوں کے یہاں آنے اور ہم سے اپنی بات چیت کا بھی ذکر کیا اور اس بات کو پھر دہرایا کہ
پیغمبر صاحب کے اس قول سے میرا کو بڑی قوت حاصل ہوتی ہے۔

بہرحال اس روز میں نے گاندھی جی میں اُن کی بہت غیر معمولی حاضر جوابی، ذہنی اور روحانی
طاقت و قوت کا جو مشاہدہ کیا میں اُسے کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ ایک مرتبہ مولانا حفظ الرحمٰن
صاحب جو میرے قریبی رشتہ سے بڑے بھائی ہوتے اور مجھ سے بے حد محبت کرتے تھے،
بیان کیا کہ ایک موقع پر مولانا ابوالکلام آزاد سے گاندھی جی کا ذکر آیا تو اگرچہ مولانا بڑے سے
بڑے آدمی کی تعریف میں بے حد بخیل واقع ہوئے تھے لیکن اس وقت انہوں نے گاندھی جی کی
ذہانت، دور رسی اور ان کی روحانی اور اخلاقی طاقت کا تذکرہ اس والہانہ انداز سے کیا کہ
میں حیرت میں رہ گیا۔ اس سلسلہ میں مولانا نے گاندھی جی کے متعدد چشم دید واقعات سنائے ان میں
ایک واقعہ یہ بھی تھا کہ جب گاندھی جی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں جا رہے تھے تو اس سلسلہ کے
جو کاغذات اور دستاویزات وغیرہ تھے وہ سب انہوں نے روانگی سے چند گھنٹے پہلے مجھ سے
لئے اور ایک دو گھنٹہ میں ان کو پڑھ لینے کے بعد ہم سب ارکان ورکنگ کمیٹی سے گفتگو کی تو معلوم
فرماتے تھے کہ ہمیں سخت حیران ہوا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کانفرنس میں جو مسائل زیر بحث آئیں گے
گاندھی جی نے ان سب کا مطالعہ بڑی وسعت اور دقت نظر سے کر لیا ہے اور اب کوئی مسئلہ کا
کوئی پہلو بھی ایسا نہیں ہے جس پر وہ بصیرت اور خود اعتمادی کے ساتھ گفتگو نہ کر سکیں۔

یہ تو خیر مولانا ابوالکلام آزاد کی بات تھی۔ وہ لوگ جو گاندھی سے سیاسی اختلافات
رکھتے تھے اُن کی عظمت کا اعتراف اُن کو بھی تھا چنانچہ میرے ایک دوست جو ایک روزنامہ کے
ایڈیٹر اور مسٹر محمد علی جناح سے بہت قریب اور کسی حد تک بے تکلف تھے۔ ایک مرتبہ انہوں
نے کہا کہ بمبئی میں گاندھی۔ جناح گفت و شنید ختم ہوگئی اور جناح صاحب دہلی تشریف
لائے اور میں ان کی خدمت میں حسب معمول حاضر ہوا تو انہوں نے بمبئی کی گفتگو سے متعلق اپنے
تاثرات بیان کرتے ہوئے جہاں اور بہت سی باتیں کہیں یہ بھی فرمایا، گاندھی جی کی روحانی
طاقت غیر معمولی معلوم ہوتی ہے۔ جب وہ بولتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ زبان کے ساتھ
وہ اپنے دل کی طاقت بھی استعمال کر رہے ہیں اور مجھ کو اپنی طرف کھینچ رہے ہیں، اس اثر سے
بچنے کے لئے مجھ کو بھی اپنی قوت ارادی سے بہت کچھ کام لینا پڑا۔"

گاندھی جی کو اس روز دیکھ کر مجھ کو یقین ہو گیا کہ کوئی شخص یونہی بڑا نہیں بن جاتا بلکہ
قدرت جس کو دنیا کی کوئی عظیم شخصیت بنانا چاہتی ہے تو اس میں کچھ غیر معمولی اوصاف
و کمالات بھی ودیعت کر دیتی ہے۔ بدقسمتی سے آج بات بات میں ہندو مسلم کا سوال پیدا
ہو جاتا ہے لیکن میری پیدائش اور پھر نشو و نما اور تربیت ایسے گھرانہ میں ہوئی جہاں اس
قسم کی باتوں کا کبھی گزر ہی نہیں تھا۔ میرے والد ریاست [illegible] کے مشہور و معروف ڈاکٹر تھے۔
سرکاری ملازمت کے علاوہ ان کی پریکٹس جتنی ہندوؤں میں تھی مسلمانوں میں نہیں تھی۔

اس کے علاوہ مکان پر آنا جانا اور میل ملاقات کی رسم دونوں فرقوں کے لوگوں سے یکساں تھی کئی ہندو گھرانے تھے جن کے بچے بچیاں والد صاحب کو چاچا اور والدہ مرحومہ کو چاچی اور بھابی کہتے تھے۔ جب میری بہن کی شادی ہوئی تو رات میں بارات کے ساتھ سینکڑوں مقامی ہندو مسلمان بھی مدعو تھے کھانے سے فراغت پاکر سب لوگ رخصت ہو گئے لیکن چند عمر رسیدہ ہندو تھے جو بیٹھے رہے۔ جب رات زیادہ ہوئی اور والد صاحب نے ان سے کہا: اچھا اب آپ بھی جائیے آرام کیجئے تو مجھے اب تک یاد ہے انہوں نے کس محبت سے ایک خاص تاثر کے لہجہ میں کہا تھا واہ: ڈاکٹر صاحب ابھی بیٹا کا ڈولا تو اٹھا نہیں ہم گھر کیسے چلے جائیں چنانچہ کافی رات گئے جب بہن رخصت ہو گئی تو یہ بھی گھروں کو واپس ہوئے۔

اس ماحول میں اور ایسی سوسائٹی میں رہنے کا ہی یہ اثر تھا کہ شاید اسی کے مادہ میں کیا ذکر ہے۔ ایک مرتبہ میں اور والد صاحب دہلی سے مراد آباد جا رہے تھے اور انٹر کلاس میں بیٹھے تھے۔ یہ ڈبہ اوپر تلے مسافروں سے بھرا ہوا تھا اور اس میں میرے اور والد صاحب کے علاوہ کوئی تیسرا مسلمان نہیں تھا۔ راستہ میں مغرب کی نماز کا وقت ہوا تو والد صاحب نے اس عالم میں تھیلہ سے جانماز نکالی اور دو ہندو جو ہمارے ہی پاس بیٹھے تھے بڑی سادگی اور بھولے پن سے ان کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر والد صاحب نے فرمایا: بھیا ذرا کھڑے ہو جانا میں نماز پڑھ لوں والد صاحب کا یہ کہنا تھا کہ اس وقت کی فضا کے پیش نظر میرا دل دھک دھک کرنے لگا کہ خدا خیر کرے سر پر کوئی اور قیامت نہ ٹوٹ پڑے۔ لیکن میری توقع کے بالکل برخلاف وہ دونوں فوراً کھڑے ہو گئے اور بولے: لیجئے: جب صاحب اب تو جگہ کافی ہو گئی سو نماز پڑھیے صاحب میں نے یہ دیکھا تو اپنی سیٹ پر سے کھڑا ہو گیا اور ان دونوں سے کہا کہ آپ یہاں بیٹھئے والد صاحب جب تک نماز پڑھیں گے آپ کی بجائے میں کھڑا رہوں گا لیکن انہوں نے میری پیش کش بالکل قبول نہیں کی اور مسافروں میں سے دو تین ہندو ایک ساتھ بولے: ارے سب مسلمان ان بڑے صاحب جیسے ہوں جو بھگوان کی پوجا سچے دل سے کریں تو کون کمبخت ہوگا جو ان سے دشمنی کرے گا اس واقعہ کو دیکھ کر مجھ کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ جس طرح بدی متعدی بیماری ہے اسی طرح نیکی بھی متعدی ہے۔ یعنی اگر آپ کا دل کسی طرف سے صاف ہوتا ہے تو اس کے دل میں بھی آپ کی طرف سے میل نہیں ہوگا لیکن اگر آپ کے ہی دل میں کدورت اور عناد ہے تو پھر آپ کو اس سے صفائی قلب و خلوص کی امید رکھنا عبث ہے چنانچہ ایک روایت میں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بھی ہے اگر تم یہ معلوم کرنا چاہتے ہو کہ تمہارے دوست کا رویہ تمہارے ساتھ کیا ہے تو تم خود اپنا محاسبہ کر کے یہ دیکھو کہ تمہارا رویہ اس کے ساتھ کیا ہے۔

بہرحال میری تربیت ایسے گھرانے میں ہوئی۔ پھر عربی کی تعلیم دیوبند میں ہوئی۔ مدرسہ دیوبند میں جو تحریک آزادی میں کانگریس کے دوش بدوش رہا ہے اور اس کے بعد میں ایم اے میں طالب علم رہا سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی کا اور پھر برسوں تک اس کا اسٹاف ممبر رہا اور اس کالج کا حال (معلوم نہیں اب کیا ہے) کہ یہاں اساتذہ اور طلباء میں ہر مذہب کے لوگ ہوتے تھے [illegible] افراد کی طرح رہتے تھے [illegible] امتیاز کیا جاتا ہے اور [illegible] کے پروفیسر تھے۔ [illegible] اچھی طرح رہتے تھے میں [illegible] اور ایک چادر ان کا ہیئت کا پہناوا تھا [illegible] تھے۔ ہر برس کو ہمارے کالج میں شب برات ( [illegible] ) ہوتی تھی جس میں بیرونی مہمانوں کے علاوہ بڑا [illegible] شاندار ہوتا تھا لیکن ہمارے نگ صاحب کا کنا [illegible] کے اہتمام کی تیاری تھا تمام اس موقع پر بھی گھر سے تیار ہو کر آتا تھا۔ شاید آپ کو یہ سن کر تعجب ہو کہ اس [illegible] پسندی اور کرمٹ کے باوجود نگ صاحب میرے نہایت عزیز اور مخلص دوست تھے اور بے تکلف بھی اس وجہ کہ کشمیری گیٹ میں رہتے تھے بعض اوقات کالج سے واپسی میں میرا ان کا ساتھ ہو جاتا۔ تو وہ اپنے مکان پر پہنچ کر مجھ کو بھی ساتھ [illegible] کی بیوی کا آخر میں ہوا انتقال ہو گیا تھا گھر میں ایک لڑکا اور دو لڑکیاں تھیں۔ گھر پہنچتے ہی نگ صاحب کے حکم سے لڑکیاں آلو کے چاپ تیار کرتیں اور گرم گرم [illegible] سے نکال کر ہم دونوں کو کھلاتی رہتیں تھیں نگ صاحب کو سگریٹ کا بہت شوق تھا لیکن [illegible] استعمال کرتے تھے۔

. . . . جب آلو کے چاپ اور اس کے بعد چائے سے فراغت ہو گئی تو ایک لڑکی جھٹ حقہ بھر لائی اور ہمارے سامنے رکھ دیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ علت قدامت پرست ہونے کے باوجود نگ صاحب اصرار کرتے کہ حقہ کا پہلا کش میں ہی لوں مجھ کو اس کی خواہش کی تعمیل کرنی پڑتی اس کے بعد وہ کش لیتے اور یہ دور اسی طرح گھنٹہ آدھ گھنٹہ چلتا رہتا۔ ابھی پانچ برس ہوئے نگ صاحب کا انتقال ہو گیا جس کا بڑا صدمہ ہوا۔ لیکن ان کی محبت شرافت اور خلوص کے یہ واقعات میں جو ہر گھڑی یاد آتی اور تڑپا جاتی ہیں میں اس کو کبھی بھول نہیں سکتا کہ ۲۱ جنوری ۱۹۴۸ء کی شام کو جب میں پرنسپل کلکتہ مدرسہ کے عہدہ کا چارج لینے کے لئے کالج سے تعلق منقطع کر کے احباب کالج سے رخصت ہوا تو میرے [illegible] اور [illegible] تو سب ہی تھے لیکن نگ صاحب پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے اور ان کی وجہ سے مجھ کو بھی اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ اسی طرح میں نگ صاحب کے علاوہ ہندو مسلمان اور سکھ اساتذہ اور طلباء میں اور بھی کتنے ہی ایسے احباب تھے جو نہایت مخلص اور مخلصانہ تھے ان کی داستان کے لئے ایک مستقل مقالہ درکار ہے میری عمر کے کم و بیش اٹھارہ برس جو سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی اور اس کے ذریعہ دہلی یونیورسٹی اور اس کے بعد کلکتہ مدرسہ کے ساتھ تعلق میں مجموعی طور پر بسر ہوئے میری زندگی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ اس زمانہ میں میری معاشی زندگی شروع ہوئی ہے جس میں ہر مذہب

ملت اور مذہب و مسلک کے لوگ شامل رہے ہیں اور اس بنا پر مجھ کو موقع ملا ہے کہ میں انسانی نفسیات کا مطالعہ زیادہ وسعت کے ساتھ کرسکوں۔ اس مطالعہ کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کا احترام اور اس کی خدمت کا جذبہ جو میرے پہلے سے موجود تھا وہ اور پختہ ہوگیا ہے اور میں انسان کے عظیم مستقبل سے مایوس نہیں ہوا ہوں۔ میری بڑی لڑکی کی کلکتہ میں شادی ہوئی اور میں نے کم و بیش ۳۰ مہمانوں کو مدعو کیا تو ایک مقامی اردو روزنامہ نے لکھا کہ آج تک ہم نے کلکتہ میں کوئی ایسی پارٹی نہیں دیکھی تھی جس میں حکومت کے افسر و وزیر، ہندو مسلمان، یورپین، اینگلو انڈین، مسٹر اور مولانا، کمیونسٹ اور کیپٹلسٹ، پروفیسر اور تاجر، بنگالی اور غیر بنگالی اس درجہ مختلف مشرب و مسلک اور مذہب و زبان کے لوگ شریک ہوں۔

جب کلکتہ پہونچا تو اس زمانہ میں ڈاکٹر کاٹجو مغربی بنگال کے گورنر تھے۔ ان کے بعد پروفیسر مکرجی وہاں کے گورنر ہوئے۔ وہ عجیب و غریب شخصیت کے مالک تھے۔ گورنر ہونے سے پہلے کلکتہ یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر اور صدر شعبہ تھے۔ آزادی کے بعد جو دستور ساز اسمبلی بنی اس کے نہایت فعال اور بااثر ممبر تھے چنانچہ دستور کی ترتیب اور اس کی زبان کی صحت میں ان کا بڑا دخل رہا ہے۔ مذہبًا عیسائی تھے لیکن عقیدۃً و عملًا مہاتما گاندھی کے نہایت سچے اور مخلص پیرو تھے۔ لباس اور غذا دونوں بہت سادہ رکھتے تھے۔ گورنر کی تنخواہ میں سے صرف ڈھائی سو روپیہ ماہوار لیتے تھے۔ باقی رقم خیراتی کاموں اور خصوصًا تعلیم کے لیے مخصوص کر دیتے تھے چنانچہ ان کے انتقال کے بعد اخبارات سے معلوم ہوا کہ انہوں نے عورتوں اور پسماندہ طبقات کی تعلیمی اعانت و امداد کے لیے پانچ لاکھ روپے کی اور بعض اور کاموں کے لیے تین چار لاکھ روپے کی وصیت کی ہے۔ پروفیسر مکرجی سے پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب میں پرنسپل کلکتہ مدرسہ کی حیثیت سے ان سے راج بھون میں ملا اور ان سے کلکتہ مدرسہ کے جلسۂ تقسیم اسناد کی صدارت اور خطبہ پڑھنے کی درخواست کی۔ موصوف نے نہ صرف یہ کہ میری درخواست بڑی خوشی سے منظور کر لی بلکہ دیر تک مسلمانوں کے معاملات و مسائل پر بڑی دلچسپی اور توجہ کے ساتھ گفتگو فرماتے رہے۔ جب میں رخصت ہونے لگا تو فرمایا میں اب ایک ایسی جگہ پر ہوں جہاں میں براہ راست مسلمانوں کی مشکلات اور ان کی دشواریوں سے واقف نہیں ہو سکتا لہٰذا جب کبھی ان معاملات و مسائل کے سلسلے میں میری امداد کی ضرورت ہو، آپ بے تکلف مجھ کو ان سے باخبر کریں۔ اس کے بعد فرمایا۔ میں بہت خوش ہوں گا اگر آپ یوں بھی مجھ سے وقتًا فوقتًا ملتے رہیں۔ میں نے ان سے وعدہ کیا اور چلا آیا۔ چنانچہ میں ان کے پاس گورنمنٹ ہاؤس کبھی کبھی یوں بھی جاتا تھا اور اس کے علاوہ بعض سرکاری اور غیر سرکاری تقریبات میں وہ بھی یاد فرماتے تھے۔ ان کی وضعداری کا عالم یہ تھا کہ کلکتہ یونیورسٹی کی ملازمت کے زمانے میں وہ جس محلہ میں رہتے تھے اسی میں ایک مسلمان نیم بند کی بھی دکان تھی۔ پروفیسر مکرجی کو حقہ پینے کا بھی شوق تھا اور اسی تقریب سے ان کا مسلمان نیم بند کے ہاں آنا جانا اور اس سے ملنا جلنا تھا۔ اپنی اس وضعداری کو انہوں نے گورنر ہونے کے بعد بھی اس طرح قائم رکھا کہ عید بقرعید پر اس شخص کے [illegible]

ان کے اہل و عیال کے لیے برابر تحفے تحائف بھیجتے اور کبھی کبھی کار بھیج کر اس کو اپنے ہاں بلاتے تھے اور خاطر مدارات کرتے تھے۔

کلکتہ مدرسہ کا جلسہ تقسیم اسناد جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔ پروفیسر مکرجی حسب وعدہ اس میں تشریف لائے، صدارت کی، اسناد تقسیم فرمائیں اور پھر مسلمانوں کے تعلیمی مسائل پر ایک نہایت بصیرت افروز خطبہ پڑھا۔ جلسہ کے بعد عصرانہ کا انتظام تھا۔ میں موصوف کے پاس بیٹھا ہوا تھا جب میں نے چکن سینڈوچ اور پیسٹری وغیرہ کی پلیٹ ان کے سامنے پیش کی تو انہوں نے ہنستے ہوئے معذرت کی اور فرمایا۔ اگر آپ اب سے بیس برس پہلے یہ پیش کش کرتے تو میں ضرور قبول کر لیتا۔ مطلب یہ تھا کہ اب ادھر بیس برس سے وہ صرف سبزی خور ہی نہیں ہو گئے ہیں بلکہ کوئی ایسی چیز بھی نہیں کھاتے جس سے بدیشی پن کی بو آتی ہو چنانچہ بالائی، مٹھائیاں اور پھل ان میں سے تھوڑا تھوڑا لے کر انہوں نے تناول فرمایا اور بس!

اب پروفیسر مکرجی کا ذکر آیا ہے تو انہیں جیسے ایک اور بزرگ کا بھی تذکرہ سن لیجئے۔ ڈاکٹر آر کے سوفٹ کلکتہ کے ایک نامی گرامی ڈاکٹر ہیں۔ اصلاً پنجابی ہندو ہیں لیکن ان کا خاندان ایک عرصہ سے یہاں آباد ہے اور ان کا پورا گھرانہ 'این خانہ ہمہ آفتاب است' کا مصداق ہے یعنی ان کے علاوہ، ان کی بیوی، لڑکا، بہو، بیٹی اور داماد ماشاء اللہ سب ڈاکٹر ہیں، اور خوش اخلاقی اور ملنساری میں ایک سے ایک بڑھ کر۔ کلکتہ کے ایک بہت مشہور اور اچھے کانگریسی رہنما پروفیسر ایم۔ اے رحیم میرے اور ڈاکٹر سوفٹ کے مشترک دوست تھے میں ان سے اکثر ڈاکٹر صاحب کی انسان دوستی اور جذبۂ خدمت خلق کی داستانیں سنتا تھا اور خوش ہوتا تھا لیکن میری پہلی ملاقات اس طرح ہوئی کہ ایک روز اچانک مغرب کے بعد وہ میرے یہاں پہنچ گئے اور اپنا تعارف کرایا اور ساتھ ہی بولے مجھ کو پروفیسر رحیم سے معلوم ہوا کہ آپ کا ایک لڑکا کئی برس سے ایک دماغی مرض میں گرفتار ہے آپ اس کی وجہ سے بہت پریشان ہیں اور علاج پر روپیہ پانی کی طرح بہانے کے باوجود اب تک اس کو افاقہ نہیں ہے تو میں آپ کے اس لڑکے کو دیکھنا چاہتا ہوں شاید میں آپ کی کچھ خدمت کر سکوں۔ میں مہمان کے اس بے محابا انداز کرم گستری سے شرم کے مارے پانی پانی ہو گیا ——— ان کا بے حد شکریہ ادا کیا اور بچہ کو اندر سے بلوا کر ان کے سامنے پیش کیا۔ انہوں نے دیر تک اس کا معائنہ کیا حالات پوچھے اور تسکین اور تشفی کی باتیں کیں۔ میں نے ڈرتے ڈرتے فیس پیش کی تو بولے فیس کیسی؟ کیا آپ نے مجھ کو بلایا تھا؟ میں تو خود ہی آیا ہوں اور صرف اسی قدر نہیں بلکہ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اب یہ بچہ آپ کا نہیں میرا ہے۔ چنانچہ انہوں نے علاج شروع کیا اس سلسلہ میں کبھی ہفتہ میں ایک مرتبہ وہ اپنے صاحبزادے کو بھیجتے اور کبھی بچے کو خود اپنے گھر بلاتے تھے۔ بچہ جب کبھی ان کے ہاں جاتا تھا تو اسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنے کسی قریبی رشتہ دار کے مکان میں آ گیا ہو۔ مٹھائی پھل اور چائے سے اس کی تواضع ہوتی تھی۔ اور ڈاکٹر صاحب کی بیوی اولاد کا سا اور ان کی بہو

اور لڑکی کے ساتھ کیسا سلوک کرتی تھی۔ فیس کا یا کار کے پٹرول کی قیمت کا تو ذکر ہی کیا ہے۔
ڈاکٹر صاحب کا یہ معاملہ تو وہ تھا جو انہوں نے خود میری ذات کے ساتھ کیا اور جس کو میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا اب ان کا ہی ایک اور واقعہ سنئے۔ پروفیسر ایم اے رحیم نے ایک دن سنایا کہ ڈاکٹر سوفٹ ایک دن میرے مکان پر بیٹھے گفتگو کر رہے تھے اسی اثنا میں ان کو معلوم ہوا کہ چور حجرے میں سے امام کا لحاف اور گدا اور ایک رضائی لے گئے ہیں اور اب پروفیسر صاحب چندہ کر رہے تھے کہ امام صاحب کے لئے وہ چیزیں مہیا کر دی جائیں۔ ڈاکٹر صاحب کو اس کا علم ہوا تو وہ بہت بگڑے اور بولے آپ لوگ بھی غضب کرتے ہیں بھلا کب یہ چندہ پورا ہوگا اور کب اس سے یہ چیزیں خریدی جائیں گی۔ آخر امام صاحب آج کی رات اس سردی میں کیسے کاٹیں گے۔ اس کے بعد انہوں نے پروفیسر صاحب سے کہا، رحیم یہ چندہ بند کرو اور جس سے وصول کر لیا ہے اُسے واپس کر دو میں ابھی ان سب چیزوں کا انتظام کئے دیتا ہوں۔ چنانچہ یہ کہہ کر فوراً اٹھے اور کلکتہ کے مشہور بازار اسپلینیڈ سے نہایت عمدہ بنا بنایا ریشمی ابرہ کا لحاف، ایک گدا، ایک رضائی اور ایک تکیہ خرید کر ایک ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد واپس پہونچے اور رحیم صاحب سے بولے بتلائیے، مسجد کہاں ہے؟ رحیم صاحب نے ہر چند منع کیا کہ آپ خود نہ جائیے میں بھجوا دوں گا مگر ڈاکٹر صاحب بالکل نہ مانے اور آخر یہ سب چیزیں ٹیکسی میں لے کر خود مسجد میں پہونچے اور امام صاحب کے حوالے کیں۔ تب ان کی بے چینی دور ہوئی اور انہیں اطمینان ہوا۔

یہ تو بڑے لوگوں کی باتیں اور اُن کے اخلاق کا ذکر تھا اب ذرا معمولی درجے کے اور گمنام لوگوں کا بھی ایک واقعہ سن لیجئے۔ کلکتہ کی ریاستی شاخ انجمن ترقی اُردو کی دعوت پر کل ہند انجمن ترقی اُردو کا سالانہ جلسہ تھا اور اس تقریب کے سلسلے میں انڈو پاک مشاعرہ بھی تھا۔ مشاعرہ جس کا داخلہ ٹکٹ سے تھا۔ شروع ہو چکا تھا۔ میں کانفرنس کے صدر استقبالیہ کی حیثیت سے جناب روش صاحب صدیقی کو ایک ٹیکسی میں لے کر مشاعرہ گاہ پہنچا اور ٹیکسی کا کرایہ جو چار روپئے کے لگ بھگ ہوتا تھا پیش کئے تو ٹیکسی کے ڈرائیور نے جو ایک سکھ تھا مجھ سے پوچھا یہ اندر پنڈال میں کیا ہو رہا ہے "؟ انڈو پاک اُردو مشاعرہ" میں نے جواب دیا۔ اب اس نے پوچھا آپ کے ساتھ کون صاحب آئے ہیں" میں نے کہا "حضرت روش صدیقی جو بہت مشہور اور مقبول شاعر ہیں۔" بس یہ سننا تھا کہ سردار جی بولے" تو صاحب! اب میں آپ سے کرایہ نہیں لوں گا" میں نے پوچھا" بھئی یہ آخر کیوں! سردار جی نے جواب دیا" دیکھئے آج کل اُردو کی جو حالت ہے اس کی وجہ سے ہر اُردو بولنے والے کا فرض ہے کہ جو کچھ وہ اس زبان کے لئے کر سکتا ہے وہ کرے اور پھر یہ شاعر تو اُردو کا جھنڈا اونچا کئے ہوئے ہیں اور شاعر اپنے شعروں سے ہمارا دل خوش کرتے ہیں اس لئے ان کی خدمت کرنا ہمارا ویسے بھی فرض ہے۔ اس گفتگو کے بعد میں نے ہر چند اصرار کیا لیکن سردار جی ٹس سے مس نہ ہوئے اور کرایہ نہیں لیا۔ تب میں نے ان کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور مشاعرہ کا ایک اعزازی ٹکٹ ان کے حوالے کیا کہ جہاں چاہیں بیٹھ جائیں۔

اس قسم کے واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ قومی یکجہتی پیدا کرنے کا سب سے زیادہ موثر ذریعہ یہ ہے کہ مختلف مذہب، علاقہ، زبان اور مختلف رنگ و نسل کے لوگوں میں باہم سوشل تعلقات ہوں تاکہ وہ ایک دوسرے کے جذبات و احساسات کو اچھی طرح سمجھیں اور اس طرح ایک دوسرے کی عزت کرنا اور اس کے ساتھ ہمدردی اور خیر اندیشی کا معاملہ کرنا سیکھیں۔

## ستارے کی موت

### ساجدہ زیدی

کہیں پہ جلتے رہے دل کی آرزو کے دیئے
کہیں پہ بجھنے لگے دیپ کبھی نگاہوں کے
سمٹ گئے کبھی جوشِ جنوں سے دریا سے
بکھر گیا کبھی تارِ نظر کبھی راہوں میں
کبھی تھی وقت کے سینے میں آرزو پیوست
جھلس گئی کبھی دوپہرِ زیست میں ہر سانس
کبھی تو نالۂ شب چیرتا تھا سینۂ شب
گزر گئی کبھی اک عمر جیسے مہر بہ لب
حکایتِ لب و رخسار گاہ شعلہ طراز
طویل شب کبھی، اور اپنے سانس کی آواز
وہ انتظار کبھی جس میں ہر نگاہ کے ساتھ
سمٹ کے آگئی خود آرزو کی روحِ جمیل
وہ بے یقینی کا موسم کبھی کہ جس میں وجود
خود اپنے سائے کی مانند بے نشان رہا
کبھی وہ دل میں تمناؤں کا ہجوم کثیر
کہ جم گئی وہیں محفل جہاں قیام ہوا
کبھی وہ ذہن کا خالی مکاں کہ فکرِ حبیب
بھی اس دیار سے دامن کشاں رہی برسوں
کتابِ عمر کے کتنے ورق پلٹ ڈالے
مگر نگاہِ پریشاں ٹھہرتی ہی نہیں!

# غزلیں

## اختر علی تلہری

نہیں ہے بّرشِ تیغ جفا وہ میرے قاتل کی
نگاہِ حسرت آگیں دیکھ لی کیا اپنے بسمل کی

میرا عشق جنوں مشرب ستم سے دب نہیں سکتا
ہیں زندانِ بلا میں بھی وہی آزادیاں دل کی

ابھی گرداب کی طوفاں نفس موجوں سے لڑنا ہے
ابھی مجھ کو نہیں ہے فکرِ عشرت گاہ ساحل کی

مقدر اس کا ہے پامالِ گامِ رہرواں ہونا
خبر کیا خاکِ جادہ کو طربہائے منازل کی

کہیں سے تیشۂ فرہاد مل جائے تو لطف آئے
بہت یاد آ رہی ہے اُس بتِ شیریں شمائل کی

بچھاتا ہے زمانہ راہ میں کس شوق سے آنکھیں
ذرا تو قدر دیکھو اپنے پابندِ سلاسل کی

بہارِ گلشنِ ہستی سمائے کیا نگاہوں میں
حیاتِ مختصر دیکھے ہوئے ہوں شمعِ محفل کی

گلوں کا رنگ و بو جنتِ بداماں ہی سہی لیکن
میرے کانوں سے ٹکراتی ہیں فریادیں عنادل کی

مٹادی عشق نے آخر مری وہ شانِ خودداری
چلا ہوں پھر اُسی ظالم سے کہنے داستاں دل کی

خبر بھی ہے تجھے اے مہر طلعت کہکشاں رفعت
ترے جلوؤں کی ہیں مشتاق نظریں اہلِ محفل کی

ہے اختر ذوق خود ہی رہنما اس صعب منزل میں
مجھے حاجت نہیں فنِ قوافی و فواصل کی!

## غلام ربّانی تاباں

آئینہ ٹوٹ گیا، عکس بھی ٹوٹا ہوگا
کس نے سوچا تھا یہ انجامِ تمنا ہوگا

رات اُمڈی ہی چلی آتی ہے طوفاں کی طرح
بجھ گئی درد کی قندیل بھی اب کیا ہوگا

سر چھپانے کا کوئی شوق کرے گا ساماں
زلف کا سایا نہ ہو دار کا سایا ہوگا

تیز تر وقت کی رفتار ہوئی جاتی ہے
دمِ بیخودِ شام کہ پیغامِ سحر کیا ہوگا

مسکراتے ہوئے زخموں کے حسیں پھولوں پہ
بے نیازی کو تری پیار تو آیا ہوگا!

(قطعہ)

تیری محفل نہ سہی درد کی محفل ہوگی
زندگی کے لئے کوئی تو سہارا ہوگا!
فکر ٹوٹے ہوئے خوابوں سے حرارت لے گی
دل پہ بیتے ہوئے ایام کا سایا ہوگا

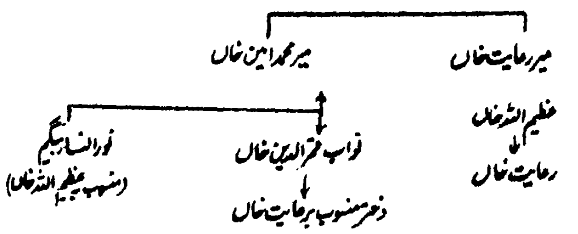
کٹ رہی ہیں بس اک اُمید پہ راہیں تاباں
بے ٹھکانوں کا بھی کوئی تو ٹھکانا ہوگا!

# میر اور یقین

نثار احمد فاروقی

میر نے ایک بار سرہند کا سفر کیا تھا یہ ۱۷۴۸ء (۱۱۶۱ھ) کا واقعہ ہے۔ اس زمانے میں عظیم اللہ جو بڑا مالدار تھا، کے بیٹے نواب رعایت خاں کی سرکار سے وابستہ تھے اس وابستگی کا واقعہ میر نے یوں لکھا ہے کہ ایک دن خاں آرزو نے کھانے پر بہت اصرار کیا میر بغیر کھائے اُٹھ کر اور اُن کے گھر سے نکل کر جامع مسجد کا راستہ لیا خاص حوض پر ان کی ملاقات عظیم اللہ نامی کسی شخص سے ہوئی اس نے خود ہی پوچھا "تم میر محمد تقی میر ہو؟" انہوں نے کہا تم نے کیسے پہچانا؟ وہ کہنے لگا "تمہاری سودائیانہ وضع تو مشہور ہے" رعایت خاں نے جو عظیم اللہ خاں کا لڑکا اور اعتماد الدولہ قمرالدین خاں کا بھانجا ہے جب سے تمہارے اشعار سنے ہیں تم سے ملاقات کرنے کا بہت مشتاق ہے اگر تم میرے ساتھ چل کر اس سے ملو تو میرے لئے بھی باریابی کا بہانہ ہو جائے میں جا کر ملا وہ بڑی شرافت سے پیش آیا اور مجھے اپنا رفیق بنا لیا اس کی ملازمت سے مجھے فائدہ پہنچا اور تنگ دستی سے چھٹکارا مل گیا"۔ [1]

فارسی میں میر نے عظیم اللہ خاں کو "یزنۂ قمرالدین خاں" کہا ہے۔ "یزنہ" کا مطلب فارسی کی زبان میں "شوہر خواہر" یعنی بہنوئی ہوتا ہے۔ اس رشتے سے رعایت خاں بھانجا ہوا۔ زیادہ صحیح رشتہ یہ ہے۔




میر کا تعلق ملازمت ۱۷۴۷ء میں کسی وقت قائم ہوا۔ اسی زمانے میں لاہور کے گورنر شاہنواز خاں نے احمد شاہ ابدالی کو دعوت نامہ بھیجا کہ اگر آپ ہندوستان پر حملہ کریں تو میں اس شرط پر آپ کا ساتھ دوں گا کہ بعد حصول فتح مجھے عہدۂ وزارت دیا جائے۔ احمد شاہ ابدالی یہ دعوت پا کر وسط دسمبر ۱۷۴۷ء میں پشاور سے روانہ ہوا۔ ۸ جنوری ۱۷۴۸ء کو لاہور سے کچھ فاصلہ پر میں خیمہ زن ہوا لیکن اس سازش کے خطرناک نتائج پر غور کر کے وزیر ہو گئے شاہنواز خاں کے ماموں نواب قمرالدین خاں نے شاہنواز خاں کو امداد دینے سے روک لیا۔ ادھر ابدالی نے پیش قدمی جاری رکھی اور شاہنواز خاں کو شکست دے کر قلعۂ لاہور پر قبضہ کر لیا۔ جب محمد شاہ کو دہلی میں لاہور کے سقوط کی خبر پہنچی تو محمد شاہ نے جو ان دنوں بیمار تھا شہزادہ احمد شاہ، نواب قمرالدین خاں، راجا جے سنگھ سوائی (جے پور کے راجہ) ایشور سنگھ وغیرہ کی نگرانی میں فوج لشکر بھیجی اور جو ۲۵ فروری ۱۷۴۸ء کو سرہند پہنچی۔ اسی لشکر میں رعایت خاں بھی تھا اور اس کے ہمراہ میر تقی میر شریکِ کارواں تھے۔ ابدالی نے ۲ مارچ ۱۷۴۸ء کو سرہند پر قبضہ کر کے لوٹ مار شروع کر دی۔ ۱۱ مارچ ۱۷۴۸ء بعد (مطابق ۲۲ ربیع الاول ۱۱۶۱ھ) کو تقریباً دس بجے دن کے نواب قمرالدین خاں اپنے خیمے میں چاشت کی نماز پڑھ رہے تھے کہ ناگاہ توپ کا ایک گولا اُن کی ٹانگ میں آکر لگا جس کے صدمے سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔ [3]

---

[1] میر کی آپ بیتی (طبع اول ۱۹۵۷ء) ص ۹۸-۹۹
ذکرِ میر (طبع اول) ص ۶۷
خواجہ احمد فاروقی نے اپنی کتاب میں ایک جگہ لکھا ہے: "یہ عظیم اللہ خاں کا بیٹا اور قمرالدین خاں ... کا بہنوئی تھا" (میر تقی میر، حیات اور شاعری ص ۱۱۲) اسی طرح ص ۸۸ پر ہے: "میر رعایت خاں کے نوکر ہو گئے۔ یہ عظیم اللہ خاں کے بیٹے اور ... قمرالدین خاں کے بہنوئی تھے" حالانکہ میر نے فارسی میں یوں لکھا ہے "رعایت خاں کہ پسر عظیم اللہ یزنہ اعتمادالدولہ قمرالدین خاں باشد" (ذکر میر ص ۶۷) اس سے بھی ظاہر ہے کہ "یزنہ" کی نسبت عظیم اللہ اور قمرالدین کے مابین ہے۔ اگر رعایت خاں مراد ہوتا تو واو عطف آتی، کہ پسر عظیم اللہ خاں و یزنہ قمرالدین خاں۔ اسی کتاب میں فاروقی صاحب نے ڈاکٹر عبدالحق پر اعتراض کیا ہے کہ مولوی عبدالحق نے یزنہ کا ترجمہ نواسا کیا ہے جو صریحاً غلط ہے" (ص ۵۴۴)

[2] احمد شاہ ابدالی کے حملوں کی تفصیلات کے لئے فارسی میں سیرالمتاخرین دیکھی جائے۔ اس کا اُردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ انگریزی میں سرکار کی کتاب کے علاوہ گنڈا سنگھ کی قابلِ قدر تصنیف "احمد شاہ درانی" ملاحظہ ہو۔ میر نے جس حملے کا بیان ذکر کیا ہے یہ ابدالی کا پہلا حملہ تھا۔

[3] سیر المتاخرین ۳/۱۹، مآثر الامرا ۱/۳۰۸

نواب معین الملک نے اس خبر کو سینہ راز میں رکھا اور خود نواب کو رچیمان کے ساتھ ہو کر مقابلے کے لئے نکلا۔ اتفاق سے ابدالی کے توپ خانے میں آگ لگ گئی اور اس کی فوج کے ہاتھی بھاگنے لگے تقریباً ایک ہزار فوجی اس آگ میں بھسم ہوگئے۔ مجبوراً ابدالی کو میدان سے ہٹنا پڑا اور شاہی فوج نے میدان مار لیا۔ اس واقعے کی تاریخ "فتح خدا ساز" (۱۱۶۱ھ) ہے۔ جب اس فتح کی خبر دلی کو پہنچی تو محمد شاہ نے از راہ خوشنودی معین الملک کو لاہور کا گورنر مقرر کر دیا وہ اپنی وفات تک (۳ نومبر ۱۷۵۳ء) اس عہدے پر فائز رہا۔ رعایت خاں معین الملک کے ساتھ جنگ میں شریک تھا۔ جب وہ لاہور کو روانہ ہوا تو رعایت خاں نے صفدر جنگ کے ساتھ دہلی کا رخ کیا۔ ابھی یہ قافلہ پانی پت پہنچا تھا کہ محمد شاہ کے انتقال کی خبر معلوم ہوئی۔ شہزادہ احمد شاہ ساتھ ہی تھا۔ صفدر جنگ نے اسے تخت نشین کیا۔ احمد شاہ نے اسے وزارت پر فائز کر دیا۔ [۵۱]

اسی زمانے میں جاوید خاں خواجہ سرا کا عروج شروع ہوا۔ اسے نواب بہادر کا خطاب مرحمت ہوا اور میر بھی اس کے دامن دولت سے وابستہ ہوگئے۔

اندازہ یہ ہے کہ رعایت خاں کی سرکار سے میر کا تعلق اواخر ۱۷۴۷ء سے اواخر ۱۷۴۸ء تک تقریباً ایک سال رہا۔ صفدر جنگ نے بخشی گری کا عہدہ نواب سادات خاں ذوالفقار جنگ کو دے دیا۔ سادات خاں نے راجا ابھے سنگھ والی جودھپور کے چھوٹے بھائی بخت سنگھ کو صوبہ اجمیر کی نیابت دے دی اور اس طرح دونوں بھائیوں کو آپس میں لڑا دیا۔ بخت سنگھ نے اپنی فوج کی کمان رعایت خاں کے سپرد کر دی اور اسے اپنے ساتھ لے کر اجمیر کا سفر کیا۔ اس وقت بھی میر تقی میر رعایت خاں کے ہمراہ تھے۔ سانبھر کے مقام پر فوجوں میں مقابلہ ہوا۔ ابھے سنگھ نے میدان ہاتھ سے جاتا دیکھا تو ملہار راؤ ہولکر کو ثالث بنا کر صلح کر لی۔ اب میر سانبھر سے اجمیر آئے اور انہوں نے درگاہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی زیارت کی اور آس پاس کی سیر کر کے پھر سانبھر کو واپس ہوگئے جہاں رعایت خاں کا لشکر خیمہ زن تھا۔ [۵۲]

اس موقع پر رعایت خاں اور راجہ بخت سنگھ کی کسی معاملے میں بدکلامی ہوگئی۔ رعایت خاں کی طرف سے ستار قلی خاں کشمیری نے راجہ بخت سنگھ کو گالیاں دے ڈالیں اس سے رنجش اور بڑھی اور یہ خدشہ پیدا ہوگیا کہ رعایت خاں اور بخت سنگھ کی فوجیں ایک دوسرے کے مقابل نہ آجائیں۔ رعایت خاں نے

---

[۵۲] میر کی آپ بیتی (طبع اول) ص ۹۸-۱۰۱۔ ذکر میر (طبع اول) ص ۷۸-۷۹

میر تقی میر کو بھیجا کہ بخت سنگھ سے معذرت کریں اور یقین دلائیں کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ معذرت کے یہ فرائض میر نے انجام دیئے [۵۳] مگر بخت سنگھ کا دل صاف نہیں ہوا۔ اس نے رعایت خاں کے رسالے کی تنخواہ بے باق کر کے رخصت کر دیا۔ رعایت خاں اپنے متوسلین کو لے کر دہلی آگیا۔ میر بھی آگئے۔

اسی زمانے میں ایک چاندنی رات کو رعایت خاں کے سامنے ڈوم کا لڑکا ٹھمکا گا رہا تھا۔ خاں نے میر سے کہا کہ اسے اپنے ریختہ کے دو تین شعر یاد کرا دو۔ یہ دھن باندھ کر سنا دے گا۔ میر کو یہ بات ناگوار گذری کہ انہیں ایک ڈوم کے لڑکے کو تعلیم کی خدمت سپرد کر دی گئی۔ طوعاً و کرہاً اسے شعر تو یاد کرا دیئے مگر اگلے دن سے رعایت خاں کے دربار میں جانا چھوڑ دیا۔ رعایت خاں نے بطور تلافی میر کے چھوٹے بھائی میر محمد رضی کو اپنے پاس سے گھوڑا دے کر ملازم رکھ لیا۔ مدت کے بعد ملاقات ہوئی تو معذرت بھی کی، میر نے بھی گذشتہ را صلوٰۃ کہی۔

کچھ زمانے کے بعد وہ اسد یار خاں کے توسط سے جاوید خاں خواجہ سرا کی سرکار سے وابستہ ہوگئے [۵۴] اسد یار خاں [۵۵] نے گھوڑے اور نوکری کی شرط معاف کرادی گویا برائے نام خدمت رہی وظیفہ مقرر ہوگیا۔

یہ رہا دورہ رعایت خاں سے وابستگی کی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں رعایت خاں کا کچھ تعارف کرا دیا جائے۔ نظام الملک آصف جاہ اول کے مورث اعلیٰ شیخ سمرقندی صدیقی تھے۔ ان کے دو فرزند ہوئے ایک کا نام میر بہار الدین تھا۔ دوسرے میر عابد قلیچ خاں (متوفی ۱۰۹۸ھ) تھے۔ میر بہار الدین کے دو فرزند

---

[۵۳] میر کی آپ بیتی ص ۱۰۱

[۵۴] میر کی آپ بیتی ص ۱۰۲

[۵۵] میر کی آپ بیتی ص ۱۰۲

[۵۶] جاوید خاں خواجہ سرا نے احمد شاہ بادشاہ کی ماں کے ذریعے نواب بہادر کا خطاب حاصل کیا تھا۔ یہ امور سلطنت میں اس حد تک دخیل ہوا کہ صفدر جنگ نے خطرہ محسوس کرتے ہوئے اسے دعوت کے بہانے گھر بلایا (۸ شوال ۱۱۶۵ھ/ ۲۸ اگست ۱۷۵۲ء) اور قتل کر کے لاش دریا میں پھنکوا دی۔ کئی ہزار متوسلین جو اس کی سرکار سے وابستہ تھے بے روزگار ہوگئے۔ ان میں میر تقی میر بھی تھے۔ اب میر نے مہا نرائن دیوان کی ملازمت کر لی۔ ذکر میر ص ۷۲۔ میر کی آپ بیتی ص ۱۰۶

[۵۷] اگرچہ اسد یار خاں انسان تخلص بے توان کا انتقال ربیع الاول ۱۱۵۸ھ مارچ ۱۷۴۵ء میں ہو چکا تھا (تاریخ مظفری ۱۲۰) اور جاوید خاں کا عروج ۱۱۶۱ھ کے بعد ہوا ہے۔ غالباً یہ دوسری شخصیت ہے۔

تھے۔ ایک نواب رعایت خاں (متوفی ۱۱۵۲ھ) دوسرے نواب محمد امین خاں (متوفی ۱۱۳۳ھ/۱۷۲۰ء) بعد رعایت خاں کو میر عابد قلیچ خاں کی دختر فاطمہ بیگم (وفات ۱۱۵۳ھ) منسوب ہوئی تھیں۔ ان کے بطن سے نواب ظہیر الدولہ عظیم اللہ خاں بہادر مجاہد جنگ صوبیدار مالوہ (وفات ۱۱۵۷ھ/۱۷۴۴ء) پیدا ہوئے تھے۔ اور انہیں میر محمد امین خاں (وفات ۱۱۳۳ھ/۱۷۲۰ء) کی بیٹی نور النساء بیگم منسوب تھیں۔ ان کے بطن سے رعایت خاں پیدا ہوا تھا جو میر تقی میر کا مربی ہے۔ اس رعایت خاں کو میر محمد امین خاں کی پوتی یعنی نواب قمر الدین خاں (وفات ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) کی بیٹی منسوب تھیں۔ قمر الدین خاں کی دوسری بہن نواب زکریا خاں (وفات ۱۱۵۸ھ/۱۷۴۵ء) کو بیاہی تھیں جن سے شاہنواز خاں پیدا ہوا تھا جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

میر عابد قلیچ خاں کے ایک بیٹے میر شہاب الدین (غازی الدین خاں) فیروز جنگ تھے اور ان کے فرزند ریاست حیدر آباد کے بانی آصف جاہ اوّل (وفات ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) تھے۔ یہ ایک ہی خاندان کے کل افراد کا شجرہ نہیں ہے۔ چند اہم نام گنائے گئے ہیں۔ ان میں کوئی لاہور کا گورنر ہے کوئی مالوے کا، کوئی حیدر آباد کا، کوئی وزیر اعظم ہے۔ غرض اس خاندان کے تمام افراد معزز عہدوں پر فائز رہے اور شاہی خاندان کے بعد عزت و وجاہت اور اقتدار و ثروت میں انہیں کا درجہ تھا۔ مگر میر کی بددماغی کا یہ عالم تھا کہ رعایت خاں کی ذرا سی فرمائش سے برافروختہ ہو گئے۔

سفر سرہند کا دوسرا حوالہ میر نے اپنے تذکرہ نکات الشعراء میں دیا ہے، انہوں نے انعام اللہ خاں یقین کے حال میں لکھا ہے: "پدرش اظہر الدین خاں نام دارد، باجدش در سرہند ملاقات کردہ بودم بسیار آدم بامزہ یافتہ، بسلوک پیش آمدہ و ضیافت فقیر کردہ تا دیر نشستہ صحبت مستوفی داشتم۔ شعر بطرزی گوید" [۳] اس سے ظاہر ہے کہ سفر سرہند (۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) کے دوران میر نے یقین کے دادا

[illegible] تذکرہ نگاروں نے [۱] [illegible]

مرزا رحمت اللہ بیگ [illegible]

یقین ... کے دادا حضرت شیخ [illegible] کو دہ سب سے مرجع خلائق تھے۔ [illegible] بہادری کے باعث سلطنت کے [illegible] دونوں میاں کی طرف سے چوتھی پشت میں حضرت شیخ [illegible] سے خلیفہ دوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ تک [illegible] میں باقی خاں تعلقات جہاندار شاہ جہاں سے [illegible] حضرت شیخ احمد سرہندی کے بعد آپ کے دو فرزند شیخ احمد سعید اور شیخ محمد معصوم صاحب ولایت ہوئے۔ شیخ احمد سعید کے بعد ان کے فرزند شیخ عبد الاحد [illegible] پر دگل، سجادہ نشین ہوئے۔ یہ انعام اللہ خاں یقین کے دادا ہیں۔ آپ کی شہرت کا یہ حال تھا کہ میر تقی میر جیسا بددماغ شخص بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔۔۔ شیخ عبد اللہ کے فرزند شیخ اظہر الدین سرہند چھوڑ دہلی آ گئے۔ یہاں آپ کے خاندانی فضائل کا ہر شخص معتقد تھا سب لے ہاتھوں ہاتھ لیا اور نواب [illegible] نے اپنی صاحبزادی کی شادی آپ سے کر دی۔" [۲]

زمانۂ مابعد میں میر کے مورخ اور نقاد ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے میر کے سفر سرہند کا علیحدہ عنوان کے تحت ذکر نہیں کیا اور اس بات کو حسب سابق اعتنا نہیں سمجھا کہ میر نے انعام اللہ یقین کے دادا سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے اور تذکرہ نگاروں نے ان کے دادا کا نام عبد الاحد عرف شاہ گل وحدت بتایا ہے، جنہوں نے مؤلف روضۃ القیومیہ کی روایت کے مطابق ۷ ذی الحجہ ۱۱۲۶ھ مطابق ۱۳ دسمبر ۱۷۱۴ء کو انتقال کیا۔ بندرابن خوشگو نے جعفر زٹلی کے [illegible] وفات ہونا

---

[۱] اسی خاندان کے ایک فرد اور نظام الملک آصف جاہ اوّل کے پوتے نواب عماد الملک نے (۱۱۶۵ھ/۱۷۵۱ء میں)، نواب صفدر جنگ سے سازش کر کے احمد شاہ سے امیر الامراء کا منصب حاصل کر لیا۔ احمد شاہ نے صفدر جنگ کی سازشوں سے عاجز آ کر نواب انتظام الدولہ پسر نواب قمر الدین خاں کو وزارت عظمیٰ دے دی جو عماد الملک کا ماموں بھی ہوتا تھا۔ عماد الملک نے احمد شاہ کو اندھا کر کے تخت سے اتار دیا جس کا بیان میر نے بھی کیا ہے (ذکر میر ص ۱۶۸ میر کی آپ بیتی ص ۱۰۹) اور عالمگیر ثانی کو اس کی جگہ بادشاہ بنا دیا۔ (۱۰ شعبان ۱۱۶۷ھ/۲ جون ۱۷۵۴ء)

[۳] نکات الشعراء (طبع اول) ص ۸۵

[۱] یقین کے سلسلے میں ملاحظہ ہوں: نکات الشعراء ۳۲-۳۳، مخزن نکات ۳۹، گردیزی ۱۴۶، چمنستان شعراء ۱۴۱-۳۴۳، گلشن گفتار ۳۴-۳۳، میر حسن ۲۳، تذکرہ ہندی ۲۷۵، ۲۷۸، مسرت افزا ۱۴۳-۱۴۹، مجموعہ نغز ۲۲۵، [illegible] ب، دو تین تذکرے ۱۸۰، تذکرہ ضیغم قلمی ۹، تذکرہ بے جگر [illegible] انتخاب الشعراء قلمی ورق ۹۰ الف، اطباء الشعراء قلمی ورق ۳ ب، دیوان جہاں ۲۰، گلشن سخن ۲۳، سرور ۲۲۵، شیفتہ ۲۴۴، نسیم سخن ۲۵۹، اشپرنگر ۲۲۳، گلزار [illegible]

[۲] دیباچہ دیوان یقین (طبع ۱۹۳۰ء) ص ۱۰-۱۱

پیدائش ... ہجری ہے جو ایک قطعہ تاریخ وفات سے ثابت ہوتی ہے۔

مگر ولادت گلشن وحدت کے مطابق ۱۱۳۵ھ/۲۳-۱۷۲۲ء ہے اور شاہ گل وحدت کی وفات سے کئی سال کے بعد عالم وجود میں آئے ہیں۔ تو آخر ان کی ملاقات کس طرح ہوئی۔

واقعہ یہ ہے کہ میر نے وحدت کو قطعاً نہیں دیکھا تھا اور انہوں نے نکات الشعراء میں غلط بیانی کی ہے کیونکہ یقین کے دادا کے دعوے کے بعد کسی اور سے ملاقات کی ہوگی، وہ بھی مشتبہ ہے۔ وہ یقین کے حالات سے واقف تھے اور شاہ گل وحدت سے متاثر تھے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے:

حضرت خواجہ محمد سعید (۱۰۰۵ھ - ۱۰۷۰ھ) کے سات فرزند تھے[۲]: ۱۔ عبداللہ ۲۔ محمد خلیل اللہ ۳۔ محمد اشرف ۴۔ شاہ فرخ (۱۰۳۸ھ/۲۹-۱۶۲۸ء - ۱۱۲۲ھ/۱۷۱۰ء) ۴۔ شیخ سعدالدین ۵۔ شاہ عبدالاحد المعروف بہ شاہ گل وحدت (۱۰۴۹ھ/۱۶۳۹ء - ۱۱۲۶ھ/۱۴-۱۷۱۳ء) ۶۔ نام معلوم نہیں ۷۔ محمد یعقوب۔

شیخ عبدالاحد وحدت کے چار فرزند اور تین صاحبزادیاں تولد ہوئیں۔ سب سے بڑے محمد ابوحنیفہ[۳] تھے جن کے پوتے شیخ محمدی المعروف بہ شاہ بھیک ہوئے۔ دوسرے کا نام محمد جواد تھا، تیسرے محمد نقی اور چوتھے نورالحق تھے۔ خواجہ محمد سعید کے ساتویں فرزند محمد یعقوب کی اولاد میں عصمت اللہ تھے۔ ان کے چار فرزند اور ایک دختر تھیں۔ بڑے کا نام صفت اللہ تھا، لاولد فوت ہوئے، دوسرے سلطان المشائخ، تیسرے ولی اللہ، چوتھے غلام الٰہی تھے۔ دختر کا نام جانان بیگم تھا۔ عصمت اللہ کے یہی تیسرے بیٹے اردو کے مشہور شاعر شاہ ولی اللہ اشتیاق دہلوی[۴] ہیں جن کا حال قدیم تذکروں میں ملتا ہے جنہیں غلطی سے شاہ ولی اللہ دہلوی فرزند شاہ عبدالرحیم دہلوی سمجھ لیا جاتا ہے۔ شیخ عبدالاحد وحدت کے تیسرے فرزند محمد نقی شاعر تھے۔ اور تقی تخلص کرتے تھے۔ ان کے دو فرزند ہوئے، بڑے کا نام محمد ظہوراللہ تھا۔ یہ مجذوب تھے اور غیر معقب رہے۔ دوسرے محمد اظہرالدین ہیں جنہیں خانی کا خطاب تھا اور نواب محمد اظہرالدین خاں[۵] مبارز جنگ کہلاتے ہیں۔ انہیں نواب عمیدالدین خاں کی دختر منسوب ہوئیں۔

اظہرالدین خاں کے تین بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ بڑے محمد عرفان اللہ بچپن میں مر گئے تھے، منجھلے محمد احسان اللہ اور چھوٹے محمد انعام اللہ تھے۔ یہی اردو کے مشہور شاعر انعام اللہ خاں یقین ہیں۔ محمد احسان اللہ کے دو فرزند تھے۔ محمد اشتاق تو بچپن میں فوت ہوئے اور دوسرے شاہ محمد آفاق، مشہور نقشبندی بزرگ ہیں جو (۱۱۹۰ھ/۷۷-۱۷۷۶ء) میں پیدا ہوئے۔ اور (۷ محرم ۱۲۵۱ھ/ ۵ مئی ۱۸۳۵ء) کو انتقال کیا۔ شاہ محمد آفاق کے اولاد نرینہ نہیں تھی۔ دو صاحبزادیاں بی بی عائشہ اور بی بی فاطمہ یادگار چھوڑیں۔

انعام اللہ خاں یقین کے تین فرزند اور دو دختر یادگار رہیں، مقبول النبی[۶]، صمصام اللہ اور میر حسین۔ ایک دختر مبارک بیگم تھیں دوسری کا نام معلوم نہ ہوا۔ سہولت کے لئے یہاں خاندان یقین کا شجرہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ باہمی قرابت

[۱] گلشن وحدت (مرتبہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں)، مقدمہ نزہۃ الخواطر ۱۳۵/۶ میں ہے کہ ولادت ۱۰۵۰ھ میں ہوئی، انتقال ۱۹ ذی الحجہ ۱۱۲۶ھ کو دہلی میں ہوا۔ جسد سرہند لے جا کر دفن کیا گیا لیکن تاریخ ۱۱۲۶ھ ہی زیادہ صحیح ہے۔

[۲] انساب الطاہرین، قلمی، مولفہ شاہ محمد عمر نقشبندی مجددی

[۳] ان کا نام انساب الانجاب وغیرہ میں محمد ابوحنیفہ بھی ملتا ہے۔ اور یہی زیادہ معروف ہے۔ شاہ محمد عمر نے خود اپنے قلم سے ابوحنیفہ لکھا ہے۔

[۴] اشتیاق کے لئے درگا داس نے تذکرہ سفینۂ عشرت (تالیف ۱۱۸۵ھ/۱۷۷۱ء) میں لکھا ہے: "شاہ ولی اللہ اشتیاق تخلص، درویشے بود بعنی آشنا، درکوٹلہ فیروز شاہ واقع دہلی کہنہ اقامت داشت درسنہ ہزار و صد و پنجاہ و چند داعی اجل را لبیک قبول گفت" (قلمی نسخہ، کتب خانہ خدا بخش، پٹنہ، ورق ۵۰۔ الف)، یہ عبدالغنی بیگ قبول کے شاگرد تھے (باغ معانی قلمی ورق ۱۹۵ب)

مزید حالات کے لئے رجوع شود: نکات الشعراء: ۶، مخزن نکات، ۱۸، گردیزی ۸، مسرت افزا ۲۰، میر حسن: ۸، تذکرہ گلشن ہند (حیدری)؛ ۲۴، عیار الشعراء خوب چند ذکا (قلمی خدا بخش) ورق ۲۸۔ الف خمخانۂ جاوید ۱: ۳۰۸، رسالہ ہندوستانی (الٰہ آباد) ۱۹۳۸ء

[۵] نواب اظہرالدین خاں بھی شاعر تھے۔ تذکرہ باغ معانی مولفہ نقش علی (قلمی نسخہ، خدا بخش، پٹنہ) میں ورق ۹۵ ب کے حاشیے پر لکھا ہے: "اظہرالدین خاں اظہر تخلص، بنیرۂ شیخ گل است از نبائر شیخ احمد مجدد الف ثانی... بمصاہرت عمیدالدین خاں بہادر معزز بود و در فن شعر شاگرد شاہ قابل مرحوم است، پدر میر یقین تخلص از شعرائے شیوا بیان ہندی زبان است" اظہر کا ایک فارسی شعر دیا ہے۔

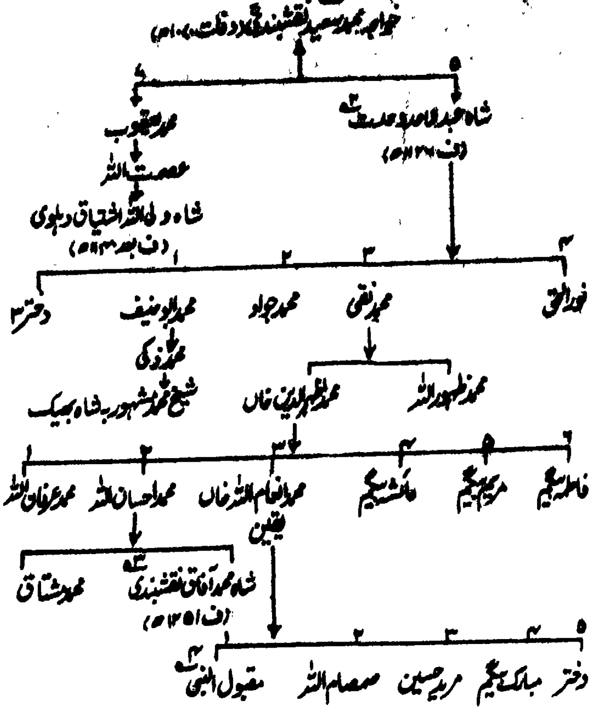
پیشتر در وصل درد و غم نصیب ما شود
دل ز ما گم می شود دلدار تا پیدا شود

[۶] مقبول النبی بھی شاعر تھے۔ ان کا حال تذکرۂ مسرت افزا (معاصر پٹنہ)، ص ۱۴۹ میں ملے گا۔

[۷] عیار الشعراء خوب چند ذکا (قلمی نسخہ خدا بخش)، ورق ۸ ب

[illegible] نظر واضح ہو جائے۔ اس کتاب کی بنیاد کتاب انساب [illegible] خواجہ محمد حسن اور شاہ محمد عمر نقشبندی کی قلمی بیاض سے معلوم ہوئی ہے جس کا نام انساب الطاہرین ہے۔ ان کے علاوہ الینع الجنی، تذکرۃ الانساب (مولفہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی)، نزہۃ الخواطر (مولفہ سید عبدالحی)، الہدیۃ احمدیہ بھی پیش نظر رہے ہیں۔ شجرے کے غیر ضروری افراد کا یہاں ذکر نہیں کیا گیا۔

## انعام اللہ خاں یقین کا شجرۂ نسب




---

[1] خواجہ محمد سعید کے فرزند محمد فرخ شاہ کے صاحبزادے علی رضا سے ولی گجراتی بیعت تھے۔ (گلشن وحدت ص ۱۷۴)

[2] وحدت صاحب تصانیف تھے۔ (نزہۃ الخواطر ۶/۱۳۵) ان کے مکتوبات کا مجموعہ ڈاکٹر غلام مصطفی خاں نے ۱۹۶۲ء میں کراچی سے شائع کیا ہے جس کا نام گلشن وحدت ہے۔ اسے وحدت کے خلیفہ محمد مراد کشمیری نے فراہم کیا تھا جن کا ذکر ولی گجراتی کے اس شعر میں ہے:

مقصود دل ہے اس کا خیال اے ولی مجھے
جو مجھ زباں کا ورد محمد مراد ہے

[illegible] ہمیشہ [illegible] انہیں [illegible] ذات [illegible] نیز شاہ [illegible] ہو جائے گا کہ [illegible] شاہ عبدالاحد المعروف بہ شاہ گل [illegible] میں دیکھئے تو فرحت اللہ بیگ [illegible]

(الف) یقین کا نسب شیخ [illegible] سے منتہی ہوتا ہے۔

(ب) شیخ عبدالاحد وحدت یقین کے [illegible] محمد تقی تھا اور

(ج) میر نے ان سے کی ملاقات کرنے [illegible] لکھا ہے۔

مقدمہ دیوان یقین میں اس کے علاوہ بھی بعض امور اصلاح طلب ہیں ان سے ہم نے دوسرے مضمون میں بحث کی ہے جو اس کے بعد آئے گا۔

## (۲)

مناسب ہوگا کہ یہاں یقین کی تمثیل [illegible] ذکر کر دیا جائے۔ نواب

---

نیز دیکھئے روضۃ القیومیہ ۱/۲۹۵، سفینۂ خوشگو [illegible] ۲۹۰

[3] شاہ محمد آفاق نقشبندی کے لئے رجوع ہوں [illegible] (۱۹۶۵ء) ص [illegible]

[4] فرحت اللہ بیگ نے یقین کی صاحبزادیوں کا ذکر نہیں کیا۔ بظاہر وہ ان سے بے خبر اور اولاد ذکور کی ترتیب بھی یوں لکھی ہے کہ [illegible] فرزند مرید [illegible] صمصام اور چھوٹے مقبول (مقدمہ دیوان یقین ۲) لیکن انساب الطاہرین (قلمی) سے معلوم ہوتا ہے کہ بالعکس صحیح ہے۔ یعنی بڑے لڑکے مقبول تھے اور چھوٹے مرید۔

[5] ان کا نام شیخ محمد عمر نقشبندی نے اپنی بیاض میں [illegible] لکھا ہے جو نعمت اللہ شوق نے تکملۃ الشعراء (قلمی ورق ۲۱۵۔ الف) میں [illegible] نقش علی کے تذکرہ باغ معانی (قلمی نسخہ پٹنہ) میں ورق ۴۲۔ الف [illegible] ان کا ترجمہ حرف ت میں درج ہے اور نام محمد تقی بتایا ہے۔ محمد تقی تقی تخلص، خلف وحدت، این مطلع از و میر لطف اللہ سہرندی در تذکرہ خود نوشتہ:

مفت است یار [illegible] است [illegible]
فردا قیامت است [illegible] شب [illegible]

حمیدالدین خاں نیمچہ تو مشہور شخصیت ہیں۔ انہوں نے ۸ر صفر ۱۱۴۳ھ/۲۳ر ستمبر ۱۷۳۰ء کو ۹۰ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ ان کے باپ کا نام سردار خاں ہے۔ یہ ۱۰۷۳ھ/۱۶۶۲ء میں فوت ہوئے اور عبدالباقی خاں تھے۔[1]

حمیدالدین خاں کے ایک فرزند عبدالباقی خاں[2] تھے اور دو صاحبزادیاں تھیں ایک غالب الظہیرالدین خاں کو منسوب ہوگئی یہ اسلام اللہ خاں یقین کی والدہ تھیں اور دوسری ہدایت اللہ خاں بن عنایت اللہ خاں[3] کشمیری کو بیاہی تھیں۔ ہدایت اللہ نے ۱۱۴۴ھ/۱۷۳۱ء میں بعمر ۳۵ سال انتقال کیا، اسلام اللہ خاں یقین کے خالو تھے۔

میر نے اپنے تذکرہ نکات الشعراء میں لکھا ہے کہ "یقین کے بارے میں لوگ کہتے ہیں مرزا مظہر انہیں شعر لکھ کر دیا کرتے ہیں اور شاعری میں اپنا وارث بنا لیا ہے۔ اس بات پر ہنسی آتی ہے کیوں کہ ہر شے وارث کو پہنچ سکتی ہے مگر شعر۔ مثلاً اگر کوئی اپنے باپ کے اشعار پر بھی متصرف ہو یا اس کا مضمون اڑا لے تو اُسے بھی چور کہا جائے گا"۔ پھر آگے چل کر کہتے ہیں کہ ملاقات سے اتنا تو اندازہ ہو ہی جاتا ہے کہ "ذائقہ شعر فہمی" مطلق نہیں ہے اسی وجہ سے لوگ ناموزوں ہونے کا گمان کرتے ہیں۔ ایک لطیفے کا یہ بھی خیال ہے کہ یقین کے اشعار نقص سے خالی نہیں ہیں بہرحال ایک شخص سے روایت کی ہے کہ عطیۃ اللہ خاں پسر عنایت اللہ خاں کے گھر یقین بیٹھے تھے اور کہہ رہے تھے کہ جب سے استاد نے میرے سر پر ہاتھ رکھا ہے میری شاعری میں نمایاں ترقی ہوگئی ہے۔ شخص مذکور (راوی) نے اس پر سب کے سامنے بلند آواز سے نظامی کا مصرع پڑھ دیا:

شد آں مرغ کو خایہ زریں نہاد

اس پر یقین بوکھلا گئے۔[4]

ان باتوں سے قطع نظر یہ دیکھئے کہ عطیۃ اللہ خاں کون تھے؟[5] عنایت اللہ خاں

---

[1] حمیدالدین خاں کے لئے رجوع شود: مآثر الامراء ۱، ۶۰۵۔ تاریخ محمدی: ۶۸، ۱۹۹

[2] ان عبدالباقی خاں کے فرزند مرزا مغل جرأت شاگرد سودا تھے، یہ بریلی میں رہتے تھے۔ (عیار الشعراء قلمی ورق ۸۰ ب)

[3] عنایت اللہ کشمیری عہد اورنگ زیب کی مشہور شخصیت ہیں، ۸ر ربیع الاول ۱۱۳۸ھ/۲ر نومبر ۱۷۲۵ء میں فوت ہوئے ۸۰ سال عمر پائی۔ ہفت ہزاری ہفت ہزار سواری ان کا منصب تھا۔ (مآثر الامراء ۲: ۸۲۸) دیکھئے، تاریخ محمدی ص ۶۷، ۱۹۵

[4] نکات الشعراء (طبع اول) ص ۸۵

[5] واقعات کشمیر: ۲۵۵ تاریخ محمدی: ۱۷۶، ۲۲۰

کشمیری (ف ۱۱۳۸ھ/۱۷۲۵ء) کا حوالہ اوپر آچکا ہے۔ ان کے پانچ فرزند تھے۔

۱۔ ہدایت اللہ خاں ۲۔ ضیاء اللہ خاں ۳۔ روح اللہ خاں ۴۔ عبیداللہ خاں ۵۔ عطاء اللہ خاں۔ ہدایت اللہ خاں کے بیٹے کا لقب بھی ہدایت اللہ خاں تھا جو یقین کے خالو تھے اور عطاء اللہ خاں کا لقب عطیۃ اللہ خاں تھا۔ بعد کو انہیں بھی "عنایت اللہ خاں" خطاب خاندانی عطا ہوا اور کشمیر کی صوبیداری تفویض کی گئی۔ وہاں ۱۱۵۴ھ/۱۷۴۱ء میں کسی نے انہیں شہید کر دیا تھا۔[1] اس سے واضح ہوگیا ہوگا کہ عطیۃ اللہ خاں یقین کے خالو ہدایت اللہ خاں کے چچا تھے۔ یقین کی ننھیال کے یہ رشتے تو ہمیں معلوم ہیں۔ ممکن ہے کہ باہم رشتہ داری کا یہ سلسلہ اور وسیع رہا ہو اور خود یقین کی بیوی بھی اسی خاندان کی فرد ہوں۔ میر نے صرف عطیۃ اللہ خاں کے مکان پر یہ لطیفہ پیش آنے کا ذکر کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ خود عطیۃ اللہ خاں تو ۱۱۵۴ھ میں مرچکے تھے اور مرزا مظہر جان جاں (ف ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۰ء) بقید حیات تھے۔ لطیفہ ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۰ء کے بعد کا ہوگا۔ اگر اس میں نظامی کے مصرع سے مرزا مظہر کی وفات کا کنایہ نہیں ہے۔ بدیں صورت میر ۱۱۹۵ھ کے بعد لکھنؤ جاچکے تھے اور اس لطیفے کو زمانہ مابعد کا اضافہ ماننا پڑے گا۔ ترجمہ یقین اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ خود یقین بھی زندہ ہیں۔ ان کی وفات ۱۱۶۹ھ/۱۷۵۵ء میں ہوئی ہے۔[2]

---

[1] واقعات کشمیر: ۲۵۵ میں قاتل کا نام "دیارام نوکر عمدہ ابوالبرکات خاں" بتایا ہے۔ محمدی: ۲۲۰

[2] چمنستان شعراء بحوالہ عبدالحکیم حاکم ۱۳۳، نیز تاریخ محمدی (قلمی: رامپور) تحت ۱۱۶۹ھ

ہندوستان کی مسجدیں

افسانہ




ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

وہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ بے فکر، منہ سے دھواں اگلتا ہوا، بڑبڑاتا ہوا بار بار سر کو جھٹکے دیتا ہوا۔

"تم قاتل ہو۔" میں نے اس کو کٹہرے میں کھڑا کر دیا۔

"تم بڑے مکار ہو۔" اس نے اپنی بڑی بڑی دھیاگی ہوئی آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال دیں۔ میری آنکھوں میں کیلیں لگے مجھے۔ اس کی آنکھوں نے بڑے زور سے قہقہہ لگایا میں ڈر گیا۔ وہ کٹہرے میں تھا۔ مگر یہ کٹہرا الیوژن بھی تو ہو سکتا ہے۔ میں نے کٹہرے کو چھو کر دیکھا۔ سب ٹھیک تھا۔ میں محفوظ تھا۔

"ہوہو، ہوہو تم کیا کہتے ہو۔" کٹہرے سے آواز آئی۔

"کیا کہوں ؟"

"بتاؤ تم مکار ہو یا نہیں۔ ؟"

"میں پوچھتا ہوں تم نے قتل کیوں کیا ؟"

"قتل میں نے کیا ؟ قتل ہوا کون ؟"

"یہ تو میں بھی نہیں جانتا۔"

کٹہرے سے پھر قہقہہ پھٹ پڑا۔ کمرہ دھوئیں سے بھر گیا۔ نہ جانے کمرہ تھا یا کھلا میدان یا دریا۔ دریا ہی تھا۔ پانی کی سطح پر لاش تیر رہی تھی اور اندھیرے میں چاند کی طرح چمک رہی تھی پانی میں۔ جہاز کنارے سے بہت دور تھا۔ یہ سب تھا مگر سب کمرے میں تھا اور کمرہ سگریٹ کے دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے کٹہرے کو چھو کر دیکھا۔ سب ٹھیک تھا میں محفوظ تھا۔

خلفشار کہرے کی طرح ہے۔ ہر چیز دھندلی ہے، سرد ہے، بے مزہ ہے، خاموش ہے، ایک کہر ایسا ہوا ہیں چھلکوں کی طرح بکھرتا ہے تیرتا ہوا آتا ہے اور مجھ سے لپٹ جاتا ہے۔ ٹھنڈک میرے ہونٹوں اور آنکھوں کو چومتی ہے اور میری روح میں گھل جاتی ہے جس کی [illegible] رہی ہے۔

[illegible] سے بھرا ہوا [illegible] رنگ اٹھاتا ہوں اور منہ سے لگاتا [illegible] زبان پر پھیلتی ہے۔ یہ بیئر نہیں ہے۔ [illegible] زبان پر [illegible] بوتل کتنی دیر برف کے [illegible] ہے۔ جھاگ بھی گرم ہو رہا ہے۔ موسم گرم ہے [illegible] اس کی ٹھنڈک تالیوں میں جذب ہو رہی ہے۔ اٹھاؤ ٹنگ پڑ رہے ہیں [illegible] تلخ ہے زبان تلخ ہے۔ تلخی تلخی میں گھل رہی ہے سمندر کے جھاگ کی

[illegible]

طرح۔ [illegible] کے وقت۔ شام ہو۔ تمہارے چہرے پر [illegible] ابھر آئی ہیں۔ تمہارا چہرہ پیش دالان ہے۔ چہرہ پیش دالان ہے جس پر جھریاں ابھر آئی ہیں۔ وقت جھریاں ڈال دیتا ہے وقت جھریاں مٹا دیتا ہے، وقت ہونٹ بھی ہے، [illegible] ہے، وسال بھی ہے، وقت پھلوں سے بھرا درخت بھی ہے۔ وقت بیئر کا مگ ہے۔ جو [illegible] جس میں جھاگ بھرا ہوا ہے۔ وقت میرا بازو ہے۔ وقت کسی کی کمر ہے۔ [illegible] مجھے نیند آ رہی ہے۔ پیو اور پیو۔ یہ تو بل زیادہ ٹھنڈی ہے۔ یہ بوتل زیادہ دیر تک برف میں دبی رہی ہے۔ ہر چیز برف میں دب کر رہ جاتی ہے۔ برف میں [illegible] وقت ہے جس کو نہ برف میں دبایا جا سکتا ہے۔ نہ مٹی میں۔ لیکن جب [illegible] تم بھی خالی کرو گے تو میں تمہیں دبا دوں گا۔ مجھے ؟ کیوں ؟ کیونکہ تم [illegible] دبا دو۔ برف میں ؟ نہیں مٹی میں ! کیوں ؟ کیوں کہ تم قتل ہو چکے ہو۔ [illegible] مٹی میں دبا دیا جاتا ہے

وہ اب بھی کٹہرے میں کھڑا تھا [illegible] تھا۔ اس کا لمبوترا چہرہ نیلا پڑ گیا تھا [illegible] کا رنگ نیلا تھا میں سانپ کے زہر کا رنگ [illegible] کیچلی نے نکلتا ہے میں اپنے [illegible] چاہتا ہوں [illegible] ساتھ سفر کرنا [illegible]

[illegible] اور اس کے ہونٹوں [illegible] ہوں۔ اب تم [illegible] سکتا ہوں قتل [illegible] کے بعد [illegible]

آہستہ اور آہستہ!

[illegible] کے پروں پر جمی ہوئی پپڑیاں سے پھُریری کی دھند کی طرح روشنی پھوٹ [illegible] میں [illegible] تحلیل ہوتی جا رہی ہیں کیونکہ خالی ہے۔ تنی قالین پر تیر [illegible] روشنی پول رہی ہے۔ کمرے میں سرگوشیوں کے سوا کچھ نہیں۔

تم جو کچھ کہہ رہی ہو میں سمجھتا ہوں۔ میں نے تم کو نہیں بلایا تم خود آئی ہو اور [illegible] آئی ہو تم بھی انجان، میں بھی انجان۔ میں ہوں۔ تم ہو۔ ہمارے لباسوں کا [illegible] لباسوں کا ملبہ ہے ہم زندگی بھر لباسوں کے ڈھیر میں ملبوں کے نیچے تلے دبے [illegible] لیکن اب ہم آزاد ہیں ہمارے لباس بھی آزاد ہیں۔ ہم راکھ کی طرح ہیں جس نے اپنا [illegible] ربا ہے جسم ہلکے ہو گئے ہیں۔ خواب کی طرح۔ لباس ہمیں بھاری بنا دیتے ہیں۔ لباس جوش کی طرح ہمیں۔ لباس ہمارا وزن بڑھا دیتے ہیں۔ ہمارے جسم کتنے ہلکے ہیں۔ شعلے کی طرح۔ [illegible] رہی ہو اور شعلے بجھ رہے ہیں۔ پھر بھی سانس کا بوجھ بڑھ رہا ہے اب۔ رومانی باتیں نہ کرو فقط بھیگے ہوئے لباس کی طرح ہیں۔ بوجھل۔ لباس کا بوجھ بڑھ رہا ہے وہ کیا چیز تھی جو تمہیں یہاں لائی اس اندھیرے کمرے میں۔ اس اندھیرے میں جو بات تم نے سرگوشی میں کہی ریگستانی بگولے کی طرح ہے بگولا اٹھا اور سو گیا۔ تم بھی سو گئیں صرف وہ بات جاگ رہی ہے جو تم نے سرگوشی میں کہی۔ وہی ایک بات۔ پیاس۔ صدیوں پرانی پیاس۔ تمہارا چہرہ کتنے رنگ بدلتا ہے۔ تجربے نے تمہیں تھکا دیا ہے۔ تمہاری سانس اب بھی قابو میں نہیں۔ خاموش پڑی رہو۔ میں پہرے جاگ رہا ہوں اور تم پر چھا رہا ہوں تم سے بے نیاز ہوں لیکن میرا جسم آزاد ہے۔ تم بھی مجھ سے بے نیاز ہو۔ لیکن تمہارا جسم آزاد نہیں کیونکہ تمہیں اپنے جسم کا احساس ہے۔ مجھے کوئی احساس نہیں۔ احساس کے قیدی، احساس کے قیدی! میں انہیں نہیں جانتا۔ وہ مجھے نہیں جانتے۔ شعلے بجھ جاتے ہیں تو بوجھ بڑھ جاتا ہے لیکن میں بوجھ نہیں ہوں۔ میں اپنے بوجھ سے الگ ہوں میں [illegible] ہوں سانس لے سکیں قیدی نہیں ہوں۔ قیدی: میں ٹھنڈی سانس لے رہا ہوں۔ لیکن میں اپنی ٹھنڈی سانسوں سے بلند ہوں، بلند!

[illegible] سب کتنا عجیب ہے!

وہ دونوں تھکے ہوئے بیکار سے لاشوں کی طرح ساکت لیٹے، پڑے ہیں۔

یہ سب کتنا عجیب ہے [illegible] میں اس لئے نہیں آئی تھی۔ ہاں: میں اکثر [illegible] تم نے آزادی چھین لی اور اب سب کچھ [illegible] ہمارے جسموں کا رنگ، جو دو [illegible] اندھیرے میں کافور کے ڈھیر کی طرح نظر آ رہا ہے کیا کیا۔ [illegible] نہیں آئی تھی میں ہمیشہ لباس میں چھپی رہی ہوں۔ ریلو کی طرح [illegible] برسوں۔ کوئی آئے اور یہ راز کھول دے۔ کھول دے، کھول دے،

پہلے۔ کوئی نہیں۔ میں نے اپنے آپ کو بچا بچا کر رکھا۔ الہامی کتاب کی طرح جزدان میں چھپا کر۔ میری بات مان لو۔ میں یہاں اس لئے نہیں آئی تھی۔ لیکن جب یہاں آئی تھی تو دیکھا تمہاری باتوں اور میری باتوں نے ایک سنگم سا بنا دیا ہے۔ ہمارے وصال کی سطح ہمارے جینے کی سطح ہے۔ ہمارے جینے کی سطح ہمارا ذہن ہے، ہماری سوچ جو موم بتی کی طرح لوٹ رہی ہے وہی ہے اور باقی کچھ نہیں۔ باقی دو جسم ہیں۔ ہاں باقی دو جسم ہیں اور دو جسم پاس پاس لیٹے ہیں۔ تھکے ہوئے، ویران، خالی، ہم لیٹے ہیں اور اندھیرے میں اپنے پیروں کو دیکھ رہے ہیں پیر جو مچھلیوں کی طرح منہ کھولتے ہیں۔ اور اونگھنے لگے ہیں۔ پلنگ کے چوبے ہم خوبصورت ہیں۔ ہم بچے ہیں۔ لیکن لگتا ہے ہم مر چکے ہیں۔

کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ میں قصاب ہوں۔ میری دکان میں ذبح کی ہوئی بکریاں کیلوں سے لٹک رہی ہیں اور میں باری باری سے ان کی کھال اتار رہا ہوں۔ خون سے لت پت رانوں پر ہاتھ پھیر رہا ہوں۔ سڈول اور سرخ رانیں جن سے بھاپ اٹھ رہی ہے۔ آہستہ آہستہ شام کے وقت جنگل کو چھوڑتی ہوئی سرد روشنی کی طرح۔

"میں کب تک کٹہرے میں کھڑا رہوں گا۔؟"

"فیصلے کا انتظار کرو۔"

"میں کسی چیز کا، کسی کا، انتظار نہیں کرسکتا۔"

"انتظار نہیں کرسکتے۔ تو جہنم میں جاؤ۔"

"کیوں؟"

"جو انتظار نہیں کرسکتے وہ جہنم میں چلے جاتے ہیں۔"

اس نے کٹہرے کی ریلنگ کو زور سے دبوچ لیا۔ اس کا مضبوط چہرہ اور لمبا ہو گیا اور تانبے کی طرح چمکنے لگا۔ اس کی مٹھیوں کی رگیں رسی کی طرح ابھر آئیں۔ اس کی آنکھیں [illegible] دیکھ رہی تھیں وہ اسی ایک دھبے کو گھورے جا رہا تھا۔

"میں انتظار کروں گا تو کب تک انتظار کرنا ہوگا [illegible] [illegible]"

[illegible]

[illegible] میری لاش کو دیکھ رہا ہوں۔ تم اور میں، دو لاشیں کتنے ٹھنڈے ہیں [illegible] کہ [illegible] پتھر کی طرح پگھل جائیں گے، مٹ جائیں گے۔

[illegible]

[illegible] منتظر رہو۔ اب جب مہینوں اور برسوں کا ڈھیر لگ چکا ہے۔ میں تم سے اپنا حساب [illegible] چاہتا ہوں۔"

رات آہستہ آہستہ دھند میں لپٹ رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں کھڑکی کے باہر درختوں کی پھنگیں [illegible] ٹکڑوں کے ڈھیر کی طرح خاموش نظر آئیں گی۔ جب پو پھٹتی ہے یہی ہوتا

بھبکیوں کے ڈھیر گھڑیالوں کی طرح کھل جاتے ہیں۔

"جاڑے کی رات ہے اور مجھ کو پسینہ آ رہا ہے۔" کٹہرے میں آواز گونجی اور دیواروں میں کیلوں کی طرح پیوست ہو گئی۔

گرم پانی کی لہر جا رہی ہے اوپر سے گزر چکی ہے اس کو کبھی جانے صدیاں بیت گئیں۔ میں اس وقت قصاب کی دکان پر پڑا ہوا بکھرا ہوا ہوں۔ بلی میرے پاس خرخرا رہی ہے۔ اس کا پیٹ بھرا ہوا ہے۔ اس کی آنکھوں میں، اس کی روح میں اور روئیں روئیں میں نیند ہے۔ میں اپنے آپ سے ہٹ کر اپنے آپ کو دیکھ رہا ہوں۔ سکڑا ہوا، سر تن دھڑ اور ہاتھ پاؤں سے الگ۔ جھلی، ٹھنڈا، باسی بے جان گوشت کا ٹکڑا۔ آخر میں یہی ہوتا ہے۔ یہ جھلاّ کا انجام میں اس نے ہنس آئی تھی۔ میں اس لئے نہیں آیا تھا۔ وہ سہم جاتی ہے اور سیدھی لیٹی لیٹی پوچھتی ہے۔ کچھ پوچھتی ہے میرے پورے جسم میں جھرجھری سی دوڑ جاتی ہے۔ میرے جسم کے انگنت مسام کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور اگر کچھ ہو گیا۔ دیکھو فرش پر۔ ہاہاہا وہ کروٹ بدل لیتی ہے۔ اس کا جسم گرم ہو جاتا ہے۔ اس کے روئیں روئیں سے سورج کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں۔ حوا نے آدم سے یہی پوچھا تھا۔ آدم بے چارا۔ تنہا خاموش شکار، وہ میرے وجود کو اپنی باتوں سے گرم کر دیتا ہے۔ پگھلا دیتا ہے۔ یہ میری ٹریجڈی ہے۔ لیکن اس وقت میں اپنے آپ سے بلند ہو چکا ہوں۔ یہ بھی میری ٹریجڈی ہے۔ بات یہ ہے کہ میں نے وہ کر دکھایا جو پہلے کسی سے نہیں ہو سکا۔ میں نے سیکس کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے

یہ معاملہ پرانا ہو چکا ہے۔ کئی دن ہو چکے ہیں اور میں اس عورت کو بھول چکا ہوں جو صرف اپنے ذہن کی سطح پر جیتی ہے۔ عورت، جو روز مرہ کو ایک روحانی تجربہ اور معجزہ بنا دیتی ہے۔ ہاہاہا! ایک سرسری سی ملاقات، ایک ہلکا سا اشارہ، ایک ذرا سا فلرٹیشن، ایک آدھ ادھورا فقرہ، ایک ذرا سی کھوئی کھوئی کیفیت، سگرٹ کے لگاتار کش، ہوکا اور پکاسو کی باتیں، کچھ اسٹیج، کچھ کتابوں کا ذکر، اور سارا تجربہ کیا ہے کیا ہو گیا وہ چلی گئی اور بالکل روایتی معشوقوں کی طرح کہہ گئی۔ خط لکھنا۔ کتنی عجیب بات ہے خط۔ اگر میں ایسے تمام تجربوں کے بعد خط لکھنا شروع کر دوں تو ساری تنخواہ ٹی اے سمیت ڈاک خانے کے پیٹ میں چلی جائے۔ وہ دھندلکے میں چلی گئی۔ بستر پر میرے پاس ایک شکن ہے اور کچھ بھی نہیں۔ میں قصاب ہوں اور ذبح کی ہوئی بکریوں کی کھال اتار رہا ہوں اور میرا کسی بکری سے جذباتی رشتہ نہیں ہے۔ میں غیر رومانی آدمی ہوں۔ میں نت نئے تجربوں میں جیتا ہوں۔ میری سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ میں کسی عورت کو مایوس نہیں کر سکتا۔ اس میں میری کمی ہے شاید عورت کی بھی۔ ان ہی باتوں میں عمریں گزر جاتی ہیں۔ ان ہی باتوں میں صدیاں بیت جاتی ہیں یہ ثابت کرنے میں کہ میں تم سے مختلف ہوں۔ میں وہی ہوں جو تم نہیں ہو۔ بلکہ شاید، میں جو ہوں تم نہیں ہو سکتے۔ حالانکہ میں جو ہوں سو ہوں اس میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ میں وہی ہوں جو میں ہو سکتا تھا جو میں ہو سکتا ہوں وہی ہوں۔ بتاؤ اس میں میرا کیا کمال ہے ہے تو سہی،

ہے تو سہی۔

ہلو ہلو How do you do ? ہلو ہلو مسٹر سوانیڈسو رات کیسی کٹی۔ رات؟ کیسی رات؟ میری زندگی میں تو راتیں نہیں ہوتیں۔ دن بھی نہیں ہوتا۔ وقت کو رنگوں میں تقسیم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ [illegible] سیاہ اور سفید اور سیاہ کے کتنے مزے [illegible] رنگوں کے شیڈ سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ مجھے بھی رنگوں اور رنگوں کے شیڈ سے کوئی [illegible] میں ہوں۔ ہلو ہلو مسٹر سوانیڈسو۔ کہو آپ کے شکار کا کیا ہے کتنا خوشبودار ہے جنگل میں ہرن شکار کرتا ہوں۔ میں ہرن شکار پر مرتا ہوں۔ [illegible] جنگل کی خوشبو آتی ہے۔ جنگلوں میں بسی ہوئی خون کی خوشبو۔ جنگل کتنا اندھیرا ہے۔ لیکن اس کے درختوں سے روشنی پھوٹ رہی ہے۔ اس جنگل کا کیا نام ہے؟ مجھے ناموں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وقت کے ساتھ یہ خوشبو بھی اڑ جائے گی۔ ہر چیز گزر جاتی ہے۔ ہا ہا (ہنسی) اچھی باتیں، ہماری تعلیاں ہماری عادتیں۔ حماقت کی باتیں کرنے سے بہتر ہے کہ سگریٹ پیو اور یوں بن جاؤ جیسے کچھ سوچ رہے ہو۔ داڑھی بڑھا لو اور سمجھو تمہارا چہرہ جنگل ہے جس میں چیتے رہتے ہیں جس میں اس صدی کے سارے چھاپے مار چھپے ہوئے ہیں [illegible] اسی لئے تو میں ہرن شکار پر مرتا ہوں میں تمہاری داڑھی پر جان دیتا ہوں جس سے روشنی پھوٹ رہی ہے۔ اس روشنی نے میرے چہرے کو مقدس بنا دیا ہے۔ روشنی جنگل کو مقدس بنا دیتی ہے جو آدم کی طرح قدیم ہے۔

"میں تمہارے پُراسرار ہونٹوں پر دبے ہوئے پُراسرار ہنگامے کے پُراسرار مرغولوں میں چکر لگاتی ہوئی باتوں میں نہیں آؤں گا۔" کٹہرے میں کھڑے پُراسرار ملزم کے ہونٹ مڑ گئے تھے۔ اس کا چہرہ یونانی چہرے کی طرح ستا ہوا تھا۔ زرد پہاڑی ڈھول کی طرح۔

"تمہیں سزا ہو چکی ہے۔ جس کو سزا ہو جاتی ہے۔ وہ سزا کاٹنے پر مجبور ہے۔ تمہاری انتقامی باتوں کا عدالت پر کوئی اثر نہیں ہو گا۔" وہ مسکراہٹ کے شکنجے سے نکل رہا تھا۔ اسے اطمینان تھا کہ وہ کٹہرے کے باہر تھا۔

مسٹر سوانیڈسو کے ہونٹ سوکھ رہے تھے گلے میں کیکٹس اگ رہے تھے۔

میں نے بہت کھیل کھیلے ہیں، جی نہیں پارٹنر آپ نے پہلے ہوں گے۔ مجھے پارٹنر بدلنے کا شوق نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے آپ بھیجے کے شوقین ہیں۔ بھیڑ کے بھیجے کے۔ جی ہاں بھیڑ کے۔ بھیڑ شریف جانور ہے۔ سر جھکائے اپنی اون میں اپنی پیشانی۔ آپ مسکراتے ہیں تو بالکل بھیڑ معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کے جسم پر اون بالکل نہیں ہے [illegible] کا شبہ ہو سکتا ہے کہ آپ بھیڑ نہیں۔ آپ کوئی اور جانور ہیں۔ بھیڑ [illegible] کتنی گھناؤنی معلوم ہوتی ہے۔ اس کی کھال۔ آپ کی معلومات بس کھال ہی تک ہے۔ میں بھیڑ کے اندر کا مسافر

چھوڑو اپنے مسافر ہو۔ چلتے ہو تو تمہارے کمروں سے گرد اُڑتی ہے۔ اُڑتی ہوگی۔ میں دور کا مسافر ہوں۔ یہ گرد بھی دُور تک جائے گی۔

مسٹر سوانیڈ سو کے منہ سے وہسکی کی بو آرہی ہے۔ آنکھیں دیکھو، چہرہ۔ اس کے خون میں وہسکی ملی ہوئی ہے۔

کیا نام بتایا آپ نے۔ بھلا سا مسٹر کون۔ خیر چھوڑیئے نام میں کیا دھرا ہے۔ میری رگوں میں خون ہے ہی نہیں۔ اس لیے ملاوٹ کا سوال نہیں اٹھتا۔ سنو، تم اس چیک پر دستخط کر دو۔ اگر تم اجازت دو تو آج یہیں منگوا لوں ایک بوتل۔ مسٹر سوانیڈ سو کا گلا سوکھ رہا ہے اور آنکھیں پتھرا رہی ہیں۔ منگوانے کی کیا ضرورت ہے۔ میرے سیف میں موجود ہے۔ Nothing like it تمہارے کمرے میں سب کچھ موجود رہتا ہے۔ سب کچھ نہیں، بہت کچھ کمیشن میں نکل جاتا ہے۔ لیکن یہ بوتل کمیشن نہیں ہے۔ دماغ کے کام کا کوئی کمیشن نہیں ہوتا۔ ہاہاہا۔ تم بوتل خالی کر دو۔ جب یہ بوتل خالی ہو جائے گی میں اس میں کاغذ بھر دوں گا جس پر تمہارے ہاتھوں کی روشنائی پھیلی ہوئی ہے۔ اس سے جو شراب کشید ہوگی اس کی بات ہی اور ہوگی۔ تب میں کہوں گا Nothing like it۔ اور میں امر ہو جاؤں گا۔ کیا میں تمہاری سیکریٹری کے ساتھ سو سکتا ہوں؟ Not that I am keen on it لیکن اس کی آنکھوں کی التجا مجھ سے انکار نہیں ہو سکتا۔ یار وہسکی بول رہی ہے۔ کمیشن بول رہا ہے۔ دماغ کے کام کا کوئی کمیشن نہیں ہوتا۔ ہاہاہا۔ خیر اس کی بات چھوڑ دو۔ اس کی بات چھوڑ دو۔ ہاں سوئی تو ضرور وہ میرے ساتھ، لیکن اس کا سونا الکحول کا سونا تھا۔ وہ میرے پہلو میں لیٹی تھی بالکل برابر برابر، لیکن مجھے پورے وقت یہ احساس تھا کہ میں اس کے دماغ کے ساتھ سو رہا ہوں۔ میرے پہلو میں اس کا دماغ تھا اور کچھ نہ تھا۔ تمہاری سیکریٹری کی بات اور ہے۔ میرے پہلو میں وہ ہوگی، سب کچھ ہوگا۔ That's fine. لیکن پہلے مسٹر سوانیڈ سو بلینک چیک پر دستخط کر دیجئے۔ پھر وہ آپ کے کمرے میں پہنچ جائے گی۔ وہ کون وہی، کوئی ہو، کوئی ہو! فرق کیا پڑتا ہے اور یہ دستخط۔

اس کا یرقانی چہرہ اور زیادہ پیلا ہو گیا تھا، جو اس کا جسم بھی کھنچ گیا تھا۔ اس کا سر چھت کو چھو رہا تھا۔ عدالت کی چھت بہت نیچی ہوتی ہے جب بہت سی کیسی کیسی باتیں منہ سے نکل جاتی ہیں۔ اس کا سوٹ بہت ڈھیلا تھا۔ سرمئی ڈھیلا ڈھالا سوٹ۔ دانت زرد تھے۔ تمباکو کی طرح۔ وہ کھانس رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بھرائی تھیں اور ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ اس کے سر پر پھریروں نے چھتری سی بنا دی تھی۔ مجھ گھبرائے ہوئے سے تھے اور وہ چہروں سے بھی زیادہ گھبرایا ہوا تھا۔ عدالت میں ملزم کا چہرہ ڈرا ہونا چاہیے۔

تم اسی طرح پڑی رہو۔ اکتانے کا پوز نہ دو۔ میں سب سمجھتا ہوں، تم جاگ رہی ہو، تم آرہی ہو۔ میں آرہا ہوں۔ زندگی ہوا کی موج کی طرح اڑتی چلی جاتی ہے اور میں جل رہا ہوں تمہاری آگ میں۔

دیکھو ایسا ہے کہ تم میرے لیے اجنبی ہو۔ ہاں تم بھی اجنبی ہو۔ میں کسی رشتہ پر یقین نہیں رکھتی۔ میں بھی کسی رشتے کا پجاری نہیں ہوں۔ میں ہوا کی طرح ہوں آزاد۔ میں بھی آزاد اور گرم آگ کی طرح۔ میں جلتی ہوں نہ بجھتی ہوں۔ بجھتی ہوں جلتی ہوں۔ =
شاعری ہے۔ ہاں یہ شاعری ہے۔

وہ ساری باندھ رہی ہے۔ الہامی کتاب کو جزدان میں رکھ رہی تھی۔ قرینے سے اس کے سامنے اس کے ہاتھ دکھائی نہیں دے رہے تھے لیکن کنگھا کٹی ہوئی زلفوں میں دوڑ رہا تھا۔ بالوں میں کوئی الجھاؤ نہیں تھا۔ کنگھا آرام سے سفر کر رہا تھا۔ چہرے پر غازے کی تہیں جم رہی تھیں۔ کھڑکی کے باہر سڑک پر گرد اُڑ رہی تھی۔ جنگلی جھاڑو دے رہا تھا۔ جھاڑو سے گرد اُڑ رہی تھی۔ کنگھے سے بال سنور رہے تھے۔ غازے سے چہرہ دمک رہا تھا۔ چہرہ اس کی طرف مڑا۔ وہ اب تک مسہری کے کنارے بیٹھا ہوا تھا۔ سر جھکائے۔ اس کے لمبے لمبے بال اس کے چہرے کو چھپائے ہوئے تھے۔ بالوں سے سگار کا دھواں چھن رہا تھا۔ اس کا چہرہ دھوئیں میں کھویا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی دھوئیں میں کھوئی ہوئی تھیں۔ چہرہ جو اس کی طرف مڑا مسکرا رہا تھا۔

"تم پچھتا رہے ہو؟" آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔

وہ اسی طرح بیٹھا رہا، سر جھکائے، اس کے لمبے بالوں سے دھواں چھنتا رہا۔

"دو اجنبی دور تک ساتھ سفر نہیں کر سکتے۔"

"کوئی دُور تک ساتھ سفر نہیں کر سکتا۔"

"کوئی نہیں؟"

"کوئی نہیں۔"

اس نے سر کو جھکا دیا۔ دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی۔ باہر روشنی تھی اور روشنی میں گرد تیر رہی تھی۔

جب آہٹیں دور چلی گئیں اور دروازہ آہستہ آہستہ دوبارہ بند ہو گیا تو گرد اور روشنی آنکھوں سے اوجھل ہو گئیں۔

وہ تھوڑی دیر جھکا رہا۔ تھوڑی دیر تک۔ یکایک شعلہ سا چمکا، شعلہ سا، وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے ہیولے کو آئینے میں دیکھا۔ آئینے میں اب وہ نہیں تھی۔ وہ تھا اکیلا۔ سانولا، میلا، بالوں سے بھرا ہوا، ریچھ جیسا ہیولا۔ وہ مڑا اور باتھ روم میں چلا گیا۔

تجربہ، تجربہ اور تجربہ۔ بہت سے تجربے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ پانی سر سے پاؤں تک بہہ رہا تھا۔ پانی کے ساتھ میل بہہ رہا تھا۔ میل پسینے کی۔ غازے کی

خوشبو، زلفوں کی مہک، ہونٹوں کی گرمی، جنت کی سپردگی سب، دوری کا احساس کچھ کھو کے کچھ پانے کا وہم سب

رات ختم ہوئی۔ دن شروع ہوا۔

وہی پرانی فائل، وہی پرانا قلم، وہی پرانے نوٹ، وہی پرانے دستخط۔ رومال میں پٹرول کی بُو بس گئی ہے۔ وہی پرانی بُو۔ نو نو یس یس۔ وہی پرانی نو نو، وہی پرانی یس یس، سوٹ نیا ہے۔ ٹائی نئی ہے میں وہی ہوں۔ وہی میں۔ مجھے زکام ہے۔ یہ پٹرول کی بو نہیں ہے۔ یہ ڈیکلپٹس کی بُو ہے۔ لیکن یہ میرے لئے ہے۔ جو کچھ ہے میرے لئے ہے۔ زکام، پٹرول اور یوکلپٹس کی بو اور رات کی یاد۔ یہ سب کتنا رومانٹک ہے۔ نو نو۔ یس یس۔ میں نے سب طے کر لیا ہے۔ ہاں میں نے طے کر لیا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں۔ تم بھی دیکھ رہے ہو۔ میں کاغذ کو چاٹ رہا ہوں۔ میری رُوح بھی کاغذ کی طرح سفید ہے۔ قاعدے سے کٹی ہوئی۔ جو چاہو اس پر لکھ دو۔ میں اسی کاغذ پر لکھا ہوا ہوں۔ میں چمک رہا ہوں روشنائی کی طرح۔ میں لکھا ہوا ہوں اور پھیل رہا ہوں۔

یہ روز روز کا قصہ ہے۔ اکتاہٹ یہاں سے شروع نہیں ہوتی۔ کہیں اور سے شروع ہوتی ہے۔ یہاں تک پہونچتی ہے۔ شاید یہاں سے آگے تک جاتی ہے۔ شاید میں اپنے آپ کو اس اکتاہٹ سے الگ الگ رکھتا ہوں۔ اس اکتاہٹ سے ہر چیز سے۔

وہ میرا پیچھا کر رہا ہے میں اپنا پیچھا کر رہا ہوں۔ میں اور قاتل۔ دونوں ایک دوسرے کا پیچھا کر رہے ہیں۔

وہ کئی پیالیاں کافی کی خالی کر چکا ہے۔ اس کے ہاتھ بہت سے کاغذوں، بہت سے چکوں پر دستخط کر چکے ہیں۔ اس کا رنگ اور سنولا گیا ہے۔ اس کے بال اس وقت بھی چہرے پر جھکے ہوئے ہیں۔ اب بھی بالوں سے سگار کا دھواں چھن رہا ہے۔ اس کے سوٹ کا نیلا رنگ اس کے چہرے کے رنگ میں جذب ہو رہا ہے۔ اور سگار کے دھوئیں سے چھن رہا ہے۔

"تو یہ کام ہو جائے گا؟"

"ہو جائے گا۔"

"سیٹھ Very nice of you."

"سوچ لیجیے کہیں آپ اپنی رائے کا اظہار کرنے میں جلد بازی سے تو کام نہیں لے رہے ہیں؟"

"میں نے سوچ لیا ہے۔"

خاموشی ہے۔ وقفہ ہے۔ ہاتھوں میں رعشہ ہے۔ قلم تھک رہا ہے قلم جو صرف دستخط کرتا ہے۔ کتنی جلدی تھک جاتا ہے۔ کئی پیالیاں کافی کی خالی ہو چکی ہیں۔ وہ

[illegible] ہے ادھالی کرسی پر بیٹھ کر [illegible] کے [illegible] دیکھتا ہے۔ انسان [illegible] گرد آلود مکانوں کے بالائی [illegible] افق میں [illegible] دھوپ ہر موڑ کا شیڈ [illegible] ہے۔ [illegible] ہے۔ وہ سڑک کے کنارے تک جاتا ہے۔ [illegible] کے ساتھ ساتھ چلتا ہے اونچی ہوتی چلی جا رہی ہے۔ [illegible] کار رواں چل رہا ہے لیکن یہ کارواں کس کا ہے۔ میں [illegible] ہوتا ہوں۔ میری رگوں سے سارا خون نکل چکا ہے۔ ایک حد [illegible] ہوتا ہے زہر [illegible] شروع ہوتی ہے۔ ایک بار پھر وہی پٹرول کی بُو، وہی [illegible]۔

کمرے کے سارے بلب جل رہے ہیں۔ لیکن کمرے میں اندھیری رات کا ہے وہ ہے اور اس کا قاتل ہے اور کٹہرا ہے۔ قاتل کا منہ بند ہے مگر اس کی آواز رہی ہے۔ تم سب کچھ دیکھ سکتے ہو، اپنے چہرے کی جھریاں نہیں دیکھ سکتے۔ دل کی جھریاں دکھائی نہیں دیتیں۔ چہرے کی دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن تم یہ بھی نہیں دیکھ سکتے۔ تم بہت تھک گئے ہو۔ تھکن سے تمہارا قد اور جھک گیا ہے۔ قد اور تمہاری گردن اور تمہارا چہرہ۔ تمہارے ہاتھوں میں رعشہ ہے۔ تم کھنچ گئے ہو۔ آنکھوں سے لوسی جھلا رہی ہے۔ بجھا ہوا سگار تمہارے ہاتھ سے چھوٹ کر قالین پر گر گیا۔ تم چپ ہو، یہ وقت بولنے کا ہے۔ مگر تم چپ ہو۔ تم تن کر کھڑے ہوتے ہو تو تم زندگی بھر یہی کرتے رہے ہو۔ اب بھی تم تن کر کھڑے ہو لیکن تمہاری کمر میں خم ہے۔ تمہارے سر پر بہت بڑی چٹان اٹھائے ہوئے ہو۔ چٹان دکھائی نہیں دیتی۔ مگر وہ سر پر دھری ہوئی ہے۔ پھر اس کے بوجھ سے کچل جاتے ہیں۔ پھر اسے دھکیل کر پہاڑ کی چوٹی تک لے جاتے ہیں۔ ہر رات۔

نکالو سلیپ وہی بوتل جو آدھی بھری ہوئی ہے استعمال کر دو۔

کیا سوچ رہے ہو۔ یہ سوچنے کا وقت سوچنے کا ہے۔ یہ وقت پینے کا ہے۔ آخری گھونٹ تمہارے ہاتھوں میں رعشہ بڑھ رہا ہے۔ لگتا ہے کوئی کیلا تار سینے میں چبھ کر تمہاری رگوں کو نوچ رہا ہے۔ تمہاری جھریاں اور گہری ہو گئی ہیں۔ تمہاری آنکھیں ایک ہی نقطے پر جمی ہوئی ہیں۔ تمہارے ہونٹ سوکھ رہے ہیں۔ ٹھنڈا گلاس بھی ہونٹوں کی خشکی دور نہیں کر سکتا۔

کس کا انتظار ہے تمہاری آنکھوں کو۔ دروازے کی طرف نہ دیکھو، وہاں کوئی نہیں، کسی کے قدموں کی آہٹ نہیں۔

میں کٹہرے میں کھڑا ہوں اور تمہارے چہرے کا تماشا دیکھ رہا ہوں۔ تمہارے لمبے چہرے پر پسینے کی لہریں تیر رہی ہیں۔ نہیں اور پسینہ تم ذرا ٹھنڈے رہے

زندگی بھر اور اب اس آخری لمحے میں اتنا بیست۔ تم میری باتوں کو مسکرا کر ٹالنے کی کوشش نہ کرو۔ اب تم مجھے نہیں ٹال سکتے۔ بہت ٹالا تم نے۔ لیکن اب وقت اپنا کھیل کھیل چکا۔ تم ہار چکے ——— وہ جو شخص چپ رہا تھا وہ کھڑا ہوا۔ اس کا قد اور لمبا ہو گیا۔ اس کا سر چھت کو چھو رہا تھا۔ اس نے کپڑے اتار دیئے۔ جوتے، کپڑے، بنیان اور انڈر ویر۔ وہ مسہری پر لیٹ گیا۔ سیدھا۔ اس کا جسم پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس نے آنکھیں کھول لیں اور کٹہرے کی طرف دیکھا۔ کٹہرے اور اس کے درمیان ایک تپائی تھی۔ تپائی پر خالی بوتل تھی اور تپائی لڑکھڑا رہی تھی۔

تم غلط سمجھے۔ میں ہار نہیں مانوں گا۔ تم میرے قاتل ہو۔ میں اپنے قاتل کو ساتھ لے جاؤں گا۔ میں ہمیشہ زندگی سے گزرتا رہا۔ گزرنا بھی بڑا آرٹ ہے لیکن زندگی اپنا سب کچھ لٹاتی رہی۔ یہ بھی بڑا آرٹ ہے۔ میں نے کبھی کسی کا ساتھ نہیں دیا۔ لیکن بہتوں نے میرا ساتھ دیا۔ خود ہی۔ بے وجہ۔ لوگ آئے اور انہوں نے مجھ سے سمجھوتہ کیا۔ میں نے کسی سے سمجھوتہ نہیں کیا۔

"جس سے سمجھوتہ کیا جاتا ہے وہ بھی کسی سے سمجھوتہ کرتا ہے۔"

ابھی نہ ہانکو۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔ کسی کے پاس وقت نہیں ہے۔

"جانتا ہوں ہم وقت کی جیب میں ہیں لیکن ہماری جیب خالی ہیں۔"

"میں نے کہا نا کہ چالاکی کی باتیں نہ کرو۔"

" Bloody Hoax "

اس نے اپنی مسہری کی سفید چادر سے اپنے جسم کو ڈھک لیا۔

یہ میرا کفن ہے۔ اپنی مسہری، اپنی چادر، اپنا کفن۔ بہت کم لوگ ہیں جو اپنی لاش کو لیں دیکھتے ہیں۔ مسہری پر رکھی ہوئی لاش اور اب میں تم کو نہیں دیکھ سکتا۔ نہ تو تم کو، نہ کٹہرے کو جو میں نے خود بنایا ہے۔ تمہارے لئے۔

میں تمہاری آنکھوں سے اوجھل ہوں لیکن میں تمہیں دیکھ سکتا ہوں۔ تمہارا کفن بلور کی طرح چمک رہا ہے۔ تمہارا جسم ننگا ہے۔ سیدھا۔ تم نے نہ جانے کب سے شیو نہیں کیا ہے۔ تمہارے چہرے پر داڑھی اُگ آئی ہے۔ حیرت ہے۔ شام تک تو تم کلین شیو تھے اس وقت بھی جب تم آخری گلاس کا آخری گھونٹ پی رہے تھے۔ تم نے سینے پر ہاتھ باندھ رکھے ہیں۔ تمہاری آنکھیں بند ہیں۔ ہونٹ خاموش ہیں۔ دل ساکت ہے۔ نبض چھوٹ چکی ہے۔ تمہارے چہرے پر پسینہ موم کی طرح خشک ہو گیا ہے۔ موم کی تہہ نے تمہیں ممی بنا دیا ہے۔ اگر میں تمہیں اٹھاؤں اور لے جا کر تمہارے آفس کے ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں تمہاری گھومتی ہوئی کرسی پر بٹھا دوں تو کیا ہو ——— تمہاری سکریٹری شیشے کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھتی بھی نہیں۔ وہ بے تکلف ہے اور تمہارے موڈ کے موسم کو جانتی ہے۔ وہ دھیرے سے دروازہ کھولتی ہے اور بے ساختہ کہتی ہے۔ "گڈ مارننگ سر!" اور تمہاری کرسی کی طرف لپکتی ہے۔ لعجب وہ تمہاری گود میں بیٹھتی ہے تو کرسی خود بخود گھوم جاتی ہے اور وہ گرتے گرتے تمہارا چہرہ دیکھتی ہے۔ وہ بے ہوش ہو جاتی ہے اور تمہاری زرد ممی اس کے اوپر گر جاتی ہے۔ منہ کے بل۔

میرے پاس ایسی مہمل باتیں سننے کا وقت نہیں۔

"وقت میرے پاس بھی نہیں۔ لیکن تمہاری آواز آج بھی میرا پیچھا کر رہی ہے۔"

میری آواز۔ میری کوئی آواز نہیں۔ اب تم آزاد ہو۔ میری آواز کے سناٹے [illegible] کٹہرا بھی سناٹا گیا ہو میں نے تمہارے لئے بنایا تھا۔ اب آسان کرو۔ مجھے اٹھاؤ اور راتوں رات لے چلو۔ اپنے ہاتھوں سے قبر کھود دو اور مجھے اس میں ڈال دو۔ مجھے اور وہ سب کچھ جسے تم ہوس کہتے ہو۔ میں چاہتا ہوں میرے بعد وہ سب کچھ، جو مجھ میں ہے، دنیا میں نہ ہو۔

"ایسا کبھی نہیں ہو سکتا!"

کوئی دروازے سے کان لگائے کھڑا ہے اور خاموشی کی صدا سن رہا ہے۔ صدا کا چہرہ روشن ہے۔ آنکھیں پھیلی ہوئی ہیں۔ بال سیاہ ہیں اور سر کالی بلی کی طرح چمک رہا ہے۔ ایک پیکر سا جو شعلے کی طرح لپک رہا ہے لیکن دروازہ بند ہے۔ اندر خاموشی ہے۔

مسہری پر سفید چادر کفن بن چکی ہے۔ اب دستک سے کیا ہوگا۔

یہ شخص مر کر بھی جھوٹ بول رہا ہے۔ دروازہ کھل جائے تو میں اس سے صرف اتنا کہوں۔ تم اب بھی جھوٹ بول رہے ہو۔ اور جب تم مجھ سے جھوٹ بول رہے تھے، تب بھی میں یہ جانتی تھی۔ تم سمجھ رہے تھے۔ میں تمہارے لئے جی رہی ہوں۔ تب میں اپنے لئے جی رہی تھی۔

کفن میرا مسکرایا۔ اس نے چادر منہ سے ہٹائی۔ اس نے قاتل کو بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ قاتل اس کے سینے میں جذب ہو گیا۔ اس نے کفن نوچ کر پھینک دیا۔ وہ بچھو کے کٹے کی طرح مسہری سے تڑپا۔ لپک کر اس نے دروازہ کھول دیا۔ کمرہ خوشبو سے بھر گیا۔

ممی کے چہرے پر موم کی زردی دوپہر کی دھوپ کی طرح چمک رہی تھی۔ ہاتھ کا رشتہ ختم ہو چکا تھا۔ گلاس پر اس کی گرفت مضبوط تھی۔

اس نے خوشبو کے کان میں کہا

"میں نے قاتل کو اپنے سینے میں دفن کر دیا ہے۔"

خوشبو کا چہرہ خون کی طرح سرخ ہو گیا۔

"تم کتنے بڑے قاتل ہو!"

اس کے چہرے پر پھر موم کی تہیں جم گئیں۔ اور اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اس کا ہاتھ لرزنے لگا۔ گلاس خالی تھا۔

مسہری پر سفید چادر کفن بن چکی تھی۔

# غزلیں

آنکھوں سنگل کر دیکھی تھی، اس کے پاؤں پڑی پگڈنڈی
نظریں گھوم رہی ہیں پل چھن در در پگڈنڈی پگڈنڈی

ایک سا گرد کیا جانے کس بستی کس پردیس سدھارا
پاؤں کے تلووں سے آ چمٹی ہر ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈی

گرد یہاں کی سیدھا من میلا کرتی ہے بس میں ہو تو
شہر کی سڑکوں پر بچھوا دوں کوسوں دھول بھری پگڈنڈی

ٹیڑھا میڑھا پن رستے کا اپنی آنکھوں کا دھوکا ہے
ہم نے سوانگ رچا ہے ورنہ جیسا من ویسی پگڈنڈی

دل آوارہ گرد ہو تو کیا دیواریں کیسے دروازے
من پر پہرا بیٹھا ہو تو جیسا گھر ویسی پگڈنڈی

میں نے قتل کئے ہیں اپنے کالے ہاتوں وقت، فاصلہ
چوں نسٹھ گھڑیوں دھیان اُسی کا چاروں سمت وہی پگڈنڈی

اشک وفا کو شیلف پہ رکھ کے خالی جیب چلو اس رستے
اتنا بوجھ نہ ڈھو پائے گی تنگ لباسوں کی پگڈنڈی

**بمل کرشن اشک**



## شہاب عراقی

کبھی جو چاند سے سورج قدم ملا کے چلا
سیاہ پڑتا گیا چہرہ پھول سے دن کا

یہ جھلملاتے ستارے بھی ڈوب جائیں گے
نہ کھینچ دن کے طلب گار رات کا پردا

بجھی ہوئی ہے نظر زہر کی تمازت سے
چمک رہا ہے اندھیرے میں سانپ کا چہرا

اُبل رہی ہے ندی کپکپائی پلکوں پر
بہاؤ تیز ہے پگھلی ہوئی چٹانوں کا

سمندروں کا لہو خشک ہو گیا شاید
بہا رہا ہوں خیالوں میں ریت کا دریا

نگاہ لعل و گہر کی تلاش میں نکلی!
ہتھیلیوں کی ہے قسمت میں سُرخ انگارا

وہاں نہ جاؤ کہ رنگوں کے امتزاج کے ساتھ
کھڑا ہے دن کے اُجالے میں رات کا سایا



تنہائی میں دُکھتے لمحے جب کچھ یاد دلاتے ہیں
سائے سائے کتنے چہرے آنکھوں میں بھر جاتے ہیں

اب تو اچھے دل والوں کا کال سا پڑتا جاتا ہے
لیکن نقلی چہرے والے دل اپنا بہلاتے ہیں

چھو جاتی ہے جب بھی آ کر یادوں کی پُروائی سے
ننھے ننھے کتنے دیپک پلکوں پر جل جاتے ہیں

اپنوں میں بیگانہ بن کر زندہ رہنا مشکل ہے
لیکن دیکھ زمانے ہم کو، ہم جی کر دکھلاتے ہیں

جانے کب سے ہم بیٹھے ہیں سوچوں کے چوراہے پر
یوں ہی کا میلہ ہے جگ، ہم بھی دیکھے جاتے ہیں

**وشوا ناتھ**



# علی گڑھ

## (چند یادیں)

۱۹۱۴ء میں جب میں ایم اے ۔ او کالج علی گڑھ میں داخلے کے لئے آیا تو میرے ہم وطن، ہم سبق اور دوست حضور عالم بھی میرے ساتھ تھے۔ ہم دونوں کے والد میر محفوظ علی اور محمد اکرام عالم بھی سرسید کے زمانے کے اولڈ بوائے تھے۔ ہم پہلی مرتبہ گھر سے نکلے تھے اور بورڈنگ کی زندگی ہمارے لئے بالکل نئی تھی۔ سرسید اسٹیٹ کے کمرہ ۱۵ میں جگہ ملی جس سے ایک کمرہ اُدھر نمبر ۱۳ کرکٹ کپتان کا کمرہ تھا۔

اُس زمانے میں الہ آباد یونیورسٹی جس سے علی گڑھ ملحق تھا امتحانات کے نتائج کا اعلان شروع مئی میں کر دیا کرتی تھی اور نئے کلاسوں میں داخلہ مل جاتا تھا۔ جون میں پڑھائی تو کچھ نہیں ہوتی البتہ دھما چوکڑی خوب مچی رہتی تھی۔ جو لڑکے اپنے اسکول سے اور بالخصوص باہر سے آتے ان کی کبھی گرم اور کبھی ٹھنڈی فاختہ اڑتی تھی۔ چارپائیاں اُلٹی جاتی تھیں اور سب سے بڑھ کر موسم کی پہلی بارش میں ہڑ رانٹ ہوتا تھا۔ جون ختم ہوتے ہی کالج بند ہو جاتا اور تین مہینے بعد یکم اکتوبر کو کھلتا تھا۔

اس کا تو کوئی سوال نہیں کہ جن لوگوں نے یہ چیزیں دیکھی ہیں۔ انہیں یہ باتیں سُن کر ایسا معلوم ہوگا جیسے ان کی آنکھوں کے سامنے وہی ماحول وہی فضا وہی گہما گہمی اور وہی چہل پہل موجود ہے جو اُن کے زمانہ میں تھی۔ سوال صرف یہ ہے کہ کیا وہ لوگ بھی یقین کریں گے جنہوں نے اس مادر علمی کی آغوش میں تعلیم نہیں پائی اور جن کو یہ نہیں معلوم کہ یہاں کے زمین و آسمان کچھ اور ہی ہیں۔ میرا مطلب ہے سرزمین علی گڑھ سے، زندہ باد علی گڑھ۔

اُس زمانہ میں بہت سے کام "ٹریڈیشن" کی بنا پر ہوا کرتے تھے۔ کالج کی زندگی میں اُس ٹریڈیشن کو ضابطہ فوجداری اور قانون تعزیرات سے زیادہ اہمیت تھی تحریک ترک موالات سے علی گڑھ کی زندگی میں ایک بھونچال آگیا تھا۔ سب پرانے طلبار کے بیک وقت نکل جانے کی وجہ سے وہ تمام خصوصیات بڑی حد تک زائل ہو گئیں، جو بڑی محنت اور محبت سے پیدا کی جا سکی تھیں اور جو سینہ بہ سینہ چلی آ رہی تھیں۔

جس ٹریڈیشن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے، اس کے اعتبار سے قاعدہ یہ تھا کہ بھکی پارک کے ہر کمرے میں دو پرانے لڑکوں کے ساتھ ایک نئے کو رکھ دیا جاتا تاکہ نہ صرف یہ کہ وہ گھبرائے نہیں بلکہ پڑھنے بیٹھنے سے بڑھ کر وہ بیٹھنا اٹھنا اور بات چیت کرنا سیکھ جائے اور اس میں وہ تمام خصوصیات پیدا ہو جائیں جن کی وجہ سے علی گڑھ والا چشم بد دور آج بھی دور سے دیکھ کر پہچان لیا جاتا ہے۔

یوں تو اُس زمانے کے علی گڑھ کے ہر بات نرالی تھی اور متاع عزیز کی طرح دل اور دماغ کے گوشوں میں رچی بسی ہے مگر دو واقعات ایسے ہیں جو بھولتے ہی نہیں۔ ایک تو پہونچتے ہی پیش آیا اور دوسرا ایک سال بعد وقوع پذیر ہوا۔ وقت گزرتے دیر نہیں کل کی سی بات ہے کہ اب سے چھپن برس پیشتر یعنی ۲۵ ر

[illegible] تھیں۔ صبح دیکھا ہے کہ وقت یک دم [illegible] پیچھے [illegible] شروع ہو گئی دس منٹ کے اندر اندر خوب بارش ہونے لگی اور لوگ اپنے اپنے کمروں سے نکل کر برآمدے میں جمع ہونے لگے صحن کے چھوٹے چھوٹے گڑھوں میں جو پانی جمع ہو گیا تھا اس کی وسعت بڑھتی گئی اور دیکھتے دیکھتے پورا صحن زیر آب ہو گیا جل تھل بھر گئے۔ نہ آسمان نظر آ رہا تھا نہ زمین، اُمنڈ اُمنڈ کے بادل آ رہا تھا اور بارش ہو رہی تھی۔ اتنے میں کمرہ [illegible] کی طرف کچھ گڑبڑ ہوئی اور میں نے دیکھا کہ سرور خان، اسد، انور، آغا مرزا، شیخ محمد وغیرہ کسی شخص کو حلقہ میں لئے ہوئے برآمدے میں سے صحن میں کود پڑے۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ بیچ کے بھوندیا بنیا ٹھا تھیر تھے جن پر کوئی پانی اچھال رہا تھا اور کوئی مٹی پھینک رہا تھا۔ ایک طرف سے کسی نے ان کی ٹانگ پکڑ کر ایسا گھسیٹا کہ یہ ایں تن دتوش وہ زمین بلکہ پانی ناپنے لگے۔ ان لوگوں کا بارش میں اس طرح کود پڑنا گویا ایک سگنل تھا جس کے بعد ہر شخص نے کسی نہ کسی کی دستگیری فرماتے ہوئے اُس کو پانی میں دھکیل دیا۔ حضورِ عالم اور میں اس عجیب منظر کو پوری طرح دیکھ بھی نہ پائے تھے کہ قریب کے کمروں سے زین العابدین، مرزا اختر حسین، حبیب بخش

---

سرفراز خاں صاحب کے چھوٹے بھائی ہونے کی وجہ سے دس سیر کم یعنی دو من سے کچھ اوپر ہوں گے۔ [illegible] بہت ہی عمدہ بجاتے تھے [illegible] علی گڑھ کے مایہ ناز ہاکی کے [illegible] پلیر [illegible] اسد کے چھوٹے بھائی رائٹ آؤٹ ہاکی پلیر [illegible] آغا مرزا گول کیپر تھے اور [illegible] پارہ سال ہاکی کے گول کیپر رہے، کپتان ہوئے، ڈپٹی کلکٹر ہوئے [illegible] کمشنر ہو کر ریٹائر ہوئے۔ اپنے وطن بریلی میں دو سال قبل انتقال پا گئے ہو گئے [illegible] ہاکی ٹرسٹ [illegible] میں اسد کا سیدھا بازو، رائٹ ان کھیلتے تھے۔ [illegible] کے رہنے والے [illegible] پاکستان گورنمنٹ میں [illegible] کے وزیر ہو کر ریٹائر ہوئے [illegible] سلطنت مغلیہ کے [illegible] چشم و چراغ ان کے [illegible] شہزادہ [illegible] دہلی سے لکھنؤ آ کر بس گئے۔ [illegible] وقت بالکل نہیں شاہی خاندان سے متعلق [illegible] گئے تھے [illegible] واقفیت بڑے [illegible] زیادہ ہوتا تھا کیونکہ [illegible] ڈپٹی کلکٹر ہو گئے تھے۔ [illegible] ہاکی کرکٹ پلیر

[illegible] وقت لوگوں نے [illegible] کے ساتھ "پابدستِ دگرے دست بدستِ دگرے" [illegible] کو پانی میں خوب خوب غوطے دیئے گئے۔ ایک گھنٹے سے زیادہ دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا اور [illegible] بخیر و خوبی ختم ہوا۔

مرسید ایسٹ کے [illegible] میں ان دنوں [illegible] خاں [illegible] تھے۔ اس وقت تھے خاں کی صورت آنکھوں میں پھر گئی [illegible] ان کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ ہو گی۔ پیرانہ سالی کے باوجود سیدھے تان کر چلتے تھے جیسے کڑی کمان کا تیر، دبلا پتلا جسم، لمبے لمبے ہاتھ پاؤں [illegible] چہرے سے ٹپکتا ہوا قد، کھلتا گندمی رنگ، مونچھوں کی بیں کٹی نہیں [illegible] اور شرعی تل جیسی داڑھی، سر یا تو گُٹا ہوا یا بہت چھوٹے چھوٹے بال [illegible] کے اوپر [illegible] کی ایک دوپلی ٹوپی رکھی جس میں [illegible] ململ کا کرتا اور ڈھیلا ڈھالا چوڑی دار پاجامہ [illegible] کرتے تھے۔ شہر کو جاتے تو کبھی سفید اور کبھی کسی اور رنگ کی شیروانی [illegible] نہ ملوائے تو تھے خاں کے پیر میں ہر مہینے ایک نیا جوتا [illegible] جوتا تو کبھی کانپوری بوٹ شو، کبھی آگرے کا [illegible] کسی زمانہ میں دلی کی سلیم شاہی چلتی تو کبھی [illegible] بجتا [illegible] جوتا، حد یہ تھی کہ میں نے انہیں [illegible] تک پہنے دیکھا لوگوں سے سنا تھا کہ [illegible] ہماری ساتیاں ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ [illegible] کا طرز عمل ہم فرسٹ ایئر والوں کے ساتھ [illegible] بھی مشکل ہے وہ گستاخ نہیں تھے [illegible] بھی نہیں ہوتے تھے لیکن ان میں [illegible] ہم لوگ

---

[illegible]

مرعوب ہو جاتے تھے۔ اُن کا رکھ رکھاؤ، اُن کی بُردباری، اُن کی کم سخنی، اُن کا رعب داب اور دوسرے ملازموں کے دلوں میں اُن کی وقعت اور عزت ننھے خاں کی ایسی خصوصیات تھیں جن سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ سرسید کی آنکھیں دیکھے ہوئے ہیں۔ غالباً بلکہ یقیناً وہ خود بھی ان چیزوں کو سمجھتے اور کبھی کبھی اُن سے فائدہ بھی اٹھا لیتے تھے۔

مذراتش کے بعد کپڑے بدل کر حضور عالم اور میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ننھے خاں باہر سے آئے اور بیک روم میں چلے گئے۔ پانچ منٹ بعد واپس ہوئے ہمارے بھیگے ہوئے کپڑے اُن کے ہاتھ میں تھے۔ باہر جاتے ہوئے ایک سیکنڈ کے لیے ٹھہر کر فرمایا: "قاعدہ ہے کہ پہلے مذراتش کے کپڑے جو بھیگے ہیں ہمارے ہوتے ہیں، اس لیے میں یہ کپڑے لیے جاتا ہوں۔" اُن کا فقرہ سُن کر حضور عالم اور میں ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے جب تک ہم سمجھیں کہ اُن کے کہنے کا کیا مطلب ہے ننھے خاں کمرے سے باہر جا چکے تھے۔ ہم لوگ ننھے خاں کو نہ جھوٹا سمجھ سکتے تھے نہ سچا۔ کبھی خیال ہوتا کہ انہوں نے سچ کہا ہوگا۔ پہلے مذراتش کے بھیگے ہوئے کپڑے واقعی بیرے لوگوں کو ہی ملا کرتے ہوں گے اور کبھی سوچا کہ ننھے خاں ایکٹوٹی (ACTIVITY) کر گئے ایسا بھی کیا کہ بیرے کپڑے ہی لے جائیں۔ آخر دل کو یوں سمجھا لیا کہ انہوں نے کوئی درخواست تو کی ہی نہ تھی جو نامنظور کر دی جاتی، وہ تو استحقاقاً کپڑے اٹھا کر چل دیے۔ یہی مہربانی کیا کم تھی کہ انہوں نے ہم کو قاعدہ بتا دیا، اگر اتنا بھی نہ بتاتے تو ہم ان کا کیا بگاڑ لیتے۔ [illegible] ہم دونوں نے یہی تصفیہ کیا کہ اس واقعہ کا ذکر کسی سے [illegible] کو شماتت ہمسایہ سے بچا لیں۔

خیال فرمائیے کہ جس زمانے میں ننھے خاں جیسے [illegible] ہوں اُس زمانے میں طالب علم کیسے ہوتے ہوں گے۔

اب سنئے [illegible] واقعہ [illegible]
[illegible] کی وجہ [illegible]

[illegible] ایک [illegible]

صاحب مرحوم کا وہ سرکاری خطاب یاد [illegible]
جس کے بعد قوم نے اُن کو مسیح الملک بنا دیا تھا۔ گفتگو، وضع قطع [illegible]
نشست و برخاست میں کچھ لکھنویت پائی جاتی تھی، حالانکہ دلی اور لکھنؤ سے
اُن کو دور کا بھی واسطہ نہ تھا، آڑو بھی، خوبانی، سردلی اور بالخصوص پونشا
ہی ایسی چیزیں ہیں جو اُن کے وطن کا اتہ پتہ دیتی ہیں۔ غرضیکہ یہ صاحب [illegible]
تھرڈ ایر میں اور میں تھا سیکنڈ ایر میں۔ داخلے کے وقت انہوں نے [illegible]
کوشش اور پیروی کر کے ——— اپنے ہم وطن اور شاید [illegible]
والے کو اپنے کمرے میں لے لیا جو کالجیٹ اسکول ہی سے [illegible]
آیا تھا۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ایسے طالب [illegible]
پاس ہو کر کالج میں آتے تھے [illegible]
اپوائنٹ [illegible]
[illegible]

کہ اُن کو موقع ملنے پر فقرہ چست نہ کر دیتے ہوں۔ خواجہ صاحب کو فقرہ چست کرنا اور کسنا نہایت ناگوار گزرتا اور وہ خیال کرتے کہ کالجیٹ اسکول سے آنے والے طالب علم کی اس سے بڑھ کر اور کیا توہین ہو سکتی ہے کہ اس کو بنایا جائے۔ چنانچہ بہت کرکے کبھی فقرہ کا جواب دیتے اور کبھی فقرہ چست کرنے میں خود سبقت فرماتے۔ یہی سبقت اُن کے لئے بلائے بے درماں ثابت ہوئی اور اس نے وہ رنگ دکھایا کہ توبہ ہی بھلی مجھے بورڈنگ میں رہتے ایک ہی سال گزرا تھا لہٰذا فقرہ اور پھبتیوں وغیرہ کے معاملے میں بھلا اُن کی کیا مدد کرتا۔ ہاں کی بات تو یہ ہے کہ مجھے خود اپنی فکر پڑی رہتی اور میں جہاں تک ہو سکتا ہر ایسے موقع کو بچاتا ہی رہتا۔ البتہ ہمارے سینیئر صاحب ہمیشہ خواجہ کی دستگیری فرماتے۔ چارپائی الٹ جانے کا اندیشہ ہوا تو انہوں نے رکھوالی کی خاطر رات رات بھر آنکھوں میں گزاری اور مجھے بھی نہیں سونے دیا۔ ٹھنڈی فاختہ اُڑنے کا اندیشہ ہوا تو ساری ساری رات کرسی یا پلنگ پر بیٹھ کر حقہ پیا جس کے تیز خمیرہ کی خوشبو بھی حقہ نہ پینے والے کی نیند کافور کر دینے کے لئے کافی تھی۔ ہمیشہ خواجہ کو اپنے ساتھ رکھا اور اپنے رعب اور اثر سے جہاں تک ہو سکا فقرے اور پھبتیوں کا موقع نہ آنے دیا۔ اُن کا رعب اور اثر یہ تھا کہ تھے تو وہ تھرڈ ایر میں مگر دو سال ایف اے میں فیل ہوئے تھے اور سن ۱۹۱۱ء اور سن ۱۹۱۲ء کا "آشیانہ" والا پُرآشوب زمانہ دیکھے اور بھگتے ہوئے تھے بقول شخصے اتنی مشکلیں پڑی تھیں کہ آسان ہو گئی تھیں۔ تن توش سے بہت درست تھے اور خواجہ کے مقابلے میں کہیں زیادہ خوش قسمت واقع ہوئے تھے۔ اس لئے کہ آنکھ نہ صرف یہ کہ چھوٹی تھی بلکہ اُس میں بادام اور نرگس والی سب باتیں موجود تھیں۔ پہلی بارک میں مدت سے رہتے تھے اور تھرڈ ایر میں آنے کے بعد سیکنڈ سینیئر فوڈ مانیٹر اور راؤنڈنگ کپتان بنا دیئے گئے تھے۔ اب بتائیے کہ جب وہ اتنے امپارٹنٹ آدمی ہوں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ جو جانور اُن کی نگرانی میں ہو اس کو آنکھ اٹھا کر بھی کوئی دیکھ سکے۔ لیکن ہوا یہ کہ حفاظت اور بچاؤ کی تدبیروں میں جس قدر شدت اور زیادتی ہوتی گئی دوسری طرف انکیوڈی کرنے کا جذبہ اسی قدر ترقی کرتا چلا گیا۔ ہر کوشش جو ناکام ہوتی ایک نئی صورت میں نمودار ہوتی گئی مگر خواجہ کے نکتہ چین سب کا کاٹ کرتے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پڑوسی تک دشمنوں سے جا ملے۔ پکی اور کچی بارک کے جتنے چوٹی کے بانی کار تھے اُن سب نے ایک مکمل اور منظم سازش کی اور کامران[۱] بخت، بشیر حیدر، صوفی احمد بخش، اشفاق علی، معین، رفیع قدوائی، جہانگیر قدر،

لدھوڑے خاں، اُستاد نذیر، آغا نورا نے سرپرستی کے لیے [illegible] جعفر کاظمی، قیوم خاں نمازی، چھوٹے خاں، بعد میں ... کو ... چھا ... دی۔ یہ ... اور کچھ ... طبیعت سے تیار ہو ... کہ کسی کو ... خواجہ پر فقرے بازی کم ہو گئی مگر ان کے نکتہ چین ... کا عیب کر گیا اور لوگ ڈر گئے۔ لیکن وہ یہ نہ سمجھے کہ سکوت ہمیشہ طوفان کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ کسی کا مصرعہ ہے۔ ؎ "بارش کی علامت ہے جو ہوتی ہے ہوا بند"

---

[۱] ۱۹۳۰ء میں صدیق حسن بدایونی وائس پریذیڈنٹ یونین ہوسٹل اور فاروق دیوانہ نے ایک اردو پرچہ نکالا تھا جس میں حسینوں اور حسن پرستوں کے کچے چٹھے چھپتے اور ان کو خطابات دیئے جاتے تھے۔ [۲] مغلیہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ فیل ہونے میں ماہر تھے پڑھنے سے زیادہ جوتے کے شوقین تھے۔ بیالیس، تینتالیس جوتے دیوار میں لٹکے رہتے تھے۔ [۳] کلائیو جمبک، اکرو خان تحصیلدار ہو گئے تھے۔ [۴] امرتسر کے رہنے والے جاپانی والے میں مشاق [۵] ٹیپال والے کرکٹ کپتان مولانا شوکت علی کے سکریٹری ہوئے۔ بھوپال چلے گئے تھے۔ [۶] بنانے پاکستان میں ہیں۔ [۷] ہمیشہ ہاکی کی سکینڈ الیون میں رہے مگر اکثر دانگلتے اور ڈھونگ بجاتے تھے۔ حیدرآباد کی فوج میں بریگیڈیر ہو کر ریٹائر ہوئے۔ بریلی کے تھے۔ [۸] حیدرآباد میں بس گئے۔ [۹] ان کو کالج میں توبہت ہی کم لوگ جانتے تھے۔ صرف الیکشن لڑاتے اور شطرنج کھیلتے تھے۔ عملی زندگی میں پہنچ کر ہندوستان کے مایۂ ناز مسلمان لیڈر اور وزیر منسٹر ہوئے۔ [۱۰] ان کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ [۱۱] اسحٰق خاں نام تھا ہمیشہ ترکش کوٹ اور ڈھیلی شلوار پہنتے تھے۔ خود بھی بھاری اور آواز بھی بھاری۔ لدھوڑی استر ہوتے کی مناسبت سے لدھوڑے خاں نام رکھ دیا گیا تھا۔ [۱۲] سب کو ایک آنکھ سے دیکھتے تھے۔ کرکٹ فرسٹ الیون کے بہت اچھے بولر اور وائس کپتان، گھڑا بہت ہی عمدہ بجاتے تھے۔ [۱۳] پہلے ذکر آ چکا ہے۔ [۱۴] قد چھوٹا مونچھیں بڑی، اپنے کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ [۱۵] کرنجی آنکھیں۔ قدرے ہکلاتے تھے۔ علیگڑھ کے رُوم فیلو تھے۔ نواب صاحب چھتاری کے یہاں رہتے، ان کے ساتھ حیدرآباد بھی گئے۔ [۱۶] سیدھے سادے، فٹ بال پلیر۔ [۱۷] لانبا قد، گورا رنگ بڑے بال، فٹ بال، فرسٹ الیون کے حیدرآبادی کھلاڑی۔ حیدرآباد میں اونچے عہدہ پر رہے۔ پاکستان چلے گئے۔ [۱۸] شاہجہان پور کے رہنے والے، بڑے خاں کے چھوٹے بھائی، فضل الرحمٰن خاں نام، ہاکی پلیر، بہت کامیاب وکیل خان بہادر اور میونسپلٹی کے چیرمین ہوئے۔ [۱۹] فضل الرحمٰن نام، انجم تخلص، علیگڑھ کے قرب و جوار کے رہنے والے چھوٹی سی داڑھی، اچھے شاعر تھے۔

ڈائننگ ہال میں فلکش ڈنر ہونے والا تھا۔ ہمارے سینیر صاحب چونکہ وہ مانیٹر تھے اس وجہ سے انہوں نے میرے اور خواجہ کے لئے دو ٹکٹ خرید لئے تھے۔ فلکش ڈنر ہمیشہ ۹ بجے سے ہوا کرتا اور اُن لوگوں کو جو ڈنر میں شرکت نہیں کر رہے ہوتے پہلے کھانا کھلا دیا جاتا تھا چنانچہ گھنٹی بجی اور ڈنر میں شریک نہ ہونے والے کھانے کی میزوں پر پہونچ گئے۔ خواجہ اور میں برآمدے کے سامنے کھلے میدان میں پلنگ پر بیٹھے گپ لڑا رہے تھے۔ ڈائننگ ہال ختم ہونے کے بعد سب لوگ یا تو کمروں میں یا باہر چارپائیوں پر لیٹے اور بیٹھے تھے۔ ایک دم سلام علیکم کی آوازیں آنے لگیں اور لوگوں کی نظریں مسجد کی سمت اُٹھ گئیں۔ میں نے بھی مڑ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ اُس طرف سے ایک مجمع چلا آرہا ہے۔ خواجہ بھی اس طرف دیکھنے لگے۔ لیکن ہم دونوں میں سے کوئی بھی نہ سمجھ سکا کہ معاملہ کیا ہے۔ بکروں کے سامنے برآمدے میں خدا داد خاں، سرتاج عالم، عبدالرشید اور رؤف پاشا کھڑے تھے۔ رؤف پاشا کہنے لگے: "ابن علی صاحب ہوشیار ہو جائیے" میں نے جواب دیا "میرے مقابلے میں آپ کا ہوشیار ہونا زیادہ ضروری ہے" فقرہ ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ آناً فاناً مجمع نے مجھے اور خواجہ کو گھیر لیا۔ ایک طرف اشفاق علی نظر آئے جن کے ساتھ ایک صاحب مشجر کی شیروانی پہنے عمامہ باندھے۔ پھولوں کا سہرا لٹکائے کھڑے تھے۔ پیر میں چکے کام کا دل کا جوتہ تھا اور ہاتھ میں سُرخ رنگ کا ریشمی رومال۔ اشفاق علی کے بازو میں بشیر حیدر بھی شیروانی پہنے، عمامہ باندھے، بانس کی چھڑی ہاتھ میں لئے موجود تھے۔ تماشائیوں کا ہجوم ایک سو سے کم نہ تھا۔ آتے ہی کسی نے کہا "نیک کام میں دیر کرنے کی ضرورت نہیں" اشفاق علی نے بشیر حیدر کو متوجہ کرتے ہوئے کہا: "بندہ زادہ عبدالجلیل خاں حاضر ہے۔ اس کو اپنی فرزندی میں قبول فرمائیے" "بشیر کہنے لگے،" مجھے کوئی انکار نہیں، بسم اللہ کیجئے" اس پر ایک

نسیم شمیم پونے چھ فٹ کے کوئی صاحب بڑا سا پگڑ باندھے لمبی سفید ڈاڑھی لٹکائے آگے بڑھے جن کو پہلے تو میں پہچان نہ سکا لیکن آواز سن کر پتہ چلا کہ وہ توقیر مرزا ہیں۔ جب انہوں نے آمنت باللہ شروع کی تو خواجہ صاحب جو اس وقت تک کافی گھبرا گئے تھے۔ بھیڑ کو چیرتے ہوئے برآمدے میں سے مونیٹر کمرے کی طرف جانے لگے۔ خیرات علی بابا نے فرمایا "دلہن شرمیلی ہے۔ گوشہ پسند کرتی ہے، چلئے اندر چلیں" چنانچہ سب لوگ کمرے کی طرف ٹوٹ پڑے چونکہ پہلے سے سب انتظامات مکمل کرلے گئے تھے اس وجہ سے فرش فروش قالین، گاؤ تکئے، کرسیاں وغیرہ سب دم بھر میں سجادی گئیں اور دلہن کے پڑوس والوں نے جو بمنزلہ میکے والوں کے تھے۔ باراتیوں کی خاطر تواضع میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ سوڈا، لیمنڈ، آرنج، راسپ بیری، جنجر، آئس کریم وغیرہ وغیرہ تقسیم ہونا شروع ہوگیا۔ ایوب احمد آثم، فہمی اور دوسرے شعرا نے خوب خوب دادِ سخن دی۔ شاید اقبال سہیل کا کہا ہوا سہرا بھی کسی نے پڑھا۔ اُدھر صحن میں آتشبازی شروع ہوگئی۔ پھل جھڑیاں پٹاخے، مہتابیاں، طرّیاں، بھچو انار

---

ساقد، سانولا اسلونا رنگ، قیوم کے ساتھ رہتے تھے سنا تھا کہ بہت بڑے ایجوکیشنسٹ ہوئے اور داڑھی بھی رکھ لی تھی [5] اُن کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ [6] دہلی کے رہنے والے، کرکٹ پلیئر، داڑھی رکھتے تھے حیدرآباد میں منصف ہوگئے تھے [7] حیدرآباد میں تھے۔ اسکول کی ابتدائی جماعت میں شریک ہو کر ظہور وارڈ میں رہے۔ کالج پہونچے کوئی درجہ دوسری یا تیسری کوشش سے پہلے پاس نہیں کیا۔ بڑی مصیبت سے علی گڑھ چھوڑا، کرکٹ کھیلتے تھے۔ سب سے پہلے فلالین کا پتلون اور کرکٹ بوٹ پہن کر ماڈ بجے سے پہلے گراؤنڈ پر پہونچ جاتے تھے مگر ساری عمر نہ کسی ٹیم میں آسکے نہ کلر ملا۔ حیدرآباد واپس پہونچ کر محکمہ امورِ مذہبی میں ملازم ہوگئے تھے۔ [8] سہارنپور کے رہنے والے، شاعر تھے لہٰذا حسن پرست تھے چونکہ داڑھی تھی اس وجہ سے کالج میں اپنے کو بہت چھپائے رکھا۔ وکالت پاس کر کے سہارنپور لوٹے تو کھلم کھلا رند شاہد باز بن گئے۔ بہت دلچسپ آدمی تھے [9] اُن کا ذکر بھی پہلے آچکا ہے۔ [10] پروفیسر رنیل ہسٹری کے پروفیسر تھے بہت قابل اور لائق مگر سخت مزاج تھے۔ ڈائننگ ہال کے پریسیڈنٹ تھے ایک مرتبہ کھانے کے وقت ڈائننگ ہال میں موجود تھے۔ اُن کے قریب کی میز پر کسی نے روٹی مانگنے کے لئے بہت زور زور سے اور دیر تک ٹیبل پر ہاتھ

[11] فٹ بال فرسٹ الیون کے بہترین فل بیک، سوا چھ فٹ اونچے، فرنیٹر کے رہنے والے۔ [12] سرتاج حسیناں مشہور تھے۔ بڑی آنکھیں سانولا رنگ، حیدرآباد پولس میں سپرنٹنڈنٹ ہوگئے تھے، مٹاپے کے باوجود ریٹائر ہوتے وقت اداؤں کی دلکشی اور عادات میں کوئی فرق نہ تھا۔ لاہور ہی میں ہوں گے۔ [13] عبدالرشید، سعید الزماں اور عنایت خاں ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔ سرتاج سانولے مگر یہ گورے تھے پشاور کے تھے، وہیں ہوں گے [14] مدراس کے رہنے والے، سب سے کم عمر تھے۔ چھوٹا

نیز بچے چینخ، غرضکہ ہر قسم کی آتشبازی چھوٹنے لگی۔ ایک طرف سے تو کچھ گنتین، چکیاں اور ہوائیاں بھی اُڑائی گئیں۔

ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ ڈائننگ ہال کی طرف سے کچھ لوگ آتے ہوئے نظر آئے جن کے آگے آگے کارجین فوڈ مانیٹر اور پروفیسر رنیل تھے۔ رنیل کو دیکھ کر مجمع کائی کی طرح پھٹ گیا۔ انہوں نے ناراضی کے ساتھ کرخت لہجے میں کہا "سب لوگ کمرے سے باہر ہو جاؤ"۔ جو لڑکا رنیل کے قریب کھڑا تھا اس سے انہوں نے دریافت کیا کہ یہ لوگ کیوں جمع ہیں۔ وہ تو جلدی میں کچھ نہ کہہ سکا۔ البتہ جلدی اور بدحواسی میں کارجین بول اٹھے کہ میرے رُوم فیلو کی شادی ہو رہی ہے۔ رنیل اُن کی صورت دیکھنے لگا۔ حیران ہو کر اس نے پوچھا "کیا مطلب کیسی شادی؟" ساری حذاقت ختم ہو گئی۔ جواب نہ دے پائے یہی کہہ کر جان چھڑائی کہ "یہ لوگ میرے رُوم فیلو کو ستا رہے ہیں"۔ دو چار منٹ بعد رنیل واپس ہو گیا لیکن ان بزرگ کی یہ حرکت کہ رنیل کو موقع پر لے آئے بہت ناپسند کی گئی اور کچھ عرصہ کے بعد جب وہ یونین سوسائٹی کی سکریٹری شپ کے لئے کھڑے ہو گئے تو ناکامی کی صورت میں اُن کو سزا بھی مل گئی۔ البتہ ایک عرصہ بعد اُن کی خطا معاف ہوئی اور وہ سکریٹری بن سکے۔

رنیل غریب کو کسی نے نہ بتایا کہ کالج میں جب کوئی طالب علم ایسا آ جائے جسے کسی قسم کا مغالطہ ہو تو اولاً چھوٹے موٹے علاج کر کے اس کو درست کیا جاتا ہے لیکن اگر یہ نسخے کارگر نہ ہوں تو قطعی اور مجرب علاج یہ ہے کہ شادی کر دی جاتی ہے جس سے اس کا دماغ بالکل ٹھیک ہو جاتا ہے۔ چنانچہ خواجہ کی عقل بھی ٹھکانے آ گئی۔ اُن کے ڈنک گر گئے اور ساری اکڑفوں خاک میں مل گئی۔

کیا آپ کو یقین آیا کہ اس عجیب بیماری کا علاج کس قدر عجیب تر تھا۔

---

مارے۔ رنیل نے اس کو ڈائننگ ہال سے نکال دیا۔ اس زمانے کے لوگوں کو یاد ہو گا کہ یوسف قمر الدین بدایونی اور رفیع احمد قدوائی وغیرہ نے اسٹرائک کرا دی اور لڑکے اس وقت تک ڈائننگ ہال میں نہ گئے جب تک رنیل نے معافی نہ مانگ لی۔



# ناشنیدہ آواز



میں ایک دریا تھا۔ بے حد تند و بیباک
کہیں میری سطح جیسے کوئی شفاف سا
کہیں میری جبیں پر کبھی اشکال کتنے
کہیں کھیتوں میں بچھے ہو سے

مری موجیں رہی ہیں مختلف جادوؤں کا
مری باہوں میں پلا ہے ہر اک تہذیبی
گلے مل مل کے کھیلا ہے مری موجوں پہ
شوالوں کے کلس سے مسجدوں کا سبز

مگر اس عہدِ نو نے پھر کو مو طرات میں لاکر
نہ جانے کیوں مری موجوں کے نازک جسم کو توڑا
اُدھر اک باندھ باندھا، اس طرف دیوار اٹھوائی

ملی اس کو بھی تنہائی، ملی مجھ کو بھی تنہائی
کلس میرے سے بچھڑے، میناروں کا شیدائی
اب ان حالات میں جو کچھ نہ پوچھا جائے وہی تھوڑا

کہ للہ کے وہ کیا بن سکا کیا بن سکوں گا میں
کہ اس کے بعد بربادی کا ہر سامان آ گیا ہے
نہ جانے کس پہ کیا گزرے کہ اک طوفان آ گیا ہے
بہت ممکن ہے کھو جائے اکیلا وہ، اکیلا میں

بغیر اختلاط دل ادھورا وہ ادھورا میں
کٹھن ہے راہ، لٹ جانے کا ہر امکان آ گیا ہے
سلگتی جا رہی ہے دھوپ، ہیجان آ گیا ہے
وہ اک بے رنگ سی تصویر ہو گا مضغہ سا میں

کہو اس سے کہ اب وہ توڑ ڈالے اپنے سب پہرے
اِدھر میں بھی کئے دیتا ہوں اس دیوار کے ٹکڑے
ہزاروں انقلاب آئے مگر یہ سچ نہیں بدلا
کہیں پانی الگ ہوتا ہے تاریخی مدینے سے
کہیں تنہا رہا ہے جسم سے اس جسم کا سایہ
کہیں تشنہ دہن صحرا، سمندر خشک کر پایا!

عجیب رامش

# غزلیں



ضیا فتح آبادی

## ضیا فتح آبادی

ضربِ تیشہ لگا رہی ہے دُھوپ
بوڑھی دیوار ڈھا رہی ہے دُھوپ

نرم و نازک دلہن کوئی جیسے
چاندنی سے لجا رہی ہے دُھوپ

آسماں سے اُتر کے دھرتی پر
سوئے فتنے جگا رہی ہے دُھوپ

گردشوں کو تیز تر کر کے
گرمیِ دل بڑھا رہی ہے دھوپ

شب گزیدوں کو کیا خبر اس کی
آ رہی ہے کہ جا رہی ہے دھوپ

سائے سے بے نیاز و بے پروا
دشت میں گھر بنا رہی ہے دُھوپ

دلِ اندھیروں سے ڈرنے لگتا ہے
گھر کے اندر تک آ رہی ہے دھوپ

کیوں نہیں پھونک دیتی پاس آکر
دُور سے کیا جلا رہی ہے دھوپ

آتشِ گل ہے اجنبی ہم سے
مدتوں آشنا رہی ہے دھوپ

نعشِ خورشید اُٹھائے کندھوں پر
جل رہی ہے، جلا رہی ہے دھوپ

سُنیئے، کوئی ضیا کی تازہ غزل
زیرِ لب گنگنا رہی ہے دھوپ

آج کل نئی دہلی

---

ٹوٹتے دیکھے ہیں پندار کے شیشے کتنے
وقت کی دُھوپ نے کجلا دیئے چہرے کتنے

صرف اک چہرے کو مہتاب بنانے کیلئے
کس کو معلوم بجھائے گئے تارے کتنے

ہم ہی دیوانے تھے ہر حال میں چاہا اس کو
زندگی ہم سے ملی روپ بدل کے کتنے

ٹکڑے ٹکڑے نظر آتا ہے ہر اک چہرے کا عکس
راہ میں بکھرے ہیں ٹوٹے ہوئے شیشے کتنے

آج کے دوَر میں بدلا ہے فضاؤں نے چلن
یوں صبا آئی کہ مرجھا گئے غنچے کتنے

امن کے شہر کی ہے وقت کی شیریں طالب
دیکھنا یہ ہے کہ اب اُٹھتے ہیں تیشے کتنے

کون اب پوچھے ہے کیفیتِ زخمِ پنہاں
کس کو معلوم کہ ہیں درد کے مارے کتنے

اپنی بیدار نگاہی پہ بھروسہ ہے جنہیں
آج اس بزم میں ہیں ایسے بیچارے کتنے

کبھی اعزاز دلایا، کبھی رسوا بھی کیا
مہدی اس دلِ نے مرے، نقش ابھارے کتنے

مہدی پرتاب گڑھی

---

دیدۂ طولِ داستاں، رنگِ بیاں سمجھا گیا
خون کی بوندوں کو زیبِ داستاں سمجھا گیا

حسن کا دل سے جو رشتہ تھا کہاں سمجھا گیا
اک حقیقت تھی، جسے اک داستاں سمجھا گیا

میری خاموشی کو بھی میرا بیاں سمجھا گیا
میں وہاں تھا ہی کہاں مجھ کو جہاں سمجھا گیا

دل کو دل کی طرح کب دیکھا کہاں سمجھا گیا
مدتوں حدِ نظر کو آسماں سمجھا گیا

جانے کیا ہوتا، اگر ہوتا گریباں چاک چاک
کچھ نہ ہونے پر تو دامن دھجیاں سمجھا گیا

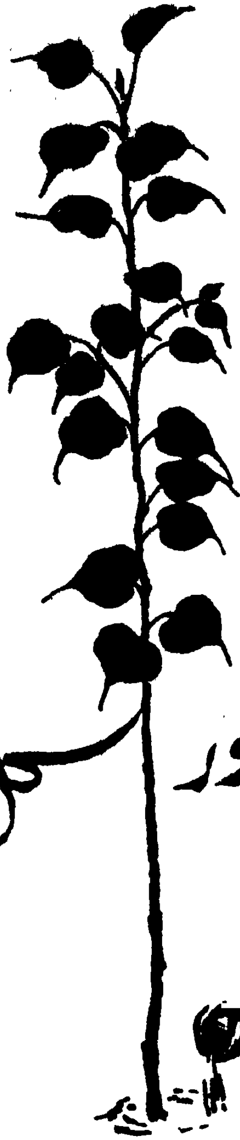
ایک ناسمجھی کو سجدے دربدر کرنا پڑے
ایک کمزوری کو زورِ آسماں سمجھا گیا

دیر و کعبہ کے دوراہے پر سنا واعظ کا وعظ
اس نے جو جانا کہا، میں نے جہاں سمجھا گیا

وہ پری بن کر اُتر آئی مرے شیشے میں آج
آسماں پر جس کو برقِ بے اماں سمجھا گیا

کی گئی زحمت بقدرِ فرصت و پندار و ظرف
مجھ کو اے فیاض کب دیکھا کہاں سمجھا گیا

فیاض گوالیاری



آج سے اکیس برس پہلے بھارت جمہوریہ بنا...
ہر طرف خوشی ....... بھاری جوش و خروش...
ترقی و خوشحالی کی طرف ایک طویل سفر کا آغاز
.. یہ بات تو ہے پرانی ...
آج ... کئی مقاصد حاصل ہو گئے ہیں ...
ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے .. کل کا بھارت ہوگا
ہماری تمناؤں کا بھارت ... بھارتی لوگوں کیلئے
قابلِ فخر ....

# آج اور کل




منو ـــــ اس کا پورا نام ہے، منوٗ ایلا۔ اُسے میں نے پہلی بار کہاں دیکھا، کوشش کے باوجود مجھے یاد نہیں آیا۔ جب بھی کوشش کرتا ہوں کئی مناظر ایک ساتھ دماغ میں اُبھر آتے ہیں ـــــ لندن کی ایک کہر آلود شام اور نیشن سیم کورٹ سڑک کی چہل پہل کے بیچ کھڑا تھا۔ شاید وہیں نومبر دسمبر کے دنوں میں، بس کے انتظار میں کھڑی منو کو میں نے پہلی بار دیکھا ہوگا۔ ساتھ ہی یہ بھی یاد آتا ہے کہ موسم بہار میں صبح سویرے سینٹ جیمز پارک میں تیرتے ہنسوں کی طرف ڈبل روٹی کے ٹکڑے پھینکتے ہوئے کوئی منو کو میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ پھر سڈول، سینے کے پاس ایک ہاتھ میں کتابیں سنبھالے دوسرے میں سینڈوچ کا ایک ٹکڑا لئے، کھڑی کھڑی ہی کھاتی ہوئی منو کی تصویر نظروں میں تیر جاتی ہے۔ اور محسوس ہوتا ہے کہ میں نے سب سے پہلے اسے وہیں دیکھا تھا ـــــ اور تاریخ وار سچائی میری گرفت میں نہیں آتی۔

وہ کہاں اور کب نظر آجائے گی۔ یہ کہا نہیں جا سکتا تھا اسی لئے اس کا کہیں بھی نظر آجانا میرے لئے خلاف توقع یا باعث استعجاب نہ ہوتا۔ اور جب بھی دیکھا اُس کی ادا نرالی ہی دیکھی۔ کبھی وہ اتنی بے تعلقی سے اپنے ماحول کا جائزہ لیتی نظر آتی کہ مانو اس کے اندر کائنات کے آغاز و انجام پر غور و فکر میں مستغرق کوئی مفکر موجود ہو اور کبھی اتنے ہی الھڑپن سے اسی ماحول میں گھل مل گئی ہوتی مگر ہر حالت میں اس کا انداز اتنا فطری اور معصوم ہوتا کہ شکایت یا صفائی کی گنجائش ہی نہ رہتی مجھے محسوس ہوتا کہ ان متضاد کیفیتوں کے باوجود منو میں کوئی خاص بات ہے۔ وہ کیا ہے یہ میں بتا نہیں سکتا، مگر رہ رہ کر مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ بات صرف میں ہی جان سکا ہوں جب بھی وہ نظر آتی، پل بھر میں سب کچھ بھلا دینے کو جی چاہتا اور کبھی کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا کہ وہ پھر کبھی نظر نہیں آئے گی۔ اس کے ساتھ ایک دائمی رشتہ قائم کر لینے اور نہ لینے کی آرزوئیں ایک ساتھ میرے من میں ہچکولے لینے لگتیں۔ یہ نہیں کہ میں اس کی وجہ جان پاؤں ـــــ کسی چیز کو پانے کی شدید آرزو کے ساتھ ہی اس کے نہ ملنے کا ڈر بھی شامل ہو تو اس چیز کو پا لینے اور نہ پانے کی کشمکش کا پیدا ہو جانا بالکل غیر فطری نہیں۔ مگر منو کے بارے ایسا کبھی سوچ نہیں سکا۔ شاید آج بھی ایسا نہیں کر سکوں گا۔

ابتدائی دنوں میں وہ جب بھی مجھے نظر آتی محسوس ہوتا کہ وہ مجھے بلا رہی ہے جی چاہتا کہ اس کے پاس چلا جاؤں کسی بہانے اس سے بولوں لیکن فوراً مجھے خیال آجاتا کہ میں نے ایسا کیا تو، پھر وہ کبھی دکھائی ہی نہیں دے گی۔ اور اسی خیال سے میں اتنا گھبرا جاتا کہ کچھ کرنے کی ہمت ہی نہ رہ جاتی۔ پھر بھی مجھے محسوس ہوتا کہ جو طوفان مجھ میں اُٹھ رہا ہے اس کا منو کو علم ہے اور میں اس کو دیکھنے، ہنسنے، بلکہ اس کی ہر حرکت کا مطلب اپنی مرضی کے مطابق نکال لیتا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ میرے یہ مطالب بالکل غلط آلودہ تھے کیونکہ وہ محض میری قیاس آرائی کا نتیجہ تھے۔

جب وہ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی تو لگتا کہ اب وہ پھر کبھی نظر نہ آئے گی۔ بن کر اسے بھول جانے کی کوشش کرتا۔ بھول بھی جاتا۔ مگر وہ اچانک پھر کہیں نظر آجاتی اور وہی سلسلہ پھر سے جاری ہو جاتا۔ شروع کے اُن تین چار مہینوں میں میں نے اُسے صرف آٹھ دس بار ہی دیکھا ہوگا۔ لیکن معلوم ہوتا تھا کہ کئی بار دیکھا ہے۔

یونہی ایک دفعہ، شام کو چھ بجے کے قریب میں کالج لائبریری سے گھر لوٹ رہا تھا وہ بس کے انتظار میں کھڑی تھی۔ اُسے دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ اُس نے مجھے پاس بلایا۔ دو کتابیں میرے ہاتھ میں تھمائیں اور "میں ابھی آئی" کہتے ہوئے بغل والی گلی میں غائب ہو گئی۔ اور مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ وہ پھر آئے گی، مجھ سے بولے گی، ہماری جان پہچان ہوگی۔ مجھے یوں صرف اس لئے محسوس نہیں ہوا تھا کہ اس کی کتابیں میرے ہاتھ میں تھیں۔

میں ماحول سے تو بے خبر ہو ہی چکا تھا، اس اُمید پر کہ اس کا نام پتہ معلوم ہوگا، میں نے اوپر کی کتاب کھولی ـــــ منوٗ ایلا ہارٹ من، دین ـــــ تو یہ آسٹرین ہے دیانا کی ـــــ منو ایلا ـــــ منو ایلا ـــــ اور میں نے اس نام کو فوراً ہندوستانی روپ میں ڈھال لیا۔ ـــــ منو ـــــ منو ویلا ـــــ اتنے میں وہ آگئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک تھیلی تھی۔ "میں کچھ سینڈوچ لے آئی ہوں۔ چلو ہیتھ میں گھومنے چلیں۔" اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا وہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چلنے لگی ـــــ

ــــــ ہو ــــــ ہو ــــــ ہو ــــــ میرا ان جاپ کرنے کا بہتیرا طریقہ کرنے میں اس کے مقابلے میں زمین دوز ریل گاڑی آرام دہ ہوتی ہے۔ اس کا علم تو مجھے بعد میں ہوا۔

اس کے بعد ہم اکثر ملنے لگے۔ کب اور کہاں ملنا ہے، یہ وہی طے کرتی اور ایک بار طے کرتی تو ٹھیک وقت پر وہاں پہنچ جاتی۔ ان ملاقاتوں میں اکثر وہی بولا کرتی اور میں چپ چاپ بیٹھا سنا کرتا اور اس کا لب و لہجہ اتنا انوکھا اور پر لطف تھا کہ جی چاہتا، انگریزی زبان کے سارے مستعمل لہجے (Accents) فراموش کر دیئے جائیں اور اسی کا اسلوب اختیار کر لیا جائے ــــــ وہ باتوں کے درمیان تالی بجا کر، پلکیں جھپکاتے ہوئے ای یا۔ ای یا (ہاں۔ ہاں)، کبھی اور دونوں ہاتھ اپنی رانوں پر رکھ کر ہنسنے لگ جاتی ــــــ جب وہ اس طرح بولنے لگتی تو مجھے جنوبی کیرالا کی عورتوں کا لب و لہجہ یاد آجاتا۔ وہ بھی ایسی ہی ہوتی ہیں، پیاری پیاری اور معمولی جملوں میں بھی مٹھاس گھول دیتی ہیں۔

منو کے پاس موضوعات کی کمی نہ تھی، اور ہر بات میں اس کی رائے منفرد ہوتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ آسمان ایک وسیع نیلا سمندر ہے۔ اسے میرا کالا رنگ بے حد پسند تھا۔ اس کی ایک تھیوری یہ بھی تھی کہ یورپ کے باشندوں کے آبا پہلے ہندوستان میں تھے۔ پھر وہ وہاں سے یورپ چلے گئے۔ اپنی تھیوری کو ثابت کرنے کے لئے وہ دلیل پیش کرتی ــــــ جہاں قدرت نے اتنی فیاضی سے اپنے خزانے لٹائے ہوں، وہاں سب سے پہلے انسان کا پیدا ہونا بالکل فطری ہے۔ بالآخر، میرے ہاتھ اپنے گلے سے لگا کر یہ ظاہر ہو بتاتے ہوئے کہ اس طویل عرصہ میں وقت نے ہمارے رنگوں میں کتنی تبدیلی پیدا کر دی ہے اپنی بات ختم کر دیتی۔ جب وہ ایسی باتیں کرنے لگتی تو اس کے ساتھ بحث کرنا بے کار ہوتا کیونکہ اگر میں ذرا بھی اختلاف کرتا یا ناپسندیدگی کا اظہار کرتا تو وہ ایک دم موضوع ہی بدل دیتی، اس سے تو یہی اچھا ہوتا کہ اس کے خیالات کی رو میں بہہ کر سب کچھ بھلا دیا جائے۔ ایسے ضبط اور صبر کا معقول پھل بھی ملتا، ہر دفعہ بالکل انوکھا اور غیر متوقع!

متعدد ملاقاتوں کے باوجود میں یہ نہ جان سکا کہ وہ کرتی کیا ہے۔ اسی سے صاف صاف پوچھنا بھی مشکل تھا۔ ایک دفعہ اس نے خود بخود کہا تھا: "میں مصوری جانتی ہوں۔ اسی کے مطالعہ کے لئے انگلینڈ آئی ہوں۔" اور میں سوچتا، جو شخص سچ مچ مصوری کی مشق کرنا چاہتا ہے وہ پیرس اور اٹلی کے مختلف شہروں میں جائے گا انگلینڈ کیوں آئے گا؟ میرا مطلب یہ نہیں کہ اس نے یوں ہی کچھ کہہ دیا ہو مگر وہ تصورات کو واقعات میں کچھ اس طرح ملا دیتی کہ اس کی باتوں کے لفظی مطالب پر اکتفا کرنا صرف مشکل [illegible]

ایک بار [illegible] پریشان ہو گیا کیونکہ میں نے [illegible] کی ہری بیلیں اس پر چڑھی تھیں۔ اور [illegible] اس کے چہرے پر معصوم سادگی لئے ہوئے بیٹھے تھے [illegible] جذبے کو کنٹرول پہنچا ہو، تاہم [illegible] نچلا ہونٹ ذرا دائیں طرف کر کے [illegible] ایک بار تو وہ اتنی دیر تک سانس روک کر بیٹھ [illegible] تھا ایسے [illegible] کو کون پسند نہیں کرے گا!

سات آٹھ دن بعد جب وہ ملی تو اس کے ہاتھ میں [illegible] ایک تھیلی تھی۔ اس نے تھیلی سے ایک تصویر نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دی۔ [illegible] کی جاپانی مصوری کے ڈھنگ کی ایک سیدھی سادی تصویر۔ جس میں ایک سفید پرندہ پر پھیلائے، دایاں پاؤں اٹھائے محو رقص تھا۔ یہ تو اس تصویر کی بہت خشک تشریح ہو گی۔ دراصل وہ تصویر اتنی حسین تھی کہ محسوس ہوتا کہ وہ پرندہ ابھی اپنا اوپر اٹھا پاؤں نیچے رکھ، دوسرا اٹھا کر پھر ناچنے لگ جائے گا۔ دیر تک میں تصویر کو دیکھتا رہا۔ پھر جو نہیں کرنا چاہیے تھا ــــــ منو کے ساتھ کبھی نہیں کرنا چاہیے تھا ــــــ وہی میں نے کیا۔ میں نے پوچھا

"یہ تصویر تم نے بنائی ہے؟"

اس نے ہولے سے تصویر میرے ہاتھ سے لی اور پھاڑ کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ اس وقت اس کا چہرہ جذبات سے بالکل عاری تھا۔ تب اگر وہ ناراض ہو جاتی، طیش میں آ کر مجھے ذلیل کر دیتی تو مجھے اچھا لگتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔

اس کے بعد وہ مجھے پھر کبھی نہیں دکھائی دی۔

افسانہ ہی لکھنا مقصود ہوتا تو اسے یہاں ختم ہو جانا چاہیئے تھا۔ لیکن حقیقی زندگی کی باتیں اس طرح ختم نہیں ہو جاتیں۔ ایک سے دوسری بات پیدا ہوتی ہے۔ بالکل بانس کی طرح اور یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اصل کہانی کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں ختم ہوتی ہے۔ ہینڈ کی وہ سب پر لیٹے لیٹے منو نے ایک بار مجھ سے کہا تھا، "سبھی باتیں ایک ہی وقت ہوتی رہتی ہیں۔" میں حالانکہ فلسفہ کا طالب علم تھا پھر بھی اس جملہ کا مطلب فوراً نہیں سمجھ سکا تھا۔ [illegible] یوں تھا میں بولتی ہوں اور ہوائیں انہیں اٹھا لیتی ہیں۔ وہ کہاں جاتی ہیں [illegible]

کچھ اکٹھا ہو جاتی ہیں، کچھ ٹھٹک جاتی ہیں۔ لیکن کوئی مانع نہیں ہوتی۔ کیونکہ فطرت کا اصول تعاون ہے۔ مثلاً نہیں اور سبھی لہریں ہواہیں ایک ساتھ تیرتی رہتی ہیں، ہر وقت جو سنتا چاہتا ہے، اسے سنائی دیتی ہیں۔ بولتے بولتے وہ اتنی سنجیدہ ہو گئی کہ جیسے کائنات کی ان تمام لہروں کو سن رہی ہو۔

"تمہیں اس وقت کیا سنائی دے رہا ہے؟" میں نے بہت دھیرے سے پوچھا (اس کی بے خودی کا خیال رکھتے ہوئے۔)

اس نے فوراً جواب دیا، "چودہ سال کی عمر میں، ایک دفعہ، تم سمندر کے کنارے ریت میں بھٹک گئے تھے، راستہ بھول گئے تھے اور تمہاری توقع سے پہلے رات ہو گئی تھی اور اندھیرا چھانے لگا تھا۔ تب گھبرا کر تم مجھے پکارنے لگے تھے۔ وہی پکار میں سن رہی ہوں۔"

میں ایک دم چونکا کیوں کہ اس سے ملتا جلتا ایک واقعہ چھ سال پہلے پیش آیا تھا گنگا پور، میرے ننھیال میں، دیر سے لوٹنے کے سبب ڈانٹ بھی سننی پڑی تھی۔ تفصیل میں فرق صرف اتنا تھا کہ اس وقت میری عمر چودہ کی بجائے سولہ کی تھی اور میرے ساتھ میری پڑوسن نرملا — نما — تھی۔ میں نے پکارا تو کسی کو نہیں تھا مگر خوف زدہ من سے نما کے بارے میں — اس سے بھی زیادہ اس کے پتا کے بارے میں — سوچ رہا تھا۔ منو ویلا اور نرملا۔ ان ناموں میں کتنی مناسبت ہے۔

اور مجھے یقین ہو گیا کہ ہستیاں اور واقعات چند ہی ہوتے ہیں۔ اور ان میں ہی جدت پیدا کرنا ہمارا کام ہے۔ انہی چند سروں سے نئی نئی راگنیاں بنانی پڑتی ہیں۔ یہ بات منو کے لئے بالکل آسان تھی۔ کوئی بھی واقعہ اسے غیر متوقع نہیں لگتا تھا۔ ہر بات کو وہ بے ساختہ قبول کر لیتی ہے۔ انگریزی میں ''آل اِن اے ڈیز ورک (All 1n a day's work) کہتے ہیں۔ بالکل ویسے ہی۔ نتیجتاً اس کے دل میں کبھی تذبذب یا ہچکچاہٹ پیدا ہی نہ ہوتی تھی۔ یہ تذبذب یا ہچکچاہٹ جسے پیش نظر حقیقت کے انکار کے مترادف ہے۔ یہ اسے ناپسند ہی نہیں بلکہ اس کے لئے ناممکن سی بات تھی۔

کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے، منو کے برتاؤ کا جو مطلب میں نکال رہا ہوں کیا وہ صحیح ہے؟ کیا خود منو اس سے آگاہ تھی؟ دراصل ان سوالوں کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ گیان ہمیشہ بعد میں آتا ہے۔ اس سے پہلے تمام پہلوؤں پر کافی غور کرنا پڑتا ہے۔ روزمرہ کی زندگی اس کے لئے کبھی رک نہیں سکتی۔ منو یہ جان گئی تھی۔

چوانگ ژو اور ہوئی ژو ایک دن گھومتے گھومتے ہاؤ ندی کے پل پرا پہنچے۔ چوانگ ژو نے کہا، "دیکھو یہ چھوٹی چھوٹی مچھلیاں کس طرح، ادھر اُدھر تیر رہی ہیں۔ ان کو بڑا لطف آ رہا ہو گا، اس میں۔"

ہوئی ژو نے کہا، "تم مچھلی تو نہیں ہو، پھر تم یہ کیسے جان سکتے ہو کہ مچھلیوں کو کس بات میں لطف آتا ہے؟"

چوانگ ژو نے کہا، "تم 'میں' نہیں ہو۔ پھر یہ کیسے جانتے ہو کہ مچھلیوں کو کس بات میں لطف آتا ہے یہ میں نہیں جان سکتا؟"

ہوئی ژو نے کہا، "میں 'تم' نہیں ہوں، اس لئے اگر میں یہ نہیں جان سکتا کہ تم جانتے ہو کہ نہیں، تو واضح ہے کہ تم بھی یہ نہ جان سکو گے کہ مچھلیوں کو کس بات میں لطف آتا ہے۔ آخر میری ہی بات سچ نکلتی ہے نا؟"

چوانگ ژو نے کہا، "ہم پھر پہلے سے شروع کریں گے۔ تم نے مجھ سے پوچھا کہ میں یہ کیسے جان سکا کہ مچھلیوں کو کس بات میں لطف آتا ہے۔ لیکن جب تم نے یہ سوال کیا تبھی تم اس کا جواب بھی جان گئے تھے۔ اتنا ہی نہیں، ہاؤ ندی کے پل پر اس طرح کھڑے ہوتے ہی تم وہ سب کچھ سمجھ چکے تھے۔"

عام زندگی کے فلسفہ کا بھی یہی حال ہے۔ وہ بحث کرنے سے حاصل نہیں ہوتا۔

شاید اسی لئے منو، خود کوئی سوال نہ کرتی تھی۔ اور اگر کبھی کر بھی دیتی تو سوال نہ صرف خود کلامی کے انداز میں ہوتا بلکہ ساتھ ہی جواب بھی اسی کی زبان سے نکل جاتا۔ سوال کے معنی ہیں وہم، وسوسہ، اسی لئے وہ سوالوں سے پرہیز کرتی تھی۔ صرف ایک بار، اس نے میرے بارے میں ایک سوال کیا تھا: "تم کیا بننے والے ہو؟"

میں نے سادگی سے جواب دیا: "میسور لوٹنے کے بعد میں مہاراجہ کالج میں پروفیسر بننے والا ہوں۔ اسی لئے ہماری سرکار نے مجھے اسکالرشپ دے کر یہاں بھیجا ہے اور میں فلسفہ سے متعلق بہت کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔"

دیر تک وہ کچھ نہ بولی۔ میں سمجھا کہ وہ اداس ہو گئی ہے۔ کیونکہ میرے جواب میں ہماری جدائی کی طرف اشارہ تھا۔

"تم رو تپ بننا نہیں چاہتے؟" تھوڑی دیر بعد وہ صرف اتنا پوچھ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور چلنے کی تیاری کرنے لگی۔

اس سوال کا مطلب کئی دنوں بعد میری سمجھ میں آیا۔ بن جانے کا مطلب ہے، جو ہے اسے پھولنے پھلنے کا موقع دینا۔ اس کے لئے محنت کی ضرورت نہیں ہوتی، پر انتخاب ٹھیک ہونا چاہیئے۔ من پسند کام کرتے ہوئے تکان کا احساس نہیں ہوتا۔ سب کچھ جیسے خود بخود ہو جاتا ہے۔ ساری قوتیں مل کر کام کرتی ہیں۔ ریل گاڑی کا پانچ منٹ کا انتظار برداشت سے باہر ہوتا ہے۔ لیکن محبوب کا انتظار کتنی بھی دیر کیوں نہ کرنا پڑے، چاہے ہم کو تشویش ہو لیکن تکان محسوس نہیں ہوتی۔ ایسے ہی ایک دفعہ مجھے جو برن اسٹیشن پہنچنے میں آدھ گھنٹے کی دیر ہو گئی۔

میں تھوڑی سی میں بہت ڈر گیا تھا لیکن منو کے رویے میں میرے پریشان من کو جیسے سہلا کر شانت کر دیا۔

"مجھے کتنی دیر ہو گئی؟" میں نے کہا۔

اس نے کہا: "نہیں تو۔ تم تو یہیں تھے۔ تھوڑی دیر تم دوستوں نے اس ستون سے آنکھ مچولی کھیلتے رہے تھے۔ کئی بار تو تم نے میرے پاس کی ایک [illegible] بن کر مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی تھی۔ ابھی ابھی تو تم ایک ننھا سا بچہ بن کر میری ٹانگوں سے لپٹ گئے تھے۔"

اور وہ یہ سب اتنی سادگی اور خلوص سے کہہ گئی کہ ہم دونوں کھلکھلا پڑے۔ اس کا برتاؤ ہمیشہ ہی اس طرح بے ساختہ اور بے لوث ہوتا۔ اسی وجہ سے کبھی کبھی یہ سمجھ میں نہ آتا کہ اس سے کس طرح پیش آیا جائے۔ ہمارے تجربات میں جیسے جیسے اضافہ ہوتا ہے ویسے ویسے ہمارے عمل اور تعلقات میں الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ جیسے ساری جد و جہد معاشرے کے مسائل حل کرنے اور ان حلوں کو آزمانے کے لئے ہو۔ ہم اپنے آپ کو سمجھا لیتے ہیں کہ اس کے بغیر سماج کی گاڑی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ ہر بات پر ہر بار نئے سرے سے غور کر کے فیصلہ کرنا ہو تو کوئی بھی پاگل ہو جائے لیکن منو کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب بے کار ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اپنی مرضی پر چلنا ہو تو بہانے تراشنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی مگر اوروں کی مرضی پر چلنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ تب ہمیشہ یہی دیکھتے ہیں کہ کون سی بات کس رواج کی رو سے بالکل ٹھیک ہے۔ وہ بات ہمیں پسند ہے کہ نہیں، یہ خیال ہی نہیں آتا۔

ان دنوں ہم آئرلینڈ گئے ہوئے تھے۔ ایک دفعہ منو باتیں کرتے کرتے یوں ہی اٹھی اور بلا جھجک اپنے سادے کپڑے اتار لاک آلن ( ) کے پانی میں اتر گئی۔ تیرنا تو مجھے بھی آتا تھا لیکن اس کی اس حرکت سے اتنا حیران ہوا کہ کچھ دیر تک مجھ سے ہلا بھی نہ گیا۔ کوئی دیکھ لے گا تو کیا ہوگا؟ اس خیال سے میں اتنا گھبرا گیا کہ وہ پانی میں کتنی حسین لگ رہی تھی اور پانی سے باہر آنے کے بعد جب وہ بڑے اطمینان سے کچھ دیر تک آنگرے کی لا سورس[1] کی طرح جو کھڑی ہو گئی تو کس طرح حسین تر لگ رہی تھی۔ یہ سب مجھے صرف ایک خواب سا لگ رہا تھا۔ نتیجتاً جو حقیقت میرے سامنے تھی اسے قبول کر لینے کی ہمت نہ ہوئی۔ اگر وہ ویسے ہی دوڑ کر مجھ پر نہ آگرتی، تو یہ حقیقت کبھی میرے ہاتھ نہ آتی......

ایک [illegible]

نے اس سے پوچھا: "بولو [illegible]"

اس غیر متوقع کرم سے [illegible] مجھے تو کچھ کہنا نہیں سوجھتا۔ میں [illegible] ہوگا، بڑوں کی راستے میں ہوگی۔"

جگوان نے کہا: "ٹھیک ہے۔"

دوسرے دن وہ [illegible] بار خوش ہونے والے جگوان دوبارہ [illegible] کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے [illegible]

منو ماضی یا مستقبل کا ذکر شاذ و نادر ہی کرتی۔ شاید اسے اس کا مکمل احساس تھا کہ ہر لمحہ دوسرے سے بالکل مختلف ہوتا ہے [illegible] چاہیئے۔ اور اسی لئے وہ ہمیشہ خوش رہتی تھی۔ [illegible] اور اسی وجہ سے وہ مناسب بھی ہوتی۔ مور کی تصویر [illegible] کیوں نہیں ملی؟ اس سے متعلق میں جب بھی سوچتا ہوں، مجھے یہی لگتا ہے کہ اس کی یہ حرکت اس کے عام رویہ کے خلاف تھی۔ میرے [illegible] مجھ پر سے اس کا اعتماد اٹھ گیا۔ اس نے جو خواہش کی [illegible] ایسے عمومی خیالات تو آتے ہیں لیکن گہرائی سے غور کرنے پر اس کا کچھ اور ہی مطلب نکلتا ہے۔ اس کی نظر میں اہمیت احساسات کی تھی [illegible] ان باتوں کی تھی کہ وہ کیسی تھی، کیا بتاتی تھی۔ اس کے بعد وہ مجھ سے نہیں ملی۔ اس کا اس حادثے سے کوئی تعلق ہی نہیں رہا ہوگا۔ نہیں تھا، ایسا محسوس ہوتا ہے۔

منو کی اس غیر متوقع جدائی سے مجھے دنیا خالی خالی نظر آنے لگی۔ کیا کیا جائے، سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اس وقت، خوش قسمتی سے میرا امتحان قریب آ پہنچا تھا۔ میں نے مطالعہ میں من لگا کر سب کچھ بھلا دینے کا عزم [illegible] بھی کر سکا۔ لیکن چین کہاں، کبھی لگتا کہ اس کی تلاش کرنا میرا فرض ہے، اتنے گہرے مراسم کے باوجود، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو، اس طرح حالات کے سامنے گھٹنے ٹیک دینا احسان فراموشی لگتا۔ یہ بھی خیال آتا کہ کہیں وہ اس دنیا ہی کو چھوڑ کر تو نہیں چلی گئی؟ اور میں مغموم ہو جاتا۔ اور کبھی کبھی لگتا کہ اب قسمت کے کھیل دیکھنے سے کیا فائدہ؟ میری انا بھی اس خیال کا ساتھ دیتی۔ میں نے ایسا کیا کیا تھا کہ وہ [illegible] رشتے ہی توڑ دینے پر تل گئی؟ اس کے جنون [illegible] ہوں؟ پہلے خیال میں محبت کی وسعت کی [illegible]

میں سمجھتا ہوں، جب تک سب ٹھیک طرح [illegible]

---

[1] آنگرے کی ایک مشہور پینٹنگ

ضرورت محسوس نہیں ہوتی یا خیالات آتے ہی نہیں۔ جب گاڑی رک جاتی ہے تو فلسفیانہ باتیں بچکانی لگتی ہیں۔ میں منو کا قائل اس وجہ سے ہوں کہ اسے ایسے فلسفوں کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ویسے دیکھا جائے تو اس کی زندگی 'جیو دھرم' کی راہ پر گامزن تھی۔ جیو دھرم کا راز صدا کی بازگشت اور سوال کا جواب مہیا کرنے میں پنہاں ہے۔ اس میں 'یہ میرا ہے یہ پرایا'، اس قسم کے خیالات کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ شکار اور شکاری کی، پیرو مرید کی، عاشق و معشوق کی، قاتل و مقتول کی یکتائی جیو دھرم کا بنیادی اصول ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس کا سلوک کبھی بے جا نہ لگے ہمیشہ ہی معقول و مناسب ہو وہ شخص اس راز کو سمجھ سکتا ہے۔ ایسے شخص کے قول و فعل میں اکثر تضاد نہیں ہوتا۔ منو جب گھنٹوں مجھ سے اس پر لپٹی رہتی، یا بچوں کی بھیڑ میں مل کر خود ایک بچہ بن جاتی یا اپنی کچھ موٹی سی انگلیوں کی قینچی میں میرے بال پکڑ کر ایک ساتھ ہنستے اور روتے ہوئے نیچے جھک کر میری جان ہی لے لیتی تب میں اس راز کو کچھ کچھ سمجھ پاتا۔ وہ ہر لمحے کو اپنا لیتی اور اس میں ایک انوکھا حسن بھر دیتی۔

ایک دفعہ اس نے کہا تھا: "مجھے بہت کچھ سیکھنا ہے۔"

میں نے پوچھا: "کیا سیکھنا ہے؟"

اس نے کہا: "سب۔ سبھی سے۔ سیکھنے کے لئے کسی خاص موضوع کی ضرورت ہے، ایسا تو نہیں۔ کل میں نے ایک لڑکے سے کاغذ کا ہوائی جہاز بنانا سیکھا۔ ٹھہرو، ابھی ایک تمہیں بنا کر دیتی ہوں۔ اور وہ میری میز پر سے کاغذ اٹھا کر سچ مچ جہاز بنانے لگی۔ اس وقت وہ بالکل ایک سات آٹھ سال کا بچہ لگ رہی تھی۔

"مجھ سے تم نے کیا سیکھا؟" میں نے پوچھا۔

"خود فراموشی۔" اس نے میرے دونوں ہاتھوں کو اپنے زانو پر رکھ کر اپنی بڑی بڑی آنکھوں کی گہرائیوں میں مجھے ڈبو لیا اور کہا۔ "ایک زمانہ تھا، روپ، جب میں بہت مغرور تھی۔ لیکن تمہیں دیکھا اور بدل گئی، ہمیشہ کے لئے۔"

میں نے کہا: "تم سدا سے یوں ہی ہو۔ مجھے مفت میں بزرگی دے کر میرا افتخار بڑھا رہی ہو۔"

اس نے کہا: "تم ابھی میرے بارے میں نہیں جانتے۔ کبھی نہ کبھی جان جاؤ گے۔ جو سچ مچ دیتا ہے وہ اپنے احسان کو نہیں پہچانتا۔"

پھر میں نے کہا: "میں نے بھی تم سے سیکھا ہے۔"

اس نے کہا: "ہاں میں جانتی ہوں۔ فضول گوئی۔"

"نہیں۔ پریوں کی کہانی والی سب سے چھوٹی شہزادی کی طرح معصوم رہنا۔"

میں نے کہا۔

سنکر وہ صرف مسکرائی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے اس کو کوٹ پہناتے ہوئے اس کے بائیں کندھے پر اپنی ٹھوڑی ٹکا دی۔ لمحہ بھر کو اس نے میرا بایاں ہاتھ لے کر اپنے دل پر زور سے دبا لیا اور اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے میرا بایاں گال سہلا دیا اور چل گئی۔ ایسا سکھ میں نے کبھی نہیں پایا تھا۔ . . . . . .

خوشی اگر ایک دلی کیفیت ہے تو راحت زندگی کا لمحاتی عرفان ہے۔ کوشش سے خوشی کو پا لیا جا سکتا ہے، مگر راحت؛ وہ کہاں اور کب نصیب ہوگی نہیں کہا جا سکتا۔

امتحان کے ختم ہونے پر میں منو کی تلاش میں ویانا جا رہا تھا۔ سفر کے دوران کے ایک واقعہ کی یاد آتی ہے۔ گاڑی میں کافی بھیڑ تھی۔ میرے ساتھ میں ایک سترہ اٹھارہ سال کی لڑکی بیٹھی تھی۔ اتنی دور کا سفر، وہ بھی تنہا، شاید وہ پہلی بار کر رہی تھی۔ اندھیرا چھانے لگا تو سبھی مسافر بیٹھے بیٹھے جھپکیاں لینے لگے۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ ویسے مجھے ریل گاڑی میں کبھی نیند نہیں آتی۔ پھر بھی لگتا ہے میں کچھ دیر سو گیا تھا۔ کیونکہ جب میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ وہ لڑکی میرے کندھے پر سر رکھ کر گہری نیند سو گئی ہے۔ یکایک مجھے لگا کہ اس کے ساتھ ایکدم غائب ہو جاؤں ـــــــــ اپنائیت کی باڑھ میں بہہ جاؤں۔ میں ویسے ہی بیٹھا رہا۔ ہلا تک نہیں، تاکہ اس کی نیند نہ ٹوٹ جائے۔ مجھے یاد آیا کہ کرن[1] نے پرشورام کو سونے کے لئے اپنا زانو پیش کیا تھا۔ ساری رات میں نے ویسے ہی بتا دی۔ اس وقت میں نے جو کچھ محسوس کیا اور آج صرف اس کی یاد سے بھی جو کچھ محسوس کرتا ہوں اسے میں راحت کہوں گا۔ یہ واقعہ اگر منو کو سناتا تو وہ خوش ہوتی، مجھے سراہتی۔

میں ویانا میں چار پانچ دن رہا۔ وہاں کے محلات، میوزیم سبھی دیکھے، عام لوگ جو کچھ کرتے ہیں وہ سب کیا ـــــــــ کچھ بھی باقی نہ رہا۔ اور ایک دن اچانک راحت کا ایک لمحہ اور آیا۔ شہر ویانا ڈینیوب کے ساحل پر واقع ہے۔ جرمنی کے گھنے جنگلوں میں جنم لے کر خلیج اسود میں جا ملنے تک یہ دریا اتنے خطوں سے گزرتا اور اسے سرسبز و شاداب کرتا ہے کہ اسے مادر یورپ وسطی کہنا چاہیئے۔ آریوں کے لئے تو وہ مادر اول ہے۔ کیونکہ، تاریخ شاہد ہے کہ اس کی وادیاں آریوں کا گہوارہ رہی ہیں۔

---

[1] پرشورام کرن (کرن) کے گرو ہیں۔ ایک دن وہ کرن کے زانو پر سر رکھ کر سو گئے۔ جب وہ گہری نیند میں تھے تب کرن کی زانو میں ایک بھنورے نے کاٹ لیا اور خون بہنے لگا۔ لیکن کرن نہ ہلا تاکہ گرو کی نیند نہ ٹوٹ جائے۔

دریا میں تفریح کے لئے چھوٹی بڑی کشتیاں ملتی ہیں۔ اس دن جلی صبح، میں ہوٹل کے سامنے ساحل پر کھڑا لہروں کا کھیل دیکھ رہا تھا اور ناؤ کا انتظار کر رہا تھا۔ اتنے میں پیچھے سے کسی نے کہا: "ہمارے ساتھ چلیں گے آپ؟ ہمیں بہت خوشی ہوگی!"

میں نے مڑ کر دیکھا۔ کشتی میں ایک جوان جوڑا تھا۔ لڑکی کے پیلے لباس پر نیلے اور قرمزی پھول تھے۔ بالوں پر ہلکے جامنی رنگ کا ایک ریشمی رومال بندھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہیمپر (HAMPER) تھا۔ وہ دونوں بہت خوش تھے، ان کے چہروں پر اتنا پیار بھرا اصرار تھا کہ میں بلا پس و پیش کشتی میں سوار ہو گیا۔ کسی بھی طرح کی بھی پوچھ تاچھ کئے بغیر اتنے پیار اور سلیقے سے پیش آنے والے لوگ یورپ میں اکثر مل جاتے ہیں۔ یہ ان کی خوش اخلاقی کی عظمت ہے۔ کشتی پر ہم نے خوب باتیں کیں۔ بڑا فراخ دل تھا۔ وہ نوجوان۔ ہم لوگ جنگلے پر جھکے باتیں کر رہے تھے۔ اس نے دریا میں مجھ سے پوچھا: "دریا کا پانی آپ کو کس رنگ کا دکھائی دے رہا ہے؟"

"میں نے کہا: نیلا"

"تب تو واقعی آپ عاشق مزاج ہیں" وہ چہکا۔

"مجھے تو یہ پانی سبز نظر آتا ہے" لڑکی نے ایک نقلی آہ بھر کر کہا: "مجھ سے کوئی بھی پیار نہیں کرتا!"

اس پر وہ دونوں کھلکھلا پڑے۔ تب تک میں ان سے کافی گھل مل گیا تھا۔ میں بھی ہنس پڑا۔ ہیوگو ڈینیوب کی یہ شاعری کتنی سادہ مگر کتنی موثر ہے، دل کو چھو لینے والی! دریا کا پانی تو ہر کسی کو نیلا ہی نظر آتا ہے۔ مگر روایت یہی ہے کہ وہ صرف عاشق مزاجوں کو ہی نیلا نظر آتا ہے۔ جس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ سبھی پریمی ہیں۔ کیا یہ آفاقی محبت حسین شاعری کی عظیم مثال نہیں! اس وقت سے میں محسوس کرنے لگا کہ منو میرے پاس ہی ہے یا میرے آس پاس چل پھر رہی ہے۔ ہر طرف اس کا روپ نظر آنے لگا۔ اور میرا من شانت ہو گیا۔ مجھ پر سب کچھ واضح ہو گیا۔ اور میں اپنے جوان دوستوں کی صحبت میں سب کچھ بھول گیا۔ کشتی جب کنارے پر پہنچی تو پھر ملنے کا وعدہ کر کے ہم ایک دوسرے سے علیحدہ ہوئے۔ جاتے جاتے، اچانک، اس لڑکی نے جھک کر میرا بایاں گال چوم لیا۔ پیار کا ایسا غیر مصنوعی روپ میں نہیں جانتا تھا۔

منو اب صرف میری ہی نہ رہی تھی، سب کی ہو گئی تھی۔ اور اسی سبب میں اس سے قریب تر ہو گیا تھا۔ فوراً ہوٹل لوٹنے کی چاہ نہ رہی۔ میں محسوس کرنے لگا کہ میں کائنات کے ذرے ذرے میں موجود ہوں ———— ہر ایک کا بھید جانتا ہوں۔ گاڑیوں کی ریل پیل، سڑک کی چہل پہل اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چلتے ہوئے جوڑوں کے دل کی دھڑکنوں کو میں محسوس کر رہا تھا۔ دونوں ہاتھ نیکر کی جیبوں میں ڈال کر، سیٹی بجاتے ہوئے اپنی ہی شان سے چلتا ہوا لڑکا، سڑک پر [illegible] کے درمیان میں رک رک کر پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوا، کسی جانی پہچانی دنیا کا لگتا تھا۔ منو اس پر ہنسے، یوں سمجھ کر جلد جلد قدم اٹھاتے نوکری پر جاتی ہوئی لڑکی ———— ان سب کے احساسات کو میں محسوس کر رہا تھا۔ مجھے ان سب میں جذب ہو کر حظ حاصل کرنا تھا۔

منو کی زندگی کے راز کو میں نے ان سب کے بیچ سمجھا۔ چھ مہینے کے عرصے میں اس نے مجھے جنت اور دوزخ کے تمام راستے بتا دیئے تھے۔ دینے لینے کے عرصے میں کچھ بھی باقی نہیں رکھا تھا۔ طوفانی سمندر کا بہاؤ اور صبح کی رات کا سکوت، مونا لیزا کی مسکراہٹ اور ٹیس کے آنسو۔ آسمان سے باتیں کرتے اونچے پیڑ اور صبح کی اوس میں بھیگی گھاس کے پھول ———— ان سب کے راز اس نے مجھ پر فاش کر دیئے تھے۔ ایک طرف منو میرا کرشن تھی۔ کرشن، رادھا کی ہر ذہنی کیفیت میں اس کا ساتھ دیتے تھے۔ اس کے لئے چھوٹے بنتے تھے اور بڑے بھی۔ منو کے سلوک میں بھی وہی خصوصیت تھی۔ کرشن متھرا چلے گئے اور رادھا کی زندگی ختم ہو گئی ——— ختم ہو گئی، ایسا ہم سمجھتے ہیں۔ مگر حقیقتاً ایسا ہوا نہیں، تب رادھا خود کرشن بن گئی تھی۔ دراصل اس کی حقیقی زندگی کا آغاز وہیں سے ہوا تھا۔

میں ہوٹل میں داخل ہو کر لفٹ کی جانب بڑھ رہا تھا۔ پورٹر نے ایک لفافہ اور ایک چھوٹا سا پارسل مجھے تھما دیا۔ میری بینک نے یہ دونوں چیزیں اس پتہ پر بھجوائی تھیں۔

کمرے میں بیٹھ کر اطمینان سے میں نے لفافہ کھولا۔ خط میں دن یا مقام کا ذکر نہیں تھا۔ پیلا سا، چکنا کاغذ اور اس پر پیارے پیارے حروف جن کا میں اتنا عادی ہو گیا تھا کہ وہ مجھے اپنے سے لگتے تھے۔ اتنا لمبا خط منو نے پہلے کبھی لکھا نہیں تھا۔ دوسرا جملہ بھی وہ شاذ و نادر ہی لکھا کرتی۔ تصویری کارڈ پر صرف پتہ اور نیچے بہت سادی حسین لکیروں کے درمیان نازک پھولوں کی طرح جھانکتے ہوئے اس کے نام کے حروف، بس! لیکن آج خط بالکل مختلف تھا، دونوں طرف لکھے آٹھ ورق، جن میں مانو اس کی زندگی کا نچوڑ تھا۔

"مجھے پورا یقین ہے کہ اس خط کو پڑھ کر تمہیں حیرت نہ ہوگی۔ اب تک تم متوازن ذہن سے دنیا سے سنگھرش کرنے کو تیار ہو چکے ہو گے اور شاید مجھے بھول بھی چکے ہو گے۔ لیکن جہاں میں ہوں، وہاں تم ہی تم ہو۔

"آج میں جو کچھ لکھنے والی ہوں، اسے تم شاید خط نہ مانو گے۔ کبھی میں نے اپنے دل سے جو وعدہ کیا تھا، اسے آج پورا کر رہی ہوں۔

"میری ماں مجھے جنم دیتے ہی اس دنیا کو چھوڑ کر چلی گئی۔ وہ پہلی لڑائی کے

وہ تھے۔ جب میں دو سال کی تھی تو پتا جی بھی چل بسے۔ اس لئے میری پرورش میری خالہ کے ہاں ہوئی۔ خالو میرے سالگرہ گئے ہیں۔ اور میں بھی اسی کنبہ کا ایک فرد بن گئی۔ میری زندگی کے وہ دن ایسے تھے کہ ہر کسی کو رشک آئے۔ میری ہر چاہ پوری کی جاتی تھی۔ خالہ کے اپنے بھی بچے تھے ——— دو لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ لیکن کسی نے کبھی ہم میں امتیاز نہیں کیا۔ میں سب سے چھوٹی تھی اس لئے میرا لاڈ پیار زیادہ ہوتا تھا۔ خالو آرکیٹیکٹ تھے۔ جنگ ختم ہوئی تو انہیں اچھے کام ملنے لگے۔ سکھ کے دن آ گئے۔ کارل، میرا بھائی، ویانا میں پڑھ رہا تھا۔ میری بہنوں کی شادی جلد ہی ہو گئی اور وہ اپنے شوہروں کے ساتھ چلی گئیں۔ اس وقت طے پایا کہ مجھے سوئٹزر لینڈ کی ایک مشن سکول میں بھیجا جائے۔ اس وقت میرا پندرہواں سال ختم ہو چکا تھا اور میں سولہویں میں قدم رکھ چکی تھی۔

"یہ سکول انٹرلاکن کے پاس بستی سے تھوڑی دور ہے۔ اس سکول میں میں نے صرف دو ہی باتیں سیکھیں ——— چوری چھپے تیرنا اور فرنچ ٹیچر سے پیار کرنا۔ سسٹر ہیلینا اتنی خوبصورت تھیں کہ ہر بار، ان کی طرف دیکھتے ہی میرے دل کی دھڑکن بند ہو جاتی ——— اور پھر دگنی تیزی سے شروع ہو جاتی۔ ونیس دے میلو کو اگر راہبہ کا لمبا گاؤن پہنا دیا جائے تو وہ جیسی لگتی، ویسی ہی تھیں وہ۔ ان کے بولنے کا انداز اتنا شاندار اور پُر وقار تھا کہ جب وہ بولنے لگتیں تو جی چاہتا کہ ان کے گاؤن کی بانہہ پر گال ملتے سنتے ہی رہ جائیں۔ اور ان کا سلوک، ہر ایک کے ساتھ، اتنا پیار بھرا ہوتا کہ سبھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے کہ وہ صرف اسی سے پیار کرتی ہیں۔ بس! اس بات کو لے کر، لڑکیوں میں، آئے دن جھگڑے بھی ہوا کرتے تھے۔

ایک رات جب سناٹا چھا گیا تو میں کھڑکی سے کود کر جھیل کے کنارے، اپنی مخصوص جگہ پر پہنچ گئی، تیرنے کے لئے۔ گرمی کے دن تھے۔ اس موسم میں من ہی من ارمانوں کی دنیا سجانے اور رات کو جھیل کے پانی میں دھینگا مشتی کر کے سب کچھ بھلا دینے سے بڑھ کر کون سا سکھ ہو سکتا ہے؟ ایسے وقت پانی کے ذرات جیسے جسم کے ہر مسام کو کھول کر زندگی میں ایک انوکھا پن بھر دیتے ہیں۔ میں سمجھتی تھی کہ وہ مقام بالکل خفیہ ہے، صرف میرا۔ لیکن اس دن وہاں کوئی اور آ گیا تھا۔ مجھ سے بھی پہلے۔ کیونکہ پانی میں چل رہے مشاق ہاتھوں کی آواز سنائی دے رہی تھی میں گھبرا تو گئی لیکن لوٹتے نہیں بن رہا تھا۔ اور اس نئے شخص کو دیکھنے کی آرزو پیدا ہوئی۔ میں ایک درخت کی اوٹ سے، چھپ کر، دیکھنے لگی ——— آواز رک گئی۔ پھر ساحل پر ایک سایہ نمودار ہوا۔ دور سے اسے پہچاننا ممکن نہ تھا۔ لیکن اتنا صاف ظاہر تھا کہ وہ بھی میری طرح آئی ہوئی تنہا عورت ہے۔ دھیرے

دھیرے وہ میرے قریب آنے لگی، میں بھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔ دفعتاً میرے دل کی دھڑکن رک گئی۔ پھر وہ دگنی تیزی سے شروع ہو گئی۔ میرے پاؤں جیسے زمین میں گڑ گئے۔ جی چاہا کہ چلا اٹھوں، زور سے ........ غیر ارادی طور پر دوڑ کر سسٹر ہیلینا کے پیروں سے لپٹ گئی تھی۔

وہ نہ چونکیں نہ گھبرائیں بلکہ بڑے اطمینان سے مجھے اوپر کھینچ لیا۔ اور "ذرا بیٹھو" کہہ کر کپڑے پہننے چلی گئیں۔ پہلے تو میں نے گھٹنوں میں سر چھپا لیا۔ پھر نہ جانے کیوں بلا جھجک سب دیکھنے لگی۔ رومال جیسے چھوٹے تولیے سے انہوں نے، بدن دھیرے دھیرے پونچھا۔ پھر کپڑے پہننے لگیں۔ ایک کے بعد ایک، جلدی جلدی مگر باقاعدہ۔ مجھے پتہ نہ تھا کہ گرجا میں رہنے والی عورتوں کے لئے اتنے سارے کپڑوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر ان ڈھیر سارے کپڑوں کے باوجود سسٹر ہیلینا ایک تازہ پھول کی مانند شاداب نظر آتی تھیں۔ کپڑے پہننے کے بعد بوٹ اور موزے اٹھا کر وہ میرے قریب آ گئیں۔ جی چاہا کہ جھپٹ کر ان کے ہاتھوں سے موزے اور بوٹ لے لوں اور انہیں پہنانے کے بہانے ان کے لال لال تلوؤں پر اپنے گالوں کو ملوں اور انہیں ہلکے سے چوم لوں۔ انہوں نے جیسے میرے دل کی بات جان لی ہو۔ بوٹ میرے سامنے رکھ دیئے اور تولیہ میرے ہاتھوں میں تھما دیا۔ میں نے ان کے پیر پونچھے، اپنی آرزو پوری کی پھر جوتے پہنا دیئے۔

پھر انہوں نے کہا۔ "تم پانی میں اترنا چاہتی ہو، چاہو تو اترو۔ میں یہیں ٹھہروں گی۔ میں نے پہلے سر ہلا کر انکار کر دیا ..... پھر ایکدم کہہ اٹھی، پھر کسی دن ہم دونوں ساتھ نہائیں گے۔"

اس کے بعد دیر تک ہم دونوں ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے بیٹھے رہے (اس رات کے بعد میں پھر پانی میں اتری تو لاک الن میں، جب تم میرے ساتھ تھے۔)

دوسرے دن میں جیسے ہوا میں تیر رہی تھی۔ میری ہر حرکت ایسی تھی جیسے میں نے دنیا بھر کی تمام خوشیاں پا لی ہوں۔ جماعت میں جب ہماری نظریں ملتیں میں من ہی من ناچ اٹھتی ........... میں ایک عالم بے خودی میں ڈوبی رہی۔

اس دن شام کی عبادت کے بعد سسٹر ہیلینا اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھیں۔ سب کی نظریں بچا کر میں ان کی طرف دوڑتی چلی گئی۔ رات کو کھانے سے فارغ ہونے کے بعد پچھلے میدان میں تھی کے پاس آ جانا۔ صرف اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھ گئیں۔ تب تک کیسے انتظار کروں؟ میں بے تاب ہو گئی۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں وہاں پہنچ گئی۔ ایک منٹ ............ دو منٹ ........ کیوں نہیں آئیں سسٹر ہیلینا ..........؟

دریا میں تفریح کے لئے چھوٹی بڑی کشتیاں ملتی ہیں۔ اس دن علی الصبح، میں ہوٹل کے سامنے ساحل پر کھڑا لہروں کا کھیل دیکھ رہا تھا اور ناؤ کا انتظار کر رہا تھا۔ اتنے میں پیچھے سے کسی نے کہا: "ہمارے ساتھ چلیں گے آپ؟ ہمیں بہت خوشی ہوگی!"

میں نے مڑ کر دیکھا۔ کشتی میں ایک جوان جوڑا تھا۔ لڑکی کے پیلے لباس پر نیلے اور قرمزی پھول تھے۔ بالوں پر ہلکے جامنی رنگ کا ایک ریشمی رومال بندھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہیمپر (HAMPER) تھا۔ وہ دونوں بہت خوش تھے، ان کے چہروں پر اتنا پیار بھرا اصرار تھا کہ میں بلا پس و پیش کشتی میں سوار ہو گیا۔ کسی بھی طرح کی بھی پوچھ تاچھ کئے بغیر اتنے پیار اور سلیقے سے پیش آنے والے لوگ یورپ میں اکثر مل جاتے ہیں۔ یہ ان کی خوش اخلاقی کی عظمت ہے۔ کشتی پر ہم نے خوب باتیں کیں۔ بڑا فراخ دل تھا۔ وہ نوجوان۔ ہم لوگ جنگلے پر جھکے باتیں کر رہے تھے۔ اس نے درمیان میں مجھ سے پوچھا۔ "دریا کا پانی آپ کو کس رنگ کا دکھائی دے رہا ہے؟"

"میں نے کہا: نیلا"

"تب تو واقعی آپ عاشق مزاج ہیں" وہ چہکا۔

"مجھے تو یہ پانی سبز نظر آتا ہے" لڑکی نے ایک نقلی آہ بھر کر کہا۔ "مجھ سے کوئی بھی پیار نہیں کرتا"

اس پر وہ دونوں کھلکھلا پڑے۔ تب تک میں ان سے کافی گھل مل گیا تھا۔ میں بھی ہنس پڑا۔ ہلکو ڈینیوب کی یہ شاعری کتنی سادہ مگر کتنی موثر ہے، دل کو چھو لینے والی! دریا کا پانی تو ہر کسی کو نیلا ہی نظر آتا ہے۔ مگر روایت یہی ہے کہ وہ صرف عاشق مزاجوں کو ہی نیلا نظر آتا ہے۔ جس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ سبھی پریمی ہیں۔ کیا یہ آفاقی محبت حسین شاعری کی عظیم مثال نہیں! اس وقت سے میں محسوس کرنے لگا کہ منو میرے پاس ہی ہے یا میرے آس پاس چل پھر رہی ہے۔ ہر طرف اس کا روپ نظر آنے لگا۔ اور میرا من شانت ہو گیا۔ مجھ پر سب کچھ واضح ہو گیا۔ اور میں اپنے جوان دوستوں کی صحبت میں سب کچھ بھول گیا۔ کشتی جب کنارے پر پہنچی تو پھر ملنے کا وعدہ کر کے ہم ایک دوسرے سے علحدہ ہوئے۔ جاتے جاتے، اچانک، اس لڑکی نے جھک کر میرا بایاں گال چوم لیا۔ پیار کا ایسا غیر مصنوعی روپ میں نہیں جانتا تھا۔

منو اب صرف میری ہی نہ رہی تھی، سب کی ہو گئی تھی۔ اور اسی سبب میں اس سے قریب تر ہو گیا تھا۔ فوراً ہوٹل لوٹنے کی چاہ نہ رہی۔ میں محسوس کرنے لگا کہ میں کائنات کے ذرے ذرے میں موجود ہوں ــــــــ ہر ایک کا بھید جانتا ہوں۔ گاڑیوں کی ریل پیل، سڑک کی چہل پہل اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چلتے ہوئے جوڑوں کے دل کی دھڑکنوں کو میں محسوس کر رہا تھا۔ دونوں ہاتھ نیکر کی جیبوں میں ڈال کر، سیٹی بجاتے ہوئے اپنی ہی شان سے چلتا ہوا لڑکا، سڑک پر گن گن کر قدم رکھتے ہوئے درمیان میں رک رک کر پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوا، نحیف جوان، ساری دنیا کا بوجھ مانو اس پر ہے، یوں سمجھ کر جلد جلد قدم اٹھاتے نوکری پر جاتی چھوٹی ٹپ ٹاپ لڑکی ــــــــ ان سب کے احساسات کو میں محسوس کر رہا تھا۔ مجھے ان سب میں جذب ہو کر حظ حاصل کرنا تھا۔

منو کی زندگی کے راز کو میں نے اسی لئے جانا۔ ساڑھے چار مہینے کے عرصے میں اس نے مجھے جنت اور دوزخ کے تمام راستے بتا دیئے تھے۔ دینے لینے کے عرصے میں کچھ بھی باقی نہیں رکھا تھا۔ طوفانی سمندر کا ہنگامہ، دوسرا کی رات کا سکوت، مونالیزا کی مسکراہٹ اور ٹیس کے آنسو۔ آسمان سے باتیں کرتے اونچے پیڑ اور صبح کی اوس میں بھیگی گھاس کے پھول ــــــــ ان سب کے راز اس نے مجھ پر فاش کر دیئے تھے۔ ایک طرف منو میرا کرشن تھی۔ کرشن، رادھا کی ہر ذہنی کیفیت میں اس کا ساتھ دیتے تھے۔ اس کے لئے چھوٹے بنتے تھے اور بڑے بھی۔ منو کے سلوک میں بھی وہی خصوصیت تھی۔ کرشن متھرا چلے گئے اور رادھا کی زندگی ختم ہو گئی ـــ ختم ہو گئی، ایسا ہم سمجھتے ہیں۔ مگر حقیقتاً ایسا ہوا نہیں، تب رادھا خود کرشن بن گئی تھی۔ دراصل اس کی حقیقی زندگی کا آغاز وہیں سے ہوا تھا۔

میں ہوٹل میں داخل ہو کر، لفٹ کی جانب بڑھ رہا تھا۔ پورٹر نے ایک لفافہ اور ایک چھوٹا سا پارسل مجھے تھما دیا۔ میری بینک نے یہ دونوں چیزیں اس پتہ پر بھجوائی تھیں۔

کمرے میں بیٹھ کر اطمینان سے میں نے لفافہ کھولا۔ خط میں دن یا مقام کا ذکر نہیں تھا۔ پیلا سا، چکنا کاغذ اور اس پر پیارے پیارے حروف جن کا میں اتنا عادی ہو گیا تھا کہ وہ مجھے اپنے سے لگتے تھے۔ اتنا لمبا خط منو نے پہلے کبھی لکھا نہیں تھا۔ دوسرا جملہ بھی وہ شاذ و نادر ہی لکھا کرتی۔ تصویری کارڈ پر صرف پتہ اور نیچے بہت سادی حسین لکیروں کے درمیان نازک پھولوں کی طرح جھانکتے ہوئے اس کے نام کے حروف، بس! لیکن آج خط بالکل مختلف تھا، دونوں طرف لکھے آٹھ ورق، جن میں مانو اس کی زندگی کا نچوڑ تھا۔

"مجھے پورا یقین ہے کہ اس خط کو پڑھ کر تمہیں حیرت نہ ہوگی۔ اب تک تم متوازن ذہن سے دنیا سے سنگھرش کرنے کو تیار ہو چکے ہو گے اور شاید مجھے بھول بھی چکے ہو گے۔ لیکن جہاں میں ہوں، وہاں تم ہی تم ہو۔

"آج میں جو کچھ لکھنے والی ہوں، اسے تم شاید خط نہ مانو گے۔ کبھی میں نے اپنے دل سے جو وعدہ کیا تھا، اسے آج پورا کر رہی ہوں۔

"میری ماں مجھے جنم دیتے ہی اس دنیا کو چھوڑ کر چلی گئی۔ وہ پہلی لڑائی کے

دن تھے۔ جب میں دو سال کی تھی تو پتا جی بھی چل بسے۔ اس لئے میری پرورش میری خالہ کے ہاں ہوئی، سالزبرگ میں۔ اور میں بھی اسی کنبہ کا ایک فرد بن گئی۔ میری زندگی کے وہ دن ایسے تھے کہ ہر کسی کو رشک آئے۔ میری ہر چاہ پوری کی جاتی تھی۔ خالہ کے اپنے بھی بچے تھے ——— دو لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ لیکن کسی نے کبھی ہم میں امتیاز نہیں کیا۔ میں سب سے چھوٹی تھی اس لئے میرا لاڈ پیار زیادہ ہوتا تھا۔ خالو آرکیٹیکٹ تھے۔ جنگ ختم ہوئی تو انہیں اچھے کام ملنے لگے۔ سکھ کے دن آ گئے۔ کارل، میرا بھائی، ویانا میں پڑھ رہا تھا۔ میری بہنوں کی شادی جلد ہی ہو گئی اور وہ اپنے شوہروں کے ساتھ چلی گئیں۔ اس وقت طے پایا کہ مجھے سوئٹزرلینڈ کی ایک مشن سکول میں بھیجا جائے۔ اس وقت میرا پندرہواں سال ختم ہو چکا تھا اور میں سولہویں میں قدم رکھ چکی تھی۔

"یہ سکول انٹرلاکن کے پاس بستی سے تھوڑی دور ہے۔ اس سکول میں میں نے صرف دو ہی باتیں سیکھیں ——— چوری چھپے تیرنا اور فرنچ ٹیچر سے پیار کرنا۔ سسٹر ہیلینا اتنی خوبصورت تھیں کہ ہر بار، ان کی طرف دیکھتے ہی میرے دل کی دھڑکن بند ہو جاتی ——— اور پھر دگنی تیزی سے شروع ہو جاتی۔ وینس دے میلو کو اگر راہبہ کا لبا گاؤن پہنا دیا جائے تو وہ جیسی لگتی، ویسی ہی تھیں وہ۔ ان کے بولنے کا انداز اتنا شاندار اور پُر وقار تھا کہ جب وہ بولنے لگتیں تو جی چاہتا کہ ان کے گاؤن کی بانہہ پر گال ملتے سنتے ہی رہ جائیں۔ اور ان کا سلوک، ہر ایک کے ساتھ، اتنا پیار بھرا ہوتا کہ سبھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے کہ وہ صرف اسی سے پیار کرتی ہیں۔ بس! اس بات کو لے کر، لڑکیوں میں، آئے دن جھگڑے بھی ہوا کرتے تھے۔

ایک رات جب سناٹا چھا گیا تو میں کھڑکی سے کود کر جھیل کے کنارے، اپنی مخصوص جگہ پر پہنچ گئی، تیرنے کے لئے۔ گرمی کے دن تھے۔ اس موسم میں من ہی من ارمانوں کی دنیا سجانے اور رات کو جھیل کے پانی میں دھینگا مشتی کر کے سب کچھ بھلا دینے سے بڑھ کر کون سا سکھ ہو سکتا ہے؛ ایسے وقت پانی کے ذرات جیسے جسم کے ہر مسام کو کھول کر زندگی میں ایک انوکھا پن بھر دیتے ہیں۔ میں سمجھتی تھی کہ وہ مقام بالکل خفیہ ہے، صرف میرا۔ لیکن اس دن وہاں کوئی اور آ گیا تھا۔ مجھ سے بھی پہلے۔ کیونکہ پانی میں چل رہے مشاق ہاتھوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں گھبرا تو گئی لیکن لوٹتے نہیں بن رہا تھا۔ اور اس نئے شخص کو دیکھنے کی آرزو پیدا ہوئی۔ میں ایک درخت کی اوٹ سے، چھپ کر، دیکھنے لگی ——— آواز رک گئی۔ پھر ساحل پر ایک سایہ نمودار ہوا۔ دور سے اسے پہچاننا ممکن نہ تھا۔ لیکن اتنا صاف ظاہر تھا کہ وہ بھی میری طرح آئی ہوئی تنہا عورت ہے۔ دھیرے دھیرے وہ میرے قریب آنے لگی، میں بھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔ دفعتاً میرے دل کی دھڑکن رک گئی۔ پھر دگنی تیزی سے شروع ہو گئی۔ میرے پاؤں جیسے زمین میں گڑ گئے۔ جی چاہا کہ چلا اٹھوں، زور سے......... غیر ارادی طور پر دوڑ کر سسٹر ہیلینا کے پیروں سے لپٹ گئی تھی۔

وہ نہ چونکیں نہ گھبرائیں بلکہ بڑے اطمینان سے مجھے اوپر کھینچ لیا۔ اور "ذرا بیٹھو" کہہ کر کپڑے پہننے چلی گئیں۔ پہلے تو میں نے گھٹنوں میں سر چھپا لیا۔ پھر نہ جانے کیوں بلا جھجک سب دیکھنے لگی۔ رومال جیسے چھوٹے تولیے سے انہوں نے اپنا بدن دھیرے دھیرے پونچھا۔ پھر کپڑے پہننے لگیں۔ ایک کے بعد ایک، جلدی جلدی مگر باقاعدہ۔ مجھے پتہ نہ تھا کہ گرجا میں رہنے والی عورتوں کے لئے اتنے سارے کپڑوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر ان ڈھیر سارے کپڑوں کے باوجود سسٹر ہیلینا ایک تازہ پھول کی مانند شاداب نظر آتی تھیں۔ کپڑے پہننے کے بعد بوٹ اور موزے اٹھا کر وہ میرے قریب آ گئیں۔ جی چاہا کہ جھپٹ کر ان کے ہاتھوں سے موزے اور بوٹ لے لوں اور انہیں پہنانے کے بہانے ان کے لال لال تلوؤں پر اپنے گالوں کو ملوں اور انہیں ہلکے سے چوم لوں۔ انہوں نے جیسے میرے دل کی بات جان لی ہو۔ بوٹ میرے سامنے رکھ دیئے اور تولیہ میرے ہاتھوں میں تھما دیا۔ میں نے ان کے پیر پونچھے، اپنی آرزو پوری کی پھر جوتے پہنا دیئے۔

پھر انہوں نے کہا۔ "تم پانی میں اترنا چاہتی ہو؟ چاہو تو اترو۔ میں یہیں ٹھہروں گی۔" میں نے پہلے سر ہلا کر انکار کر دیا......... پھر ایکدم کہہ اٹھی، "پھر کسی دن ہم دونوں ساتھ نہائیں گے۔"

اس کے بعد دیر تک ہم دونوں ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے بیٹھے رہے (اس رات کے بعد میں پھر پانی میں اتری تو لاک الن میں، جب تم میرے ساتھ تھے۔)

دوسرے دن میں جیسے ہوا میں تیر رہی تھی۔ میری ہر حرکت ایسی تھی جیسے میں نے دنیا بھر کی تمام خوشیاں پا لی ہوں۔ جماعت میں جب ہماری نظریں ملتیں میں من ہی من ناچ اٹھتی.......... میں ایک عالم بے خودی میں ڈوبی رہی۔

اس دن شام کی عبادت کے بعد سسٹر ہیلینا اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھیں۔ سب کی نظریں بچا کر میں ان کی طرف دوڑتی چلی گئی۔ "رات کو کھانے سے فارغ ہونے کے بعد پچھلے میدان میں بتی کے پاس آ جانا۔" صرف اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھ گئیں۔ تب تک کیسے انتظار کروں؛ میں بے تاب ہو گئی۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں وہاں پہنچ گئی۔ ایک منٹ......... دو منٹ......... کیوں نہیں آئیں سسٹر ہیلینا.........؟

دریا میں تفریح کے لئے چھوٹی بڑی کشتیاں ملتی ہیں۔ اس دن علی الصبح، میں ہوٹل کے سامنے ساحل پر کھڑا لہروں کا کھیل دیکھ رہا تھا اور ناؤ کا انتظار کر رہا تھا۔ اتنے میں پیچھے سے کسی نے کہا: "ہمارے ساتھ چلیں گے آپ؟ ہمیں بہت خوشی ہوگی!"

میں نے مڑ کر دیکھا۔ کشتی میں ایک جوان جوڑا تھا۔ لڑکی کے پیلے لباس پر نیلے اور قرمزی پھول تھے۔ بالوں پر ہلکے جامنی رنگ کا ایک ریشمی رومال بندھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہیمپر (HAMPER) تھا۔ وہ دونوں بہت خوش تھے، ان کے چہروں پر اتنا پیار بھرا اصرار تھا کہ میں بلا پس و پیش کشتی میں سوار ہو گیا۔ کسی بھی طرح کی نجی پوچھ تاچھ کئے بغیر اتنے پیار اور سلیقے سے پیش آنے والے لوگ یورپ میں اکثر مل جاتے ہیں۔ یہ ان کی خوش اخلاقی کی عظمت ہے۔ کشتی پر ہم نے خوب باتیں کیں بڑا فراخ دل تھا۔ وہ نوجوان۔ ہم لوگ جنگلے پر جھکے باتیں کر رہے تھے۔ اس نے دریا میں مجھ سے پوچھا۔ "دریا کا پانی آپ کو کس رنگ کا دکھائی دے رہا ہے؟"

"میں نے کہا: نیلا۔"

"تب تو واقعی آپ عاشق مزاج ہیں۔" وہ چہکا۔

"مجھے تو یہ پانی سبز نظر آتا ہے۔" لڑکی نے ایک نقلی آہ بھر کر کہا۔ "مجھ سے کوئی بھی پیار نہیں کرتا۔"

اس پر وہ دونوں کھلکھلا پڑے۔ تب تک میں ان سے کافی گھل مل گیا تھا۔ میں بھی ہنس پڑا۔ ہلکو ڈینیوب کی یہ شاعری کتنی سادہ مگر کتنی موثر ہے، دل کو چھو لینے والی! دریا کا پانی تو ہر کسی کو نیلا ہی نظر آتا ہے۔ مگر روایت یہی ہے کہ وہ صرف عاشق مزاجوں کو ہی نیلا نظر آتا ہے۔ جس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ سبھی پریمی ہیں۔ کیا یہ آفاقی محبت حسین شاعری کی عظیم مثال نہیں! اس وقت سے میں محسوس کرنے لگا کہ منو میرے پاس ہی ہے یا میرے آس پاس چل پھر رہی ہے۔ ہر طرف اس کا روپ نظر آنے لگا۔ اور میرا من شانت ہو گیا۔ مجھ پر سب کچھ واضح ہو گیا۔ اور میں اپنے جوان دوستوں کی صحبت میں سب کچھ بھول گیا۔ کشتی جب کنارے پر پہنچی تو پھر ملنے کا وعدہ کر کے ہم ایک دوسرے سے علیحدہ ہوئے۔ جاتے جاتے، اچانک، اس لڑکی نے جھک کر میرا بایاں گال چوم لیا۔ پیار کا ایسا غیر مصنوعی روپ میں نہیں جانتا تھا۔

منو اب صرف میری ہی نہ رہی تھی، سب کی ہو گئی تھی۔ اور اسی سبب میں اس سے قریب تر ہو گیا تھا۔ فوراً ہوٹل لوٹنے کی چاہ نہ رہی۔ میں محسوس کرنے لگا کہ میں کائنات کے ذرے ذرے میں موجود ہوں ـــــــــ ہر ایک کا بھید جانتا ہوں۔ گاڑیوں کی ریل پیل، سڑک کی چہل پہل اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چلتے ہوئے جوڑوں کے دل کی دھڑکنوں کو میں محسوس کر رہا تھا۔ دونوں ہاتھ نیکر کی جیبوں میں ڈال کر، سیٹی بجاتے ہوئے اپنی ہی شان سے چلتا ہوا لڑکا، سڑک پر گن گن کر قدم رکھتے ہوئے درمیان میں رک رک کر پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوا، نحیف جان، ساری دنیا کا بوجھ مانو اس پر ہے، یوں سمجھ کر جلد جلد قدم اٹھاتے نوکری پر جاتی ہوئی ٹپ ٹاپ لڑکی ـــــــــ ان سب کے احساسات کو میں محسوس کر رہا تھا۔ مجھے ان سب میں جذب ہو کر حظ حاصل کرنا تھا۔

منو کی زندگی کے راز کو میں نے ابھی لے جانا۔ ساڑھے چار مہینے کے عرصے میں اس نے مجھے جنت اور دوزخ کے تمام راستے بتا دیئے تھے۔ ویسے لینے کے عرصے میں کچھ بھی باقی نہیں رکھا تھا۔ طوفانی سمندر کا ہنگامہ اور سرما کی رات کا سکوت، مونا لیزا کی مسکراہٹ اور ٹیس کے آنسو۔ آسمان سے باتیں کرتے اونچے پیڑ اور صبح کی اوس میں بھیگی گھاس کے پھول ـــــــــ ان سب کے راز اس نے مجھ پر فاش کر دیئے تھے۔ ایک طرف منو میرا کرشن تھی۔ کرشن، رادھا کی ہر ذہنی کیفیت میں اس کا ساتھ دیتے تھے۔ اس کے لئے چھوٹے بنتے تھے اور بڑے بھی۔ منو کے سلوک میں بھی وہی خصوصیت تھی۔ کرشن متھرا چلے گئے اور رادھا کی زندگی ختم ہو گئی ـــ ختم ہو گئی، ایسا ہم سمجھتے ہیں۔ مگر حقیقتاً ایسا ہوا نہیں، تب رادھا خود کرشن بن گئی تھی۔ دراصل اس کی حقیقی زندگی کا آغاز وہیں سے ہوا تھا۔

میں ہوٹل میں داخل ہو کر، لفٹ کی جانب بڑھ رہا تھا۔ پورٹر نے ایک لفافہ اور ایک چھوٹا سا پارسل مجھے تھما دیا۔ میری بینک نے یہ دونوں چیزیں اس پتہ پر بھجوائی تھیں۔

کمرے میں بیٹھ کر اطمینان سے میں نے لفافہ کھولا۔ خط میں دن یا مقام کا ذکر نہیں تھا۔ پیلا سا، چکنا کاغذ اور اس پر پیارے پیارے حروف جن کا میں اتنا عادی ہو گیا تھا کہ وہ مجھے اپنے سے لگتے تھے۔ اتنا لمبا خط منو نے پہلے کبھی لکھا نہیں تھا۔ دوسرا جملہ بھی وہ شاذ و نادر ہی لکھا کرتی۔ تصویری کارڈ پر صرف پتہ اور نیچے بہت سادی حسین لکیروں کے درمیان نازک پھولوں کی طرح جھانکتے ہوئے اس کے نام کے حروف، بس! لیکن آج خط بالکل مختلف تھا، دونوں طرف لکھے آٹھ ورق، جن میں مانو اس کی زندگی کا نچوڑ تھا۔

"مجھے پورا یقین ہے کہ اس خط کو پڑھ کر تمہیں حیرت نہ ہوگی۔ اب تک تم متوازن ذہن سے دنیا سے سنگھرش کرنے کو تیار ہو چکے ہو گے اور شاید مجھے بھول بھی چکے ہو گے۔ لیکن جہاں میں ہوں، وہاں تم ہی تم ہو۔

"آج میں جو کچھ لکھنے والی ہوں، اسے تم شاید خط نہ مانو گے۔ کبھی میں نے اپنے دل سے جو وعدہ کیا تھا، اسے آج پورا کر رہی ہوں۔

"میری ماں مجھے جنم دیتے ہی اس دنیا کو چھوڑ کر چلی گئی۔ وہ پچھلی لڑائی کے

دن تھے۔ جب میں دو سال کی تھی تو پتا جی بھی چل بسے۔ اس لئے میری پرورش میری خالہ کے ہاں ہوئی، سالزبرگ میں۔ اور میں بھی اسی کنبہ کا ایک فرد بن گئی۔ میری زندگی کے وہ دن ایسے تھے کہ ہر کسی کو رشک آئے۔ میری ہر چاہ پوری کی جاتی تھی۔ خالہ کے اپنے بھی بچے تھے ——— دو لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ لیکن کسی نے کبھی ہم میں امتیاز نہیں کیا۔ میں سب سے چھوٹی تھی اس لئے میرا لاڈ پیار زیادہ ہوتا تھا۔ خالو آرکیٹیکٹ تھے۔ جنگ ختم ہوئی تو انہیں اچھے کام ملنے لگے۔ سکھ کے دن آ گئے۔ کارل، میرا بھائی، ویانا میں پڑھ رہا تھا۔ میری بہنوں کی شادی جلد ہی ہو گئی اور وہ اپنے شوہروں کے ساتھ چلی گئیں۔ اس وقت طے پایا کہ مجھے سوئٹزرلینڈ کی ایک مشن سکول میں بھیجا جائے۔ اس وقت میرا پندرہواں سال ختم ہو چکا تھا اور میں سولہویں میں قدم رکھ چکی تھی۔

"یہ سکول انٹرلاکن کے پاس بستی سے تھوڑی دور ہے۔ اس سکول میں میں نے صرف دو ہی باتیں سیکھیں ——— چوری چھپے تیرنا اور فریج ٹیچر سے پیار کرنا۔ سسٹر ہیلینا اتنی خوبصورت تھیں کہ ہر بار، ان کی طرف دیکھتے ہی میرے دل کی دھڑکن بند ہو جاتی ——— اور پھر دگنی تیزی سے شروع ہو جاتی۔ ونیس دے میلو کو اگر راہبہ کا لبا گاؤن پہنا دیا جائے تو وہ جیسی لگتی، ویسی ہی تھیں وہ۔ ان کے بولنے کا انداز اتنا شاندار اور پُروقار تھا کہ جب وہ بولنے لگتیں تو جی چاہتا کہ ان کے گاؤن کی بانہہ پر گال ملتے سنتے ہی رہ جائیں۔ اور ان کا سلوک، ہر ایک کے ساتھ، اتنا پیار بھرا ہوتا کہ سبھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے کہ وہ صرف اسی سے پیار کرتی ہیں۔ بس! اس بات کو لے کر، لڑکیوں میں، آئے دن جھگڑے بھی ہوا کرتے تھے۔

ایک رات جب سناٹا چھا گیا تو میں کھڑکی سے کود کر جھیل کے کنارے، اپنی مخصوص جگہ پر پہنچ گئی، تیرنے کے لئے۔ گرمی کے دن تھے۔ اس موسم میں من ہی من ارمانوں کی دنیا سجانے اور رات کو جھیل کے پانی میں دھینگا مشتی کر کے سب کچھ بھلا دینے سے بڑھ کر کون سا سکھ ہو سکتا ہے؛ ایسے وقت پانی کے ذرات جیسے جسم کے ہر مسام کو کھول کر زندگی میں ایک انوکھا پن بھر دیتے ہیں۔ میں سمجھتی تھی کہ وہ مقام بالکل خفیہ ہے، صرف میرا۔ لیکن اس دن وہاں کوئی اور آ گیا تھا۔ مجھ سے بھی پہلے۔ کیونکہ پانی میں چل رہے مشاق ہاتھوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں گھبرا تو گئی لیکن لوٹتے نہیں بن رہا تھا۔ اور اس نئے شخص کو دیکھنے کی آرزو پیدا ہوئی۔ میں ایک درخت کی اوٹ سے، چھپ کر، دیکھنے لگی ——— آواز رک گئی۔ پھر ساحل پر ایک سایہ نمودار ہوا۔ دور سے اسے پہچاننا ممکن نہ تھا۔ لیکن اتنا صاف ظاہر تھا کہ وہ بھی میری طرح آئی ہوئی تنہا عورت ہے۔ دھیرے دھیرے وہ میرے قریب آنے لگی، میں بھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔ دفعتاً میرے دل کی دھڑکن رک گئی۔ پھر دگنی تیزی سے شروع ہو گئی۔ میرے پاؤں جیسے زمین میں گڑ گئے۔ جی چاہا کہ چلا اٹھوں، زور سے.......غیر ارادی طور پر دوڑ کر سسٹر ہیلینا کے پیروں سے لپٹ گئی تھی۔

وہ نہ چونکیں نہ گھبرائیں بلکہ بڑے اطمینان سے مجھے اوپر کھینچ لیا۔ اور "ذرا بیٹھو" کہہ کر کپڑے پہننے چلی گئیں۔ پہلے تو میں نے گھٹنوں میں سر چھپا لیا۔ پھر نہ جانے کیوں بلا جھجک سب دیکھنے لگی۔ رومال جیسے چھوٹے تولیے سے انہوں نے اپنا بدن دھیرے دھیرے پونچھا۔ پھر کپڑے پہننے لگیں۔ ایک کے بعد ایک، جلدی جلدی مگر باقاعدہ۔ مجھے پتہ نہ تھا کہ گرجا میں رہنے والی عورتوں کے لئے اتنے سارے کپڑوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر ان ڈھیر سارے کپڑوں کے باوجود سسٹر ہیلینا ایک تازہ پھول کی مانند شاداب نظر آتی تھیں۔ کپڑے پہننے کے بعد بوٹ اور موزے اٹھا کر وہ میرے قریب آ گئیں۔ جی چاہا کہ جھپٹ کر ان کے ہاتھوں سے موزے اور بوٹ لے لوں اور انہیں پہنانے کے بہانے ان کے لال لال تلوؤں پر اپنے گالوں کو ملوں اور انہیں ہلکے سے چوم لوں۔ انہوں نے جیسے میرے دل کی بات جان لی ہو۔ بوٹ میرے سامنے رکھ دیئے اور تولیہ میرے ہاتھوں میں تھما دیا۔ میں نے ان کے پیر پونچھے، اپنی آرزو پوری کی پھر جوتے پہنا دیئے۔

پھر انہوں نے کہا۔ "تم پانی میں اترنا چاہتی ہو؛ چاہو تو اتر و۔ میں یہیں ٹھہروں گی۔ میں نے پہلے سر ہلا کر انکار کر دیا......پھر ایکدم کہہ اٹھی، پھر کسی دن ہم دونوں ساتھ نہائیں گے۔"

اس کے بعد دیر تک ہم دونوں ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے بیٹھے رہے (اس رات کے بعد میں پھر پانی میں اتری تو لاک الن میں، جب تم میرے ساتھ تھے۔)

دوسرے دن میں جیسے ہوا میں تیر رہی تھی۔ میری ہر حرکت ایسی تھی جیسے میں نے دنیا بھر کی تمام خوشیاں پا لی ہوں۔ جماعت میں جب ہماری نظریں ملتیں میں من ہی من ناچ اٹھتی.......... میں ایک عالم بے خودی میں ڈوبی رہی۔

اس دن شام کی عبادت کے بعد سسٹر ہیلینا اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھیں۔ سب کی نظریں بچا کر میں ان کی طرف دوڑتی چلی گئی۔ رات کو کھانے سے فارغ ہونے کے بعد پچھلے میدان میں جی کے پاس آ جانا۔ صرف اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھ گئیں۔ تب تک کیسے انتظار کروں؛ میں بے تاب ہو گئی۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں وہاں پہنچ گئی۔ ایک منٹ.............. دو منٹ.......... کیوں نہیں آئیں سسٹر ہیلینا..............؟

آخر وہ آئیں۔ ایک البم نما کتاب میرے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے انہوں نے کہا ۔۔ اسے اپنے پاس رکھو، تمہارے لئے ہے۔ اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی انہوں نے بڑے پیار سے میرے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور چلی گئیں۔ مجھے کچھ بھی نہیں سوجھ رہا تھا۔ میں نے وہ کتاب کس کر دل سے لگالی پھر گاؤن میں چھپالی۔ رات کو کتاب نکال کر دیکھ نہ سکی کیونکہ ڈارمٹری میں سبھی لڑکیوں کی موجودگی میں، ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔ رات بھر کتاب میرے سینے سے لگی چبھتی رہی۔

اگلے دن دوپہر کے کھانے کے دوران، میری نظر بڑی میز پر گئی۔ وہاں سسٹر ہیلینا نہیں تھیں۔ میرے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔ کل جو البم یا کتاب ملی تھی وہ بھی تو نہیں دیکھ سکی تھی۔ کھانے کی رسم ادا کر کے نوکرانی ایلیسا کے پاس دوڑی۔ اس نے بتایا کہ اسی دن صبح کو سسٹر ہیلینا کو سپین کے کسی گرجا میں بھیج دیا گیا ہے۔ سنکر میرے ہوش اڑ گئے۔ ایلیسا کو اور کچھ معلوم نہ تھا۔ کسی اور سے پوچھنا بھی ممکن نہ تھا۔

اسی رات کو مجھے بخار آ گیا۔ جب وہ نہ اترا تو گھر تار بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد مجھے سالزبرگ لے جایا گیا ہوگا۔ ان سات آٹھ دنوں کی یاد بالکل دھندلی ہے۔ پوری طرح صحت یاب ہوتے ایک مہینہ لگ گیا۔ ان دنوں میں ایک ہی کام کرتی تھی۔ سسٹر ہیلینا کی البم۔ ڈائری (میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کیا نام دیا جائے) کا نظارا۔ میں نے تمہیں ایک مور کی تصویر دکھائی تھی۔ اُسے میں نے اسی ڈائری کے ایک سکیچ سے بنایا تھا۔ اس ڈائری میں الفاظ سے بڑھ کر ایسی چھوٹی موٹی تصویریں ہی ہیں۔ یہ تو تم دیکھو گے ہی۔

اور ایک دن میں نے مصوری سیکھنے کا تہیہ کر لیا۔ میرے لئے وہ سسٹر ہیلینا کا پیغام ہی تو تھا۔ مجھے مشق کے لئے ساری چیزیں مہیا کر دی گئیں۔ آسٹریا کے سبھی میوزیم دکھلائے گئے۔ پھر یہ طے ہوا کہ پہلے مجھے لندن بھیجا جائے اور بعد میں پیرس۔ جب ہم ملے تب میں سلیڈ سکول میں زیر تعلیم تھی۔

سسٹر ہیلینا نے اپنی ڈائری میں ایک جگہ لکھا ہے۔ پھول کے باطن میں داخل ہونے کی کوشش نہ کرو، وہاں خلا کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اور وہی اس کا سوندھا گیہ ہے۔ پھول کی تمام تر رنگینیاں جس کے دل میں بھی ہوں، یہ بے نام خالی پن بھی اسی کے لئے ہے۔ پہلی بار تمہیں دیکھتے ہی مجھے یقین ہو گیا کہ میرے دل کا پھول تمہارے پاس ہمیشہ محفوظ رہ سکے گا۔

تم نے شاید یہ سمجھا ہو کہ میں نے تمہاری زندگی کے ساتھ مذاق کیا ہے لیکن سچ کہتی ہوں، روپ، میں نے ایسا نہیں کیا۔ سسٹر ہیلینا نے مجھے اپنا جانشین چنا اور اپنے دل کی دھڑکنیں میرے حوالے کر دیں۔ وہی اس خط کے ساتھ، میں تمہیں بھیج رہی ہوں۔ تم میرے جانشین ہو۔ تم میں [illegible] کی صلاحیت ہے اور پھر نتیجہ کو آسان الفاظ میں پیش کرنے کی صلاحیت بھی ہے۔ یہ سب کو بتلانا، جو سمجھ جائیں گے، وہ کل ہمارے جانشین بنیں گے۔

میں آج کہاں ہوں ۔۔۔۔؟ یہ تم پوچھو گے۔ میں [illegible] کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ہوں۔ خوب گھومتی ہوں۔ کھیت میں کام کرتی ہوں اور تصویریں بناتی ہوں۔ ایک دن تم مجھے بہ کا طرح چاہنے لگو گے، میرے بغیر نہ رہ سکو گے، تب میں تمہارے پاس آؤں گی۔ تب تک کے لئے خدا حافظ۔۔۔۔۔!

منو کے اس خط کو آئے سولہ سال بیت چکے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی یادیں اور گہری اور واضح ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ وہ اب تک تو نہیں آئی۔۔۔۔۔ اس کی ٹیچر سسٹر ہیلینا کی ڈائری میں دل کی دنیا اتنی پیچیدہ ہے کہ اتنے برسوں بعد بھی وہاں پوری طرح قدم نہیں جما سکے ہیں۔ ایک دن مجھے یہ ڈائری شائع کرنی پڑے گی۔ مگر اس دن، جب اس کا ہر لفظ، ہر نقش میرا اپنا بن جائے گا۔

(مترجم :- محمد شرف الدین)

# غزلیں

## فضا کوثری

جو سنگ سار ہوت چور چور اپنا ہے
گیا ہے پیار سراسر قصور اپنا ہے
میں ایک میں ہوں اور اپنے وجود کا احساس
نہ پاس ہے نہ کوئی سو دور دور اپنا ہے
لرز رہا ہوں اسے بھی نہ چھین لے کوئی
یہ آسرا بھی کہ رب غفور اپنا ہے
یہ اعتبار نظر بھی نہ ہو کہیں معلوم
کرن کرن یہی کہتی ہے نور اپنا ہے
اکیلے پن کا یہ احساس مٹ گیا ہوتا
اگر فضا کو سمجھتے حضور اپنا ہے

## جگدیش مہتہ درد

کسی کی یاد بڑھتے بڑھتے دردِ دل نہ بن جائے
خداوندا یہ آسانی کہیں مشکل نہ بن جائے
نگاہِ شوخ ہی تیرے لئے قاتل نہ بن جائے
کہیں بیٹھے بٹھائے جان پر اے دل نہ بن جائے
میرا ہر اشک وہ دامن سے اپنے پونچھ دیتے ہیں
کہ ہے یہ لختِ دل مٹی میں مل کر دل نہ بن جائے
وہ جب سے آئے ہیں دل میں نظر سے دور رہتے ہیں
مجھے ڈر ہے کہ دل ہی پردۂ محمل نہ بن جائے
اثر پڑ کر رہے گا ایک دن رندوں کی صحبت کا
یہ درد پارسا بھی میکشِ کامل نہ بن جائے

## عشرت انور

دردِ عالم سے ہے گرچہ ساری دنیا آشنا
آج کل ہے کون دنیا میں کسی کا آشنا
گویا شیرازہ چمن کا اب بکھر جانے کو ہے
"سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل نا آشنا"
آشنا سب ساتھ تھے اپنے فقط اک موڑ تک
موڑ پہ پہونچے تو سب تھے آشنا نا آشنا
دوستوں کی مہربانی دشمنی سے کم نہیں
کیسے ممکن ہے تمیزِ آشنا نا آشنا
دوستوں کی دشمنی انور بہت ہے دل شکن
دوست دشمن عمر بھر ہم سے رہے نا آشنا



## حشر سہسرامی

گلشن میں بلبلوں کا ہے میلہ لگا ہوا
شاید کوئی اسیر قفس سے رہا ہوا
پرہیز اُن سے ہو نہیں سکتا بہار میں
توبہ کا خون منہ کو ہے جن کے لگا ہوا
سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں ہے نگاہ میں
یہ آ گیا کہاں میں تمہیں ڈھونڈتا ہوا
اس کو بھی تم نے بھانپ لیا میری شکل سے
جو رہ گیا تھا بات کا پہلو دبا ہوا
اُن کی نگاہ پھرتے ہی آیا یہ انقلاب
سارا زمانہ حشر ہے مجھ سے پھرا ہوا

## ناظر الحسینی

تیری محفل سے کہاں جائیں گے دیوانے لوگ
خاک اڑائیں گے تو بن جائیں گے افسانے لوگ
ہم نے خود پاؤں میں زنجیرِ وفا ڈالی ہے
ایسے عالم میں عبث آتے ہیں سمجھانے لوگ
بتکدہ کم نہیں جنت سے جنابِ واعظ
آ ہی جاتے ہیں دلِ زار کو بہلانے لوگ
جب گلستاں میں اماں کی کوئی صورت ہی نہیں
کیوں نہ آباد کریں شوق سے ویرانے لوگ
کتنا بدلا ہوا دستورِ جہاں ہے ناظر
ہو کے کعبے سے چلے جاتے ہیں میخانے لوگ


بچوں کی پیدائش میں وقفہ کیلئے
ان نادہ بچوں کی پیدائش اتفاق کی بات نہیں
یہ آپ کے اختیار میں ہے۔ نرودھ
استعمال کرنے سے آپ کے بچے تبھی
ہوں گے جب آپ چاہیں گے، اتفاق
سے نہیں۔
بچہ اور ماں
کی صحت کیلئے
ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ بچے کو شروع کے تین
برسوں میں زیادہ توجہ درکار ہوتی ہے
پھر بچے کی پیدائش کے بعد ماں کو اپنی
صحت بحال کرنے میں بھی وقت لگتا ہے۔
نرودھ استعمال کر کے آپ اگلے بچے کی
پیدائش ملتوی کر سکتے ہیں۔
نرودھ (کنڈوم) اعلیٰ کوالٹی کے ربڑ سے
بنتا ہے۔ دنیا بھر میں لوگ اسے استعمال
کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ فیملی پلاننگ کا آسان
و محفوظ طریقہ ہے۔ اس کے استعمال سے
صحت پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا۔
نرودھ استعمال کیجئے
فیملی پلاننگ کیلئے
اعلیٰ کوالٹی کے
ربڑ کنڈوم
سرکاری امداد سے کم دام
نرودھ ہر جگہ ملتا ہے:۔
پروویژن اسٹور، کریانہ فروش،
کیمسٹ، جنرل مرچنٹ، پان فروش
وغیرہ کی دوکانوں پر بکتا ہے۔
صرف
5 پیسے
خرچ کر کے
آپ اور
اپنے کنبے
کو
محدود رکھنے
کی طاقت
حاصل کر سکتے ہیں

# عرب اور علم کیمیا

سعد الحسن آفاق

کیمسٹری اس سائنس کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ قدرتی چیزوں کی بناوٹ اُن کی خصوصیت اور اُن کی بناوٹ میں قدرتی طور پر جو تبدیلیاں ہوتی ہیں اُن کی واقفیت حاصل کی جائے۔ اس علم کے جاننے والے کو ماہر علم کیمیا یا کیمیا داں کہتے ہیں۔

اس علم کی بنیاد یونان اور مصر میں پڑی۔ ہندوستان اور چین میں بھی یہ علم رائج تھا۔ سب سے پہلے یہ علم دھاتوں کو نکالنے اور برتن بنانے کے فن تک محدود تھا۔ شاید ۳۵۰۰ ق م میں مصری دھات نکالنے کے فن سے قطعی طور پر واقف تھے اور برتن بنانے کے فن میں بھی انہیں مہارت حاصل تھی۔ سب سے پہلی دھات جو انسانوں کے استعمال میں آئی شاید سونا تھی۔ اس کے بعد لوگ تانبے سے واقف ہوئے۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ لوہا، چاندی، پارہ، قلعی اور دوسری دھاتوں سے متعارف ہو گئے۔ کچھ دنوں بعد یہ لوگ فن شیشہ گری سے واقف ہوئے۔ اس کے بارے میں دو خیال ہیں۔ کچھ مصنفوں کا خیال ہے کہ شیشہ گری کا فن یونانیوں کی ایجاد ہے مگر دوسرں کا خیال ہے کہ یہ فن یونانیوں اور رومیوں نے مصریوں سے سیکھا۔ کیونکہ یونان کے شہنشاہوں کے یہاں اور قیصر روم کے دربار میں مصری شیشے بطور تحفے اور اکثر خرید کر بھیجا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں یہ لوگ رنگین شیشے بھی بنانے لگے اور بعد میں ان رنگین شیشوں سے مختلف قسم کے نقلی جواہرات بنانے میں کیمیا گروں نے بہت نام پیدا کیا۔ پہلے پہل تو یہ جواہرات بہت اچھے نہیں ہوتے تھے اور آسانی سے پہچان لئے جاتے تھے۔ مگر بعد میں اُن لوگوں نے دور دراز سے مختلف قسم کی معدنی اشیا جمع کیں اور ان کے ساتھ تجربے کر کے اس قدر عمدہ مصنوعی جواہرات بنانے لگے کہ اصل سے امتیاز کرنا مشکل ہو گیا۔ دوسری طرف نقلی سونا بنانے کا رواج بھی زور پکڑنے لگا۔

جب کیمیا گر نقلی سونا بنانے میں مصروف ہوتے تھے تو سونا تو بن نہیں پاتا تھا۔ البتہ اس عمل کے دوران دوسرے قسم کے سیال اور بہت سی ٹھوس قسم کی چیزیں مل جاتی تھیں۔ یہ لوگ ان چیزوں کو ویسے ہی نہیں چھوڑتے تھے بلکہ اُن کو دیکھتے اور پرکھتے تھے۔ اُن کے بنانے کے آسان طریقوں پر غور کرتے تھے۔ اس قسم کی کوششوں میں ایسی چیزیں مل گئیں جو دنیا کے لئے نئی اور کارآمد تھیں۔ کئی قسم کے مرکب، تیزاب اور الکحل جیسی چیزیں ان کے ہاتھ آئیں۔ لیکن کچھ لوگ اس عام فارمولے سے ہٹ کر کام کرتے تھے اور ان کے کام جدید کیمسٹری کے انداز پر ہوتے تھے۔

اس طرح ایک طرف کیمیائی سائنس ترقی پر تھی اور دوسری طرف نقلی سونا اور مصنوعی جواہرات بنانے کا فن ترقی پر تھا۔ آج کل ہم ان دونوں کا فرق کرنے کے لئے اوّل الذکر کو "کیمیا" اور ثانی الذکر کو "الکیمی" کہتے ہیں۔

کیمیا داں اس فن کے علاوہ عنصر اور فلسفۂ زندگی میں بھی بہت دخل رکھتے تھے۔ یونان کے ایک فلسفی تھیلس نے ۶۲۴ ق م میں عنصر کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کی تھی۔ اس کے قول کے مطابق ہر چیز پانی سے بنتی ہے۔ بعد میں لوگوں نے ہوا پانی اور آگ کو بھی عنصر بتایا۔ اور آخر میں ایمپی ڈاکلس نے کہا کہ ہر چیز کے اجزائے ترکیبی چار ہوتے ہیں: آگ، ہوا، پانی اور مٹی۔ عنصر کا لفظ جس کو لاطینی میں Stoiches کہتے ہیں، پلیٹو نے ۴۲۷ ق م اور ارسطو نے ۳۸۴ ق م میں استعمال کیا تھا۔

۳۳۱ ق م میں شہر اسکندریہ میں بھی اس علم نے بہت ترقی کی۔ یہاں پر مصر، یونان، روم اور شام کے مایۂ ناز کیمیا داں اکٹھے ہوئے اور اسی اسکول کے ذریعے اس علم نے اپنی ترقی کی رفتار تیز کر دی۔ یہیں پر دھاتوں کے اشارے بنانے کا خیال پیدا ہوا اور کچھ اشارات بنائے بھی گئے۔ (جیسے سونے کے لئے ☉ اور چاندی کے لئے ☽) وغیرہ وغیرہ۔ یہ اشارے کیونکر بنائے گئے؟ اس کا خیال کیسے آیا۔ اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ اس وقت تک اس تعداد میں کیمیائی چیزیں معلوم ہو گئی تھیں اور کہ ان کو لکھنے میں بہت وقت لگتا تھا۔ اس لئے اشارے بنائے گئے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کیمیا داں چاہتے تھے کہ اُن کی لکھی ہوئی باتیں دوسرے نہ سمجھ سکیں اور انہیں تک محدود رہیں۔ اور اسی لئے شاید الگ الگ کیمیا والوں کے اشارے بھی الگ الگ ہوں۔ اس کی موافقت میں ہم یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ کیمیا دانوں نے کبھی اپنے فن کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اور جو کچھ کتابوں میں لکھا اس میں بھی بخل سے کام لیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جو پرانی کتابیں اس علم کے متعلق ملتی ہیں وہ ادھوری معلوم ہوتی ہیں اور ان کے کچھ تجربوں اور تکنیک سے ہم لوگ قطعی بے بہرہ ہیں۔

جب عربوں نے اس خطۂ ارض پر قبضہ کیا تو وہ اس فن سے واقف ہوئے۔ عربوں نے علم کیمیا کی کتابوں کا ترجمہ کیا اور اس علم کو پڑھنے اور سمجھنے کے بعد اپنایا اور اس علم کو اس قدر مالا مال کیا کہ اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

اشاروں کے سلسلے میں یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ کیمیا داں علم کیمیا کو علم التنجیم سے جوڑنے لگتے تھے۔ ستاروں اور دھاتوں کو ایک ہی چیز سمجھتے تھے۔ ان کے قول کے مطابق سیارے اور دھات ایک ہی چیز کے دو حصے ہیں ایک آسمان پر اور ایک زمین پر۔ مثال کے طور پر ان کیمیاگروں نے سات اشارے بنائے اور ان اشاروں کو مشترکہ طور پر دھات اور سیاروں کے نشان کے طور پر تسلیم کرتے تھے۔ یہ اشارے اس طرح ہیں۔

| ☽ | ♀ | ☉ | ♂ | ♃ | ♄ |
|---|---|---|---|---|---|
| چاند | زہرہ | سورج | مریخ | مشتری | زحل |
| چاندی | تانبا | سونا | لوہا | قلعی | سیسا |

اس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اسلام کے عروج تک علم کیمیا نے بہت ترقی کی تھی اور اسلام کے بعد اس علم کا دوسرا باب کھلتا ہے جو اس علم کی تاریخ میں سنہرے حرفوں سے لکھا جاتا ہے۔

جب عربوں میں یہ فن کتابوں کے ترجمے سے منتقل ہوا تو انہوں نے اس فن کو بے انتہا ترقی دی اور اس میں اضافہ کرتے چلے گئے۔ کتابوں کے ترجمے کا کام زیادہ تر عباسی خلفاؤں کے زمانے میں ہوا اور خلفاؤں نے اس کام کے لئے مالی اور دوسرے قسم کی سہولتیں دیں۔

دوسرے ممالک کے کیمیادانوں کی طرح عربوں میں بھی تین قسم کے کیمیا داں ملتے ہیں۔ کچھ کسی عنصر کے اندرونی تبدیلی پر یقین رکھتے ہیں۔ کچھ نئی چیزوں کی کھوج اور تجربوں میں لگے ہوئے تھے اور بعض دھاتوں کی جنس تبدیل کرنے کے چکر میں تھے۔ ان کیمیادانوں میں الرازی پہلی قسم کے مصنفوں میں، العراقی دوسری قسم کے اور جابر تیسری قسم میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان تینوں کے علاوہ اور بہت سے دوسرے کیمیاں داں بھی ہوئے ہیں جیسے الحسن الرحاما، السمرقندی، ایوب الروحادی وغیرہ وغیرہ۔

جابر ابن حیان کا زمانہ آٹھویں صدی کے بعد کا ہے۔ ان کے آباد اجداد دکھنی عرب سے ہجرت کر کے آئے تھے اور اسلامی عروج کے زمانہ میں کوفہ میں رہنے لگے تھے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ شاید یہ کتابیں کسی ایک آدمی کی نہیں ہیں بلکہ جابر کے خیالات کے ماننے والے دوسرے مصنفوں نے جابر کے نام سے کتابیں لکھیں ہیں۔ جابر کی مشہور کتاب The Book Of Balance ہے۔

الرازی جن کا پورا نام محمد ابن ذکریا الرازی تھا Arab Galen کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ یہ طب میں بھی بہت استاد مانے جاتے تھے ان کا نام طب میں ابو سینا کے بعد لیا جا سکتا ہے۔ الرازی کی مشہور کتاب جو طب کے موضوع پر ہے Despestilentia or Dr.Peste ہے۔ دوسری کتاب Secret of Secrets کے نام سے مشہور ہے۔

تیسرے مشہور کیمیا داں ابو القاسم العراقی ہیں جو تیرہویں صدی کے ہیں۔ یہ اندلس کے رہنے والے تھے۔ ان کی نو کتابیں عام ہیں۔

ان لوگوں کے علاوہ کچھ شاعر بھی تھے جو کیمیا کے فارمولوں کو شاعری میں ڈھالتے تھے۔ ان میں الطغرالی کافی مشہور ہیں۔ دوسرے کیمیا داں انہیں لوگوں کے خیالات پر کام کرتے تھے اور اکثر انہیں لوگوں کی باتوں کو دہراتے تھے۔

علم کیمیا کی تاریخ دیکھیے تو بہت پرانی ہے مگر اس کی صحیح تاریخ کسی کو معلوم نہ تھی۔ عربوں نے سب سے پہلے اور سب سے اہم جو کام کیا ہے وہ اس علم کی تاریخ سے متعلق ہے۔ جابر نے سب سے پہلے علم کیمیا کی تاریخ لکھی ہے۔ وہ اس کی تاریخ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جس طرح فلسفے کے بانی ہرمیز ہیں اسی طرح اس علم کے جنم داتا ارنستی ہیں۔

توازن کا خیال اور اس کا اصول بھی سب سے پہلے جابر نے پیش کیا۔

توازن سے مراد یہ ہے کہ کسی دھات کی جو خصوصیات باہر سے دکھائی دیتی ہیں۔ اس کے برابر کی متوازن خصوصیت اس میں اندرونی طور پر موجود رہتی ہے۔ ان کے قول سے ہر دھات کی دو اندرونی خصوصیات ہیں اور اس کے برابر کی دو باہری خصوصیات ہیں جیسے کہ سونا اندرونی طور پر سرد اور خشک ہے اور باہری طور پر گرم اور تر (سرد گرم کا مقابل اور خشک تر کا) چاندی اس کے برعکس ہے۔ باہر سے سرد خشک اور اندر سے گرم تر۔ اس طریقے سے اندرونی اور باہری خصوصیات کا توازن قائم رہتا ہے۔

معدنی شے کی بناوٹ کے بارے میں سب سے پہلے جابر نے گندھک اور پارے کا نظریہ پیش کیا۔ یہ نظریہ آج کل کی ایسڈ اور بیس کے نظریے سے موافقت رکھتا ہے۔ گندھک اور پارے کے نظریے میں ان لوگوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہر دھات پارے اور گندھک سے بنتی ہے۔ پارہ جب گندھک کی مدد سے جم جاتا ہے تو کوئی نہ کوئی دھات بن جاتا ہے۔ لیکن یہ سوال اٹھتا ہے کہ دھات تو کئی قسم کی ہوتی ہیں۔ اس کا جواب دیتے ہوئے جابر نے لکھا ہے کہ دھاتوں میں فرق حادثاتی ہے یا گندھک میں فرق کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اور گندھک میں فرق اس جگہ کی زمین جہاں سے گندھک نکالا گیا ہے اور موسم کی گرمی کی وجہ سے ہے۔

اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ان لوگوں کے خیال سے ہر دھات ایک ہی جنس سے تعلق رکھتی ہے اور ان میں فرق اتفاقی یا گندھک میں فرق کی وجہ سے ہوتا ہے. شاید اسی خیال کی بنا پر العراقی نے Prima - Matter کا نظریہ پیش کیا ہے.

ان کے خیال میں ایک چیز Prima - Matter ہے جس سے ہر دھات بنتی ہے. اس کو انہوں نے اس طریقے سے بیان کیا ہے کہ Prima - Matter ایک پیڑ ہے. جس کی کئی شاخیں ہیں اور ہر شاخ میں الگ الگ رنگ کے پھول کھلتے ہیں جو لال رنگ، کالے رنگ، سفید رنگ لال اور کالے کے بیچ کا رنگ. سفید اور پیلے رنگ کے بیچ کا رنگ ہوتا ہے (لال رنگ سے مراد شاید سونا ہے کالے رنگ سے مراد شاید لوہا ہے. سفید رنگ سے مراد چاندی اور لال اور کالے رنگ کے بیچ کے رنگ سے مراد شاید قلعی ہے) اس طرح یہ خیال ان لوگوں کے ذہن میں آتا ہے کہ جب ہر دھات ایک ہی قسم کی چیز سے پیدا ہوتی ہے تو اس کی جنس بھی بدلی جا سکتی ہے.

مسلمان کیمیا دانوں میں جابر پہلا شخص تھا جس نے تجربہ گاہ بنائی اس کام میں فوفاعرن نے اس کی مدد کی. پہلے تو کیمیا داں ہوس کے چکر میں پڑے رہتے تھے اور نتیجہ صفر ہوتا تھا. لیکن بعد میں جب ابو سینا نے (۹۸۰ء سے ۱۰۳۶ء) یہ کہا کہ یہ انسانوں کے بس کا روگ نہیں ہے کہ وہ دھات کی جنس تبدیل کر دیں. اسی وقت سے اس علم نے دوسری کروٹ لی اور الکیمی سے ہٹ کر کیمیا پر آ گیا.

جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ دور اسلامی کی پہلی تین صدیاں مذہبی فلسفے میں گزریں. اس کے بعد کی دس صدیاں سائنس کی صدیاں تھیں جس کا زیادہ تر حصہ ہوس کی نظر ہو گیا. اور بارہویں صدی سے یہ علم یورپ کی طرف منتقل ہونا شروع ہو گیا. یہاں پر بھی پہلے اسی انداز پر کام ہوا مگر بعد میں جدید کمسٹری کی بنیاد پڑی. یورپ میں اس علم کے متعلق عربی اور لاطینی زبان میں لکھی گئی کتابوں کے ترجمے انگریزی اور فرانسیسی میں ہوئے. سب سے پہلی کتاب Turb -Philospomin کا ترجمہ لاطینی زبان سے کیا گیا. اس کے بعد جابر کی لکھی ہوئی کتابوں کا ترجمہ شروع ہوا. اس سلسلے میں اگر ہم نکلسن فلیمنگ کا ذکر نہ کریں تو زیادتی ہوگی. یہ ۱۳۳۰ء میں پیدا ہوا. فرانس کا رہنے والا ایک معمولی کتاب فروش تھا. ایک بار اس نے ایک خواب دیکھا (جس کا ذکر اس نے خود کیا ہے) کہ ایک فرشتہ اس کو ایک کتاب دکھا رہا ہے جس کا نام Abraham of jend ہے. اس خواب کے دوسرے دن اسی کتاب کو ایک آدمی نے اس کے ہاتھ فروخت کیا. جب یہ کتاب اس کے ہاتھ آئی تو اس کو وہ خواب یاد پڑا. اس نے اس کتاب کو پڑھا مگر کچھ سمجھ نہ سکا. اس کو سمجھنے کے لئے اس نے اسپین کا سفر کیا. جب وہ وہاں سے ناکام واپس آ رہا تھا تو راستے میں اس کو ایک آدمی ملا. اس نے فلیمنگ کو کتاب کے بارے میں بتایا. اس آدمی کی کچھ دنوں کی محنت سے فلیمنگ اس قابل ہو گیا کہ کیمیا کے متعلق ہر کتاب کو سمجھ سکتا تھا. اس نے کچھ تجربے بھی اپنی اہلیہ کی مدد سے ۱۳۸۲ء میں کئے. ۱۳۹۷ء میں اس کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا. اس کے بعد اس نے اپنا پورا وقت علم کیمیا سے متعلق لاطینی اور عربی کتابوں کا ترجمہ کرنے میں صرف کر دیا. ۱۴۱۷ء میں اس کا انتقال ہو گیا. اس طریقے سے علم کیمیا عربوں سے یورپ کی طرف منتقل ہوا اور جدید کمسٹری کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے.

اس زمانے میں چند قابل ذکر چیزیں ایجاد ہوئیں جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں.

قرع انبیق مسلمانوں کی ایک قابل قدر ایجاد ہے. مغرب کے لوگ اس کو پالی کین پرندے کے نام سے جانتے ہیں. اس میں پالی کین پرندے کی طرح ایک چوڑا جسم، ایک چپٹا سر اور ایک لمبی چونچ ہوتی ہے. یہ ایک عالی چکنی مٹی کا بنایا جاتا ہے اور خاص طریقے سے پکایا جاتا تھا. اس کے دو حصے تھے جس کو حسب ضرورت ملایا جا سکتا تھا. ایک حصہ گول پیندے کے مرتبان کی شکل کا ہوتا تھا جس کی چوڑی گردن لمبائی میں بہت چھوٹی ہوتی تھی. اس کا دوسرا ایک بھبکے کے شکل کا ہوتا تھا جس کی چوڑی گردن لمبائی میں بہت چھوٹی ہوتی تھی. یہ دوسرا حصہ پہلے حصے کے اوپر صحیح طور پر آ جاتا تھا.

مرتبان میں جس کا جوہر یا عرق نکالنا ہوتا تھا بھر دیا جاتا تھا. اور اس کی گردن میں بھبکے کو الٹ لٹکا دیا جاتا تھا. اس حالت میں مرتبان کو آگ پر رکھ کر گرم کیا جاتا تھا. حرارت سے اس شے سے بخارات اٹھتے تھے اور نالی سے ہوتا ہوا بھبکے میں آتا تھا. بھبکے میں ایک صراحی لگا دی جاتی تھی جس سے آبخارات ٹھنڈے ہو جاتے تھے اور مائع بن جاتا تھا. یہی مائع اس چیز کا عرق ہوتا ہے. یہ لوگ قرع انبیق سے گلاب، چنبیلی، موتیا وغیرہ کا عرق نکالتے تھے اور خوشبو کے طور پر استعمال کرتے تھے. اس سے ست پودینا نکالتے تھے اور پیٹ کے مرض میں دیتے تھے. سری بوٹی کا تیل بھی نکالتے تھے اور مرہم وغیرہ میں استعمال کرتے تھے. سری بوٹی کا عرق Salicylic Acid ہے اور اسپرین Aspirin اسی تیزاب کا ایک مرکب ہے جو آج کل بہت عام ہو رہا ہے.

قرع انبیق کے ذریعے شراب سے الکحل بھی انہیں لوگوں نے بنایا. بلاشبہ اوپر ذکر کئے گئے قرع انبیق سے الکحل نہیں بن سکتی. کاریگروں نے بہت کوشش کی مگر ہمیشہ ناکام رہے. یہ کام انہوں نے شراب کے Distillation سے شروع کیا. مگر شراب بھبکے میں آتی ہی نہیں تھی. کچھ عرصے بعد ایک کاریگر نے اس کی نلی کو لمبا کر کے اس کو ایک صراحی سے گزارا. اس طرح صراحی میں رکھے ہوئے

بھبکے میں ایک مائع آگیا اور اس کو الکحل کا نام دیا۔

تیزاب ایک اتفاقی ایجاد ہے۔ ایک بار ایک بوڑھے کیمیاداں نے قرع انبیق میں پھٹکری، ہراکسیس اور قلمی شورہ ڈالا، اس کو کوئلے کی آگ پر رکھ دیا۔ اس نے ان مرکب کو کیوں ملایا اور اس سے کیا ہوگا؟ یہ وہ بھی نہیں جانتا تھا مگر اس کا یہ تجربہ نہایت ہی کامیاب رہا۔ بھبکے میں پہلے بھورے رنگ کی ایک گیس نکلی۔ اور بعد میں ایک بے رنگ کا مائع بیرونی برتن میں اکٹھا ہوگیا۔ اس مائع نے قرع انبیق کے بیرونی برتن جو تانبے کا تھا سوراخ کردیا۔ اس کو چاندی کے کٹوری میں اکٹھا کرنے کی کوشش کی تو اس میں سوراخ ہوگیا۔ چمڑے کی تھیلی کو بھی نقصان پہنچا۔ اس نے اس مائع کو چھوا تو اس کا ہاتھ جل گیا۔ اس کا نام اس نے تیزاب۔ Aquaf ortes۔ رکھا۔ اس تیزاب کا اثر صرف سونے اور شیشے پر نہیں ہوتا تھا۔ اس اثر کو دیکھتے ہوئے لوگوں نے شیشے کا قرع انبیق بنایا۔ جو سب سے پہلے اٹلی میں بنا اور وینس کے شیشہ گردں نے اس کام کو سرانجام دیا۔ ان کاریگروں نے ان کے دونوں برتنوں کو جوڑ دیا اس سے یہ فائدہ ہوا کہ مائع کے رِس رِس کر نکلنے کے امکان بھی ختم ہوگئے۔ اس کا نام ریٹارٹ رکھا۔ بعد میں اس سے ایک تیزاب بنایا۔ جو پھٹکری، ہراکسیس، نوسادر اور قلمی شورے کو ملاکر گرم کرنے سے بنا تھا۔ یہ تیزاب سونے کو بھی گھول لیتا تھا۔ اس کو شاہی تیزاب یا Aquaregia کا نام دیا۔ اس سے ایک اور تیزاب بنایا جو پھٹکری اور ہراکسیس کی مدد سے بنا۔ اس کو ہراکسیس کا تیل کہتے تھے۔ آج کل پہلے تیزاب کو شورے کا تیزاب Nitric Acid دوسرے کو Aquaregia (شورے اور نمک کے تیزاب کا آمیزہ) اور تیسرے کو گندھک کا تیزاب Sulphuric Acid کہا گیا ہے۔

بارہویں صدی کے آخری حصے میں بارود کی ایجاد ہوئی۔ بارود کی ایجاد شورے کے ساتھ پوٹاش اور گندھک کے تجربے سے ہوئی۔ اس کی ایجاد کے بارے میں لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یہ شاید تیرہویں صدی میں ہوئی۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ بارود چینیوں کی ایجاد ہے مگر اس کی تصدیق نہیں ہوتی ہے۔ ویسے جہاں تک خیال ہے کہ یہ شام میں بنایا گیا تھا۔ اور اس کی جلنے والی خصوصیت کی وجہ سے اس کا استعمال جنگ میں بھی کیا جانے لگا۔

اس کے علاوہ ان لوگوں نے کچھ ایسے سائنسی سامان بنائے جو کیمیائی تجربوں میں اب تک استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے Smelting furnace, Pistol motor, Beaker Flask, Naptha Lamp,

اس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ علم کیمیا مصر اور یونان میں پیدا ہوا۔ اسکندریا میں پنپا، مسلمانوں نے اس کو پروان چڑھاکر بغداد، اسپین، سمرقند اور افریقہ تک پھیلایا۔ اور بعد میں یورپ والوں نے اس کو اپناکر جدید کمسٹری کی شکل دی۔ اس علم کا زیادہ تر کام بارہویں صدی میں ہوا، بارود، رنگ اور الکحل وغیرہ اسی زمانے کی ایجاد ہیں۔ علم کیمیا کی جو شکل پہلے تھی اب قطعی بدل چکی ہے۔ الکیمی یا مہوسی ایک دوسری چیز بن کر رہ گئی ہے۔ جواب بہت کم ملتی ہے۔ علم کیمیا جواب جدید کمسٹری کی شکل میں ہے اس میں سائنس نے بہت ترقی کی ہے۔ ان چیزوں کے خاکے بنائے ہیں جن کو نہ ہم دیکھ سکتے ہیں اور نہ چھو سکتے ہیں۔ اور انسانوں کی سوجھ بوجھ، حکمت عملی اور لگن کی وجہ سے قدرت کے راز لگاتار منکشف ہو رہے ہیں۔

## کلیم عاجزؔ

کروگے عشق تو ڈوبوگے پیارے
یہ دریا ہے کنارے ہی کنارے
یہ دن آیا ہے کس مشکل سے پیارے
پھرو ہو تم جو زلفوں کو سنوارے
تمہیں سب بے وفا کہتے ہیں پیارے
مرے جاتے ہیں ہم غیرت کے مارے
مرے احوال پر روتے ہیں سارے
ہنسو ہو تم بڑے ظالم ہو پیارے
جو سب سے دور ہیں سب سے کنارے
وہی ہیں چاہنے والے تمہارے
ہمیں یہ اس لئے پیاری ہے پیارے
یہ محفل ہے تمہاری تم ہمارے
نہ رکھو تہمت ترکِ محبت!
چھری رکھ دو گلا حاضر ہے پیارے
دلِ اب قابو سے باہر جارہا ہے
کوئی اس جانے والے کو پکارے
تڑپ ہر شعر میں رہتی ہے عاجزؔ
یہ کیسا درد ہے دل میں ہمارے

# نئی کتابیں

## جدید اُردو نظم اور یورپی اثرات

ڈاکٹر حامدی کاشمیری

ناشر:۔ مجلس اشاعت ادب، ۴۹۱۰ باڑہ ہندو راؤ دہلی
صفحات:۔ ۴۱۰ ، قیمت:۔ ۲۰ (بیس) روپے
ملنے کا پتہ:۔ مجلس اشاعت ادب دہلی اور ادارہ ادب ۳۹۷ جواہر نگر سرینگر کشمیر

زیرِ نظر مقالے پر ڈاکٹر حامدی کاشمیری کو کشمیر یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا ہوئی ہے۔ مقالہ نگار اس لحاظ سے قابلِ تحسین ہیں کہ انہوں نے ایک ایسے موضوع پر قلم اٹھایا جس پر اُردو میں کم لکھا گیا ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے بڑی چھان بین کرکے اس مقالے میں خاصا کار آمد مواد بھی اکٹھا کیا ہے۔ لیکن مواد اکٹھا کرنا محض آدھا کارنامہ ہے۔ ناقد کی خوبی یا خامی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ وہ اس مواد کو کس طور پر ترتیب دیتا ہے اور اس سے کیا نتائج اخذ کرتا ہے۔ مقالہ نگار کے نقطہ نظر کی وضاحت کے لئے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

"جہاں تک دوسری اصنافِ سخن مثلاً غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، رباعی وغیرہ کا تعلق ہے۔ انہیں زیرِ مطالعہ سے خارج کیا گیا ہے کیونکہ یہ موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے حد درجہ روایتی فرسودہ اور کہنہ ہیں۔ (صفحہ ۸)

"مرتبِ مقالہ نے اُردو نظم کے اس مطالعے میں جو تنقیدی اسلوب اختیار کیا ہے وہ مغرب اور مشرق کے ادب اور شاعری کے درمیان کوئی فرق یا تمیز روا نہیں رکھتا۔ (صفحہ ۹)

"مرثیہ کی صنف میں نظم نگاری کے بہت سے امکانات پوشیدہ تھے لیکن ان امکانات کا سُراغ کسی شاعر نے نہیں لگایا ہے سوائے اس کے کہ صرف ایک مرکزی موضوع شہادت امام حسین کو استعمال کیا گیا ہے اور وہ بھی روایتی انداز سے مرثیہ کی صنف بذاتِ خود بری نہیں۔ یہ نظم کے تخلیقی عناصر کی حامل ہے۔ انگریزی میں گرے کی ایلجی، یا ٹینی سن کی ان میموریم، مرثیہ کے ذیل ہی میں آتی ہیں اور دونوں بلند پایہ نظمیں قرار دی گئی ہیں۔ لیکن اُردو میں اس پائے کی ایک بھی نظم نہیں ملتی۔" (صفحہ ۹۵)

"یہ بات مسلّم ہے کہ فیض نے جدید نظم کی فنی تراشیدگی، تنظیم اور تعمیر میں اپنی بہترین خلّاقانہ صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے۔ اور چند ایسی اعلیٰ پایہ کی نظمیں تخلیق کی ہیں جو مغربی نظموں کا طرزِ تفکر اور اندازِ نگارش کی حامل معلوم ہوتی ہیں اور فکر و فن کی نئی سمتوں کا تعین کرتی ہیں۔ جہاں تک اُن کے دائرہ فکر کا تعلق ہے وہ بدقسمتی سے بہت ہی محدود رہا ہے۔ اُن کے افکار نہ متنوع ہے اور نہ وسعت اُن کے اسلوب اور ہیئت میں بھی ایک طرح کی یکرنگی اور یکسانیت پائی جاتی ہے۔"
(صفحہ ۸۴)

"اُردو شاعری اپنی پیدائش کے زمانے ہی سے مسلسل طور پر یا تو بدیسی روایات کے تلے دبی رہی ہے یا مختلف ادوار میں مروجہ تصورات اور اصناف کی غلام بنی رہی۔ سچ تو یہ ہے کہ ایرانی زبان و خیال کے حادی اثر سے ہماری شاعری ابھی تک آزاد نہیں ہوئی ہے۔" (صفحہ ۴۰۶)

"نئے نظم نگار فنی اصولوں کی اہمیت سے واقفیت رکھتے ہیں۔ وہ یورپی شعر و ادب کے حالیہ رجحانات کا دلچسپی سے مطالعہ کر رہے ہیں۔ آزاد نظم اب تک علیحدہ اور مکمل صنف کی حیثیت اختیار کر چکی ہے اور نظم کی مقبولیت بڑھتی جا رہی ہے۔"

"مختصر یہ کہ نئی اُردو نظم موجودہ دور میں جس سُرعت کے ساتھ عالمی تحریکوں، ادبی تظریوں اور نئے اسالیب سے ہم آہنگ ہوتی جاتی ہے وہ اس

کے مستقبل کے امکانات کے لئے فالِ نیک نہیں ہے۔" (صفحہ ۲۱۰)

مندرجہ بالا اقتباسات اور متعدد دیگر بیانات میں سے ہر ایک محلِ نظر ہے اور اگر کسی ذمہ دار ناقد نے یہ بیانات دلائل اور امثال کے ساتھ پیش کئے ہوتے تو ان پر مفصل بحث بھی ہو سکتی تھی لیکن مقالہ نویس نے چونکہ یہ اور ایسے دیگر بیانات بغیر دلیل و شواہد کے پیش کئے ہیں لہٰذا وہ محض ان کی ذاتی رائے کے مظہر ہیں اور زیادہ سے زیادہ انگریزی ادب سے ان کی ذہنی مرعوبیت کی غمازی کرتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ذاتی رائے پر کوئی بحث نہیں ہو سکتی۔

سنجیدہ قاری کو ایک علمی مقالے میں "اشارے" کی کمی گراں گزرتی ہے اور یہ امر بھی شش و پنج میں ڈال دیتا ہے کہ "جدید اردو نظم" کا عہد صرف ۱۸۵۷ء تا ۱۹۴۷ء تک کیوں محدود رکھا گیا ہے۔ کیا گزشتہ بیس سال کی شاعری جس کا محض ضمنی طور پر آخری باب میں ذکر ہے "غیر جدید" ہے ؟

ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس مقالے کے باوجود "جدید اردو نظم اور یورپی اثرات" کا موضوع ابھی تک تشنہ ہے۔

(مہدی عباس حسینی)

## عہد جہانگیر و شاہجہاں میں ہندوستان کا فارسی ادب (انگریزی)

مصنف : پروفیسر لطف الرحمٰن

فارسی سینکڑوں برس تک ہندوستان کی زبان رہی ہے اور اس طویل عرصہ میں یہاں تقریباً ہر علم و فن میں فارسی میں کتابیں لکھی جاتی اور ترجمہ ہوتی رہی ہیں لیکن ہندوستان سے باہر لکھنے والے جب فارسی ادب کی تاریخ لکھتے ہیں تو ہندوستان کے اس صدیوں کے ذخیرہ کو تقریباً نظر انداز کر دیتے ہیں۔ خود ہمارے ملک میں اب تک اس پر دل کھول کر کام نہیں ہوا ہے۔ پھر بھی انگریزی میں اس سے متعلق کچھ کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ڈاکٹر اقبال حسین صاحب نے امیر خسرو کے پہلے کے ہندوستانی فارسی شعراء پر ایک کتاب لکھی تھی۔ پٹنہ یونی ورسٹی کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ پروفیسر عبدالغنی نے مغلوں سے پہلے کے عہد اور بابر، ہمایوں اور اکبر کے زمانے کے فارسی ادب پر تین جلدوں میں ایک کتاب شائع کی تھی مگر اس کے بعد کے فارسی ادب پر کوئی کتاب موجود نہ تھی جس کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔

۱۹۷۰ء میں بڑودہ یونی ورسٹی نے پروفیسر لطف الرحمٰن کی ایک کتاب شائع کی ہے جس میں جہانگیر اور شاہجہاں کے زمانہ کے فارسی ادب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں متوسط سائز کے تقریباً دو سو صفحات ہیں اس میدان میں ایک بڑی کمی تھی جس کو اس تالیف نے دور کر دیا ہے۔

اس امر کی نشان دہی ضروری ہے کہ کتاب کی ضخامت کو دیکھتے ہوئے مولف نے تناسب کا خیال نہیں رکھا ہے یعنی بعض کے ذکر میں ضرورت سے زیادہ طول دیا گیا اور بعض کو ضرورت سے زیادہ مختصر رکھا گیا ہے۔ جہانگیر پر پچیس صفحوں پر شامل دو باب ہیں۔ جبکہ صرف ایک باب اور اس سے کم صفحوں میں کام چل سکتا تھا۔ عرفی کا ذکر عمداً جہانگیر کے عہد میں کیا گیا ہے جبکہ وہ اس کی تخت نشینی سے پہلے مر چکا تھا۔ صرف اس وجہ سے کہ اس کی شاہزادگی کے زمانہ میں عرفی نے اس کی مدح میں قصیدے لکھے، اسے جہانگیر کے عہد کے شعراء میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح ابوطالب کلیم اور شیدا جیسے شاعروں کو جہانگیر کے عہد کے شعراء میں شمار کرنے کے بجائے شاہجہاں کے عہد میں شامل کر لینا چاہیے تھا، اس لئے کہ کلیم شاہجہاں کے دربار کا ملک الشعراء تھا۔ نیز شیدا کا اسی زمانہ کے شعراء میں شمار ہوتا ہے۔ کچھ گمنام قسم کے شعراء کا ذکر ہے جن کو صرف ایک سرسری فہرست میں شامل کیا جا سکتا تھا۔ علاوہ بریں بعض شاعروں کا ذکر کرتے ہوئے ان کے کلام کا کوئی نمونہ پیش نہیں کیا گیا ہے۔

اقتباسات طولانی ہیں۔ خاص کر جب کہ فارسی کے ساتھ اُن کے انگریزی ترجمے بھی دے گئے ہیں۔ حواشی غیر ضروری طریقہ سے طولانی ہو گئے ہیں۔ چند کتابوں کا پورا پورا نام بار بار دہرایا گیا ہے۔ جبکہ ان سے مخففات سے کام نکالا جا سکتا تھا۔ چھپائی کی غلطیاں بھی کافی ہیں۔

ہندوستان میں فارسی ادب کے مطالعہ میں ملکی عناصر کا خیال رکھنا ضروری ہے، بلکہ ان پر اصرار ہونا چاہیئے۔ دارا شکوہ اور جہاں آرا دونوں کو اس کتاب میں برابر سے ایک ایک صفحہ دیا گیا ہے جبکہ دارا شکوہ نے فارسی ادب میں اپنی تخلیق، تحریر اور سرپرستی سے ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ اس عہد میں بہت سی ہندوستانی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ ہوا اور مقامی داستانوں کو فارسی کا لباس پہنایا گیا ہے جنہیں پورے طریقے سے اب تک منظرِ عام پر نہیں لایا گیا ہے۔

(امیر حسن عابدی)

جواب طلب امور کے لئے مناسب سائز کا لفافہ اور ڈاک ٹکٹ ضرور بھیجیں



شتہ دنوں جمہوریہ گویانا کے وزیراعظم عزت مآب لینڈن
لبس سیمپن برنہم اور شریمتی وائلا برنہم ہندوستان کے
سرکاری دورے پر تشریف لائے تھے آپ نے ہندستانی
رہنماؤں سے مشترکہ دلچسپی کے مسائل پر بات چیت کی۔
(تصویر میں) ۲۸ جنوری کو آپ دونوں نے مہاتما گاندھی
کی سمادھی پر پھول چڑھائے۔



حکومت ہند ہر سال ہندوستانی زبانوں پر
شائع ہونے والی کتابوں کو بہترین طباعت، تز
کاری اور گٹ اپ کے مختلف زمروں کے
انعامات دیتی ہے۔ ۱۹۶۹ء کے دوران میں
اور شائع ہونے والی ہندوستانی زبانوں کے ا
قومی مقابلے میں نسخۂ عرشی زادہ دیوان غالب
غالب کو دو انعامات کا مستحق قرار دیا۔
(تصویر میں) ۳ فروری ۱۹۷۱ء کو شری گوپال سر
پاٹھک نائب صدر جمہوریہ ہند نے دگیان بھون
دلی میں منعقدہ ایک تقریب میں شری مودود علی
امروہوی کو پروڈکشن کا انعام دیا۔ دوسرا انعا
شری اکبر علی کو دیا گیا جو ڈیزائننگ کے
تھا۔





Vol. 29 No. 8 AJKAL (Monthly) March 1971

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi.
Printed by Skylark Printers, 11355 Idgah Road, New Delhi-55
Regd. No. D-509



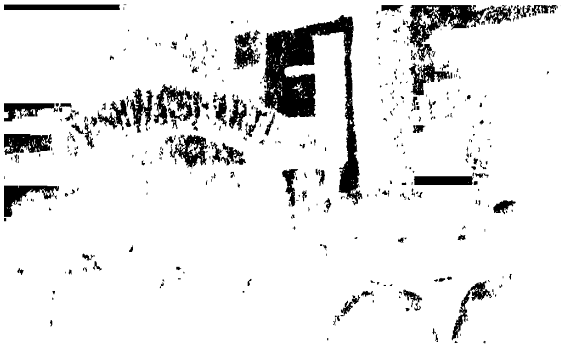




Vol. 29 No. 8 AJKAL (Monthly) March 1971

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi.
Printed by Skylark Printers, 11355 Idgah Road, New Delhi-55
Regd. No. D-509







مارچ ۱۹۷۱ء میں ہندوستان میں لوک سبھا اور بعض اسمبلیوں کے وسط مدتی انتخابات ہوئے آزاد اور غیر جانبدارانہ انتخابات جمہوریہ ہند کا طرۂ امتیاز رہے
تصویر میں :- (اوپر) سرینگر کے ایک پولنگ بوتھ کے سامنے ووٹروں کی قطار
(نیچے) کام روپ (آسام) کے ایک پولنگ بوتھ پر ووٹ ڈالنے والی خواتین اپنی باری کے انتظار میں کھڑی ہیں۔



# آج کل

نائب مدیر
نند کشور وکرم

جلد [illegible]
اپریل ۱۹۸۱ء
[illegible]

قیمت [illegible]




شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر آج کل (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

# ملاحظات

یکم مارچ سے دس مارچ کے درمیان دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت میں وسط مدتی انتخابات ہوئے۔ ملک بھر کی ۵۱۸ اور تامل ناڈو، مغربی بنگال اور اڑیسہ کی ۶۵۴ اسمبلی نشستوں کے لئے ووٹ ڈالے گئے۔ ووٹروں کی مجموعی تعداد تقریباً ۲۷ کروڑ ۵۰ لاکھ تھی جس میں سے تقریباً ۵۰ سے ۶۰ فی صد ووٹروں نے ووٹ ڈالے۔

متعدد سیاسی پارٹیوں کے علاوہ بہت سے آزاد امیدواروں نے چناؤ لڑا اور ووٹروں کے سامنے مختلف نوعیت اور پروگراموں کے منشور رہے لیکن رائے دہندوں نے کثرت رائے سے شری جگ جیون رام کی صدارت والی کانگریس کو کامیاب بنایا ہے۔ یہ الیکشن برسراقتدار کانگریس نے شریمتی اندرا گاندھی کی قیادت میں لڑا اور ملک سے غریبی، بیکاری اور پسماندگی دُور کرنے کے اُن کے پروگرام کو قبولیت عام نصیب ہوئی۔ اُن کو جو شاندار کامیابی حاصل ہوئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عوام ایک مستحکم اور پائیدار حکومت کے خواہاں ہیں تاکہ ایسی حکومت اعتماد کے ساتھ ملک میں ترقی پسند طاقتوں کو آگے بڑھائے اور جمہوریت، سیکولرازم اور سوشلزم کو فروغ دے۔

یہ انتخابات کئی لحاظ سے بڑے اہم ہیں۔ ووٹروں کی اکثریت نے ذات پات مذہب و فرقہ اور علاقائی عصبیت سے بالاتر ہو کر مسائل کی بنیاد پر ووٹ دیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ووٹروں کا سیاسی شعور اب پختہ ہو گیا ہے اور وہ سمجھنے لگے ہیں کہ اصل مسائل کیا ہیں اور اُن کے حل کرنے میں وہ کس طرح مددگار ہو سکتے ہیں۔ شریمتی اندرا گاندھی کو جو ملک گیر کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ معمولی علاقائی اختلافات سے قطع نظر تمام ملک کے بنیادی مسائل ایک ہیں اور سارے ملک کی قسمت ایک ہی ڈور سے بندھی ہے۔ ووٹروں نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ ملک کی ترقی اور خوشحالی تشدد، مذہبی منافرت اور علاقائی عصبیت میں نہیں ہے بلکہ ایک متوازن اور سنجیدہ سیاسی پروگرام میں ہے جس کے ذریعے بتدریج ملک کے مسائل کو حل کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں آزادی سے پہلے لوگوں کو بڑے محدود پیمانے پر ووٹ دینے کا حق حاصل تھا جبکہ جمہوریہ ہند کے قیام کے بعد تمام بالغوں کو ووٹ ڈالنے کا حق دیا گیا۔ یہ ایک جرأت مندانہ قدم تھا اور ہندوستان کے دستور سازوں نے یہ بڑا انقلاب آفریں فیصلہ کیا تھا۔ [illegible] انتخابات اور حالیہ انتخاب سے ظاہر ہو گیا کہ ان پر جو اعتماد کیا گیا تھا وہ بالکل صحیح تھا۔

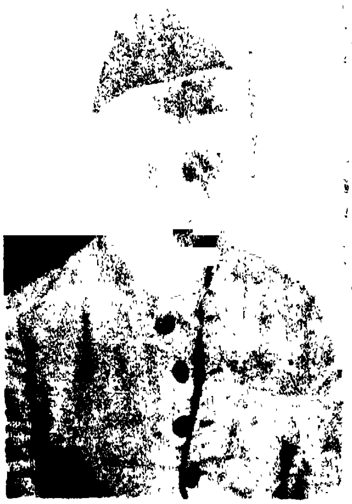
آزادانہ اور بالکل غیر جانبدارانہ انتخابات کے لئے الیکشن کمیشن نے بڑے پیمانے پر تیاریاں کی تھیں۔ ایک اندازے کے مطابق الیکشن کے مختلف کاموں میں تقریباً ۳۰ لاکھ سرکاری کارکن مصروف رہے۔ ۵۱۸ انتخابی حلقوں میں ۳ لاکھ ۴۰ ہزار سے زائد پولنگ بوتھ قائم کئے گئے۔ ان بوتھوں پر دس لاکھ بیلٹ بکس پہنچائے گئے۔

نئے انتخابات نے ملک میں امید و اعتماد کی ایک فضا پیدا کی ہے۔ جمہوری طریقہ کار، سیکولرازم، اور پُرامن طریقہ کار میں لوگوں کا اعتماد بڑھا ہے اور دنیا کے سامنے ایک اچھا اور مثالی نمونہ آیا ہے۔ ضرورت ہے کہ عوام بھی [illegible] سے کام کریں اور ملک کو آگے بڑھانے میں بھرپور حصہ لیں۔

ویسٹ انڈیز کے اپنے حالیہ دورے میں ہندوستانی کرکٹ ٹیم نے ویسٹ انڈیز کے ساتھ اپنے دوسرے میچ میں ویسٹ انڈیز کو سات وکٹوں سے شکست دی ہے۔ گزشتہ ۲۲ سال میں ویسٹ انڈیز کے خلاف ہندوستان کی یہ پہلی جیت ہے۔ اس سلسلہ کا پہلا میچ برابر رہا ہے۔

کرکٹ کے کھیل میں ہندوستان کی یہ شاندار کامیابی [illegible] دوسرے کھیلوں میں بھی ہندوستانی کھلاڑیوں نے خاصا نام پیدا کیا ہے ہمیں امید [illegible] آئندہ بھی ہمارے کھلاڑی مزید کامیابیاں حاصل کریں گے۔

گنج گل نئی دہلی



جمیل مظہری

غزل

یہ خراب خانوں میں جا بسے، وہ حرم تک آکے ٹھہر گئے
وہیں رہ گزر پہ ہیں چپ کھڑے جو اِدھر گئے نہ اُدھر گئے

جو حرم میں آئے تھے دیر سے، وہ حرم سے لوٹ کے گھر گئے
جنہیں گھر کی راہ نہ مل سکی وہ خبر نہیں کہ کدھر گئے

وہ تشنگی کو بتا سکیں گے سراب و آب کا فاصلہ
جو دیارِ نکہت و رنگ سے بہ مقامِ فکر و نظر گئے

ہے ستم و کرم کی بحث کیا، چلی تند و تیز سی اک ہوا
جو نکھر گئے سو نکھر گئے، جو بکھر گئے سو بکھر گئے

ترے ذہن کا یہ فشار ہے کہ اس آئینے پہ غبار ہے
جنہیں تھا سنورنے کا حوصلہ اسی آئینے میں سنور گئے

نہ خفا ہو میرے دماغ سے، نہ بہل سکوں گا چراغ سے
تو انہیں میں مجھ کو شمار کر جو لیے امیدِ سحر گئے

نہ ہوں کیوں کر اس پہ نثار ہم، ہوئے تیرگی میں شرار ہم
ہیں وہ کرمکِ شبِ تار ہم جو نمودِ صبح سے ڈر گئے

نہ غبارِ دوشِ صبا بنے، نہ شمیمِ زلفِ رسا بنے
نہ خروشِ بانگِ درا بنے، بڑی خامشی سے گزر گئے

کوئی نقشِ پا نہ بنا سکے، کوئی راستہ نہ بنا سکے
یہ سفر تو کوئی سفر نہیں کہ مثالِ گردِ سفر گئے

گزر اس مقام سے سرسری، یہ دیارِ عشق ہے مظہری
جو گزر گئے سو گزر گئے، جو ٹھہر گئے سو ٹھہر گئے

محمد حسن

# حصارِ دوراں

(۱۴)

اپنے بارے میں کیا لکھوں۔ واقعات اور شخصیات جنہوں نے متاثر کیا وہ ہیں جن میں گفتنی درج گزشت باقی جو ہیں ناگفتنی۔ ناگفتنی کو کہنے میں فسادِ خلق کا اندیشہ اور سراندیشہ اندیشہ ہائے دور و دراز سے عبارت ہے۔ پھر بہت سے اثرات ایسی شخصیتوں اور ایسے واقعات کے ہوتے ہیں، جو کسی گزشت میں درج نہیں جن کو پہچاننا خود میرے لیے بھی دشوار ہے۔

ایک واقعہ جو ابھی یاد آیا ہے اس کے کردار بھی اسی نوعیت کے ہیں۔ میوٹ مسلم ہائی اسکول مرادآباد میں زیرِ تعلیم تھا، زمانہ وہ تھا جب انگریز ہندوستان پر حکمراں تھے اور سرمحمد یعقوب جو اس زمانے کی اہم شخصیتوں میں تھے ہمارے اسکول کے طلبا کو اطیعو اللہ و اطیعو الرسول و اولی الامر منکم کا یہ مطلب سمجھاتے تھے کہ ہر ایک مسلمان پر خدا رسول کے علاوہ حکمرانوں کی اطاعت بھی فرض ہے۔ نواب صاحب رامپور باہر کے دورے سے واپس آتے اور اسکول کے سامنے والے کٹ گھر اسٹیشن سے ان کا اسپیشل گزرتا تو اسکول سے لڑکے سلامی کے لیے جمع کیے جاتے اور مٹھائی تقسیم ہوتی۔ اسکول کے چار اساتذہ کی شخصیتوں کا نقش میرے لیے آج بھی ناقابلِ فراموش ہے۔ ان میں ایک تھے محمد طیب جن سے اچھا اُستاد مجھے زندگی میں میسر نہ ہوا۔ ان کا ہنر یہ تھا کہ مشکل سے مشکل اور خشک سے خشک مضمون کو ایسا دلکش اور دلچسپ بنا دیتے تھے کہ اس کے بغیر جینا دشوار ہو جاتا تھا۔ اُن کی ذہانت ہر مضمون میں نئی کشش پیدا کرتی اور تعلیم کو ایک جیتا جاگتا تجربہ بنا دیتی تھی۔ دوسرے تھے حلیم صاحب جو ہم سب کو یورپین ہسٹری پڑھاتے تھے۔ سیدھے سادے پان کھانے والے سیاہ شیروانی پہنے والے بید کی چھڑی ہلاتے ہوئے کلاس میں آتے، لڑکے اُن کے کلاس میں شور مچاتے اور وہ پورے خلوص سے پڑھاتے رہتے، پھر ایک دن معلوم ہوا کہ وہ نوکری سے الگ ہو گئے۔ لڑکے اُن کے پاس گئے تو انہوں نے لڑکوں کو ڈانٹ بتائی جاؤ اپنا کام کرو تمہیں ان جھگڑوں سے کیا مطلب۔ منیجر صاحب چاہتے ہیں کہ میں تم لوگوں پر سختی کر کے ڈسپلن قائم کروں، تم ہی تو میرے بچے ہو۔ اگر میرا بیٹا زندہ رہتا تو کیا تمہاری طرح شرارتیں نہ کرتا؟ کیا میں اس کے ساتھ سختی کرتا۔ مجھ سے یہ نہ ہوگا۔ جاؤ اپنا کام کرو۔“

تیسرے تھے اسفندیار بیگ صاحب جو ہمیشہ کھوئے کھوئے سے رہتے۔ حساب کا کوئی سوال مروجہ قاعدوں سے شاید ہی کبھی حل کرتے ہوں ہمیشہ انوکھا زاویہ نکالتے اور حساب اور ریاضی کے سوالوں کے انہی زاویوں میں گم رہتے تھے۔ بہت نئی باتیں جدت ذہن سے پیدا کرتے اور باقی تمام باتوں کو ذہن سے نکال دیا کرتے جیسے ریاضی حساب کے مسائل کے علاوہ زندگی کے باقی تمام مسائل فضول اور لایعنی ہوں۔ چوتھے تھے ضیاء الدین صاحب جو تاریخ کے اُستاد تھے، خاموش، متدین اور سنجیدہ، کھدر کی شیروانی اور ٹوپی پہنتے اور پورے اسکول میں اکیلے معتبر اور مستند کانگرسی سمجھے جاتے۔ گفتگو ہمیشہ دھیمی آواز میں کرتے اور غصہ شاذ و نادر ہوتے تھے۔ کلاس میں البتہ تاریخ کی تعبیر وہ اسی نہج سے ضرور کر دیتے تھے جس سے اپنی سیاسی غلامی اور انگریز دشمنی کا نقش جاگزیں ہوتا جاتا تھا۔

ان چار کرداروں نے میری شخصیت کی تصنیف و تالیف کی۔ طیب صاحب نے علم و ادب سے گہری شغف پیدا کرائی۔ اسفندیار بیگ صاحب نے اس شغل میں حریت کا سبق دیا۔ حلیم صاحب سے درد مندی سیکھی اور ضیاءالدین صاحب سے انگریز دشمنی اور سیاسی غلامی کے خلاف نفرت کا سبق ملا۔ انہیں سے کمیونسٹ تحریک کی ابتدائی معلومات حاصل کیں اور اخبارات کے مطالعے کی ابتدا ہوئی۔ اسفندیار بیگ صاحب کسی دوسرے صاحب کا کلاس لے رہے تھے انہوں نے آتے ہی بازی کے لیے

ت کردیا۔ میرے ہم جماعتوں میں ایک نہایت خوش رو اور تنومند طالب علم غفران تھا جو تنہا پورے کلاس سے بیت بازی کا مقابلہ کر رہا تھا۔ گھنٹہ ختم ہو گیا بیت بازی ختم نہ ہوئی۔ دوسرے دن غفران کو ہرانے کے لیے میں نے اپنے والد سے پہلی بار دیوانِ غالب کا نظامی ایڈیشن حاصل کیا اور ذ۔ خ۔ ط۔ ث وغیرہ پر ختم ہونے والے اشعار رٹ لیے مگر دوسرے دن بھی میدان غفران ہی کے ہاتھ رہا مگر دیوانِ غالب سے یہ میرا پہلا تعارف تھا۔ دیوان کوئی بیس سال پہلے تک میرے قبضے میں رہا اور ہر بار اس کے مطالعے سے ایک خاص قسم کی زندگی اور روشنی ملتی رہی۔ ادب زندگی کے ایک شعبے بلکہ ایک لازمی حصے کی طرح میرے سامنے آیا اور اس کا جادو اتنا گہرا ہوتا چلا گیا کہ جب نویں جماعت میں سائنس یا عربی لینے کا سوال تھا تو میں نے اپنے والد کی مرضی کے خلاف سائنس سے دامن کشی اختیار کی اور ادب کے کوچے میں رہ نوردی کا سلسلہ شروع ہوا۔

اس کے بعد کی یادیں بڑی منتشر سی ہیں مراد آباد کا گنج بازار لال جھنڈے اٹھائے ہوئے گریش ماتھر اور معصوم حسین نجم کچھ میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے لوگ، انقلاب زندہ باد کے نعرے میرے لیے یہ سب کچھ بہت اجنبی تھا۔ میرا خاندان مراد آباد کے نہایت متشرع خاندانوں میں تھا۔ دھیرے دھیرے فکری اور جذباتی بغاوت کی یہ آنچ تیز ہوتی گئی۔ اسباب و محرکات کی فہرست طولانی ہے مگر ۱۹۴۲ء شروع ہوتے ہوئے اس نو عمر لڑکے نے جس نے کبھی اپنے گھر سے تنہا قدم باہر نہیں نکالا تھا فکر کے تمام مسلمات و اقدار پر سوالیہ نشان قائم کرنے شروع کر دیے، اور جب پرائیوٹ انٹرمیجیٹ پاس کرنے کے بعد اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لیے کسی دوسری یونیورسٹی جانے کا سوال تھا تو میری آزاد روی مجھے علی گڑھ کے بجائے لکھنؤ لے گئی، جو ان دنوں باغیانہ فکر کا مرکز تھا۔

۱۹۴۲ء میں لکھنؤ پہنچا تھا اور ۱۹۵۴ء تک وہیں رہا۔ عمر عزیز کا اچھا خاصا بڑا حصہ وہیں گزرا۔ نیا ادب مکمل کے بند ہو چکا تھا۔ سردار جعفری اور مجاز دونوں وہاں سے جا چکے تھے۔ ڈاکٹر رشید جہاں اور اُن کے شوہر صاحب زادہ محمود الظفر البتہ تھے۔ یونیورسٹی سیاسی آزادی کے نعروں سے آباد تھی۔ کانگریس کے چلائے ہوئے انفرادی ستیہ گرہ میں ڈاکٹر عبد العلیم اور ڈاکٹر حسین ظہیر بھی جیل گئے تھے۔ غرض لکھنؤ ملک کی فکری اور سیاسی فضا کا آئینہ تھا۔ جولائی میں لکھنؤ پہنچا تھا۔ اگست ۱۹۴۲ء میں "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک چلی اور طلبا کے جلوس پر فائرنگ ہوئی۔ پوری فضا جیسے برق رفتار تیزی سے بدل گئی۔ اور نوجوان طلبا کی زندگی میں آزادی کے چیلنج کے سوا باقی ہر چیز فضول سی معلوم ہونے لگی۔

اسی موڑ پر میری ملاقات ان چار شخصیتوں سے ہوئی جنہوں نے میری زندگی پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں ان میں پہلا نام اسرار الحق مجاز کا ہے۔ دوسرا نصیر حیدر کا تیسرا پروفیسر احتشام حسین کا اور چوتھا پروفیسر آل احمد سرور کا۔ مجھے تصنیف و مطالعہ کا مرض تو ایام طالب علمی ہی میں لاحق ہو چکا تھا لیکن مجاز نے پہلی بار ادب کو زندگی بنا کے گزارنے کی تصویر میرے سامنے پیش کر دی۔ آج اس شخصیت کے سارے دل نواز گوشوں کو چند لفظوں میں بیان کرنا بھی ممکن نہیں جو لوگ مجاز سے نہیں ملے وہ صرف اُن کے کلام سے شخصیت تک پہنچنے میں دشواری محسوس کریں گے۔ "دیوداس" فلم کے بعد جو ایک نسل ہندوستانی نوجوانوں میں ابھری تھی جو عشق کو خود سوزی کا ذریعہ جانتی تھی اور تصور پرستی کی قربان گاہ پر مادی راحتوں اور آسودگیوں کی قربانی دینے کا کس بل رکھتی تھی، اسی کی ایک خاموش تصویر مجاز تھے۔ بذلہ سنجی، لطیفہ بازی اور شانِ کج کلاہی میں ایک عجیب شان تھی جو زندگی کی ظاہری چمک دمک اور آسودگی کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ شراب اس راہ کی آتش نمرود تھی۔ جس میں بقول مجاز جل بجھے کتنے خلیل، آگ گلستاں نہ بنی" مگر مجاز سے غنیمت الزکانی اور گھٹیا ادبی اور غیر ادبی سازشوں سے نفرت کا سبق سیکھنے کی کوشش کی مجھے مجاز کی سی رندی ملی نہ بانکپن مگر مجاز کی زندگی اور اُس کے کرب و اضطراب نے یہ ضرور دکھا دیا کہ ایک شعر تر کے لیے تجربات کے کتنے جہنموں سے گزرنا ہوتا ہے اور زندگی کو شاعری اور شاعری کو زندگی بنانے کی ہفتخوان کیسی دشوار ہے۔

نصیر حیدر کو بہت کم لوگ جانتے ہیں لیکن اس شخص نے شعری کیفیات کو زندگی بنانے کا جو تجربہ کیا تھا اس کی نظیر میرے نزدیک بہت کم ہوگی۔ نصیر حیدر ایک کھاتے پیتے گھرانے کا چشم و چراغ ہونے کے باوجود زندگی کی معنویت کی جان کاہ تلاش میں اس طرح سرگرداں پھرا کہ پھر اپنی منزل تک نہ پہنچا۔ زندگی کے تجربات جو حسی کیفیات چھوڑتے ہیں ان کی اصل کیا ہے اور نشاط و الم کے ان لمحوں میں انسانی زندگی کی تکمیل کا احساس مضمر ہے یا نہیں؟ کیا نشاط اور مسرت کی تلاش آرزوؤں کی تکمیل کے ذریعے ممکن ہے؟ یا مسرت کوئی اور شے ہے؟ اور ان سوالوں کے جواب میں نصیر حیدر نے اپنی زندگی کو اسی طرح تار تار کر ڈالا جیسے کوئی سائنس داں معمل میں کسی شے کا کیمیاوی تجزیہ کرتا ہو۔ نصیر حیدر شاعر تھا اور ہے مگر زندگی کی اصل صلابت اور حقیقی معنویت کی تلاش میں وہ اتنی دُور جا چکا تھا کہ اسے اپنے کلام کی اشاعت کا عمل بھی مہمل نظر آنے لگا تھا۔ زندگی کے خلا کا ایسا بامعنی احساس، انسانی Predicament کا ایسا بھرپور تجربہ شاید ہی اس سے قبل اس طرح پیش کیا گیا ہو۔ چند شعر سنیے۔

کچھ ہوا تیز تھی کھلی تھی کتاب ؛ ایک پچھلا ورق الٹ آیا

---

یہ کھنڈر دیکھو اسی طرح کے کتنے نقشے
اہلِ تعمیر ابھی بیٹھے بناتے ہونگے

---

محمد حسن

# کاروان

(۱۴)

اپنے بارے میں کیا لکھوں۔ واقعات اور شخصیات جنہوں نے متاثر کیا وہ ہیں جن میں گفتنی درج گزٹ باقی جو ہیں ناگفتنی۔ ناگفتنی کو کہنے میں فسادِ خلق کا اندیشہ اور ہر اندیشہ اندیشہ ہائے دور و دراز سے عبارت ہے۔ پھر بہت سے اثرات ایسی شخصیتوں اور ایسے واقعات کے ہوتے ہیں، جو کسی گزٹ میں درج نہیں جن کو پہچاننا خود میرے لئے بھی دشوار ہے۔

ایک واقعہ جو ابھی یاد آیا ہے اس کے کردار بھی اسی نوعیت کے ہیں۔ ہیوٹ مسلم ہائی اسکول مراد آباد میں زیرِ تعلیم تھا۔ زمانہ وہ تھا جب انگریز ہندوستان پر حکمراں تھے اور سر محمد یعقوب جو اس زمانے کی اہم شخصیتوں میں تھے ہمارے اسکول کے طلبا کو اطیعو اللہ و اطیعو الرسول و اولی الامر منکم کا یہ مطلب سمجھاتے تھے کہ ہر ایک مسلمان پر خدا رسول کے علاوہ حکمرانوں کی اطاعت بھی فرض ہے۔ نواب صاحب رامپور باہر کے دورے سے واپس آتے اور اسکول کے سامنے والے کٹ گھر اسٹیشن سے ان کا اسپیشل گزرتا تو اسکول کے لڑکے سلامی کے لئے جمع کئے جاتے اور مٹھائی تقسیم ہوتی۔ اسکول کے چار اساتذہ کی شخصیتوں کا نقش میرے لئے آج بھی ناقابلِ فراموش ہے۔ ان میں ایک تھے محمد طیب جن سے اچھا اُستاد مجھے زندگی میں میسر نہ ہوا ان کا ہنر یہ تھا کہ مشکل سے مشکل اور خشک سے خشک مضمون کو ایسا دلکش اور دلچسپ بنا دیتے تھے کہ اس کے بغیر جینا دشوار ہو جاتا تھا۔ اُن کی ذہانت ہر مضمون میں نئی کشش پیدا کرتی اور تعلیم کو ایک جیتا جاگتا تجربہ بنا دیتی تھی۔ دوسرے تھے حلیم صاحب جو ہم سب کو یورپین ہسٹری پڑھاتے تھے۔ سیدھے سادے پان کھانے والے سیاہ شیروانی پہنے والے بید کی چھڑی ہلاتے ہوئے کلاس میں آتے، لڑکے ان کے کلاس میں شور مچاتے اور وہ پورے خلوص سے پڑھاتے رہتے، پھر ایک دن معلوم ہوا کہ وہ نوکری سے الگ ہو گئے۔ لڑکے اُن کے پاس گئے تو انہوں نے لڑکوں کو ڈانٹ بتائی "جاؤ اپنا کام کرو۔ تمہیں ان مضمونوں سے کیا مطلب۔ منیجر صاحب چاہتے ہیں کہ میں تم لوگوں پر سختی کر کے ڈسپلن قائم رکھوں۔ تم ہی تو میرے بچے ہو۔ اگر میرا بیٹا زندہ رہتا تو کیا تمہاری طرح شرارتیں نہ کرتا؟ کیا میں اس کے ساتھ سختی کرتا۔ مجھ سے یہ نہ ہوگا۔ جاؤ اپنا کام کرو۔"

تیسرے تھے اسفندیار بیگ صاحب جو ہمیشہ کھوئے کھوئے سے رہتے۔ حساب کا کوئی سوال مروجہ قاعدوں سے شاید ہی کبھی حل کرتے ہوں ہمیشہ انوکھا زاویہ نکالتے اور حساب اور ریاضی کے سوالوں کے انہی زاویوں میں گم رہتے تھے نئی نئی باتیں جدتِ ذہن سے پیدا کرتے اور باقی تمام باتوں کو ذہن سے ایسا محو کر دیتے جیسے ریاضی حساب کے مسائل کے علاوہ زندگی کے باقی تمام مسائل صفر اضافی ہیں۔ اور چوتھے ضیاء الرحمٰن صاحب جو تاریخ کے اُستاد تھے بخاموش متدین اور سنجیدہ، کھدر کی شیروانی اور ٹوپی پہنے اندر پورے اسکول میں اکیلے معتبر اور مستند کانگرسی سمجھے جاتے۔ گفتگو ہمیشہ مدھم آواز میں کرتے اور غصہ شاذ و نادر ہوتے تھے۔ کلاس میں البتہ تاریخ کی تعبیر وہ اسی نہج سے ضرور کر دیتے تھے جس سے اپنی سیاسی غلامی اور انگریز دشمنی کا نقش ہر اگر ہی ہوتا جاتا تھا۔

ان چار کرداروں نے میری شخصیت کی تعمیر و تاسیس کی۔ طیب صاحب نے علم و ادب سے گہری شیفتگی پیدا کرائی۔ اسفندیار بیگ صاحب نے اس شیفتگی میں محویت کا سبق دیا۔ حلیم صاحب سے دردمندی سیکھی اور ضیاء الرحمٰن صاحب سے انگریز دشمنی اور سیاسی غلامی کے خلاف نفرت کا سبق ملا جس سے کھدر پہننا شروع کیا۔ سیاسیات کی ابتدائی معلومات حاصل کیں اور اخبارات کے مطالعے کی ابتدا ہوئی۔ اسفندیار بیگ تھا کسی دوسرے صاحب کا کلاس لے رہے تھے انہوں نے آتے ہی بازی کے لئے

وقف کر دیا۔ میرے ہم جماعتوں میں ایک نحیف و نزار و اور تنومند طالب علم غفران تھا جو تنہا پورے کلاس سے بیت بازی کا مقابلہ کر رہا تھا۔ گھنٹہ ختم ہو گیا بیت بازی ختم نہ ہوئی۔ دوسرے دن غفران کو ہرانے کے لیے میں نے اپنے والد سے پہلی بار دیوانِ غالب کا نظامی ایڈیشن حاصل کیا اور ذ۔ مق۔ ظ۔ ٹ وغیرہ پر ختم ہونے والے اشعار رٹ لیے مگر دوسرے دن بھی میدان غفران ہی کے ہاتھ رہا مگر دیوانِ غالب سے یہ میرا پہلا تعارف تھا۔ دیوان کوئی دس سال پہلے تک میرے قبضے میں رہا اور ہر بار اس کے مطالعے سے ایک خاص قسم کی زندگی اور روشنی ملتی رہی۔ ادب زندگی کے ایک شعبے بلکہ ایک لازمی حصے کی طرح میرے سامنے آیا اور اس کا جادو اتنا گہرا ہوتا چلا گیا کہ جب نویں جماعت میں سائنس یا عربی لینے کا سوال تھا تو میں نے اپنے والد کی مرضی کے خلاف سائنس سے دامن کشی اختیار کی اور ادب کے کوچے میں رہ نوردی کا سلسلہ شروع ہوا۔

اس کے بعد کی یادیں بڑی منتشر سی ہیں۔ مراد آباد کا گنج بازار لال جھنڈے اٹھائے ہوئے کرشن ماتھر اور مصور حسین نجم کچھ میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے لوگ، انقلاب زندہ باد کے نعرے میرے لیے یہ سب کچھ بہت اجنبی تھا۔ میرا خاندان مراد آباد کے نہایت متشرع خاندانوں میں تھا۔ دھیرے دھیرے فکری اور جذباتی بغاوت کی یہ آنچ تیز ہوتی گئی۔ اسباب و محرکات کی فہرست طولانی ہے مگر ۱۹۴۱ء شروع ہوتے ہوئے اس نوعمر لڑکے نے جس نے کبھی اپنے گھر سے تنہا قدم باہر نہیں نکالا تھا فکر کے تمام مسلمات و اقدار پر سوالیہ نشان قائم کرنے شروع کر دیے، اور جب پرائیوٹ انٹرمیجیٹ پاس کرنے کے بعد اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لیے کسی دوسری یونی ورسٹی جانے کا سوال تھا تو میری آزاد روی مجھے علی گڑھ کے بجائے لکھنؤ لے گئی، جو ان دنوں باغیانہ فکر کا مرکز تھا۔

۱۹۴۲ء میں لکھنؤ پہنچا تھا اور ۱۹۵۴ء تک وہیں رہا۔ عمرِ عزیز کا اچھا خاصا بڑا حصہ وہیں گزرا۔ نیا ادب مکمل کے بند ہو چکا تھا۔ سردار جعفری اور مجاز دونوں وہاں سے جا چکے تھے۔ ڈاکٹر رشید جہاں اور اُن کے شوہر صاحب زادہ محمود الظفر البتہ تھے۔ یونی ورسٹی سیاسی آزادی کے نعروں سے آباد تھی۔ کانگریس کے چلائے ہوئے انفرادی ستیہ گرہ میں ڈاکٹر عبد العلیم اور ڈاکٹر حسین ظہیر بھی جیل گئے تھے غرض لکھنؤ ملک کی فکری اور سیاسی فضا کا آئینہ تھا۔ جولائی میں لکھنؤ پہنچا تھا۔ اگست ۱۹۴۲ء میں ہندوستان چھوڑ دو تحریک چلی اور طلبا کے جلوس پر فائرنگ ہوئی۔ پوری فضا جیسے برق رفتار تیزی سے بدل گئی اور نوجوان طلبا کی زندگی میں آزادی کے چیلنج کے سوا باقی ہر چیز فضول سی معلوم ہونے لگی۔

اسی موڑ پر میری ملاقات ان چار شخصیتوں سے ہوئی جنھوں نے میری زندگی پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں ان میں پہلا نام اسرار الحق مجاز کا ہے۔ دوسرا نصیر حیدر کا تیسرا پروفیسر احتشام حسین کا اور چوتھا پروفیسر آل احمد سرور کا۔ مجھے تصنیف و مطالعہ کا مرض تو ایام طالب علمی ہی میں لاحق ہو چکا تھا لیکن مجاز نے پہلی بار ادب کو زندگی بنا کے گزارنے کی تصویر میرے سامنے پیش کر دی۔ آج اس شخصیت کے سارے دل نواز گوشوں کو چند لفظوں میں بیان کرنا بھی ممکن نہیں جو لوگ مجاز سے نہیں ملے وہ صرف اُن کے کلام سے شخصیت تک پہنچنے میں دشواری محسوس کریں گے۔ "دیوداس" فلم کے بعد جو ایک نسل ہندوستانی نوجوانوں میں ابھری تھی جو عشق کو خود سوزی کا ذریعہ جانتی تھی اور تصور پرستی کی قربان گاہ پر مادی راحتوں اور آسودگیوں کی قربانی دینے کا حوصلہ رکھتی تھی، اسی کی ایک خاموش تصویر مجاز تھے۔ بذلہ سنجی، لطیفہ بازی اور شانِ کج کلاہی میں ایک عجیب شان تھی جو زندگی کی ظاہری چمک دمک اور آسودگی کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ شراب اس راہ کی آتش نمرود تھی۔ جس میں بقول مجاز سبل بجھے کتنے خلیل، آگ گلستاں نہ بنی مگر مجاز سے خفیف الحرکاتی اور گھٹیا ادبی اور غیر ادبی سازشوں سے نفرت کا سبق سیکھنے کی کوشش کی مجھے مجاز کی سی زندگی ملی نہ پائیں مگر مجاز کی زندگی اور اُس کے کرب و اضطراب نے یہ ضرور دکھا دیا کہ ایک شعر تر کے لیے تجربات کے کتنے جہنموں سے گزرنا ہوتا ہے اور زندگی کو شاعری اور شاعری کو زندگی بنانے کی ہفتخواں کیسی دشوار ہے۔

نصیر حیدر کو بہت کم لوگ جانتے ہیں لیکن اس شخص نے شعری کیفیات کو زندگی بنانے کا جو تجربہ کیا تھا اس کی نظیر میرے نزدیک بہت کم ہوگی۔ نصیر حیدر ایک کھاتے پیتے گھرانے کا چشم و چراغ ہونے کے باوجود زندگی کی معنویت کی جان کاہ تلاش میں اس طرح سرگرداں پھرا کہ پھر اپنی منزل تک نہ پہنچا۔ زندگی کے تجربات جو حسی کیفیات چھوڑتے ہیں ان کی اصل کیا ہے اور نشاط و الم کے ان لمحوں میں انسانی زندگی کی تکمیل کا احساس معتبر ہے یا نہیں؟ کیا نشاط اور مسرت کی تلاش آرزوؤں کی تکمیل کے ذریعے ممکن ہے؟ یا مسرت کوئی اور شے ہے؟ اور ان سوالوں کے جواب میں نصیر حیدر نے اپنی زندگی کو اسی طرح تار تار کر ڈالا جیسے کوئی سائنس داں معمل میں کسی شے کا کیمیاوی تجزیہ کرتا ہو۔ نصیر حیدر شاعر تھا اور ہے مگر زندگی کی اصلی صلابت اور حقیقی معنویت کی تلاش میں وہ اتنی دُور جا چکا تھا کہ اسے اپنے کلام کی اشاعت کا عمل بھی مہمل نظر آنے لگا تھا۔ زندگی کے خلا کا ایسا بامعنی احساس، انسانی Predicament کا ایسا بھرپور تجربہ شاید ہی اس سے قبل اس طرح پیش کیا گیا ہو۔ چند شعر سنیے۔

کچھ ہوا تیز تھی کُھلی تھی کتاب ؛ ایک پچھلا ورق الٹ آیا

---

یہ کھنڈر دیکھو اسی طرح کے کتنے نقشے
اہلِ تعمیر ابھی بیٹھے بناتے ہونگے

---

اسی پہ اہلِ ہوس پھر رہے ہیں ہو اتراتے
وہ اک کرم جو ہمیں بارہا میسر تھا

اب ڈھونڈیے تو اس کا نشاں بھی نہ پائیے
وہ موج جو سفینۂ دل کو ڈبو گئی

پھر احتشام صاحب کا نام ہے جنہوں نے کلاس میں اور اس کے باہر مجھے فکر کی نئی جہتوں کی طرف متوجہ کیا۔ مارکسزم سے میرا تعارف مراد آباد ہی میں ہو چکا تھا مگر اسے علمی اور فلسفیانہ راہ کے اعتبار سے یہ تعارف احتشام صاحب کی وساطت سے ہوا۔ احتشام صاحب نے ادب کو علم و دانش کا ایک حصہ بنا کر پیش کیا اور اس کا رشتہ تمام انسانی علوم سے اس طرح ملا دیا کہ ادب کی راہ سے انسانی فکر و دانش کے سبھی شعبوں کے دروازے کھلتے نظر آنے لگے۔ ان کے اندازِ بیان سے اثر قبول کرنے میں میں نے عمداً بہت احتیاط سے کام لیا ہے لیکن اُن کے اندازِ فکر کے نقوش میری تحریروں میں اور شاید میری شخصیت میں بھی ملیں گے۔ مجروح کا ایک شعر ہے شعر بہت بعد کا ہے لیکن ان تینوں شخصیتوں کے اثرات کا لب و لباب اسی ایک شعر میں آجاتا ہے۔

جلا کے مشعلِ جاں ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے

آل احمد سرور سے میری پہلی ملاقات ۱۹۴۴ء کے لگ بھگ ہوئی تھی ۱۹۴۶ء میں ان کے لکھنؤ آنے کے بعد سے لے کر علی گڑھ سے میرے دہلی آنے تک ان کے قریب ہونے کا موقع ملا — — — — — — سرور صاحب کی شخصیت میں دل نوازی اور کشش بے پناہ تھی اور ان کے اندازِ گفتگو میں نرمی، اندازِ تحریر میں شگفتگی اور چاشنی تھی اور ایک خاص قسم کا توازن اور رجائیت میرا اپنا خیال ہے کہ لکھنؤ میں قیام کے دوران میں یہ سب خوبیاں اپنے عروج پر تھیں۔ اُن سے بھی میں نے بہت کچھ سیکھا اور پایا۔

جہاں تک کتابوں کا سوال ہے مجھے ان سب کتابوں نے متاثر کیا ہے جن میں "شیریں دیوانگی" کے نقوش ہوں خاص طور پر گوئٹے کے ناول (Sorrow Of Weather) میں ورتھر کی داستانِ غم کے اثرات مدت تک میرے ذہن پر مرتسم رہے پھر وان گوگ کی سوانح پر مبنی ارونگ اسٹون کا ناول (Lust For Life) نے ایک مدت تک میرے ذہن پر غلبہ قائم رکھا "تصور پرستی کی ایک آگ تھی جو ان ناولوں نے روشن کی اس آگ کے ناچتے شعلوں میں زندگی کی مادی آسائشوں اور عظمتوں کی تلاش مہمل نظر آنے لگی اور وجود میں ایک حقیقی معنویت کی تلاش کے لیے اضطراب پیدا ہوا۔

۱۹۴۲ء سے لے کر ۱۹۵۴ء تک کی روداد لکھنؤ کی ہے جسے میرا تشکیلی دور کہا جا سکتا ہے۔ اسی دوران ملک تقسیم ہوا۔ فرقہ وارانہ فسادات نے ملک میں خون کی ندیاں بہا دیں۔ اُردو سے آسانیاں چھین لی گئیں، زمینداریاں ختم ہوئیں اور میرا خاندان امارت سے غربت کی طرف آ گیا۔ میں نے ایم۔ اے اور کچھ سال بعد پی ایچ ڈی کر کے انگریزی اخبار "پائنیر" کی نائب مدیری کی صف میں شامل ہو گیا۔ چند سال ان کی نیم ماہی فلم میگزین "فلم میل" کا مدیر بھی رہا۔ مگر اسی دوران برابر تنقیدی مضامین اور ڈرامے لکھتا رہا اس لئے کہ ان ذرائع سے اپنی شخصیت کا اظہار کرنے کے لئے اپنے کو مجبور پاتا تھا۔ تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ "ادبی تنقید" کے نام سے اور خطوط کا پہلا مجموعہ "تپسیا اور پرچھائیں" کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے کچھ دنوں بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں بحیثیت لیکچرار تقرر ہوا اور ۱۹۶۳ء تک وہیں رہا۔

علی گڑھ میں جن شخصیتوں نے مجھے متاثر کیا ان میں سرفہرست پروفیسر رشید احمد صدیقی کا نام ہے جو ان دنوں شعبۂ اُردو کے صدر تھے۔ لندن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے اسرار و رموز بہت دھیرے دھیرے کھولتا ہے۔ رشید صاحب کا بھی یہی حال ہے۔ وہ اپنے حیرت خیز اور اعلیٰ ترین انسانی اور فنی جوہروں کو نرگل کی طرح چھپائے رہتے ہیں۔ جب تک کسی کو اُن سے قریب ہونے کی سعادت حاصل نہ ہو اس وقت تک ان کی صحیح عظمت کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ لفظ کی جیسی پرکھ اور اندازِ بیان کی لطیف ترین پرتوں کی جیسی پہچان انہیں ہے ہکسلے کے بعد شاید ہی کسی کو ملی ہو۔ اُردو نثر کا ایسا مزاج داں شاید ہی کبھی پیدا ہوا ہو۔

پھر ایک عجیب و غریب شخصیت مسعود حسین خاں کی ہے جنہوں نے ایک محترم رفیق اور شفیق دوست کی حیثیت سے اپنے اثرات چھوڑے ہیں۔ مسعود صاحب قائم گنج کے پٹھان ہیں۔ شمشیر زنی کا فن کب کا چھوٹ چکا ہے البتہ سپاہیانہ وراثت سے بات کا کھرا پن انہیں ملا ہے۔ بات کے کھرے اور کردار کے شفاف۔

۱۹۶۳ء میں دہلی آیا۔ اس سے دو چار سال پہلے کی بات ہے کہ قاضی عبدالودود صاحب سے پہلی بار نیاز حاصل ہوا۔ قاضی صاحب ہمارے دور کے ابوالفضل ہیں۔ ان کی علمیت، ذکاوت، اور قوتِ حافظہ کی معدودے چند ہی مثالیں اس دور میں ملیں گی انہوں نے ادبی تحقیق سے جس معیار کا مطالبہ کیا اور خود جو اعلیٰ معیار قائم کیا وہ اُردو تو کیا تمام ہندوستانی زبانوں میں سب سے اعلیٰ تھا۔ یہ بات میرے نزدیک کبھی اہم نہیں رہی کہ قاضی صاحب کس مصنف اور اس کی کس کتاب پر معترض ہوتے ہیں۔ ان کی گرفت یقیناً سخت اور لہجہ اکثر تند و تیز ہوتا ہے مگر جو بات اہم ہے در اصل وہ ذخیرۂ معلومات ہے جو وہ اس نکتہ چینی کے دوران فراہم کرتے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ سب سے زیادہ اہمیت میرے نزدیک اس ذہنی تربیت کی ہے اور اس طرزِ استدلال کی ہے جس کا

مطالعہ قاضی صاحب اُردو کے محققین سے کرتے ہیں۔ یہ ذہنی تربیت صرف قانون ریاضی اور فلسفہ و منطق کے ڈسپلن سے حاصل ہو سکتی ہے جن میں استنباطِ نتائج کا اسلوب دوسرے علوم کے مقابلے میں زیادہ متعین ہے اس طرزِ استدلال اور ذہنی تربیت کا چلن ہمارے یہاں ہو جائے تو ہندوستانی سماج آج سے کہیں بہتر سماج ہوگا۔ کیونکہ اس صورت میں معاملات جذباتی تاثر اور تعصب کے بجائے دلائل و براہین کے ذریعے زیادہ معروضی انداز سے پیش ہو جایا کریں گے

پھر سید مسعود حسن رضوی کی شخصیت ہے جن کی شائستگی، نرمی اور ملائمت نے مجھے انسانیت کے نئے تصور سے آشنا کیا ان کے ہاں علم کی وہ انکساری ملتی ہے جو صرف سچے عالم کی پہچان ہے میں نے زندگی میں مسعود صاحب کے علاوہ دوسرا کوئی اُردو داں نہیں دیکھا جو گفتگو میں بھی اس قدر احتیاط برتتا ہو کہ اس کی زبان سے کوئی غلط لفظ، غلط تلفظ یا غلط نحوی ترتیب کے ساتھ نہ نکلے یہ سب میرے محترم بزرگ ہیں جن میں ہر ایک مغتنمات روزگار میں سے ہے اور جن کی نظیر قرنوں میں جاکر پیدا ہوگی۔ ان کے علاوہ وہ لاتعداد شخصیتیں ہیں جن کا کوئی نام نہیں جانتا ان میں سے بعض کا تفصیلی تعارف ممکن ہے مگر شاید اس کا یہ محل نہیں۔ پھر وہ شخصیتیں بھی ہیں جن کا نام مجھے بھی معلوم نہیں بعض کے اصلی نام تو تھے مگر میرے تخیل نے انہیں کچھ کا کچھ بنا دیا۔ ان کا ایسا نقشہ اپنے ذہن میں قائم کر لیا کہ وہ کچھ کا کچھ ہو گئیں اور بقول اقبال "تراشیدم، پرستیدم، شکستم" کی منزلوں سے گذریں اور اس عمل کے دوران خود میں بھی تراشیدن، پرستیدن اور شکستن کی منزلوں سے انہیں کے ساتھ ساتھ گزرا اور ہر نئی شکست سے میں نے نیا حوصلہ بھی پایا اور نئی افسردگی بھی ملی جو زندگی کو نئی آگہی بخشتی ہے۔

میری دلچسپیاں متنوع رہی ہیں۔ تھوڑا بہت ادبی تحقیق و تنقید میں سر کھپایا ہے ڈرامے لکھے اور اس ضمن میں ریڈیو، ٹیلی وژن اور اسٹیج تک پہونچا صحافت کی بھی تھوڑے دن گرد جھیلی ہے اور ان میں سے ہر ایک میدان میں ایسی دلنواز شخصیتیں واقعات اور تصانیف میری راہ میں آئی ہیں جنھوں نے میری تربیت بھی کی ہے اور گہرے اثرات بھی چھوڑے ہیں۔ مگر یہ سب قابل احترام ہستیاں جن میں کئی ایسی ہیں جنہیں میں نے ہیرو سمجھا ہے میری راہوں سے کٹتی ملتی ہوئی چلی ہیں ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کی شخصیت کے کسی پہلو سے میری راہ الگ نہ ہوتی ہو کیونکہ میری افتادِ طبع ان سے مختلف تھی اور میں جن راہوں سے ہوتا ہوا ان تک پہنچا تھا وہ بھی الگ تھیں اس لحاظ سے ان شخصیتوں کا پورا عکس میرے ہاں نہ ملے گا۔ البتہ جن شخصیتوں کو میں نے جس زاویے سے دیکھا اور سمجھا ہے اسی زاویے سے ان کی روشنی سے اکتساب کی کوشش کرتا رہا ہوں۔



# غزل

نذیر بنارسی

آنکھ بربادیٔ دشمن پہ بھی بھر آتی ہے
کوئی گھر اُجڑے اداسی مرے گھر آتی ہے

آج آرام کی کیوں شکل نظر آتی ہے
کیا ملا کوئی یہ اندازِ دگر آتی ہے

جب گلے مل کے بچھڑتا ہے کسی سے کوئی
میرے سینے کی دبی چوٹ اُبھر آتی ہے

بزم میں ان کی نظر دیکھوں کہ جادوئے نظر
سب سمجھتے ہیں جدھر میں ہوں اُدھر آتی ہے

شاید اس دشت میں چلتی ہے ہوا میرے خلاف
کیوں مرے منہ پہ مری گردِ سفر آتی ہے

میری مشکل ہو کہ ہو سارے جہاں کی مشکل
سب کا حل صرف محبت ہی نظر آتی ہے

ہے خیال اسکا کہ شرمندہ نہ ہو عہدِ وفا
ورنہ آرام کی صورت تو نظر آتی ہے

صبح کی خندہ زنی سے تو بچا لو آکر
زلفِ دوشیزۂ شب تابہ کمر آتی ہے

دل مرا ڈوب گیا تم نے سہارا نہ دیا
ورنہ ایک ڈوبتی کشتی بھی اُبھر آتی ہے

اتنا مایوس نہ ہو اے دلِ بیتاب ٹھہر
جب نہیں آئی تو اب اسکی خبر آتی ہے

اسی رستے پہ کہیں وہ تو نہیں محوِ خرام
لڑکھڑاتی ہوئی کیوں بادِ سحر آتی ہے

بوالہوس طالبِ دیدار نہیں بن سکتا
سیکھنے سے کہیں تہذیبِ نظر آتی ہے

اس طرح یاس کے عالم میں وہ بیٹھے ہیں نذیر
سر بہ زانو مری تقدیر نظر آتی ہے

# غزلیں

## وحید اختر

خوشا وہ تیر جو دل کا ارادہ رکھتے ہیں
جو سر بلند ہیں، سینہ کشادہ رکھتے ہیں

ہے درد دولتِ دنیا و دیں سے دُنیا خوش
فراخ حوصلۂ غم بھی زیادہ رکھتے ہیں

ہماری سطح تک آ کر زمانہ ہم سے ملے
نہ آنکھ نیچی نہ ہم دلِ اُفتادہ رکھتے ہیں

مگر تراشے کوئی تو نئے خیال کی راہ
نظر میں ہم بھی عقیدے کا جادہ رکھتے ہیں

متاعِ بے حسی ارزاں ہے ہم کو بھی مل جائے
کہ ہم بھی جینے کا کچھ دن ارادہ رکھتے ہیں

نہ کوئی میکدہ اُن کا، نہ کوئی پیرِ مغاں
جو پیاس ظرفِ جہاں سے زیادہ رکھتے ہیں

ہمیں یہ ضد ہے کہ پتھر پہ بھی کتاب اُترے
بہت سے لوگ ورق دل کا سادہ رکھتے ہیں

## بشیر بدر

خوشبو کی پلک، رنگ کے لب چوم رہا ہوں
میں ہاتھ میں اک چاند لئے جھوم رہا ہوں

میں روزِ ازل سے تری آواز کے پیچھے
آوارہ ستارے کی طرح گھوم رہا ہوں

جن پر ترے اشکوں نے میرا نام لکھا تھا
اُن خستہ کتابوں کے ورق چوم رہا ہوں

دریا مرے ہونٹوں کو ترستا ہی رہے گا
پانی کے لئے اصغرِ معصوم رہا ہوں

اس دھوپ کو دیوار میں روزن نہیں ملتے
احساس ہوں الفاظ سے محروم رہا ہوں

## من موہن تلخ

ہوا کے ساتھ نہ اُڑنے کو چھوڑ جا مجھ کو
سمیٹ لوں گا میں خود کو اُٹھا تو لا مجھ کو

اُجاڑ سیکڑوں صبحوں کا ہیں میں اے سورج
ترا بھلا ہو کہ گھر میں کبھی بسا مجھ کو

میں اپنے دھیان سے خود ہی اُتر گیا ہر بار
یہ سب غلط ہے کسی نے نہیں سنا مجھ کو

تو میری بات ہے تو گونج جا مرے اندر
میں تیری چپ ہوں تو پھر تو دُہرا دکھا مجھ کو

یہ راستہ کبھی اتنا تو گرد گرد نہ تھا
یہ کیا ہوا ہے مجھے اور کیا ہوا مجھ کو

میں سلسلہ ہوں صداؤں کے حرف بننے کا
تو سوچ کر ہی دوبارہ صدا بنا مجھ کو

مرا خیال ہے گھر کے بہت قریب ہوں میں
ہر ایک لمحہ نہ یوں ورنہ دیکھتا مجھ کو

یہ اب جو دیکھتا ہوں تجھ کو اپنے آپ میں خوش
تو جیسے دکھ میں بھی کچھ سہل ہو گیا مجھ کو

میں ایک شام ترے ساتھ رہ کے لُٹ سا گیا
کہ زندگی میں یہ لہجہ نہیں ملا مجھ کو

یہ رکتی ہوئی آنکھوں سے دیکھ کر نہ گزر
بنا کے اپنی توجہ نہ یوں ہٹا مجھ کو

میں دیکھ کر تجھے ایک سمت ہو سا جاتا ہوں
یہ ملتے ملتے پرے کیسے کر دیا مجھ کو

یہ موج موج سی آواز کشتیوں کی سی چپ
قدم بنا ہوں اندھیروں کا، اب بجھا مجھ کو

پھر آج گھر سے آئی جوں کی توں یہ بات
کہ تلخ کوئی کھڑا دیکھتا رہا مجھ کو

# میرے زمانے کا



# علی گڑھ *

علیگڑھ : میرے زمانے کا ہو یا آپ کے زمانے کا علی گڑھ جو تھا وہ ہے، اور وہی رہے گا۔ ممکن ہے کچھ پرانی کوٹھیاں ڈھا کر نئی بنا دی جائیں۔ ایک آدھ نئی سڑک کوٹ دی جائے، کچھ اور کلی پھندنے لگا دیئے جائیں، علی گڑھ کی رُوح نہیں بدلے گی۔

سن اٹھائیس میں جب ہم لوگ آگرے سے ہجرت کرکے علی گڑھ آئے تو ایسا لگا تھا جیسے پیرس پہونچ گئے۔ پتلی پتلی گلیوں اور ملی ہوئی چھتوں والے محلہ پنجہ شاہی سے ایک دم سول لائنز علی گڑھ میں پہونچ جانا اور حواس قائم رکھنا آسان کام نہیں اور خاص طور پر جبکہ شروع میں نواب مزمل اللہ خاں صاحب کی کوٹھی مزمل منزل میں قیام کا اتفاق ہو جائے۔ اتنے ڈھیر سارے بچے ساری کوٹھی میں اتنی گھمسان مچا بیٹھے کہ نواب صاحب کو اختلاج کا دورہ پڑ گیا اور بوکھلا کر بھیکم پور بھاگ گئے۔ کبھی دبے سہمے رات برات کو ایمرجنسی سے مجبور ہو کر آجاتے تو نہایت خوشامد سے والد صاحب سے درخواست کرتے کہ ذرا بچے کم دوڑیں اور وہ دروازے نہ دھڑ دھڑائیں تو بڑا کرم ہو۔ سخت مارشل لا رنافذ ہو جاتی اور ٹانگیں توڑ دیئے جانے کا الٹی میٹم مل جاتا، مگر ٹانگیں بھلا قابو میں آنے کے لئے بنی ہیں اور وہ بھی بچوں کی۔

نواب صاحب خودکشی کے قائل نہیں تھے لہٰذا ہم لوگ وہاں سے منتقل ہو کر مسعود محل میں رہنے لگے جو اس وقت صرف محل تھا ہوٹل نہیں بنا تھا۔ یہاں بھی ہم لوگ زیادہ دن نہ جم پائے تو ڈگی کے پاس دو بنگلے تھے ان میں رہنے لگے۔ دونوں بنگلوں کو ترچھی بانچ دیوار سے جوڑ دیا گیا اور ایک لق و دق صحن بچوں، کتوں، بلیوں اور مرغیوں کی جنت بن گیا۔ پاس ڈگی تھی اس کے علاوہ بھی کئی گڈھے بنگلوں سے ملحق موجود تھے۔ ہر طرف کیچڑ اور اونچی اونچی گھاس سانپوں مینڈکوں اور مچھروں کی اٹا اٹ بستیاں۔

یونی ورسٹی قریب ہی تھی۔ شورٹ کٹ کے لئے صبح سے شام تک کالی شیروانیوں کا تانتا لگا رہتا۔ پرے کے پرے سائیکلوں پر اُڑے چلے جاتے۔ گرلز اسکول بھی کھیتوں کھیتوں بہت دور نہیں پڑتا تھا۔ سب بچوں کے نام فرداً فرداً لکھا دیئے گئے اور برسوں اسکول جاتے رہے۔ زنانے اور مردانے اداروں کی طرح دو ٹکڑے سوسائٹی کے بھی موجود تھے۔ جب تک پردا نہیں ہوا یونی ورسٹی میں کوئی ایٹ ہوم یا پارٹی ہوتی تو سارے بچے والد کی سخت منادی کے باوجود پہونچ جاتے پلچ پلچ کر پیسٹریاں اور نمکپارے کھاتے اور جیبوں میں بھر لاتے۔ باقی باتیں تفصیل سے یاد نہیں کیا ہوتا تھا۔ کیوں ہوتا تھا یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ایک جھلک مولانا شوکت علی کی یاد ہے۔ بے حد لمبے چوڑے، زور زور سے بولتے اور قہقہے لگاتے ہوئے پھر

جب پردہ ہوگیا یعنی نوکر اور گنوار قسم کے لوگوں سے نہیں کوئی شریف آدمی آئے تو باہر کنڈ کرنے لگانا منع ہوگیا تب سے زندگی بالکل ہی زنانی حدوں تک بندھ گئی۔ گرلز کالج کے ہنگاموں اور ڈراموں کا انتظار رہتا۔ وہ خلقت جمع ہوتی کہ تو بہ بھلی سارا شہر اُمڈ پڑتا۔ بیاہ شادیوں کے جوڑے نکل پڑتے اور بڑی گہما گہمی رہتی۔

اس کے بعد دنیا اور بھی محدود ہوگئی۔ بورڈنگ میں اونچی اونچی دیواروں کے پیچھے جو کچھ بھی ہنگامہ ممکن ہوسکتا ہے برپا رہتا تھا۔ ڈے اسکالر لڑکیوں کے ذریعے اُن کے بھائیوں اور بھائیوں کے دوستوں کے ناک نقشے پر بھی اندھا دھند تنقیدیں ہوا کرتی تھیں۔ جن خوش نصیبوں کے چاہنے والے یا منگیتر ہوتے ان کا ذکر کر کے منہ کا مزہ بدلا جاتا۔ باہر کیا ہو رہا ہے بہت کم پتہ چلتا تھا۔

ہاں ایک قیامت خیز وقت آتا تھا جس کا سال بھر انتظار رہتا تھا، وہ تھی نمائش۔ ساجھے کے تانگے اور شکروں میں کر کے ٹوٹ پڑتے تھے ٹکے تو ہوتے تھے کم اور طبیعتیں بلا کی شوقین۔ خریداری کم اور چکلس زیادہ۔ یہ اور بات تھی کہ جہاں کالج کی لڑکیاں چوڑی والے یا بندرن نکلس والے کی دوکان پر پہونچیں اور کالی شیروانیوں کے پرے جمع ہونے لگے۔ کہنے والے کہتے تھے کہ کتنے ہی نہایت کامیاب عشق چلے ہیں۔ کتنی ہی شادیاں ہوئیں زیادہ تر تو دل ٹوٹا کرتے تھے جب نمائش اُٹھ جاتی سب کچھ اُٹھ جاتا۔ سب کچھ ہوتا بھی کتنا تھا۔ بس قہقہوں کی اَدل بدل، کبھی کوئی پرچہ ورچہ بھی چل جاتا تھا۔ زیادہ تر ٹھنڈی آہیں ہی پلے پڑتی تھیں۔

مرد ذات کی بڑی دہشت تھی، خاص طور پر کالج کے لڑکے تو زہر میں بجھے تیر ہوا کرتے ہیں۔ بڑی بوڑھیاں پولیس کے سپاہیوں سے زیادہ چوکس لڑکیوں کی رکھوالی کرتیں۔ ذرا سی بات کا یہ بڑا پہاڑ بنا کر کھڑا کر دیا جاتا۔ نہ جانے کتنی لڑکیاں آوارہ اور بدمعاش مشہور ہو جاتی تھیں۔ بہت سے بدنام لڑکے تھے جن کے ناموں کو سُن کر کانوں پر ہاتھ دھرے جاتے تھے۔ بدّو، بتو وحید ....... اور نہ جانے کون کون! جہاں آگ اور مٹی کے تیل کا گودام پاس پاس ہوں وہاں لوگ دھماکوں سے ڈرنے ہی لگتے ہیں۔ زنانہ مردانہ تعلیمی اداروں کا وجود کافی دہشت انگیز ہے۔ دُنیا کتنی بھی ترقی کر جائے۔ علی گڑھ کی فضا سے یہ خوف نہیں مٹے گا۔ آج بھی علیگڑھ میں کم و بیش اتنا ہی سخت سنسر ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس ماحول میں کچھ رومانی ساسنسنی سے رہا ہے بستی کی گھٹ پٹانی فضا میں تو دم گھٹنے لگتا ہے جہاں لوگ سنسنی خیز کے اسکینڈل کی تاک میں رہتے ہیں وہاں سب کی نظریں زنانہ اور مردانہ کالجوں پر جمی رہتی ہیں۔ کون کس سے ملا؟ کون مسکرایا؟ کس کی آنکھیں دو چار ہوئیں غرض چال چلن پر بے حد زور ہے۔

علی گڑھ اتنا آہستہ بدلا ہے کہ میں نے بالکل محسوس نہیں کیا۔ میں جب بھی وہاں جاتی ہوں۔ لوگوں سے ملتی ہوں، کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا۔ وہی مروّت اور محبت خاطر داری، دعوتیں اور بلاوے۔ گرلز کالج کا کوئی فنکشن بالکل ویسا ہی جیسا تیس برس پہلے ہوا کرتا تھا۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے لڑکیاں بھی وہی ہیں ہاں عمارتیں بہت بڑھ گئی ہیں اور دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ حالانکہ پندرہ بیس منزلہ عمارت نہیں بنی۔ اونچے ہوٹل اور سینما گھر نہیں بنے۔ وہی پرانے شہر کے میلے سینما ہیں۔

پہلے ایک زنانہ کلب بھی تھا۔ جہاں خواتین ٹھاٹ کے کپڑے پہن کر جمع ہوتی تھیں۔ جی بھر کر اسکینڈل ڈسکس ہوتے تھے۔ سارے شہر کی خبریں مل جاتی تھیں۔ پھر آئے دن کے نئے کپڑوں کے خرچ سے تنگ آکر کلب بند کر دیا گیا اور اب شاید کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں سب آزادی سے مل بیٹھ سکیں۔

میرے زمانے میں گرلز کالج صرف ایف اے تک تھا۔ اس لئے بی اے کے لئے لڑکیوں کو علی گڑھ سے باہر جانا پڑتا تھا میرے جانے کے دوسرے سال علی گڑھ میں بی اے کی کلاس کھل گئی۔

بی ٹی کے لئے علی گڑھ میں کوئی انتظام نہ تھا اور نہ گرلز کالج میں اتنا دم تھا کہ گنتی کی چھ طالبات کے لئے بی ٹی کلاس کھول سکے۔ لہٰذا ہم قریشی صاحب کے پاس گئے جو پرو وائس چانسلر تھے۔ . . . . کہ ہمارے لئے کوئی انتظام کیجئے۔ ہمیں بھی کلاس میں بیٹھنے کی اجازت دیجئے۔ قریشی صاحب نے کہا یہ اسلامی ادارہ ہے۔ مسلمانوں کو مخلوط تعلیم پر اعتراض ہوگا۔

"پھر ہم کیا کریں؟"

"لکھنؤ یا الہ آباد جائیے۔"

"وہاں بھی مخلوط تعلیم ہے تو کیا مسلمانوں کو اعتراض نہیں ہوگا اگر مسلمان لڑکیاں لڑکوں کے پہلو بہ پہلو بیٹھیں گی!"

"انہیں بخشیں مت کیجئے" قریشی صاحب رکھائی سے بولے
اتنے میں ٹریننگ کالج کے پرنسپل حبیب الرحمن صاحب آگئے، انہیں
پیش ہٹیا کہ تھوڑے سے طرح سے انتظام ہو سکتا ہے۔

ہفتہ بھر کے اندر حبیب صاحب نے آخری سیٹوں کے آگے ایک لوہے کی جالی لگوائی اس پر دوسرے پردے ڈال دیئے گئے اور اس کے پیچھے ہم چھ طالبات بیٹھ گئیں۔

اب وہ جالی کلاس میں سے ہٹا دی گئی ہے۔ اب لڑکے لڑکیاں ساتھ بیٹھتی ہیں اور بڑی سنجیدگی سے پڑھتی ہیں۔ پردے کے پیچھے بیٹھ کر ہم کبھی کبھی کیا کرتے تھے، لڑکوں کو تاکا کرتے تھے اور دوسرے پر بدتمیزی کے بہتان لگایا کرتے تھے۔ بڑا احساس کمتری ہوتا تھا پردے کے پیچھے بیٹھ کر اور اس پر فتح پانے کے لئے ہم لوگ بھونڈے مذاق میں وقت گنواتے تھے۔

باوجود سنسر کے اب لڑکے لڑکیاں ساتھ پڑھتے ہیں سائیکلوں پر گھومتے ہیں۔ فضا ہزار درجہ زیادہ صحت مند ہو گئی ہے اب علی گڑھ کے لڑکے دوسرے کالج کے لڑکوں کی طرح ہیں۔ میرے زمانے کے لڑکوں کی طرح برقع دیکھ کر سائیکل سے لڑکھڑا کر نہیں گرتے۔ علی گڑھ کے لوگ بھی اب کچھ عادی ہوتے جا رہے ہیں۔ پردہ قریب قریب ختم ہو گیا ہے۔ بہت کم گھرانوں میں باقی ہو گا۔

میرے زمانے میں جب کالج میں کوئی لیکچر یا مشاعرہ ہوتا تھا تو لڑکیاں بند گاڑیوں میں بند کر کے لے جائی جاتی تھیں۔ برقعوں میں لپٹی ایک بالکونی میں جس کے آگے چقیں بندھی ہوئی ہوتی تھیں، ٹھونس دی جاتی تھیں اور پردے کے ادھر سے لڑکے کہنیاں اڑاتے تھے چٹکیاں بھرتے تھے۔ لیکچر خاک پلے نہیں پڑتا تھا۔ پورے وقت کھی کھی چلتی تھی۔ پچھلی بار جب مجھے اسی ہال میں جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں زنانہ انتظام نہیں تھا۔ سب عورت مرد ساتھ بیٹھے تھے، چند خواتین برقعے میں بھی تھیں مگر نہ کوئی ہلچل تھی نہ ہنگامہ۔

علی گڑھ کی فضا سے گھٹن دور ہو رہی ہے اور مطلع صاف ہوتا جا رہا ہے۔ چوبچے اور گندے نالے بھی بہت کچھ سوکھ گئے ہیں پھر بھی اس بلا کے نہیں۔ مکھیاں اور چونٹے بھی یونیورسٹی اور گرلز کالج کی طرف زیادہ نہیں ہیں۔

مگر پھر بھی بہت سا علی گڑھ وہی کا وہی ہے۔ وہی کھڑ ملکا، مٹھائیوں کی دکانوں پر مکھیوں کے چھتے اور میلے گندے بازار جہاں دو رکشہ ساتھ نہیں گزر پاتے اور گائیں اور سانڈ بے تکلفی سے ٹہلتے ہیں گلیوں میں بے شک تنگی ہے لیکن علی گڑھ کے باسیوں کے دلوں میں اتنی وسعت ہے کہ سارا جہاں سما سکتا ہے۔



# ان کہی

**بشر نواز**

اور پھر ہونٹ ہی کانپے نہ کوئی بات ہوئی
صرف آنکھوں پہ گھٹا چھا گئی، برسات ہوئی
ایک اک بار کئی خنجر خونخوار لئے
کسی ڈائن کی طرح آگئی دہلانے کو
صرف دھوکوں سے بہل سکتا تھا دل تو اپنا
لیکن اب وہ بھی سہارا نہیں بہلانے کو
روح کے آخری گوشوں سے پکارا جن کو
جن کے سر درد پہ یوں پھوٹ کے روئے سو بار
کوئی رگ ٹوٹ گئی اپنے ہی دل کی جیسے
وہ بھی بربادیٔ جاں دیکھ کے رونا تو کجا
اک تعلق بھری جھوٹی ہی ہنسی ہنس نہ سکے
سوچتا آپ ہی ہوں۔ آپ ہی ہنس پڑتا ہوں
زندگی تیرے بھرے گھر سے ملا کیا مجھ کو ؟
صرف کچھ کھونے کا احساس فقط کرب کی آگ
چند ٹوٹے ہوئے خواب، انکی ہزاروں کرچیں
ایک اک رگ میں جو پیوست ہوئی جاتی ہیں
اپنے ہی جسم سے بہتے ہوئے خوں کو کب تک
تیری راہوں کا دیا جانوں بہلتا جاؤں
اشک تیزاب ہیں تیزاب میں ڈھلتا جاؤں
زندگی، زندگی بھر کی او بے حس عورت !!
اب تو شانوں سے الگ کر لے یہ باہیں اپنی
دھوپ میں رکھی ہوئی برف کی صورت کب سے
پگھلا جاتا ہوں، ہٹا اب تو نگاہیں اپنی

# کہانی



سہیل عظیم آبادی

" ردی والا "

وہ لکھنے بیٹھا ہی تھا کہ دروازے پر آواز سُنائی دی۔ اُس کی طبیعت جھلا اٹھی کئی دنوں تک سوچتے رہنے کے بعد تو اس کی طبیعت موزوں ہوئی تھی اور وہ لکھنے بیٹھا تھا۔ بیچ میں یہ کم بخت ردی والا نہ جانے کہاں سے آ ٹپکا۔ اور کوئی وقت نہیں تھا اس کے پاس۔ اُس نے بیٹھے بیٹھے جواب دیا۔

" آج نہیں، پھر آنا ۔۔۔"

لیکن ردی والا گیا نہیں۔ اُس نے چمکار کر کہا۔

" دُور سے آنا ہوتا ہے بابو ۔ جو ہو دے دیجئے "۔

اس کی طبیعت اور جھلا گئی اور وہ ذرا تیز ہو کر بولا۔

" پھر آنا۔ آج فرصت نہیں ۔۔"

ردی والا کئی برسوں سے ہر مہینے دو مہینے پر ردی لے جایا کرتا تھا اور ذرا ڈھیٹ تھا اُس سے ضد کرتے ہوئے کہا۔

دو مہینے پر آیا ہوں بابو۔ ردی بہت ہو گی۔ آج ہی دے دیجئے۔"

اس کی ڈھٹائی پر اُسے غصہ آ گیا اور وہ سختی کے ساتھ بولا۔

" نہیں آج نہیں۔ کام کر رہا ہوں کل آنا "

ردی والا چپ ہونے والا کب تھا۔ بولا ۔

" نہ جانے کل موقع ملے یا نہ ملے ۔۔"

" جب موقع ملے آنا ۔۔ "

اس نے جواب دیا۔ ردی والا چلا گیا۔ اور اُس نے لکھنے کے لئے قلم اٹھایا۔ پہلا جملہ لکھا۔

" اس دن دھوپ تیز تھی ۔"

اسی وقت اس کی بیوی آ گئی ۔ اور بولی

" ارے آپ نے ردی والے کو چلا دیا میں کب سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ گھر میں ردی کا ڈھیر لگا ہوا ہے کوڑا بھی صاف ہو جاتا اور کچھ پیسے بھی نکل آتے ۔"

اس کے سارے خیالات بکھر گئے۔ ردی والے سے زیادہ غصہ اس کو اپنی بیوی پر آیا اس کی آدھی زندگی اس کے ساتھ بیت گئی تھی مگر اب تک اس نے پہچانا نہیں تھا تیکھے انداز میں وہ بولا۔

" تم نے خود روک لیا ہوتا ۔"

بیوی نے تنک کر جواب دیا ۔

" میں کیسے روکتی ۔ کیا اُس کے سامنے جاتی۔ لڑکے اسکول گئے ہیں ماما بازار گئی ہے ۔

" میں کیا کروں ؟ "

اس نے بے رخی سے جواب دیا۔ بیوی نے سادگی سے کہا

" ساری ردی نکال کر دیدیتے۔ گھر بھی صاف ہو جاتا اور کچھ روپے بھی مل جاتے ۔"

وہ جھنجھلا اٹھا اور بولا۔

" ساری ذمہ داری مجھی پر ہے ؟ "

بیوی بولی

" ردی اکٹھا بھی تو آپ ہی کرتے ہیں۔ میں تھوڑے کرتی ہوں۔ جب دیکھو کاغذ ۔۔۔ کاغذ ۔۔۔"

بیوی کے جواب میں بھی تیکھا پن تھا۔ اس نے بیوی کو گھور کر دیکھا وہ سہم گئی اسے

بیوی کا پرہم آگیا اور نرم ہوکر بولا۔
"ابھی لکھنے بیٹھا تھا۔"

اس کی بیوی منہ پھلائے چلی گئی۔ وہ پھر لکھنے کے لئے بیٹھ گیا مگر سارے خیالات بکھر چکے تھے خیالات جو اڑتے ہوئے سرخاب کی طرح پر پھیلائے اس کے دماغ میں آ رہے تھے نہ جانے کدھر بھٹک گئے۔ وہ بیٹھا بیٹھا پھر خیالات کو اکٹھا کرنے لگا مگر بکھرے ہوئے خیالات جلدی اکٹھا تھوڑے ہوتے ہیں۔ وہ سوچتا رہ گیا لیکن خیالات پھر اکٹھا نہ ہوسکے۔

کتنا مشکل کام ہے کہانی لکھنا۔ اس کی بیوی کو اس کا احساس ہی نہ تھا اُسے کیا معلوم کہ ایک دلچسپ کہانی لکھنے کے لئے دماغ کو کس طرح چلانا پڑتا ہے وہ سمجھتی ہے کہ ایک وقت کا کھانا پکا لینا کہانی لکھنے سے بڑا کام ہے سینکڑوں مرتبہ اُسے سمجھا چکا تھا کہ لکھنے کے وقت اسے بیچ میں آکر نہ ٹوکے لیکن سمجھانا بے کار تھا لکھنا اس کی بیوی کی نظر میں سب سے فضول کام تھا۔ اس وقت بھی اس نے ٹوک کر کہانی کے تانے بانے کو الجھا دیا تھا وہ پھر لکھنا چاہتا تھا لیکن کہانی کہاں سے شروع اور کہاں ختم کرنی تھی۔ ساری باتیں اس کے دماغ سے نکل گئی تھیں بہت دیر تک دماغ سے سوچتا رہا مگر ساری باتیں اس کے دماغ سے نکل گئی تھیں۔ وہ بستر پر لیٹ گیا، اور ایک کتاب اٹھا کر دیکھنے لگا دو دن پہلے خرید کر لایا تھا لیکن ختم نہیں کر سکا تھا "مرد اور عورت کے تعلقات"

مرد اور عورت کا تعلق — دُنیا کا سب سے پرانا موضوع — جائز اور ناجائز — یہ بحث شاید اس وقت سے چل رہی ہے جب انسان دنیا میں آیا اور اُسے عقل آئی۔ بحث صرف جائز اور ناجائز کی ہے تعلق ضروری ہے۔ لیکن کون سا طریقہ جائز اور کون سا ناجائز ہے۔ ایک زمانے میں جو طریقہ جائز تھا اُسے ناجائز قرار دیا گیا اور جو ناجائز تھا اُسے جائز کہا گیا طریقے بدلتے رہے اور بحث چلتی رہی مرد اور عورت کا تعلق بھی رہا دونوں طرح کا تعلق۔ جائز بھی اور ناجائز بھی۔ اگر جائز اور ناجائز بحث میں یہ تعلق ختم ہوجاتا تو یہ دنیا آج اتنی آباد نہیں ہوتی۔ ایک زمانہ تھا کہ یورپ میں عورتیں فخر یطور پر کہتی تھیں کہ وہ فلاں نائٹ کے ساتھ سوئی ہیں اور یہ کہ اس کا بیٹا فلاں نائٹ کا بیٹا ہے۔ ایک بڑے بادشاہ کو اس پر فخر تھا کہ وہ ایک نائٹ کا بیٹا ہے حالانکہ اس کی ماں کا بیاہ نہیں ہوا تھا اور یہ بھی کہ بہت سے اچھے اور قابل لوگوں کو بادشاہ صرف اس لئے نہ بننے دیا گیا کہ وہ تخت کے جائز وارث نہ تھے اور اُن کی جگہ نالائقوں کو بادشاہ بنایا گیا — یہ بحث کبھی ختم بھی ہوگی۔

کہانی اس کے دماغ سے بالکل نکل گئی۔ اور وہ دیر تک کتاب پڑھتا رہا۔ جب کتاب رکھ کر اٹھا تو پھر کہانی کا خیال آیا۔ لیکن کہانی تو اس کے دماغ سے نکل کر نہ جانے کہاں چلی گئی تھی — اُسے بالکل یاد نہیں رہا تھا کہ وہ کیا لکھنا چاہ رہا تھا۔ اُسے خیال آیا عورت اور مرد کا تعلق، کہانی کے لئے اچھا مرکزی خیال ہے۔ انسانی سماج کا بے حد اہم مسئلہ ہے — پہلے بھی تھا اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔ اتنا ہی الجھا ہوا جتنا پہلے تھا۔

وہ پھر کہانی لکھنے بیٹھ گیا۔ ایک سوال پھر اس کے سامنے آگیا۔ اگر یہ سچ ہے کہ فطرت کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ مرد اور عورت کے تعلقات ہوں۔ باقی سب کچھ تہذیب کے ڈھکوسلے ہیں۔ تہذیب نے خواہ مخواہ انسان کی ایک فطری ضرورت پر رسموں کی پابندیاں لگا رکھی ہیں اور قانون کے پہرے بٹھائے ہیں۔ ایک ہی فعل کو پاک اور ناپاک کے خانوں میں بانٹ رکھا ہے۔ ایک ہی فعل کو ضروری بھی قرار دیا ہے اور جرم بھی۔ انسان کا دماغ بڑا فتنہ انگیز اور فتنہ پرور ہے۔ سب کچھ اس کی پیداوار ہے سارے تماشے اسی کے کھڑے کئے ہوئے ہیں۔

وہ سوچنے لگا سماج ایسی باتیں سوچنے کو تیار نہیں۔ اُس نے مرد اور عورت کے تعلقات کی حدیں مقرر کردی ہیں، قوانین بنا رکھے ہیں سزائیں مقرر کی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ جس آدمی میں طاقت ہوتی ہے وہ قوانین کو ٹھکرا دیتا ہے من مانی کرتا ہے اور سماج اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔ بلکہ بے بسی کے ساتھ اُسے دیکھتا رہ جاتا ہے اور کبھی کبھی اسی کا ساتھ دیتا ہے البتہ سارے قوانین کمزوروں کو دباتے ہیں۔

اس نے محسوس کیا وہ بہک رہا ہے۔ اسے کہانی لکھنی ہے مباحثے میں حصہ لینا نہیں ہے اور وہ مباحثے میں اُلجھ رہا تھا۔ اس موضوع پر بھی کہانی لکھی جاسکتی ہے لیکن اس طرح نہیں اور ایسی نہیں ہوگی کہ پڑھنے والوں کے دل کروٹ لیں۔ دماغ میں ہلچل ضرور پیدا ہوسکتی ہے اور اس کا دماغ الجھ کر رہ گیا۔

وہ قلم بند کرکے پھر بستر پر لیٹ رہا اور پہلے سوچی ہوئی کہانی کے تانے بانے پھر سے درست کرنے لگا لیکن اور چھور کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ پہلی کہانی دماغ سے نکل چکی تھی صرف اس کے نشانات باقی تھے، جیسے راستے میں کسی مسافر کے پاؤں کے نشان — اُس نے بڑی بے چینی محسوس کی کہانی پڑھنے والوں کو کیا معلوم کہ لکھنے والے کو کن حالات سے گزرنا پڑتا ہے کبھی پھولوں بھری وادی سے اور کبھی کانٹوں بھری راہ سے۔ اس کا دماغ سوچتے سوچتے تھکن محسوس کرنے لگا۔ پاس پڑا ہوا ایک رسالہ اس نے اٹھا لیا لیکن پڑھنے میں جی نہیں لگا۔ اس نے رسالے کو بے پروائی سے ایک طرف ڈال دیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا ایک نیند سو کر اٹھے گا تو دماغ تازہ ہوگا اور لکھ سکے گا۔

مگر نیند نہیں آئی۔ دماغ انسان کے جسم کا سب سے آوارہ حصہ ہے۔ نہ خود چین سے رہتا ہے اور نہ جسم کے دوسرے حصوں کو چین سے رہنے دیتا ہے۔ کہانی اب بھی دور تھی بس کبھی کبھی کھوئے ہوئے مسافر کی طرح راستے سے بھٹک کر اس کے دماغ میں آجاتی اور پھر غائب ہوجاتی تھی۔ وہ آنکھیں بند کئے لیٹا رہا اور سوچتا رہا کہانی خوبصورت تتلی کی طرح چمکیلے پر پھڑپھڑاتی اُڑی پھر رہی تھی، اور وہ بچے کی طرح اسے پکڑنے کے لئے دوڑا پھر رہا

تھا۔ تیلی تک وہ ہاتھ سے جاتا ہے۔ مگر تیلی اُڑ جاتی ہے ساتھ نہیں آتی۔ مگر اس بھاگ دوڑ میں اُسے مزا آ رہا تھا۔

بیوی کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔

"آج چائے بھی نہیں پی آپ نے"؟

اور وہ اُٹھ بیٹھا۔ کاغذ اور قلم سامنے دھرا تھا۔ اس نے بیوی کو دیکھا اور بولا۔

"ردی والے نے آکر سب چوپٹ کر دیا۔ کیا لکھوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

اس کی بیوی ہنس پڑی۔

"آپ تو مشہور لکھنے والے ہیں۔ سینکڑوں کہانیاں لکھ چکے ہیں۔ لکھ ڈالئے"

اس نے بڑی بے بسی کے ساتھ بیوی کو دیکھا۔ اور بولا۔

"چائے دیجئے ——"

بیوی چلی گئی اور اس نے تازہ اخبار اٹھالیا —— ایک دلچسپ خبر تھی۔ وہ اسے پڑھنے لگا۔ پچھلی شام کا ایک واقعہ تھا۔ اور اخبار نے اُسے بڑی اہمیت دے کر پہلے صفحے پر شائع کیا تھا۔

شہر کے سب سے بڑے پارک میں بڑی رونق تھی۔ پارک میں سینکڑوں آدمی تھے۔ شام کے وقت سیر کرنے والے مرد ٹہل رہے تھے یا بنچوں پر بیٹھے تھے۔ عورتیں میدان میں بیٹھی تھیں بچے کھیل رہے تھے۔ ہر طرح کے لوگ تھے۔ یکایک پارک کے ایک کونے سے ایک عورت کی آواز سنائی دی "مدد۔ مدد" اور بہت سے لوگ اس کی طرف دوڑ پڑے۔ ایک ادھیڑ عمر کا شریف صورت مرد تھا اور ایک خوبصورت سی جوان عورت۔ مرد نے عورت کی کلائی مضبوطی سے پکڑ رکھی تھی۔ اور اسے گھسیٹ کر لے جانا چاہتا تھا۔ عجیب نظارہ تھا۔ لوگوں کو دیکھ کر عورت نے کہا: میں ادھر ٹہلتی ہوئی آگئی تھی یہ مرد میری عزت لوٹنا چاہتا تھا۔" اور مرد نے کہا: "یہ عورت بدمعاش ہے۔ دیر سے مجھے تنگ کر رہی ہے۔ مجھ سے سو روپے مانگتی ہے جب میں نے انکار کر دیا تو اس نے مجھے دھمکی دی کہ شور مچا کر مجھے ذلیل کر دے گی۔ میں نے بار بار انکار کیا سمجھایا اور یہ نہیں مانی۔ میں اسے تھانے لے جاؤں گا۔ اور عورت کہتی رہی کہ یہ میری عزت لوٹنا چاہتا تھا۔ مجمع میں سے کچھ لوگ عورت کے ہمدرد بن گئے" اور مرد کو مارنے پر آمادہ ہو گئے"، اور کچھ لوگ مرد کے ہمدرد بن گئے" اور ہنگامہ سا ہو گیا۔ پارک میں پہرہ دینے والے پولیس کے سپاہی آگئے" اور دونوں کو پکڑ کر لے گئے"۔

خبر عجیب سی تھی اس میں کون سچا تھا اور کون جھوٹا۔ اس میں مجرم کون تھا، اور بے گناہ کون —— پھر کیا ہوا اخبار میں اس کی کوئی خبر نہ تھی۔ اس کے دل میں کرید پیدا ہوئی، یہ تو معمہ ہو گیا۔ لیکن کہانی کا پلاٹ اچھا تھا۔ دونوں باتیں ممکن تھیں مرد اس عورت کی عزت لوٹنے کی کوشش بھی کر سکتا تھا اور عورت بدمعاش بھی ہو سکتی تھی۔ دھونس ڈال کر روپے وصول کرنے کی کوشش بھی کر سکتی تھی۔

اس نے سوچا۔ دلچسپ کہانی بن سکتی ہے —— اور سوچنے لگا کہانی کیسے شروع کی جائے اور کس طرح ختم کی جائے اور کہانی کا تانا بانا بننے لگا کہ اس کی بیوی چائے لے کر آگئی تو وہ اس کا چہرہ اس طرح دیکھنے لگا جیسے کہانی اس کے چہرے میں لکھی ہو۔ وہ گھبرا سی گئی اور چائے کی پیالی رکھ کر جلدی سے جانا چاہتی تھی کہ اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"میرے پاس بیٹھو ——"

وہ بڑی نرمی سے بولا

"آج کہانی نہیں لکھ سکا لکھ لیتا تو . . . ."

"اب تو چھٹی ہو گئی ہو گی باورچی ——"

"کون؟ ——"

"ردی والا ——"

اس نے بیوی سے کہا

"بھئی جلدی سے ساری ردی نکال دو ختم کرو اس کا قصہ چین نہیں لینے دیگا۔"

اس کے ہاتھ میں ستائیس روپے بارہ آنے دیئے —— تو وہ چونک گیا —— روپے لا کر اس نے بیوی کے ہاتھ میں دیئے اور وہ خوش ہو کر بولی ——

"دیکھئے اتنے روپے مل گئے نا ——"

اور اُسے محسوس ہوا کہ کہانی لکھنے سے زیادہ فائدے کا کام ردی بیچنا ہے۔

# امیر خسرو کا دور

## ایک تاریخی اہمیت

ظ۔ انصاری

ہندوستان میں قرونِ وسطیٰ کی نمایاں خصوصیات اور اہم تبدیلیوں کو سمجھنے کے لئے بلبن کے عروج (۱۲۵۰ء) سے محمد تغلق کی ناکامی (۱۳۳۰ء) تک کا دور فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے۔

علاءالدین خلجی (۱۲۹۵ – ۱۳۱۶ء) اور محمد تغلق اس دور کی سب سے اہم شخصیتیں ہیں اور امیر خسرو کی نظم و نثر اس عہد کی تاریخ کا سب سے معتبر البم۔

امیر خسرو تہتر برس جیے (۱۲۵۲-۱۳۲۵ء) دس درباروں سے تعلق رہا۔ برائے نام گیارہ ورنہ اصل میں نو بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔ آپ اس علاقے کے ترک تھے جو اب تاجیکستان کا حصہ ہے اور یہاں ایک ہندوستانی امیر کی بیٹی تھیں۔ اسی نسبت سے وہ خود کو ترک ہندوستانی کہتے ہیں اور اپنے ہندوستانی ہونے پر فخر کرتے ہیں یہاں تک کہ سنسکرت کو عربی کے علاوہ دنیا کی تمام زبانوں سے افضل بتاتے ہیں اور ہندوستان کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ ملک "مولد و ملجا و ماویٰ و وطن" انہوں نے نو دس برس کی عمر سے شاعری شروع کی۔ ترکی اور فارسی کے علاوہ مقامی زبانوں میں مہارت پیدا کی۔ آگرے سے دہلی تک کی "زبانِ ہندوی" ان کی مادری زبان تھی۔ چار لاکھ کے قریب شعر کہے جن میں سے کم و بیش ایک لاکھ آج سات سو برس بعد بھی محفوظ ہیں۔ نثر کی تین بڑی کتابیں لکھیں۔ لڑائی کے میدان، امراء کی محفل، شاعروں، عالموں اور صوفیوں کی صحبت انہیں عمر کے ہر حصے میں میسر تھی۔ بنگال سے لے کر ملتان اور سندھ تک اور ساحل سے غالباً تامل ناڈو تک جنگی قافلوں اور ادب کے قدر دانوں تک کے درمیان سفر کیا، فطرت اور معاشرت کے رنگا رنگ منظروں کو ان میں شریک ہو کر دیکھا اور جو کچھ دیکھا یا برتا یا بھروسے کے لوگوں سے سنا اس کو شاعرانہ حسنِ بیاں سے بنا سنوار کر ہمارے لئے محفوظ کر دیا۔

ہمارے پاس اس دور کی معاصرانہ تاریخیں موجود ہیں جن میں بعض جگہ واقعات کو پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ تاج المآثر، طبقاتِ ناصری، چچ نامہ، خلجی دور سے پہلے کی باقاعدہ ایسی تاریخی سندیں ہیں جن کو بعد کے مورخین نے پیشِ نظر رکھا۔ محمد شاہ بن تغلق کے آخری دنوں میں عصامی کی مثنوی فتوح السلاطین لکھی گئی۔ اس زمانہ کا شہرۂ آفاق مصنف ضیاءالدین برنی ہے جس نے تاریخ فیروز شاہی لکھ کر آئندہ مورخین کی رہنمائی کی۔ تغلق خاندان کے عہدِ حکومت میں ہی دوسری تاریخ فیروز شاہی "شمس سراج عفیف" نے ترتیب دی، پھر فوراً ہی "تاریخ مبارک شاہی" لکھی گئی۔ ان ساتوں مورخین کا تعلق درباروں سے تھا۔ عصامی آبائی جائداد ضبط ہو جانے پر محمد شاہ بن تغلق سے ناراض ہو کر دکن کی طرف نکل جاتا ہے اور علاءالدین حسن گنگو بہمنی سے قدردانی کا امیدوار ہے۔ ضیاءالدین برنی جو سترہ سال تک محمد بن تغلق سے وابستہ رہا۔ اس کا سخت نکتہ چیں ہے۔ بعد کے مورخوں نے زیادہ تر انہی چراغوں سے اپنے چراغ جلائے اور تحقیق کے عمل میں ان افسانوں کو بھی سند کا درجہ دے دیا جو وقتاً فوقتاً شاعری یا مداحی کی زبان سے پھیل گئے تھے۔ دکن کے ہندو شاہ استرآبادی (مصنف تاریخ فرشتہ) اکبر کے دربار نشیں اور نکتہ چیں عبدالقادر بدایونی (مصنف منتخب التواریخ) اور نظام الدین بخشی (مصنف طبقاتِ اکبری) اسی گروہ میں آتے ہیں جس کے بیانات نے اپنے سے پہلے کی تواریخ اور اپنے زمانے کے زبان زد افسانوں کو ملا جلا کر تاریخی سرچشموں کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ اور ۱۹ویں، ۲۰ویں صدی کے مغربی مصنفین مثلاً سر ہنری ایلیٹ، لین پول، ونسنٹ اسمتھ، الفنسٹن، جیمس ٹاڈ، گارڈنر براؤن اور کرنل ہیگ نے انہی کو اپنا رہنما بنایا ہے۔

اس کے برعکس امیر خسرو دہلوی کے پاس عاشق کا دل، شاعر کا حسنِ بیان اور ایک مورخ کی بے لوچ (یا Objective) نظر ہے جب وہ اپنے سے پہلے کے یا اپنے زمانے کی اتھل پتھل پر تبصرہ کرتے ہیں تو کہیں جان بوجھ کر لفظوں پر ایسا باریک سا پردہ ڈال دیتے ہیں کہ اصلیت چھن کر باہر نکل آئے مثلاً:

جب خسرو خاں گرفتار ہوکر غازی ملک کے سامنے لایا جاتا ہے تو وہ قیدی سے سوال کرتا ہے کہ جس آقا نے تجھ پر اتنے احسانات کئے تھے، اس کا خون کیوں کیا۔ مورخ برنی نے جابجا اور بہت ہی کھول کر بیان کیا ہے کہ بادشاہ قطب الدین مبارک شاہ اپنے خاص مصاحب اور وزیر سے ہم جنسی ( Homeo-Sexual ) تعلقات رکھتا تھا۔ امیر خسرو اس کی زبان سے جواب دیتے ہیں ؎

اگر نا رفتی بر من نہ رفتے
زمن نا آمدے ویں فن نہ رفتے

(شعر ۲۰۸۲ تغلق نامہ)

کہیں قصیدوں، رباعیوں یا مثنویوں میں حالات کی صاف جھلک دکھا جاتے ہیں جیسے "ہشت بہشت" مثنوی کے بعض بیانات سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ شرفا کا لباس اس زمانے میں کیا تھا، سماج میں عورت کی حیثیت کیا تھی۔ یا جلال الدین خلجی کے قصیدے اور شہر آشوب کی رباعیوں سے پتہ چلتا ہے کہ دشمن پر آگ پھینکی جاتی تھی، شب برات پر آتش بازی کا استعمال ہوتا تھا، لیکن بارود کا نہیں بلکہ "نفط" یا ( Crude Oil ) کا۔ آتش بازی کی بہت سی قسموں کے نام آجاتے ہیں جن میں سے ہوائی مہتاب اور فتیلہ آج تک موجود ہیں۔

کہیں اپنے دیباچوں اور اعجاز خسروی کے مضامین کی پیٹ میں وہ ایسی اطلاعیں مہیا کر دیتے ہیں جن سے تاریخی مسلمات کی تردید یا تصدیق نکلتی ہے، مثلاً "دوسرے دیوان وسط الحیٰوۃ اور تیسرے دیوان . . . . . . . غرۃ الکمال کا دیباچہ محض ان کی سوانح حیات نہیں بلکہ اپنے گرد و پیش کی سوانح عمری کا اہم حصہ ہے۔ کہیں عشق کے افسانے میں تاریخی سربستہ رازوں پر سے پردہ اٹھا دیتے ہیں، جیسے "دول رانی خضر خاں" کے عشقیہ افسانے سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ علاء الدین خلجی کو ملک کافور نے ٹھیک اسی طرح دغا بازی سے ختم کیا جیسے علاء الدین نے اپنے مہربان چچا جلال الدین کا خاتمہ کیا تھا۔ ملک کافور کو وہ "مہدی کُش"، "کافور بے نور" کے خطاب سے یاد کرتے ہیں۔

اپنے پیش رو آذربائیجانی شاعر نظامی گنجوی کی تقلید میں انہوں نے جو ۱۸۹۰ء استرہ ہزار آٹھ سو نوے شعر کا خمسہ لکھا: مطلع الانوار، مجنوں لیلیٰ، خسرو شیریں، آئینہ سکندری، ہشت بہشت اس کے علاوہ پانچ ایسی مثنویاں بھی تھوڑے تھوڑے وقفے سے تصنیف کیں جن کی بنیاد ہی تاریخی واقعات پر ہے اور خود شاعر کا دعویٰ ہے کہ اس نے اچھی طرح چھان بین کی ہے۔

امیر خسرو کی نظم و نثر سادہ طرز پر نہیں ہے، اس میں کنایوں اور استعاروں کی کافی بھرمار ہے۔ لیکن ان پانچوں مثنویوں میں، جہاں انہیں تاریخی واقعات بیان کرنا تھے لفظی نوک پلک کے بجائے بیان واقعہ کو اہمیت دی ہے۔ مثلاً مفتاح الفتوح "مثنوی میں جو دیوان "غرۃ الکمال" کا حصہ ہے۔ خود کہتے ہیں کہ شاعرانہ مبالغہ اور جھوٹ سے اگرچہ خوب صورتی پیدا ہو جاتی ہے لیکن جھوٹ یا مبالغے سے پاک کیا ہوا سچا بیان Realism بھی ایک دل فریبی رکھتا ہے

## پدماوت محض افسانہ

امیر خسرو چتوڑ کے قلعے پر علاء الدین خلجی کے حملے کے وقت موجود تھے اس کی ساری تفصیلات نثر میں بیان کی ہیں۔ راجپوتوں کی دلیری اور شیرانہ جنگ کا دلچسپ ذکر کہیں بھی ان افسانوں کا پتہ نہیں چلتا جو ملک محمد جائسی کی نظم پدماوت کے بعد اتنے مشہور ہو گئے کہ ابوالفضل نے "آئین اکبری" میں جگہ دی اور کرنل ٹاڈ نے اسے قطعی تاریخی واقعہ تسلیم کر لیا ہے حالانکہ خود ملک محمد کو شاعری اور تخیل کا دکھانا مقصود تھا ورنہ بقول اُن کے "کہاں کی رانی اور کہاں کا راجہ" مزے کی بات ہے کہ ہمارے زمانے کے ایک مشہور مورخ ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے History Of Muslim Rule In India مطبوعہ ۱۹۳۶ء میں) امیر خسرو کے بیان "خزائن الفتوح" سے حوالہ بھی دیا تو یہ نہیں بتایا کہ شیر شاہ کے زمانے سے پہلے علاء الدین خلجی تک یعنی امیر خسرو اور ان کے بعد ڈھائی سو سال تک کسی تاریخ میں رانی پدمنی وغیرہ کے افسانے کا ذکر نہیں ہے۔

ان پانچوں مثنویوں میں مفتاح الفتوح، خضر خاں دول رانی اور تغلق نامہ کی زبردست تاریخی اہمیت ہے۔ مفتاح الفتوح (نظم) اور خزائن الفتوح (نثر) تو پہلے خلجی بادشاہ کے زمانے اور فتوحات کی ایسی ہم عصر تاریخیں ہیں کہ بعد کے تمام قابل ذکر مورخوں نے ان سے فیض اٹھایا ہے۔

اس "ترک ہندوستانی" کی نظر ہندوستان کے ہر ایک منظر پر بے لاگ پڑتی ہے علاء الدین خلجی نے اپنے سپہ سالار ملک کافور کی سرکردگی میں جو فوج جنوبی ہندوستان کی طرف بھیجی تھی، اس کا سفر نامہ ہمیں امیر خسرو کے بیانات میں ملتا ہے وہ دیوگری یا دیوگڑھ قلعے کی، اس علاقے کی، وہاں کی کاریگری اور ہنرمندی کی بڑھ چڑھ کر تعریف کرتے ہیں اسی طرح رنتھمبور قلعے کے استحکام کا انہوں نے نقشہ کھینچ دیا ہے۔

لباس کی تفصیلات ملتی ہیں۔ پھلوں اور پھولوں کا بیان ملتا ہے، کاغذ امپورٹ بھی ہوتا تھا۔ اور ہندوستان میں ردی اور کپڑے کو پانی میں گلا کر، کوٹ کر بنایا بھی جاتا تھا۔ دیوگری میں جو باریک ریشمی کپڑا بنتا تھا۔ اس کا دس گز کا تھان ناخن پر پٹیا جا سکتا تھا (اور یہ کپڑا اکسپورٹ کیا جاتا تھا، اس کا نام ہی دیوگری تھا)

المیہ مثنوی "خضر خاں دول رانی" جب لکھ رہے تھے تب اس خونی ڈرامے کے سارے کردار زندہ تھے، غلط بیانی کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ امیر خسرو کی ہمدردیاں اس میں دول رانی کے ساتھ ہیں۔ وہ خضر خاں کے ساتھ کھیل کر بڑی ہوئی ہے اور دونوں بچپن سے ایک دوسرے کو دل دیے بیٹھے ہیں۔ اس ڈرامے کو منظوم کرتے وقت امیر خسرو نہ

صرف درباروں اور محلوں کی اندرونی سازشوں کو بے نقاب کرتے ہیں بلکہ شادی کی رسموں کا بھی تفصیلی نقشہ کھینچ دیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صرف ایک صدی پہلے باہر سے آئے ہوئے ترک تاجیک اور پٹھان قبیلوں میں خاص ہندوستانی شرفاء کے رسم و رواج چل پڑے تھے۔

لباس کے علاوہ ہتھیار، اوزار، جیوتشیوں اور دو دوانوں کے مرتبے، مختلف پیشہ ورانہ گروہوں کی سماجی حیثیت اور دہلی کے خوش حال طبقے کی دولت کی کثرت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ بعض لفظوں اور محاوروں کی قدامت کا پتہ لگتا ہے مثلاً "سُن برسنا" آج تک زبان پر چڑھا ہوا ہے۔ امیر خسرو کے بیان سے خیال گزرتا ہے کہ علاء الدین خلجی جب اپنا شاہی جلوس لے کر دہلی کی طرف بڑھا ہے تو روزانہ ۵ من سونا منجنیق (گوپھن) سے رکھ کر آس پاس کی بستیوں پر پھینکا جاتا تھا۔ خضر خاں کی پہلی شادی کے موقع پر بھی دونوں طرف اشرفیاں دُور دُور تک منجنیق سے پھینکی جاتی تھیں۔ دن، تاریخ، وقت اور صورت حال کی بعض ایسی تفصیلات اُن کے اشعار میں مل جاتی ہیں جن کا کسی معاصرانہ تاریخ میں پتہ نہ تھا، اور اس لحاظ سے ان کا تغلق نامہ (جو ابھی ۴۰ سال پہلے دستیاب ہوا ہے) ایک اہم تاریخی دستاویز ہے۔

## تغلق کی فوج میں ترک اور روسی

تغلق نامہ نامکمل حالت میں ملا ہے۔ اس کے ۲۹۲۰ شعر محفوظ ہیں۔ شاعر نے جس احتیاط سے تفصیل کے ساتھ واقعات اور کرداروں کا ذکر کیا ہے اس سے کئی اہم نتیجے نکلتے ہیں۔

(الف) خسرو خاں گجرات کا ایک نومسلم اور بڑا منتظم آدمی تھا۔ اس کے قبیلے کا نام پرمار یا پھروار نہیں، "براد‍ء" تھا۔ اور یہ گجرات کا ایک زبردست جنگی قبیلہ تھا جس کے جوانوں کی بڑی تعداد دہلی میں رکھی گئی تھی اور وہ مسلمان نہیں ہوئے تھے ممکن ہے کہ "پرمار" ذات کے لوگ اُن کے ساتھ شریک ہوں۔

(ب) ملک غازی تغلق کی فوج میں باہر کے سپاہی اور امیر زیادہ تھے تعجب ہوتا ہے کہ اس میں ہمالیہ پار کے جنگجو کس طرح دو مہینے کی تیاری میں آکر شریک ہو گئے تھے ان کی تعداد بھی خسرو خاں کی ہندوستانی فوج سے بہت کم تھی اور اس میں روسی سپاہی بھی تھے۔

سپاہش ارچہ بود اندک نہ بسیار ؛ و لے بسیار اندک بود و پُر کار
سواراں بیشتر ز اقلیم بالا ؛ نہ ہندوستانی و ہندو و والا
غز و تُرک و مُغل، رومی و روسی ؛ چو باز جرہ در جنگ خروسی
دگر تاجیک خراسانی و پاک اصل ؛ گشتہ اصل بد با اصل شان وصل

(ج) اس مثنوی سے یہ بھی صاف صاف ثابت ہوتا ہے کہ دونوں طرف کی فوجوں میں مسلم اور غیر مسلم شریک تھے خود ملک غازی کے لشکر میں مسلمانوں کی پلٹنیں "اللہ اکبر" پکارتی تھیں اور ہندو پلٹنوں سے "نارائن" کے نعرے بلند ہوتے تھے اس میں پنجاب کے کئی ہزار بہادر کھوکھرے شامل تھے اسی طرح خسرو خاں کے لشکر میں مسلمان پلٹنیں موجود تھیں جنہوں نے آخر تک اس کی طرف سے جنگ کی اور خسرو خاں کے کئی مسلمان سردار مارے گئے سالار سالاری "براد‍ء" ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی۔

(د) اس سے لشکروں کی ترتیب کا بھی پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے اگر جلال الدین خلجی سے لے کر تغلق خاندان تک ان جنگی مہموں کی وہ تفصیلات نظر میں رکھی جائیں جو امیر خسرو کے بیان سے ثبوت کو پہنچتی ہیں تو یہ نتیجہ نکالنے میں دشواری نہیں ہوتی کہ:

تیرھویں صدی سے ہی ہندوستان کی جنگیں مذہبی نہیں بلکہ قبائلی غلبہ، نسلی برتری قائم رکھنے اور زرخیز علاقوں پر قبضہ کرنے کی جنگیں ہو چکی تھیں۔ مذہب کا نام صرف اسی حد تک استعمال کیا جاتا تھا کہ ان جنگی قبیلوں یا امیروں کو ساتھ لیا جا سکے جو کسی ایک یا دوسرے مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ تاتاری اور منگول حملوں کا منہ توڑ جواب دینے کے لئے "بار بار کفار مغول" سے جہاد کا نعرہ لگایا گیا اور جب یہ مغول اسلام قبول کر چکے تھے تب بھی ان کی یلغار جاری تھی انہیں کفار ہی کہا گیا جو بالآخر بابر کی فتح پر تمام ہوئی۔

(ہ) امیر خسرو کے بیانات کی روشنی میں یہ راز بھی کھلتا ہے کہ ہندوستانی پیشہ وروں میں اسلام پھیلتا جا رہا ہے اور سماج میں کاری گروں مثلاً جلاہوں نقاشوں اور برتن بنانے والوں کی اہمیت بڑھنے لگی تھی جن میں مقامی کاریگروں کے علاوہ نو وارد ولایتی بھی شامل تھے۔

فریڈرک اینگلس نے بالزاک کے افسانوی ادب پر تبصرہ کرتے ہوئے جو یہ کہا تھا کہ انقلاب فرانس کے پس پشت حالات کو میں نے مورخوں سے بہتر بالزاک کی تحریروں میں سمجھا ہے تقریباً وہی نکتہ لارڈ جیبرٹن نے ڈکنس کے ناول "دو شہروں کی کہانی" (A TALE OF TWO CITIES) کے دیباچے میں دُہرایا ہے کہ کارلائل نے انقلاب فرانس کی عالمانہ "تاریخ" بڑی محنت سے لکھی لیکن اس تاریخی واقعے کی جیتی جاگتی تصویر ڈکنس کے یہاں ملتی ہے۔

امیر خسرو نے آج سے ساڑھے چھ سو سال پہلے، ہندوستان کے قرونِ وسطیٰ کی گہری تبدیلیوں کو جو تیرھویں صدی کے آخر اور چودھویں صدی کے شروع میں سطح کے نیچے کام کر رہی تھیں۔ شاعرانہ صداقت کے ساتھ پیش کر کے ہمیں یہ سراغ لگانے میں مدد دی ہے کہ چیتنیہ، کبیر، اور نانک کے ذہنی اور سماجی پیغام کی تہہ میں کون سے عناصر کام کر رہے تھے ہم کہہ سکتے ہیں کہ امیر خسرو کی نظم و نثر میں صرف بادشاہوں کی فتح و شکست کا بیان نہیں بلکہ ایک بھرپور تصویر ملتی ہے۔ ان عناصر کی فتح و شکست کی جو زندگی کے تبدیل ہوتے ہوئے منظر میں کارفرما تھے ـــــ تاریخ کے ورق اور شاعری کے ایسے امتزاج کی مثال اگر امیر خسرو کے سوا کہیں اتنی عظمت اور گہرائی کے ساتھ ملتی ہے تو فردوسی طوسی کے ہاں لیکن فرق اتنا ہے کہ فردوسی نے داستان پاستان سے "نامِ خسرواں" کے ریزے چن چن کر تاریخی داستانیں مہیا کی تھیں۔ امیر خسرو نے اپنے دل کے ٹکڑے جنگی میدانوں میں تڑپتے دیکھے ہیں، اپنے محبوبوں کو خاک و خون میں ملتے دیکھا ہے اور اُن کی آرزوؤں اور حسرتوں کو شعر کر کے آئندہ کے مورخ کے لئے سرو سامان محفوظ کر دیا ہے۔


NIRODH
بچّوں کی پیدائش میں وقفہ کیلئے
فی زمانہ بچّوں کی پیدائش اتفاق کی بات نہیں۔
یہ آپ کے اختیار میں ہے۔ نرودھ
استعمال کرنے سے آپ کے بچّہ تبھی
ہونگا جب آپ چاہیں گے، اتفاق
سے نہیں۔
بچّہ اور ماں
کی صحت کیلئے
ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ بچّے کو شروع کے تین
برسوں میں زیادہ توجہ درکار ہوتی ہے۔
پھر بچّے کی پیدائش کے بعد ماں کو اپنی
صحت بحال کرنے میں بھی وقت لگتا ہے۔
نرودھ استعمال کرکے آپ اگلے بچّے کی
پیدائش ملتوی کر سکتے ہیں۔
نرودھ (کنڈوم)، اعلیٰ کوالٹی کے ربڑ سے
بنتا ہے۔ دنیا بھر میں لوگ اسے استعمال
کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ فیملی پلاننگ کا آسان
و محفوظ طریقہ ہے۔ اس کے استعمال سے
صحت پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑتا۔
نرودھ ہر جگہ ملتا ہے:۔
پروویژن اسٹور، کرانہ فروش،
کیمسٹ، جنرل مرچنٹ، پان فروش
وغیرہ کی دوکانوں پر بکتا ہے۔
صرف
5 پیسے
خرچ کرکے
آپ
اپنے کنبے
کو
محدود رکھنے
کی طاقت
حاصل کرسکتے ہیں
نرودھ استعمال کیجئے
فیملی پلاننگ کیلئے
اعلیٰ کوالٹی کے
ربڑ کنڈوم
15 پیسے کے 3
سرکاری امداد سے کم دام
70/61



# کام اور آپ

کرتار سنگھ دُگّل

پھر وہی بات ہوئی تھی، لاکھ احتیاط سے وہ دورے کا پروگرام بناتا، کون سی گاڑی، ہوائی جہاز کی کون سی پرواز، کب کہاں پہنچے گا، کہاں قیام کرے گا، کتنے دن رُکے گا، پھر بھی کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہو جاتی۔ کوئی خرابی ضرور تھی۔ اِس بار جب وہ گاڑی سے اُترا، اُس کے استقبال کے لیے آئے کارکن نے جھجکتے ہوئے بتایا، "حضور! سرکٹ ہاؤس میں آپ کے لیے کمرہ ریزرو کیا تھا لیکن اس میں کچھ تبدیلی . . . . " وہ چپ رہا۔ اپنے میزبان سے کوئی اُلجھتا تھوڑے ہی ہے۔ جب باہر موٹر میں وہ بیٹھا، مقامی کارکن نے ڈرائیور کو ایم ایل اے ہوسٹل چلنے کے لیے کہا اور اُس نے پھر خود بخود بولنا شروع کر دیا، بات یوں ہوئی، ہم نے سرکٹ ہاؤس میں دو ہفتے پہلے ہی کمرہ ریزرو کروا دیا تھا لیکن کچھ دن ہوئے ایک اعلیٰ سطح کی میٹنگ یہاں کرنے کا فیصلہ ہوا اور سرکٹ ہاؤس باہر سے آئے وی آئی پی مہمانوں کے لیے خالی کروا لیا گیا۔ یہ تو غنیمت ہے کہ ہمارا ایم ایل اے ہوسٹل آج کل خالی ہے جب سے اسمبلی ٹوٹی ہے، شہر میں رہنے کی جگہ کی کوئی تکلیف نہیں رہی۔ اتنا بڑا ایم ایل اے ہوسٹل خالی پڑا ہے اور پھر ہمارا یہ ہوسٹل شہر کے درمیان واقع ہے، سرکٹ ہاؤس تو شہر کے باہر ہے — کوئی سات میل آگے جلنے میں ہی آدھا دن بیت جاتا ہے . . . "

اِس طرح کی کہانی وہ بیان کر رہا تھا کہ موٹر ایم ایل اے ہوسٹل کے سامنے جا رُکی۔

انتہائی خوبصورت پانچ منزلہ عمارت۔ ایک نظر دیکھ، وہ کھِل اُٹھا —

"اس میں کیا خرابی ہے ؟ یہ ہوسٹل تو بہت بڑھیا ہے !" موٹر سے اُترتے ہوئے اس نے اپنے میزبان سے کہا: "اس میں کیا خرابی ہے ؟" مقامی کارکن خاموش تھا۔ سر ہلا ہلا کر اس کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔ پھر وہ جلدی جلدی تیار ہو، ناشتہ کر کے کام پر نکل گیا۔

دوپہر، کھانا کھانے کے بعد جب وہ لوٹا تو بہت اُمس تھی۔ ہر کوئی کہتا — اِن دِنوں جب ایسی اُمس ہوتی ہے تو بارش ضرور آتی ہے۔ لیکن بارش کا کہیں دُور، دُور تک نشان نہیں تھا۔ اور وہ ہوسٹل کے اپنے سوٹ میں کواڑ بند کر کے نیچے فرش پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر کے بعد اُسے محسوس ہوا جیسے ڈریسنگ رُوم کی الماری میں سے اُسے کچرے کی سڑاند آ رہی ہو۔ الماری بند تھی۔ ڈریسنگ روم کا دروازہ بند تھا۔ پھر بھی جیسے بدبو آ رہی تھی۔ یونہی اُس کا وہم ہے، اس نے سوچا۔ بدبو تو آ رہی تھی۔ پھر وہ اُٹھا اور اُس نے سامنے والی کھڑکی کا پٹ کھول دیا۔

آسمان پر جیسے غبار چھا رہا تھا۔ عجیب موسم ہو رہا تھا۔

کھڑکی کے باہر خالی جگہ میں کسی نے مکئی بو رکھی تھی۔ پودے کندھے تک بڑھے ہوئے تھے۔ لیکن ابھی اُن میں بھٹے نہیں لگے تھے اور سامنے کوارٹر تھے نیچے موٹروں کے لیے گیراج۔ اوپر نوکروں کے گھر۔ گھروں کے سامنے گیلری تھی۔ اس طرف سیڑھیاں تھیں جہاں کوڑے کا ڈھیر لگا تھا لیکن جہاں وہ لیٹا ہوا تھا۔ وہاں سے کوڑے کا ڈھیر نہیں دکھائی دیتا تھا۔ مکئی کے پودے دکھائی دیتے تھے، گیراج کے پیچھے دکھائی دیتے تھے اور نوکروں کے کوارٹروں کی گیلری۔

اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اُمس بھی کتنی تھی! اور پھر اُس نے دیکھا — سامنے نوکروں کے کوارٹروں کے باہر گیلری میں کوئی آ کھڑی ہوئی۔ اِس گرمی میں۔ پہاڑن

سی کوئی۔ پان کے پتے جیسا منہ، گورا رنگ، کہیں کہیں چیچک کے داغ، سوئی سوئی آنکھیں کھلے بال کندھوں پر بکھرے ہوئے، نیلی جیکٹ دھوتی، گیلری میں آکر کھڑی ہوئی کہ اُس کی نظریں جیسے ایم ایل ہوسٹل کے پچھواڑے کی کھڑکیوں پر تیرنے لگیں۔ ایک، دو، تین، چار۔ ۔ ۔ دس۔ ۔ ۔ بیس۔ ۔ ۔ پچاس۔ ۔ ۔ سو کھڑکیاں پانچویں منزل کی، ایک، دو، تین، چار۔ ۔ ۔ دس۔ ۔ ۔ بیس۔ ۔ ۔ پچاس۔ ۔ ۔ سو کھڑکیاں چوتھی منزل کی، پھر تیسری منزل، دوسری منزل، پہلی منزل اور اب نچلی منزل کی کھڑکیوں پر گھومتی ہوئی اُس کی نظریں اُس کھڑکی پر آکر رک گئیں جس سوٹ میں وہ ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ کھڑکی کھلی تھی۔ باقی کھڑکیاں بند تھیں۔ تیسرے پہر کی اُمس میں باقی سب کھڑکیاں بند تھیں اور اِس کھڑکی میں اس کی نظریں جیسے جم گئی ہوں۔ آگے نہیں اُٹھ سکیں۔ اُس نے بازو اٹھاکر ایک جمائی لی جیسے اس کا سارا جسم اینٹھ گیا ہو۔ اب وہ اپنے بالوں کو اکٹھا کر کے اُن کا جوڑا بنا رہی تھی اور اندر پنکھے کے نیچے لیٹے ہوئے اُس نے دیکھا، اُس کی چار اُنگل چولی اُس کے انگ کو ڈھانپنے کے بجائے ان کی گولائیوں کو مزید بے نقاب کر رہی تھی۔ اور پھر وہ زیرِ لب مسکرانے لگی۔ سامنے وہ لیٹا ہوا تھا سفید چادر پر۔ پنکھا تیز چل رہا تھا۔ اُس کے بال اُڑ اُڑ کر اُس کے چہرے پر گر رہے تھے۔ وہ بار بار اپنے بالوں کو پیچھے کر رہا تھا اور ایک ٹک اُسے دیکھ رہا تھا۔ اس بے ہودہ موسم میں باہر گیلری میں کھڑی آنکھوں ہی آنکھوں سے جیسے وہ قدم قدم چلتی اس کے کمرے میں چلی آرہی ہو۔ بد تمیز عورت! اور اس نے کروٹ بدل کر دیوار کی طرف منہ پھیر لیا۔ کتنی دیر تک وہ یونہی پڑا رہا۔

گرمی بہت تھی۔ اُسے نیند نہیں آرہی تھی۔ باہر گیلری میں کتنی اُمس ہوگی! اور اُس نے کروٹ بدل کر دیکھا، یوں کی توں وہ کھڑی تھی۔ اب اُس کی گود میں بچہ تھا مریل سا مکھیاں اس کے منہ پر بھنبھنا رہی تھیں۔ ایک جانب جونک سی لڑکی اُس کی دھوتی کے پلو کو پکڑے ہوئے کچھ مانگ رہی تھی۔ پھر ایک اور بچہ آیا۔ وہ بھی کوئی فرمائش کرنے لگا۔ پھر ایک اور، پھر ایک اور۔ اوپر تلے پانچ بچوں نے اسے گھیر رکھا تھا۔ کوئی کچھ کہہ رہا تھا، کوئی کچھ مانگ رہا تھا۔ کوئی کسی چیز کے لئے ضد کر رہا تھا۔ اور وہ سامنے کھڑکی میں پھر اُسے اپنی جانب جھانکتے ہوئے دیکھ کر کھل سی گئی۔ اس کی گود میں بچہ رونے لگا تھا۔ اُسے اس نے سب سے بڑے بچے کو سونپا اور باقی بچوں کو جیسے سمجھانے لگی۔ باہر بہت گرمی ہے۔ تم اندر کوارٹر میں جاکر کھیلو اور پھر جیسے یہ بات بچوں کی سمجھ میں آگئی ہو۔ ایک ایک کر کے وہ چلے گئے اور اب وہ پھر اکیلی تھی۔ کس طرح کا یہ آدمی ہے! بٹ بٹ اُسے گھورے جا رہا ہے لیکن ٹس سے مس نہیں ہو رہا۔ شاید اُس میں اب وہ تمنا جیسی قوت نہیں رہی ہے۔ کوئی دن تھے، کوئی اُسے دیکھتا تو ریشہ خطمی ہو کر رہ جاتا۔ شاید اوپر تلے ہوئے پانچ بچوں نے اس کا سب کچھ نچوڑ لیا تھا اور اُس کی آنکھیں لال ہوگئیں۔ چھل چھل آنسو اُن میں سے بہنے لگے۔ یہ تو رو رہی ہے! اور اندر پنکھے کے نیچے لیٹا، اس کا جی پارے کی طرح پگھل گیا۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر کھڑکی کے پاس جاکر کھڑا ہوا اور اُس نے اُسے اشارہ کیا وہ اُس کے کمرے میں آسکتی تھی۔ اُس نے اسے اشارہ کرتے ہوئے دیکھا تو جیسے اُس کے لئے سپنا تہ نکل آیا ہو۔ اسی طرح وہ میلے کپڑوں میں ویسی کی ویسی میلی جیکٹ، دھوتی میں ویسے کے ویسے بے سنورے بال، وہ سیڑھیوں کی طرف چل دی —

دو منٹ، تین منٹ، چار منٹ، اور وہ اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی دروازہ کھلا تھا اور وہ کمرے کے اندر تیز چل رہے پنکھے کے نیچے آ کھڑی ہوئی — ڈری سی، معصوم، مجبور، مظلوم۔

"پہلے باتھ روم میں۔ ۔ ۔ " اس سے پہلے کہ وہ اپنا جملہ پورا کرتا وہ بولی "میں ابھی ابھی نہائی ہوں، بال بھی دھوئے تھے۔ ابھی سوکھے بھی نہیں۔"

"باتھ روم میں کپڑے پڑے ہیں، انہیں دھو دو۔" اُس نے مسکراتے ہوئے اپنا جملہ پورا کیا۔

اور اُنہی قدموں، وہ باتھ روم کی جانب چل دی۔ کواڑ بند کئے۔ کتنی دیر کپڑوں کو صابن لگانے، کوٹنے، کھنگالنے کی آواز آتی رہی۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد وہ باتھ روم سے باہر نکلی اور سامنے ڈرائنگ روم میں اُس کا کرتہ، پائجامہ، جانگیہ، بنیان سب کو ایک ایک کر کے کیلوں کے ساتھ، کھڑکی کے پٹ کے ساتھ، کرسیوں کی پشت پر ٹانگ دیا اور پھر اپنے ہاتھوں کو دھوتی کے پلو سے پونچھتی ہوئی وہ اس کے سامنے آکھڑی ہوئی

"اب ڈرائنگ روم کی الماری کو صاف کر دو۔" وہ مڑ کر ڈرائنگ روم کی طرف چلی گئی الماری میں سے بُو آرہی تھی۔ اُس نے بیچ کا دروازہ بند کر لیا۔ ایسا لگتا تھا، الماری کو کسی نے برسوں سے صاف نہیں کیا تھا اور وہ ایک ایک کر کے ہر خانے کو جھاڑتی، پونچھتی صاف کرتی کتنی دیر اس میں مصروف رہی۔ کام کرتی جاتی اور ساتھ ساتھ کسی لوک گیت کی دھن بھی گنگناتی جاتی۔ الماری کو صاف کرنے، کوڑا اکٹھا کرنے، کوڑا باہر پھینکنے میں کوئی ایک گھنٹہ بیت گیا۔ اب پھر وہ اُس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اس بار وہ صابن سے ہاتھ منہ دھو کر آئی تھی۔ اُجلی، اُجلی لگ رہی تھی۔ فاختہ سی، پرسکون کھوئی کھوئی

ویسی کی ویسی وہ کھڑی تھی جیسے کوئی دھرتی سے ابھی ابھی پھوٹی کونپل ہو کہ وہ اُٹھ کر تیزی سے باتھ روم کی طرف نکل گیا۔ اُس نے اندر سے کنڈی لگالی۔ کچھ دیر کے بعد اس کے نہانے کی آواز آنے لگی۔ اتنے میں بے کار کھڑی اس نے اس کے سونے کے کمرے کی صفائی شروع کر دی۔ پہلے کمرے کو بہارا، پھر جھاڑا پونچھا۔ پھر پلنگ کے پائے میز، کرسیاں، کھڑکی کے شیشے صاف کئے، جو میلے تھے۔

وہ نہا کر نکلا۔ وہ ابھی تک کھڑکی کے شیشے صاف کر رہی تھی۔ جتنی دیر تک وہ ڈریسنگ

روم میں کپڑے بدلتا رہا، وہ ویسی کی ویسی شیشے صاف کرتی رہی۔ اب اس کی پلنگ کی چادر جھٹک کر بچھا رہی تھی۔ اتنے میں وہ تیار ہوکر اُس کمرے میں آگیا۔

چادر کے ایک سرے میں سے سلوٹیں نکالتے ہوئے اُس نے اس کی طرف دیکھا کتنا بانکا آدمی تھا۔ اونچا، لمبا، گندمی رنگ، تازہ سنورے بال، ایک نظر اس نے اُسے دیکھا اور جیسے کچھ ہوگیا ہو۔ جیسے اُس کا انگ انگ ٹوٹنے لگا ہو۔ اُسے دیکھتے ہوئے اُس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

اُسے لگا، ایک لمحہ اور وہ اُس کے بھرپور آغوش میں ہوگی۔ اس کے ماتھے پر، اس کے گالوں پر ایک جھنجھناہٹ سی محسوس ہوئی، چکر چکر . . . اندھیرا اندھیرا اور اس نے دیکھا اس کا ہاتھ اس کے کوٹ کے اندر کی جیب میں گیا۔ اور اس نے دس روپے کا ایک نوٹ اس کی ہتھیلی پر دھر دیا۔

"بہت بڑھیا صفائی تم نے ان کمروں کی کی ہے۔" وہ اس کی تعریف کر رہا تھا۔

دس روپے کا نوٹ اس کی مٹھی میں تھا اور وہ باہر جانے کے لئے تیار کھڑا تھا۔ اس بات کا احساس جب اُسے ہوا تو گوری کی اس پہاڑن کا جی چاہا کہ اُس کے قدموں میں وہ اوندھی جا گرے۔ ممنونیت کے تحت، پھول جیسے لطیف اپنے انگوں کو سمیٹتی وہ کمرے سے باہر نکل آئی۔ دروازے سے گزرتے ہوئے اس نے دھوتی کے پلو سے اپنے سر کو ڈھک لیا۔

کچھ دیر کے بعد اس نے دیکھا، وہ سامنے نوکروں کے کوارٹروں کے گیلری میں کھڑی تھی۔ جیسے اڑ کر وہاں پہونچ گئی ہو۔ جب آئی تھی تو کتنی دیر اس نے لگائی تھی، اب کیسے اتنی جلدی اپنے گھر پہونچ گئی تھی۔ اس کے بچوں نے اسے گھیر لیا تھا اور سب سے چھوٹے کو ہوا میں اچھال کر وہ کھلا رہی تھی۔ بچہ کھل کھلا کر ہنس رہا تھا۔ باہیں اٹھائے بچے کو اچھالتے ہوئے، ماں نے اس کے پاؤں کی انگلیوں کو اپنے دانتوں میں لے لیا۔ جیسے انہیں ہنس چبا رہی ہو اور اس کی آنکھیں ایک ناقابلِ بیان نشاط سے مندھ گئیں کچھ دیر رم جھم پھوار پڑنے لگی۔

## پبلیکیشنز ڈویژن

نے طے کیا ہے کہ اس ادارے کی طرف سے شائع ہونے والے رسائل کے خریداروں کو ہماری مطبوعات کی خریداری پر ۲۰ فیصد کی رعائت دی جائے گی۔ آرڈر پانچ روپے سے کم نہ ہو۔ اور آرڈر کے ساتھ خریداری نمبر لکھنا ضروری ہے۔ ہمارے ہاں اُردو، ہندی، انگریزی کے علاوہ علاقائی زبانوں کی کتابیں بھی شائع ہوتی ہیں۔ کتابوں کے انتخاب کے لئے فہرست طلب کیجئے جو آپ کی خدمت میں مفت ارسال کی جائے گی۔

بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی

# حسن اور وفا

**جگدیش سہائے سکسینہ**

آہ اے گل اے سراپا رنگ و بو
شاخ گلبن کی ہے چرخِ اخضری
اور تو ہے کوکبِ رنگیں جمال
تجھ پہ قرباں ہے ادائے دلبری

کس کے تیرِ ناز کا پیکاں ہے تو
کس قدر جاں بخش ہے منظر ترا
گل ہے تو یا رنگ و بو کے درمیاں
کوئی پیمانِ وفا باندھا گیا

جس سے روشن ہے جہانِ آرزو
تیرے دلدادہ ہیں مرغانِ ارم
داستانِ مستیٔ حسن و شباب
ہے ترے اوراقِ رنگیں پر رقم

اے جوانی کی بیاضِ مشکبو
کس کے ہونٹوں کا چرایا تو نے رنگ
کس کے گیسو کی اُڑائی ہے مہک
خاک میں پنہاں ہیں لاکھوں شوخ و شنگ

مہ جبین و مہ جمال و ماہرو
حیف تیری نرم و نازک پتیاں
جن پہ نازاں ہے عروسِ نو بہار
شام کو ہو جائیں گی نذرِ خزاں

اے دلِ بلبل کی رنگیں آرزو
سوچتا ہوں کس طرح دامن ترا
دستِ بیدادِ خزاں سے دور ہو
میرے لفظوں میں ہے تاثیر بقا

جلوہ فرما ہو مری نظموں میں تو
میں سخنور ہوں مرا حسنِ بیاں
کھینچ کر صورت تری الفاظ میں
تجھ کو بخشے گا حیاتِ جاوداں

غیر ممکن ہے کہ پژمردہ ہو تو

# نظریات کا تصادم

دوسرے افراد و اشیاء کا بلاواسطہ علم ہمیں مشاہدے کے ذریعے ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ہم یہ بھی باور کرتے ہیں کہ مشاہدہ اشیا افراد کے حقیقی اوصاف کی عکاسی کرتا ہے۔ مشاہدہ ان کی اصلی خصوصیات پر ہی مبنی ہوتا ہے اس صورت میں اگر کوئی شخص یہ محسوس کرے کہ دوسرا شخص اپنی اشیا یا حالات کا مشاہدہ دوسری طرح کر رہا ہے تو وہ بلاشبہ ایسا سمجھنے پر مجبور ہوگا کہ اس دوسرے شخص کا مشاہدہ حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ اپنے مشاہدے کی صداقت پر اُسے کسی شبہ کی گنجائش نہیں معلوم ہوگی کیونکہ اپنے مشاہدے میں اس نے کوئی کتر بیونت نہیں کی ہے بلکہ اس کے حواس خمسہ نے انہیں جس صورت میں پیش کیا تھا اس نے من وعن قبول کر لیا ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ وہ دُوسرے شخص کے مشاہدے کو غلط نہ سمجھے اور اسے یہ شبہ نہ ہو کہ دوسرے شخص نے دانستہ اپنے مشاہدے میں تحریف کر دی ہے۔ تماشہ یہ ہے کہ دُوسرا شخص بھی سراسر انہی وجوہات کی بنا پر اپنے مشاہدے کو درست اور صحیح باور کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک ہی شئے یا حالت کے مشاہدے میں ہم نظریات کے تصادم سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ اور چونکہ ہر فرد کو اس بات کا یقین ہے کہ دوسرا شخص غلط ہے، اس لئے نظریات کے تصادم کی گتھی الجھی ہوئی رہ جاتی ہے۔ دوسرے شخص کو مخالفت کے حق سے اس لئے محروم کر دیا جاتا ہے کہ نہ تو خارجی اشیاء کی مستقل اور پائندہ خصوصیتوں سے انکار ممکن ہے اور نہ اپنے مشاہدے کی حقیقت سے — ایک دوسرا تصور بھی عام طور پر ہم پر حاوی ہے کہ ہمارے افعال ہمارے مشاہدوں پر مبنی ہوتے ہیں یعنی کسی شئے کے ساتھ ہمارا فعل اسی انداز میں ہوتا ہے جس رنگ میں ہم اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ سامنے رکھی ہوئی چیزوں میں ایک چیز کو ہم اٹھا کر منہ میں ڈال لیتے ہیں اس لئے کہ وہ ہمیں کھانے کی چیز دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً چاکلیٹ دوسری چیز کو اُٹھا کر ہم کاغذوں کی تہوں کے اوپر رکھ دیتے ہیں اس لئے کہ ہمارا مشاہدہ اسے پیپر ویٹ بتاتا ہے۔ ان دو مختلف اشیاء کی بابت ہمارے افعال کی نوعیت مختلف ہے جس کا سبب یہی ہے کہ ان کا مشاہدہ بھی مختلف ہے۔ اس طرح ہمیں یقین ہے کہ مختلف مشاہدے ہمارے اندر مختلف افعال کی تحریک پیدا کرتے ہیں اور اس بنا پر مشاہدہ ہی کسی شئے کے ساتھ مناسب فعل کا اصل سبب سمجھا جاتا ہے۔ اگر کسی ایک شئے یا حالت کے مقابلے میں دو افراد سے دو مختلف افعال سرزد ہوتے ہیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ ان دونوں میں سے کسی ایک فرد کا فعل غیر مناسب یا غلط ہے۔ اس شخص کو ہم غیر تربیت یافتہ یا عجیب تصور کرنے لگتے ہیں۔ یہاں بھی ہمارے استدلال کی بنیاد وہی ہے "فعل مشاہدے سے اثر پذیر ہوتا ہے، حقیقی مشاہدے کا نتیجہ مناسب عمل ہونا چاہئے، غلط مشاہدہ ناموزوں عمل پیدا کرتا ہے"۔ اس طرح دوسرے افراد کے اعمال و کردار کی بابت بھی نظریات کا تصادم رونما ہونے لگتا ہے۔

مندرجہ بالا بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مشاہدہ اور فعل سبب و نتیجے کے رشتے میں منسلک کر دئے جاتے ہیں اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس رشتے کی سمت بدلی نہیں جا سکتی یعنی ہم مشاہدے کے رشتے سے فعل کی طرف رخ کر سکتے ہیں لیکن فعل سے مشاہدہ کی سمت نہیں جا سکتے۔ دوسرے لفظوں میں فعل مشاہدہ سے اثر پذیر ہوتا ہے لیکن مشاہدہ پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی کہے کہ ان دونوں کا تعلق محض یک طرفہ نہیں ہے بلکہ بعض صورتوں میں فعل، سبب اور مشاہدہ نتیجہ بھی بن سکتا ہے تو یہ بات لایعنی تصور کی جائے گی اس لئے کہ یہ بیان دو بنیادی عقیدوں سے انحراف کرتا ہے (۱) مشاہدہ کو فعل کا سبب قرار دیا جانا (۲) سبب اور نتیجے کے تعلق میں عدم بازگشت۔ اگر "الف" "ب" کا سبب ہے تو کسی حالت میں "الف"، "ب" کا نتیجہ نہیں بن سکتا۔ یہ ممکن ہے کہ "الف" کسی دوسرے سبب کے تعلق سے نتیجے کی شکل اختیار کر لے لیکن جو کسی ایک وقت میں "الف" کا نتیجہ بن چکا ہے، کبھی "الف" کا سبب نہیں بن سکتا۔ عام طور پر سبب

اور نتیجے کا رشتہ مندرجہ ذیل طریقے سے ہی پیش کیا جاتا ہے۔

الف ← ب ← ج ← س نہ کہ الف ⇄ ب ⇄ ج ⇄ س ⇄

حقیقت میں سبب اور نتیجے کے باہمی عدم بازگشت کا تصور اس حالت میں صحیح نہیں ہوتا جب فکر و مطالعہ کا موضوع ایک جاندار شئے ہو۔ مشاہدہ اور فعل جاندار یعنی جانور اور انسان کی خصوصیتیں ہیں۔ ان کے سلسلے میں جو کسی وقت سبب رہا ہو، دوسرے موقع پر اسی کا نتیجہ بن سکتا ہے جسے ہم اول الذکر کا نتیجہ سمجھ چکے ہیں اگر ایک حالت میں سبب نتیجے پر اثر انداز ہو سکتا ہے تو دوسری حالت میں وہی سبب اپنے نتیجے سے اثر پذیر بھی ہو سکتا ہے۔ دوستی اور محبت کے رشتے کی طرح سبب اور نتیجے کا تعلق بھی یک طرفہ نہیں ہوتا۔ ایک موقع پر زید کی ضرورت اگر بکر فراہم کر سکتا ہے تو دوسرے موقع پر بکر کی ضرورت بھی زید کے ذریعہ پوری ہو سکتی ہے۔ مشاہدے کی اثر اندازی فعل پر ہوتی ہے۔ مشاہدے کی رہنمائی میں موضوع مشاہدہ کی بابت فعل سرزد ہوتا ہے لیکن فعل کے ظہور پذیر ہو چکنے کے بعد ہم آیندہ اس شئے کا مشاہدہ کس صورت میں کریں گے اس کی نشاندہی ہمیں اس کے سلسلے میں کئے ہوئے فعل سے ہی ملے گی اس طرح فعل مشاہدے پر اثر انداز ہوگا۔ وہی جو کبھی سبب تھا، بغیر تیسرے واقعہ کی مداخلت کے نتیجہ بن سکتا ہے۔ بلی جب کسی بچے کو ایک خوفناک شئے دکھائی دیتی ہے تو وہ اس سے دور بھاگتا ہے۔ مشاہدہ سے فعل کی تحریک ہوتی ہے لیکن اگر آپ اسی بچے کو بلی کے ساتھ کھیلنے کی مشق کرا دیں تو پھر اس کی نگاہ میں بلی ایک کھلونا دکھائی دینے لگے گی۔ پہلے موقع پر بلی کا مشاہدہ بچے کے اندر عمل فرار پیدا کرتا ہے۔ مشاہدہ فعل کا سبب ہے۔ دوسرے موقع پر بچے کی، بلی کیساتھ، خوش فعلی، اس کے مشاہدہ میں انقلاب پیدا کر دیتی ہے۔ فعل مشاہدہ پر اثر انداز ہو جاتا ہے۔ ایک دوسری مثال لیجئے۔ جب کوئی شخص کسی ایسے محلے میں بود و باش اختیار کرتا ہے جہاں پہلے سے اس کی آمد و رفت نہیں تھی تو محلے والے اسے اجنبی دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن جب کچھ عرصے میں محلہ والوں کے ساتھ عمل اور رد عمل کا موقع اسے مل جاتا ہے تو وہ محلے والوں کو دوسری نگاہ سے دیکھنے لگتا ہے۔ وہ اسے اجنبی کی جگہ جانے پہچانے نظر آتے ہیں۔

سماج کے اندر ہر فرد کا جو رول یا سماجی حیثیت ہوتی ہے اس کا اثر دوسرے افراد کے مشاہدے پر پڑتا ہے۔ ہر سماج چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹا ہوتا ہے۔ سماج کا ہر فرد ہر ٹولی سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ مختلف افراد مختلف ٹولیوں سے وابستہ ہوتے ہیں لیکن ایک ہی ٹولی کے اندر سب ممبروں کی حیثیت یکساں نہیں ہوتی۔ ہر رکن کی ذات کے ساتھ چند خصوصی فرائض اور ذمہ داریاں منسلک ہوتی ہیں جو اس کی حیثیت یا رول کی نشاندہی کرتی ہیں اور جن کی بنا پر اس ٹولی کا ہر رکن اس سے ایک خاص نوع کے افعال و کردار کی توقع رکھتا ہے۔ ایک کنبے کی مثال سامنے رکھئے جو ایک چھوٹی سماجی اکائی ہے کنبے کے رکن کی حیثیت سے والدین کا رول کنبے کے دوسرے افراد سے جداگانہ ہے۔ والدین کے اندر بھی باپ کی حیثیت ماں کی حیثیت سے مختلف ہے۔ سماجی اکائی کی دوسری مثال اسکول یا کالج کا ادارہ ہے۔ ہیڈ ماسٹر یا پرنسپل کی حیثیت دوسرے اساتذہ سے مختلف ہے اساتذہ کی حیثیت طلباء سے جداگانہ ہے، اسی طرح ان سبھوں کی حیثیت اسکول کے غیر تعلیمی اسٹاف سے الگ ہے۔ سماجی اکائی کا ہر فرد دوسرے افراد کا مشاہدہ ان کی سماجی حیثیت کی روشنی میں کرتا ہے۔ ہر فرد سے جس نوع کے کردار کی توقعات وابستہ ہوتی ہیں، انہی کے مطابق دوسرے افراد اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ ایک طالب علم دوسرے طالب علم کا جس رنگ میں مشاہدہ کرتا ہے اور اسی طالب علم کا مشاہدہ جس طرز سے اس کا استاد کرتا ہے، دونوں میں بڑا فرق ہوتا ہے طالب علم کی وہی بات دوسرے طالب علم کو معقول اور مناسب نظر آتی ہے، جو اس کے اساتذہ کی نگاہ میں غیر معقول اور نامناسب ہے استاد کی جماعتی حیثیت یا، دوسرے لفظوں میں، اس کی عملی خصوصیتیں اس کے مشاہدہ پر اثر انداز ہوتی ہے۔

مشاہدہ پر افعال کی اثر اندازی کی مثال ہمیں اس فرق کے اندر بھی ملتی ہے جو کلچر کے فرق کے ساتھ ایک ہی شے یا ایک ہی حالت کے مشاہدہ میں ہوا کرتا ہے۔ کلچر کی تعریف ان لفظوں میں کی جا سکتی ہے "ان سیکھے ہوئے افعال اور ان کے نتیجوں کی ایک ترتیب جو کسی خاص سماج کے افراد میں مشترک پائے جاتے ہیں اور اس طرح ایک پیڑھی سے دوسری پیڑھی میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔" وہی چیز جو ایک کلچر والوں کو بری دکھائی دیتی ہے، دوسرے کلچر کے افراد کے لئے منظر فریب ہو سکتی ہے۔ کھانے کے بعد مسلسل ڈکار کی آواز ایک کلچر کے افراد کے لئے خوش آیند ہے تو دوسرے کلچر والوں کے لئے مسمع خراش۔ اپنی ماں یا بہن کے چہرے کا بوسہ ایک کلچر کے افراد کے لئے ایک خوشگوار منظر پیش کرتا ہے تو یہی نظارہ دوسرے کلچر والوں کی نگاہوں میں کھٹکنے لگتا ہے۔ مشاہدہ اور فعل ایک دوسرے کے ساتھ باہمی تعلق رکھتے ہیں یا باہم دگر اثر انداز ہونا اُن کی خصوصیت ہے مشاہدہ فعل سے اسی حد تک اثر پذیر ہو سکتا ہے جتنا فعل مشاہدہ سے لیکن صرف اتنا ہی نہیں ہے۔ ان دونوں کے اوپر ایک دوسرا اثر بھی کام کرتا ہے سبب اور نتیجے کی کڑی اشیاء سے مشاہدہ کی طرف اور مشاہدہ سے فعل کی جانب نہیں جاتی۔ بلاشبہ خارجی اشیاء مشاہدہ پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اور ان کی وساطت سے فعل پر۔ لیکن خارجی اشیاء اور خارجی حالات کے علاوہ کچھ دوسرے اسباب کا عمل مشاہدہ اور فعل پر یکساں ہوتا ہے۔ ان اسباب کا تعلق ہماری داخلی ذات سے ہے اور ان کا محل وقوع مشاہدہ اور فعل کے مابین ہے اس طرح دونوں پر ان کا اثر پڑتا ہے۔ ان داخلی اثرات میں میلان طبع کی اہمیت سب سے زیادہ سمجھی جاتی ہے اس بات کے

سمجھنے سے پہلے کہ میلان طبع مشاہدہ اور فعل پر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے ہمیں میلانِ طبع کی ماہیت پر روشنی ڈالنی ہوگی۔ میلان یا رجحان جیسی اصطلاحیں جن کے لئے انگریزی میں Attitude کا لفظ مستعمل ہے اپنے استعمال کی عمومیت کی بنا پر ہمیں اس فریب میں مبتلا کر دیتی ہیں کہ ہم انہیں اچھی طرح جان پہچان چکے ہیں۔ ہم میلانات الفت، نفرت، احترام، اہانت، بدگمانی وغیرہ وغیرہ جیسے الفاظ کا استعمال روزمرہ کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم میلانِ طبع کو ایک خاص نوع کے احساسات و جذبات کے مترادف سمجھتے ہیں لیکن اگر ہم کسی شخص کے میلان طبع کا تجزیہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس کے اجزا صرف احساسات و جذبات تک محدود نہیں ہیں۔ ان میں بعض اور بھی نفسی عناصر کے نشان ملیں گے۔ مثلاً جب آپ اپنے اندر کسی شخص سے بدگمانی کا میلان پاتے ہیں تو آپ دیکھیں گے کہ اس شخص کے متعلق آپ کچھ خاص تصورات بھی رکھتے ہیں آپ اسے غیر معتبر سمجھتے ہیں، آپ باور کرتے ہیں کہ اس کے اندر آپ کے لئے اُنس و ہمدردی کا کوئی جذبہ نہیں ہے، موقع ملتے ہی وہ آپ کو مشکلات میں ڈال دے گا اور اسی سے ملتے جلتے دوسرے تصورات بھی۔ اگر آپ کبھی اس سے دوچار ہو جاتے ہیں تو اس سے کترانے کی تحریک آپ کے اندر پیدا ہونے لگتی ہے۔ اگر آپ کی بدگمانی کا پارہ بہت اونچا ہے تو اس کی اہانت اور اس کے ساتھ ناروا سلوک کرنے کے اقدام رونما ہونے لگتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ میلان طبع صرف ایک خاص نوع کے احساسات یا جذبات کا دوسرا نام نہیں ہے بلکہ اس کی تہہ میں چند تصورات و عقائد بھی ہوتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اقدام عمل کی تحریکیں۔

میلان طبع کے اجزائے ترکیبی کے عناصر یعنی احساسات و جذبات، تصورات و عقائد اقدام عمل و تحریک فعل کی حیثیت منفی اور مثبت دونوں ہی ہو سکتی ہے۔ پہلی حیثیت کو جانبدارانہ اور دوسری کو معاندانہ میلان کہا جائے گا۔ مثال کے طور پر اگر کسی سیاسی جماعت کے لئے ایک شخص کے اندر جانبدارانہ میلانات ہوں تو اس جماعت کی نسبت اس کے احساسات خوشگوار ہوں گے۔ وہ اس جماعت کی کامیابیوں پر مسرور اور نامرادیوں پر ملول ہوگا۔ اس کے تصور میں یہی جماعت ملک کے بنیادی مسائل کا مفید حل پیش کر سکتی ہے اور اس بات پر اسے کامل یقین بھی ہوگا۔ اس جماعت کے فروغ کی کوشش میں اپنا وقت اور دوسرے وسائل صرف کرنے کے لئے وہ ہمہ تن مستعد رہے گا۔ معاندانہ میلانات کی عکاسی ان محسوسات و جذبات، ان تصورات و عقائد، ان اقدام و محرکات کی صورت میں ہوگی جو اس پارٹی کے مفاد سے متصادم ہوں گے۔

میلان طبع اور موڈ میں کچھ ملتی جلتی کیفیتوں کے ہوتے ہوئے بھی ایک بڑا فرق ہے۔ موڈ کی ایک ہنگامی اور عارضی کیفیت ہے۔ میلان طبع دیرپا اور مستقل ہوتا ہے۔ اس بنا پر میلانات طبع شخصیت کا جزو بن جاتے ہیں۔ میلان طبع کی مختصر تعریف اس طرح کی جا سکتی ہے۔ "میلان طبع دوسرے افراد، اشیاء اور حالات کا ایک خاص رنگ سے مشاہدہ اور ان کی جانب ایک خاص طرز عمل کے لئے داخلی مستعدی کا نام ہے۔" اگر آپ کے اندر کسی خاص شے کی طرف میلان کا وجود ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ پہلے ہی سے اس شے کا مشاہدہ اور اس سے متعلقہ افعال کی ایک خاص نہج سے ظہور پذیری کے لئے آمادگی رکھتے ہیں۔ اس تشریح کے مطابق میلان طبع کی اثر اندازی مشاہدہ اور فعل دونوں ہی پر ہوتی ہے۔ میلان طبع کا فعل پر اثر شاید آسانی سے مان لیا جائے گا۔ اگر کوئی شخص کسی کے ساتھ دشمنی کا میلان رکھتا ہے تو بہ قرینۂ غالب وہ اسے نقصان، نہ کہ فائدہ پہنچانے کی کوشش میں سرگرم ہوگا۔ لیکن یہ بات آسانی سے باور نہیں کی جائے گی کہ میلان طبع مشاہدہ پر بھی اثر انداز ہے۔ ہم جو کچھ دیکھتے یا سنتے ہیں وہ بھی اس کے اثر سے بری نہیں ہوتا۔ وجہ یہ ہے کہ مشاہدہ کا جو تصور ہم نے گھڑ رکھا ہے اس کے آگے یہ بیان باطل ہو جاتا ہے۔ جیسا ہم اوپر دیکھ چکے ہیں، ہم یہی سمجھتے ہیں کہ مشاہدہ خارجی اثرات کے تحت ہوتا ہے۔ اس کو ہماری داخلی ذات سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ہمیں اس خیال کی تصحیح کرنی ہوگی۔

یہ بات کہ مشاہدہ کرنے والے کے داخلی اثرات اس کے مشاہدے پر اسی حد تک اثر انداز ہو سکتے ہیں جتنے خارجی، ایک جامع نفسیاتی کلیہ کی صورت میں پیش کی گئی ہے جو بادی النظر میں کچھ عجیب سا نظر آتا ہے لیکن دراصل ایک عظیم حقیقت کا ترجمان ہے۔ "اشیاء ہمیں ویسی نہیں معلوم ہوتیں جیسی وہ ہیں بلکہ جیسے ہم ہیں۔" یہ کلیہ متواتر تجربوں کی روشنی میں قبول کیا جا چکا ہے۔ ہماری حاجتیں ہمارے مطالبات ہماری خواہشیں، یہ سب وہ اثرات ہیں جو ہماری ذات کے اندر کارفرما رہتے ہیں۔ مشاہدے پر ان کی اثر اندازی کی مثالیں عام ہیں۔ ایک بھوکا آدمی اشیاء خوردنی کا صرف تصور ہی نہیں کرتا بلکہ کبھی کبھی ان کے غائبانے میں بھی اسے ان کا مشاہدہ ہونے لگتا ہے۔ ایک تجربہ میں دو گروہوں کے افراد کو کچھ مبہم نقوش ایک لمحے کے لئے دکھائے گئے۔ ایک گروہ کے افراد کو بھوکا رکھا گیا تھا اور دوسرے گروہ کے افراد کو بھرپیٹ کھانا کھلا دیا گیا تھا۔ ان سے کہا گیا کہ جو کچھ انہوں نے ان نقوش میں دیکھا اس کی وضاحت کریں۔ بھوکے گروہ کے بیان میں اشیاء خوردنی اور ان سے متعلقہ اشیاء کے نام، دوسرے گروہ کے بیان سے کہیں زیادہ تھے۔ اس طرح کے ان گنت تجربوں سے اس کی مستقل تصدیق ہو گئی ہے کہ مشاہدہ حاجتوں، خواہشوں اور مقاصد کی اثر اندازی سے بے نیاز نہیں رہتا۔

مشاہدے پر موڈ کی اثر اندازی کس حد تک ہوتی ہے اس سلسلے میں ایک دلچسپ تجربے کی رپورٹ پیش کرتا ہوں۔ حسب خواہ موڈ پیدا کرنے کے لئے معمول پر پہلے ہپناٹزم کا عمل کیا گیا۔ اس کے بعد اس پر ایک خاص موڈ طاری کیا گیا۔ تجربے میں تین مختلف موڈ کا استعمال کیا گیا تھا۔ (۱) سرور و نشاط (۲) تنقید و نکتہ چینی (۳)

خوف و اندیشہ ——— آپ جانتے ہوں گے کہ کسی شخص پر ہپناٹزم کا عمل کر کے آپ اپنی خواہش کے مطابق اس سے ہر بات تسلیم کرا سکتے ہیں اور اس پر ہر نوع کی کیفیت طاری کر سکتے ہیں۔ آپ اگر کہیں کہ "تمہارے بائیں ہاتھ میں سخت درد ہو رہا ہے اور تم اسے ہلا تک نہیں سکتے" تو وہ ایسا سنتے ہی درد کے احساس سے کراہنے لگے گا اور باوجود کوشش کے ہاتھ اٹھانے میں ناکام رہے گا۔ آپ اگر کہہ دیں کہ اس کی مرحومہ بیوی کی یاد اسے غمگین و افسردہ بنا رہی ہے تو وہ غم کی اور افسردگی کے سارے اثرات کا بے ساختہ اظہار کرنے لگے گا۔ آپ نے سنا ہو گا کہ بعض ماہران مریض پر ہپناٹزم کا عمل کر کے اور اس حالت میں اسے یقین دلا کر کہ آپریشن کی کوئی تکلیف نہیں رہی ہے اس پر بڑا سے بڑا عمل جراحی کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اسی طرح اس تجربے میں بھی جس کا میں ذکر کر رہا تھا مختلف افراد پر مختلف موڈ طاری کر دیئے گئے۔ اس کے بعد ہر ایک کو کچھ ایسی تصویریں دکھائی گئیں جن میں چند افراد کسی کام میں مشغول نظر آ رہے تھے پھر ہر ایک سے کہا گیا کہ وہ جو کچھ تصویر میں دیکھ رہا تھا بیان کرے۔ موڈ کی مناسبت سے بیان میں اتنا زیادہ فرق تھا کہ ان کی بنا پر تصویروں کو ایک دوسرے سے تمیز کرنا ایک دشوار عمل بن گیا۔ وہی تصویر جو نشاط کی کیفیت میں ایک خوشگوار نظارہ پیش کر رہی تھی، نکتہ چینی کے موڈ میں اخلاق سوز اور ناگوار منظر پیش کرتی ہوئی دکھائی دی۔ اسی طرح خوف و اندیشہ کے موڈ میں وہی تصویر پر خطر اور سنسنی خیز نظر آئی۔ موڈ ایک عارضی کیفیت کا نام ہے۔ یہ کسی شخص کی خصوصیت نہیں بن سکتا لیکن جب مشاہدہ پر میلان طبع کی اثر اندازی کے سلسلے میں اسی قسم کے تجربے کئے گئے تو ان کے نتیجے بھی ایسے ہی پائے گئے۔ ایک تجربے میں کچھ افراد کی جانچ کر کے اس کا پتہ لگایا گیا کہ مزدوروں کی نسبت ان کا میلانِ طبع کیا تھا۔ اس بنیاد پر ان میں سے دو گروہ چن لئے گئے۔ (۱) مزدوروں کے شدید طرفدار (۲) مزدوروں کے شدید مخالف۔ اس کے بعد دونوں گروہوں کے ہر ایک فرد کو ایسی تصویریں دکھائی گئیں جو غریبوں کے محلے میں ایک گھر کے اندرونی حصے کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ ہر ایک سے کہا گیا کہ وہ جو کچھ تصویریں دیکھ رہا تھا اس کی وضاحت کرتے ہوئے اپنی رائے پیش کرے۔ مزدوروں کے جانبدار گروہ کے لئے تصویریں مزدوروں کی زندگی کی دشواریاں، ان کی بدحالی، ان کے مسائل کے ساتھ انتظامیہ کی عدم توجہی وغیرہ وغیرہ کے مناظر پیش کر رہی تھیں۔ مزدوروں کے مخالف گروہ کو انہیں تصویروں میں مزدور طبقہ کی گندی عادتیں، غیر صحتمندانہ رہائش، ناگوار طریقوں کے مرقعے نظر آ رہے تھے۔

مشاہدے پر میلانِ طبع کا اثر ہم صرف تجربہ گاہوں میں ہی نہیں دیکھ پاتے۔ اگر ہم اپنے روزمرہ افعال پر یک گونہ علیحدہ ہو کر نظر ڈالیں تو وہاں بھی ان اثرات کے نشان ہمیں دکھائی دیں گے۔ یہ ایک عام بات ہے کہ اپنے خاندان یا اپنی ذات والوں کی خوبیوں اور خامیوں پر ہماری نگاہ اس طرح نہیں پڑتی جیسے دوسرے خاندان یا دوسری ذات والوں کی اچھائیوں اور برائیوں پر، بہ گمان غالب ہماری نگاہ اپنی ٹولی کے افراد کی خوبیوں پر زیادہ اور ان کی خامیوں پر کم پڑتی ہے۔ اس رجحان کو انگریزی میں Ethnocenterism کہتے ہیں جس کا ترجمہ ہم "نسلی ارتکاز" کر سکتے ہیں۔ سماجی تعصب اسی رجحان کی پیداوار ہے۔ غیر جماعتوں کے افراد کا مشاہدہ ہم ان کی حقیقی خصوصیتوں کی روشنی میں کرنے کے عادی نہیں ہیں بلکہ ہم ان کا مشاہدہ اپنے ان داخلی میلانات کے تحت کرتے ہیں جو ہم نے ان کے متعلق اخذ کر لئے ہیں۔ اکثر و بیشتر ہم نے افراد و اشیا کی جانب ایک خصوصی زاویئے سے نگاہ کرنے کی عادت بنا رکھی ہے جماعتی حیثیت سے ہم فرد کی انفرادی خصوصیتوں کو نظرانداز کر دینے کے عادی ہوتے ہیں اور ان کی جگہ ان اوصاف کو رکھ دیتے ہیں جنہیں ہم اس جماعت کی خصوصیت سمجھتے ہیں جس کا فرد وہ ہے۔ ان جماعتی خصوصیتوں کو جن کی روشنی میں ہم غیر جماعتوں کے افراد کا مشاہدہ یا ان کے اوصاف کی پرکھ کرتے ہیں۔ اسٹیریو ٹائپ Stereo-type کہا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسٹیریو ٹائپ وہ جماعتی خصوصیتیں ہیں جو ہم کسی جماعت کے ہر فرد پر بلا تامل لاگو کر دیتے ہیں۔ عام طور پر کسی ایک جماعت کے افراد دوسری جماعت کے افراد کی توصیف کرنے میں جن خصوصیتوں کا استعمال کرتے ہیں ان میں یکسانیت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ہم میں سے ہر ایک بحیثیت قوم کے انگریز کو زمانہ ساز، قوم پرست، قدامت پسند، کم آمیز، باوقار وغیرہ وغیرہ تصور کرتا ہے۔ اس کے برخلاف امریکن کے متعلق ہمارے ذہن میں زود آمیز جلدت پسند، مادیت پسند، انفرادیت کا علمبردار وغیرہ وغیرہ خصائل ابھر آتے ہیں۔

میلان طبع مشاہدہ اور فعل پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مشاہدہ اور فعل کی اثر اندازی میلانِ طبع پر ہوتی ہے یا نہیں؛ میلانِ طبع کوئی جبلّی خصوصیت نہیں ہے۔ ہم اپنی نشوونما کے ذریعہ اس کا اکتساب کرتے ہیں۔ میلان طبع کا اشیا اور افراد سے قریب ترین رشتہ ہوتا ہے۔ پہلے پہل بچے کو اشیا اور افراد کا تجربہ مشاہدہ اور فعل کے ذریعہ ہی ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے اندر اشیا اور افراد کی نسبت جو میلانات بنتے ہیں ان میں مشاہدہ اور فعل کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ بچے کی چند گنی چنی بنیادی ضرورتیں ہوتی ہیں۔ بھوک، پیاس، بول و براز وغیرہ۔ بچے کی صحت بلکہ زندگی کا دارومدار ان ضرورتوں کی تسکین پر ہے۔ اشیا اور دوسرے افراد ان ضرورتوں کی فراہمی کے لئے آلۂ کار بنتے ہیں۔ اس سلسلے میں بچے کے اندر ان اشیا اور افراد سے کچھ توقعات وابستہ ہو جاتی ہیں۔ اس طرح ان اشیا اور افراد کا جانبدارانہ مشاہدہ کرنے کی آمادگی اور ان کی نسبت مثبتی اقدام کی تیاری بچے کے اندر پیدا ہو جاتی ہے۔ جو اشیا اور جو افراد بچے کی حاجتوں کی تسکین میں رخنہ انداز ہوتے ہیں ان کی نسبت معاندانہ میلانات کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔ ہر بچہ ایک خاص

سماج میں پیدا ہوتا، پلتا اور رہتا ہے۔ اپنی نشو و نما کے سلسلے میں وہ ان سماجی قدروں اور فکر و عمل کے معیار کو اپنا لیتا ہے جو اس جماعت کے لئے مخصوص ہیں، جس کا وہ ممبر ہونے کی حیثیت رکھتا ہے۔ جیسے جیسے اس کی عمر بڑھتی جاتی ہے اور اس میں پختگی آتی جاتی ہے، وہ اپنے خاندان کی مختصر اکائی کے علاوہ بڑی بڑی سماجی اکائیوں کا رکن بنتا جاتا ہے۔ جیسے ہمسائے، اسکول، کالج، ہم پیشہ اشخاص، تفریحی اور کلچرل ادارے، سماجی اور سیاسی گروہ، قومی بلکہ بین الاقوامی تنظیمیں۔ ان جماعتوں کی وسعت کے ساتھ ساتھ جن کے رکن ہونے کا اُسے شرف ہوتا ہے وہ علم و عمل کے ایک وسیع تر دائرے سے بھی آشنا ہونے لگتا ہے جس کی وجہ سے اُس کے میلانات طبع میں وسعت اور گہرائی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ وہ نت نئے میلانات کا اکتساب کرتا جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کے اولین میلانات میں تغیر بھی رونما ہوتا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ مشاہدے اور فعل کے نتیجے میں ہی ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا بیان سے یہ ظاہر ہوگا کہ سبب و نتیجے کے باہمی بازگشت کا اطلاق صرف مشاہدہ اور فعل تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ یہ ایک طرف مشاہدہ اور فعل اور دوسری طرف میلان طبع پر بھی منطبق ہوتا ہے۔ میلانات طبع کی ساخت مشاہدہ اور فعل کی کارفرمائی کے تابع ہے لیکن جب ان کی بنیاد پڑ چکی ہوتی ہے تو یہی میلانات طبع مشاہدہ اور فعل کے ڈھنگ پر اثر انداز ہونے لگتے ہیں۔

میلان طبع، مشاہدہ اور فعل کے ربط باہمی کو ہم اکثر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ایک فرد کو دوسرے فرد سے یا ایک جماعت کو دوسری جماعت سے جو نت نئی غلط فہمیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں ان کی تہہ میں اسی فروگذاشت کی کارفرمائی ہے۔ نظریات کے تصادم کی اصلی بنا یہی ہے کسی شخص کے مشاہدے اور فعل کو پرکھنے کے وقت ہم اس کے مشاہدے، فعل اور میلانات طبع کے پس منظر پر نظر نہیں ڈالتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا مشاہدہ اور فعل ہمارے لئے بے معنی بن جاتے ہیں۔ اس شخص پر ہمیں فریب کاری کا شبہ ہوتا ہے۔ اور ہم اس پر حقیقت اور انصاف سے روگردانی کا الزام عائد کرنے لگتے ہیں۔ ہم اس کے فعل اور مشاہدہ کی جانچ اپنے مشاہدہ، فعل اور میلانات طبع کے پس منظر میں کرتے ہیں۔ اپنا داخلی دائرۂ منسوبیت (Frame of Reference) ان پر نافذ کر کے ہم ان افعال و میلانات کی تحصیل و تنقید کرنے لگتے ہیں۔ دائرہ منسوبیت کسی ایک فرد یا جماعت کے تصورات، خیالات، معتقدات، احساسات و جذبات، مشاہدات، عادات، تحریکات عمل اور میلانات طبع کا ملا جلا داخلی پس منظر ہے۔ کسی شخص کے انفرادی فعل کا صحیح ادراک ہمیں اسی وقت ہو سکتا ہے جب ہم اس شخص کے داخلی دائرۂ منسوبیت میں اس فعل کو رکھ کر اس پر نگاہ کریں۔ یعنی اس کے داخلی پس منظر کو متشکل کر کے اس فعل کی نوعیت پر غور کریں۔ کسی دوسرے شخص یا دوسری جماعت کے ادراک کے لئے لازم ہے کہ اس شخص یا جماعت کے داخلی دائرۂ منسوبیت کا خاکہ ہمارے سامنے موجود ہو۔ ہمیں چاہیئے کہ دوسرے شخص کی پوزیشن میں اپنے آپ کو رکھ کر ہی ہم اس کے افعال و کردار کی جانچ پڑتال کریں۔ اس کے ماضی اور حال کی تصویر اپنے سامنے کھڑی کر کے ہم اس کے قول و فعل پر تبصرہ کریں۔ دوسرے لفظوں میں پہلے ہم اس کے داخلی دائرۂ منسوبیت کا ہیولا تیار کر لیں۔ جب تک ہر فرد اپنے اندر اس بات کی صلاحیت نہ پیدا کر لے، ایک دوسرے کا صحیح ادراک اور ایک دوسرے سے متعلق صحیح رائے قائم کرنے میں نظریات کا تصادم حائل ہوکر رہے گا۔ اس طرح یہ ٹکراؤ صرف ایک فرد اور دوسرے فرد، ایک سماج اور دوسرے سماج، ایک قوم اور دوسری قوم کے اندر نت نئے مسائل ہی نہیں پیدا کرتا رہے گا بلکہ ان مسائل کے حل کی ساری کوششوں کو ناکام بنا دے گا۔

## غزل

اختر بستوی

دہر کے دشت میں اک مسافر بنی روح روزِ ازل سے بھٹکتی رہی
خارِ تاریخ سینے میں چبھتا رہا، وقت کی پھانس دل میں کھٹکتی رہی

بحرِ تشکیک کی وسعتوں میں کہیں ہاتھ آیا نہ عرفاں کا ساحل کبھی
تلملاتی رہی عقل کی لہر بھی، موجِ ادراک بھی سر پٹکتی رہی

سونا سونا تخیل کا گلزار تھا، گلشنِ فکر پر مُردنی تھی مگر
ایک انجان خواہش کی ننھی کلی ذہن کی کیاریوں میں چٹکتی رہی

لے کے دیوانگی کا سہارا کبھی کر سکا میں نہ بیتا بیاں اپنی کم
کچے دھاگے میں شمشیرِ ہوش و خرد سر پہ ہر وقت میرے لٹکتی رہی

علم کے پھول اختر نے جتنے چنے، سب وہ جی جان سے نذر کرتا رہا
فن کی دیوی مگر ایسی ناراض تھی اپنا دامن ہمیشہ جھٹکتی رہی

## او لقمنہ کی پہلی نظم

صلاح الدین پرویز

وہ کسی نم دیدہ دل پر
اپنے جوہوں کی سیاہی کو
لگانے کی بڑی کوشش میں
پاگل ہوگیا
ریڈیو کے کالے کمرے سے
کسی بچے نے اپنے باپ سے رو کر کہا
" ہوک جو جاگی ہے من میں
اس کو چادر پر سجا کر
تم کسی ویراں محور پہ
شرارت کا تبسم
اپنی دو موٹی بڑی آنکھوں پر رکھ لو"
پتیاں رکھ کر گلاسوں میں
رعونت اپنی بغلوں میں چھپا کر
وہ پرانی خوابگاہِ عیش و عشرت میں
تھکے آنچل پہ مہندی کو رچا کر
ہنس پڑی
اور پھر ساری ہوائیں
اس کے ماتھے سے نکل کر
پالنے کے اجلے بستر پہ
سمٹ کر سو گئیں
اور میں بھی سوچ کر
رکھ کر پرندوں کے سنہرے خوبصورت پر
کسی مندر کے آنگن میں
ہمک کر سو گیا
میرے بچے نے مرے سارے خیالوں اور اندیشوں پر اپنا
چاند جیسا پاک چہرہ رکھ دیا

## زورِ نمو

مشتاق علی شاہد

بوڑھا پیپل
حیراں حیراں
دیکھ رہا ہے . . . .
اس کے تن پر ــــ سوکھی چھال
جگہ جگہ سے
ترخ گئی ہے ــــ
وہ بیچارہ
سوچ رہا ہے :
" شاید کوئی روگ لگا ہے : "
اور حقیقت ــــ
مجھ سے پوچھو :
نئی، توانا، تازہ چھال
موسمِ گل کے آتے ہی
بے چین ہوئی ہے ــــ
زورِ نمو میں
سوکھی چھال کے ٹکڑے کر کے
ــــ اُبھر رہی ہے :

## تیج

جوہر بھارتی

آج کیا بات ہے
کس لئے
سامنے والی کھڑکی
بڑی دیر سے بند ہے
چوڑیوں کی کھنک ــــ
گھنگھروؤں کی جھنک ــــ
روشنی
قہقہے
شور و غل
آج کچھ بھی نہیں
موت کی بے کراں خامشی کے سوا

اوہ ! یاد آگیا
آج سے کچھ برس پہلے
اس لڑکی کا کوئی آشنا
تیج کے دن
اسے چھوڑ کر چل دیا تھا
نہ جانے کدھر

آج تہوار ہے تیج کا
اس لئے
سامنے والی کھڑکی
بڑی دیر سے بند ہے
چوڑیوں کی کھنک
گھنگھروؤں کی جھنک
روشنی
قہقہے
آج کچھ بھی نہیں
موت کی بے کراں خامشی کے سوا

# قابلِ مطالعہ

# کتابیں

| | |
|---|---|
| ہمارا جھنڈا | ایک روپیہ |
| بھارت آج اور کل | ۷۵ پیسے |
| دو شہروں کی کہانی (چارلس ڈکنس) | ۵ روپے |
| جوالا مکھی (ناول، اننت گوپال شیوڈے) | ۲ روپے ۵۰ پیسے |
| ہندوستان کا دستور | ۲ روپے |
| آئینہ غالب | ۵ روپے |
| آج کل کی کہانیاں | ۳ روپے ۵۰ پیسے |
| وطن کے نغمے | ایک روپیہ ۷۵ پیسے |
| امر جوت | ۲ روپے |
| سائینس کے چند پہلو | ایک روپیہ ۲۵ پیسے |
| ہمارے نہرو | ۳ روپے ۵۰ پیسے |
| گنجینہ غالب | ۴ روپے ۵۰ پیسے |
| ہندوستان کی مسجدیں | ۲ روپے ۵۰ پیسے |
| مہاتما گاندھی کی کہانی (رنگین تصویروں میں) | ۲ روپے ۵۰ پیسے |

| | |
|---|---|
| اچھا شہری (بچوں کے لئے) | ایک روپیہ |
| نہرو رادھا کرشنن کی نظر میں | ایک روپیہ |
| ابو الکلام آزاد | دو روپے |
| ہندوستان کی تاریخ (بچوں کے لئے) | ۳ روپے ۷۵ پیسے |
| ہندوستان کی نامور ہستیاں (حصہ اول) | ۲ روپے ۲۵ پیسے |
| ہندوستان کی نامور ہستیاں (حصہ دوم) | ۲ روپے ۵۰ پیسے |
| ہندوستان کی نامور ہستیاں (حصہ سوئم) | ۲ روپے ۵۰ پیسے |
| سوامی دویکانند (بچوں کے لئے) | ایک روپیہ ۵۰ پیسے |
| جواہر لال نہرو (خراجِ عقیدت) | ۲ روپے ۵۰ پیسے |
| ہندوستان میں تعلیم کی از سرِ نو تنظیم (ڈاکٹر ذاکر حسین) | ایک روپیہ ۲۵ پیسے |
| ہندوستانی ڈرامہ (صفدر آہ) | ۳ روپے ۷۵ پیسے |
| پنڈت نہرو سے بات چیت (ٹیبر منڈی) | ۲ روپے |
| ندیا کنارے (علی عباس حسینی) | ایک روپیہ |
| کلکی یا تہذیب کا مستقبل (ڈاکٹر رادھا کرشنن) | ۷۵ پیسے |

**آج کل کے خریداروں کو ۲۰ فی صد رعایت ہوگی**
**محصول ڈاک ہمارے ذمہ ہو گا**

**اُردو کے علاوہ انگریزی، ہندی اور تمام علاقائی زبانوں میں کتابیں شائع ہوتی ہیں**

فہرستِ کتب مُفت طلب کیجئے

**بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی**

# ایک ڈوبتا جزیرہ



رفعت سروش

یونہی بے ترتیب سے گھونگھریالے بال — سوتی ساڑی — سادہ چہرہ، کھلتا ہوا گندمی رنگ، باتیں کرنے کا بے جھجک لیکن شریفانہ انداز —

جب میں نے اس عورت کو پہلی بار دیکھا تو یہ گمان بھی نہ ہوا کہ وہ ایک کروڑپتی باپ کی بیٹی اور ایک لکھ پتی شوہر کی بیوی ہوگی۔ شہر کی صنعتی نمائش میں ایک کوی سمیلن تھا جس میں ہندی اُردو، گجراتی، مراٹھی — چاروں زبانوں کے شاعر ایک اسٹیج پر جمع تھے۔ اس کھچڑی کوی سمیلن میں کسی ایک زبان کے شعر بھی سننے کا لطف نہ آیا کیونکہ سب شاعروں کی یہی کوشش تھی کہ ایسے اشعار اور نظمیں سنائی جائیں جو سب کی سمجھ میں آسکیں ظاہر ہے یہ کام ایک کوی سمیلن میں نہیں ہو سکتا تھا اور نہ کوئی ایسی جادو کی چھڑی تھی جو سب کو سخن فہمی کی دولت بانٹ دے۔ میں نے بھی بے دلی سے اپنے روکھے پھیکے شعر سنا کر بلا ٹال دی اور اپنی جگہ پر آبیٹھا۔

ایک آٹوگراف بک گھومتی ہوئی مجھ تک آئی۔ میں نے اپنا نام لکھ کر آگے بڑھا دی۔ ایک آواز اسٹیج کے اس کونے سے آئی جہاں دو تین شاعرات سر جوڑے بیٹھی تھیں —

— اپنا کوئی شعر بھی لکھ دیجئے — مگر ہندی میں" — میں نے پلٹ کر دیکھا — آواز دینے والے کے چہرے پر تحکم بھی تھا اور التجا بھی —

— میں اس التجا کو ٹھکرا نہ سکا — ہندی میں ایک شعر لکھ دیا۔ اور ساتھ ہی یہ عبارت بھی " اُردو شاعری کا صحیح لطف اٹھانے کے لئے اُردو رسم الخط جاننا ضروری ہے — آٹوگراف بک آگے بڑھ گئی اور جانے کتنے لوگوں نے کس کس زبان میں اس پر کیا کچھ لکھا — کوی سمیلن ختم ہو گیا۔ لوگ اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ دہلی میں ایک آل انڈیا مشاعرہ منعقد ہوا۔ میں بھی اس میں شرکت کے لئے بمبئی سے دہلی آیا۔ لال قلعہ کے دیوانِ عام میں مشاعرہ تھا۔ اسٹیج پر اُردو کے سبھی مشہور شعراء موجود تھے۔ کچھ لوگوں سے میری ملاقات نہیں تھی۔ کچھ بہت دن بعد ملے تھے۔ میں نئے پرانے احباب سے ملنے میں منہمک تھا۔

ایک چھوٹا سا پرچہ کئی ہاتھوں سے ہوتا ہوا مجھ تک پہونچا — "اگر ہو سکے تو کل صبح ۱۰ بجے کیننگ روڈ تشریف لائیے — شانتا — " میں نے پرچہ پڑھ کر متجسس نظروں سے ادھر اُدھر دیکھا کوئی نہ تھا — پھر حاضرین پر نظر ڈالی — تو سامنے صوفوں پر دوسری قطار میں وہی بکھرے ہوئے گھونگھریالے بالوں والی عورت نظر آئی — نظر ملی اور اس کے ہونٹوں پر ایک ایسا تبسم کھل گیا جسے محبت کے سوا اور سب کچھ کہا جا سکتا تھا۔

مشاعرہ ختم ہو گیا۔ رات گزر گئی۔ اگلی صبح نئی مصروفیتیں لے کر آئی اور میں کیننگ روڈ نہ جا سکا حالانکہ رات کو ارادہ کر کے سویا تھا۔ ویسے بلی ماران اور کیننگ روڈ میں فاصلہ بھی بہت تھا۔

ادھر اُدھر گھوم کر میں بمبئی واپس چلا گیا اور پھر وہی دفتر کے معمولات — اور بہت سے نئے لوگوں سے ملنا اور بہت سے پرانے لوگوں کو بھول جانا — یادوں کی محفل سجانے کا نہ مجھے اس زمانے میں سلیقہ تھا نہ فرصت۔

— "ہلو" — ایک سادہ اور بے تکلف آواز نے مجھے چونکا دیا — "جی میں پہچان گیا۔" — اور وہی گھنگریالے بالوں والی عورت میری نظروں میں پھر گئی —

— مجھے افسوس ہے میں دہلی میں کیننگ روڈ حاضر نہیں ہو سکا۔" — "بہت اچھا — مجھے یہ سزا منظور ہے اور آج شام کو ۵ بجے میں منتظر رہوں گا۔" —

اور شام کو ٹھیک ۵ بجے ایک لمبی سی سیاہ موٹر میرے دفتر کے نیچے میرے انتظار میں کھڑی تھی۔ میں بے جھجک گاڑی میں بیٹھ گیا۔ کوئنس روڈ سے موٹر نے فراٹا بھرا اور پلک جھپکتے میرین ڈرائیو — پہونچ گئی — اب تک میں میرین ڈرائیو پر سمندر کے کنارے والی دیوار پر بیٹھا تھا۔ آج چار منزلہ بلڈنگ سے سمندر کے اتار چڑھاؤ کو دیکھوں گا۔ یہ سوچتا ہوا میں درویش مینشن کی لفٹ میں داخل ہوا۔ بٹن دبایا اور آن کی آن میں چوتھی منزل پر پہونچ گیا۔ کال بیل بجائی دروازہ کھلا اور اُسی مسکراہٹ سے بے تکلفی سے میرا استقبال کیا جس میں محبت کے سوا اور سب کچھ تھا۔

اس بڑے ڈرائنگ روم کے بڑے صوفہ پر بیٹھ کر مجھے اجنبیت کا بالکل ہی احساس نہ ہوا کیونکہ اس عورت کی گفتگو میں کوئی رسمی بات ہی نہ تھی۔ نہ یہ کہ آپ کے اشعار پسند آئے نہ یہ کہ آپ کا نام بہت دنوں سے سنا تھا اور ملنے کا اشتیاق تھا — نہ یہ کہ آپ کپھ روڈ کیوں تشریف نہیں لائے — بس بغیر کسی تمہید کے پہلے ایک گلاس پانی آگیا۔ پھر چائے آگئی — اور پکوڑیاں — کئی طرح کی — کئی ذائقوں کی پکوڑیاں — مجھے ایسے بھی تکلف کی عادت نہیں، اور وہاں تو تکلف کا کوئی موقع ہی نہ تھا۔ میزبان نے اتنا موقع ہی نہ دیا۔ حد یہ ہے کہ میں پکوڑیوں کی تعریف کرنا بھی بھول گیا۔ ادھر اُدھر کے بے ربط جملوں سے اچکتی ہوئی بات اُردو رسم الخط تک آگئی — اور میں نے کہا کہ اُردو سیکھنا تو بہت آسان ہے۔ اتنا آسان کہ میں ایک ہفتہ میں لکھنا پڑھنا سکھا سکتا ہوں۔

"— تو آپ مجھے پہلی کتاب لا دیجئے۔"

"نہیں اگر آپ پڑھنا چاہتی ہیں تو میں آپ کو بغیر کتاب کے پڑھا دوں گا۔ کتابی طریقے میں بڑا جھنجھٹ ہے۔ وہ کتابیں اور قاعدے تو چھوٹے بچوں کے لئے لکھے جاتے ہیں۔ اگر واقعی آپ سنجیدگی سے کہہ رہی ہیں تو میں آپ کے لیے ایک نیا قاعدہ بنا کر دوں گا۔"

وہ بے حد سنجیدہ تھی اور ذہین بھی۔ میں نے اسے ہندی کی ماتراؤں کے ذریعہ اُردو حروف کی حرکتیں سمجھائیں اور اس نے بہت تیزی سے اُردو لکھنا اور پڑھنا سیکھ لیا روز شام کو دفتر کے بعد کبھی میں خود پہنچ جاتا کبھی بلا لیا جاتا۔ اور اُردو کا شغل جاری رہتا بیچ میں اِدھر اُدھر کی گپ شپ — لطائف و ظرائف — کبھی کبھار ہندی اُردو ادبیات پر گفتگو، کبھی کبھی سمندر کے کنارے ڈرائیو — مگر محبت اور شاعری — دونوں کا وجود ہم دونوں کے درمیان نہ تھا — ہاں اس کے گھر کے اور افراد بھی آہستہ آہستہ متعارف ہو گئے۔ مثلاً اس کا شوہر، اس کی بہن، مثلاً اس کی جٹھانی — "اُردو کلاس" اب ڈرائنگ روم سے اٹھ کر بیڈ روم میں چلی گئی تھی۔

ایک روز شانتا کی جٹھانی رادھیکا نے، جو شانتا کے مقابلہ میں نہایت مسکین مرنجا مرنج اور کم سخن نظر آتی تھی — مجھ سے بڑے ادب و احترام کے ساتھ پوچھا "آپ مجھے بھی اُردو پڑھا دیا کریں گے؟" — میں نے بہت روکھا جواب دیا — یہ بات آپ شانتا سے پوچھئے۔" وہ خاموش ہوگئی۔ [illegible] بہت [illegible] سنکر اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور بھی [illegible] ہو گئیں۔

میں کچھ روز کے لیے بمبئی سے باہر چلا گیا۔ [illegible] جب [illegible] تو معلوم ہوا کہ شانتا کچھ دنوں کے لئے بمبئی سے باہر گئی ہے — [illegible] تھا کہ رادھیکا نے آواز دی وہی ادب و احترام میں بھیگا ہوا لہجہ — [illegible] میں رک گیا جانے کا انتظار تھا اور ابھی جانے پیچھے کا موقع تھا —

ہم لوگ بالکنی میں بیٹھ گئے سامنے سمندر موجیں مار رہا تھا — چائے آئی — زیادہ سلیقہ سے، زیادہ پر تکلف — اور مجھے محسوس ہوا کہ آج میں کسی نئی جگہ اور کسی نئے ماحول میں آیا ہوں — رادھیکا نے دھیمے دھیمے لہجہ میں کئی سوالات پوچھے جن کا تعلق میری ذاتی زندگی سے تھا — میں عام طور پر اس طرح کے سوالات غیر ضروری سمجھتا ہوں اس لئے میں نے نہایت مختصر اور روکھے پھیکے جواب دے کر رخصت کا سوچا — اس نے چشمہ صاف کرتے ہوئے پوچھا — "شانتا کو آپ کس طرح پڑھاتے ہیں؟" — اس سوال کے پس پردہ مجھے اپنی خودداری پر چوٹ ہوتی ہوئی محسوس ہوئی اور میں نے [illegible] جواب دیا — شانتا میری دوست ہے، میں اُسے ٹیوشن نہیں پڑھاتا اور نہ پڑھانا میرا پیشہ ہے۔ میں اپنے دوستوں سے برابری سے ملتا ہوں اور اس رشتہ کو میں کسی قیمت پر قربان نہیں کر سکتا —"

وہ لاجواب نہیں ہوئی — بلکہ مسکرائی — " میں نے یہ سب تو نہیں پوچھا تھا" اس کے اس جملہ نے مجھ پر کچھ ایسا وار کیا کہ میں گھبرا کر جانے اٹھنے لگا — پھر اس نے گفتگو کا رخ بدلا — "آپ اپنی کوئی پسندیدہ غزل میری غزلوں کی کاپی پر لکھ دیجئے"۔ — ظاہر ہے اس میں انکار کی گنجائش نہ تھی — اس نے ایک کاپی لا کر مجھے دی اور میں اپنی ایک غزل ہندی میں لکھنے لگا — میں نے شاید کوئی لفظ غلط لکھا — وہ ایک دم ہنسی۔ — "بس آپ کو اتنی ہی ہندی آتی ہے" اس میں یہ غلطی ہے، اس میں یہ غلطی ہے" — اور میں کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا —

اس نے اُردو میں دو چار غلط سلط لفظ لکھے اور کہنے لگی — دیکھئے مجھے بھی تھوڑی بہت اُردو آتی ہے — اب غلطی نکالنے کی باری میری تھی میں نے اپنی علمیت بھاڑنی شروع کر دی۔ اور اس نے زانوئے ادب تہ کر لیا — میں بے ارادہ ہی اُسے اُردو پڑھانے لگا۔

میں روز شام کو درویش مینشن پہونچ جاتا — اور بات شام کی چائے سے بڑھ کر رات کے کھانے تک جا پہونچی — آہستہ آہستہ اس نے مجھے اپنا عادی بنا لیا۔ اُردو کے سبق چلتے رہے۔ اس کی کاپی پر میری بہت سی غزلیں اور نظمیں منتقل ہو گئیں اور اُس نے بھی مجھے ہندی کے کچھ گُر سکھا دیئے۔

اُسے خود موٹر چلانی نہیں آتی تھی اس لیے کچھ دن تو سیر و تفریح سے گریز کیا، پھر ایک دن شام کو حکم ملا کہ آج فلاں پکچر دیکھنے چلنا ہے۔ پکچر دیکھی گئی اور ڈرائیور کو بھی ایک نچلے درجہ کا ٹکٹ دلا دیا گیا۔ اب دوسرے تیسرے دن ایسے پروگرام بننے لگے — کھانا اونچے درجے کے ہوٹلوں میں کھایا جانے لگا۔ غیر محسوس طور پر میرا معیار زندگی بھی اونچا ہونے لگا — میرے کوٹ کی جیبوں میں نوٹ ہی نوٹ کھنکنے لگے — اور میں جانتے ہوئے بھی انجان ہو گیا کہ یہ کس دستِ غیب کی کرامات ہے۔ فضول خرچی عادت میں داخل ہونے لگی — اور کیوں نہ ہوتی جب روپیہ سوچنے سے پہلے جیب میں آ جاتا تھا۔

پھر ایک دن بیچ چوراہے پر رادھیکا کی "اُردو نوازی" کا بھانڈا پھوٹ گیا ڈرائیور گھر کا بھیدی ثابت ہوا اور اس نے وہ سب کچھ ہم دونوں سے منسوب کر دیا جو عام طور پر ایسے افسانوں میں ہوتا ہے (حالانکہ ناگوار گزرنے والی بات کا افسانہ میں ذکر ہی نہ تھا)

نتیجہ اس کا یہ ہونا چاہئے تھا کہ درویش مینشن کے دروازے ہم پر بند ہو جاتے مگر ہوا اس کے برعکس — درویش مینشن کی بلندی جھک کر اور نیچے آ گئی — اور ایک ڈرائیور کی جگہ ان گنت ٹیکسی ڈرائیوروں نے لے لی۔

———— میں خود ایک کٹھ پتلی بن گیا اور وقتی طور پر یہ غرور ہو گیا کہ یہ ہے ہماری خودداری کی فتح کہ آسمان جھک کر زمین پر آیا ہے — مگر آسمان زمین کی جڑیں کھوکھلی کر رہا تھا — افسانے پھیلتے رہے — ٹیکسیاں سڑکوں پر دوڑتی رہیں

پھر وقت نے کروٹ لی — شانتا بمبئی واپس آ ئی اور جب اس نے شام کو مجھے گھر آنے کے لیے فون کیا تو میں نے بہانہ کر دیا — مجھے تو دوسری چاٹ لگ چکی تھی — شانتا کو ضرور یہ بات بُری لگی ہوگی مگر اس نے اس وقت مجھ سے کچھ نہ کہا اور شاید درویش مینشن کے در و دیوار سے پوچھ لیا کہ قصہ کیا ہے — قصہ کوتاہ تھا اور اس کی عقل تیز —

دو چار دن بعد میں شانتا سے ملنے گیا تو اس کے انداز میں وہ گرم جوشی اور بے تکلفی نہ تھی۔ بجھا بجھا سا لہجہ — "بیٹھئے"، باتیں شروع ہوئیں — بے مقصد — بے ہنگم — وقت گزاری کی باتیں۔ اردو ہندی کا تو اب جھگڑا ہی ختم ہو گیا تھا — جب میں اٹھنے لگا تو اس نے صرف اتنا کہا — آپ سوچ لیجئے — غلط راستہ پر جا رہے ہیں۔"

— میں نے انجان بنتے ہوئے اس سے وضاحت چاہی اور اس نے پھیکی ہنسی میں بات ٹال دی — اب شانتا اور میں، دونوں ہی ایک دوسرے سے کترانے لگے مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے غافل نہیں ہے۔ کیونکہ بعض اوقات اس کی کار بے موقع گزرتی ہوئی نظر آ جاتی۔

رادھیکا کے التفات میں کوئی کمی نہ آئی۔ بلکہ اس کی عنایات بڑھتی ہی گئیں۔ بے ضرورت روپیہ مل جاتا۔ بے ضرورت عیش و عشرت کے سامان، بے ضرورت رفاقت۔ اور اس نے اس قدر ناز بیجا اُٹھانے شروع کر دیئے کہ مجھے محسوس ہونے لگا میری عمر کم ہوتی جا رہی ہے اور میں ایک ذمہ دار نوجوان سے ایک ضدی بچہ بنتا جا رہا ہوں آہستہ آہستہ میں اس شخص کو بھول گیا جس نے پہلی بار نہایت وقار اور خود اعتمادی سے درویش مینشن میں قدم رکھا تھا۔

ایک دن جب میری ٹیکسی کا ہارن نیچے سے چیخ رہا تھا۔ درویش مینشن کی بلندی سے قہقہے بکھرتے ہوئے میرے کانوں تک پہونچے — صرف قہقہے — نہ کوئی ہاتھ ہلا نہ کوئی آنچل لہرایا — اور میں جھنجھلا کر "ریان پوائنٹ" کی طرف بڑھ گیا — جانے کب تک کہاں کہاں اور کدھر کدھر بھٹکتا رہا۔ اس رات — اور صبح جب ٹیلیفون پر برسنا چاہا تو جیسے تاروں کی آواز کسی نے گھونٹ دی —

" اس قدر بننے کی ضرورت نہیں، آخر آپ بگڑ کیوں رہے ہیں۔ اور کس بات پر۔" — کوئی بات نہیں بنی تو میں نے فون پٹخ دیا —

شام کو پھر ٹیکسی کا ہارن چیخا — لیکن آج قہقہوں نے بھی اس کا جواب نہ دیا۔ خاموشی — مکمل خاموشی — بادلِ ناخواستہ اوپر چڑھا تو معلوم ہوا کہ نوکروں کے علاوہ گھر کے مکینوں میں سے کوئی بھی نہیں ہے — بہت جھلایا۔ اور پھر خود انتقامی کا جذبہ مجھے نہ جانے کہاں کہاں لئے پھرا جیب کو روز بھرنے اور خالی ہونے کی عادت پڑ گئی تھی۔ مگر اب خالی ہی ہوتی چلی گئی تو اور چڑچڑاہٹ بڑھی — روپیہ — مجھے روپیہ چاہئے — روپیہ چاہئے — میں اپنی بے بسی پر پاگل ہوا جا رہا تھا مگر وہاں پر اسرار خاموشی اور گم شدگی کے سوا کچھ نہ تھا — نہ شانتا کا پتہ تھا، نہ رادھیکا کا —

شانتا سے تو خیر سروکار کیا تھا۔ مگر رادھیکا —!! وہ میرے ایک اشارے پر اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کا حوصلہ رکھنے والی رادھیکا — وہ کہاں ہے؟؟ اور ایک دن ایک ایکٹر کے ساتھ اُسے جاتا دیکھ کر میرا پیمانہ صبر چھلک گیا اور اپنی اوقات بھول کر اُسے ڈانٹنے کا ارادہ کیا۔ اپنے سب ہتھیار سنبھال کر درویش مینشن پہونچا۔ معلوم ہوا رادھیکا گھر پر ہے۔ بیڈ روم کا دروازہ بند تھا۔ میں بے صبری سے برآمدہ میں ٹہلنے لگا۔ تھوڑی دیر میں دروازہ کھلا — اور بے تکلف قہقہوں کی آواز آئی — میں اُدھر بڑھنے ہی والا تھا کہ رادھیکا اندر سے برآمد ہوئی۔

" آپ " — اس کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی اور مجھے اس طرح دیکھا جیسے کوئی شکاری اپنے زخمی شکار پر نظر ڈالے۔ میں تڑپ کر رہ گیا "— ہاں میں —" میں نے اپنے حواس بجا کرتے ہوئے مصنوعی رعب اپنی آواز میں پیدا کرتے ہوئے کہا —

"آپ بغیر اطلاع کے کیسے تشریف لے آئے" —— وہ اور بھی سنبھل کر بولی —
میں اس قسم کے سوالات کے لئے تیار نہ تھا اور یہ سوچتا ہوا اوپر گیا تھا کہ مجھے دیکھتے ہی رادھیکا رشتہ خلی ہوجائے گی۔ ہزار ہزار معافی مانگے گی اور اتنے دن نہ ملنے کے جھوٹے سچے عذر پیش کرے گی۔ میں بگڑوں گا تو وہ منائے گی۔ —— مگر آج اس کے تیور ہی اور تھے بلکہ چڑھتے جا رہے تھے —— مجھ سے کچھ نہ بن پڑا سوائے اس کے کہ اپنے آپ کو ملائم کرکے مسکرانے کی کوشش کروں ——

—— مگر اس کی نظریں اپنے سوال کا جواب تلاش کر رہی تھیں ——

—" مجھے — مجھے — ضرورت ہے"، —— آج پہلی بار میں دستِ سوال دراز کرنے کی کوشش کر رہا تھا ——

" ضرورت —— کاہے کی ضرورت" —— وہ غرائی ——

" آپ خوب جانتی ہیں مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے" ——

مگر اس کے چہرے پر اور صلابت آگئی —— " جلدی کہئے کیا کہنا ہے —— میرے احباب بیٹھے ہیں ——"

" مجھے روپیہ چاہئے" —— میں نے بلا تکلف جملہ اگل دیا —— وہ اس طرح ہنسی جیسے میرے منہ پر تھوک رہی ہو —— اور بے حد سنگین لہجہ میں بولی ——

" اب آپ کے لئے میرے پاس ایک پیسہ نہیں ہے"

" آپ کی اکڑ، خودداری اور خود پرستی اور بے نفسی کی جو قیمت میں نے مقرر کی تھی، وہ میں ادا کر چکی۔ شانتا بھی مات کھا چکی اور آپ بھی بے سر و سامان ہو چکے — اب آپ اپنی لاش لے جا سکتے ہیں"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے بڑھی اور میں نے محسوس کیا جیسے میری غیرت اور حمیت کی میت کو درویش مینشن کی بلندی سے سمندر کی موجوں میں پھینک دیا گیا ہے ●●

# دو غزلیں



## ۱

### مظہر امام

ترے خیال پہ جیتے دلوں کی بلا ہے
مگر وہ دورِ تمنا جو آنے والا ہے
ہر ایک لاش پہ عائد ہے قتل کا الزام
یہ حادثہ ہے، مگر حادثہ نرالا ہے
ابھی سے ٹوٹتے لمحوں کی گرد اڑنے لگی
یہ راستہ تو بہت دور جانے والا ہے
وہی تو ہیں کہ جنہیں بولنا نہ آتا تھا
یہ کون لوگ ہیں اب جن کا بول بالا ہے
اسی امید پہ اربابِ شہر زندہ ہیں
کہ اس پہاڑ کے آگے بہت اجالا ہے
اب اس کے بعد کوئی حادثہ نہ ہوگا کبھی
مرے وجود کا یہ آخری سنبھالا ہے

## ۲

### غلام مرتضیٰ راہی

آخر میں بے نقاب سرِ آئینہ ہوا
تھا تلخ تجربہ جو نفس آشنا ہوا
آثارِ تشنگی، سرِ آسودگی نہ پوچھ
صحرا کا نقش تھا لبِ دریا بنا ہوا
پھر ہاتھ اپنی نبض پہ رکھتا ہوں بار بار
پھر مجھ سے کوئی فعل خلافِ انا ہوا
وابستہ مجھ سے رہتی تھیں کیا کیا پہیلیاں
میرے لئے غلط ہی انھیں بوجھنا ہوا
انجام کو پہنچنے پہ مجھ کو پتہ چلا
خود میرے ہاتھ ہی میں تھا نقشہ بنا ہوا
بے چہرگی میں ڈھونڈتے ہی رہ گئے مجھے
ایسے بھی آئینوں سے مرا سامنا ہوا
غارت گرِ وجود ہی کہیئے اسے مگر
جوہر وہ اس میں کیا تھا جو کھل کر فنا ہوا

**سعادت علی صدیقی**

# منیر شکوہ آبادی



سید اسمٰعیل حسین منیرؔ شکوہ آبادی، سید احمد حسین شادؔ شکوہ آبادی کے بیٹے تھے۔ شادؔ اعلیٰ پائے کے فقیہہ و محدث تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت علیؓ سے ملتا ہے۔ منیرؔ ۱۲۲۹ھ (۱۸۱۳ء) میں پیدا ہوئے[1] شعر و سخن کا ماحول ورثے میں پایا۔ منیرؔ کے بڑے بھائی سید اولاد حسین بھی عالم باعمل تھے اور چھوٹے بھائی سید حسین مطیرؔ بھی شاعر۔ منیرؔ کا اپنے ماحول سے متاثر نہ ہونا ناممکن تھا۔ وہ بچپن ہی سے شعر کہنے لگے اور تھوڑے عرصہ میں ہی اپنے کمالِ فن سے لوگوں کو متوجہ کر لیا۔

منیرؔ پیدا شکوہ آباد میں ہوئے مگر محبت انہیں لکھنؤ سے تھی۔ لکھنؤ کی رعنائیاں اور دلچسپیاں اُن کے دل میں گھر کئے تھیں۔ لیکن یہاں مستقل قیام کی کوئی صورت نہ تھی۔ روزگار کی تلاش میں وہ کلکتہ، مرشد آباد، الٰہ آباد وغیرہ گھومتے رہے۔ کہا جاتا ہے کہ آگرے کے ایک مشاعرے میں نواب نظام الدولہ ان کی غزل سے بہت متاثر ہوئے اور وہ انہیں لکھنؤ لے آئے اور ناسخؔ کا شاگرد بنایا۔ غازی الدین حیدر کی تخت نشینی کے بعد ناسخؔ کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔ ان کی خواہش پر منیرؔ علی اوسط رشکؔ سے اصلاح لینے لگے۔ منیرؔ نے جابجا ان دونوں کے کمالِ فن کا اعتراف کیا ہے۔

جناب رشکؔ و ناسخؔ کے تلمذ سے بڑھا رتبہ
منیرؔ استاد کہلایا عنایات الٰہی سے

منیرؔ کی پوری زندگی کسی نہ کسی رئیس یا نواب کی مصاحبت میں بیتی۔ وہ نواب نظام الدولہ کے ساتھ لکھنؤ آئے تھے۔ ان کے بعد نواب اصغر علی خاں نے اپنی مصاحبت میں لے لیا۔ چند دنوں بعد یہ صحبت بھی برہم ہوئی اور تیرہ بختی نے آگھیرا۔ مولانا احمد حسین خاں عروج نے قدردانی کی۔ پھر سید محمد ذکی خاں نے طلب کر لیا اور اپنا استاد مقرر کر دیا۔ دو سال نواب صاحب کے ساتھ لکھنؤ کی رنگ رلیوں میں گزرے۔ اسی عرصہ میں نواب تجمل حسین خاں بہادر ظفر جنگ معروف بہ حشمت جنگ[2] نے انہیں اپنے پاس بلا لیا اور ان کی قدر و منزلت کی۔ تھوڑے عرصہ بعد منیرؔ پھر لکھنؤ چلے آئے۔ راجہ الور نے سفر خرچ بھیج کر انہیں بلانا چاہا لیکن منیرؔ نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد نواب علی بہادر والی ریاست باندہ نے منیرؔ کو دو سو روپے ماہوار پر ملازم رکھ لیا اور اپنے کلام پر اصلاح لینے لگے۔ باندہ میں انہوں نے کافی عرصہ قیام کیا اور یہیں ان کے دونوں دواوین 'منتخب العالم' اور 'تنویر الاشعار' مرتب ہوئے۔[3] اور یہیں سے منیرؔ کی زندگی میں قید و بند کا آغاز ہوا۔

---

[1] منیرؔ کے سن پیدائش کے بارے میں اختلاف ہے۔ محمود الٰہ آبادی نے ۱۲۳۵ھ (صحیفہ تاریخ اردو صفحہ ۲۴۳) سید ہادی حسن جعفری نے ۱۲۳۴ھ (ہادی اردو مطبوعہ نامی برقی پریس میرٹھ ۱۹۳۷ء) حافظ محمد جلال الدین احمد جعفری نے ۱۲۲۳ھ (اردو ترمیم شدہ ایڈیشن صفحہ ۳۱۸) اور جناب محمد علی خاں اثر رام پوری نے ۱۲۲۹ھ (ہماری زبان علی گڑھ ۲۲ ستمبر ۱۹۵۹ء) منیرؔ شکوہ آبادی کا سالِ ولادت تحریر کیا ہے۔ لیکن منیرؔ نے اپنے دیوان کے دیباچہ میں لکھا ہے: "سمند عمر تا حال سی و پنج مرحلہ از مراحل زندگی طے کردہ توفیق اتمام ایں دیوان (منتخب العالم) دادہ است" (منتخب العالم صفحہ) منیرؔ نے یہ دیوان ۱۲۶۴ھ میں مرتب کیا اس وقت ان کی عمر ۳۵ برس تھی اس اعتبار سے ان کا سن پیدائش ۱۲۲۹ھ (۱۸۱۳ء) قرار پاتا ہے۔

[2] یہ وہی نواب تجمل حسین خاں ہیں جن کے لئے غالبؔ نے کہا تھا: "بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے"۔

[3] لکھنؤ کا دبستانِ شاعری، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی

منیر نے اپنی لیاقت سے نواب علی بہادر کو اس درجہ گرویدہ کر لیا تھا کہ وہ ریاست کے مسائل پر منیر سے مشورہ لینا ضروری سمجھنے لگے۔ ۱۸۵۷ء میں جب جذبۂ آزادیٔ حریت نے ہر سینے کو شعلہ زار اور ہندوستان کو کوہِ آتش فشاں بنا دیا اور آزادی کے پروانے دہلی اور بادشاہ دہلی پر نثار ہونے لگے، فرخ آباد، لکھنؤ، بہادر گڑھ، بلب گڑھ اور دوجانہ وغیرہ کے فرماں رواؤں نے علم بغاوت بلند کیا اور جب رانی جھانسی کے دلیرانہ کارناموں نے ملک کے کونے کونے میں احساسِ آزادی بیدار کر دیا، تو نواب علی بہادر خاں بھی خاموش نہ رہ سکے۔ انہوں نے اپنے وزیر ولایت حسین اور صلاح کار منیر شکوہ آبادی سے مشورے کیے۔[۱] دونوں نے انگریزوں کے خلاف معرکہ آرائی کی ترغیب دی چنانچہ نواب نے فوجوں کو صف آرا کر کے راج گڑھ کے قلعہ پر حملہ کیا اور فتح حاصل کی۔ فتح کی خوشی میں منیر نے تاریخ کہی۔

چوں فوج بندیلہ بہ باندہ رسید
زحصن اجے گڑھ برائے فساد
بر ایشاں ظفر یافت نواب ما
دل اہلِ انصاف گردید شاد
چنیں گفت تاریخ نصرت منیر
خدا فتح علی بہ نواب داد
۱۲۷۴ھ

۱۵ جون ۱۸۵۷ء کو کاک ویل گرفتار کر کے نواب کے سامنے پیش کیا گیا۔ منیر نے ایک قطعہ کہا جس کا یہ شعر بہت مشہور ہے۔

ہوا محبوس دوا باندہ میں آکر اجے گڑھ سے
پھنسا دامِ مصیبت میں سیانا گرچہ کوا ہے[۳]

۲۰ اپریل ۱۸۵۸ء کو جب باندہ پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا تو نواب کو بھاگنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ولایت حسین[۲] اور منیر شکوہ آبادی فرخ آباد سے مدد حاصل کرنے کے لئے روانہ ہوئے لیکن راستے میں ہی گرفتار کر لیے گئے۔ جنگ میں منیر کی شرکت اور اُن کے قطعات انھیں مجرم قرار دینے کے لیے بہت کافی تھے، لیکن انگریزوں کو ایک اور بہانہ بھی ہاتھ آگیا۔ منیر کے دوستوں میں ایک صاحب مصطفےٰ بیگ بھی تھے۔ انہوں نے ایک طوائف مسمی نواب کو قتل کر دیا تھا۔ سرکار نے مصطفےٰ بیگ کو گواہ بنا کر منیر کے اوپر قتل کا جرم عائد کر دیا اور [illegible] سال کے لیے انڈمان بھیج دیا گیا۔ منیر فرماتے ہیں۔

غربت میں وطن خانہ بدوشوں کو ملا
زہرِ غربت شکر فروشوں کو ملا
[illegible]
کالا پانی سفید پوشوں کو ملا

مصطفےٰ بیگ کے بارے میں مزید تفصیلات نہیں ملتیں، کہا جاتا ہے کہ [illegible] میں سے تھے اور نواب جان فرخ آباد کی طوائف تھی جس سے [illegible] نواب جان کے قتل کے بعد منیر بھی مورد الزام ٹھہرائے گئے۔ بشن نرائن حامی بریلوی نے لکھا ہے

"صحیح سبب تو بیان کرنا مشکل ہے مگر اتنا ضرور ہے جیسا کہ واقف کاروں سے سنا ہے کہ مقتولہ نواب صاحب کی محبوبہ بھی تھی۔"[۳]

بشن نرائن حامی بریلوی کی یہ عبارت قابلِ توجہ ہے کیونکہ ان کے والد دیبی پرشاد عرف دیبی سہائے صادق منیر کے شاگرد تھے جن کا ذکر منیر نے اپنی غزل کے ایک مقطع میں کیا ہے۔

ان تنگ قافیوں میں نہ کہتا غزل منیر
مجبور ہے کہ خاطرِ دیبی سہائے ہے

نواب جان کا منیر سے تعلق ناممکن بات نہیں ہے منیر کو اس طرح کے معاملات سے دلچسپی تھی۔ اُن کے دیوان میں تین تاریخی قطعات محبوبہ کی وفات پر ملتے ہیں۔ ان کی محبوبہ کا انتقال ۱۲۶۴ھ میں ہوا۔ جب وہ فرخ آباد میں تھے۔ ان کی محبوبہ حسین، ماہر موسیقی اور شعر و سخن کی دلدادہ تھی۔ ایک قطعہ تاریخ کا یہ شعر ملاحظہ ہو

وہ پری مر کے بھی مجھے مار گئی
زیست میں جان کی تلخی ہے

ممکن ہے نواب جان سے بھی منیر کا تعلق رہا ہو اور اس بنا پر قتل کے الزام میں دھر لیے گئے۔ اور مصطفےٰ بیگ نے سرکار برطانیہ کو ان کی طرف سے بدظن دیکھ کر اس موقع سے فائدہ اٹھا لیا ہو۔

منیر اس قتل میں شریک رہے ہوں یا نہیں لیکن مقتولہ سے انہیں ہمدردی ضرور تھی۔

---

۱ لکھنؤ کا دبستان شاعری از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
۲ مرزا ولایت حسین خاں کو سزائے عبور دریائے شور ہوئی اور انڈمان بھیج دیا گیا۔
(غدر کے چند علماء مفتی انتظام اللہ شہابی صفحہ ۵۷)
۳ قند اردو ترمیم شدہ ایڈیشن صفحہ ۳۲
۴ کلیات منیر صفحہ ۳۷۴
۵ منیر شکوہ آبادی بشن نرائن حامی: آج کل ۱۵ ستمبر ۱۹۵۵ء صفحہ ۲

کیونکہ وہ اس حادثہ کا تذکرہ اپنے قطعہ میں "خونِ ناحق نواب جان" کے الفاظ کے ساتھ کرتے ہیں۔ اور مصطفیٰ بیگ کے اس فعل کو "تزویر" سے تعبیر کرتے ہیں۔

منیر نے ایک خط حکیم محمد حسن خاں صاحب طبیب اعلیٰ سرکار مہاراجہ گوالیار کو ان کی والدہ کی تعزیت کے سلسلے میں لکھا ہے۔ اظہار افسوس کے ایک مخصوص مسئلہ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایک نامعقول عورت اور اس کی لڑکی اپنی بدکرداریوں کی وجہ سے سرکاری نوکری سے معزول کر دی گئی ہے اور اس کو اس شہر (رام پور) میں رہنے کی ممانعت کر دی گئی ہے اور وہ مرادآباد منتقل ہو گئی ہے اور اب سننے میں آیا ہے کہ تھوڑی مدت میں ہی کچھ لوگ آپ کے ذریعے سے ان دونوں بدکرداروں کا تعلق مہاراجہ (گوالیار) سے کروانا چاہتے ہیں۔ یہ صورت حال آپ کی دور اندیشی اور مآل بینی سے بہت دور معلوم ہوتی ہے لیکن اس کا امکان ہے کہ ان میں سے کسی ایک نے فرخ آباد وطن ہونے کے رشتہ سے یا اپنی دل ربائی کی وجہ سے ایسی صورت پیدا کر لی ہو لیکن اس قسم کی تحریک دونوں ریاستوں (رام پور اور گوالیار) میں خوشگوار تعلقات کے لیے مضرت رساں ہو سکتی ہے۔ اگر اس کی ذمہ داری آپ پر ہے تو اس کا تدارک جلد از جلد ضروری ہے اور اگر کسی دوسرے کی یہ حرکت ہے تو بھی اپنی امکانی کوشش اس کے لیے کریں۔ خدا کی قسم کہ دیرینہ اخلاص نے مجھے اس دردسری پر مجبور کیا ہے۔ ورنہ مجھے اس خرافات سے کیا تعلق۔ ہر کسے ناصح برائے دیگراں"[1]

اس خط سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ منیر اس کوچے سے ناواقف نہیں تھے اور نواب جان کے قتل کے الزام کے پسِ پشت کوئی نہ کوئی بات ضرور پوشیدہ ہے

خود منیر نے ان واقعات پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

فرخ آباد اور یارانِ شفیق
چھٹ گئے سب گردشِ تقدیر سے
آئے باندہ میں مقید ہو کے ہم
سو طرح کی ذلت و تحقیر سے
اک مرا شاگرد تھا اس شہر میں
پھل وہ پائے گلشنِ توقیر سے
لفظ خاں کا جزوِ اول کر وزیر
نام اس کا جان اس تقریر سے
کیں سعادت مندیاں اس نے بہت
رہ گیا عاجز مری تقدیر سے
جس قدر احباب خالص تھے وہاں
درگزر کرتے نہ تھے تدبیر سے
پر کہوں کیا کاوشِ اہلِ نفاق
تھے وہ خوں ریزی میں بڑھ کر تیر سے
شہر کا خنجر زبانیں ان کی تھیں
قتل کرتے تھے مجھے تزویر سے
مصطفیٰ بیگ ایک صاحب ان میں ہیں
کج روؤں میں بڑھ کے چرخِ پیر سے
کر کے خونِ ناحقِ نواب جان کا
مجھ کو بھی پھنسوا دیا تزویر سے
خون میرا وہ سمجھتے تھے حلال
تھا جو میں ذریتِ شبیر سے

باندہ کے زنداں کے ستم، وہاں کی کوٹھری کا قبر کی طرح تاریک ہونا، گوبر جیسی روٹیاں اور بھینس کی ساتی سے بدتر دال کا ملنا، ٹاٹ کمبل کا بستر، باندہ سے الٰہ آباد اور الٰہ آباد سے کلکتہ تک کا پاپیادہ سفر اور حالت یہ کہ

ہتھکڑی ہاتھوں میں بیڑی پاؤں میں
ناتواں تر فیس کی تصویر سے
بے حواس و بے لباس و بے یار
دل گرفتہ جورِ چرخِ پیر سے

منیر کلکتے سے کالے پانی پہنچتے ہیں۔ ان پر وہاں کیا کچھ گزرتی ہے، اس کا حال ایک قطعہ میں لکھتے ہیں۔ دو شعر ملاحظہ ہوں۔

اسیر ہو کے جو ہم آئے کالے پانی میں
ہوئی مصائب و آلام کی فراوانی
محال شرح ہے ادنیٰ سی بھی مصیبت کی
اگر بیان کریں مل کے انسی وجانی

قید میں منیر کے کیا مشاغل تھے؟ اُن کے ذمہ کیا کام سپرد تھا ان کے دل و دماغ کی کیا کیفیت تھی اور وہاں اُن کے جذبات و احساسات پر کیا گزرتی تھی۔ ان تمام تفصیلات کا ذکر منیر کے قطعات میں مل جاتا ہے۔ وہاں انھیں پانی کھینچنے یا گھوڑ بیل باندھنے کا کام سپرد نہیں ہوا تھا اور نہ چکی کی مشقت انہیں سونپی گئی تھی۔ بلکہ وہ کمشنر کے محکمہ میں

---

[1] تنظیم منیر صفحہ ۴۲۳ (بحوالہ منیر شکوہ آبادی مقالہ برائے ڈاکٹریٹ از زبرا یاسین صاحبہ لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری۔)

منشی تھے ظاہر ہے یہ کام ان کے لئے دقت طلب نہ تھا۔

منیرؔ پہلے چھ روپے ماہوار پر ملازم ہوئے پھر تنخواہ میں اضافہ کر دیا گیا تھا۔

محکمے کے کاموں سے فراغت ملنے کے بعد منیرؔ اپنا وقت مولانا فضل حق خیرآبادی کی صحبت میں گزارتے تھے یا حضرت علیؓ و حضرت حسینؓ کی شانِ اقدس میں قصیدے اور قطعات کہتے تھے اور اپنی رہائی کے لئے دعائیں مانگتے۔ تھے یوں نا فضل حق سے منیرؔ کو خاص عقیدت تھی۔ قید کے زمانے میں منیرؔ نے ان کی شان میں ایک قصیدہ بھی کہا تھا۔

منیرؔ کو انڈمان میں جسمانی محنت و مشقت نہ اٹھانی پڑتی تھی لیکن عزیزوں سے جدائی اور لکھنؤ کی یاد اُن کے دل پر تیر کا کام کرتی تھی۔ اُن کے کلام میں اگر کہیں سوز و گداز ہے تو صرف چند رباعیوں، قطعوں اور تضمینوں میں ہے، جو انہوں نے انڈمان کے قیام کے دوران کہی ہیں۔ جس روز سے دخل بے لبسی نے پایا

ہونٹوں کا نہ قرب ہنسی نے پایا

اپنا ساتھی تمام دنیا میں منیرؔ

ڈھونڈھا تو بھی کو بے بسی نے پایا

ایک پُر اثر اور درد انگیز تضمین کا ایک بند ملاحظہ فرمایئے۔

ظاہر کمال رحم خدا داد کیجئے

قید ملال و رنج سے آزاد کیجئے

برباد ہے غلام اب آباد کیجئے

گھبرا رہا ہوں جلد مجھے شاد کیجئے

للہ یا علی میری امداد کیجئے۔

آخر کار منیرؔ کی دعا قبول ہوئی اور ۱۲۸۰ھ میں وہ رہا کر دیئے گئے۔ کلکتہ واپس جاتے ہوئے لکھتے ہیں۔

بارے آئی نجات کی باری ؛ کھل گیا عقدۂ گرفتاری

ہم کو منصب ملا رہائی کا ؛ قید کو جائداد بے کاری

کوچ ٹھہرا مقام غربت سے ؛ اب وطن چلنے کی ہے تیاری

رخصت اے دوستان زندانی ؛ الوداع اے غم گرفتاری

منیرؔ ۱۹ صفر ۱۲۸۲ھ کو رہا ہوئے دو برس میعاد قید میں کم کر دیئے گئے تھے منیرؔ نے لکھا ہے

انعام میں معاف ہوئے ہم کو دو برس

شکرِ خدا رہا ہوئے کام نہنگ سے

ہندوستاں میں آکے رہے ہم پراگ میں

اب کانپور جاتے ہیں دل کی امنگ سے

فضل خدا سے سال رہائی کہو منیرؔ!

اب ہم گھر آئے چھوٹ کے قیدِ فرنگ سے

کہا جاتا ہے کہ نواب یوسف علی خاں والئ رامپور کے ہاں ایک دن محفل رقص منعقد تھی کہ ایک گویئے نے منیرؔ کی مشہور غزل "شرمندہ ہو رہا ہوں اپنے کمالوں کے سامنے" پڑھی نواب صاحب اس غزل سے بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے اسی زمین میں ایک غزل کہی۔

ناظم منیرؔ آئے یہاں ہم ہیں قدرداں

شرمندہ کیوں ہے اپنے کمالوں کے سامنے

لیکن جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ منیرؔ کو عبور دریائے شور کی سزا ہوگئی ہے تو انہوں نے منیرؔ کی رہائی کی سفارش کی اور جب منیرؔ رہا ہو کر آئے تو انہیں نواب صاحب کے کرم فرمائی کا علم ہوا۔ انہوں نے نواب صاحب کے مصرع "شرمندہ کیوں ہے اپنے کمالوں کے سامنے" کی تضمین کی۔ مشہور خلق آپ کی ہیں قدر دانیاں

حسب طلب منیرؔ بھی آتا ہے اب وہاں

یہ حکم خاص ہے دل و جاں پہ مرے رواں

"ناظم منیرؔ آئے یہاں ہم ہیں قدرداں

شرمندہ کیوں ہے اپنے کمالوں کے سامنے

منیرؔ قید سے رہا ہونے کے بعد الٰہ آباد پہونچے تھے اور وہاں سے نواب صاحب کے شقے کا جواب لکھا اور رامپور جانے کے لئے لکھنؤ آئے یہاں انہیں نواب رامپور کے انتقال کی خبر ملی۔ عالم حزن و یاس میں منیرؔ نے ایک بند اور کہا

آیا منیرؔ چھٹ کے جب قید سے یہاں

تھا قصد رام پور کو ہو جاؤں میں رواں

لیکن حضور ہو گئے راہی سوئے جناں

اب کس کے پاس جاؤں ہے کون قدرداں

نادم رہا میں اپنے کمالوں کے سامنے"

منیرؔ پہلے ہی پریشان حال تھے، اس حادثہ نے انہیں نڈھال کر دیا اور وہ بہت مایوس ہو گئے۔ اتنے میں ولی عہد رامپور کی تخت نشینی کی خبر آئی۔ امیدوں نے پھر انگڑائی لی اور تہنیت نامہ مع تاریخ کہا۔ نواب کلب علی خاں نے انہیں رامپور بلا لیا۔ یہاں ان کی زندگی سکون و اطمینان سے گزرنے لگی۔ خود کہتے ہیں

نواب پاک کلب علی خاں نے اے منیرؔ ؛ بلوا کے رام پور میں کیں بخششیں کثیر

صد شکر آئے راہ پہ اب طالع فقیر ؛ ہے قدرداں سراپا امیر ملک سریر

اب سرخ رو ہوں اپنے کمالوں کے سامنے

منیرؔ آخر عمر تک دربار رامپور سے وابستہ رہے اور ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۹ء) میں رام پور ہی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ انتقال منیر عالی قدر سے ہجری سال وفات کا تعین ہوتا ہے۔

# غزلیں

## دھرم پال عاقل

جب سے پیتے ہیں مئے وحدت کے پیمانے کو ہم
جانتے ہیں ایک سا اپنے کو بیگانے کو ہم

ہر قدم پر ایک دھوکا، ہر نظر میں اک سراب
دیکھتے ہیں زندگی کے آئینہ خانے کو ہم

وہ تو گزری خیر، جھگڑا ہوتے ہوتے رہ گیا
کس گھڑی نکلے تھے گھر سے اُن کو سمجھانے کو ہم

زندہ جل مرنا اسی کا، ہاں اسی کا کام ہے
دیر تک دیکھا کئے حیرت سے پروانے کو ہم

ٹوٹے پھوٹے جام و مینا، دل شکستہ بادہ خوار
کیا کریں ساقی بتا! اس تیرے میخانے کو ہم

اُن کی شوخی دیکھئے کہتے ہیں کس انداز سے
دل سے کیوں کر دور کر دیں اپنے دیوانے کو ہم

صورتِ سیماب اسے رہتا ہے ہر دم اضطراب
اب الٰہی کیا کریں اس دل کے بہلانے کو ہم

دیدۂ باطن نہ ہونے سے رہے ناکامیاب
گو بہت سمجھا کئے دُنیا کے افسانے کو ہم

ہم فقیروں کو تعلق مے سے کیا، لیکن حضور!
آپ کہتے ہیں تو چل پڑتے ہیں میخانے کو ہم

یہ پُرانی بات ہے، کچھ آج کا قصہ نہیں:
وہ اگر ہیں جی جلانے کو تو غم کھانے کو ہم

کیا طلب کرتے کسی سے، جب سمجھتے ہی رہے
باعثِ شرم و خجالت، ہاتھ پھیلانے کو ہم

عمر ساری عارضی لذات ہی میں کٹ گئی
خاک سمجھیں ایسے جینے اور مرجانے کو ہم

میکدے میں کام اپنا تو نہیں عاقل کوئی
آ گئے ہیں میکشوں کو راہ پر لانے کو ہم

## خاطر حافظی

درد کی چوکھٹ پہ آ کر یوں صدا دیتا ہے کون
رات کے پچھلے پہر مجھ کو جگا دیتا ہے کون

خون کے دریا فضاؤں میں بہا دیتا ہے کون
روز سورج کو یہاں سولی چڑھا دیتا ہے کون

میرے گھر کا اجالا سوچتا رہ جاتا ہے
رات ہوتے ہی یہاں پردہ گرا دیتا ہے کون

صبح ہونے کے قریب
مجھ کو بستر سے اُٹھا کر
دل کی ساری تلخیاں مجھ کو پلا دیتا ہے کون

دل کے بھرے بازار میں
دیکھتے ہی دیکھتے مشعل سی جلا دیتا ہے کون

آخر آخر شب کی آسمانوں کا زوال
چونک اُٹھتا ہے خدا بھی، یوں ہلا دیتا ہے کون

عرشِ اعظم کو بھی اکثر یوں ہلا دیتا ہے کون
خون روتے جاتے ہیں ہر اک گھڑی خاطر یہاں
ناشناسوں کی ہے بستی خوں بہا دیتا ہے کون

## [illegible] زیدی

آؤ کہ رنگِ خونِ وفا دیکھتے چلیں
اس بے وفا کا حال ہے کیا دیکھتے چلیں

سنتے ہیں آج ہوش میں دیوانہ آ گیا
اک حادثہ ہے کیسے ہوا، دیکھتے چلیں

سونی پڑی ہوئی ہیں وفاؤں کی بستیاں
یارو یہ آج بات ہے کیا، دیکھتے چلیں

آئینہ اُن کے ہاتھ میں دیکھا، ٹھہر گئے
سوچا کہ ہم بھی اپنی ادا دیکھتے چلیں

کس کس کو اُن کی بزم میں ہے، ہم سے کچھ گلہ
ہے کون کون ہم سے خفا دیکھتے چلیں

ہم تو رہِ خلوص میں دیوانہ ہو گئے
ان کو بھی کچھ ملال ہوا دیکھتے چلیں

شاید یہیں کہیں مرا نقشِ قدم بھی ہے
اس نقش کو بھی راہ نما دیکھتے چلیں

ظلم و ستم کی تند ہواؤں کے درمیاں
کس نے جلا دیا ہے دیا دیکھتے چلیں

اچھا تو خانقاہ میں، آخر نہیں ملے
آؤ تو میکدے میں ذرا دیکھتے چلیں

## نثار الرحمٰن خاں منشا

شوق کھلے دل سے سنایا جائے
دل کی لے کو ذرا اور بڑھایا جائے

قدرتِ فکر و نظر ہاتھ جب آئی ہے تو پھر
ادب و شعر کا اعجاز دکھایا جائے

کچھ نہیں اس کے سوا تیرہ نصیبی کا علاج
نورِ ایقان رگ و پے میں بسایا جائے

زندگانی کے حقائق کو سمجھنے کے لئے
پردۂ وہم نگاہوں سے ہٹایا جائے

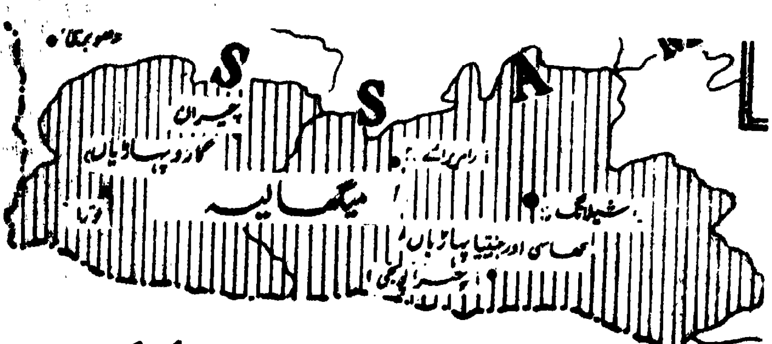
روشنی کی جو ضرورت ہے سرِ راہِ حیات
دوستو! اپنا ہی دل کیوں نہ جلایا جائے

پھر کبھی چاند پہ جانے کی کریں ہم باتیں
پہلے انسان کو انسان بنایا جائے

زندگی ایک حسین بت کی طرح ہے یارو
اس کا ہر ناز سلیقے سے اٹھایا جائے

موسمِ گل کے تقاضوں پہ نظر رکھتے ہوئے
جذبۂ جوشِ جنوں کام میں لایا جائے

خونِ دل خونِ جگر خوب لٹا کر منشا
صحنِ گلشن کو بہر طور سجایا جائے




# میگھالیہ

راج نرائن راز

گارو جینتیا اور کھاسی قبائلیوں کی دھرتی میگھالیہ اپنے باشندوں کے رہن سہن، لباس، زبان، عقائد، رسوم و رواج وغیرہم کے اعتبار سے ایک "مجموعہ اضداد" ہے۔ تاہم یہ بھارت کی دیرینہ روایات کے عین مطابق متضاد ہوتے ہوئے بھی متصادم نہیں، بلکہ مربوط ہے۔ میگھالیہ کی دھرتی اور لوگ گوناگوں دلچسپیوں کے حامل ہیں اور ملک کے دوسرے علاقوں کے رہنے والوں کے لئے اپنے اندر ایک خاص کشش رکھتے ہیں۔ میگھالیہ کی اہمیت کا محض ایک یہی سبب نہیں۔ میگھالیہ کا قیام بھی بھارت کی دیرینہ روایتوں کا آئینہ دار ہے اور ہماری خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔

میگھالیہ کا قیام اپریل ۱۹۷۰ء میں ریاست آسام کے اندر ایک ذیلی خود اختیار ریاست کی حیثیت سے عمل میں آیا۔ یہ آسام کے پانچ میں سے دو پہاڑی اضلاع گارو اور کھاسی و جینتیا ہلز پر مشتمل ہے۔ اس کے جنوب میں مشرقی پاکستان اور شمال میں وادیٔ برہم پترا ہے۔ مشرق میں شمالی کچھار اور میکر ہلز اضلاع ہیں۔ یہ ۸۷۰۰ مربع میل علاقے پر محیط ہے۔ اس کی آبادی لگ بھگ دس لاکھ ہے۔

اس ذیلی ریاست کی تشکیل کئی پہلوؤں سے آزادی کے بعد سے، ملک کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ یہ غالباً واحد انتظامیہ اکائی ہے جو اس کے عوام کی خواہش اور منشا پر، بنیادی طور پر، بغیر کسی تشدد کے، وجود میں آئی ہے۔ یہ میگھالیہ کے عوام اور سیاسی رہنماؤں کی بائیس تیئیس برس کے عرصے پر حاوی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ میگھالیہ کے تعلق سے یہ امر بھی خصوصی توجہ چاہتا ہے کہ یہ بھارت کی دوسری ریاستوں کی طرح کوئی لسانی ریاست نہیں۔ یہاں کے باشندوں کی خاص زبانیں گارو اور کھاسی ہیں۔ ذریعہ تعلیم انگریزی ہے، جسے لوگوں نے باہمی رضامندی سے اختیار کیا ہے۔

میگھالیہ کا قیام اس اعتبار سے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ بھارت کے آئینی نظام میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا تجربہ ہے۔ یہ ذیلی ریاست روس کی یونین جمہوریتوں کے نمونے پر بنائی گئی ہے۔ لیکن اسے اختیارات اور آئین بھارتی پارلیمنٹ کے ایک قانون سے حاصل ہیں۔ یہ قانون بھی اپنی جگہ اس اعتبار سے خاص اہمیت کا ہے کہ اسے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں نے ضابطوں کو معطل کرتے ہوئے محض ایک روز میں پاس کیا ہے۔ نظم و نسق کی بعض مدات براہ راست اس ذیلی ریاست کے زیر اختیار ہیں۔ جبکہ بعض کی انجام دہی و تکمیل آسام سرکار کی نگرانی میں ہے۔

اتنے سارے اعتبارات سے اہم میگھالیہ کی ذیلی ریاست اپنے عوام کے رہن سہن، لباس، عقائد اور رسوم و رواج کے اعتبار سے منفرد اور عجیب و غریب ہے۔ ان سے متعلقہ حقائق اپنے اندر افسانے کا سا افسوں اور دلکشی رکھتے ہیں۔ یہاں کے خاص باشندے کھاسی، گارو اور جینتیا ہیں۔ ممکن ہے بادی النظر میں یہ سارے قبائل ایک جیسے لگیں۔ لیکن واقعتاً یہ قبائل ہی جانتے ہیں کہ ان میں کہاں کہاں مماثلت ہے اور کہاں کہاں اختلاف۔

آغاز ان قبائل کی ابتدا ہی سے کرنا مناسب ہوگا۔

گارو اپنے آپ کو اچک ماندے (پہاڑی آدمی) کہتے ہیں۔ ان کا اولین وطن نامعلوم ہے لیکن ان کا اپنا یقین یہ ہے کہ وہ تبت کے رہنے والے ہیں جو اور گارو

زبانوں میں کچھ مشابہت پائی جاتی ہے۔ گارو ہندوؤں کی طرح گھڑیال کا احترام کرتے اور بیل کی دم کی قدر کرتے ہیں۔ گو یہ جانور گارو ہلز میں کبھی نہیں پایا گیا۔ زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ آسام کے میدانی قبائلیوں کی طرح وہ چین اور بالائی برما سے شمال مشرقی راستوں کے ذریعے اپنے موجودہ مسکن تک آئے۔ لسانی اور جسمانی اعتبار سے گارو کچھاریوں سے بڑے مشابہ ہیں، لیکن ان کی موت کی اور نیز بعض دوسری اور بالخصوص سرکا شکار کھیلنے کی رسومات ناگاؤں جیسی ہیں۔ قرین قیاس ہے کہ گارو ابتداً دیناج پور کے قریبی علاقے میں رہے ہوں گے۔ اور اس علاقائی قرب کی وجہ سے بعض ناگا رسومات ان کی زندگی میں راہ پا گئی ہوں گی۔

گاروؤں کی طرح، اس ذیلی ریاست کے دوسرے خاص باشندوں جینتیاؤں کے بارے میں بھی خیال یہ ہے کہ وہ باہر سے ـــــ مشرق بعید یا چین سے، برما کے راستے سے موجودہ مسکن تک آئے اور انہوں نے اس پہاڑی علاقے میں سلطنت قائم کر لی تھی، جو اب جینتیا ہلز کے نام سے موسوم ہے۔ یہ طاقتور سلطنت مارچ ۱۸۳۵ء میں ختم ہوئی جب انگریزوں نے اس کے آخری راجہ راجندر سنگھ کو معزول کر دیا تھا۔

اس علاقے کے تیسرے خاص باشندے کھاسی ہیں۔ کھاسی اور جینتیا ایک ہی نسل سے ہیں۔ اُن کی متعدد رسمیں ایک جیسی ہیں اور وہ کئی پہلوؤں سے ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ کچھ مشابہت کھاسیوں اور چھوٹا ناگپور کے مونڈا قبائلیوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ جو ان کے گہرے روابط کی مظہر ہے۔ ممکن ہے کھاسی اور مونڈا قبائلیوں نے اپنا ثقافتی ورثہ ایک ہی وسیلے سے پایا ہو۔

آج کی متمدن دنیا میں ان قبائلیوں کے ماضی پر ایک نظر ڈالنے سے رگوں میں خون منجمد ہونے لگتا ہے۔ یہ قبائل ابتداً بڑے وحشی تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ماضی قریب تک گاروؤں کو بے حد ظالم، خون کے پیاسے اور وحشی سمجھا جاتا تھا۔

اور اس کا ثبوت ان کے اپنے نواحی میدانی اضلاع پر متعدد اور مسلسل حملے ہیں۔ ہر حملے میں متعدد لوگ ہلاک اور زخمی ہوتے تھے۔ گارو قبائلی ناگاؤں کی طرح مرے ہوئے لوگوں کے سر کاٹ کر اپنے ہمراہ لے جاتے تھے کہ یہ اُن کا محبوب مشغلہ تھا۔ محض تفریح کے لیے کیے جانے والے اس قتل و خون کے علاوہ اُنہیں قربانی کی غرض سے بھی انسان درکار ہوتے تھے۔ یہ قربانیاں بُرے شگون والے واقعات کے بعد، دیوتاؤں کو مہربان کرنے کی غرض سے دی جاتی تھیں۔ اسی طرح انسانی قربانی کا رواج متحد کھاسی و جینتیا ہلز کے جینتیا قبائلیوں میں بھی تھا، جو انہوں نے غالباً آسام کے میدانی علاقوں کے تانترک ہندوؤں سے لیا تھا۔ جینتیا قبائلی جن پتھروں پر انسانوں کو قربان کیا کرتے تھے وہ جینتیا ہلز میں گرم پانی کے قریب دریائے کوپلی کے کنارے آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ قربانیاں کوپلی دیوی کو خوش کرنے کے لیے دی جاتی تھیں۔ ان قبائلیوں میں سر کا شکار کھیلنے کا رواج ۱۸۷۶ء تک رہا۔ اسی برس اس کی مؤثر روک تھام ہو پائی تھی۔ اس برس گارو قبائلیوں نے کئی سو انسانی کھوپڑیاں ڈپٹی کمشنر یا اس کے عملے کی تحویل میں دیں۔

سر کا شکار اور انسانی قربانی اپنی جگہ چونکانے اور حیرت میں ڈالنے والے امور ہیں۔ تاہم گارو اور کھاسی قبیلوں میں جرم و سزا اور جھوٹے وسچے کی آزمائش کے طریقے اور معیار بھی اتنے ہی انوکھے اور حیرت انگیز ہیں۔ گاروؤں کے بارے میں ایک بہت دلچسپ روایت یہ ہے کہ ہر گارو کی زندگی واثی (معاوضہ) دیتے اور طلب کرتے ہوئے گزر جاتی ہے۔ معاوضے کی طلبی کا سلسلہ نسل در نسل چلتا ہے۔ فرض کیجئے، ایک شخص کے دادا، پردادا کا قتل پچاس برس پہلے ہوا تھا وہ قتل کا معاوضہ، پچاس برس گزر چکنے پر بھی قاتل کے وارثوں سے طلب کرتا ہے اور اگر معاوضہ نہیں ملتا تو پھر اس کے وارث، قاتل کے وارثوں کے وارثوں سے معاوضہ اس وقت تک طلب کرتے رہتے ہیں جب تک کہ وہ ادا نہیں ہو جاتا۔ گاروؤں کے تعلق سے یہ امر بھی دلچسپی کا حامل ہے کہ مقدمات میں متعلقہ فریقین ہی نہیں، بلکہ سارا گاؤں حصہ لیتا ہے اور جب مقدمے کا فیصلہ زبانی شہادتوں کی بنا پر نہیں کیا جا سکتا تو حلف و آزمائش کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ آزمائش دو نوعیتوں کی ہوتی ہے پہلی سِل سوا کہلاتی ہے اس آزمائش کے لیے دھات کا ایک ٹکڑا آنچ میں تپایا جاتا ہے۔ پھر پجاری لوہے کے اس گرم ٹکڑے کو گراہ کی روئی اور پتوں سے ڈھکی ہتھیلی پر سے گزارتا ہے خیال ہے کہ اگر وہ سچا ہے تو اس کی ہتھیلی جلے گی نہیں۔

میگھا لیہ کے لوگ



دوسری آزمائش چوکیلا سواہے۔ اس آزمائش میں اُبلتے ہوئے پانی والے کٹورے میں ایک انڈا ڈال دیا جاتا ہے۔ اور سچے شخص سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ کوئی زک اُٹھائے بغیر ہاتھ سے انڈے کو باہر نکال لے گا۔ پُرانے زمانے میں سچے شخص کی ایک پہچان یہ بھی تھی کہ رات کو اُسے جنگل میں ایک درخت سے باندھ دیا جاتا تھا اور صبح تک اگر کوئی چیتا پھاڑ نہیں کھاتا تو سمجھا جاتا تھا کہ وہ سچا ہے۔ یہ طریقہ آج بھی اپنایا جاتا ہے لیکن ایک بنیادی فرق کے ساتھ یعنی آدمی کی جگہ کسی بکری یا سور کو جنگل میں درخت سے باندھا جاتا ہے۔

ناگا قبائلیوں کی طرح گارو بھی چیتے کے دانت کو کاٹتے ہوئے حلف اٹھاتے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اگر وہ جھوٹ بول رہا ہے تو چیتا اُسے کھا جائے۔ چیتے کا کسی شخص کو کھا جانا آفت کے نزول کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ ایسے میں کنبے کے دوسرے افراد اور رشتے داروں کو چیتے سے محفوظ رکھنے کے لیے جانوروں اور پرندوں کی قربانیاں دینا ہوتی ہیں۔

گارو قبائلیوں کے مقابلے میں کھاسی زیادہ امن پسند ہوتے ہیں اور اخلاق، قانون اور ضابطے کا بڑا پاس لحاظ رکھتے ہیں۔ ان کے بعض قاعدے عہد قدیم کی شدت لیے ہوئے ہیں، اور شعور و احساس کو بے طرح جھنجھوڑتے ہیں۔ یہ شدت بھی غالباً اسی سبب سے ہے کہ کھاسی بڑے امن پسند واقع ہوئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ قانون شکنی کرنے والوں سے بڑی سختی سے پیش آتے ہیں۔ وہ جُرم کے اعادہ کو کسی طرح برداشت نہیں کرتے۔ قتل کی سزا میں قاتل کو اس بے دردی سے پیٹا جاتا تھا، کہ وہ بالآخر جاں بحق ہو جاتا تھا۔ بدچلنی کی سزا عمر قید یا گیارہ سو روپے اور ایک سور جُرمانہ ہوتی تھی۔ خاوند اپنی بیوی کو کسی دوسرے کے ساتھ ہم بستری کرتے ہوئے دیکھ لے تو وہ دونوں کو موت کے گھاٹ اُتار سکتا تھا اور اس پر بھی وہ قاتل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ شادی شدہ عورت کے اغوا کی سزا بھاری جرمانہ اور ایک سور کی ادائیگی ہوتی تھی۔ تدریج محرمات کی ممانعت کی خلاف ورزی کرنے والے کو برادری سے خارج کر دیا جاتا تھا اس طرح کہ بالآخر اُسے گاؤں چھوڑتے ہی بنتی تھی۔ آتش زنی کی سزا عمر قید یا دیس نکالا ہوتی تھی۔ لوگوں کو ارواح بد کا اسیر بنانے والے کو سزا کے طور پر، عمودی چٹان سے نیچے پھینک دیا جاتا تھا۔ چوری ڈاکے کی سزا میں مجرم کو جرمانہ مویشیوں کی صورت میں ادا کرنا ہوتا تھا یا مجرم کو بانسوں سے بنے ایک مچان پر بٹھا کر سرخ مرچوں کی ایک دھونی دی جاتی تھی۔ ایسی سزا کا نتیجہ سوچا تو جا سکتا ہے۔ شاید بیان نہیں کیا جا سکتا۔

جرم و سزا اور جھوٹ سچ کی آزمائش کے انوکھے طریقوں کی طرح، ان قبائلیوں کی وراثت، شادی اور طلاق کی رسومات بھی عجیب و غریب اور تاریخ کا کوئی پارینہ ورق لگتی ہیں۔ ان تینوں قبائل میں کنبہ چونکہ ماں پر مبنی یعنی ماں کا ہوتا ہے گویا تمام افراد کا سلسلۂ نسب ماں سے ملایا جاتا ہے۔ جنتیا قبائلیوں کے معاملے میں باپ کی صورت

عجیب اور انوکھی ہوتی ہے۔

گاروؤں میں شادی قبیلے کے اندر قطعی نہیں ہو سکتی۔ خاوند اور بیوی کا دو مختلف قبیلوں سے ہونا بے حد ضروری ہے۔ بچے ماں کے قبیلے میں شامل سمجھے جاتے ہیں۔ شادی کی تجویز ہمیشہ لڑکی والوں کی طرف سے ہوتی ہے اور عام طور پر لڑکی اپنے خاوند کا انتخاب خود آپ کرتی ہے۔ صرف ایک یا سب سے چھوٹی لڑکی پھوپھازاد یا چچازاد بھائی سے بیاہی جاتی ہے جو شادی کے بعد اپنی بیوی کے والدین کے پاس آ کر رہتا ہے۔ وہ اپنے سسر کا نوک رام یعنی ماں کے گھر میں باپ کے قبیلے کا نمائندہ بن جاتا ہے۔ یہاں تک تو شادی میں کچھ انوکھا پن نہیں لیکن یہ فی الواقع ایک عجیب رسم ہے۔ اس داماد کو اپنے سسر (جو اس کا چچا یا پھوپھا بھی ہوتا ہے) کے انتقال کے بعد اپنی بیوہ ساس سے شادی کرنا ہوتی ہے اس طرح وہ بیک وقت ماں اور بیٹی دونوں کا خاوند بن جاتا ہے۔ بات اس پر ختم نہیں ہوتی نوجوان خاوند اور بوڑھی بیوی سے اولاد کا ہونا بھی لازمی تصور کیا جاتا ہے۔ ادھر روشن خیال گارو قبائلی اس رسم کو تیزی سے ختم کر رہے ہیں۔

جن صورتوں میں نیک رام نہیں ہوتا ان میں بیوہ کو متوفی خاوند کے کنبے کی رضامندی کے بغیر دوبارہ شادی کی اجازت نہیں ہوتی۔ ایک مرد جتنی شادیاں چاہے کر سکتا ہے لیکن اگر اُسے دو بہنوں سے شادی کرنی ہو تو اُسے پہلے بڑی بہن سے شادی کرنی ہوگی۔ دوسری عورت سے شادی کرنے سے پہلے مرد کو اپنی پہلی بیوی سے اجازت حاصل



ایک کھاسی رقاصہ

کرنا ہوتی ہے۔ برعکس صورت میں اُسے پہلی بیوی کو معاوضہ ادا کرنا ہوتا ہے۔ پہلی بیوی جیک جونگ یعنی خاص بیوی اور دوسری بیویاں جیک گانٹس کہلاتی ہیں لیکن سماجی طور پر ان کا مرتبہ معمولی نہیں ہوتا۔ لیکن جب کوئی شخص اپنے چچا کی بیوہ سے شادی کرتا ہے تو وہ جیک مونگ بن جاتی ہے اور اگر کوئی بیوہ اپنے خاوند کے بھتیجے سے شادی کرنے سے انکار کرتی ہے۔ تو اُسے بھتیجے کو دالی یعنی معاوضہ ادا کرنا ہوتا ہے۔ شادی کی قیمت کا کوئی رواج گاروؤں میں نہیں جبکہ یہ رسم میزوؤں میں عام ہے۔

طلاق عام ہے اور بد چلنی وغیرہ کی بنیاد پر بڑی آسانی کے ساتھ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ مرد یا عورت بغیر کسی وجہ کے بھی طلاق حاصل کر سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں طلاق حاصل کرنے کے خواہشمند کو دوسرے فریق کو ایک رسمی معاوضہ ادا کرنا ہوتا ہے جو ساٹھ روپے ہوتے ہیں۔

جنتیا اور گارو قبائلیوں کی طرح کھاسیوں میں بھی کنبہ ماں کا ہوتا ہے اور وراثت کا حق بھی لڑکی ـــــ سب سے چھوٹی لڑکی کو پہونچتا ہے۔ کھاسیوں میں شادی کے بعد مرد اپنی بیوی کے گھر پر آکر رہتا ہے۔ گھر گرہستی کی ذمہ داری تین حصوں میں بٹی ہوتی ہے۔ گھر بھر کی ضروریات کے لئے خاوند کو کمانا ہوتا ہے۔ قبیلے کے امور کا انتظام چچا کرتا ہے اور گھریلو معاملے تمام تر بیوی کے انتظام و اختیار میں ہوتے ہیں۔ مرد شادی سے پہلے جو کچھ کماتا ہے ماں کو دیتا ہے اور شادی کے بعد اپنی تمام کمائی اپنے بچوں کو دیتا ہے۔ لیکن جنتیا قبائلیوں میں صورت بالکل مختلف و برعکس ہے۔ وہ جو کچھ کماتا ہے بیوی کو نہیں بلکہ اپنی ماں اور بہنوں کو دیتا ہے وہ زندگی میں ماں کے گھر کا فرد سمجھا جاتا ہے اور موت پر بھی اُسے بیوی کے رشتہ دار نہیں، اُس کے اپنے رشتے دار جلاتے اور اس کی ہڈیاں گھرانے کے برتن میں محفوظ کرتے ہیں۔

گارو اور کھاسی قبائلیوں کی طرح جنتیا قبائلیوں میں بھی شادی قبیلے سے باہر ہوتی ہے۔ بچے بھی ماں کا قبیلہ اختیار کرتے ہیں لیکن شادی کی تجویز ہمیشہ لڑکے والے کی طرف سے آتی ہے۔ لڑکا اپنے لئے بیوی خود پسند کرتا ہے۔ اس میں ماں باپ کی پسند کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ شادی کے بعد لڑکا گھر کے ایک فرد کی طرح بیوی کے گھر پر رہنے کو نہیں آتا۔ اُسے مہمان شبینہ کہنا مناسب ہوگا وہ سورج ڈوبنے کے بعد بیوی کے گھر آتا ہے واقعتاً وہ ٹھیک سے مہمان شبینہ بھی نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ اگلی صبح سورج نکلنے پر وہ کام طعام کے لئے اپنے کھیتوں اپنی ماں کے گھر کو روانہ ہوجاتا ہے۔ لیکن ادھر اس صورتِ حال میں تبدیلی واقع ہونے لگی ہے عیسائیت اختیار کرنے والے جنتیا قبائلیوں نے اس رسم کو قطعی خیرباد کہہ دیا ہے دوسرے بھی اس رسم کو دھیرے دھیرے ترک کر رہے ہیں۔ یہ بدلے ہوئے سماجی حالات کا نتیجہ ہے لیکن اس سے سماجی ڈھانچہ میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔

جرم و سزا، وراثت اور شادی کی عجیب و غریب رسموں کی طرح ان قبائلیوں کے مذہبی عقائد بھی عجیب و غریب ہیں۔ کھاسیوں کا عقیدہ ہے کہ ایک وقت ایسا بھی تھا جب خدا اور اس کے بندوں کے درمیان رابطہ براہِ راست تھا اور خدا انسان اور حیوان مکمل ہم آہنگی کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے وہ اس بات میں بھی یقین رکھتے ہیں کہ مذہب اُنہیں خدا نے عطا کیا ہے۔ اُن کے نزدیک دراصل یہ ایک طریقہ ہے جس کے ذریعے وہ خدا سے منقطع رشتے کو دوبارہ استوار کر سکتے ہیں۔ کھاسیوں کے مذہب میں مرغ کو بڑا مقام حاصل ہے کہتے ہیں کہ جب اس دھرتی پر گناہ حد سے زیادہ بڑھے تو سورج نہ نکلا۔ کسی کو اتنی جرأت نہ ہوئی کہ وہ خدا کے پاس جائے اور معاملے کی وضاحت کرے۔ بالآخر ایک پرندہ رونما ہوا۔ اُس نے اپنی خدمات پیش کیں اور خدا کے حضور میں حاضر ہوا۔ خدا نے پرندے سے خوش ہوکر اس کی دعا اور درخواست قبول کرلی۔ مرغ نے تین بار اذان دی اور سورج نکل آیا۔ اس پر مرغ کو شوخ رنگوں والے پر اور کلغی عطا ہوئی کھاسی آج بھی اس بات میں یقین رکھتے ہیں کہ اگر مرغ تین بار اذان نہیں دے گا تو سورج نہیں نکلے گا۔

کھاسیوں کے مذہب کے تعلق سے یہ بات بلا خوف تردید کی جاسکتی ہے کہ ان کا تمام تر نظریہ رسوم پسندی کا آئینہ ہے اور رسومات کی ادائیگی کا سلسلہ صبح آنکھ کھلنے اور پوپھٹنے سے شروع ہوتا ہے اور بستر میں جانے تک، مختلف اوقات میں مختلف صورتوں میں جاری رہتا ہے۔ تاہم یہ رسوم اور رسمیات کچھ پیچیدہ نہیں اور روزمرہ کے کھاسی معمولات میں شامل ہیں۔

جہاں تک گاروؤں کے مذہب کا تعلق ہے، اُن کی ایک خاصی معقول تعداد امریکی مشنریوں کی کوششوں سے عیسائی بن گئی ہے۔ تاہم ہندومت کی عام شکل ہی گاروؤں کا مذہب ہے۔ گارو متعدد دیوی دیوتاؤں کو مانتے ہیں۔ یہ دیوی دیوتا قدرت کے مختلف مظاہر بارش، بجلی، کڑک، ہوا، بھونچال وغیرہ سے متعلق ہیں سورج چاند اور ستارے موسموں کا پھیر بدل کرنے والے دیوتا سمجھے جاتے ہیں۔ گوئرا قوت کا دیوتا سوسائم۔ دولت کی دیوی، سَل گونگ زرخیزی کا اور چوراڈوبی فصلوں کا محافظ دیوتا ہے۔ ان دیوی دیوتاؤں کو مہربان کرنے کے لئے بکریوں اور مرغیوں وغیرہ کی قربانیاں دی جاتی ہیں۔

فصلوں کے محافظ اور زمین کی زرخیزی سے متعلق دیوتاؤں کے تذکرے سے یہ امر بھی مسلم ہوجاتا ہے کہ گارو، کھاسی اور جنتیا قبائلیوں کی طرح بنیادی طور پر زراعت پیشہ ہیں تاہم اُن کے زندگی کے دوسرے شعبوں کے طور طریقے کے ساتھ ساتھ زراعت کے طور طریقے مختلف اور قدرے انوکھے ہیں۔

گارو قبائل کا رشتہ دھرتی سے بہت گہرا ہوتا ہے۔ اس کے لئے زندگی کا کام دھرتی جوتنے سے شروع اور دھرتی جوتنے پر ختم ہوتا ہے وہ اپنی تمام تر قوت اسی پیشے پر صرف کر دیتا ہے آسام کے دوسرے پہاڑی قبائلیوں کی طرح وہ بھی کھیتی

عجیب تخریبی انداز سے کرتا ہے۔ ہر برس ایک سرسبز علاقہ گاؤں بھر کے لیے منتخب کرلیا جاتا ہے اس علاقے کے سارے درخت کاٹ گرائے جاتے ہیں پھران پیڑوں کو سوکھنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اور پھر سوکھے پیڑوں کو آگ لگادی جاتی ہے اور اس طرح سارا علاقہ کھیتی کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ ایک علاقہ میں کھیتی صرف ایک برس کی جاتی ہے۔ اگلے برس اس غرض سے دوسرا علاقہ چنا جاتا ہے۔ چونکہ ہر گاؤں کے پاس علاقہ بڑا محدود ہوتا ہے لہذا چند برس بعد اُس زمین میں کھیتی کی جاتی ہے جس میں کہ چند برس پہلے کی گئی ہوتی ہے اور ایک بار پھر اس علاقہ میں پیڑ پودوں کو نذر آتش کر دیا جاتا ہے۔

جینتیا کاشتکاروں کا معاملہ برعکس ہے۔ وہ جگہ بدل بدل کر نہیں بلکہ مستقل کھیتی کرتے ہیں۔ اُن کا سینچائی کا طریقہ بہت ڈھنگ کا ہے اور ایک ہُنرمندی کا مظہر ہے لیکن جہاں تک کھیتی باڑی کا تعلق ہے کوئی پہاڑی قبیلہ بھی کھاسیوں کی ہنرمندی کا جواب نہیں لا سکتا۔ ان کا طریقہ کاشت بڑا مفصل اور زمین کی پیداواری صلاحیت سے تطابقت رکھتا ہے۔ یہاں کی خاص فصلیں، چاول، مکئی، آلو، شکرقند، جوار، باجرہ کپاس وغیرہ ہیں۔ چاول ان قبائلیوں کی خاص خوراک ہے۔ دوسری خاص خوراک گوشت ہے اس ذیل میں گارو قبائلیوں کا کوئی جواب نہیں ــــ ایک چیتے کو چھوڑ کر وہ باقی سبھی چیزیں بکری، سور، بطخ، مرغ، کتا، بلی، سانپ، چھپکلی، چمگادڑ اور حد تو یہ ہے کہ اڑنے والی سفید چیونٹیاں تک کھا جاتے ہیں۔ ہاتھی کے گوشت کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے سوکھی مچھلی روزانہ کی خوراک ہے۔

دوسرے پہاڑی قبائلیوں کی طرح گارو شراب کے بے حد شوقین ہوتے ہیں۔ شراب کشید تو نہیں کی جاتی۔ البتہ چاول باجرے اور مکئی سے تیار اور روزانہ استعمال کی جاتی ہے۔ دِن تہواروں اور خاص خاص مواقع پر مذہبی رسومات کی ادائیگی کے وقت شراب کثرت سے پی جاتی ہے۔ منشیات کا رواج جینتیاؤں میں بھی عام ہے وہ افیون تو نہیں کھاتے لیکن جوار یا چاول سے کشید کی گئی شراب بڑی مقدار میں استعمال کرتے ہیں۔ تقریبات میں چاول سے تیار کی گئی بیئر کثرت سے پی جاتی ہے اور یوں بھی یہ روزانہ کی اشیائے خورد و نوش میں شامل ہے۔ جینتیا بچے، عورتیں اور مرد سپاری اور پان چبانے کے بڑے شوقین ہیں۔ اس ضمن میں یہ امر شاید دلچسپی کا باعث ہو کہ جینتیا فاصلے کی پیمائش سفر میں چبائی گئی سپاریوں کی تعداد سے کرتے ہیں۔


میگھالیہ کا ایک بازار

گو یہ قبائل ایک ہی ذیلی ریاست کے باشندے ہیں لیکن زندگی کے دوسرے شعبوں کے ساتھ ساتھ ان کی سماجی ثقافتی زندگی کے طور طریقوں میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ مثلاً گاروؤں میں شراب کے ساتھ رقص اور بھینس کے سینگ، بانسری اور ڈھول کا سنگت تمام مذہبی اور سماجی تقریبات کا جزو خاص ہے۔ مرد ہاتھوں میں تلوار اور ... لے کر رقص کرتے اور بیچ بیچ میں "کالی کالی" کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔ مرد اور عورتیں ... اور الگ الگ بھی رقص کرتے ہیں۔ ناگا اور لوشائی قبائلیوں کے رقصوں کی بہ نسبت ... قبائلیوں کے رقص بے تمک ہوتے ہیں۔ بجز شراب نوشی و رقص انہیں اجتماعی تفریح کا کوئی سامان میسر نہیں۔ کھیل بالعموم جسمانی طاقت کے مظاہرے کے لیے ہوتے ہیں ان میں کسی مہارت یا ہنرمندی کی گنجائش نہیں ہوتی شکار اور مچھلی کا شکار گارو... دل پسند مشغلے ہیں لیکن حیرت ہے کہ شکار ہتھیار سے نہیں کھیلا جاتا۔ یہ طریقہ بس خود شکاریوں کے لیے جان کا خطرہ پیدا کر دیتا ہے۔ مچھلی کے شکار کے لیے بھی گ... مروج طریقے نہیں اپناتے۔ وہ بانس کے نیزوں سے ہی مچھلی کا شکار کھیلتے ہیں

گاروؤں کے برعکس کھاسیوں کی سماجی ثقافتی زندگی زیادہ رنگین اور دل... ہے۔ وہ گھر کی چار دیواری سے باہر کی زندگی کے بڑے شیدائی اور دلدادہ ہوتے ہیں۔ شکار، مچھلی کا شکار اور تیر اندازی اُن کے محبوب مشاغل ہیں۔ تیر کمان اُن کے ہتھیار ہیں اور وہ ان کے استعمال میں بے مثل مہارت بھی رکھتے ہیں۔ ایسی مہارت اور شغف وہ رقص اور سنگیت میں رکھتے ہیں۔ کھاسی لڑکیاں ہاتھوں ...



کپڑے اور سونے کے زیور پہنے ہوئے، سبک اور تیز قدموں سے موسیقی کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر رقص کرتی ہیں۔ مرد بھی گہرے شوخ کپڑوں میں خاندانی تلواروں سے آراستہ ہاتھوں کو حلقے میں لئے ہوئے رقص کرتے ہیں اور رقص و رنگ کا ایک عجیب رُوپ پیش کرتے ہیں۔

کھاسیوں کی طرح جینتیا بھی بڑے خوش باش ہوتے ہیں۔ وہ کھیل تفریح ہنسی مذاق اور خوش فعلیوں کے بڑے دل دادہ ہوتے ہیں۔ شکار اور مچھلی کا شکار اور کشتی اُن کے محبوب تفریحی مشاغل ہیں۔ ان کا سب سے اہم مقبول ورنگین تہوار، بہیہ دین کھلم ہے۔ یہ ماہ جولائی میں جوائی اور نواحی دیہات میں منایا جاتا ہے۔ اس میں صرف مرد رقص کرتے ہیں۔ اس رقص کو مغرب کے رقصوں راک اینڈ رول اور ٹوئسٹ کی ابتدائی شکل کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ناچنے والے ڈھول اور بے کے سنگیت سے ہم آہنگ ہو کر سروں اور پیروں کو حرکت دیتے ہیں۔ ہفتہ بھر دھوم دھام سے منائے جانے والے اس تہوار کی آخری رسوم بھی مرد ہی ادا کرتے ہیں۔ جنوبی ہند کے تہوار رتھ یاترا سے مشابہ اس تہوار پر عورتوں اور بچوں کی خوش پوشی وجامہ زیبی دیدنی ہوتی ہے

مختصراً میگھالیہ کی دھرتی نئے اور پرانے کے عجیب وغریب امتزاج کی آئینہ دار ہے۔ اس دھرتی کے لوگ، ملک کے دوسرے حصوں کے عوام کی طرح مختلف اور گوناگوں رنگوں میں رنگے ہوئے ہونے کے باوجود یک رنگی کا ایک عجیب نقش لئے ہوئے ہیں۔ ابتداً ضلع کونسلوں اور اب میگھالیہ کی ذیلی ریاست کے قیام سے ان قبائلیوں کے لئے ایک نئی زندگی کا باب وا ہوا ہے، ترقی کی راہیں کھلی ہیں اور آج وہ قومی زندگی میں برابر کے شریک اور ملک کے دیگر عوام کے ہم دوش وہم رکاب ہیں۔

●●

# وقت کا تقاضہ ہے

## اعجاز فاطمہ

وقت کا تقاضا ہے آج اے خرد مندو!
زیست کے گلستاں میں حسن ہو، تبسّم ہو
نُور ہو، اُجالا ہو، کیف ہو، مسرّت ہو
نغمگی ہو، راحت ہو، جاوداں ہو شادابی
اور حُسن و شادابی
زیست کے گلستاں میں
راحتوں کے آنگن میں
مختصر سی خوشیاں ہیں

مختصر سی یہ خوشیاں
مختصر سا کنبہ ہے
جو سکونِ لافانی
اور تصورِ دلکش
آج اے خرد مندو! وقت کا تقاضا ہے
مت بڑھاؤ کنبے کو
دو یا تین ہی بچے زیست ہی کا مقصد ہیں
نور ہیں، اُجالا ہیں، کیف ہیں، مسرت ہیں
حُسن ہیں تبسم، نغمگی ہیں، راحت ہیں
وقت کا تقاضا ہے آج اے خرد مندو!
زیست کے گلستاں میں، حُسن ہو تبسم ہو

نئی کتابیں

# اُردو افسانہ
# کل آج اور کل

**دیویندر اسر**

کسی فن پارے کی تخلیق کیسے اور کیوں کر عمل میں آتی ہے ؟ اس کے بارے میں ماہرینِ نفسیات اور سماجیات اور اہلِ علم و دانش کئی بار اپنی رائے کا اظہار کر چکے ہیں لیکن کسی ایک نظریئے کو مکمل طور پر حتمیت کے ساتھ صحیح قرار دینا تخلیقی عمل کی پیچیدگیوں کو نظر انداز کرنا ہے۔ ادبی تنقید میں بارہا ایسا دیکھا گیا ہے کہ ادبی مسائل کو سہل پسندی کا شکار بنا کر انہیں چند سکّہ بند فارمولوں میں بند کر دینے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ کسی افسانے کی قدر متعین کرتے ہوئے جب کوئی تخلیقی افسانہ نگار اس کے بارے میں یقینی طور پر کوئی فیصلہ صادر کرتا ہے تو تعجب ہوتا ہے کیونکہ افسانہ نگار میں اگر تخلیقی صلاحیت موجود ہے اور اس کا احساس و تجربہ مستند ہے تو وہ اپنے افسانے یا اپنے تخلیقی عمل کے بابت ہی کچھ کہہ سکتا ہے ضروری نہیں کہ اس کی رائے دوسرے افسانوں کے بارے میں بھی صحیح ہو اس لیے جب کوئی نقاد کسی افسانہ نگار یا عام طور پر مختلف افسانہ نگاروں سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ایک مخصوص طرز کے افسانے کیوں نہیں لکھتے تو ظاہر ہے کہ وہ تخلیقی عمل کے اصولوں کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔

افسانہ کسی بھی موضوع پر لکھا جا سکتا ہے۔ کسی افسانہ میں سیاسی مسائل کے حل کی تلاش ملتی ہے یا اس کا کوئی مخصوص حل پیش کیا جاتا ہے اور کوئی سماجی پہلو کو اُجاگر کرتا ہے۔ کسی کے لیے معاشی بحران زیادہ اہم ہے تو کسی کے لئے اخلاقی یا اصلاحی نقطۂ نظر۔ کوئی من کی دنیا میں ڈوبا ہوا ہے تو کوئی لاشعور کی گتھیوں کو سلجھانا چاہتا ہے، کوئی حسن کا پجاری ہے تو کوئی انقلاب کا نقیب —— لیکن افسانوی ادب کو اس طرح مختلف خانوں میں تقسیم کرنا ادب کو چند بندھے ٹکے فارمولوں میں تبدیل کرنا ہے۔ بنیادی بات تو یہ ہے کہ ہر افسانے کا محور "انسان" ہوتا ہے جس کے گرد ساری زندگی گھومتی ہے۔ افسانے کا یہ انسان ہی ہے جو سیاسی اور معاشی زندگی بسر کرتا ہے۔ ضمیر کی چبھن محسوس کرتا ہے یا اس کا گلا گھونٹتا ہے۔ لاشعور کا غلام بن کر عمل کرتا ہے یا شعوری طور پر کوئی قدم اُٹھاتا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ زندگی کے بارے میں اس کا تمام تر رویہ غیر استدلالی ( Arational ) یا غیر اخلاقی یا غیر معمولی (Abnormal) ہو ——

اس پس منظر میں ماہنامہ "کتاب" لکھنؤ کے دو جلدوں پر مشتمل افسانہ نمبر کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس نمبر میں افسانوں، ڈراموں، ناولٹ، طنزیہ و مزاحیہ مضامین اور افسانوی ادب پر مقالوں کے علاوہ اُردو افسانے پر تین سمپوزیم بھی شامل ہیں جو اُردو افسانے کے مختلف پہلوؤں پر غور و فکر کے لیے مفید مواد فراہم کرتے ہیں۔ پہلے سمپوزیم میں —— اُردو افسانہ کل آج اور کل" میں حصہ لینے والے صرف نقاد اور افسانہ نگار ہیں۔ دوسرے سمپوزیم میں افسانوی ادب پر ایک مذاکرہ شامل ہے جس میں مراٹھی اور اُردو کے چند افسانہ نگاروں اور نقادوں نے شرکت کی ہے۔ تیسرے سمپوزیم میں اُردو افسانے کے چند مسائل پر اشاعتی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے جس میں قاری افسانہ نگار اور ناشر نے حصہ لیا ہے۔ ان کے علاوہ افسانوی ادب سے متعلق چند فکر انگیز مقالے بھی شامل ہیں۔ اس نمبر کے مطالعہ سے اُردو افسانے کی "کرشن چندر سے لے کر حمید سہروردی تک پوری تین نسلیں پیش میں آجاتی

ہیں۔ یہ افسانہ دراصل ان تینوں نسلوں کی بھی کہانی ہے کہ انہوں نے کن کن زاویوں سے تہذیب، حقیقت اور افسانہ کو دیکھا ہے۔" (پہلا صفحہ)

ان افسانوں کا مطالعہ اور سمپوزیم میں پیش کیے گئے نکات اور مقالوں میں زیرِ بحث اٹھائے گئے خیالات دراصل حقیقت اور افسانے کے باہمی رشتے پر نہ صرف ایک جامع بحث کو پیش کرتے ہیں بلکہ دعوتِ فکر بھی دیتے ہیں۔ بنیادی مسئلہ تو یہ ہے کہ جب ہر افسانہ نگار یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اپنے دور کی حقیقت کی ترجمانی کر رہا ہے تو پھر یہ سوال اٹھتا ہے کہ ان کے افسانے ایک دوسرے کے افسانوں سے مختلف کیوں ہوتے ہیں کیا یہ فرق محض تکنیک اور اسلوبِ بیان کا ہے؟ یا وہ حقیقت کے ادراک اور زندگی کے شعور میں ایک دوسرے سے الگ ہیں جو افسانہ نگار ادب کے جمالیاتی پہلو پر زیادہ زور دیتا ہے وہ بھی اس امر سے انکار نہیں کر سکتا کہ اس کے افسانے بھی زندگی کی حقیقت کے کسی پہلو کو کسی نہ کسی انداز سے پیش کرتے ہیں۔ ادب برائے ادب یا برائے حسن کے نظریئے میں بھی حقیقت کی عکاسی شامل ہے۔ بظاہر وہ زندگی سے فرار کر کے رومان کی تخلیق کرتے ہیں اور افسانے کو طلسماتی فضا اور الفاظ کی شعبدہ بازی اور مینا کاری اور رومان پرستی کے حربے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

ادب کے اس معذور نظریئے کے خلاف پریم چند نے بغاوت کی تھی اور افسانے کو زندگی کی دھڑکنوں کے قریب لا کھڑا کیا۔ پریم چند نے افسانے کو نہ صرف سماجی زندگی سے گہرے طور پر منسلک کر دیا بلکہ اس میں آدرشوں کی تکمیل کی خواہش بھی شامل کر دی۔ اردو میں نئے افسانے کی تحریک صحیح معنی میں پریم چند کے افسانوں سے ہی شروع ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شروع شروع میں پریم چند کے افسانوں میں مقصدیت اور داستانی رنگ غالب رہا لیکن جلد ہی انہوں نے زندگی کی حقیقت کو ہم عصر ماحول سے اخذ کر کے اسے فنی مہارت سے پیش کرنا شروع کر دیا۔ ہندوستان کی قومی تحریک نے جس نئے سماجی شعور اور ذہن کی پرورش کی پریم چند نے اُسے اپنے افسانوں کی شکل میں ڈھال دیا۔ علی عباس حسینی، سدرشن، اوپندر ناتھ اشک سہیل عظیم آبادی وغیرہ پریم چند کی اس روایت کو لے کر آگے بڑھے۔ اس دور میں مقصدی اور اصلاحی افسانوں کے علاوہ رومانیت کے پروردہ ادب کو بھی جگہ ملی جسے سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، ل احمد اکبر آبادی، مجنوں گورکھپوری اور امتیاز علی تاج نے پروان چڑھایا۔

یہ تھی وہ ذہنی فضا جس میں نئے ادب کے رجحان کو تقویت ملی۔ اس نئے ادب کو ترقی پسند ادب کے نام سے موسوم کیا گیا۔ آدرش، حقیقت نگاری، رومانیت اور فن کا جمالیاتی احساس آپس میں خلط ملط بھی ہوئے۔ کرشن چندر، حیات اللہ انصاری احمد ندیم قاسمی، بلونت سنگھ کے افسانوں میں حقیقت اور رومان کے امتزاج کو بخوبی پیش کیا گیا ہے۔ غلام عباس نے اپنے مشہور افسانہ آنندی میں اس احساس کو اجتماعی سطح پر لا کر ایک ایسی فینٹیسی کو جنم دیا جو حقیقت سے بھی زیادہ حقیقی ہے لیکن انگارے کی اشاعت نے سماجی ناہمواری، معاشی عدم مساوات اور جنسی گھٹن سے پروردہ زندگی کے مسائل کو کچھ اس انداز سے پیش کیا کہ اردو افسانہ جیسے ایک دم خواب سے چونک اٹھا۔ بغاوت و تخریب کا شور اٹھا ادب برائے انقلاب کا نعرہ بلند ہوا جس میں اختر حسین رائے پوری کی تحریروں اور افسانوں نے اہم رول ادا کیا۔ یہی وہ دور تھا جب مارکس اور فرائیڈ کے نظریات نے ادیبوں کے ذہن میں جگہ بنالی۔ مارکسیت کے زیرِ اثر سماجی حقیقت نگاری کو افسانے میں پیش کیا گیا اور ادب میں تبلیغی جذبہ زیادہ نمایاں ہونے لگا۔ ان افسانوں میں سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل کی تفصیلات اور جزئیات نگاری پر زیادہ زور دیا گیا۔ افسانوں میں ایسے کردار ملنے لگے جو زندگی میں جدوجہد کرتے ہیں۔ ایک خوش آئندہ مستقبل کی خواہش اور اس کے لئے مجاہدانہ جذبہ کی فراوانی ان افسانوں کا خاصہ بن گئی۔ کردار انسان کی خوبیوں اور کمیوں کا مجسمہ نہیں بلکہ آدرش کا پیکر بن گیا۔ پروپیگنڈہ، لفاظی، نعرے بازی اور غیر ضروری تفصیلات کی حامل ان کہانیوں میں عام طور پر محاسن اور تخلیقی اشاریت کا فقدان تھا دراصل افسانہ سیاست، سماج یا معاشی تنظیم کے بارے میں نہیں لکھا جاتا بلکہ اس کا مرکزی موضوع ہوتا ہے فرد۔ فرد جو کبھی اکیلا ہوتا ہے اور کبھی دوسرے لوگوں کے ساتھ گروہ میں۔ فرد ہی اس خارجی دنیا سے متاثر ہوتا ہے اور خارجی دنیا کو متاثر کرتا ہے اس متاثر ہونے یا متاثر کرنے کے فرق پر ہی شاید ترقی پسند افسانے اور جدید افسانے کی تقسیم کو سمجھا جا سکتا ہے۔ فرد اگر متاثر ہی ہوتا ہے اور متاثر نہیں کرتا تو وہ دبائے عام میں مرتا ہے لیکن اگر وہ محض متاثر کرنا چاہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ متاثر نہیں ہو رہا تو وہ شہید کا رتبہ پا سکتا ہے۔ سچی ٹریجیڈی بھی ان دونوں کی کشمکش میں جنم لیتی ہے۔ اب یہ ساری کیفیت اتنی مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے کہ اسے لغو اور لایعنی قرار دیا جانے لگا۔

فرائیڈ کے نظریات اس لغو اور لایعنی کیفیت کو مزید تقویت بخشتے ہیں ان نظریات کے تحت افسانے میں جنسی اور لاشعوری حقیقت کو پیش کیا گیا۔ عصمت چغتائی نے مسلم معاشرہ میں جنسی گھٹن اور کجروی کو مخصوص منفرد انداز میں پیش کیا، اس روایت کو ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، جیلانی بانو اور واجدہ تبسم نے آگے بڑھایا۔ حسن عسکری جو فرانسیسی فطرت نگار اور بعد میں سمبالسٹ ادب سے متاثر ہوئے، لاشعور کی اس گہری دنیا کے عکاس ہیں۔ عصمت چغتائی بعد میں ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر سماجی حقیقت نگاری پر زیادہ زور دینے لگیں۔ ممتاز مفتی نے لاشعوری حرکات کا مطالعہ اور تجزیہ نفسیاتی اور علمی نقطۂ نظر سے پیش کیا۔ ان کے افسانے میں کوائفِ مرض کی صورت زیادہ نمایاں ہے۔

لیکن منٹو ہی وہ تنہا افسانہ نگار تھا جس نے افسانے میں ایک جاندار اور منفرد طرز کی بنا ڈالی اور سماجی و معاشی اور جنسی مسائل کو ایک ایسی اکائی کے روپ میں پیش کیا

جس کی تفسیر فرائیڈ اور مارکس کے نظریات کی اصطلاحات میں نہیں کی جا سکتی۔ منٹو محض ایک روایت شکن ادیب ہی نہیں تھا بلکہ اس کی تحریریں گہرے انسانی جذبات اور خیر و شر میں جانبدارانہ مداخلت کی حامل تھیں۔ فرائیڈ کے نظریے کے زیر اثر تکنیک کے نئے نئے تجربے ہوئے، حسن عسکری، احمد علی، قرۃ العین حیدر اور کسی حد تک عزیز احمد نے تحلیل نفسی خواب، شعور کے بہاؤ، آزاد تلازمہ خیال، لاشعوری محرکات کے ملکب سُرریلسٹ طرز کے افسانے لکھے۔ جدید افسانہ کافکا سے متاثر ہے لیکن اس دور میں بھی احمد علی کے افسانوں میں کافکائی ماحول کی تصویر کشی ملتی ہے۔ اُن کے افسانوں میں فلسفیانہ گہرائی، گہری رمزیت، اساطیر سے حقیقت کی عکاسی، مشرقی مزاج اور مغربی اسلوب خصوصیت رکھتے ہیں۔ درحقیقت جدید افسانہ احمد علی کے افسانوی ورثے سے انکار نہیں کر سکتا۔ ایک اور افسانہ نگار جس نے شعور کے بہاؤ کی تکنیک میں اور برگساں کے تصورات سے متاثر ہو کر حیات و کائنات اور انسانی تہذیب و معاشرے کا فلسفیانہ شعور پیش کیا ہے وہ ہے قرۃ العین حیدر۔

افسانہ نگاروں کی دوسری نسل اس پہلی نسل کے افسانہ نگاروں کی روایت کو ہی لے کر آگے بڑھی۔ یہ نسل دو نسلوں کی درمیانی کڑی ہے۔ انور عظیم، رام لعل، اشفاق احمد، غیاث احمد گدی وغیرہ میں ترقی پسند روایات کی پختگی اور انحطاط اور جدیدیت کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں۔ آزادی کے بعد جو نئی نسل سامنے آئی اور تقسیم وطن اور فسادات کے ہنگاموں سے اُبھر کر نکلی اس کے لئے ترقی پسند تحریک بے معنی ہی نہیں بلکہ سدِّ راہ ثابت ہوئی۔ ترقی پسند تحریک لبرل انسانیت پرست عناصر سے عاری ہو کر شعوری طور پر اشتمالی سیاست کی روز مرہ بدلتی ہوئی پالیسی کی غلام ہو گئی۔ اس کا فائدہ ان لوگوں نے اٹھایا جو ادب کو ہر قسم کی Comml tment کے خلاف خالصتاً جمالیاتی تخلیق سمجھتے ہیں۔ ان کا نعرہ تھا کہ ادب طاق الغربا نہیں۔ ازالہ سحر کے بعد ادیب کئی گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ اشتمالیت کے دشمن، انسانیت پرستی کے لبرل علمبردار اور فن برائے فن کے پیرو کار۔ جدید افسانہ نگاروں میں آخری رجحان زیادہ تر نمایاں ہوا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سیاست سے کنارہ کش ہو کر ہر قسم کے سیاسی خیال کے لئے غیر جانبدار ہو گیا۔ اس لئے آمریت یا جمہوریت، اشتمالیت یا فسطائیت بے معنی اصطلاحیں ہیں۔ جدیدیت کے نام پر زندگی کی لغویت، فرد کی تنہائی، دہشت، ذات کی تلاش، یا لم شدگی اور اقدار کے بحران کو افسانوں کا موضوع بنایا گیا اور اس کا انجام یہ ہوا کہ جدید افسانہ نگار کہنے لگے کہ ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں کہ کسی ادیب کا سیاسی نظریہ کیا ہے؟ وہ فرقہ پرست ہے یا قوم پرست، اشتمالی نظریئے کا حامی ہے یا فسطائیت کا یا جمہوریت کا علمبردار۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس کے افسانوں میں ادبیت موجود ہے یا نہیں۔ اس نظریے کا بنیادی تقاضا ہے کہ یہ موضوع اور مواد اور فارم اور اسلوب کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کر دیتے ہیں حالانکہ ان کا کہنا ہے کہ ہیئت اور مواد کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا) سوال اٹھتا ہے کہ کیا موضوع اور مواد کا تعلق محض ادبیت سے ہے زندگی کے گوناگوں پہلوؤں اور اس کی حقیقت سے نہیں۔ اگر زندگی کے کسی بھی پہلو کو لیا جائے اس کو سماجی، سیاسی یا معاشی ماحول سے الگ کر کے محض تجربہ کیا جا سکتا ہے؟ کیا انسان کی نفسیات پر اس ماحول اور خارجی حقائق کا اثر نہیں پڑتا؟ کیا یہ محض ہیئت یا اسلوب کا ہی مسئلہ ہے۔ دراصل ایسی جدیدیت ادب برائے ادب کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ یہی باعث ہے کہ جو ادیب اس نوع کی جدیدیت کے نام پر افسانوں کی تخلیق کرتے ہیں وہ ابہام کا حسن کاری اور ایسی علامت پسندی کا شکار ہو جاتے ہیں جو حقیقت کو آشکار کرنے کے بجائے اس کی پردہ داری کرنے کا باعث بنتی ہے۔ چند جدید افسانے جنہیں علامتی افسانے قرار دیا گیا ہے، احمد علی کی نہیں سجاد حیدر یلدرم کی یاد دلاتے ہیں۔ دیویندر ستیارتھی کے حالیہ افسانے، مہندر پرکاش کا افسانہ "تلقارمس" اسی نوعیت کے حامل ہیں۔ اس کے برعکس بلراج مین را کی رمزیت میں خارجی زندگی کی حقیقت کے تہہ در تہہ پہلوؤں کو پیش کرنے کی کوشش ملتی ہے۔

آج اُردو افسانہ انگریزی کے ایک محاورے کے مطابق پورا دائرہ گھوم گیا ہے یعنی جس حسن پرستی اور طلسماتی حظ اور رومانیت کے خلاف افسانے نے جہاد کیا تھا آج افسانہ اسی رُومانیت، حُسن پرستی اور ہیئت نگاری اور طلسماتی ماحول کو رمزیت اور تجریدیت کے نام پر پیش کر رہا ہے اور افسانے میں تجریدیت کے رجحان کا ذکر بھی بہت سے افسانہ نگاروں نے کتاب میں شامل سمپوزیم میں کیا ہے۔ کم از کم میری نظر میں اُردو میں کوئی ایسا افسانہ نہیں گزرا جو تجریدی ہو۔

۱۹۵۵ء کے آس پاس اُردو افسانے میں جو تبدیلیاں رُونما ہوئیں وہ نئے فکر و احساس کی ترجمانی کرتی ہیں لیکن ان افسانوں میں ترقی پسند فکر کی کٹر پرستی سے انحراف ہی نہیں بلکہ ایک معنی میں مراجعت بھی ہے۔ کچھ افسانہ نگار رجعت پرستوں اور گوشہ نشینوں کی زبان میں زندگی کی حقیقت سے فرار کرنے کے لئے تاویلیں پیش کرنے لگے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہمارے پاس سوال ہیں، جواب نہیں لیکن یہ صحیح نہیں۔ ان کے پاس جواب ہیں وہ بخوبی سمجھتے ہیں کہ آمریت، خونریزی، جنگ، فرقہ وارانہ فسادات، اجارہ داری، سرمایہ پرستی، نفع خوری، کالا بازار وغیرہ انسان کی بہت سی پریشانیوں، ذلتوں اور دکھوں کا باعث ہیں۔ کیونکہ وہ ان مسائل کا سامنا نہیں کرنا چاہتے حالانکہ وہ اپنے مقالوں میں جدید دور میں ٹکنالوجی اور منظم اداروں کے مضر اثرات کا بار بار ذکر کرتے ہیں جس کے باعث انسان "انسانیت" کے حقائق سے عاری ہو رہا ہے لیکن جب وہ کسی افسانے کی تخلیق کرتے ہیں یہ سب کچھ ان میں غائب ہو جاتا ہے۔ اور رہ جاتی ہے ذات کی تلاش۔ اس سے وہ سوال کرتے ہیں اور جواب سے کتراتے ہیں۔ ہر انقلاب آمریت کو جنم دیتا ہے۔

ہیں ... برداشت کرتے ہیں تو یہ نہیں کہ آمریت کے خلاف بغاوت آنا ہو جائے اسی لئے ... نہ کرنے دو ... ہو جاؤ شک سے قبول نہ کرو لیکن یہ سارے مسائل غیر ادبی ہیں۔ محض بیانیہ فن کی یہ بدترین صورت ہے جنس غیر ادبی مسئلہ نہیں، دہشت ... غیر ادبی نہیں۔ ذات کی تلاش غیر ادبی نہیں۔ اگر غیر ادبی ہے تو بھوک، قحط، جنگ ... یا انقلاب۔ افسانے کی تخلیق میں سماجیات، نفسیات، تاریخ، سائنس، فلسفہ ... سب سے استفادہ کیا جا سکتا ہے خالص ادبی افسانہ کوئی چیز نہیں ہوتی جو افسانہ نگار یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ خالص ادبی افسانے کی تخلیق کرتا ہے۔ وہ کسی ایک افسانے کا نام بھی گنوائے جو خالصتاً ادبی ہو اور جس کی پرکھ خالصتاً ادبی اصولوں پر ہی ہو سکی ہے (دیکھئے یہ خالص ادبی اصول کیا ہوتے ہیں۔)

ان تمام خامیوں کے باوجود نئے افسانہ نگاروں نے گزشتہ پندرہ برسوں میں اردو افسانے کو نئی وسعت دی ہے۔ فنی طور پر ان میں پختگی آئی ہے اور پختگی کا احساس بھی ملتا ہے۔ انہوں نے فطرت پرست نقطۂ نظر کے خلاف شخصیت کے پیچیدہ اور پوشیدہ عناصر کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے افسانوں میں انفرادی احساسات اور نفسیاتی ردِ عمل کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ کردار نگاری میں بھی گہرائی ملتی ہے۔ جدید افسانے میں سب سے زیادہ نمایاں رجحان علامت نگاری کا ہے۔ کتاب کے زیر نظر شمارے میں شامل شہزاد منظر نے اپنے مضمون " افسانے میں رمز و علامت کا استعمال " میں اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس موضوع پر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ایک اہم مضمون پیش کر چکے ہیں جس کا حوالہ زیر تبصرہ مضمون میں بھی دیا گیا ہے۔ شہزاد منظر رقم طراز ہیں "یہ سمجھنا غلط ہے کہ افسانے میں رمز نگاری آج کا مقبول رجحان یا ادبی خصوصیت ہے حقیقت یہ ہے کہ برصغیر کی آزادی سے بہت قبل کئی افسانہ نگاروں نے علامتی افسانے لکھنے کی ناکام کوشش کی ہے بعض لوگوں کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ ان افسانہ نگاروں میں احمد علی کے بعد ہی کرشن چندر کا نام آتا ہے۔ کرشن چندر اردو کا سب سے بڑا تجربہ پسند افسانہ نگار ہے جس نے مغرب کے مختلف ادبی رجحانات کا غائر مطالعہ کیا ہے اور اپنے مختلف ادوار میں ان سے متاثر ہو کر افسانے بھی لکھے ہیں لیکن وہ کسی ایک مقام پر کسی ایک رجحان سے متاثر ہو کر زیادہ دیر تک ٹھہرا نہیں ہے اس کا ادبی اور فنی سفر اور شعوری ارتقا جاری رہا ہے۔ ... ان کے لئے کوئی نیا ٹکنیک یا کسی اور طرح کا تجربہ کرنا کھیل سا ہو گیا تھا۔ انہوں نے ایک سرئیلی تصویر بھی کھینچی تھی اور ایک افسانے میں الفاظ کو بدل کر "نئی زبان بنانے" کا اصولی تجربہ بھی کیا تھا صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اینٹی پلاٹ کے عارضی تصور کے تحت افسانے بغیر مقصد، بغیر پلاٹ اور کلائمکس کے بغیر" لکھے سائے ہیں" جیسے افسانے لکھے ہیں "اتفاقیہ" " بت جاگتے ہیں" " پانی کا درخت" جیسے تمثیلی و علامتی افسانے بھی۔ ان افسانوں میں ... جیسی قدرت تاثر بھی موجود ہے جس نے افسانے کے فارم اور ٹکنیک میں نئے اور نو کے تجربے ضرور کئے لیکن ان کا تجربہ محض تجربہ نہیں تھا۔ انہوں نے اگر اپنے افسانوں کے فارم اور ٹکنیک میں کوئی تجربہ کیا بھی تو صرف اپنے مافی الضمیر اور موضوع کے فن کارانہ اور موثر اظہار کے لئے جدید افسانہ نگاروں کی طرح صرف قارئین کو چونکانے کے لئے چونکانے کی غرض سے نہیں۔"

علامتی افسانوں کے ضمن میں ایک اور بات قابل ذکر ہے کہ صرف علامتی افسانہ ہی جدید افسانہ نہیں، دوسرے یہ کہ علامتی افسانے صرف آج کی ہی ادبی خصوصیت نہیں۔ اس سے قبل کرشن چندر کے علاوہ احمد علی "قید خانہ" "ہمارا کمرہ" اور "موت سے پہلے" اور ممتاز شیریں "میگھ ملہار" جیسے اعلیٰ افسانوں کی تخلیق کر چکے ہیں۔ جدید دور میں انتظار حسین اور سجاد اور بلراج کومل اور کمار پاشی نے معنی خیز علامتی افسانوں میں قابل قدر اضافے کئے ہیں۔ میں بلراج کومل کی اس رائے سے متفق ہوں کہ "افسانہ بہرحال افسانہ ہوتا ہے۔ تجریدی یا تمثیلی یا علامتی محض الفاظ ہیں۔ ان کے استعمال سے کسی افسانے کا کردار تخلیقی سطح پر بلند نہیں ہو سکتا۔ اردو کے اکثر نئے ادیب محض الفاظ کے اسیر ہیں۔ ہر اچھا افسانہ انسانی تجربے کے کسی ایک پہلو کا عزیز ترین گوشہ پیش کرتا ہے اور پڑھنے والا اس عزیز ترین گوشے کو پہچاننے کے بعد افسانے کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ تجریدی اور علامتی محض فیشن ساز تنقید کے Catch Words ہیں۔"

(سمپوزیم میں سے)

"کتاب" کے افسانہ نمبر میں افسانے سے متعلق کچھ دیگر مسائل پر بھی بحث کی گئی ہے۔ کیا اردو کا موجودہ عہد مختصر افسانہ کا عہد ہے؟ مختصر افسانہ رسالوں میں اس قدر مقبول کیوں ہے؟ مختصر افسانہ کی اس قدر مقبولیت کے باوجود افسانوی مجموعے کم تعداد میں کیوں شائع ہوتے ہیں؟ افسانوی ادب سے دلچسپی رکھنے کے باوجود لوگ افسانوی مجموعے کیوں نہیں خریدتے؟ اس دور کو مختصر افسانے کا دور کہا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود افسانوی مجموعے پہلے کے مقابلے میں کم تعداد میں شائع ہوتے ہیں اور جو شائع بھی ہوتے ہیں وہ زیادہ تر پبلشروں کی الماریوں کی زینت بنے رہتے ہیں۔ اس صورت حال کے لئے کیا ناشر ذمہ دار ہے یا قاری یا آج کے افسانہ کی وہ کیفیت جس میں قاری اپنے دل کی بات کم اور مصنف کا 'ہیں' زیادہ نظر آتا ہے۔

یہ سوالات بڑے اہم ہیں۔ درحقیقت ان کا تعلق محض تجارتی پہلو سے نہیں بلکہ تخلیقی پہلو سے بھی ہے۔ اقدار کے خلاء میں زندگی کی حقیقتوں سے کنارہ کش ہو کر کوئی بھی افسانہ زندہ نہیں رہ سکتا اور قارئین اس سے اپنی ذہنی وابستگی قائم نہیں کر سکتے۔ سوال صرف ابلاغ تک محدود نہیں بلکہ بنیادی طور پر اقدار کی تلاش اور فلسفۂ حیات سے متعلق ہے۔ زندگی کتنی بھی لغو اور لایعنی کیوں نہ ہو پھر بھی اہم ہے کیونکہ وہ زندگی ہے اور اس میں معنویت کی تلاش تخلیقی عمل کا ایک اہم فریضہ ہے۔ افسانہ نگار کا فریضہ محض تجربات اور احساسات میں گہرائی اور بصیرت عطا کرنا ہی نہیں بلکہ ان کی اہمیت اور معنویت کے دائرے میں اقدار حیات کو تلاش کرنا اور زندگی سے وابستگی قائم کرنا ہے کیونکہ انسان سے پرے اور ماورا کسی افسانے کی تخلیق کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی ایسا افسانہ تخلیق بھی ہو جاتا ہے تو وہ جگنو کی لمحاتی چمک کے سوا اور کوئی روشنی عطا نہیں کر سکتا۔

ادب اور تنقید۔ اسلوب احمد انصاری ایسے معلم۔ ناقد ہیں جن کے تنقیدی [illegible] ادب کے تقاضا سے علم لکر [illegible] نہیں کرسکے۔

"ادب اور تنقید" اسلوب احمد انصاری کے منتشرہ مقالوں کا مجموعہ ہے جسے مسلم پبلشرز الہ آباد نے شائع کیا ہے قیمت آٹھ روپے ہے۔

"ادب اور تنقید" کے ناقد کے تعارف کی ضرورت نہیں ہے اسلوب صاحب انگریزی زبان و ادب کے معروف استاد ہیں۔ انگریزی میں ولیم بلیک پر ان کی کتاب اردو تنقید کو بھی روشنی عطا کرتی ہے

"ادب اور تنقید" کے مضامین کے بعض موضوعات بہت اہم اور قابلِ تجزیہ ہیں مثلاً "شعری صداقت" "تنقید اور تخلیق" "اور نثر کا آہنگ" ان موضوعات پر جو مضامین مجموعے میں شریک ہیں وہ دعوتِ غور و فکر دیتے ہیں۔ اسلوب احمد انصاری نے کئی اہم پہلوؤں کی وضاحت کی ہے اور بہت سے پہلوؤں کی طرف معانی خیز اشارے کئے ہیں۔ "غزل میں فراق کا کارنامہ" "علی گڑھ اور رومانی نثر کے معمار" اور "بیدی کا فن" اہم مضامین ہیں۔

پیش لفظ میں اسلوب صاحب نے تحریر فرمایا ہے :-

"شعر و ادب کے تجزیے سے ہمیں جو عرفان حاصل ہوتا ہے اسے کسی فارمولے کے ذریعے بیان کرنا ممکن نہیں البتہ اس کے اثرات پڑھنے والے کے ادراک کی ایک نئی وسعت اور گہرے تفکر کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔"

اس خیال سے جس نقطۂ نظر کی وضاحت ہوتی ہے وہ اس دور میں بہت اہم ہے۔ اس طرح سوچنے والوں کی کمی ہے۔ اس حقیقت کے باوجود انہوں نے اپنے ابتدائی مضامین میں جو کلیے اور فارمولے بنائے ہیں، اپنی عملی تنقید کی بنیاد اُن ہی پر رکھی ہے۔ اکثر جب تجزیئے کے عرفان کا احساس نہیں ہوتا اور ناقد کے وجدان کی روشنی نظر نہیں آتی تو ایک خلش سی محسوس ہوتی ہے۔

اگرچہ اسلوب احمد انصاری کا مطالعہ وسیع ہے لیکن مجھے اکثر محسوس ہوا کہ ضروری اور غیر ضروری حوالوں اور اصطلاحوں کے ساتھ وہ بیسویں صدی کی تحریکوں اور اس صدی کے بنیادی رجحانات کی جنبشیں دیتے، انگریزی کے ایسے مستند معلم کو ایک ایسا ذریعہ بن جانا چاہئے کہ آگے چل کر اس کی حیثیت ایک سرچشمے کی ہو جائے "ادب کی قدریں" کا ایک ایک لفظ غور سے پڑھا تاکہ ناقد کا بنیادی نقطۂ نظر اور اس کے بنیادی رجحان کو سمجھ سکوں۔ ادب کے بارے میں ارسطو اور [illegible] کے خیالات کی تفصیل میرے نزدیک کئی لحاظ سے غیر ضروری ہے۔ ادب کی بنیادی قدروں سے متعلق ان فنکاروں کے خیالات قطعی [illegible] [illegible] [illegible] اسلوب صاحب [illegible]

اردو میں محض ساتھ معروضیت کی بات کرنا چاہتے تھے [illegible] دلچسپ اور فکر انگیز بنا سکے۔ ناقد کا اپنا زاویۂ نگاہ ہونا ہی ہے [illegible] کی تر سیلداری ہے۔ اکثر مضامین میں چند آخری جملوں میں دوسروں کے [illegible] کے درمیان ناقد اپنی موجودگی کا احساس دلانے کی ایک ناکام [illegible]۔

عملی تنقید میں اسلوب احمد انصاری سے وہ جملے جو پڑھنے والوں سے [illegible] کچھ کہنا چاہتے ہیں معانی خیز سرگوشی نہیں کرتے۔

"غالب بہت کچھ پرانے ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ نئے ہیں۔"

"اقبال کی غزلیں ارضی محبت کے ترانے کب ہیں وہ تو اس [illegible] کی اشاعت کا صرف ایک ذریعہ ہیں۔"

"فراق کی غزلیں اُن کے انفرادی جذبات سے بوجھل ہیں۔"

"رشید صاحب کی ظرافت عام طور پر وزن دار اور خیال انگیز ہوتی ہے لیکن بسا اوقات وہ اپنی مزاحیہ غایت کی طرف مکمل طور پر اشارہ کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اس سے نہ صرف شدید قسم کا ابہام پیدا ہوتا ہے بلکہ یہ بھی گمان گزرتا ہے کہ غالباً وہ اس خاص نمونے کے مزاحیہ امکانات کو پوری طرح گرفت میں نہیں لاسکے ہیں۔"

"معیار اور فن دونوں کے اعتبار سے اگر اردو کے دو بڑے افسانہ نگاروں کا نام لیا جائے تو وہ بلاشبہ پریم چند اور راجندر سنگھ بیدی ہی ہیں۔"

منٹو اور کرشن چندر، عصمت چغتائی اور احمد ندیم قاسمی، بیدی سے [illegible] فن دونوں کے [پیش نظر] کتنے "چھوٹے" ہیں۔ یہ بھی معلوم ہو جاتا تو [illegible]

ان باتوں کے باوجود اس کتاب میں مجھے ایک [illegible] کہ ہر خبر پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ "ادب اور تنقید" کئی اعتبار سے ایک اہم تنقیدی کتاب ہے۔ امید ہے کہ ادب کے چاہنے والے اسے ضرور پسند کریں گے۔

گلوب اس قابلِ قدر مجموعے کا [illegible] اور خوبصورت نام رکھا جاسکتا تھا اس لئے کہ یہ نئے شعری تجربوں کا ایک اچھا انتخاب ہے۔ میرے نزدیک اس نام سے اس اہم انتخاب کی اہمیت واضح نہیں ہوتی۔ اس میں اُردو کے ممتاز شعراء کے کلام کا عمدہ انتخاب ہے۔ ہر شاعر کا ایک ہلکا تعارف بھی شامل ہے۔ سید احمد شمیم اور شمس فریدی نے [illegible] محنت کی ہے اور اس بات کی ہر ممکن کوشش کی ہے کہ [illegible]

اس مجموعے میں بہت سی بکھری ہوئی نظمیں یکجا ہوگئی ہیں [illegible] شاعروں کے کلام کو پڑھتے ہوئے جدید اُردو نظم کے [illegible] یہ کتاب "تانیث" میں چھپ گئے آپ [illegible] خوبصورت کتاب کی قیمت پانچ روپے ہے [illegible] [illegible] نے شائع کیا ہے۔



# ٹرینالے ۲

دوسری جنگ عظیم کے بعد سائنس اور ٹکنالوجی میں انقلاب آفریں تبدیلیوں ساتھ ساتھ فنون لطیفہ میں بھی بڑی دُور رس تبدیلیاں آئی ہیں۔ مصوری، سنگتراشی اور مجسمہ سازی میں دنیا کے مختلف ممالک میں نئے نئے تجربے کئے ہیں۔ یہ تجربے مقامی اور اپنی قومی خصوصیت کے حامل ہونے کے باوصف اقدار کے حامل بھی ہیں۔

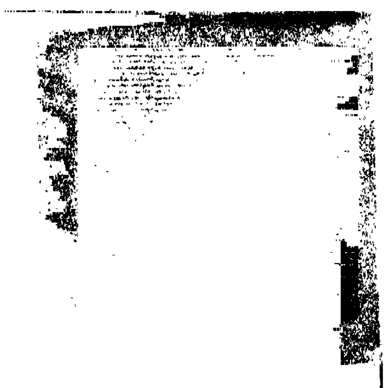
مصوری کے جدید رجحانات سے واقف کرانے کے لئے دنیا کے مختلف ممالک میں مصوری کی نمائش کی جاتی ہے جس میں دُنیا کے بہت سے فن کار لیتے ہیں۔ ایسی نمائش ہندوستان میں پہلی بار ۱۹۶۸ء میں منعقد کی گئی تھی۔ تین سال بعد (اسی لئے اس نمائش کو ٹرینالے کا نام دیا گیا ہے) جنوری ۱۹۷۱ء میں نئی دہلی میں دوسری نمائش کی گئی ہے جس میں ۲۷ ملکوں کے ۳۰۰ فن کاروں نے حصہ لیا ہے۔ ان میں ان کے ۸۰۰ شاہکار پیش کئے گئے ہیں۔

ایسی نمائشیں تہذیبی لین دین اور بین اقوامی مفاہمت میں مدد دیتی ہیں۔

اوپر (اوپر) مغربی جرمنی کے ہنریکل کا شاہکار

(دائیں طرف) سیلف پورٹریٹ عمل:- جرزی بنیاک (پولینڈ)

(بائیں طرف) فرانس کے یووا ال جین پیری کا پلاسٹک اور تاروں سے بنایا شاہکار





"ادب اور تنقید" اسلوب احمد انصاری ایسے معظم ناقد ہیں جن کے تنقیدی مقالے ادب کے نقاد اب نظر انداز نہیں کر سکے۔

"ادب اور تنقید" اسلوب احمد انصاری کے منتشر مقالوں کا مجموعہ ہے جسے مکتبہ علی گڑھ الہ آباد نے شائع کیا ہے قیمت آٹھ روپے ہے۔

"ادب اور تنقید" کے ناقد کے تعارف کی ضرورت نہیں ہے۔ اسلوب صاحب انگریزی زبان و ادب کے معروف استاد ہیں، انگریزی میں ولیم بلیک پر ان کی کتاب اردو تنقید کو بھی روشنی عطا کرتی ہے

"ادب اور تنقید" کے مضامین کے بعض موضوعات بہت اہم اور قابل تجزیہ ہیں مثلاً شعری صداقت "تنقید اور تخلیق" اور نثر کا آہنگ" ان موضوعات پر جو مضامین مجموعے میں شریک ہیں وہ دعوت غور و فکر دیتے ہیں۔ اسلوب احمد انصاری نے کئی اہم پہلوؤں کی وضاحت کی ہے اور بہت سے پہلوؤں کی طرف معانی خیز اشارے کئے ہیں۔ "غزل میں فراق کا کارنامہ" "علی گڑھ اور رومانی نثر کے معمار" اور "بیدی کا فن" اہم مضامین ہیں۔

پیش لفظ میں اسلوب صاحب نے تحریر فرمایا ہے :-

"شعر و ادب کے تجزیے سے ہمیں جو عرفان حاصل ہوتا ہے اسے کسی فارمولے کے ذریعے بیان کرنا ممکن نہیں البتہ اس کے اثرات پڑھنے والے کے ادراک کی ایک نئی صلابت اور حکم تنظیم کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں"

اس خیال سے جس نقطہ نظر کی وضاحت ہوتی ہے وہ اس دور میں بہت اہم ہے۔ اس طرح سوچنے والوں کی کمی ہے اس حقیقت کے باوجود انہوں نے اپنے ابتدائی مضامین میں جو کلیے اور فارمولے بنائے ہیں، اپنی عملی تنقید کی بنیاد ان ہی پر رکھی ہے۔ اکثر جب تجزیئے کے عرفان کا احساس نہیں ہوتا اور ناقد کے وجدان کی روشنی نظر نہیں آتی تو ایک خلش سی محسوس ہوتی ہے۔

اگرچہ اسلوب احمد انصاری کا مطالعہ وسیع ہے لیکن مجھے اکثر محسوس ہوا کہ ضروری اور غیر ضروری حوالوں اور اصطلاحوں کے ساتھ وہ بیسویں صدی کی تحریکوں اور اس صدی کے بنیادی رجحانات کی خبریں دیتے، انگریزی کے ایسے مستند معلم کو ایک ایسا ذریعہ بن جانا چاہئے کہ آگے چل کر اس کی حیثیت ایک سرچشمے کی ہو جائے "ادب کی قدریں" کا ایک ایک لفظ غور سے پڑھا تاکہ ناقد کا بنیادی نقطۂ نظر اور اس کے بنیادی رجحان کو سمجھ سکوں۔ ادب کے بارے میں ارسطو، لانجائنس اور ٹالسٹائی اور فشر و شیوسکی کے خیالات کی تفصیل میرے نزدیک کئی لحاظ سے غیر ضروری ہے۔ ادب کی بنیادی قدروں سے متعلق ان فنکاروں کے خیالات قطعی اتنے اہم نہیں کہ ان کا ذکر اس طرح کیا جائے اور ان کے نظریوں کو معتبر سمجھا جائے۔ اسلوب صاحب حسن اور ظلمت اور ان کے ساتھ معروضیت کی [illegible] دلچسپ اور فکر انگیز بنا سکے۔ ناقد کا اپنا زاویہ نگاہ [illegible] کی ٹریجڈی ہے اکثر مضامین میں چند آخری جملوں [illegible] کے درمیان ناقد اپنی موجودگی کا احساس دلانے کی ایک ناکام [illegible]

عملی تنقید میں اسلوب احمد انصاری کے وہ جملے جو [illegible] کچھ کہنا چاہتے ہیں معانی خیز سرگوشی نہیں کرتے۔

"غالب بہت کچھ پرانے ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ نئے ہیں"

"اقبال کی غزلیں ارضی محبت کے ترانے کب ہیں [illegible] کی اشاعت کا صرف ایک ذریعہ ہیں۔"

"فراق کی غزلیں اُن کے انفرادی جذبات سے بوجھل ہیں"

"رشید صاحب کی ظرافت عام طور پر وزن دار اور خیال انگیز ہوتی [illegible] بیسا اوقات وہ اپنی مزاحیہ غایت کی طرف مکمل طور پر اشارہ کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔"

اس سے نہ صرف شدید قسم کا ابہام پیدا ہوتا ہے بلکہ یہ بھی گمان گزرتا ہے کہ [illegible] اس خاص نمونے کے مزاحیہ امکانات کو پوری طرح گرفت میں نہیں لا سکے ہیں۔

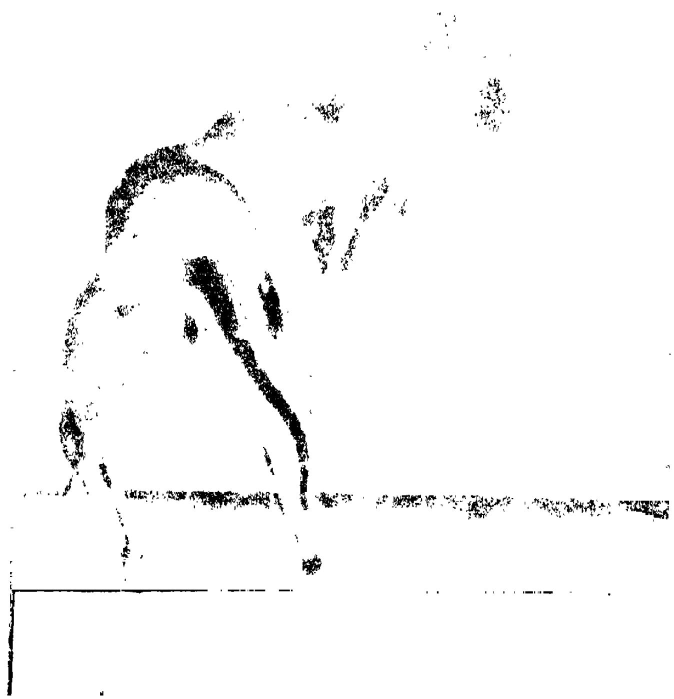
"معیار اور فن دونوں کے اعتبار سے اگر اُردو کے دو بڑے افسانہ نگاروں کا نام لیا جائے تو وہ بلاشبہ پریم چند اور راجندر سنگھ بیدی ہی ہیں۔"

منٹو اور کرشن چندر، عصمت چغتائی اور احمد ندیم قاسمی، بیدی سے (معیار اور فن دونوں کے پیش نظر) کتنے "چھوٹے" ہیں۔ یہ بھی معلوم ہو جاتا تو اچھا تھا۔

ان باتوں کے باوجود اس کتاب میں مجھے ایک امتیازی تجزیہ ناقد [illegible] کی ہر خبر پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ ادب اور تنقید کئی اعتبار سے ایک اہم تنقیدی کتاب ہے۔ امید ہے کہ ادب کے چاہنے والے اسے ضرور پسند کریں گے۔

گلوب اس قابل قدر مجموعے کا کوئی اور خوبصورت نام رکھا جا سکتا تھا اس لئے کہ یہ نئے شعری تجربوں کا ایک اچھا انتخاب ہے۔ میرے نزدیک اس نام سے اس اہم انتخاب کی اہمیت واضح نہیں ہوتی۔ اس میں اُردو کے ممتاز شعراء کے کلام کا عمدہ انتخاب ہے، ہر شاعر کا ایک ہلکا تعارف بھی شامل ہے۔ سید احمد شمیم اور شمس فریدی نے بڑی محنت کی ہے اور اس بات کی ہر ممکن کوشش کی ہے کہ نمائندہ نظموں کا انتخاب کیا جائے۔ اس مجموعے میں بہت سی بکھری ہوئی نظمیں یکجا ہو گئی ہیں، ایک ساتھ اتنے شاعروں کے کلام کو پڑھتے ہوئے جدید اُردو نظم کے کئی رجحانات بہت واضح ہو جاتے ہیں۔ کتاب ٹائپ میں چھپی ہے گٹ اپ خوبصورت ہے۔ ۱۸۹ صفحات کی اس خوبصورت کتاب کی قیمت پانچ روپے ہے جسے اُردو سرکل [illegible] جمشید پور نے شائع کیا ہے۔

(شکیل الرحمان)

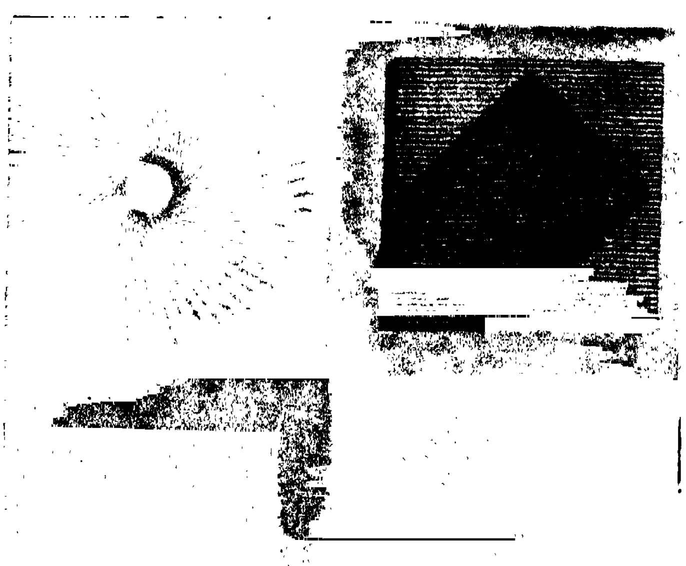


# ٹرینالے ۲

دوسری جنگ عظیم کے بعد سائنس اور ٹکنالوجی میں انقلاب آفریں تبدیلیوں
ہ ساتھ فنون لطیفہ میں بھی بڑی دُوررس تبدیلیاں آئی ہیں۔ مصوری،
اشی اور مجسمہ سازی میں دنیا کے مختلف ممالک میں نئے نئے تجربے کئے
، یہ تجربے مقامی اور اپنی قومی خصوصیت کے حامل ہونے کے باوصف
قدار کے حامل بھی ہیں۔

مصوری کے جدید رجحانات سے واقف کرانے کے لئے دنیا کے مختلف
میں مصوری کی نمائش کی جاتی ہے جس میں دنیا کے بہت سے فن کار
تے ہیں۔ ایسی نمائش ہندوستان میں پہلی بار ۱۹۶۸ء میں منعقد کی گئی تھی۔
تین سال بعد (اسی لئے اس نمائش کو ٹرینالے کا نام دیا گیا ہے) جنوری
۱ میں نئی دہلی میں دوسری نمائش کی گئی ہے جس میں ۳۷ ملکوں کے ۳۶۰ فن
نے حصہ لیا ہے اس میں ان کے ۸۰۰ شاہکار پیش کئے گئے ہیں۔
ایسی نمائشیں تہذیبی لین دین اور بین اقوامی مفاہمت میں مدد دیتی ہیں

صفحے (اوپر) مغربی جرمنی کے ہنز ہیگل کا شاہکار
(دائیں طرف) "سیلف پورٹریٹ" عمل:- جرزی بنیک (پولینڈ)
(بائیں طرف) فرانس کے یوواال جین پیری کا پلاسٹک اور تاروں سے بنایا
شاہکار

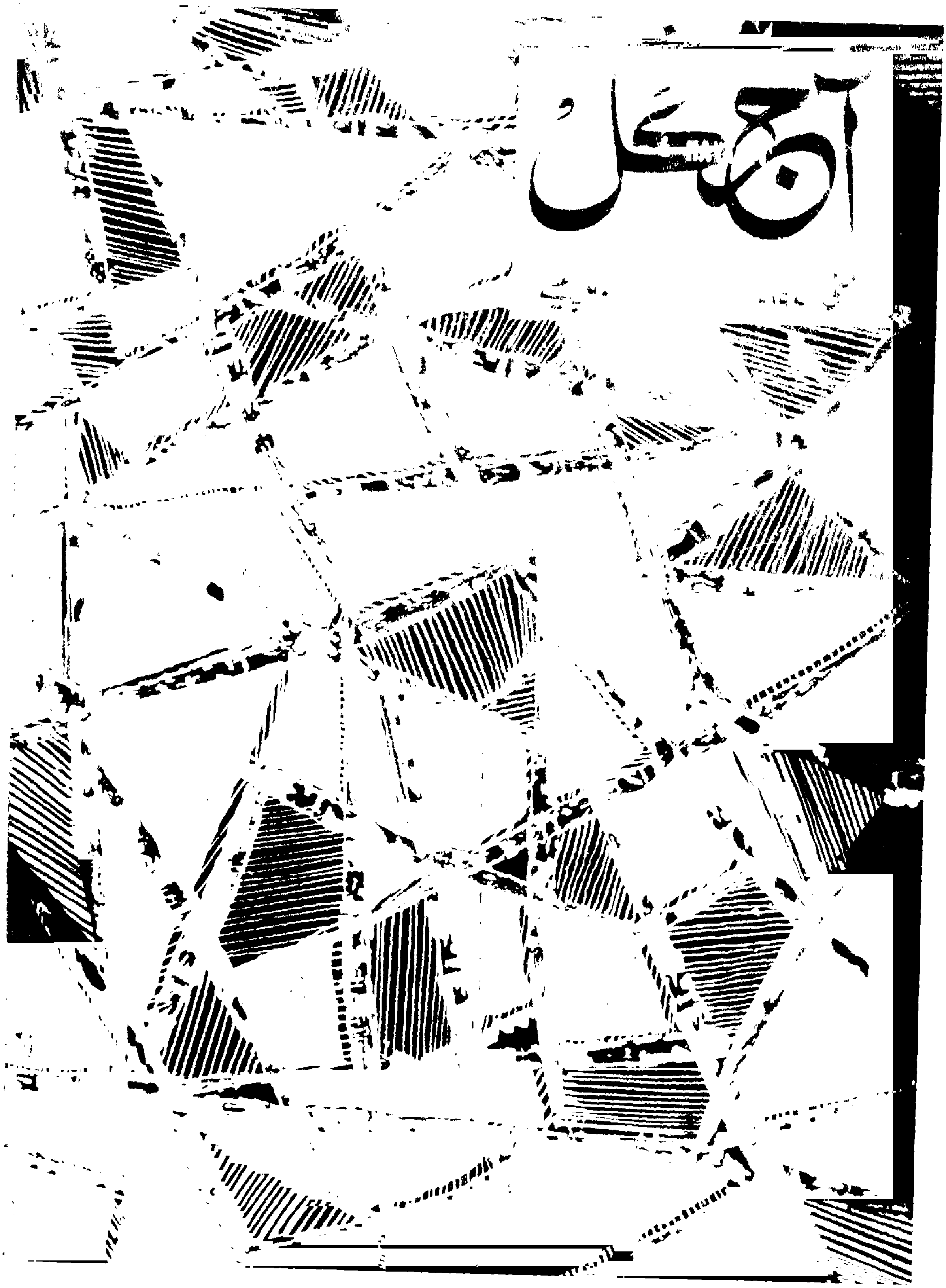






Vol. 29 No. 9 AJKAL (Monthly) April 1971

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi.
Printed by Skylark Printers, 11355 Idgah Road, New Delhi-55
Regd. No. D-509


آجکل



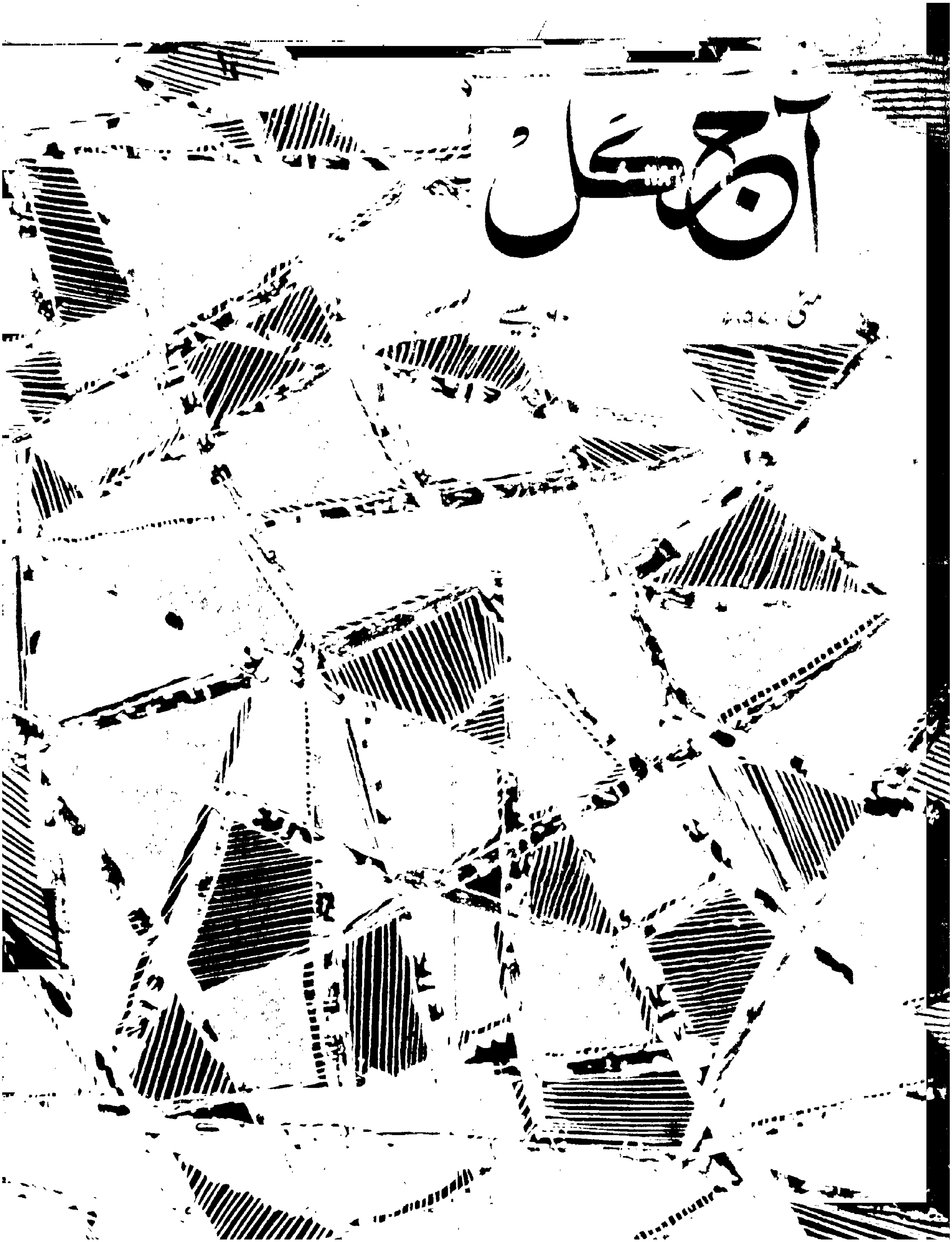
**Vol. 29 No. 9** **AJKAL (Monthly)** **April 1971**

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi.
Printed by Skylark Printers, 11355 Idgah Road, New Delhi-55

# آجکل

مئی ۱۹۸۰ء

۷۰ پیسے





پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم (۱۹۷۱ء-۱۹۰۶ء)

اردو کا مقبول عام مصور ماہنامہ

# آج کل

نئی دہلی

ایڈیٹر
شہباز حسین

*

سب ایڈیٹر
نند کشور وکرم

جلد ۲۹ شمارہ ۱۰
مئی ۱۹۷۱ء
بیساکھ جیٹھ سمت ۱۸۹۳

سرورق: علی مدن موہن ملک

سالانہ: ہندوستان میں: سات روپے
دیگر ممالک سے ۱۰ شلنگ پنس یا ۲ ڈالر

فی پرچہ: ہندوستان میں ۷۰ پیسے
دیگر ممالک سے ۱ شلنگ یا ۱۵ سینٹ

## ترتیب



مضامین اور ترسیل زر کا پتہ
شہباز حسین ایڈیٹر آج کل (اردو) پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

شائع کردہ ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

پانچویں لوک سبھا اور راجیہ سبھا کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے صدر جمہوریہ ہند نے کہا کہ عام انتخابات نے ایک بار پھر ثابت کر دیا ہے کہ جمہوریت میں پائیدار سیاسی اقتدار کا صرف ایک ہی منبع ہے اور وہ ہیں عوام۔ انتخابات سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ لوگوں کو اپنے پر اور جمہوریت کے عمل پر کتنا اعتماد ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے دیش واسیوں نے اپنے فیصلے کا اظہار کر دیا ہے۔ رائے دہندگی کے حق کے استعمال کے ذریعے انہوں نے اپنی خود مختاری کا بھرپور طریقے سے اظہار کیا ہے۔ انہوں نے تبدیلی کے لیے بہت موثر فیصلہ دیا ہے ایسی پرامن تبدیلی کے لیے جس کے ذریعے تیزی کے ساتھ ملک میں پائی جانے والی غربت کا خاتمہ کیا جا سکے۔

شری گری نے کہا کہ جلد ہی سرکار رائے دہندگان کے فیصلے پر مبنی پالیسیاں اور پروگرام بنائے گی۔ چوتھے منصوبے کا وسط مدتی جائزہ لیا جائے گا۔ اس جائزے سے اس کا اندازہ ممکن ہو سکے گا کہ منصوبے کو کیا شکل دی جائے جس سے کہ اقتصادی ترقی کے لیے سرمایہ کاری کی رفتار بڑھ سکے اور اس کا موثر استعمال کیا جا سکے ساتھ ہی ساتھ سرکار یہ بھی فیصلہ کر سکے گی کہ ترقیاتی پروگراموں کو کس طرح مضبوط بنایا جائے تاکہ بے روزگاری کے مسئلے کے حل میں مدد مل سکے۔ - - - - - - - - -

ایک وسیع پروگرام پر آیندہ مالی سال سے کام شروع ہوگا جو کھیتی کی پیداوار بڑھانے کی اسکیموں سے متعلق ہوگا اور اس کے مطابق سینچائی کے چھوٹے وسیلوں کی تعمیر اور مرمت اور پینے کا پانی مہیا کرنے اور سڑکوں کی تعمیر ایسی بنیادی سہولتوں کو بھی فروغ دیا جائے گا تعلیم یافتہ بیروزگاروں کو روزگار دلانے کے لیے مخصوص کوششیں کی جائیں گی۔ راشٹرپتی نے کہا کہ سرکار دیہی علاقوں میں بجلی فراہم کرنے کے کام کو اور بالخصوص سینچائی کے لیے بجلی کے استعمال کو خصوصی اہمیت دیتی ہے۔ گاؤں میں بجلی پہنچانے کے پروگراموں میں تیزی لائی گئی ہے! اس پنجسالہ منصوبے کے پہلے برس میں ۲ لاکھ ۶۶ ہزار پمپنگ سیٹوں کے لیے بجلی مہیا کی گئی تھی رواں سال میں یہ کام اور بھی تیزی کے ساتھ کیا گیا ہے گاؤں کو بجلی پہنچانے کی کارپوریشن نے لگ بھگ ستر کروڑ روپے کی اسکیمیں منظور کر کے اپنے کام کو شروع کر دیا ہے اس پروگرام کو اور بھی تیزی کے ساتھ آگے بڑھایا جائے گا۔

شری گری نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ سرکار کو اچھی طرح معلوم ہے کہ شہروں میں غریب لوگ کس قدر ناقابلِ برداشت حالات میں رہ رہے ہیں۔ مالی اور سماجی اصلاحات کے پروگراموں کی فہرست میں گندی بستیوں کی صفائی اور ان کے سدھار کو خصوصی اہمیت دی جائے گی۔ اور ان کے لیے سرکار زیادہ سے زیادہ وسائل فراہم کرنے کی کوشش کرے گی۔ حال ہی میں تعمیر مکانات اور شہری ترقی کی مالیاتی کارپوریشن قائم کی گئی ہے اور اس کے ذریعے بڑے شہروں اور شہری علاقوں میں مکانات کی سہولتوں میں اضافہ ہو سکے گا۔

راشٹرپتی نے کہا کہ ملک کے کچھ حصوں میں فرقہ وارانہ کشیدگی کا جاری رہنا اور وقتاً فوقتاً تشدد کا بھڑک اٹھنا ہمارے سیکولرازم اور جمہوریت نیز ہماری مہذب زندگی کی بنیادی اقدار کے لیے ایک خطرہ ہے حکومت نے اس خطرے پر قابو پانے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ قومی وجود کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس مسئلے کو قومی اہمیت کا کام تصور کیا جائے۔

راشٹرپتی نے کہا کہ والیانِ ریاست کے وظائف اور مراعات موزوں آئینی اقدامات کے ذریعے ختم کرنے کے حکومت کے عزم میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔

شری گری نے کہا کہ ہمارے اردگرد وسیع تر دنیا میں امید و یاس دونوں موجود ہیں۔ مغربی اور مشرقی یوروپ کے درمیان کشیدگی میں کمی ہوئی ہے۔ ہم وفاقی جمہوریہ جرمنی اور روس و پولینڈ کی حکومتوں کے درمیان طے پائے معاہدے کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

راشٹرپتی نے کہا کہ انڈوچائنا کی صورت حال اور زیادہ بگڑ گئی ہے۔ لاؤس اور کمبوڈیا میں جنگ مسلسل جاری ہے اس مسئلے کا حل جنیوا معاہدے کے دائرے کے اندر پرامن اور گفت و شنید کے ذریعے تصفیہ پنہاں ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ بہترین حل یہ ہوگا کہ تمام بڑی بڑی طاقتیں اور اس خطے میں دلچسپی رکھنے والے دیگر حلقے ایک بین الاقوامی معاہدے یا سمجھوتے پر دستخط کریں۔

مغربی ایشیا میں جنگ بندی کے باوجود بے چینی پائی جاتی ہے میری حکومت امید رکھتی ہے کہ سکیورٹی کونسل کی ۲۲ نومبر ۱۹۶۷ء کی قرارداد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اپنی دلی خواہش کے اظہار کے طور پر متحدہ عرب جمہوریہ نے حال ہی میں جو اقدامات کئے ہیں ان کا مثبت جواب ملے گا۔

راشٹرپتی نے کہا کہ میری حکومت بدستور غیر جانبداری کی پالیسی پر عمل جاری رکھے گی جب بھی پر امن اور خود مختار حکومتوں کی آزادی کو خطرہ لاحق ہوگا میری حکومت آواز اٹھائے گی اور نو آبادیاتی نظام کی مخالفت کرے گی۔

---

اردو کے ممتاز ناقد اور محقق پروفیسر عبدالقادر سروری کا ۱۱ مارچ کی شب سرینگر میں انتقال ہو گیا آپ پر قلبی دورہ پڑا جس سے جانبر نہ ہو سکے آپ کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے صدر تھے۔ آپ نے دینیات، لسانیات اور اردو تحقیق میں قابلِ قدر کام انجام دیا۔ آپ بہت دنوں تک آج کل کی مجلسِ ادارت سے وابستہ رہے ہیں۔ ان کی موت اردو کے لیے واقعی ایک سانحہ ہے۔

# ملاحظات

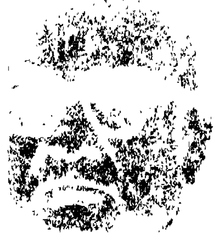
# آج

سکندر علی وجد

آج کی طرف دیکھو
اصل زندگی ہے یہ ؛ دورِ مختصر اس کا
تابناک و بے پایاں ؛ وقت کے اندھیرے میں
گم ہوا، گزشتہ کل ؛ اک سراب اگلا کل
آج کی طرف دیکھو
اس طلسمِ حیرت میں ؛ عہدِ آفریں ماضی
جاندار مستقبل ؛ ارتقا کا ہر منظر
قافلے بہاروں کے ؛ نغمہ خواں جواں دنیا
آج کی طرف دیکھو
آج کی مسرت سے ؛ یادگار پچھلا کل
خوش گوار اگلا کل ؛ ہر نظر میں اک جلوہ
ہر قدم پہ اک منزل ؛ خواب دیکھنے والو
آج کی طرف دیکھو

# غزل

کاشانۂ دل میں جب سے تو ہے
ہر وقت خوش گفتگو ہے
جلوؤں میں اسیر ہیں نگاہیں !
فردوسِ خیال روبرو ہے
کل تک جسے تیری جستجو تھی
آج اُس کو خود اپنی جستجو ہے
اے موجِ صبا، ادب سے چلیو
گلزار حریمِ رنگ و بو ہے
کانٹوں میں جو ہنس رہا ہے پیہم
وہ پھول، چمن کی آبرو ہے
وہ نقش حسیں، غزل سراپا
ہر خط میں رواں جواں لہو ہے
آئینہ رُخوں کی بے نیازی
اے وجد، حجابِ آرزو ہے



# گزر گیا کارواں

(۱۵)

عرش ملسیانی

رات دن ببک خرامی سے سفید بنیں بہتی ہیں ندی کا پانی گہرا نہیں تھا۔ اِس لئے لوگ اُس کے آر پار دن رات آتے جاتے رہتے۔ ملسیاں کے پاس یہی ایک قدرتی منظر تھا جس پر ملسیاں کے لوگ ناز کرتے۔ رات بھر یہ دھیمی دھیمی گنگناتی بلی اصبح لوگ اس میں اشنان کے لئے آتے۔ اشنان کر کے کنارے پر ہی سنت تیجا سنگھ کی کٹیا میں داخل ہوتے جہاں سنت جی اپنی سُریلی آواز میں گورو گرنتھ صاحب کا پاٹھ کرتے۔ صبح کی بانی آسا دی وار سنتے اور مگن ہو جاتے۔ ایک آتا اور ایک جاتا۔ اس وقت کے لوگوں میں عقیدت تھی سچائی تھی۔ دلوں میں میل نہیں تھا۔ واپسی پر راستے میں آرائیں اور مسلمان راجپوت کسان ہل اور بیلوں کے ساتھ آتے ہوئے ملتے، صاحب سلام، سے ہر ایک کو بلاتے۔ مذہبی تعفرتوں سے بری یہ دنیا آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے ایک ایسی معصوم اور بھولی بھالی دُنیا تھی کہ آج اُسے یاد کرتا ہوں تو دل میں ہوک سی اٹھتی ہے۔

میں ۱۹۰۸ء میں ملسیاں میں پیدا ہوا۔ والد سے پہلے خاندان میں کیا سارے قصبے میں نہ کوئی صاحبِ علم تھا اور نہ قابلِ ذکر صاحبِ جاہ و حشم۔ انیس بیس کا فرق تھا کوئی کھاتا پیتا تھا، کوئی محنت کش اور کوئی دوسروں کا دستِ نگر۔ چھوٹا سا بازار ہشو لات میں بنی ہوئی بستی جس تعلق سے ہم مشہور شاہ قل پور کے باشندے تھے۔ نرم پوڑھو بلی ہمالو مگر قصبہ دیگر مشمولات تھے مسلم راجپوت چودھریوں کا زور تھا۔ ذیل دار بھی انہیں میں سے ہوتا اور تعصیے کی سربراہی سرکاری حلقوں میں بھی وہی کرتے۔

دلچسپ کردار کے لوگ تھے، علیا نوجہ، جانن چوڑھی گر، دادا حاکمیاں والا، بھائی مُولا اور چوہدار۔ ہر ایک میں کوئی نہ کوئی خصوصیت تھی۔ ۱۹۱۲ء میں جب میں چار سال کا تھا میں نے چوبدار کو دیکھا۔ چاق چوبند، گندمی ہوئی سفید داڑھی، میرے ہمجولی اس کے گرد ہو گئے، پالو سب سے بڑا تھا اس نے کہا کہ چوبدار کی عمر سو سال سے زیادہ ہے۔ مہتہ جی میرے تایا ہوتے کہ ایک سو پانچ سال۔ میں حیرت میں تھا آج حساب لگاتا ہوں تو سمجھ میں آتا ہے کہ بابا سر کھیم سنگھ بیدی اور ان کے خاندان کا یہ چوبدار ۱۸۰۷ء میں پیدا ہوا ہوگا اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے وقت اس کی عمر پچاس سال کی ہوگی۔ غالب کی موت اور مہاتما گاندھی کی پیدائش کے وقت یہ باسٹھ سال کا ہوگا۔

مہتہ جی کی بیٹھک ہر وقت اُن کے سائلوں سے بھری رہتی۔ وہ وثیقہ نویس تھے۔ دوسرے درجے تک پڑھے تھے لیکن ہر قسم کا وثیقہ لکھنے میں طاق تھے تمسک، رہن نامہ، بیع نامہ، وصیت نامہ، طلاق نامہ وغیرہ۔ سعدی کا ایک شعر یاد تھا جب اُجرت وثیقہ پر جھگڑا ہوتا تو سائل پر رعب طاری کرنے کے لئے وہ پڑھ دیتے ہے

دوست آں باشد کہ گیرد دستِ دوست
در پریشاں حالی و درماندگی

شعر پڑھتے ہی منہ مانگی اُجرت مِل جاتی۔ اس لئے نہیں کہ سننے والا شعر سمجھتا تھا بلکہ اس لئے کہ اس پر مہتہ جی کی علمیت کا سکہ بیٹھ جاتا تھا۔ ہندو، مسلمان، سکھ سبھی اس بیٹھک میں جمع رہتے۔ بیٹھک کے باہر ان کی سواریاں گھوڑی یا اونٹ بندھے رہتے۔ مہتہ جی بڑے فیاض تھے۔ جانوروں کو چارہ دیتے اور ان کے مالکوں کو کھانا حقہ تمباکو کا بھی زور رہتا۔ اُجرت میں سب کچھ وصول کر لیتے۔ دُور دُور کے گاؤں والے ان پر اعتماد رکھتے تھے۔ ان کی مہارت، بر خود غلط قانون دانی اور جعل سازی سب اُن کے بروئے کار آتی۔

پہلی جماعت میں مقامی مدرسے میں داخل ہوا۔ خلیفہ حیدر علی ہمیں پڑھاتے تھے

[illegible] سے قریب لگتی تھی۔ کیونکہ ایک چھوٹی سی چھڑی دائیں ہاتھ میں لے کلاس میں [illegible] رہتے ہوائے نماز کے وقت کے محنت سے پڑھاتے۔ پیٹتے کبھی نہیں تھے۔ گالی کبھی نہیں دیتے تھے مگر پھونکیں دیتے اور دم بھی کرتے تھے۔ وظیفہ پڑھتے اور تسبیح ہاتھ میں رکھتے [illegible] داڑھی اور دوپلی ٹوپی پہنتے۔ ہر شخص اُن کی عزت کرتا۔ سال میں ایک دوبار مٹیش کے پاس [illegible] زمین دیکھنے جاتے۔ بازار سے گزرنا پڑتا۔ ہر شخص دکان سے اُٹھ کر انہیں سلام کرتا۔ خلیفہ جی سلام خلیفہ جی سلام کی آوازیں آتیں۔ خلیفہ جی سر جھکائے آنکھیں نیچی کئے ہوئے [illegible] سب کا سلام قبول کرتے تیزی سے نکل جاتے۔ اتنا پاک نفس، نیک نہاد اور علم کا پتلا انسان آج کے زمانے میں ڈھونڈو بھی تو نہ ملے۔

قاضیوں کی مسجد کے پاس سے ایک تنگ گلی گزرتی ہے اس کے آخری موڑ پر ہندوؤں کے تین مکان تھے ایک ہمارا، ایک مہتہ جی کا اور ایک کانشی رام حجام کا۔ ارد گرد سینکڑوں مکان مسلمانوں کے تھے سب مل جل کر آپس میں رہتے۔ شادی کہار، جنگی خوجہ، عمرا راؤنت *مولانا، بیگم رنگریزن، بلھا سنار یہ تھے ہمارے ہمسائے بے خوفی سے دن گزرتے۔ نہ ڈر، نہ خطرہ

رہتے تھے بتیس دانتوں میں زبانوں کی طرح

دیوی دوارہ، گلشن مندر ہم سے دور تھے۔ اذان کی آواز کان میں آتی رہتی اور ایسے لگتی کہ واقعی اللہ اور اس کے اکبر ہونے کا ہمیں یقین دلا رہی ہو —— الفاظ میں کیا رکھا ہے۔

ایشور اللہ تیرے نام

سیاست کسی کو چھو نہیں گئی تھی۔ چھوت چھات جہالت کی وجہ سے زوروں پر تھی لیکن نفرت کا موجب نہیں تھی۔ یونہی طرز زندگی سی بن گئی تھی۔ سود خوروں کی وجہ سے کاشتکار طبقہ دبا رہتا تھا۔ اس سے بھی بغض و عداوت کے شعلے نہیں بھڑکتے تھے۔

قصبے کی معاشی اور اقتصادی حالت اچھی نہیں تھی۔ ایک زمانے میں یہ بیدیوں کی جاگیر تھی۔ اُن کی بارہ دری، بُرج، طویلہ اور مکانوں کے کھنڈر میں نے دیکھے ہیں۔ اب اس سارے جاہ و جلال کی نشانی وہی سکھ چوہدری تھا جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

چوہدری اللہ بخش، ڈاکٹر جھنڈے خاں، سیٹھ سوار حسین، بسنتا (بسنت سنگھ) سفید پوش گوپی چند اگروال پرانے پڑھے لکھے لوگ تھے جن میں سے کوئی مڈل سے آگے نہیں گیا تھا۔

میرے دادا پنڈت موتی رام پشاور کے قصہ خوانی بازار میں حلوائی کی دکان کرتے تھے۔ شراب پیتے تھے۔ کچھ کما کے لاتے تو نا و نوش میں خرچ کرکے واپس چلے جاتے۔ قطعی ان پڑھ تھے۔ والد اس خاندان میں پہلے شخص تھے جنہوں نے باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ فارسی میں بہت اچھی دسترس حاصل کی۔ معلمی پیشہ اختیار کیا۔ شعر و سخن کی طرف توجہ ہوئی تو معلوم ہوا کہ ایک دبی قوت ظہور میں آرہی ہے۔ عروض، علم بیان اور زبان کا مطالعہ کرتے کرتے منتہی بن گئے۔ ۱۹۰۳ء میں داغ کے شاگرد ہوئے اور آج ستاسی سال کی عمر میں بھی شعر کہتے ہیں۔ داغ کے دو ہزار کے قریب شاگردوں میں تنہا رہ گئے ہیں انہیں کا ایک شعر ہے۔

جینے کا کیا لطف یہاں اب یار گئے غمخوار گئے
جو دو چار رہے تھے وہ بھی تیر جگر پر مار گئے

تقسیم بنگال کی تحریک اور پنجاب میں نہری مالیانے کی تحریک سے انہیں ہمدردی تھی اور وہ سیاسی نظمیں کہتے تھے۔ اسی شبہ میں ۱۹۰۸ء میں ان کی تلاشی ہوئی۔ پولیس کو کچھ ملا تو نہیں لیکن سزا کے طور پر انہیں ایک ایسے مدرسے میں تبدیل کر دیا جو قریب قریب ویران جگہ پر اور آبادی سے دُور تھا، وہ دل برداشتہ ہو کر مستعفی ہو گئے اور ریاست جیند میں سفیدوں کے مقام پر ایک اسکول میں چلے گئے۔ چند سال بعد نکودر اینگلو سنسکرت ہائی اسکول میں آگئے۔ یہ قصبہ ملسیاں سے آٹھ میل کے فاصلے پر ہے میں پانچ سال کا تھا کہ ہم یہیں منتقل ہو گئے اور آج تک یہی ہمارا وطن ہے۔ ملسیاں کو والد خراب آباد کہا کرتے تھے۔ تین چار سال ہوئے ہیں ملسیاں دو تین گھنٹے کے لئے گیا بازار وغیرہ تو ترقی پذیر ہے لیکن تقسیم کے بعد آبادی بہت کم ہو گئی ہے۔ قاضیوں کی مسجد کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ سب مکان صاف ہو چکے ہیں اور میں یہ بھی نہ پہچان سکا کہ ہمارا گھر کس مقام پر تھا۔ ہمارے لئے زمانے میں وہی گھر ایک ایوان تھا اس کی بربادی اور ناپیدی کو دیکھ کر ایک فارسی شاعر کا یہ شعر بغداد کی بربادی پر یاد آگیا۔

ہاں اے دلِ عبرت بیں از دیدہ نظر کن ہاں
ایوانِ مدائن را آئینۂ عبرت داں

مسلمان اب وہاں کوئی نہیں۔ ہندو سکھ بظاہر میل ملاپ سے رہتے ہیں لیکن خلوص نہ ہندو ہندو میں ہے اور نہ سکھ میں نکودر میں مڈل تک تعلیم حاصل کی۔ پڑھنے لکھنے میں بہت اچھا تھا کئی مضامین میں سو فیصد نمبر حاصل کئے۔ لیکن ذہانت کا فائدہ نہ ملا۔ میٹرک کے لئے جالندھر گیا اور انٹر کے لئے کپورتھلہ۔ ۱۹۲۱ء میں تحریک عدم تعاون جاری ہوئی تو دل جذبۂ آزادی سے کھولنے لگا۔ ہر جلسے اور جلوس میں شامل ہوتا۔ اخباری نظمیں جلسوں میں پڑھتا۔ واہ واہ ملنے لگی۔ غلط سلط شعر بھی کہنے لگا۔ لالہ لاجپت رائے نکودر میں تلک سوراج فنڈ جمع کرنے آئے۔ امتحان کا دن تھا تین گھنٹے کا پرچہ آدھ گھنٹے میں حل کرکے اسکول کے پیچھے سے بھاگا اور لالہ جی کی جائے قیام پر پہنچ گیا۔ اُن کو دیکھا قدم چومے اور اس سعادت پر آج تک نازاں ہوں۔

کالج میں گیا تو شعر و شاعری کے چرچے بہت تھے۔ ہم جماعت سمجھتے تھے کہ میں بہت بڑا شاعر ہوں۔ ایک نظم ڈرتے ڈرتے والد کی خدمت میں اصلاح کے لئے

بھیجی۔ اصلاح تو کجا ایک سرزنش آمیز خط ملا کہ اس طوق کو اتار ڈالو یہ تمہارے گلے میں تنگ ہے۔ اُن کے ایک دوست نے مجھے بتایا کہ جوش صاحب خوش تو بہت تھے لیکن کہتے تھے کہ شعر کہنے لگا تو تعلیم سے غافل ہو جائے گا۔ اس لئے اس کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے تو اچھا ہوگا۔ اس کے بعد ایک دوست نے میرے سامنے والد کو میرا یہ شعر غالب کی مشہور زمین میں سنایا ؎

مر کر بھی گرفتارِ سفر ہے مری ہستی
دُنیا مرے پیچھے ہے تو عقبیٰ مرے آگے

بہت خوش ہوئے اور شعر کی برجستگی کی بڑی تعریف کی۔ میری تسکین ہوگئی اور میں آزادانہ شعر کہنے لگا کسی لفظ یا ترکیب پر شبہ ہوتا تو اسے والد سے پوچھ لیتا۔ اصلاح نہ لیتا۔ اس سے مجھے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی توفیق حاصل ہوئی۔ نوہریا رام درد (نریش کمار شاد کے والد) والد کے شاگرد تھے۔ انہوں نے میرا حوصلہ بڑھایا کہ بس کہتے جاؤ۔ نہ رکنے کا مقام ہے نہ ڈرنے کا۔

انٹر میں پڑھ ہی رہا تھا کہ بلائے ناگہانی مجھ پر نازل ہوئی۔ میں والد کے مجبور کرنے پر گورنمنٹ انجینیرنگ کالج رسول کے داخلے کے امتحان میں بیٹھ گیا اور امتیاز سے کامیاب ہوا۔ ناچار علم و ادب کی فضا کو چھوڑ کر انجینیرنگ کی تعلیم حاصل کرنے لگا۔ دو سال رو رو کر گزارے مگر بُرا ہو اس ذہانت کا کہ وہاں بھی امتیاز سے کامیاب ہوا۔ ملازمت نہر کے محکمے میں ملی۔ دیکھا کہ چاروں طرف بھیڑیئے منہ کھولے بیٹھے ہیں۔ رشوت کا بازار گرم ہے۔ جہالت ہی جہالت چھائی ہوئی ہے۔ ایک سال کی مدت میں تین بار مستعفی ہوا۔ ملازمت چھوڑ کر گھر پر آتا تو وہاں سرزنش ملتی۔ ملازمت پر جاتا تو ضمیر ملامت کرتا آخری بار جب مستعفی ہوا تو یہ کہہ کر مستعفی ہوا کہ خواہ بھوکا مروں اس پُر آشوب ملازمت کا نام نہ لوں گا جہاں اتنی جہالت ہے کہ مزدور اوورسیر کو بلاتا ہے تو کہتا ہے 'اوئے باؤجی اوئے' یعنی دونوں طرف تعظیماً اوئے، کہتا ہے تعلیم نامکمل، جو پیشہ اختیار کیا اس سے نفرت، گھر کی مالی حالت خستہ، چار بہنوں کی شادیاں یکے بعد دیگرے سر پر، رات کو نیند نہیں آتی تھی۔ اسی زمانے میں لاہور میں کانگرس کا تاریخی اجلاس منعقد ہوا جواہر لال نہرو کے جلوس سے لے کر سالانہ اجلاس اور متعلقہ تقریبات دیکھتا رہا۔ اور درد صاحب کے پاس پندرہ بیس دن ٹھہرا۔ وہاں گاندھی سردار پٹیل، موتی لال نہرو، سروجنی نائیڈو، سبھاش چندر بوس اور بہت سے اکابر کو دیکھا۔ یہ بات ۱۹۲۹ء کے آخر کی ہے۔ جنوری ۱۹۳۰ء کے پہلے تین چار دنوں میں بہت سی تقریریں سنیں۔ وہیں پہلی بار عطاء اللہ شاہ بخاری کو سنا۔ کیا تقریر تھی گاندھی سے جوش عقیدت، انگریز کے خلاف شعلہ افشانی، طلاقت، فصاحت بلاغت، برموقع لحن سے شعر خوانی، لطائف و ظرائف، اللہ کی پناہ ایسا مقرر میں نے عمر بھر نہیں دیکھا۔ بہادر یار جنگ کے باب میں بھی ایسی ہی باتیں سنی ہیں لیکن ان کو میں نے نہیں دیکھا۔

پنجاب کی بساطِ سیاست پر اس زمانے میں ڈاکٹر ستیہ پال، ظفر علی خاں، ڈاکٹر محمد عالم، چودھری افضل حق، ڈاکٹر کچلو، ماسٹر تارا سنگھ اور بہت سے قائدین چھائے ہوئے تھے۔ سرکار کے کاسہ لیسوں کا کوئی عزت سے نام نہیں لیتا تھا۔ اُردو صحافت اپنی مستقل ٹک ٹک جھک جھک میں مصروف تھی۔ نظموں کے جواب میں نظمیں اداریوں کے جواب میں اداریے لکھے جاتے پھلجھڑیاں چھوٹتیں۔ زندہ دلانِ پنجاب جو بھی کرتے کم تھا۔ لالہ کرم چند کا ہفتہ وار اخبار پارس اپنی وضع کا نرالا اخبار تھا۔ ادبی حصہ بڑا پُر لطف ہوتا۔ نگران پنڈت ہری چند اختر لکھتے، حفیظ، تاثیر فرضی ناموں سے مولانا محمد علی اور خواجہ حسن نظامی کی طرف داری میں نظمیں لکھتے۔ رچھپال سنگھ شیدا کا کمل، مظفر حسین خاں کا شاعری کالج، تاجور نجیب آبادی کی انجمن ارباب علم پنجاب سیتلا مندر کے مہنت کی بداعمالیاں، سب پر پھبتیاں کسی جاتیں۔ بانگِ درا میں زبان و فن کے اغلاط پر مسلسل مضمون "اقبال کی خامیاں" اسی "پارس" میں چھپتا رہا ان ہنگاموں سے کہاں پیٹ بھرتا۔ گھوم پھر کر گورنمنٹ انڈسٹریل اسکول میں ڈرائنگ ماسٹر کی ملازمت حاصل کی۔ دوست احباب طعنہ زن تھے کہ اوورسیری چھوڑ کر یہ کیا کرنے چلا ہے لیکن ستر روپے کی قلیل تنخواہ پر میں نے لدھیانے میں بارہ سال گزار دیئے۔ وہیں ایف اے اور بی اے کے امتحان پرائیوٹ طور پر پاس کئے۔ جی بھر کے پڑھا، جی بھر کے شعر کہے، مشاعروں میں شمولیت کی۔ پاٹ دار آواز، لحن سے پڑھنا۔ دور و نزدیک شہرت پھیلی۔ بالکل ایک مشاعرے باز شاعر کی حیثیت سے۔ بزم اُردو شملہ کے مشاعروں میں جا کر دادِ سخن لی۔ حسرت موہانی، جگر، جوش، بیخود، سائل، پنڈت امرناتھ ساحر، اور پنڈت کرشن کانت مالویہ سے دادِ سخن پائی مشاعروں کو لوٹا اور سمجھنے لگا کہ اب میں ہی شاعرِ اعظم ہوں۔ مشاعرے کی داد شاعر کو بر خود غلط بنا دیتی ہے۔ یہی حال میرا بھی تھا۔ ہارڈنگ لائبریری دلی نے تین بڑے مشاعرے کئے۔ ایک مشاعرے میں چار نشستوں کے صدر تیج بہادر سپرو، نواب رامپور سر رضا علی اور رائے بہادر رام کشور تھے۔ ڈپٹی کمشنر انگریز تھے مسٹر ایونز نام تھا۔ شعراء کا خیر مقدم انہوں نے فارسی میں پڑھا۔ لہجہ بھی ایرانی تھا۔

شملے کے مشاعروں میں یوں تو بہت سے اکابر سے ملا۔ لیکن ایک تعلق خاطر مسٹر غلام محمد سے ہو گیا۔ انہوں نے ۱۹۴۱ء میں دلی میں مشاعرہ کیا۔ اسی میں میری غزل بہت سرسبز ہوئی۔ غلام محمد تو ناچنے لگے۔ مشاعرے کے بعد مجھ سے کہا دلی آؤ لدھیانے میں پڑے کیوں سڑ رہے ہو۔ قصہ کوتاہ مجھے وہ ماہ فروری ۱۹۴۲ء میں دلی لے آئے اور میں سپلائی کے محکمے میں پہلے سے زیادہ تنخواہ پانے لگا۔

لدھیانے میں جب تھا تو بہت سے شعراء تھے لیکن اکثر غلط گو اور بزعم خود غلط تھے۔ ان کے امام نرلدھیانوی خود کو مصدر عنایات سمجھتے تھے۔ ان کا ایک مصرعہ آج تک یاد ہے "ذرا دیکھ دوغوف ہاٹ نہ کر" میری گلی میں نظیر لدھیانوی رہتے تھے انھیں کے پاس اٹھنا بیٹھنا تھا۔ بعد میں گوپال متل آ گئے اور وہ بھی اسی گلی میں مقیم ہو گئے۔ ویکفیلڈ گنج لدھیانہ میں یہ احباب ثلاثہ جمع ہو گئے۔ گوپال متل بڑے ذہین تھے۔ طبیعت میں براقی تھی، ہر بحث میں ایسا پڑتے تھے ایسا معلوم ہوتا کہ زیر بحث موضوع خود انھیں کا مضمون ہے۔ ان کے ساتھ جو وقت گزرا اس سے لدھیانہ میں رہتے رہتے بجھی ہوئی اور گند طبیعت میں ایک طوفان سا آ گیا اور نظیر لدھیانوی کے مکان کے باہر فی البدیہہ اشعار ہوتے۔ ادھر اُدھر کی ادبی باتیں ہوتیں، بے ادبی پر بھی اتر آتے۔ گوپال متل ایک رسالہ صبح امید کے نام سے نکالتے تھے۔ دو تین شمارے نکلے اور وہ بند ہو گیا۔ متل صاحب لاہور چلے گئے۔ یہ غالباً ۱۹۳۵ - ۳۶ کی بات ہوگی۔

شملے کے ایک مشاعرے میں سر سکندر حیات خاں صدر تھے۔ اقبال کا مصرعہ مصرعۂ طرح تھا۔ میرا ایک شعر تھا

دوروزہ عظمت و شوکت پہ بھولنے والے
اجل سے پوچھ کہ شانِ سکندری کیا ہے

لوگ داد دینے کے موڈ میں آ گئے۔ وزیر اعلیٰ پر شعری چوٹ۔ اس کے بعد جلد ہی ان کا انتقال ہوا۔ مجھے اس بات کا علم بعد میں ہوا کہ عظمت حیات اور شوکت حیات ان کے بیٹوں کے نام ہیں۔

دلی آیا تو لدھیانے کی صحبتیں یاد آنے لگیں۔ وہاں کی ادبی چودھراہٹ دلی میں کہاں میسر تھی ایک نظم کہی جس کے دو شعر یہ ہیں

دنیا کی نگاہوں میں بھلا ہوں کہ بُرا ہوں
اربابِ محبت کا ہوں پابندِ وفا ہوں
لدھیانے سے نکلا صفتِ بلبلِ ناشاد
دلی کی فضاؤں میں ہوا نغمہ سرا ہوں

میر درد روڈ نئی دہلی کے قریب ہی پریس پلیس میں رہنے لگا جو فرشاہ جہاں روڈ پر تھا۔ مٹیا محل میں خواجہ محمد شفیع کے دولت کدے پر ہر اتوار کو اردو مجلس منعقد ہوتی۔ وہیں کبھی کبھی پرانے احباب اسد ملتانی اور عبدالمجید حیرت کے ساتھ میں بھی جاتا۔ بسمل صاحب بھی کبھی کبھی آ جاتے۔ اس زمانے کا تاثر ان قطعات میں ہے۔

یہ بھی ہے اے عرش حسنِ اتفاق ÷ ملسیاں اور دلی میں قیام
اس ستارے کو چمکنے کی ہوس ÷ جس کے گرداگرد اک شمسی نظام

خوبیٔ قسمت وہاں لائی مجھے ÷ ہے جہاں دل کے لئے اکسیر درد
اور اس پہ میرے مسکن کے قریب ÷ چین سے سوتے ہیں خواجہ میر درد

از سرِ نو دل ہوا ہنگامہ زار ÷ پھر خیال و فکر کے لشکر چلے
پھر ہے ایماشے مۓ شعر و سخن ÷ جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

لال قلعے کی وہی دلی جہاں ÷ سجدہ کرتا ہے ہر اک ذی احتشام
وہ نظام الدین کی درگاہِ پاک ÷ جس جگہ جھکتا ہے ہر عالی مقام

خوبیٔ قسمت وہاں لائی مجھے ÷ ہیں جہاں کے ذرے رشکِ آفتاب
اور اس پر میرے دفتر کے قریب ÷ غالب و خسرو ہیں دونوں محوِ خواب

خسروِ ملکِ سخن کا فیض ہے ÷ غالبِ نام آورم، سنتا ہوں روز
سربسر گم ہو کے فکرِ شعر میں ÷ خوبیٔ قسمت پہ سر دھنتا ہوں روز

ان قطعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں میرے ذہن کی ساخت کس طرح ہوئی۔ میں روایت کا باغی نہیں تھا۔ قدامت کا پرستار تھا لیکن کچھ ایسا بھی تھا کہ قدامت کا طوق گلے میں تنگ نظر آتا تھا۔ میں نے بہت سی نظمیں مختلف موضوعات پہ کہیں۔ کرشن اور رام پر نظمیں لکھیں۔ رسولِ کریم کی تعظیم میں نعتیں کہیں۔ گورونانک اور گورو گوبند سنگھ کی بھی مدح کی۔ دل اپنے بچپن کے زمانے کو یاد کرتا اور رواداری کے مسلک پر چلتا۔ ملک میں فسادات ہوئے تو ملتان، ڈیرہ اسمٰعیل خاں اور کانپور کے فسادات پر دل دوز نظمیں کہیں۔ فرقہ پرست لیڈر کو مخاطب کر کے اُسے خوب سنائیں۔

میرے ضمیر ہی میں یہ بات نہیں تھی کہ مذہبی عصبیت کا شکار ہوں۔ دلی آئے ابھی پانچ سال ہی نہیں ہوئے تھے کہ تقسیم ملک کا حادثہ ہوا۔ اس نے ہر درد مند دل پر چوٹ لگائی۔ آدمی وحشی ہو گیا۔ اس حادثے نے میرے دل کو بہت مجروح کیا۔ اس زمانے کے کلام میں آدمی کی وحشت اور بربریت پر نوحہ خوانی جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ ایک طویل مسدس میرے مجموعے چنگ و آہنگ میں اسی کی یادگار ہے۔ رام پور کے مشاعرے میں سہمے ہوئے لوگوں کے سامنے جب میں نے اپنی غزل پڑھی تو لوگوں میں یقین اور اعتماد کی لہر پیدا ہو گئی۔ اس کا پہلا مصرعہ ہی اس آدم کش زمانے پر بھرپور وار تھا ؎

یہ دَور خرد ہے دورِ جنوں اس دور میں جینا مشکل ہے

پوری غزل اسی خیال کی ترجمان ہے۔ صرف تین شعر درج کرتا ہوں ؎

جب ناخنِ وحشت چلتے تھے روکے سے کسی کے رُک نہ سکے

اب چاک جل انسانیت سیتے ہیں تو سینا مشکل ہے
جو دھرم، یہ بیتی دیکھ چکے 'ایماں' یہ جو گزری دیکھ چکے
اس رام و رحیم کی دنیا میں انسان کا جینا مشکل ہے
وہ مرد نہیں جو ڈر جائے ماحول کے خونیں منظر سے
اُس حال میں جینا لازم ہے جس حال میں جینا مشکل ہے

آخری شعر پر تو سامعین تڑپ اُٹھے۔ درد انگیز شورِ تحسین بلند ہوا۔ مایوس دلوں کے لئے یہ حوصلہ مندی کا پیغام تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ شعر پڑھتا ہی چلا جاؤں۔

یہ جذبہ ہندوستان اور پاکستان کی خونریزی تک ہی محدود نہ رہا۔ نظر ذرا اور آگے بڑھی۔ دُنیا میں جنگ جوئی کے ارادے دیکھے تو نسلِ آدم کی بدعنوانیوں پر قلم رانی کی۔ جنگِ کوریا پر نظم لکھی۔ ایشیا کی مظلومیت پر ایک ترکیب بند "ایشیا کو چھوڑ دو" کے عنوان سے لکھا۔ چند شعر اس جذبے کی یادگار ہیں۔

عجیب درد ہے یہ دورِ ارتقائے جدید ÷ کہ سب کی قدر بڑھی قدرِ آدمی نہ رہی
بجھے گلا ہے یہ حکمت فروش دُنیا سے ÷ کہ بُوعلی تو بہت ہیں قلندری نہ رہی

ہم صفیروں کی نواؤں کا اثر ہے شاید ÷ ہر گرفتارِ قفس کوششِ پرواز میں ہے

عقل کی صبح کہاں جہل کی ہے رات ابھی ÷ ذہنِ انساں میں ہیں فرسودہ خیالات ابھی
آستاں امن کا لب تک نہیں مسجودِ بشر ÷ آستاں جنگ کا ہے قبلۂ حالات ابھی
عرشؔ کیوں خواب سے بیدار ہوا جاتا ہے ÷ بند کر آنکھ کہ باقی ہے یہاں رات ابھی

۱۹۴۸ء میں 'آج کل' کی ادارت ملی۔ مدیرِ اعلیٰ جوشؔ ملیح آبادی تھے جوشؔ کا ساتھ سات سال تک رہا اور اس کے بعد اُن کی کرسی عرشؔ کو ملی۔ جوشؔ زنگا رنگ مزاج کے آدمی ہیں۔ اُن سے مسلسل تعلق نے ذہن کو جلا دی شعر میں میرے نقطۂ نظر میں تبدیلی آئی اُن سے بحثیں ہوتیں۔ وہ شگوفے چھوڑتے ہماری زبان و بیان کی غلطیاں ہمیں سمجھاتے۔ کبھی ایسا معلوم ہوتا کہ وہ خالص بورژوا ہیں، کبھی وہ پرولتاری نظر آتے۔ اصل میں وہ کچھ اور ہی ہیں۔ اُن کی قدرتِ کلام نے ہمیں مرعوب کیا اس لئے جائز و ناجائز وہ اپنی بات منوا لیتے۔ اکثر معاملات میں وہ میری رائے کی قدر کرتے۔ فنی امور میں بھی کبھی شکست مان لیتے۔ اُن کے ہوتے کتنے شعرا اور ادیبوں کا جمگھٹ اُن کے گرد دیکھا۔ ایک سے ایک دلچسپ، ایک سے ایک اپنے اپنے رنگ کا مالک، مجازؔ، فراقؔ، حکیم ممنورؔ، مخدومؔ، پرویز شاہدی ایسے بادہ آشاموں کے ساتھ ساتھ جعفر علی خاں اثرؔ، گوپی ناتھ امنؔ، منورؔ، مانی جائسی، پروفیسر اجمل خاں، یونس سلیم

ریاضؔ، یو مصرا، حیرتؔ بدایونی، امجدؔ حیدرآبادی، صفیؔ لکھنوی کے علاوہ بہت سے صوفیائے صافی طینت سے بھی ان کو بہت ربط ضبط تھا۔ سات سال میں اس ادبی اور شعری ماحول کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کرتا رہا اور اس ماحول سے کسبِ فیض بھی کرتا رہا۔ جوشؔ صاحب کی شراب کی محفلوں میں تنہا اُن سے اور اُن کے احباب کے تیر باشے مطاعن کا شکار ہوتا رہا۔ عالمِ ہوش میں وہ حیرت کا اظہار کرتے تھے کہ تم کس مٹی کے بنے ہو کہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔

اُن کو فراقؔ سے محبت تھی لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ ظاہری زیادہ تھی اور باطنی کم۔ وہ کسی ہم عصر کو اپنے سے بہتر نہیں سمجھتے تھے۔ جگرؔ اور فانیؔ میں کسی کے بارے میں اُن کی رائے اچھی نہ تھی۔ فراقؔ کی ذہانت کے بہت مدّاح تھے۔ اقبالؔ کی وساطت سے یہ حیدرآباد میں ملازم ہوئے تھے۔ لیکن اس کی شاعری پر چوٹیں بھی کرتے تھے اس کے مدّاحوں کو شاہین بچے کہتے تھے۔ اب یہ بات چل پڑی ہے تو ذرا اس پر کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کروں تو بے جا نہ ہوگا۔

شاعر کو خام بدم پختہ شدم سوختم، نہیں ہونا چاہئے۔ یہ بات اقبالؔ میں تھی۔ کہ خام تھے اور پختہ ہو گئے۔ داغؔ کے شاگرد ہوئے، بڑی فرسودہ غزلیں کہتے تھے۔ پھر نیا شوالہ اور ہندوستان ہمارا کہنے پر مائل ہو گئے۔ اور تصویرِ درد کھینچی۔ اس کے بعد رُخ بدلا تو اسرار و رموز پر آئے۔ لوگ اسرار و رموز کو بہت بڑا کارنامہ سمجھتے ہیں لیکن سنائی، عطار، اور رُومؔ اس میدان میں ان کے رہنما ہیں۔ ہندوؤں کا فلسفہ ویدانت بہت آگے ہے۔ اس کے بعد نئے شوالے کا پجاری مسجدِ قرطبہ پر نوحہ زن ہوا تو پنجاب کے مسلمان اُسے ترجمانِ حقیقت کہنے لگے۔ شکوہ اور جوابِ شکوہ پہلے ہی انہیں دائرۂ اسلام میں محدود کر چکا تھا۔ پھر تو اپنی نظموں میں اسلامی تلمیحات اور ترکیبات بھرنے لگے۔ 'عورت' کے متعلق ان کے خیالات ان کی ذہنی بلندی کا ثبوت نہیں دیتے۔ گورونانک، سوامی رام تیرتھ، رام، بھرتری ہری، گوتم بدھ یہ سب کچھ ان میں ہے لیکن ان کے پورے کلام کو دیکھیں تو عشرِ عشیر بھی نہیں۔ انہوں نے الہ آباد میں مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کی اور پاکستان کے تصور کو ہوا دی جناح کے نام ان کے خطوط پڑھیے تو بجز اس کے کچھ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کو ہندوؤں سے الگ کرنا چاہتے تھے۔ یہ کہاں کی بین الاقوامیت ہے؟

ان کی شاعری کمال کی حدوں کو چھوتی تھی۔ ان کا اسلوبِ بیاں ان کا اپنا ہے۔ وہ فکر انگیز شاعر ہیں لیکن پنجاب والوں نے اُن کو بانس پر ذرا زیادہ ہی چڑھایا۔ یہ جذباتی ستائش تھی جو اعتدال کی حدوں سے نکل گئی۔

فراقؔ اور جوشؔ الگ الگ ڈھرّوں کے شاعر ہیں۔ مارکس کے دونوں قائل۔ جوشؔ میں کلاسکیت زیادہ ہے اور وہ اس میں رچے ہوئے ہیں۔ حکیم آزاد انصاری تو ان

بحر کا اثر دیکھتے تھے اور جب جوش غزل کی مخالفت کرتے تھے تو وہ کہہ اٹھتے

کیا ہو گئی نہیں شایانِ عظمتِ غزل ؛ ممکن ہو تو دعا دیجئے ایوانِ غزل
سرکار غزل میں جو مشکل سے یہ بیر ؛ افسوس ہے اے ہمگرامانِ غزل

فراق کلاسیکی دنیا سے نکلے تو ہندوستانی تہذیب اور کلچر کی نمائندگی کرنے لگے۔ ان کی شاعری میں وید، اپنشدوں، گیتا کے اشلوکوں، سنت کبیر اور سورداس کی بانیوں کا اثر ملتا ہے۔ یہ مالا، سرود، ہنس، بھیرویں وغیرہ قسم کے ناموں سے تشبیہات مرتب کرتے ہیں غزل میں بالکل انفرادی رنگ ہے۔

"ہم زندہ ہیں ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے" کی قسم کی نظمیں بھی کہتے ہیں، مزدور اور دہقان کی عظمت کا راگ جوش کی طرح ہی گاتے ہیں۔

شاید اقبال کے لئے ان دونوں کی رائے اتنی اچھی اور عقیدت مندانہ نہ ہو جتنی "شاہین" جوش کی ہے۔ جذباتی عقیدت مندی وقت کے ساتھ ساتھ مٹ جایا کرتی ہے۔ اقبال کا مقام بحیثیت فلسفی اور پیغامبر ابھی نہیں مقرر کیا جا سکتا اس کے لئے وقت چاہئے۔

جوش و فراق کا اس میں قصور نہیں، نظیر اکبرآبادی کو اس دور کے ثقہ لوگوں اور تذکرہ نویسوں نے متبذل اور سادہ گو قرار دیا تھا آج یہ حالت ہے کہ خود جوش کو میں نے یہ کہتے سنا ہے کہ نظیر ہندوستان کا اصل عوامی اور فلسفی شاعر ہے اور بڑا شاعر ہے۔

غبارِ کارواں میں کارواں کے اسیروں کا ذکر آ گیا۔ غالباً یہ ناموزوں نہیں جوش پاکستان چلے گئے، اور قرعۂ فال جب مجھ دیوانے کے نام پر پڑا تو زیادہ سنجیدگی آ گئی۔ شروع سے اب تک مشاعرہ بازی نے سوچ سمجھ کر شعر کہنے کا ایک انداز خیال پیدا ہونے دیا دوستوں اور بزرگوں نے واہ واہ تو کی لیکن شاعری میں وہ مجھے آگے بڑھنے سے روکتے رہے۔ اس لئے واہ واہ کا نشہ جب اترتا تو پھر چڑھ جاتا عالمِ ہوش میں آنے کا موقع نہ ملا۔

مجموعے تو کئی چھپ گئے۔ نثری کتابیں بھی چھپیں۔ فارسی سے برابر انس رہا سرمد کی رباعیوں کا اردو رباعیوں میں ترجمہ کیا۔ قاضی عبدالودود نے میری رہنمائی کی۔ موصوف مجھ سے عمر میں بڑے اور علم میں بہت بڑے ہیں۔ تحقیق کے میدان میں ان کا کوئی مدِمقابل نہیں۔ بہت بڑے انسان بھی ہیں۔ اس زندگی میں قاضی صاحب، مالک رام اور کشن اکبرآبادی سے بہتر انسان مجھے شاید ہی ملے ہوں۔ ذوق تو کسی ہمدم دیرینہ کی ملاقات کو مسیحا و خضر کی ملاقات سے بہتر جانتے تھے۔ میں بزرگ، ہمدرد، ہم خیال اور نیک دوستوں سے ملاقات کو نعمت غیر مترقبہ سمجھتا ہوں۔ یہ لوگ پریشان حالی اور درماندگی کے بھی دوست نہیں، ہر حال، ہر رنگ اور ہر ساعت کے دوست ہیں۔ ان لوگوں کی محبت بڑی ہموار ہے، یہ حبِ علی یا بغضِ معاویہ کے اصول پر نہیں چلتے۔

ان تین ناموں کے ساتھ پنڈت ہری چند اختر کے نام کا اضافہ ضروری ہے۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن ان کی انسان دوستی اور نیکیوں کا اخترِ تابندہ پوری طرح روشن ہے۔ وہ صاحبِ دل تھے، صاحبِ علم و فضل تھے، نہ جانے کتنی خوبیوں کے مالک تھے۔ ان کا مجموعہ ان کی زندگی کے بعد "کفر و ایماں" کے نام سے چھپا تھا افسوس ہے کہ اس صاحب کفر و ایماں کو ہندو و مسلمان بھول گئے۔ مالک رام دلی میں میرے انسائیکلوپیڈیا تو ہیں ہی۔ یوں بھی دل کو دل سے راہ ہے۔ ان کی محبت میری زندگی کا عزیز ترین سرمایہ ہے۔ جس دردِ انسانی کی جھلک بچپن میں دیکھی تھی وہ میری ذات میں زندگی بھر نمایاں ہوتا گیا۔ مالک رام اور دوسرے احباب نے اپنے طرزِ تعلقات سے اسے اور استوار کیا۔ زندگی کا یہ جوہر جسے میں نے اوّل اوّل والد محترم کی زندگی سے پایا، احباب کی مخلصانہ نوازشات سے پالا اور اپنی افتادِ طبع سے قائم رکھا، ایک ایسی واحد نعمت ہے جس پر میں فخر کر سکتا ہوں۔ شاعر سینکڑوں مجھ سے بہتر ہیں۔ نثر لکھنے والے سینکڑوں مجھ پر فائق ہیں۔

میری زندگی اور ذوقِ ادب کی تشکیل کس طرح ہوئی اس کا ایک مختصر سا خاکہ میں نے پیش کر دیا۔ کچھ لوگ اس کی تفصیل پیش کرتے ہیں تو نام و نسب سے شروع کرتے ہیں میں تو صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ میرا اصل شجرۂ نسب تو صرف والد محترم سے شروع ہوتا ہے۔ ان کا ذوقِ ادب، ان کی شرافت، ان کی پاکیزہ نفسی نے میری رہنمائی کی۔ ان کے باب میں جوش ملیح آبادی کہا کرتے تھے کہ ایک گاؤں اور وہ بھی پنجاب کے گاؤں میں رہ کر انہوں نے دلی اور لکھنؤ کی زبان کہاں سے سیکھی۔ بے علموں میں بیٹھ کر فن کیسے حاصل کیا۔ بہرحال یہ سب خدا کی دین ہے۔ انہوں نے عمر بھر ریاض کیا۔ اردو کی خدمت کی۔ نہ کوئی فلسفۂ عمل ان کے پاس ہے جس کی وہ تشہیر کرتے۔ نہ کسی مجذوبِ فرنگی کو انہوں نے پڑھا ہے "مقامِ کبریا" تک پہنچا دینے کا دعویٰ کرتے۔

میں نے بھی اتنا مطالعہ نہیں کیا جتنا آج کل کے ادیب کے لئے ضروری ہے۔ سعدی، حافظ، عطار، سنائی، رومی، ادھر ادھر سے دیکھے۔ نظیری اور صائب پر آیا، شبلی و گرامی پڑھے یہ دونوں ہندوستان کے آخری کلاسیکل شاعر ہیں جنہوں نے فارسی میں دادِ سخن دی۔ اقبال، جوش، فراق کو جی بھر کے پڑھا۔ انگریزی میں معرکۃ الآرا ناول پڑھے سیاسی اور غیر سیاسی موضوعات پر کتابیں پڑھیں۔ جستہ جستہ معتبر شعرائے انگریزی کا مطالعہ کیا۔ کبیر، تلسی، بہاری، جائسی کو پڑھا۔ اردو نظم و نثر کی کتابوں کی فہرست لکھوں تو دفتر ہو جائے۔

غالبیات سے مجھے خاص انس رہا اور مالک رام سے ربط و ضبط بڑھا تو یہ شوق خبط ہو گیا۔ ہندی میں ایک کتاب غالب بہ حیثیت شاعر اور انسان لکھی۔ رقعات

غالب کا انتخاب ہندی میں کیا۔ آج کل کے ماہ فروری کے شمارے میں ہر سال غالب سے متعلق نادر مضامین شائع کئے۔ اب بھی فرصت ہوتی ہے تو کلیات غالب فارسی لے کے بیٹھتا ہوں اور اس قسم کے شعروں پر سر دھنتا ہوں

با من میاویز اے پدر فرزند آذر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد

تو اے کہ معتقدِ شاعران پیشینی
مباش منکر غالب کہ در زمانہ تست

یہ شعر اس زمانے کے شعر نظر آتے ہیں۔ اور غالب کی ترقی پسند ذہنیت کے آئینہ دار ہیں علم و فضل میں مولانا آزاد سا نابغہ اس دور میں نہیں دیکھا۔ ڈاکٹر سید عابد حسین اور سید مسعود حسن رضوی ادب کے ستون ہیں۔ خواجہ غلام السیدین جدید و قدیم علوم کا مجموعہ ہیں اور کس کس کا نام گناؤں۔ میں نے ان سب کی تحریروں سے فیض پایا ہے۔

تقسیم سے پہلے لاہور اُردو کا مرکز تھا کتنے ادیب جمع تھے۔ تاجور نجیب آبادی کی کوششوں سے اُردو مرکز قائم ہوا تو جگر، یگانہ، اصغر، فہیم گوالیاری سیفی سیوہاروی اور نہ جانے کون کون وہاں پہنچ گیا۔ حفیظ، تاثیر، تبسم اور ہری چند اختر کی چار یاری، سالک و مہر کی صحافتی ہم رکابی، چراغ حسن حسرت اور پطرس کی بذلہ سنجی اور مزاح نگاری، ظفر علی خاں کی نظم و نثر کا طنطنہ، پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی اور میاں بشیر احمد کی دوستی، سر عبدالقادر اور دیوان بہادر راجہ نریندر ناتھ کی علم دوستی اور ادب پروری، پنڈت راج نرائن ارمان کی ہمہ دانی، شیو برت لال دامن اور محمد اسلم کی ناول نگاری، امتیاز علی تاج کی ڈرامے سے محبت، خواجہ دل محمد کی ہمہ رنگی، کس کس کا ذکر کیا جائے، اقبال تو ان سب کے سرخیل تھے ہی۔ یہ تو بڑ کا درخت تھے۔ اُن کے سایے میں کوئی شاعر اونچا نہ اُٹھ سکا سوائے حفیظ کے جس نے الگ راہ اختیار کی اور شعر و نغمہ کا امتزاج کیا۔ اب میاں بشیر احمد، حفیظ، تبسم اور ایم اسلم کے سوا سب عالم بقا کو سدھار چکے ہیں۔ ان سب نے اُردو کا پرچم بلند کیا فیض احمد فیض نے بھی نئی شاعری کی شاہراہ پر گامزنی کی اور نئی راہ نکالی۔ ایک محفل میں راجہ نریندر ناتھ، سر عبدالقادر اور جوگی کے عنوان سے مشہور نظم کے خالق منشی محمد ناظر جیسے بزرگوں کو دیکھا وہ آپس میں چہلیں کرتے اور سامعین خوش ہوتے۔

اولاد حسین شاداں بلگرامی، محمود شیرانی، پرنسپل محمد شفیع اورینٹل کالج کی جان تھے۔ ان اکابر کو میں نے دیکھا، ان کی تصنیفات، ان کی گفتگو، ان کی علم دوستی سے رہنمائی حاصل کی۔ لیکن زمانے میں پائداری کسے نصیب ہے۔ تقسیم کے بعد اُردو کا انحطاط شروع ہوگیا۔ سیماب، آرزو لکھنوی، اختر حیدرآبادی اور بعد میں نیاز فتحپوری پاکستان گئے اور جاتے ہی عالم فانی کو چھوڑ گئے۔ اب مہاجرین میں صرف جوش ہیں جو قریب قریب گوشۂ تنہائی میں ہیں۔

ادھر بھی پنجاب میں اُردو نے دم توڑ دیا۔ اب اس کا حال اس شعر کے مصداق ہے ؎

نہ پوچھ حال میرا چوبِ خشکِ صحرا ہوں
لگا کے آگ مجھے کارواں روانہ ہوا

اتنا بڑا انقلاب آنکھوں سے دیکھا۔ سخت جانی بروئے کار آئی۔ اُردو کا دامن اب بھی تھامے ہوئے ہوں ہندی میں لکھتا ہوں تو اُردو ہی سے متعلق لکھتا ہوں۔ یہ خوبصورت و چیدار زبان کیوں سیاست کی نظر ہوگئی۔ اس المیے کی تشریح کون کرے۔ اب تو پاکستان میں بھی حفیظ اور فیض یہ کہہ رہے ہیں کہ پنجاب کی زبان پنجابی ہے۔ انھیں مبارک ہو۔ پنجابی میں صوفی شعراء گزرے ہیں۔ بلھے شاہ وارث شاہ اور غلام رسول کی دین سے کسے انکار ہے۔ لیکن اُردو نے بھی تو بہت کچھ بخشا ہے۔ یہ بھی سلامت رہے تو کیا بُرا ہے۔

ادھر ہندوستان میں دیوناگری رسم الخط اختیار کئے جانے کی آوازیں بھی اٹھ رہی ہیں۔ اس بحث میں کون پڑے۔ مجھے امید ہے کہ اُردو کی خدمت کرنے والے خدمت کرتے رہیں گے۔ ہم لوگ تو قریب قریب اپنا کام کر چکے۔ وہ اچھا تھا یا بُرا اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔

اب نئی تعلیم کے زیور سے آراستہ نوجوان نئی آن بان سے نکلے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ ن۔ م راشد اور میراجی پرانوں کی فرسودگی کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہوئے وہ زمانہ بھی گزر گیا۔ ترقی پسند تحریک چلی وہ وقت بھی اب نہیں رہا۔ اب جدید ادب کا زمانہ آیا ہے۔ شاعری نئی، افسانہ نگاری نئی، تنقید نئی حتیٰ کہ تحقیق بھی نئی۔ پڑھے لکھے نوجوان جو سوجھ بوجھ سے جدیدیت کا نعرہ لگاتے ہیں ان کا نعرہ قبول۔ ان کی تخلیقات میں بھی جان ہے۔ ان کی باتیں بھی فکر انگیز ہیں لیکن ایک بھیڑ بے راہ رَو نوجوانوں کی بھی ہے جو کاتا اور لے دوڑی کے اصول پر چلنا چاہتے ہیں۔ جن کی تخلیقات میں نہ فکر کی گہرائی ہے اور نہ بیان کی عمدگی۔ ان کو کون سمجھائے گا۔ ہر نئی چیز پرانی ہو جاتی ہے۔ اس نئے ادب کے بعد جو ادب آئے گا۔ وہ کیا ہوگا۔ اس سے بھی بدتر ہوگا یا بہتری کی تصویر ہوگا۔ ہم تو بساط بھر جو کرنا تھا کر چکے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ سیلاب سب کو خس و خاشاک میں بہالے جائے گا یا کہیں تھم جائے گا ــــ

نئے علوم، نئے فنون، نئی طرز معاشرت سب ادب پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اُردو ادب اس سے مبرا نہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ آہستہ روی اور اعتدال پسندی

* حال میں اُن کا انتقال ہوگیا ہے (ادارہ)

سے آگے بڑھ جائے۔ تیز روی میں ٹھوکر کھانے کا خطرہ بھی ہے۔

میں نے دیکھا ہے کہ غزل ایسی مردود صنفِ سخن میں بھی جدید فنکار قابلِ تعریف اصلاحی و متضاد باتیں نئے انداز سے کہہ جاتے ہیں۔ یہ فالِ نیک ہے لیکن ہر نئے دور میں روایت بیشتر طریقہ وہ خوش آئندہ ہو قائم رہی ہے۔ روایت کو محض روایت کہہ کر گردن زدنی قرار دینا بصیرت کی بات نہیں

میں نے اپنے گرد و پیش کی بہت سی نئی اور پرانی باتیں کہہ دیں۔ میرے نزدیک یہ باتیں حق ہیں ناحق نہیں ؎

بت پرستی کیجئے یا حق پرستی کیجئے
یاس کس دن کے لئے ناحق پرستی کیجئے

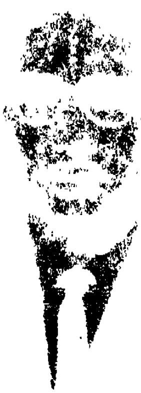
شعر و ادب کی کوئی منزل آخری منزل نہیں۔ اس دولت میں جس نے جو بھی تھوڑا بہت اضافہ کیا ہے یا کر رہا ہے قابلِ صد مبارکباد ہے۔

میں زندگی بھر یہ سوچتا رہا کہ ملازمت سے سبک دوش ہو کر سیاسی ہواؤں میں بھی اڑ کر دیکھوں گا اور اس طریقے سے تحریر و تقریر دونوں کے ذریعے ادب کی خدمت کروں گا لیکن ایسے وقت میں کنجِ قفس سے نکلا کہ بال و پر کمزور ہو چکے تھے اب سمجھ میں آیا کہ ادیب کے لئے سیاسی فضا کی ہوا بادِ سموم سے کم نہیں اس لئے منقار زیرِ پر ہونا ہی بہتر سمجھا۔

کارواں آگے نکلتا جا رہا ہے۔ میں ابھی راہ ہی میں ہوں، اور اس شعر کا مصداق بن گیا ہوں ؎

خدا جانے کہاں ہے میری منزل ؛ غبارِ کارواں ہے اور میں ہوں





# غزل

### مخمور سعیدی

بھیڑ میں ہے مگر اکیلا ہے
اس کا قد دوسروں سے اونچا ہے

دل میں جو چٹکیاں سی لیتا ہے
یہ سیہ، سرد ہاتھ کس کا ہے

اپنے اپنے دکھوں کی دنیا میں
میں بھی تنہا ہوں وہ بھی تنہا ہے

منزلیں غم کی طے نہیں ہوتیں
راستہ ساتھ ساتھ چلتا ہے

ساتھ لے لو سپر محبت کی
اس کی نفرت کا وار سہنا ہے

تجھ سے ٹوٹا جو اک تعلق تھا
اب تو سارے جہاں سے رشتہ ہے

خود سے مل کر بہت اداس تھا آج
وہ جو ہنس ہنس کے سب سے ملتا ہے

اب مراسم میں وہ تپاک نہیں
ملنا جلنا یہ چند دن کا ہے

اور تو یاد ہے اسے سب کچھ
وہ مگر خود کو بھول بیٹھا ہے

غمِ دل کو عزیز رکھتا ہوں
یادگارِ نشاطِ رفتہ ہے

سب چلے، تم بھی اٹھ چلو مخمورؔ
میکدہ بند ہونے والا ہے

# پروفیسر عبدالقادر سروری

خواجہ احمد فاروقی

آہ یہ دُنیا یہ ماتم خانۂ برنا و پیر
آدمی ہے کس طلسم دوش و فردا میں اسیر

۱۳ مارچ کی رات کو شنکر وشاد کی یاد میں مشاعرہ تھا اُس روز صبح کو کشمیر گرلز کالج کی لیکچرار بلقیس فاطمہ مظہر اللہ کا ٹیلیفون آیا کہ پروفیسر عبدالقادر سروری کا ناگہانی سرینگر میں انتقال ہوگیا اور قضا و قدر نے اتنی مہلت بھی نہ دی کہ علاج ہو سکتا ۔ چنداں اماں نہ داد کہ شب را سحر کند

سروری صاحب ہندوستان کی تین مشہور و معروف یونی ورسٹیوں میں اُردو کے پروفیسر اور صدر شعبہ رہ چکے تھے اور یہ معمولی اعزاز نہیں ہے حیدرآباد اور میسور کی ملازمت ختم کرنے کے بعد وہ کشمیر یونی ورسٹی کی کرسی پر فائز ہوئے۔ سرینگر نسبتاً دُور ہے لیکن اُردو کا کوئی کام اور کوئی تحریک ایسی نہیں تھی جس سے قریبی طور پر وابستہ نہ رہے ہوں۔ انجمن ترقی اُردو ہند، ترقی اُردو بورڈ، ساہتیہ اکادمی اور جشن غالب کمیٹی کے ممبر رہ چکے تھے۔ ۲۹ اور ۳۰ جنوری سنہ ۱۹۷۱ء کو ہمارے شعبہ میں اُردو رسم الخط پر سے می نار تھا اس کی ان کو بے انتہا خوشی تھی اور انہوں نے شرکت کا وعدہ فرمالیا تھا لیکن بعض مجبوریوں کی وجہ سے شرکت نہ ہوسکی جیسے ۷ فروری سنہ ۱۹۷۱ء کے خط میں لکھتے ہیں۔ (یہ انکی آخری تحریر ہے جو میرے پاس محفوظ ہے)

حیدرآباد ۷ فروری سنہ ۱۹۷۱ء

محب مکرم

آپ کا خط رسم خط کے سلسلہ میں سرینگر ہوتا ہوا یہاں ایسے وقت ملا کہ آپکے لئے مضمون لکھنا ممکن نہ تھا۔ اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ فوراً جواب بھی نہ دے سکا یہ سوچ رہا تھا کہ عزیزی رفعت کی شادی کے دعوت نامے کے ساتھ خط بھی لکھ دوں گا۔ یہ ذرا ملتوی ہوگئی۔ ۱۵ فروری ۱۹۷۱ء مقرر ہوئی ہے۔ مجھے توقع ہے آپ اور احتشام صاحب شادی میں شریک ہوسکیں گے۔

ہم ۲۰ مارچ کو انشاء اللہ آپ کے شعبے میں ملیں گے۔ پروفیسر احتشام حسین نے آپ کو خط لکھ دیا ہے۔

۲۲ دسمبر کو میں نے گھر پر فون کیا تھا۔ صاحب زادی سے بات ہوئی تھی۔ پتہ نہیں آپ کو اطلاع ہوئی یا نہیں۔ خط حیدرآباد ملتا تو مضمون لکھ دیتا۔

آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ جموں اور کشمیر میں اُردو کی ادبی تاریخ میں نے مکمل کرلی ہے۔ تین جلدوں میں لکھی ہے۔ ریاست کی کلچرل اکادمی اُسے چھاپنا چاہتی ہے۔ دیکھئے کب تک چھپ جاتی ہے۔

سب کی خیر و عافیت کا متمنی مخلص

عبدالقادر سروری

اس خط کے سلسلے میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ ۲۰ فروری کو ہمارے شعبۂ اردو میں ترویجی یونی ورسٹی کا زبانی امتحان تھا۔ اس میں پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر احتشام حسین اور پروفیسر گیان چند آئے تھے۔ میں اس روز دہلی میں موجود نہیں تھا۔ اس لئے ان دوستوں سے نیاز حاصل نہ کرسکا۔ لیکن حسن اتفاق سے سروری صاحب

۲۸ فروری کو حیدرآباد میں ملاقات ہوگئی۔ پروفیسر رفیعہ سلطانہ کے مکان پر پھول بن پورے پہر کے کھانے کی دعوت تھی، اس میں وہ بھی مدعو تھے۔ میں نے کبھی ان کو اتنا خوش و خرم، اتنا صحت مند اور اتنا مطمئن نہیں دیکھا۔ اطمینان کا سبب غالباً یہ تھا کہ وقت کی شادابی کے فرض سے سبک دوش ہو گئے تھے اور کشمیر کی ادبی تاریخ تین جلدوں میں مکمل کر چکے تھے کہنے لگے: "فاروقی صاحب میں نے آپ کے حکم کی تعمیل کر دی ہے۔ کشمیر میں اُردو کی ادبی تاریخ تین جلدوں میں مرتب ہوگئی۔ اب اس کے چھپوانے کی ذمہ داری آپ کی ہے۔" یہ میری اُن سے آخری ملاقات تھی۔

۸ مارچ کو حیدرآباد سے سرینگر جاتے ہوئے وہ ذرا دیر کو دہلی میں رُکے اور مجھے اسٹیشن سے ٹیلی فون کیا۔ میری بدقسمتی کہ اس روز ایسا گھرا ہوا تھا کہ ان کی خدمت میں اسٹیشن نہیں پہنچ سکا لیکن جو گفتگو ٹیلی فون پر ہوئی۔ وہ بھی کچھ کم اہم نہیں تھی۔ میں نے عرض کیا کہ سروری صاحب اب آپ میرے پاس دہلی آجائیے۔ ایک صورت نکلی ہے۔ خواہ مخواہ کے بہانے مت کیجئے گا۔ میں آپ کی جگہ ہوتا تو جنت سے بھی بھاگ کھڑا ہوتا۔

"بہ فردوس ہم دل نیا سایدم

کہتے: بڑے بڑے سفر کرتے ہیں آپ اس عمر میں، اور جی نہیں گھبراتا آپکا۔" کہنے لگے زندگی تو ذوقِ سفر ہی ہے لیکن حضرت یہاں بھی تو آپ ہی نے بھیجا تھا۔

چہ می کردم اے بندہ پرور خدا شے"

مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ اس سے بڑے سفر پر جانے والے ہیں اور ان کا ذوقِ عمل موت کو بھی ماندگی کا ایک وقفہ سمجھے گا۔

سروری صاحب زندگی بھر علمی کاموں میں مصروف رہے۔ مقالات کو چھوڑ کر جن کی تعداد تین سو کے قریب ہے ان کی مشہور تصانیف یہ ہیں۔

۱۔ جدید اُردو شاعری

۳۔ پھولبن

| | | |
|---|---|---|
| ۵۔ سراج سخن | ۲۔ کلیات سراج<br>۴۔ قصۂ بے نظیر | } کی ترتیب اور تصحیح |

۶۔ زبان اور علم زبان ۷۔ اُردو مثنوی کا ارتقاء ۸۔ دُنیائے افسانہ

۹۔ اُردو کی ادبی تاریخ

۱۰۔ سراج سخن<br>۱۱۔ انتخاب ظفر } شاہ سراج اور بہادر شاہ ظفر کے کلام کا انتخاب

۱۲۔ کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ

۱۳۔ کشمیر میں اُردو کی ادبی تاریخ۔ تین جلدوں میں

لیکن اس سے بھی زیادہ اہم یہ ہے کہ وہ ہر علمی کام کرنے والے کی فیاضی سے مدد کرتے تھے اور اس معاملہ میں بخل نہیں کرتے تھے۔ وہ مجھے تین جون ۱۹۵۹ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

حیدرآباد دکن

مورخہ ۳-۶-۵۹ء

"محب مکرم"

کرم نامہ مورخہ ۲۳ مئی عنایت ہوا۔ شبہ اور اہلِ محبت سے، پرستاروں کی لعنت میں کفر کے مترادف ہے۔ آپ کی دی ہوئی بشارت ایک ضخیم مقالہ کی شکل میں مجسم ہوئی۔ اب اس کو پڑھنا ہے۔

محوزہ "چار درویشوں" کے بارے میں آپ کو کس طرح کا مواد درکار ہے۔ جامعہ عثمانیہ میں ان کے بارے میں شاید کچھ زیادہ مواد نہ مل سکے لیکن کتب خانہ آصفیہ اور کتب خانہ سالار جنگ میں مل جائے گا۔ کتب خانہ آصفیہ میں دیوان اثر کا ایک قلمی نسخہ ہے ان "چار درویشوں" کے بارے میں وہاں جو مواد چاہئے انشا اللہ اس کی سبیل نکل آئے گی۔"

سروری صاحب انجمن اساتذہ اُردو جامعات ہند کے بانیوں میں سے تھے اور اس کے سب سے پہلے صدر۔ ان کی صدارت میں انجمن کے تین سالانہ جلسے ہوئے۔ سب سے پہلا اجلاس دہلی میں ہوا۔ دوسرا سرینگر میں اور تیسرا علی گڑھ میں ــــ ان کو اس کا سخت رنج تھا کہ چوتھا اجلاس اب تک نہیں ہوا۔ وہ برابر اس کی کوشش اور پیروی میں لگے رہتے کہ ہم کہیں سر جوڑ کر بیٹھیں۔ مجھے ان کے ساتھ بحیثیت جنرل سکریٹری انجمن اساتذہ کام کرنے کا شرف حاصل ہوا اور میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ بے مثل تنظیمی صلاحیت کے مالک تھے اور اُن کو اُردو سے گہری اور سچی محبت تھی، جس میں جذبات کم اور علم و عمل کا دخل زیادہ تھا۔

سن ۱۹۶۱ء میں میں یورپ اور امریکہ گیا اور اٹھارہ مہینے کے بعد واپس آیا۔ میری واپسی پر سروری صاحب نے لکھا: "رام چندر جی کی غیر حاضری میں ان کے بھائی بھرت تخت و تاج کو سنبھالے رہے۔ اب آپ آگئے ہیں حضرت۔ انجمن اساتذہ اُردو کو سنبھالئے اس کے ضروری کاغذات آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔"

سروری صاحب بڑے اصرار و کوشش سے سرینگر بلواتے تھے اور جو بھی اُردو کے حلقہ کا دوست یا عزیز وہاں پہونچ جاتا تھا اس کے ساتھ بیشتر وقت صرف کرتے تھے۔ میرے حال پر غیر معمولی کرم تھا۔ ۱۸ جون ۱۹۶۴ء کے گرامی نامے میں سرینگر سے لکھتے ہیں۔

"محب مکرم

آپ کا تار تین چار دن پہلے عنایت ہوا تھا۔ جواب کی جلدی نہیں تھی ۔

اس زمانے میں مجھ سے کچھ تاخیر سے کام لیا۔ آپ کے نہ آسکنے کا بہت افسوس ہے میں نے خط لکھنے کے بعد آپ کے گھر پر ٹرنک کال کی۔ بیگم صاحبہ سے معلوم ہوا کہ آپ دلّی میں نہیں ہیں۔ کئی دن انتظار کے بعد چونکہ رجسٹرار کو جلدی تھی۔ اس لئے . . . صاحب کو بلوایا۔ یہ بہت اچھا موقع تھا۔ آپ اور بیگم صاحبہ سب یہاں آسکتے تھے اب ایک اور صورت نکالنے کی کوشش کی ہے غالباً اس کا تذکرہ میں نے آپ سے کیا تھا۔ میں نے ایک سیمی نار غالب پر مقرر کرنے کی تحریک یونی ورسٹی کو بھیجی ہے۔ اس میں آپ کا سرور صاحب، احتشام صاحب اور نورالحسن ہاشمی کا نام بھی تجویز کیا ہے۔"

لیکن میں پانچ برس کے بعد ۱۹۷۹ء کی گرمیوں میں کشمیر پہنچ سکا؛ ڈل جھیل کی ایک ہاؤس بوٹ "پی کاک" میں ٹھہرا۔ اس موقع پر انہوں نے مجھے ایک توسیعی لیکچر دینے کے لیے مدعو فرمایا۔ وہ مجھ سے ملنے کے لیے شکارے میں بیٹھ کر آیا کرتے تھے۔ اور خال مرزا نیت پوری جھیل کو تیر کر پہنچتے تھے۔ وہ اس موقع پر ایک قدیم اُردو شاعر کا شعر پڑھا کرتے تھے جو مجھے یاد نہیں رہا لیکن جس کا مفہوم یہ تھا کہ تم تک رسائی ہوسکے تو یہ بحرِ بر کچھ بھی نہیں۔

ایسی محبت اور شفقت کے لوگ اب کہاں؟ ان کے یہاں نہ ڈاکٹر زور کی سی شان و شوکت تھی اور نہ عبدالحق صاحب کی سی وسعت اور بے پایانی ایک اُستاد کی سادگی اور بے ریائی تھی جو دلوں کو موہ لیتی ہے۔

ایک فقط ہے سادگی جس پہ بلائے جان ہے تو
عشوہ کرشمہ کچھ نہیں۔ آن نہیں ادا نہیں

اُردو والوں پر یہ الزام تھا کہ وہ زندگی میں کسی کی قدر نہیں کرتے مرنے کے بعد پرستش کرتے ہیں۔ ہم نے ڈاکٹر عبدالحق، سید سلیمان ندوی، ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی اور جگر مرادآبادی کے لیے کیا کیا جو اب کچھ کریں گے۔؟ میرے خیال میں اس الزام سے اب اس قبیلۂ عشق کو بری کر دینا چاہیے۔





# غزل

مظفر حنفی

حالانکہ وہ حسین نہ تھا کچھ اداؤں سا
پھر بھی ہمارے ساتھ رہا دھوپ چھاؤں سا

جس شہر میں گیا ہوں لگا مجھ کو اجنبی
جو گاؤں بھی ملا وہ لگا اپنے گاؤں سا

مرمر کے رات دن جو تراشا ہے ایک بت
وہ بھی ہے پُر جلال پرانے خداؤں سا

تم سے بھی مل کے جی کو تسلی نہیں ہوئی
تم نے بھی سبز باغ دکھایا وفاؤں سا

ہم دیوتا سمجھ کے جسے پوجتے رہے
دیکھا تو اس کا پاؤں تھا مٹی کے پاؤں سا

فردوسِ گمشدہ سے بھی شاید نہ بھر سکے
وہ سلسلہ جو ہے مرے اندر خلاؤں سا

میں معذرت طلب تو نہیں ہوں مگر یہ دیکھ
اعمال نامہ ہے کوئی میری خطاؤں سا

فکرِ معاش، فن کی طلب جستجوئے حق
ایک غول میرے پیچھے لگا ہے بلاؤں سا

اختر اورینوی

# ایک درخت کا قتل

ایک کوارٹر کے پہلو میں ایک بہت ہی اونچا، مضبوط، گھنیرا اور خوبصورت درخت تھا۔ شہر کے مشہور باغ کو بڑی بدسلیقگی سے کاٹ کاٹ کر بے ربط اور بدوضع کوارٹر کھڑے کیے گئے تھے بے ہنگم، نہ ناک درست نہ نقشہ۔ صرف ایک کوارٹر اسی چھتنار اور بلند و بالا درخت کی وجہ سے بہت بھلا لگتا تھا، ہرا بھرا، سایہ دار۔ ماحول کے بے کیف سپاٹ پن اور بدآہنگی کو دُور کرنے والا۔ گہری جڑیں، سڈول، بھاری بھرکم، اونچا تنا۔ پھیلی ہوئی صحت مند شاخیں، سرسبز کونپلیں، سندر ہرے بولتے ہوئے پتے۔ اس پیڑ کی سربلندی کو دیکھ کر جی خوش ہو جاتا تھا اور آسمان کی طرف نظریں اُٹھ جاتی تھیں۔ دل میں بڑا اعتماد اور حوصلہ پیدا ہوتا تھا جیسے مٹی سے ایسا وشال درخت اُگے وہ مقدس محسوس ہوتی تھی۔ اس پرانے باغ کے نہ جانے کتنے خوبصورت اور پھل دار درخت کاٹ کر پھینک دیے گئے ہوں گے۔ آم، لیچی، جامن، امرود اور شریفے کے پیڑ۔ اُفتادہ زمینوں اور بنجر قطعوں کی کمی نہ تھی لیکن نہ جانے کس جبلت کی تسکین کے لیے یہی حسین باغ قتل گاہ بنایا گیا۔

اس برباد باغ کی ایک تاریخ تھی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شاہی وقت کا باغ تھا۔ ایک فراخ دل نواب نے اپنے ہمجولی دوست ایک مہاراجہ کو تحفتاً یہ باغ پیش کیا تھا۔ انہیں دنوں ایک کامل فقیر باغ کے ایک گوشے میں دھونی رما بیٹھا۔ مہاراجہ نے کوئی مزاحمت نہ کی بلکہ اُسے نیک شگون سمجھا اور پہلو میں ایک قطعہ اراضی بھی شاہ صاحب کو دیدی۔ آج بھی اُس احاطے میں قبر موجود ہے۔ خدارسیدہ فقیر کا سالانہ عرس ہندو مسلمان سب دھوم دھام سے مناتے ہیں۔ جس عظیم الشان درخت کا ذکر ہے شاہ صاحب کی قبر پر سایہ کیے ہوئے تھا جیسے چتر لگانے کی سعادت حاصل کر رہا ہو۔ لوگوں میں یہ مشہور تھا کہ یہ درخت بھی متبرک ہے اور اس خطے کی خاک پاک ہے۔ جب انگریزوں کا راج ہوا تو لیفٹننٹ گورنر بہادر نے عزت دباؤ ڈال کر یہ باغ مہاراجہ سے اونے پونے خرید لیا۔ یہیں سرکار بہادر کی کوٹھی بنی مگر باغ کا بڑا حصہ قائم رہا۔ اور وقت پر پھل دیتا رہا۔ قبریں رفتہ رفتہ منہدم ہو گئیں اور اُن کے نشانات بھی مٹتے گئے لیکن پیر صاحب کی قبر جیسی تھی ویسی ہی رہی۔

۱۸۵۷ء کے ناکامیاب ہندوستانی انقلاب کے بعد اسی باغ میں کئی مجاہدوں کو سولی پر لٹکا کر شہید کر دیا گیا۔ انگریزی راج محل خون اور گوشت کے گارے سے تعمیر ہوا۔ اس وشال پیڑ نے یہ خونیں ڈرامہ دیکھا تھا۔

خلقت کہتی ہے کہ اس عجیب درخت کی خونِ شہداء سے آبیاری ہوتی رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر درخت کے پتے یا شاخیں کوئی توڑتا تو اُن سے سُرخ خون ٹپکنے لگتا تھا۔ اسی وجہ سے جب نئے کوارٹر باغ کے درختوں کو کاٹ کاٹ کر بنائے جانے لگے تو کسی بڑھئی کی یہ جرأت نہ ہو سکی کہ اس متبرک زندہ جاوید درخت پر آرا چلائے۔

یہ درخت عجوبۂ روزگار تھا۔ اس کا نام کوئی صحیح طور پر نہیں جانتا تھا۔ کوئی کچھ کہتا تھا اور کوئی کچھ۔ نہ پھول نہ پھل۔ مگر ہریالی و شادابی عین سُکھ اور سکونِ دل و جان۔ یہ بھی مشہور تھا کہ انقلاب ۱۸۵۷ء کے پہلے پھول لگتے تھے۔ پھل لگتے تھے۔ اس بات کی شہرت بھی تھی کہ فرنگیوں کی حکومت کے بعد تین چار بڑے خوشبودار پھول کھلے اور لال لال پھل آئے اور فرنگیوں کو بڑا تعجب ہوا۔ ادھر سالوں سے کسی نے پھول دیکھے نہ پھل کھائے۔ شہر بھر میں ایسا کوئی پیڑ نہ تھا۔ ریاست اور ملک بھر میں لاثانی اور فرد ہو تو عجب نہیں۔ مجھے اس درخت کے نظارے سے بڑی تسکین ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ آندھیوں اور طوفانوں کو آڑے گا۔ وہ ہمارا سپر تھا، سہارا تھا، مربّی تھا، ہمسایہ تھا۔ ساتھی تھا، دوست اور غمگسار تھا۔ وہ قطب نما تھا۔ ایک عظیم و رفیع علامت تھا۔ پورے احاطے کی انفرادیت اسی سے قائم تھی۔ میں پہروں اُسے دیکھتا رہتا تھا۔ ہر موسم میں اس کی الگ بہار تھی۔ صبح دوپہر، شام جب دیکھئے وہ دلکش تھا۔ چاندنی راتوں میں اس

[illegible] راتوں میں وہ ایک بلند وبالا اور قوی جاگتا ہوا سنتری [illegible] کی حفاظت میں ہم سب لوگ سکھ کی نیند سوتے تھے۔ اس کی خاموش [illegible] میں بھول نہ سکتا۔ کبھی تو میں یہ محسوس کرتا کہ اس درخت کا بیج میرے دل میں ہے۔ کبھی نہ کبھی وہ انکرانے گا۔ اور ایک عظیم وسرفراز شجر بن جائے گا۔

اس شاداب درخت کو کاٹ کر گرانے کی برسوں سے کوششیں ہو رہی تھیں لیکن اس کی تقدیس جاننے والے بڑھئی اور مزدور اُسے کاٹنے سے ڈرتے تھے۔ درخت کی رگوں میں لال لہو تیرتا ہے اور اس کا سایہ پیر صاحب کی خدمت گزاری کرتا ہے وہ قبر کے کنارے جیتے جاگتے پاسبان کی طرح چوکس کھڑا تھا کبھی کوئی ٹھیکہ دار دور کے شہروں سے مزدور لا کر اس پاک پیڑ کو کاٹ کے اس کی لکڑیاں بیچ کر نفع کمانا چاہتا تھا لیکن یہ دیکھا گیا کہ درخت کے کسی تنے یا شاخ پر تبر چلاتے ہی سرخ عرق ٹپکنے لگتا اور کارندوں پر دہشت طاری ہو جاتی اور کام رُک جاتا۔ ایک بار کوئی کلہاڑا چلانے والا درخت کی کسی اونچی شاخ سے گر کر مر گیا۔ کبھی کوئی مزدور خطرناک طور پر بیمار پڑ جاتا۔

غرض یہ کہ حیات اور رحمت کا علمبردار درخت فضا کی رفعتوں پر لہلہاتا رہا اور اس کا ماحول امن کا گہوارہ بنا رہا۔ اُسے دیکھ کر سکون اور شانتی کا احساس ہوتا تھا۔

پچھلی گرمیوں میں یہ جانے کہاں سے ایک سخت دل اور بے باک ٹھیکہ دار کو انجان اور ڈھیٹ کارندے مل گئے۔ اور ایک نئی ترکیب سے اس شاندار پیڑ کا قتل شروع ہوا۔ بڑے بڑے لانبے اور موٹے رسّوں سے اُسی درخت پر پھانسیاں بنائی گئیں۔ بالائی پتلی پتلی شاخوں کو کاٹ کاٹ کر پھانسی چڑھایا جانے لگا۔ پھر بڑے تنوں کی باری آئی اور اُنہیں آرے سے کاٹ کاٹ کر پھانسی پر لٹکایا گیا۔ کئی مزدور کٹے ہوئے تنوں کو آہستہ آہستہ جھلاتے ہوئے زمین پر لے آتے۔ یہ اہتمام اس لئے تھا کہ کوارٹروں کو نقصان نہ پہونچے۔ یہ پیڑ جڑ کے پاس سے گرایا نہیں جا سکتا تھا۔ اس کا دقار و جلال لرزہ پیدا کرتا تھا اس میں زمین کا جان بخش رس تھا، بلند آسمان کے کرنوں کی روشنی اور دھڑکتی ہوئی زندگی کی شادابی تھی۔

پندرہ دنوں تک اس درخت کو پھانسی دی جاتی رہی عضو بہ عضو لال لال عرق بہتا رہا پھر وہ تھوڑی دیر کے بعد خون کے چکتوں کی طرح جم جاتا۔ اس کے عرق کا رنگ ببول کے گوند کی طرح پیلا نہ تھا۔ کوارٹروں کی نالیوں میں لال لوتھڑے کیچڑ کے ساتھ مل کر بہہ رہے تھے۔

اچانک کئی مزدور بیمار پڑ گئے اور کئی موٹے موٹے رسّے پارہ پارہ ہو گئے۔ پندرہ دنوں کے لئے کام رُک گیا۔ لانبے لانبے بالوں اور چڑھی ہوئی آنکھوں والے ٹھیکہ دار کو بڑی تشویش ہوئی۔ محلّے کے لوگوں میں چہ می گوئیاں شروع ہو گئیں اور پیر صاحب کی کرامات کے چرچے ہونے [illegible] جو چاہتے تھے کہ یہ اونچا جھاڑ درخت کے [illegible] چھوٹے احاطوں میں مولی، گوبھی، آلو اور چقندر اُگا کر کچھ پیسے حاصل کر لیں [illegible] میں مولی اور چقندر کہاں اُگ سکتے تھے۔ ہاں امن وسکون، طمانیت، ملاحت اور حسن کی نشوونما ہوتی رہتی تھی اور چین کی برکھا برستی تھی۔

کام پھر شروع ہو گیا۔ درخت کے بڑے بڑے موٹے تنے [illegible] تنوں سے جہازی رسّے کئی سمتوں میں باندھے جاتے تھے اور اُن کے سرے درجنوں مزدور زمین پر کھڑے تن کر پکڑے رہتے تھے۔ درخت کے تنوں پر کلہاڑے اور آرے سے تیز دست مزدور اُس کے جوڑ بند کاٹتے جاتے تھے اور مضبوط رسوں سے باندھ کر اُنہیں آہستہ آہستہ جھلا جھلا زمین پر کوارٹروں سے بچا بچا کر گرایا جاتا تھا۔ دُور سے ایسا لگتا تھا کہ جیسے گٹھیلے بدن کے پہلوانوں کو پھانسی دی جا رہی ہے۔ اور ان کی جسیم لاشیں زمین پر پڑی ہیں روزانہ دو ہی تین تنے کاٹے جا سکتے تھے اور اُنہیں نیچے لانا بڑا مشکل مرحلہ تھا۔ رسّے کئی پہلوؤں سے باندھے جاتے اور کئی سمتوں سے کھینچے جاتے تھے اور مرکزی رسّے کو دھیرے دھیرے ڈھیل دے کر اس حساب سے دیوقامت تنوں کے ٹکڑوں کو کوارٹروں کی چھتوں اور دیواروں سے بچا بچا کر زمین پر گرایا جاتا تھا کہ ان پر ضرب نہ پڑے۔ پھر بھی زور کا دھماکہ ہوتا تھا اور در و دیوار لرز جاتے تھے۔

چند دنوں میں جیتے جاگتے، شاداب ومسرت بار درخت کا عضو عضو کاٹ ڈالا گیا جیسے پہلے لوگوں کو صلیب پر چڑھانے کے بعد اُن کی ہڈیاں توڑ دیتے تھے۔ میرا ذہن مہینے بھر تک سولی پر چڑھتا رہا اور میرے دل کو صلیب دی جاتی رہی۔

اب ایک محیط رعب دار جڑیلا تنا اور اسی سے نکلے ہوئے دو شاخہ تنوں کے ٹکڑے بے برگ وبار بے دم ہو کر رہ گئے۔ اوپر کے دونوں تنوں سے بندھے رسّے جھول رہے تھے۔ ایک صبح میں اپنے احاطہ میں ٹہل رہا تھا۔ میری نظر اس ٹھنٹھ درخت پر پڑی۔ زمین پر تنوں کی لاشیں بے سدھ بکھری پڑی تھیں۔ بہت سے تنے اور شاخیں ٹھیکہ دار بیل گاڑیوں میں لے جا چکا تھا۔ اس وقت مجھے ایسا محسوس ہوا کہ سامنے ایک دیوقامت غلیل ہے۔ اس کا عظیم دو شاخہ آسمان تک بلند ہونا چاہتا تھا اور دستہ دھرتی کے ہاتھوں میں ہے۔ اور اب شکتی شالی دھرتی کٹے ہوئے تنے کے چھوٹے چھوٹے ٹونوں کو جھولی پر جما کر شست باندھے گی اور قاتلوں پر بھرپور نشانہ لگائے گی ——

ایک روز دو شاخہ بھی کاٹ دیا گیا۔ مگر گرتے گرتے دو شاخہ کے ایک بازو نے ایک کوارٹر کی دیوار سے ٹکرا کر اُسے شق کر دیا اور دوسرے بازو نے دوسرے کوارٹر کی گیراج کی چھت کو پارہ پارہ کر ڈالا۔

نہ جانے کیوں مہینوں قتل و غارت کا کام پھر ٹھیکیدار نے روک دیا اور وسطی جو بیلا تنا دیوار سے لگی ہوئی لاش کی طرح کھڑا رہا۔

ہفتوں یہ دردناک تنا مقتول امن و شادابی کی علامت بن کر میرے دل میں تیر نیم کش کی طرح پیوست رہا۔ اور دو شاخے کے دونوں بازو کسی عظیم کٹی ہوئی سپاہی کے بالائی حصوں کی مانند اس سرو تن بُریدہ درخت کی لاش کے سامنے زمین پر پڑے رہے۔

بیساکھ اور جیٹھ کے مہینے ختم ہو گئے اور اساڑھ آگیا۔ وقفے وقفے سے بادل کے ٹکڑے آئے اور کچھ چھڑکا ؤ ہوتا رہا۔ ایک صبح ننّھا پر درمعجزہ نمودار ہوا اُسے دیکھ کر ہم سب خوشی سے لہلہا اُٹھے۔ چند ہی دنوں بعد ٹھیکیدار پھر نمودار ہوا اور درخت کے وسطی تنے پر مزدوروں کو آرا چلانے کے لئے آمادہ کیا۔ پہلے کلہاڑیاں چلنے کی آوازیں آئیں ہم چوکنا ہو گئے! اور بھاگتے ہوئے مقتول درخت کی طرف دوڑ پڑے دیکھا کہ درخت کو جڑ سے کاٹا جا رہا ہے۔

ہم لوگوں نے ٹھیکیدار اور عملوں سے پرزور احتجاج کیا اور انہیں صاف صاف بتا دیا کہ جڑ والا تنا ہرگز نہیں کٹے گا۔ جو زمین پر تنوں کے گرے ہوئے ٹکڑے ہیں انہیں چاہو تو اٹھا کر لے جاؤ جڑ میں اب ہرگز ہاتھ لگانے نہیں دیا جائے گا۔ تند و تیز مجادلے کے بعد ٹھیکیدار اور اس کی ذریت دفع ہوئی اور دوسرے دن وہ لوگ تنوں کے افتادہ ٹکڑے لاد کر لے گئے۔

مجروح جڑ والا تنا صبر، استقلال، اطمینان اور امید کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے بالائی پہلو میں سرسبز نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں اور کواڑوں کی چھتوں سے اونچی چند نئی ہری بھری شاخیں ہوا میں لہرا رہی تھیں۔

وہ رحمت نشاں درخت مر کر پھر جی اٹھا تھا۔



# غزل


مغیث الدین فریدی


بے شوق طلب، بے ذوق نظر، بے رنگ تھی اُن کی گل بدنی
یہ کوہکن مجنوں کی نظر شیریں بھی بنی لیلیٰ بھی بنی

دیکھے ہوئے اُن کو دیر ہوئی ہر نقش ابھی تک تازہ ہے
بے گانہ وشی، مستانہ روی، جادو نظری، شیریں سخنی

اپنا بھی گریباں دیکھ ذرا، پھر میرے جنوں پر ہنس لینا
عادت میں تری پیماں شکنی فطرت میں مری زنداں شکنی

ہم اپنے ہی گھر میں رہتے تھے جب تیری نظر میں رہتے تھے
اب روز ہمیں تڑپاتی ہے اے دوست وطن میں بے وطنی

پھولوں میں چھلکتے ہیں جیسے شاخوں پہ گماں آغوش کا ہے
کچھ ایسی بسی ہے نظروں میں گل پیرہنی، نازک بدنی

شعلوں میں بکھرتے ہیں جو ہر قسمت پہ فریدی طنز نہ کر
غم ایسی ہی نعمت ہے جس کو پاتے ہیں یہاں قسمت کے دھنی



# تبصرہ نگاری کا فن

شمس الرحمٰن فاروقی

تبصرے کے بارے میں چھان بین کے کئی پہلو ہو سکتے ہیں۔ اخلاقی، ہیئتی، علمی، اخلاقی پہلو سے بات کی جائے تو اس طرح کے سوال اٹھائے جائیں گے۔ تبصرے میں غیر جانب داری کا کیا مقام ہے؟ مبصر کے لئے کتاب سے کس حد تک واقف ہونا ضروری ہے؟ تبصرہ نگار کو کتاب کے نقائص کی نشان دہی اور اس کے محاسن کی تعریف میں کیا تناسب رکھنا چاہئے وغیرہ ہیئتی چھان بین میں کچھ اس طرح کے سوالوں سے بات شروع ہوگی۔ تبصرہ فن ہے یا مشق یعنی Art ہے یا Skill دوسرے الفاظ میں، کیا تبصرہ نگار بھی شاعر کی طرح تلمیذ الرحمٰن ہوتا ہے یا مشق و مزاولت کے بل بوتے پر ہر شخص تبصرہ نگار بن سکتا ہے؟ تبصرہ کتنا طویل ہونا چاہئے؟ تبصرہ نگاری اور تاثرات نگاری میں کیا فرق ہے؟ کیا مبصر کے لئے ضروری ہے کہ وہ بھی اس فن کو برتتا ہو جس کا اظہار کتاب میں کیا گیا ہے؟ یعنی کیا شعری مجموعے کے مبصر کا شاعر ہونا ضروری ہے؟ علمی نقطۂ نظر سے گفتگو میں صرف ایک ہی سوال ہوگا یعنی یہ کہ تبصرہ اور تنقیدی مضمون میں کیا فرق ہے۔

میں اس مختصر سے مضمون میں تبصرہ نگاری کی تاریخ اور اردو کے اچھے یا مشہور تبصرہ نگاروں کے بارے میں کچھ نہ کہوں گا۔ حالی سے لے کر آل احمد سرور محمد حسن عسکری سے لے کر محمود ایاز تک اردو میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں رہی ہے جنہوں نے بہت اچھے تبصرے لکھے ہیں۔ ان مسائل پر معلومات حاصل کرنے کے اور بھی ذرائع ہیں۔ میں تبصرہ نگاری کے صرف اخلاقی اور علمی مسائل پر کچھ ضروری اشارے کروں گا۔

اخلاقی مسائل کو میں نے اس لئے اہمیت دی ہے کہ یہی مسائل تبصرے کے قاری، کتاب اور مبصر سے براہ راست متعلق ہیں۔ اور یہ رشتہ نہ صرف براہ راست ہے بلکہ بہت گہرا اور اصلی بھی ہے: بحیثیت ایک قاری میری دلچسپی صرف یہ ہے کہ میں کتابوں کے بارے میں معلومات حاصل کروں مجھے اس بات سے چنداں سروکار نہیں ہے کہ تبصرہ نگار کسی فن کا مظاہرہ کر رہا ہے یا کسی مشق یعنی Skill کا؟ مجھے اس سے بھی کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے کہ جو تبصرہ میں پڑھ رہا ہوں اس میں اور کسی تنقیدی مضمون میں کیا فرق ہونا چاہئے ہیئتی سوالات تو محض طالب علموں کی دلچسپی کے ہیں، علمی سوالات کی اہمیت صرف تبصرہ نگار کے لئے ہے لیکن اخلاقی سوال میں تینوں شرکا (قاری، کتاب اور مبصر) پوری طرح الجھے ہوئے ہیں اس لئے اس سوال کو حل کر لیا جائے تو تبصرہ نگاری کے بارے میں بہت سی بنیادی باتیں صاف ہو جائیں گی۔

کچھ دن ہوئے ایک معروف شاعر نے اپنے دیوان کے دیباچے میں لکھا کہ تبصرے کی نوعیت محض ایک اشتہار کی ہوتی ہے اس افسوسناک نظریے پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم

ہوا کہ حقیقت اپنی جگہ برقرار رہتی ہے کہ ادبی برادری کا ایک بڑا اور سنجیدہ طبقہ تبصرے کے اخلاقی مسائل سے اس درجہ بے خبر ہے کہ وہ اسے محض ایک جانب دارانہ تقریظ سمجھتا ہے۔ بلکہ تقریظ تو پھر بھی کتاب کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلومات حاصل کرنے کے لئے لکھی جاتی تھی۔ لیکن اشتہاری عبارت بنانے والے کو تو اکثر یہ خبر نہیں ہوتی کہ وہ کس چیز کی تعریف کر رہا ہے۔ عبارت بنانے والے سے کہہ دیا جاتا ہے کہ بھائی ایک نیا صابن بازار میں آنے والا ہے، اس کے لئے عبارت بنا دو، وہ اپنی جودتِ طبع کو کام میں لاکر کوئی دلچسپ یا توجہ انگیز عبارت گھڑ دیتا ہے۔ اگر تبصرہ اتنے ہی پست درجے کی چیز ہے تو پھر ادیب اور قاری (ادیب خاص طور پر، قاری عموماً) اپنی پسند کا تبصرہ نہ پاکر اتنے برہم کیوں ہوتے ہیں۔؟

ہماری جدید ادبی صورت حال کا ایک عبرتناک پہلو یہ ہے کہ ہم ایک طرف تو اپنے اوپر اچھے سے اچھا تبصرہ دیکھنے کے مشتاق رہتے ہیں اور اس کے لئے سعی بھی کرتے ہیں، اور دوسری طرف تبصرے کو اشتہار بازی کی سی گھٹیا چیز بھی سمجھنے پر مصر رہتے ہیں۔ یہ رویہ خود اعتمادی اور فنی ایمان داری کے فقدان کی دلیل ہے۔ اردو میں آزاد اور بے خوف تبصرہ نگاری کی روایت کے عدم استحکام کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ادیبوں نے اکثر تبصروں سے اشتہار کا سا کام لیا ہے یا لینا چاہا ہے۔ چنانچہ اب بھی اگر کسی کتاب پر تعریفی یا تنقیصی تبصرہ ذرا بھی معمول سے ہٹا ہوا نظر آئے تو فوراً یہ افواہ اڑ جاتی ہے کہ مبصر یا رسالے کا مدیر مصنف کا دشمن یا دوست ہے۔ دراصل ہمارے یہاں تقریظ، دیباچہ اور تبصرہ ایک ہی قبیل کی چیز سمجھ لئے گئے ہیں، بس اس فرق کے ساتھ کہ تقریظ میں تعریف زیادہ مبالغہ آمیز ہونا چاہیئے۔ دیباچے میں تعریف تو ہو لیکن مبالغہ کی آرائش ذرا کم ہو، تبصرے میں تعریف تو دیباچہ نما ہو لیکن ساتھ ہی کتاب کی قیمت، پبلشر کا نام، اور دیگر تفصیلات بھی درج ہوں۔ اگر تبصرہ نگار یا مدیر مصنف سے ناراض ہے تو مستقل عنوانات (قیمت، پبلشر کا نام وغیرہ) تو ویسے ہی رہیں۔ بس مبالغہ آمیز تعریف، مضحکہ آمیز تنقیص میں بدل جائے۔ یہ نکتہ غور طلب ہے کہ تبصرہ اگر تعریف پر مبنی نہ لکھا جاتا ہو تو تقریظ کی روایت کو یکسر نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ غالب نے جب آئین اکبری پر تقریظ لکھی تو سرسید کی مبالغہ آمیز عیب جوئی نہیں کی تھی بلکہ عیب جوئی سرے سے کی ہی نہیں تھی، اور صرف یہ لکھا تھا کہ زمانہ بدل رہا ہے، لیکن تم ابھی تک پرانی باتیں لئے پھر رہے ہو۔ انگریزوں کو دیکھو، وہ کس طرح پانی پر دھوئیں کے جہاز چلاتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ گویا غالب نے اصولی اختلاف کیا تھا، جوتیاں لے کر پل نہیں پڑے تھے۔ لیکن میٹھا میٹھا ہپ اور کڑوا کڑوا تھو کے مصداق جب ہمارے اردو ادب کے شیروں نے تقریظ کی روایت کو پرانے ادب کے جنگل سے اکھاڑ کر نئے ادب کی کھیتی میں تبصرے کے نام سے آباد کیا تو آسانی سے یہ بات نظرانداز کر دی کہ تقریظ میں اگر عیب چینی بھی ہو تو اصولی اور علمی ہوتی ہے۔ چنانچہ تعریف کے تیور تو وہی رہے صرف ظاہری رکھ رکھاؤ بدل گیا۔ لیکن اظہار ناراضی کے لئے اصولی اور علمی متانت کو بالائے طاق رکھ کر وہ کڑوے تیور اختیار کئے گئے کہ کتاب کا پتہ پانی ہونے لگا۔ لہٰذا جہاں اس طرح کے جملے ہمارے تبصروں میں بہت عام ہیں کہ کتاب اردو ادب میں اضافہ ہے، لازوال ہے، غیر معمولی کارنامہ ہے، شاعر/افسانہ نگار/تنقید نگار نے اردو ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے فنی نزاکتیں اور فکری باریکیاں موصوف پر ختم ہیں وغیرہ۔ وہاں ایسے بھی خشمناک اور سنگین فیصلے بھی دکھائی دیتے ہیں: مصنف جاہل ہے، شاعری/تنقید/افسانہ نگاری کے فن سے قطعاً بےگانہ ہے، تعجب ہے کہ موصوف اس قدر کم علم ہیں کہ ..... وغیرہ۔

یہاں پر یہ سوال اٹھ سکتا ہے کہ اگر ہمارے تبصروں کی بیشتر تعداد ایسی ہی سطحی، کم کوشش، تقریباً جھوٹی (اور اگر جھوٹی نہیں تو حد سے زیادہ تعمیم زدہ) تحریروں پر مشتمل ہو تو قاری ایسی چیزوں کو برداشت کیوں اور کیسے کرتے ہیں؟ احتجاج کیوں نہیں کرتے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بہت کم زور، نیم جان سا احتجاج کبھی کبھی ضرور ہوتا ہے، لیکن عموماً قاری یا تو بےخبری کی وجہ سے تبصرے کو صحیح سمجھتا ہے اور اس سے اتفاق کرتا ہے، یا پھر جان بوجھ کر ایسی تحریر کو قبول کرتا ہے، کیوں کہ وہ بھی مصنف کے لئے اسی قسم کا معاندانہ رویہ رکھتا ہے جیسا کہ مبصر یا مدیر کا تھا۔ لاعلم قاری بےچارہ تو دونوں طرف سے مارا جاتا ہے کیوں کہ اگر وہ مصنف اور مدیر/مبصر کے تعلقات سے بےخبر ہے تو تبصرے کو بالکل صحیح سمجھ کر قبول کرتا ہے، اور اگر وہ مصنف سے بالکل بےخبر ہے، یا اس کے بارے میں محض ایک دھندلا سا تصور رکھتا ہے تو اس کی تمام تر رائے اس تبصرے کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے جو اس نے پڑھا ہے۔ لیکن بڑا قصور تو باعلم قاری کا ہے، جو اپنی رالیوں، اپنے تعصبات، اپنے جہل کا انعکاس تبصرے میں دیکھنا پسند کرتا ہے اور اس طرح انتہا پسندانہ تبصرہ نگاری کی ہمت افزائی کرتا ہے۔ جس طرح جمہوریت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جمہوریت میں ہمیں ویسی ہی حکومت ملتی ہے جس کے کہ ہم مستحق ہوتے ہیں۔ اسی طرح تبصروں کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ قاری کو تبصرے بھی ویسے ہی ملتے ہیں جن کا کہ وہ مستحق ہوتا ہے۔ آج کا قاری پچاس برس پہلے کے لوگوں کی طرح ادبی مسائل

اور صورت حال سے کلیتہً بے خبر نہیں ہوتا۔ اس کے اپنے تعصبات ہوتے ہیں۔ بیشتر معروف لکھنے والوں کے بارے میں اس کی ایک ذاتی رائے بھی ہے جو ہمیشہ ادبی بنیادوں پر نہیں قائم کی جاتی۔ چنانچہ اگر مجھے شاعر الف سے کسی وجہ سے کد ہے تو میں اس کی کتاب پر سخت تبصرہ پڑھنا پسند کروں گا۔ اور ایسا تبصرہ پڑھ کر خوش ہوں گا، یہ نہ سوچوں گا کہ مبصر نے کتاب کو غور سے پڑھا بھی ہے کہ نہیں۔ چنانچہ اگر مبصر نے لکھ دیا ہے کہ شاعر زیر بحث کا اسلوب دوسرے شعرا سے مستعار ہے تو میں اس رائے کو فوراً قبول کر لوں گا اور اس بات پر اعتراض نہ کروں گا کہ مبصر نے مثالیں نہیں دی ہیں۔ لیکن اگر مجھے شاعر سے کسی وجہ سے ہم دردی ہے تو میں فوراً اعتراض کر دوں گا کہ دوسرے شعرا سے کھلے استفادے کی مثالیں کیوں نہیں دی گئیں۔

لیکن تبصرے میں جانب داری کا مسئلہ اتنا آسان اور سادہ نہیں ہے جتنا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں۔ اوپر کی بحث سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ تبصرے میں غیر جانب داری بہت بڑی چیز ہے، اور تبصرہ دیباچے یا تقریظ سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ لیکن یہ نتیجہ پوری طرح درست نہ ہوگا۔ کیوں کہ واقعہ یہ ہے کہ تبصرے میں مکمل جانب داری نہ ممکن ہے نہ مستحسن۔ یہ نکتہ غور طلب ہے کہ کسی رسالے میں جو مضامین چھپتے ہیں وہ لازماً ادارے کی پالیسی کے آئینہ دار نہیں ہوتے، لیکن جو تبصرے چھپتے ہیں وہ یقیناً اس کی پالیسی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یعنی یہ تو ممکن ہے کہ کسی ترقی پسند پرچے میں جدیدیت پر مضمون چھپ جائے جو یک گونہ تعریفی ہو، لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ اس میں کسی جدید شاعر کے کلام پر تبصرہ بھی چھپ جائے تو توصیفی اور تحسین آمیز ہو مضمون نگار کو تو آزادی ہوتی ہے کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کرے، چاہے وہ خیالات ادارے کے نظریات سے مکمل طور پر ہم آہنگ نہ ہوں۔ لیکن تبصرہ نگار ادارے کے ذہن کا نمائندہ ہوتا ہے، تبصرہ ہی پڑھ کر یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس پرچے کے ارباب حل و عقد کس قسم کا ادب پسند کرتے ہیں۔ کسی پرچے میں شاعر الف کی نظم یا افسانہ نگار ب کا افسانہ چھپ جانا لازماً یہ معنی نہیں رکھتا کہ یہ رسالہ شاعر الف یا افسانہ نگار ب کے ادبی نظریات و اسالیب اظہار کو نظر استحسان سے دیکھتا ہے۔ لیکن اگر اس میں شاعر الف یا افسانہ نگار ب پر تحسینی تبصرہ چھپے تو یقیناً ایسا نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ لہذا تبصرہ نگاری میں کلی طور پر جانب داری کا دعویٰ صرف وہی کر سکتا ہے جو یا تو دیوتا ہو یا بہت بڑا احمق۔ اگر کوئی مبصر ہر طرح کی کتاب پر ایک ہی طرح کا تبصرہ کرتا ہے تو یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ یا تو اس کی اپنی کوئی رائے نہیں ہے یا پھر اس نے وہ کتابیں پڑھی نہیں ہیں بلکہ محض فارمولے کا استعمال کر کے بقراطی کی داد دے رہا ہے۔

بنیادی بات یہ ہے کہ ہر رسالے کا اپنا مزاج ہوتا ہے (یا ہونا چاہیے) اور کتابوں پر تبصرے رسالے کے مزاج اور کردار کے زیر اثر ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر معارف میں افتخار جالب کے مجموعۂ کلام پر تحسینی تبصرہ نہیں ہو سکتا اور نہ ہونا چاہیے۔ برہان میں عشقیہ گیتوں کے مجموعے پر تبصرہ اگر ہوگا تو قبل مختصراً "تذکرہ" ہوگا یا نکتہ چینی سے مملو ہوگا۔ شاعر میں کسی ایسی کتاب پر توصیفی تبصرہ نہیں ہو سکتا جو اردو زبان یا سیماب اکبرآبادی کی مخالفت کرتی ہو، وغیرہ۔ ان تبصروں میں اس بات کا لحاظ نہ رکھا جائے گا۔ (اور نہ رکھا جانا چاہیے) کہ یہ کتابیں اصلاً کتنی اچھی، کتنی مدلل، خوب صورت یا پرزور ہیں۔ لہذا اس حد تک تو تبصرہ جانب داری کا اعلان ہوتا ہی ہے۔

دوسری طرف ہر مبصر کا بھی نقطۂ نظر ہوتا ہے۔ فرض کیجیے اردو مخالف کتاب جو شاعری میں تبصرے کے لئے آئی اسے ایک ایسے شخص کے پاس بھیجا گیا ۲
جو اردو مخالفوں کے بارے میں جذباتی رویہ نہیں رکھتا، بلکہ عقلی اور استدلالی سطح پر ان سے اختلاف رائے رکھتا ہے۔ ایسے شخص کا تبصرہ اس شخص کے تبصرے سے مختلف ہوگا جو اردو کے مخالفوں کے بارے میں جذباتی رویہ رکھتا ہے۔ اول الذکر مبصر کتاب کی علمی اور استدلالی خامیوں کا تذکرہ کرے گا۔ موخر الذکر مبصر، ممکن ہے، مصنف کتاب کو ملک دشمن، فاشسٹ، مجرم اور بے ایمان کہہ دے۔ دونوں تبصروں میں اصول تو ایک ہے لیکن رویہ اور نقطۂ نظر کے اختلاف نے تبصروں میں زمین آسمان کا فرق کر دیا۔ ممکن ہے اردو مخالف مصنف نے اپنی رائے کا اظہار علمی اور سائنسی ایمانداری کے ساتھ کیا ہو اور اس میں تنگ نظری، بے ایمانی اور شر انگیزی کا شائبہ تک نہ ہو۔ لیکن جذباتی نقطۂ نظر والے مبصر نے جو نتیجہ اخذ کیا وہ عقلی نقطۂ نظر والے مبصر سے مختلف تھا۔ اور اس نے مصنف کی نیت کو بھی معرض بحث میں لے کر اسے بدنیتی سے متہم کیا۔

یہ صورت حال تخلیقی ادب کی کتابوں پر تبصروں میں اور زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ افتخار جالب کی ہی مثال پھر لیجئے۔ افتخار جالب ایک جدید لیکن انتہا پسند شاعر اور نقاد ہیں۔ بہت سے پرچے ایسے ہیں جو جدیدیت کے مخالف نہیں ہیں لیکن انتہا پسندی کے اس اظہار سے خوف کھاتے ہیں جو افتخار جالب کے یہاں نظر آتا ہے۔ ان کے یہاں افتخار جالب پر تبصرہ کسی اور نہج سے ہوگا۔ وہ ان کے نکالے ہوئے نتائج سے اتفاق تو کریں گے لیکن احتیاط کے ساتھ۔ وہ انہیں جدید تو مانیں گے لیکن گم راہ، یا کم سے کم گمراہی کی طرف مائل۔ قدامت پسند رسالے میں مبصر افتخار جالب کو مہمل گو بتائے گا، لیکن وہ افتخار جالب کے

حلقے سے سادگی جدید شاعری کو مطعون و مسترد کرے گا۔ ترقی پسند رسالہ افتخار جالب کے جدید سے ہی شاید انکار کر دے۔ لیکن کسی بھی مبصر پر آپ بے جا جانبداری یا تعصب کا الزام نہیں رکھ سکتے۔ ان میں سے ہر ایک نے ذہنی اپنی روشنی میں کتاب کو پرکھا ہے اور اپنے نظریات کے حوالے سے صحیح رائے دی ہے۔ جو لوگ ان مبصروں کو ایمان داری سے عاری کہیں گے وہ خود ایمانداری سے عاری ٹھہریں گے کیونکہ وہ اپنی ایمانداری دوسروں پر مسلط کرنا چاہتے ہیں، یہ رویہ بے ایمانی کی بدترین شکل ہے۔

تو پھر تبصرے میں جانب داری اور تعصب کیا شے ہے؟ جب ہر سنجیدہ رسالے کی ایک پالیسی ہوتی ہے اور ہر سنجیدہ مبصر کا ایک نقطۂ نظر اور دونوں کے رنگوں کا انعکاس تبصرے میں لازم، مستحسن اور متوقع ہے، تو پھر غیر جانب داری سے کیا مراد ہے؟

اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لئے ہمیں اپنے پہلے تعفنے کی طرف واپس جانا ہوگا۔ جہاں میں نے اس ذہنیت کی طرف اشارہ کیا تھا کہ بعض سنجیدہ لوگ بھی تبصرے کو اشتہار سے زیادہ نہیں سمجھتے۔ علمی غیر جانب داری تو مبصر کے لئے سم قاتل اور تبصرے کے لئے موت ہے۔ کیوں کہ پھر تو تبصرہ یا تو بالکل بے رنگ ہوگا یا بالکل یک طرفہ بیان سے زیادہ نہ ہوگا۔ لیکن انفرادی غیر جانب داری مبصر کے لئے یقیناً از حد ضروری اور اس کے فن کا پہلا تقاضا ہے۔ انفرادی غیر جانب داری سے میری مراد یہ ہے کہ تبصرہ لکھتے یا لکھواتے وقت مبصر اور مدیر اس کو نظر انداز کر دیں کہ مصنف سے ان کے تعلقات کیسے ہیں؟ مصنف کی ادبی شہرت اور حیثیت کیا ہے؟ ورنہ وہ غیر جانب داری تو کچھ نہ ہوئی جو چھوٹے موٹے ادیبوں یا اجنبی مصنفوں کی کتابوں کے ساتھ تو پورا پورا تجزیہ و تحسین و تنقیص روا رکھتی ہے لیکن بڑے ادیب کی کتاب یا اپنے کسی دوست شناسا کی تحریر دیکھ کر اس کے منہ میں آبلے پڑ جاتے ہیں اور وہ بولنے سے قاصر ہو جاتی ہے۔ تبصرہ نگاری آبگینوں کو ٹھیس سے محفوظ رکھنے کا نام نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ صاحب ایسی باتیں نہ لکھیے جن سے مصنف یا پبلشر کو تکلیف پہنچے۔ مصنف اور پبلشر سے میری درخواست یہ ہے کہ جب اوکھلی میں سر دیا ہے تو موسل سے ڈرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ اگر آپ کی کتاب میں مبصر کو عیوب یا نقائص یا خامیاں نظر آئیں تو وہ لامحالہ ان کا تذکرہ کرے گا، اس پر برا ماننے کی کیا بات ہے؟ لیکن آج کل مصنف اور پبلشر بھی اسکول کے بچوں کی طرح ہو گئے ہیں جو نتیجہ خراب ہونے پر ممتحن اور اسکول کے دوسرے ارباب حل و عقد کو گالیاں سناتے ہیں بلکہ مار بیٹھنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ظاہر ہے کہ یہ رویہ غیر ادبی، غیر فن کارانہ اور عمومی ایمان داری کے خلاف ہے۔ اس خصوصی اور مشکل ایمان داری کا تو ذکر ہی کیا جسے ہم فن کارانہ ایمان داری کہتے ہیں۔

لیکن تصویر کا دوسرا رخ بھی ہے۔ کسی ادیب پر تبصرہ صرف اس وجہ سے سخت لکھنا کہ ہمارے اس کے تعلقات اچھے نہیں ہیں، یا اس نے ہماری کتاب پر سخت تبصرہ لکھا تھا، یہ بھی مبصر کی انفرادی ایمان داری کے منافی ہے۔ اور یہ رویہ بھی اتنا ہی غیر ادبی ہے جتنا وہ رویہ جو خیال خاطر احباب پر آزادیٔ رائے کو قربان کر دیتا ہے۔ مبصر اگر تبصرہ موافقانہ لکھتا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ مصنف کا دوست ہے، اور اگر مخالفانہ لکھتا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ مصنف اس کا دشمن ہے۔ یہ تصور اگر ہمارے درمیان میں عام ہو جائے تو غیر ذمہ دارانہ تبصرے جن میں فن کارانہ ایمان داری کا فقدان ہے۔ خود بہ خود کم ہو جائیں گے۔ اس وقت تو قاری کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ تبصرہ اگر اچھا ہے تو دوست نے لکھا ہے اور اگر خراب ہے تو دشمن نے۔ جب مبصر کو یہ بات معلوم ہے تو پھر وہ بھی اس رسم کی پابندی کرتا ہے۔ مجھ سے اکثر یہ پوچھا گیا ہے کہ آپ نے فلاں بڑے ادیب پر سخت تبصرہ کیا تھا، کیا آپ میں اور ان میں کوئی اختلاف رائے ہے؟ اس کا الٹا بھی ہوا ہے کہ اگر کسی کتاب کی تعریف میں نے کی ہے تو لوگوں نے فرض کر لیا ہے کہ مصنف خود ان حضرت کا دوست ہوگا۔ کئی سال کی مسلسل محنت کے بعد یہ فضا ایک حد تک بدلی ہے لیکن وہ بھی صرف چند مبصروں کے حق میں۔ عام طور پر مصنف خود تبصرہ لکھ کر کسی دوسرے کے نام سے چھپوا دیتا ہے، لہٰذا تبصرہ نگاری میں جانب داری کی مسموم جڑ پوری طرح اکھڑی نہیں ہے۔ اس کو اکھاڑنے میں قاری اور پھر مصنف سب سے زیادہ کام کر سکتے ہیں، کیونکہ جس دن یہ محسوس ہونے لگا کہ نہ قاری اور نہ مصنف جھوٹے تبصروں کو قبول کرنے پر راضی ہے، اسی دن سے ان مبصروں کی ضرورت ختم ہو جائے گی جو مصنف یا مدیر یا پبلشر کی رضا کو مقدم جانتے ہوئے قاری کو جہل اور اندھی تعریف کا گاڑھا میٹھا محلول تبصرے کے گلاس میں پیش کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔

میں نے تبصرہ نگاری کے اخلاقی پہلو کو اس وقت خاصی اہمیت دی ہے کیوں کہ حالات حاضرہ کا تقاضا یہی ہے، ورنہ بہتر فضا اور صورت حال میں سب سے اہم سوال یہ ہوتا کہ تبصرے اور تنقیدی مضمون میں کیا فرق ہے؟

اس سوال کا جواب طوالت اور اختصار، محدود یا غیر محدود دائرہ کار، وغیرہ کے حوالے سے نہیں دیا جا سکتا۔ کیوں کہ ممکن ہے کہ تبصرہ بیس صفحے کا ہو کر بھی تبصرہ ہی رہے اور تنقیدی مضمون دو ہی صفحے کا ہو لیکن تنقید کہلائے۔

(یہاں میں میکالے اور اس کی قبیل کے دوسرے تبصرہ نگاروں کا ذکر نہیں کر رہا ہوں جو کتاب کا نام، مصنف کا نام اور دیگر تفصیلات اوپر لکھ کر اپنے طور سے ایک پورا مضمون لکھ ڈالتے تھے) دراصل تبصرے اور تنقیدی مضمون کی روح میں فرق ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ تبصرے کی ایک مخصوص ہیئت ہوتی ہے، یعنی یہ کہ تبصرہ جس کتاب پر کیا جاتا ہے اس کا نام، مصنف کا نام، پبلشر، سائز، قیمت صفحات، گیٹ اپ وغیرہ تمام تفصیلات اس میں درج ہوتی ہیں، بنیادی بات یہ ہے کہ تبصرہ نگار کا رویہ نقاد کے رویے سے مختلف ہوتا ہے۔ سب سے پہلا فرق تو یہ ہے کہ تبصرہ نگار کا مخاطب بہت فوری اور سامنے کا قاری ہوتا ہے۔ تبصرہ اس لئے نہیں لکھا جاتا کہ اسے دس سال بعد کا قاری پڑھے گا، تبصرہ اس لئے لکھا جاتا ہے کہ جو قاری اس وقت موجود ہے اسے کتاب سے متعارف کیا جائے۔ تنقیدی مضمون کا مخاطب آج کا بھی قاری ہوتا ہے اور کل کا بھی۔ لہٰذا اس میں ایسے فیصلے اور رائیں دینے سے احتراز کیا جاتا ہے جن کی درستگی Validity آئندہ زمانے میں مشکوک ہو سکے یا ہو جائے۔ مثلاً ضربِ کلیم پر تنقید لکھنے والا یہ تو کہہ سکتا ہے کہ یہ کتاب ناکام ہے، لیکن یہ نہیں کہہ سکتا کہ اقبال کی شاعری ناکام ہو گئی ہے یا ختم ہو چکی ہے۔ اس کے برخلاف مبصر ضربِ کلیم کو ناکام کتاب کہہ کر یہ کہہ سکتا ہے کہ اقبال کی شاعری میں دم نہیں رہا[۱]۔ تبصرہ ایک لمحاتی اور فوری چیز ہوتی ہے۔ تنقید ایک مستقل اور پائدار تحریر ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تبصرہ دس سال بعد نہیں پڑھا جا سکتا۔ یقیناً پڑھا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کا اولین مقصد یہ ہوتا ہے کہ اسے فوراً پڑھا جائے۔ اس کے پڑھنے والے وہ لوگ ہوں جو مصنف کے اپنے عہد میں رہتے ہیں، جو مصنف کو عصری ماحول کے تناظر میں دیکھ سکتے ہوں۔ اچھے تبصرے بہت دیر تک زندہ رہتے ہیں، اور رہے ہیں، لیکن یہ اتفاقی امر ہے۔

دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ تبصرہ نگار اپنے موضوع کے ساتھ ایک انتہائی ذاتی اور تاثراتی رشتہ رکھتا ہے۔ کتاب پڑھتے وقت اسے اس بات سے زیادہ دلچسپی نہیں ہوتی کہ مصنف کے ذاتی حالات کیا ہیں، وہ کیا محرکات ہیں جنہوں نے اس کتاب کو جنم دیا ہے۔ اس کا تعلق کتاب کے Gestatt سے زیادہ ہوتا ہے، پس منظری تفصیلات سے کم۔ مثلاً کسی نظم کو پڑھ کر وہ اس کے ذریعے پیدا ہونے والے فوری تاثر کو تبصرہ میں بیان کرتا ہے، لیکن نقاد صرف اسی پر بس نہیں کرتا۔ وہ نظم یا مجموعۂ کلام کو پڑھ کر اس کا رشتہ مصنف کی دوسری کتابوں، اس کے ہم عصروں، اس کے ماضی و حال سے بھی قائم کر سکتا ہے۔ تنقید محرکات و عوامل، اصل الاصول اور تخلیق کی گہرائیوں سے بھی بحث کر سکتی اور کرتی ہے، تبصرہ خود صرف تخلیق زیرِ بحث کے زیرِ اثر پیدا ہونے والے ذاتی ردِعمل تک محدود رکھتا ہے۔ تنقید نگار کی بہت سی شخصیات بہ یک وقت کارفرما ہو سکتی ہیں، مورخ، نفسیات داں، عروضی، فلسفیانہ تجزیہ کار، وغیرہ۔ یا اگر یہ سب نہ بھی ہو تو اس کا کم سے کم ایک مخصوص نقطۂ نظر ہوتا ہے جسے ایک فکری نظام و استدلال کی پشت پناہی حاصل ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف تبصرہ استدلال اور Argument کے ذریعہ کوئی نظریہ نہیں خلق کرتا بلکہ کسی بنے بنائے نظریہ یا نقطۂ نظر کی روشنی میں کسی مخصوص کتاب کا جائزہ لیتا ہے۔

---

۱ ان جملوں کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں ضربِ کلیم کو ناکام کتاب سمجھتا ہوں۔ یہ نام محض مثالاً اٹھایا گیا ہے۔ عہدِ حاضر کا کوئی نام لیا جاتا تو اس میں غلط فہمی کے امکانات زیادہ تھے۔

---

# انا کا پرندہ

سمٹتے ہوئے سایوں کے فرش پر
دیر سے یونہی بیٹھا ہوا ہوں
کہ گزرے کوئی قافلہ جادۂ روز و شب سے
تو پوچھوں کہ درماندگی کی سزا کیا ہے؟ مجھ کو بتاؤ!
مگر ڈر رہا ہوں کہ کوئی مسافر
مری بات پر مسکرایا تو میں کس طرح جی سکوں گا؟
مری زندگی ایک سرکش انا ہے
پرندے کی صورت عناصر کے زرکار پنجرے کی زینت
مری روح بھی (جادوگر کی طرح)
اس انا، اس پرندے کے قالب میں خلوت نشیں ہے

کسی کو (وہ دشمن ہو یا دوست)
میں پنجرے کی تیلیوں تک پہونچنے دوں
یہ کس طرح ہو سکے گا؟
کسے یہ خبر ہے کہ میں خود کو بھی
اپنا دشمن سمجھنے لگا ہوں

حرمت الاکرام

# ایک روش

علی جواد زیدی

عروج وزوال کی بات کرتے ہوئے شاعر نے کہا تھا کہ ع

کسی کی ایک طرح پر بسر ہوئی نہ انیسؔ

لیکن روشؔ صدیقی کی زندگی ایک ہی طرح پر بسر ہوگئی۔ شروع سے آخر تک ان کی ایک ہی روش رہی۔ متبسم نگاہیں، مسکراتے ہوئے ہونٹ، بوٹا سا قد، چھریرا جسم، بیچ کی مانگ سے دو حصوں میں بٹے ہوئے بال، پُراطمینان چہرہ، لیکن جسمانی اور ذہنی اعتبار سے ہر وقت متحرک، ایک نیم اضطرابی اور سیمابی کیفیت کا مرقع! میں نے انہیں ہمیشہ اسی حال میں دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ان پر سرد وگرم زمانہ کا اثر ہی نہیں ہوتا۔ ظاہری طور سے ان کے عروج وزوال کا پتہ لگانا ناممکن تھا۔ وہی شیروانی علی گڑھ کاٹ کا پاجامہ اور کشتی نما ٹوپی، اس لباس میں کبھی تبدیلی نہیں آئی آزادی کے پہلے وہ سر سے پیر تک کھدّر پہنتے تھے۔ آزادی کے کچھ دنوں بعد خود کو اس قید سے آزاد کر لیا۔ ہاتھ میں چمڑے کا ایک بیگ بھی ہمیشہ رہا۔ ان علامات ظاہری میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ صرف ٹوپی پہننے کے معاملے میں زیادہ شدت پسند نہیں تھے۔ اکثر شعر سناتے وقت ٹوپی اتار لیا کرتے تھے اور کبھی کبھی ایک خاص قلندرانہ ادا سے ہاتھ میں ٹوپی لئے ہوئے شعر سناتے تھے۔ اس سر برہنگی کے عالم میں پتہ چلتا کہ چالیس پینتالیس کے سن تک بالکل کالے رہنے والے بال ساٹھ کی عمر تک آتے آتے کچھ کچھ رنگ بدلنے لگے ہیں۔ یہ بھی بڑی احتیاط سے، بڑی آہستگی سے ہو رہا تھا۔ عمر بہت دبے پاؤں آگے بڑھ رہی تھی۔ شعر پڑھنے کا انداز بڑا پُرجوش اور والہانہ تھا۔ مجھے یاد ہے کہ انقلابی نظمیں سناتے وقت وہ مٹھی باندھ کے داہنا ہاتھ باغیانہ انداز سے بار بار بلند کرتے تھے۔ آخری عمر میں بغاوت پر قلندری غالب آنے لگی لیکن ہاتھ اب بھی فضا میں بار بار بلند ہوتا تھا۔ طرزِ خواندگی میں قدیم طرز کا ہلکا ترنم بھی ملا ہوتا تھا۔ آواز کے اتار چڑھاؤ سے وہ رومان سے انقلاب تک کے تمام مراحل طے کر لیا کرتے تھے۔ خلوص، تپاک، حفظِ مراتب، آدابِ مجلس کا خیال یہ سب ان کی طرحداری اور وضعداری کے سنگِ میل تھے۔ ایسے لوگ شاذ ہوتے جاتے ہیں۔

بہت کم لوگوں کو روشؔ کے پورے نام یا ان کی صحیح عمر کا علم ہوگا۔ انہیں سب ان کے تخلص ہی سے جانتے پہچانتے تھے۔ نام جاننے کی شاید ہی کسی نے کوشش کی ہو۔ کچھ کم باسٹھ برس کی عمر پائی لیکن کاٹھی ایسی مضبوط تھی کہ دیکھنے والا چالیس پینتالیس برس کا اندازہ کرتا۔ "نگار" لکھنؤ نے جنوری۔ فروری ۱۹۴۱ء کا شمارہ غزل نگاروں کے تذکرے اور انتخاب اشعار کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ اس کے لئے چند شاعروں نے اپنے حالات خود لکھے تھے۔ روشؔ کے خود نوشت حالات صفحہ ۱۲۸ پر درج ہیں۔ اس کے اعتبار سے تاریخ ولادت ۱۰ر جولائی ۱۹۱۱ء ہے۔ لیکن خود روشؔ نے مالک رام سے بیان کیا تھا کہ ان کی عمر سے دو برس کاتب نے چرا لئے تھے۔ انہوں نے ۱۹۰۹ء لکھ کر بھیجا، کاتب نے نہ جانے کس طرح ۱۹۱۱ء کر دیا اور اب یہی غلط تاریخ سند ہوگئی۔ لیکن صحیح تاریخ ۱۰ر جولائی ۱۹۰۹ء ہے۔

ان کا نام شاہدؔ عزیز تھا۔ ان کے والد مولوی طفیل احمد شاہدؔ کو غنیمت کنجاہی کی مثنوی "نیرنگ عشق" بے حد پسند تھی۔ اُس کے پہلے شعر سے انہوں نے خود اپنا تخلص اور اپنے بیٹے کا نام اخذ کیا۔ شعر یہ ہے:

بنامِ شاہدِ نازک خیالاں
عزیزِ خاطرِ آشفتہ حالاں

روشؔ تخلص کے بارے میں بھی ایک روایت سنی۔ روشؔ کا وطن جوالاپور (ضلع سہارنپور، یو۔پی) اپنے مناظر قدرت اور مشہور دانش گاہ گورو کل دکانگڑی

کے لئے معروف ہے۔ ابتدائی زندگی میں روشن کو اس دانش گاہ سے قریبی ربط رہا ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے ہندی میں بڑی مہارت پیدا کر لی تھی اور سنسکرت سے بھی لگاؤ تھا۔ گورو کل کی علمی فضا پر گھر کے ادبی ماحول نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور روشن سات برس کے سن سے شاعری کرنے لگے۔ والد فارسی کے عالم اور اچھے شاعر تھے، روشن نے شروع میں انہیں سے مشورۂ سخن کیا۔ لیکن تخلص گورو کل کی دین ہے۔ ابھی روشن تخلص و اصلاح سے بے نیاز طفلانہ شاعری ہی میں مصروف تھے کہ گورو کل والوں کو ان کے ذوق شعری کا پتہ لگ گیا اور انہوں نے ان کے لئے ایک تخلص "رویش" جو سنسکرت میں روی (سورج) اور ایش (خدا) کا مرکب ہے تجویز کیا۔ 'رویش' اردو میں چل نہیں سکتا تھا اس لئے غالباً والد کی ہدایت پر یہ روش ہو گیا۔

اگرچہ ابتدا میں روش نے اپنے والد سے اصلاح لی لیکن سچ یہ ہے کہ وہ تلمیذ رحمان تھے کیوں کہ انہوں نے شاعری میں اپنی ڈگر خود بنائی۔ وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر تھے اور ان کا ذہنی سلسلۂ تلمذ چکبست و سرور و اقبال کی قومی شاعری سے جا ملتا ہے۔ بلکہ انہوں نے اس میں جوش و احسان کی طرح انقلاب کی گرمی بھی حل کر دی۔ جب انہوں نے ۱۹۱۶ء میں غزل کی شاعری شروع کی تو وہ کچھ اس طرح کے شعر کہتے تھے،

یہ میرے ضبط محبت کی تھی عجب تاثیر
کہ ان کو ضبط محبت کا حوصلہ نہ رہا
ہے روز میرے گریباں سے گفتگوے رفو
بہار کے لئے کیا کوئی مشغلہ نہ رہا

۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۴ء تک روش برابر غزلیں کہتے رہے۔ ۱۹۲۴ء سے وہ نظموں کی جانب متوجہ ہوئے اور ان کی سب سے پہلی نظم "انتظار" رسالہ 'ہمایوں' لاہور میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد ان کی نظمیں ملک کے مقتدر رسالوں میں چھپتی رہیں اور اتنی مقبول ہوئیں کہ ۱۹۳۴ء، ۱۹۳۵ء تک آتے آتے مشاعروں میں ان سے نظمیں ہی پڑھنے کی فرمائش ہونے لگی۔ وہ خود بھی بیشتر نظمیں سناتے۔ غزلیں عموماً طرحی مشاعروں، آغاز خواندگی یا مختصر نشستوں کے لئے مخصوص تھیں۔ ۱۹۳۵ کے بعد کا زمانہ نظموں کے عروج کا زمانہ ہے۔ ۱۹۴۰ء تک نوبت یہ پہنچ گئی تھی کہ لکھنؤ جیسے شہر کے غزل گو، تقدم و تاخر کا خیال ترک کر کے، مشاعروں میں غزل کا دور پہلے کرا لینے کی فرمائش کرنے لگے تھے۔ حصول آزادی کے بعد حالات نے ایک اور پلٹا کھایا اور غزل پھر بزم مشاعرہ میں صدر نشین ہو گئی۔ روش اس دور میں بیشتر غزلیں لکھنے اور پڑھنے لگے۔ یہ ان کی غزل نگاری کا کامیاب ترین دور تھا۔ اس زمانے میں انہوں نے کئی غزلیں آہنگ و طرح غالب میں لکھیں اور یہ تجربہ کامیاب ثابت ہوا۔

میں یہ بات بار بار دہرا رہا ہوں کہ ہمعصر رائیں اکثر جلد بازی کی رائیں ہوتی ہیں۔ ۱۹۴۲ء کے آغاز میں کلیم الدین احمد اور آل احمد سرور کے رتبے کے ناقدوں نے روش کو خالصتہً نظم کا شاعر قرار دیا تھا اور ان کی غزل گوئی کو نسبتاً کم پایہ ٹھہرایا تھا۔ آج ان کی نظموں کا کوئی مجموعہ ہمارے سامنے موجود نہیں ہے اور لوگ انہیں صرف "محراب غزل" کی وساطت سے جانتے ہیں!

اکثر شاعر کچھ ایسے جہاں گرد ہوتے ہیں کہ انہیں کسی ایک شہر سے وابستہ کرنا مشکل ہے۔ روش بھی مختلف شہروں سے متعلق رہے ہیں لیکن جالاپور میں زیادہ قیام رہا اور وہی ان کا وطن ہے۔ یہاں شروع شروع میں روش بانسوں کا کاروبار کرتے تھے۔ آزادی کے پہلے انہوں نے ایک دار الاشاعت بھی قائم کیا تھا۔ اور کوئی رسالہ بھی نکالا تھا۔ لیکن یہ دونوں زیادہ دنوں نہ چل سکے۔ کچھ دنوں لاہور میں علامہ تاجور کے بھی شریک کار رہے لیکن ان سے نہ نبھی اور وہاں سے بھی چلے آئے۔ آزادی کے فوراً بعد جو اندوہناک ہنگامے ہوئے، ان کی زد میں بانسوں کا کاروبار بھی آ گیا اور اس میں شک نہیں کہ کئی برس انہوں نے خاصی تکلیف لیکن بڑے صبر و استغنا سے گزارے۔

روش کی شادی کافی کم عمری میں ہو گئی تھی لیکن بہت جلد شریک حیات نے داغ مفارقت دیا۔ روش ان سے بے حد مانوس تھے۔ اس ناوقت موت کا اتنا شدید صدمہ ہوا کہ پھر مدتوں تاہلی زندگی سے کنارہ کش رہے۔ جب سن چالیس سے متجاوز ہو گیا تو زندگی کا یہ خلا ناقابل برداشت نظر آنے لگا۔ احباب و اقارب نے بھی اصرار کیا تو انہوں نے اسی شرط پر رضامندی ظاہر کی کسی بیوہ سے عقد کریں گے۔ اس سلسلے میں مجاز کا ایک لطیفہ مشہور ہے۔ ایک مجلس میں لوگوں نے روش سے شادی کا ذکر چھیڑا تو کہنے لگے کہ کسی بیوہ سے عقد کرنا چاہتا ہوں۔ مجاز نے کہا کہ آپ اس کی فکر نہ کریں۔ آپ سے شادی کرنے کے بعد بیوی تو بیوہ ہو ہی جائے گی۔ بہر حال روش کی یہ شرط پوری نہ ہو سکی اور بالآخر سینتالیس اڑتالیس برس کے سن میں انہوں نے مراد آباد کے مولوی مظہر جلیل کی صاحبزادی سعیدہ سے شادی کر لی۔ اس سے تین لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔ بڑا لڑکا بہت ذہین ہے۔ اس کو جامعہ ملیہ اسلامیہ سے سال کے بہترین طالب علم ہونے کا انعام ملا۔ اب علی گڑھ میں ایم، ایس سی کا طالب علم ہے۔
شادی کے بعد روش کا قیام کچھ دنوں مراد آباد میں بھی رہا لیکن آبائی کاروبار سے محروم ہو کر انہیں اب فکر معاش ہوئی۔ مولانا آزاد جیسے گوشہ نشین کو اس کی

قبر ہوئی تو انہوں نے وزیر اطلاعات ڈاکٹر کیسکر سے تحریک کی ۱۹۵۵ء ان کا تقرر آل انڈیا ریڈیو میں ڈپٹی چیف پروڈیوسر اردو سپوکن ورڈ کی حیثیت سے ہوگیا۔

مولانا آزاد، روش کی ناقابلِ تسخیر قوم پروری سے بہت متاثر تھے مسلم لیگ کے ہنگامہ پرور دور میں اور بعد آزادی کے ہنگاموں میں کبھی بھی روش کے پائے استقلال کو لغزش نہ ہوئی۔ پاکستان سے کئی بار ان کو ملازمت وغیرہ کی پیش کش ہوئی لیکن جو کمی دنیا کے برعکس، روش نے اپنے وطن کی خدمت کو فرضِ اولین جانا اور یہیں کی خاکِ پاک سے پیوند ہونے کو باعث سعادت سمجھا۔ ان کی قومیت "وفاداری بشرطِ استواری" کے معیار پر پوری اترتی تھی اور واقعتہً اصل ایمان تھی۔

۱۹۵۹ء میں جب دلی آئے تو شروع شروع میں کاکا کالیلکر کے یہاں مقیم ہوگئے۔ یہاں ریحانہ بہن سے ملاقات ہوئی اور وہ ان پر بے حد شفقت کرنے لگیں۔ ریحانہ بہن خود عالم اور علم دوست ہونے کے علاوہ روحانیت سے خاص لگاؤ رکھتی ہیں اور دلی میں بہت سے معززین ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہیں۔ انہوں نے روش کو اپنا بیٹا بنالیا اور کہنے لگیں کہ میں اگلے جنم میں ان کی ماں تھیں۔ جب روش کو سرکاری مکان مل گیا تو یہ پنڈارہ روڈ منتقل ہوگئے اور ملازمت سرکاری کے خاتمے کے بعد تک وہیں مقیم رہے۔ آخر میں وہ میرٹھ جا بسے۔

میرٹھ میں مستقل قیام رہا۔ اس کے علاوہ لکھنؤ بھوپال ہاؤس میں اور الٰہ آباد مسلم بورڈنگ ہاؤس میں بھی روش ہفتوں قیام کیا کرتے تھے۔ ان دونوں شہروں کی ادبی فضا نے ان کو اور انہوں نے وہاں کی محفلوں کو بہت کچھ دیا۔ سلسلہ فرنگی محل سے بھی ارادت رکھتے تھے۔ ان کے والد سلسلۂ قادریہ رزاقیہ میں شمس العلما مولانا عبدالحمید مرحوم فرنگی محلی کے مرید تھے اور یہ خود بھی اسی سلسلے سے منسلک تھے۔ بغرض

ع چمن میں ہر طرف بکھری پڑی ہے داستاں میری

روش کی رسمی تعلیم زیادہ نہ تھی لیکن گھر کے علمی ماحول اور ذاتی مطالعے سے روش نے یہ کمی بڑی حد تک پوری کرلی۔ بالخصوص ادب و تصوف پر ان کی نظر گہری تھی۔ اور وہ تصوف کے رموز و غوامض سے خاص طور پر واقف تھے۔ معلومات ہی کی حد تک ہی نہیں بلکہ کیفیت کے اعتبار سے بھی وہ صوفی مشرب تھے۔ ان کے قریبی دوست پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی کا بیان قابل نقل ہے کہ "ان کی زندگی اور معمولات پر تصوف اور اس کی جاندار و اعلیٰ قدروں کا بہت گہرا اثر تھا۔ ان کی کتابوں کے بیش قیمت ذخیرے میں تصوف اور صوفیائے کرام سے متعلق بڑی نادر کتابیں ہیں۔ ان میں سے بعض کتابوں کو تو انہوں نے بار بار پڑھا تھا اور ان کا جب ذکر کرتے تو بڑے گہرے احساس سے کرتے تھے جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کی روحانی کیفیات کچھ اور ہیں۔"

روش نے گھر پر اردو اور فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پھر گوروکل سے ہندی اور ابتدائی سنسکرت کا علم حاصل کیا۔ کام چلانے بھر کو انگریزی سے بھی واقفیت حاصل کرلی لیکن سچے ادیب اور شاعر کی طرح وہ زندگی بھر طالب علم رہے۔ فارسی کا بڑا ستھرا ذوق رکھتے تھے اور شعرِ فارسی کی نوک پلک سے واقف تھے۔ فارسی کا ذوقِ شعری اور غزلِ فارسی کا احساسِ جمال ان کے کلام میں پوری آب و تاب و متانت و فن کاری سے جھلکتا ہے۔

روش سے میری پہلی ملاقات ۱۹۳۵ء میں ہوئی جب وہ ایک مشاعرے کے سلسلے میں لکھنؤ آئے ہوئے تھے۔ اس کے بعد لکھنؤ اور لکھنؤ کے باہر مشاعروں میں اکثر ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ جب سے میں نے مشاعروں میں شریک ہونا تقریباً ترک کردیا یہ ملاقاتیں کم ہوگئیں۔ لیکن جب آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہوئے تو میرا دفتر بھی قریب ہی تھا۔ اس لئے ان سے برابر بر سر راہے گاہے ملاقات ہو جایا کرتی تھی کبھی مخصوص نشستوں میں بھی ساتھ رہا۔ یہ سلسلہ اس وقت بھی جاری رہا جب وہ ریڈیو کی ملازمت ترک کر کے میرٹھ جا بسے تھے۔ مشاعروں کے سلسلے میں یا کسی اور کام سے برابر دلی آتے رہتے تھے اور یا تو خود مجھے ملاقات کا شرف بخشتے یا کہیں نہ کہیں ملنے کا بہانہ مل جاتا۔ عمر بڑھتی جا رہی تھی، لیکن ان کی آن بان، طبعی شگفتگی، متصوفانہ سکونِ طبع، اور ظاہری صحت میں کوئی فرق نمایاں نہیں تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کاروانِ عمر اُن سے کترا کترا کے نکل جاتا ہے۔ لیکن موت غریب الوطنی کا ماحول ڈھونڈ رہی تھی۔ ایک مشاعرے میں شرکت کی غرض سے شاہجہاں پور گئے ہوئے تھے۔ وہیں یکایک دل کا سخت دورہ پڑا اور پلک جھپکاتے یہ شاہدِ محبی اور یہ یارِ عزیز ہم سے چھن گیا۔ ۲۳ جنوری ۱۹۷۱ء کی صبح کو پہلے ریڈیو سے اور پھر مشترک دوست زنجانی صاحب سے معلوم ہوا کہ گزشتہ شب میں روش دائمی مفارقت کا داغ دے گئے۔ ایک دور، ایک عہد، جو اب پلٹ کے آنے والا نہیں ہے، دم توڑ گیا۔ وحشتِ جنوں سے سرِ ہر خار کو تیز رکھنے کی فرمائش کیا کی جائے اب شاید ہی کوئی آبلہ پا ادھر سے گزرے۔ روش کی طرح کے لوگ ایک عہد، ایک تحریک اور ایک روایت کی دین تھے اور اسی اعتبار سے دیکھے اور پرکھے جائیں گے۔

روش میں بڑی خوبیاں تھیں۔ وہ خلوص کا مجسمہ اور وفائے بے ریا کا سراپا تھے۔ یہ کہنا شاید غلط ہو کہ وہ سب سے ایک انداز سے ملتے تھے لیکن پہلی بار جس خلوص و محبت سے ملتے تھے اسے آخر تک نبھاتے تھے۔ اس خلوص میں گرمی بھی تھی اور خودداری بھی، وضعداری بھی تھی اور دینداری بھی، لیکن دنیاداری نہیں تھی۔ دل کے صاف تھے۔ جو بات ناگوار ہوتی اسے بے تکلف

اور بے تامل کہہ دیتے تھے۔ اس سلسلے میں زنجانی صاحب نے ایک واقعہ ان کی جوانی کا سنایا۔ ایک محفل میں اقبال کے کلام پر گفتگو ہو رہی تھی۔ یکایک روشں نے اقبال کو ناروا الفاظ سے یاد کرتے ہوئے کہا کہ میں اس کی یہ دریدہ ذہنی شان الٰہی میں برداشت نہیں کر سکتا۔

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

زنجانی صاحب اقبال کے غالی مداحوں میں تھے۔ زور آزمائی پر آمادہ ہوگئے۔ اگر روشں کے قد کو مدنظر رکھا جائے تو نتیجہ بھی ظاہر تھا۔ اس کے بعد دونوں میں گفتگو بھی بند ہوگئی، لیکن وضعداری یہ تھی کہ روشں الٰہ آباد میں بدستور زنجانی صاحب کے مہمان ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ یہ کدورت رفع ہوگئی اور خود روشں کا یہ حال ہوا کہ وہ اقبال کے پرستاروں میں شامل ہوگئے!

اسی طرح قوم پروری کے معاملے میں وہ بے حد متشدد تھے۔ انہوں نے جنگ آزادی میں عملی حصہ تو نہیں لیا لیکن کانگریس کے جلسوں میں وہ ضرور جاتے اور اپنی قومی نظمیں سناتے تھے۔ عالمی جنگ کے زمانے میں جب کئی شاعر متعدد بہانے بنا کر جنگی ترانے گانے اور نظمیں لکھنے لگے تھے، اس وقت بھی وہ کنارہ کش رہے اور مسلم لیگی فرقہ واریت سے بھی وہ برسرپیکار رہے۔ یہ پیکار فکری اور ذہنی تھی، مگر تھی غیر متزلزل۔ ان کے پائے ثبات میں اس وقت بھی لغزش نہ ہوئی جب فرقہ واریت کی لپٹوں نے جوالا پور تک کو گھیر لیا تھا۔ ان کی قوم پروری دکھاوے سے بہت دور تھی۔ جب آزادی ملی تو بہت سے شاعر اور ادیب وزراء کے دروں کے چکر کاٹنے لگے لیکن روشں کی خودداری، فقیری اور مستی میں فرق نہیں آیا، جب آخر میں ریڈیو کی ملازمت پائی تو بھی مولانا آزاد خود متوجہ ہوئے۔ انہیں دست سوال دراز نہ کرنا پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض نمائشی قوم پرستوں سے روشں کی طبیعت اکراہ کرتی تھی۔ حکومت پرستوں کو تو وہ علی الاعلان ٹوک دیا کرتے تھے جب حفیظ جالندھری کو زمانۂ جنگ میں برطانوی سامراج کی حمایت کے صلے میں غالباً 'خان صاحب' کا خطاب ملا تو روشں نے اقبال کے شعر سے استفادہ کرتے ہوئے لکھا:

رقاص حکومت کی معراج یہ کہتی ہے
طاؤس درباب اول، اعزاز وخطاب آخر

ان کے ہم عصروں میں جوشں بزرگ تر اور ساغر و احسان ہم عصر تھے اور یہ تینوں اپنی قومی اور سیاسی شاعری کے لئے شہرت رکھتے تھے۔ جوشں شاعر انقلاب مشہور تھے لیکن انقلاب کا نعرہ ان تینوں نے بھی اپنایا۔ ساغر کا تصور انقلاب ایک محبوبہ کے تصور سے ہم آہنگ تھا، احسان خود کو مزدور شاعر کہتے تھے اور وہ انقلاب کے تخریبی عناصر کو نمایاں کرتے تھے لیکن روشں کے یہاں کر و فر اور طمطراق الفاظ کم ہے۔ وہ انقلاب کی بھی بات کرتے ہیں اور بغاوت کی بھی لیکن وہ الفاظ کے استعمال کے معاملے میں محتاط ہیں اور بے جا جوش و خروش سے حتی المقدور بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بیداری ہند کے ساتھ وہ بیداری ایشیا کے بھی نقیب ہیں لیکن یہ بیداری قومی اور علاقائی بیداری ہے۔ اقبال کی بیداری مشرق کی طرح تہذیبی، فکری یا ملی بیداری نہیں ہے۔ وہ ایشیا کی بات کرتے ہوں یا ہند کی۔ ان کا تصور انقلاب احسان دانش کے تصور انقلاب کی طرح بنیادی طور پر صرف خون و تباہی نہیں ہے۔ تصور انقلاب کے لئے اس دور میں کچھ تخریب اور جبری تبدیلی تو لازمی ہے اور روشں بھی ایسی تعمیری تخریب کی طرف اشارے کرتے ہیں۔ لیکن اساسی طور پر وہ ایک بہتر مستقبل کی تعمیر کے پیامی ہیں۔ وہ خواب خرگوش سے نیزے چبھو کر یا ٹھوکریں مار کر بیدار نہیں کرتے بلکہ پیار سے جگاتے ہیں اور کبھی کبھی چلا بھی لیتے ہیں۔

ہم نے اپنی نوجوانی سے روشں کی نظمیں سنی ہیں اور ان کی نظموں پر ہم جھومے ہیں۔ وہ اس دور کے نوجوانی کے لہجے میں ضرور بولتے تھے لیکن ان کا آہنگ بزرگوں کو بھی گوارا تھا۔ بعض اوقات تو وہ دونوں ہی کے جذبات کے ترجمان نظر آتے تھے۔ یہ غالباً فارسی ادب میں رچے بسے ہونے کی وجہ سے ممکن ہو سکا۔ انہوں نے قومی نظموں کے علاوہ کچھ رومانی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ رومانی نظموں سے مراد وہ نظمیں ہیں جو حسن و عشق کے محور پر رقص کرتی تھیں ورنہ ان کی قومی نظمیں بھی رومانی تصورات سے آزاد نہیں تھیں۔ ان رومانی نظموں پر ٹیگور کا اثر (مثلاً "نذر جا") صاف جھلکتا ہے۔ یہ نظمیں اپنے زمانے میں خاصی مشہور بھی ہوئیں لیکن ان کی رومانی نظموں کو وہ رتبہ نہ مل پایا جو اختر شیرانی کے حصے میں آیا۔ قومی نظمیں یقیناً ہمارے قوم پرورانہ ادب کا حسین ورثہ ہیں۔ ان میں عصری مسائل و کوائف کا ذکر آیا ہے۔ روشں نے ان میں آفاقی عناصر ڈھونڈھنے کے لئے شاعرانہ انتخاب اور خوش مذاقی سے کام لیا ہے، اس لئے یہ کافی مدت تک تازہ رہیں گی اور دوسری جذباتی تخلیقات کی طرح کسی خاص عہد کی فضا میں چمک کر بجھ نہ جائیں گی۔ یہاں ان کی نظموں پر تفصیل سے بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔ بدقسمتی سے ان کی نظمیں یکجا ملتی بھی نہیں ہیں۔ ذہن میں فوری طور سے "بار دولی"، "بیداری مشرق" اور "مہاتما گاندھی" وغیرہ نظمیں آتی ہیں۔

روشؔ نظموں میں شبلیؔ، ظفر علی خاں، چکبستؔ و سرورؔ جہاں آبادی کے بعد کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ جوشؔ و شیرانی سے بھی کم عمر ہیں۔ غزلوں میں بھی ان کا شمار حسرتؔ، فانیؔ، اصغرؔ، جگرؔ و فراقؔ کے بعد کے گروہ سے ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ کسی خاص اُستاد کے شاگرد یا کسی طرزِ خاص سے وابستہ نہیں ہے لیکن وہ بیشتر بحروں پر لہراتے ہیں اور بعض سے کسبِ شہد بھی کیا ہے۔ پھر بھی نظم و غزل دونوں ہی میدانوں میں اُن کی آواز جانی پہچانی جاتی ہے۔ جو خصوصیت انہیں اُن کے ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہے وہ اُن کا رچا ہوا ذوقِ فارسی ہے ویسے تو اُن کی نسل میں دو ایک مستثنیات کے علاوہ سبھی فارسی سے بخوبی واقف تھے لیکن روشؔ تراکیبِ فارسی کے استعمال اور تراش و تخلیق میں زیادہ کوشاں رہتے تھے اُن کے یہاں زبان و بیان کا یہ فارسی انداز ارادی اور اسی لئے زیادہ نمایاں ہے۔ کہیں تو وہ "بربطِ بے نغمہ" اور "ساغرِ بے بادہ" جیسی ترکیبیں تراش لیتے ہیں اور کہیں "سرمۂ مینائشں" اور "بصد ہزار الواع" جیسی ترکیبوں کو بھی غزل کے لئے روا رکھتے ہیں۔ ایسے مقامات شاذ ہیں مگر ہیں۔ روشؔ کا فن ہمہ جہاتی نہیں ہے اور فکری عنصر بھی ان کے یہاں دبا دبا سا ہے۔ لیکن گہرے متصوفانہ اندازِ نظر (تصوف نہیں) اور تغزل کی متوازن رَو کی بدولت اُن کی غزلوں تک میں ایک فکری ماحول ضرور ملتا ہے جو جگرؔ و ساغرؔ سے زیادہ نمایاں ہے۔

اُن کے یہاں خمریات کے بھی تمام لوازم ملتے ہیں۔ میکدہ، مینا، جام، سبو، خمار، تشنگی اور (بفیضِ غالبؔ) زہرا اور بزم کا ماحول بھی شمع، ہمنشیں، پروانہ وغیرہ سے تعمیر ہوتا ہے وہ تلاطم و باد و ساحل سے بھی باتیں کرتے ہیں اور منزل و سوز جادہ کی بھی۔ بہار و چمن بھی ہے منصور و طور و موسیٰ بھی ہے۔ لیلا و سلمیٰ بھی سینکڑوں برس سے ان مضامین کے گرد رقاصۂ غزل ناچتی رہی ہے لیکن روشؔ ان فرسودہ مضامین میں بھی اپنی فن کاری سے ایک تازگی پیدا کر لیتے ہیں۔ وہ بزم و انجمن سے زیادہ خلوت و تنہائی کے شاعر ہیں۔ اُن کا عشق ایک "ربطِ پنہاں" ہے۔ اُن کا "شوقِ فراواں" ہر لحظہ فزوں "بھی ہوتا ہے، اس میں" گلہ و شکایت"، حرف و حکایت "بھی ہے اور عشرت و کیف و طرب کے ساتھ اشک و غم و درد بھی ہے بلکہ اُن کی شخصیت" منزل احساس فراموش میں زیادہ ابھرتی ہے انہیں حسرت آغوش بھی ہے لیکن وہ بیگانہ نگاہی پر بھی جان چھڑک سکتے ہیں۔ وہ "آئین حجاب" کے پرستار ہیں . . . . "آوارگیٔ غربت" میں بھی لذت محسوس کرتے ہیں۔ اکثر "بیتابِ گزارش" (ترکیب کی غرابت پر نہ جایئے) رہتے ہیں اور تماشائے بیتابیٔ دل کے مزے لیتے ہیں۔ جب سطحِ عشق اور بلند ہوتی ہے تو زندگی "حجابِ رخِ امکاں" بن جاتی ہے اور وہ "رسمِ اظہار" سے بیگانہ ہو کر "نالۂ خاموش" سے کام لینے لگتے ہیں۔ وہ "نظارہ" کی مسرتوں سے بھی آشنا ہیں، لیکن یہ نظارہ انھیں حیرت و حیرانی کی منزلوں کی طرف لے جاتا ہے۔ وہ راہِ تصوف کے جادوں سے آگاہ ہیں لیکن اُن کا اندازِ قیام و سفر ذہنی ہے۔

وہ اکثر تضادات سے بھی کام لیتے ہیں۔ جیسے صبح و شام، طرب و غم، دیر و حرم، شوق و تغافل، سکوت و گفتگو، سوال و جواب، وفا و جفا۔ اور کبھی تسلسلِ کلام سے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن تازگی اور شگفتگی کو کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اُن کے اشعار میں سیاسی اور سماجی رمزیت بھی پائی جاتی ہے۔ ابتدا میں روشؔ پر شبلیؔ و اقبالؔ کا اثر نظر آجاتا تھا لیکن بعد میں وہ ارادی طور پر "بطرزِ غالبؔ" لکھنے لگے تھے۔ کئی غزلیں غالبؔ کی طرحوں میں لکھی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ بڑی حد تک ہم آہنگی پیدا کرلی ہے۔

روشؔ موجودہ دور کے ممتاز غزل گو تھے اور صادق لہجہ نظم گو۔ اُن کے کلام کا بہت سا حصہ غیر مطبوعہ پڑا ہے۔ ضرورت ہے کہ اُسے یکجا کر لیا جائے۔ غزلیں تو "محرابِ غزل" کی بدولت پھر بھی مل جاتی ہیں لیکن نظمیں صرف حافظوں یا اخبارات و رسائل کے صفحات میں محفوظ رہ گئی ہیں ضرورت ہے کہ انہیں فوراً یکجا کر لیا جائے۔ یہاں کوئی انتخاب منظور نہیں ہے لیکن چند اشعارِ غزل پیش ہیں۔

فریبِ آرزو کی انتہا ہے ؛ کسی افسردہ دل کا مسکرانا
گمانِ بادۂ عشرت میرے سبو پہ نہ کر ؛ ہے اس میں زہر بھی شامل مرے لہو کے سوا
حریصِ عیش نہیں ہوں مگر خوشی یہ ہے ؛ تری نگاہ سے پنہاں رہا ملال مرا
ہاں زندگی ایک پیغامِ لغزش ؛ جینا پڑے گا کب تک سنبھل کر
خدا شناس ہے زاہد، مگر نہیں معلوم ؛ کہ آدمی کو جگاتی ہے آدمی کی پکار
ہائے اب اُن بستیوں کا ذکر ہی کیا ہمنشیں ؛ جو ابھی بسنے نہ پائی تھیں کہ ویراں ہوگئیں
سکونِ دل جو ملا بھی تو آہ کیا ہوگا ؛ سکونِ دل تو مرے درد کا مآل نہیں

روشؔ کے یہاں زبان و بیان کی غلطیاں نہیں ملتیں لیکن "محرابِ غزل" میں غزل کے بارے میں جو نظم یا غزل ہے اُن میں کچھ تسامحات نظر آئے مثلاً یہ اشعار

دیکھتا کون رُخِ شاہدِ معنیٰ کی بہار ؛ گر یہ پیراہنِ خوش زیب نہ پہنائے غزل
ہوش رہتا کسے اس دور میں حق گوئی کا ؛ اگر افسانۂ منصور نہ دہرائے غزل
لب کشا کیا کوئی ہوتا اگر اُس محفل میں ؛ ترجمانِ دلِ خاموش نہ بن جائے غزل
آتشِ وعظ و خطابت کا بھرم کیا کھلتا ؛ تختۂ دار سے گر پھول نہ برسائے غزل

پہلے مصرعوں میں خط کشیدہ الفاظ کا قوافی سے ربط نہیں۔ اگر علی الترتیب یوں ہوتا تو یہ عیب جاتا رہتا (۱) دیکھے پھر کون (۲) پھر کسے ہوش ہو (۳) لب کشا کیسے کوئی ہو (۴) کیسے کھلے۔ اِن معمولی لغزشوں سے جو معدوم کی حد تک شاذ ہیں روشؔ کی عظمت شاعری میں فرق نہیں آتا۔ وہ اس دور کے صفِ اول کے ممتاز شاعر ہیں اور ہمارے ادب میں اُن کے لئے مستقل جگہ محفوظ ہے۔


بچوں کی پیدائش میں وقفہ کیلئے
فی زمانہ بچوں کی پیدائش اتفاق کی بات نہیں۔
یہ آپ کے اختیار میں ہے۔ نرودھ
استعمال کرنے سے آپ کے بچہ تبھی
ہوگا جب آپ چاہیں گے، اتفاق
سے نہیں۔
بچہ اور ماں
کی صحت کیلئے
ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ بچے کو شروع کے تین
برسوں میں زیادہ توجہ درکار ہوتی ہے۔
پھر بچے کی پیدائش کے بعد ماں کو اپنی
صحت بحال کرنے میں بھی وقت لگتا ہے۔
نرودھ استعمال کرکے آپ اگلے بچے کی
پیدائش ملتوی کر سکتے ہیں۔
نرودھ (کنڈوم)، اعلیٰ کوالٹی کے ربڑ سے
بنتا ہے۔ دنیا بھر میں لوگ اسے استعمال
کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ فیملی پلاننگ کا آسان
و محفوظ طریقہ ہے۔ اس کے استعمال سے
صحت پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا۔
نرودھ ہر جگہ ملتا ہے:-
پروویژن اسٹور، کریانہ فروش،
کیمسٹ، جنرل مرچنٹ، پان فروش
وغیرہ کی دوکانوں پر بکتا ہے۔
NIRODH
صرف
5 پیسے
خرچ کرکے
آپ
اپنے کنبے
کو
محدود رکھنے
کی طاقت
حاصل کر سکتے ہیں
نرودھ استعمال کیجئے
فیملی پلاننگ کیلئے
اعلیٰ کوالٹی کے
ربڑ کنڈوم
15 پیسے کے 3
سرکاری امداد سے کم دام
7061

# زندگی رقص

م م راجیندر

وہ اٹھ گیا اور ندی کے اس پار ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھنے لگا۔ سہ پہر کی نرم بے جان دھوپ ڈھل چکی تھی اور افق میں کانپتے ہوئے زرد سونے کے سوا تمام فضا میں ایک دھندلکا چھا گیا تھا تیزی سے سمٹتی ہوئی روشنی ایک اندھیرے کی گود میں گم ہو رہی تھی اور اُسے ایسا محسوس ہوا کہ ایک زندگی موت سے ہم کنار ہو رہی ہے۔

اور موت کا خیال آتے ہی اس کے بوڑھے جسم میں کپکپی دوڑ گئی، اور وہ سوچنے لگا۔ کہ کسی بھی لمحے وہ بھی اسی طرح ایک اندھیرے کی گود میں کھو جائے گا۔ وہ خوف زدہ سا ہو گیا اور جلد جلد اپنے گھر کی طرف چلنے لگا جو یہاں سے پاس ہی تھا۔

گھر پہونچ کر وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اُسے دیکھتے ہی نوکر دوڑ کر آیا اور اس نے اس کے کمرے کی بتی جلائی، اس کے ہاتھ سے اس کی چھڑی لی اور اُس کا لمبا کوٹ اتارنے لگا۔ وہ پلنگ پر بیٹھ گیا اور اُس نے نوکر کو چائے لے آنے کے لئے کہا۔ بستر پر لیٹ کر اور لحاف اپنے پاؤں پر ڈال کر پھر سوچنے لگا۔ یہاں اس کمرے میں کتنا سکون تھا۔ باہر پھیلی ہوئی لامحدود وسعت کتنی بھیانک تھی جیسے موت ہی پھیل کر یہ وسعت بن گئی ہو۔ جب تک سورج سروں پر چمکتا ہے، چاروں طرف ایک گہما گہمی رہتی ہے اور سرگرمی اور دوڑ دھوپ کا چکر چلتا رہتا ہے۔ اس وقت ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ چکر کبھی نہیں رُکے گا لیکن شام ہوتے ہی زندگی کی چکی کا یہ شور کتنا کم ہو جاتا ہے۔ اور جب درختوں کے سائے ڈھلتے ہیں اور دھرتی پر ایک کاٹنے والی اُداسی اور ٹھنڈک کا غلاف پڑ جاتا ہے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اب زندگی بیٹھ جائے گی۔ یہ چکر پھر نہیں چلے گا۔

وہ سوچنے لگا کہ وہ ستر برس کا ہو گیا ہے اور کسی بھی دن اور کسی بھی لمحے ایک ہنگامی پرشور دنیا سے چلا جائے گا۔ اس کے اعضا تقریباً جواب دے چکے تھے اور دن بھر اپنے مکان کے برآمدے یا لان میں آرام کرسی پر بیٹھنے اور سہ پہر کو اپنی چھڑی کے سہارے ندی تک چلے جانے اور ایک پتھر پر بیٹھنے کے سوا وہ کوئی اور کام کرنے کے قابل نہیں رہا تھا لیکن اس لاچاری کے باوجود اُسے موت سے ڈر لگتا تھا وہ موت کو ایک ایسی اتھاہ گہرائی سمجھتا تھا جس میں گر کر وہ ہمیشہ کے لیے منیست و نابود ہو جائے گا۔

نوکر چائے لے آیا اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چائے کی گھونٹوں میں گرمی اور زندگی تھی، اور وہ اس گرمی اور زندگی کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ یکایک اُسے ٹھنڈک کا احساس ہوا اور اُس نے مڑ کر دیکھا تو کھڑکی کو کھلا ہوا پایا۔ کھڑکی کے پار موت کی سی خاموشی اور اندھیرا تھا۔ اُس نے نوکر کو کھڑکی بند کرنے اور پردہ ڈالنے کے لیے کہا اور جب کھڑکی بند ہو گئی۔ اور نوکر دروازہ بند کرتا ہوا چلا گیا تو وہ اطمینان سے چائے پینے لگا اور چائے پی کر لیٹ گیا۔ اب اس کے کمرے میں کوئی نہیں آئے گا کیونکہ وہ شام کو کچھ نہیں کھاتا تھا اُس نے لحاف سینے تک اوڑھ لیا۔ اس کے کمرے میں بتی ساری رات جلتی تھی کیونکہ وہ گھپ اندھیرے کو ہی موت کی آمد سمجھتا تھا کچھ دنوں سے تو جب وہ سونے لگتا تو اُسے یہ خیال آتا کہ وہ شاید صبح نہیں جاگے گا اور نیند میں ہی اس کے دل کی حرکت بند ہو جائے گی۔ وہ ہر صبح جاگ کر پہلے اپنے آپ کو ہی محسوس کرتا تھا۔

اگلے روز اٹھ کر اور چائے وغیرہ پی کر وہ معمول کے مطابق اپنی چھڑی لے کر باہر برآمدے میں آ گیا اُس کا بیٹا دفتر جاتا ہوا ہمیشہ کی طرح اُس سے ملنے آیا اور اس کی طبیعت کے بارے میں پوچھتا ہوا چلا گیا۔ بیٹے کے جاتے ہی اُس کے دل میں اپنے

مکان میں پیچھے کی طرف لگے ہوئے امرودوں کے درختوں کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ دراصل درختوں سے زیادہ اُن خرگوشوں کو دیکھنا چاہتا تھا جو اس کے پوتوں منّو اور چنّو نے پال رکھے تھے وہ اندر گیا اور اس نے اپنی الماری میں سے بسکٹیں نکال کر اپنی جیبوں میں بھر لیں۔ وہ جب کبھی مکان کے پیچھے کی طرف جاتا تھا وہ اپنی جیبیں اسی طرح بسکٹوں سے بھر لیتا تھا کیونکہ اُدھر کھیلتے ہوئے چنّو اور منّو اپنے بابا کو دیکھتے ہی اس کی ٹانگوں سے چمٹ جاتے اور بسکٹ مانگتے۔ وہ اپنی چھڑی کے سہارے آہستہ آہستہ نیچے اُتر آیا اور پیچھے کی طرف پہنچ کر چنّو منّو اور اُن کے دوستوں کو بسکٹ دیتا ہوا امرودوں کے درختوں کے پاس آکر رک گیا۔

یہ درخت اُسے بہت پسند تھے۔ ایک بڑا درخت تھا جو پکّے امرودوں سے لدا پڑا تھا۔ ایک اس سے چھوٹا تھا جس پر ذرا بڑے کچّے امرود لگے تھے اور دو تین تو تقریباً پودے ہی تھے جو پچھلے ہی سال لگائے گئے تھے اور ہرے بھرے پتوں سے بھرے ہوئے تھے۔ اُس نے بڑے درخت کے نیچے کھڑے ہو کر اپنے بائیں ہاتھ کو آنکھوں پر رکھتے ہوئے اوپر کی طرف جھانکا۔ اور اُس کے جھانکتے ہی ٹہنیوں پر بیٹھی ہوئی دو تین چڑیاں اُڑ گئیں پھر وہ خرگوشوں کی طرف بڑھ گیا۔ یہ خرگوشوں کا جوڑا پچھلے سال مالی نے اُس کے لڑکے کو لا کر دیا تھا اور کوئی ایک ماہ کے بعد ہی اُن میں دو ننھے ننھے روئی سے بھی زیادہ سفید اور نرم بچوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ اور اب تو وہ بھی پورے خرگوش تھے۔ اور اُن کے لئے ایک علیحدہ گھر بن گیا تھا۔ وہ خرگوش کے گھر کے سامنے زمین پر بیٹھ گیا اور اندر جھانکنے لگا۔ اس کے بیٹھتے ہی خرگوش دبک کر ایک کونے میں چھپ گئے اس نے جال کے سوراخوں میں سے دو بسکٹ توڑ کر اندر پھینک دیئے، اور پھر زمین پر سے ہری گھاس کے چند تنکے توڑ کر اندر ڈال دیئے۔

وہ اُٹھ گیا اور مکان کی دیوار کے ساتھ دھوپ میں چلنے لگا۔ یہ مکان اس نے پچیس برس ہوئے چالیس ہزار روپے کی لاگت سے بنوایا تھا اور دس بارہ کمروں کا ایک شاندار بڑا مکان تھا جس کے چاروں طرف ایک اچھا خاصا باغ تھا۔ اب اس لمبے چوڑے مکان میں جو کبھی اس کے خوابوں کی تعبیر تھا وہ تنہا ایک چھوٹے سے کمرے میں اپنی زندگی کی شام گزار رہا تھا۔ اس کی بیوی پندرہ سال ہوئے چل بسی تھی اور وہ اس سفر کے لئے تیار بیٹھا تھا۔ وہ اس دنیا کی بے ثباتی کے بارے میں سوچنے لگا۔ کیا ایک بھری پری بارونق زندگی کا یہی المناک انجام ہے۔ اس کی تمام زندگی چند سمٹے ہوئے لمحے بن کر اس کے سامنے سے گزر گئی۔ کتنا شوریدہ لڑکپن کتنی بھرپور جوانی، کتنی طاقت کتنا آرام، اور سکھ اس کی زندگی میں رہا تھا اور افسوس کہ وہ سب کچھ اس طرح مٹنے والا اور مٹ کر کبھی نہ بننے والا تھا۔ زندگی کا یہ انجام اور زندگی میں یہ موت کیوں تھی۔

سہ پہر کو تین بجے کھانا کھانے اور کچھ دیر لیٹنے کے بعد وہ اپنا کوٹ پہن کر اور چھڑی لے کر ندی کی طرف چل پڑا۔ آج اُسے کچھ زیادہ تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی۔ شاید اس لئے کہ وہ صبح اُٹھ کر مکان کے پیچھے کی طرف چلا گیا تھا اور کچھ دیر وہاں رہا تھا۔ کمزوری کی اب یہ حالت تھی کہ اگر وہ ذرا سا بھی زیادہ چل لیتا تو بڑا تھک جاتا تھا لیکن یہ تھوڑا بہت چلنا ہی تو اس کی زندگی تھی اور وہ اُسے چھوڑنے کے لئے آمادہ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ وہ دن کے وقت کمرے کے باہر ندی کے کنارے کھلے آسمان کے نیچے اور سورج کی کرنوں میں زندگی محسوس کرتا تھا اور شام کو اپنے کمرے کے اندر اُسے یہ وسیع دنیا اندھیرے میں ڈوبی ہوئی بڑی خوفناک لگتی تھی۔ وہ ندی پر پہنچ کر دھوپ میں بیٹھ گیا اور سورج کی کرنیں اس کے ناتواں جسم میں گرمی بھرنے لگیں۔ ہوا صاف شفاف پانی ایک خوشگوار خنکی کا احساس دے رہا تھا۔ حرارت اور خنکی یہ امتزاج زندگی کا کتنا پرمسرت پہلو تھا اور وہ چند لمحوں کے لئے اپنے آپ کو بھول سا گیا۔

مگر جاڑے کی دھوپ بھی زندگی کی مانند کتنی مختصر ہوتی ہے گھنٹے دو گھنٹے میں ہی سہانی دھوپ کی یہ چادر سمٹ گئی، اور ہوا میں خنکی سرسرانے لگی۔ وہ اُٹھ گیا کیونکہ درختوں کے سائے سمٹنے لگے تھے! اور ایک زندگی ایک موت سے ہمکنار ہونے والی تھی۔ ایک دہکتا ہوا آگ کا گولا ایک ٹھنڈی نارنجی گیند بن کر ڈوبنے والا تھا اور دھرتی پر ایک ڈسنے والی تاریکی کا غلاف پڑنے والا تھا وہ گھبرا کر گھر کی طرف بڑھنے لگا۔ نہیں، وہ ڈوبتے ہوئے سورج کو نہیں دیکھے گا پنجے پھیلاتے ہوئے سایوں پر نظر نہیں ڈالے گا۔ وہ بغیر موت کو دیکھے ہوئے اُس زندگی کی طرف لوٹ جائے گا جو اب اُس کے کمرے کی چار دیواری میں بجلی کی ایک روشنی میں سمٹ جائے گی۔ وہ کانپتے ہوئے قدموں کے ساتھ ہانپتا ہوا گھر پہونچا۔

اس روز اُسے پتہ نہیں لگا کہ کب نیند آگئی یا آئی بھی یا نہیں۔ یہ زندگی کیا تھی، اور موت کیوں تھی، اس پر وہ بہت دیر تک سوچتا رہا تھا۔ اور جتنا وہ سوچتا رہا تھا اس کا دل ڈوبتا سا گیا تھا اس نے اپنے دل کو کئی بار کڑا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کی اُداسی دور نہ ہوئی تھی وہ ایک ایسی بےمقصد لمبی چوڑی زندگی کو جس کا انجام موت تھا ماننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ یہ ایک بڑا غیر یقینی اور بھیانک انجام تھا۔

اگلی صبح وہ چائے وغیرہ پی کر باہر برآمدے میں نہیں آیا بلکہ اپنے پلنگ پر لیٹا رہا۔ اُس نے آج اپنے اندر اُٹھنے اور باہر جانے کے لئے کوئی بھی جوش محسوس نہیں کیا دراصل وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس کے لئے کوئی بھی سرگرمی جینے کے لئے ضروری نہیں ہے بے معنی سی تھی۔ اس کا بیٹا حسب معمول دفتر جاتے ہوئے اُس سے ملنے کے لئے آیا اور اسے برآمدے میں نہ پا کر تیزی سے اندر آیا۔ باپ کو پلنگ پر لیٹے ہوئے دیکھ کر وہ بالکل اس کے قریب سرہانے کی طرف بیٹھ گیا اور اُس کی طبیعت کے بارے میں پوچھنے

لگ سکتی نے بتایا کہ وہ بالکل ٹھیک تھا اس کا بیٹا دو تین منٹ تک بیٹھا رہا اور کچھ کہہ کر اور مسکرا کر چلا گیا

اس کا بیٹا چلا گیا مگر وہ کچھ ٹھٹک کر رہ گیا وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ اس کا بیٹا جیسے اسی کی تصویر تھا اور جب وہ بھی چالیس سال کا تھا تو بالکل ایسا ہی تھا اور اب جو اس کا بیٹا مسکرایا تھا تو بالکل اسی کی طرح۔ تو کیا اُس کے بیٹے میں وہ خود موجود تھا۔ اور اس کا بیٹا جا بھی دفتر گیا تھا تو کیا اُس کی شکل میں وہ خود گیا تھا؟

اس کے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا جیسے کوئی نئی روشنی پھوٹنے والی ہو۔ وہ لپک کر اٹھ بیٹھا۔ اُس نے اپنا کوٹ پہنا چھڑی اٹھائی اور باہر برآمدے میں آگیا پھر وہ نیچے اتر کر پھاٹک کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اور باہر کی طرف دیکھ کر مسکرا اٹھا کیوں کہ چند لمحے ہوئے وہ خود چالیس سال کا جوان بن کر اس پھاٹک میں سے نکل دفتر گیا تھا!

وہ اپنے کمرے میں آگیا اور اس نے اپنی جیبوں میں بسکٹ ٹھونس لیں اور پھر باہر نکل کر منوا اور منو کو بسکٹ دیتا ہوا امرودوں کے درختوں کی طرف مڑ لیا اور ان کے تلے چند لمحے کھڑا ہو کر خرگوشوں سے خاموش مگر خوش و خرم کنبے کی طرف بڑھ گیا۔

وہ اس روز کافی خوش تھا اور اُسے تھکاوٹ کا احساس تک نہیں ہوا وہ وہ اپنے کمرے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اور ادھر سے جنو گزرا تو اُس نے اُسے بلا کر پوچھا کہ کیا وہ بابا کے ساتھ ندی پہ چلے گا جنو نے جواب میں بابا سے پوچھا کہ کیا اس کی جیبوں میں بسکٹ ہیں اور جب اُس نے بسکٹ دکھائے اور ایک پہلے ہی دے دیا تو جنو خوشی سے بابا کے ساتھ ہو لیا۔

آج ندی پر بڑی روپہلی اور خوشگوار دھوپ تھی اور ندی کا پانی چاندی کی طرح سفید اور اجلا تھا درختوں کے ہلے سلے چمکتی دھرتی پر اپنے جسموں کی شکل بنے لہلہا رہے تھے ندی کے اوپر آسمان کی نیلگوں پہنائی میں پرندوں کی کتنی ہی ڈاریں اڑان میں مصروف تھیں چاروں طرف ایک نہ مٹنے والی زندگی تھی۔ وہ دھوپ میں نیچے بیٹھ گیا تھا اور اُس نے جنو کو دو بسکٹ دے کر اپنے پاس ہی کھیلتے رہنے کو کہہ دیا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں جنو اپنے ہاتھ میں گول گول بجریاں اکٹھی کر کے لے آیا اور جب اُس نے انہیں نیچے رکھ کر بابا سے آئس کریم کے پیسے مانگے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جنو کی شکل بھی اس سے بہت ملتی تھی اور اُس کے کان اور آنکھیں تو بالکل ہی اُس پر تھیں۔ اس کے ذہن میں اُس کا بچپن جھلملانے لگا اور وہ جنو کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔ تو کیا وہ اپنے بعد اپنے بیٹے کی صورت میں اور پھر اس کے بعد اپنے پوتے کی صورت میں زندہ رہے گا اور کیا زندگی ایک ایسا دائرہ ہے جو کبھی نہیں ٹوٹے گا۔؟

اس نے جنو کو پیسے دیئے اور جنو آئس کریم لینے دوڑ گیا۔ وہ بے اختیار ہنس پڑا اور نیچے بیٹھ کر جنو کی بجریوں سے کھیلنے لگا۔ پھر جنو بابا کی چھڑی لے کر بابا کی طرح چلا اور اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ وہ دونوں دیر تک ندی پر رہے اور جب درختوں کے سائے سمٹ گئے اور گرمی اور روشنی کو خنکی اور اندھیارے نے ڈس لیا تو بھی وہ نہیں گھبرایا وہ اطمینان سے سورج کو افق میں کانپتے اور ڈوبتے دیکھتا رہا اور اُسے محسوس ہوا کہ ایک زندگی دوسری زندگی میں ڈھل رہی تھی، موت کا کہیں نام و نشان نہیں تھا اور لاتعداد دائرے ایک دوسرے میں جذب ہو کر مسلسل گھوم رہے تھے۔

## رباعیات

امیر چند بہار

(۱)

انسان کی دو روزہ زندگی کیا ہے
کیا چیز بڑھاپا ہے، جوان کیا ہے
جاتی ہے کہاں رُوح بشر بعد فنا
آنے جانے کی یہ کہانی کیا ہے

(۲)

کرتی ہے ہمیں عقل اشارہ کچھ اور
لیکن ہے طبیعت کا تقاضا کچھ اور
مجبور ہے کس درجہ زمانے میں بشر
کرتا ہے وہ کچھ، اور ارادہ کچھ اور

(۳)

نالاں ہے غم دہر سے انسان بہت
اُٹھتے ہیں یم زیست میں طوفان بہت
اے دوست نظر الجھ کے رہ جائے نہ کیوں
افسانۂ ہستی کے ہیں عنوان بہت

(۴)

مانا کہ میں ہوں دیر و حرم سے بیزار
اخلاص و محبت ہے مگر میرا شعار
ناراض نہ ہوں شیخ و برہمن مجھ سے
میں اپنی ضمیر کا ہوں فرماں بردار

(۵)

تسکیں نہ ملے جس سے وہ ایماں کیا ہے
بخشے نہ گناہ جو وہ یزداں کیا ہے
جو درد سے معمور نہ دل کیسا؟
اوروں کے نہ کام آئے جو انساں کیا ہے

# قابلِ مطالعہ

# کتابیں

| | |
|---|---|
| ہمارا جھنڈا | ایک روپیہ |
| بھارت آج اور کل | ۷۵ پیسے |
| دو شہروں کی کہانی (چارلس ڈکنس) | ۵ روپے |
| جوالا مکھی (ناول، اننت گوپال شیوڈے) | ۲ روپے ۵۰ پیسے |
| ہندوستان کا دستور | ۲ روپے |
| آئینۂ غالب | ۵ روپے |
| آج کل کی کہانیاں | ۳ روپے ۵۰ پیسے |
| وطن کے نغمے | ایک روپیہ ۷۵ پیسے |
| امرجوت | ۲ روپے |
| سائنس کے چند پہلو | ایک روپیہ ۲۵ پیسے |
| ہمارے نہرو | ۳ روپے ۵۰ پیسے |
| گنجینۂ غالب | ۴ روپے ۵۰ پیسے |
| ہندوستان کی مسجدیں | ۲ روپے ۵۰ پیسے |
| مہاتما گاندھی کی کہانی (رنگین تصویروں میں) | ۲ روپے ۵۰ پیسے |

| | |
|---|---|
| اچھا شہری (بچوں کے لئے) | ایک روپیہ |
| نہرو رادھاکرشنن کی نظر میں | ایک روپیہ |
| ابوالکلام آزاد | دو روپے |
| ہندوستان کی تاریخ (بچوں کے لئے) | ۳ روپے ۷۵ پیسے |
| ہندوستان کی نامور ہستیاں (حصہ اوّل) | ۲ روپے ۲۵ پیسے |
| ہندوستان کی نامور ہستیاں (حصہ دوم) | ۲ روپے ۵۰ پیسے |
| ہندوستان کی نامور ہستیاں (حصہ سوئم) | ۲ روپے ۵۰ پیسے |
| سوامی وویکانند (بچوں کے لئے) | ایک روپیہ ۵۰ پیسے |
| جواہرلال نہرو (خراجِ عقیدت) | ۲ روپے ۵۰ پیسے |
| ہندوستان میں تعلیم کی ازسرِ نو تنظیم (ڈاکٹر ذاکر حسین) | ایک روپیہ ۲۵ پیسے |
| ہندوستانی ڈرامہ (صفدر آہ) | ۳ روپے ۷۵ پیسے |
| پنڈت نہرو سے بات چیت (ٹیبر منڈی) | ۲ روپے |
| ندیا کنارے (علی عباس حسینی) | ایک روپیہ |
| کلکی یا تہذیب کا مستقبل (ڈاکٹر رادھاکرشنن) | ۷۵ پیسے |

آج کل کے خریداروں کو ۲۰ فی صد رعایت ہوگی
محصول ڈاک ہمارے ذمہ ہوگا

اُردو کے علاوہ انگریزی، ہندی اور تمام علاقائی زبانوں میں کتابیں شائع ہوتی ہیں

فہرستِ کتب مفت طلب کیجئے

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

احمد جمال پاشا

# محلے میں ہمارا گھر ہے



جس محلے میں ہے ہمارا گھر وہیں بقول مرزا شوق دہلوی رہتا ہے ایک سوداگر ہمیں اس بات کا پکا یقین ہے کہ شوق مرحوم کے زمانے میں ضرور اس علاقہ میں کوئی سوداگر رہتا ہوگا۔ مگر اب تو سمجھئے واقعی لوگ کم رہتے ہیں اور سوداگر زیادہ۔ گھروں کے آگے یہاں یا دش بخیر کبھی ڈرائنگ روم، دیوان خانے اور مہمان خانے ہوا کرتے تھے۔ ان کے بجائے اب دکانیں اور صرف دکانیں ہوا کرتی ہیں۔ اور دکانیں بھی ایسی کہ گھر کے سامنے دکانیں، گھر کے پیچھے دکانیں، گھر کے دائیں دکانیں، گھر کے بائیں دکانیں، یہاں تک کے گھر کے اوپر اور نیچے دکانیں۔ چنانچہ ہمارا گھر اچھا خاصا بساط خانہ اور محلہ بازار معلوم ہوتا ہے۔ غرض جب ہم اپنے گھر کو دیکھتے ہیں تو ہمیں اپنے بچپن میں پڑھی ہوئی ایک نظم 'The Charge of the Light Brigade' بے اختیار یاد آجاتی ہے۔ جس میں ٹیپ کا بند تھا۔!

"Canon to the left of them,
Canon to the right of them,
Canon in the front of them,
Canon behind of them".

بس فرق یہ ہے کہ اس ذہنی بریگیڈ کے چاروں طرف توپیں ہی توپیں اور اس کشتۂ بازار کے ہر طرف دکانیں اور بس دکانیں ہیں۔

ان دکانوں میں دکانداری سے زیادہ شور وغل کی آوازیں دن تو دن رات تک میں ہمارا جینا اور سونا دوبھر کئے رہتی ہیں۔ یہ آوازیں مول تول سے لے کر مار پیٹ اور ریکارڈ نگ تک کی ہوتی ہیں۔ اور اس بازار کا ہر سودا با آواز بلند طے پاتا ہے۔

آپ مانیں یا نہ مانیں مگر اب ہم اس دھماکوں، ہنگاموں اور آوازوں کی دنیا کے شور شرابے کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ اگر ٹھیک سے شور نہ ہو رہا ہو تو آرام سے سو نہیں پاتے، اور اگر بازار وغیرہ بند ہونے کی وجہ سے کچھ سناٹا ہوا تو عجب الجھن اور بے چینی سی رہتی ہے۔

مگر اس شور وغل کے فائدے بھی ہیں۔ مثلاً حال ہی میں ہمارے ایک عزیز مع اپنے خاندان لکھنؤ کی سیر کے لئے ہم پر اس طرح نازل ہو گئے جیسے گنہ گاروں پر عذاب اور کمزوروں پر موسمی بخار۔ ہم اس مہنگائی میں مہمانداری کے بوجھ سے دبنے ہی والے تھے اور ہمارا بجٹ فیل ہونے میں کوئی خاص کسر باقی نہیں رہ گئی تھی ہمارے معزز مہمان نے دو دن اور دو رات مسلسل شور وغل کی وجہ سے سو نہ سکنے کے بعد اپنا بوریا بستر باندھا اور شہر کے باہر ڈاک بنگلے میں قیام کے لئے ہمارے ظاہری روکنے کے باوجود چل دیئے۔ اور ہمارا بجٹ فیل ہونے سے اور ہم محض اس دن رات کے شور کی وجہ سے بال بال بچ گئے۔

اس شور و غل سے ایک اور فائدہ یہ ہے کہ ہمیں صبح صبح بلا اخبار پڑھے دنیا جہاں کی خبریں معلوم ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ ہر اہم خبر کے بارے میں مختلف قسم کی رائیں اور بے لاگ تبصرے مل جاتے ہیں۔ کیونکہ زیادہ تر کاروباری حضرات اخبار بھی اس طرح پڑھتے ہیں گویا اخبار پڑھ نہیں، چلا چلا کر بیچ رہے ہیں۔ اس کے ساتھ پاس پڑوس کے لاتعداد ریڈیو اور ٹرانسسٹر پل پل کی خبریں ہمارے کانوں میں پہنچاتے رہتے ہیں۔ فری خبروں کے بعد یہاں صبح سے رات گئے تک عام طور پر اور خاص طور پر تہوار تقریب کے موقع پر دن بھر کے علاوہ رات بھر بھی بالکل مفت تازہ ترین فلمی گانے اور فرمائشی پروگرام سنائی دیتا ہے۔

کرکٹ میچ کی کمنٹری ۱۵ اگست اور ۲۶ جنوری کے موقع پر جشن جمہوریہ کے پروگرام، اہم اعلانات اور بازار کے بھاؤ کے لئے ہمیں کبھی سننے کا کوئی اہتمام نہیں کرنا پڑا ہم اپنے معمولات میں مصروف رہے مگر ہر پروگرام کی تفصیلات سے خود بخود آگاہ بھی ہوتے رہے۔

اسی کے ساتھ ایک زبردست فائدہ گھر میں بازار لگنے کا یہ بھی ہے کہ ہمیں ہمیشہ معلوم رہتا ہے کہ کون سی چیز بازار سے غائب ہے؟ کس چیز کے دام چڑھے یا گرے۔ کون چیز کہاں اچھی ملتی ہے اور کون کہاں خراب؟

چوں کہ ہمارا گھر بیچ شہر میں واقع ہوا ہے۔ اس لئے ہمارا ہر عزیز، شناسا اور جگری دوست، خواہ کہیں بھی رہتا ہے مگر شہر کے اس بارونق بازار کا ضرور رُخ کرتا ہے اور جو لوگ یہاں تک آجاتے ہیں وہ گھڑی دو گھڑی کے لئے غریب خانے کو بھی رونق بخش جاتے ہیں۔ اس زمانے میں جبکہ جناب کرایے اتنے مہنگے ہیں اور رکشا والے ٹیکسی والے کا کرایے میں مقابلہ کرتے ہیں، ہم کرایے اور آنے جانے کی زحمت اور خرچ سے بالکل صاف بچے رہتے ہیں کیونکہ جائیں تو جائیں کہاں۔ سب تو خود یہیں آجاتے ہیں۔

آنے والوں میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ وہ لوگ بھی جو محض وقت گزارنے یا ادھار مانگنے آتے ہیں اور وہ لوگ بھی جو کھڑے کھڑے آتے ہیں اور الٹا ہم ہی سے پوچھ لیتے ہیں۔ "ہمارے لائق کوئی خدمت؟" تو ہم اس آخر الذکر قسم کی مخلوق سے ملنا زیادہ پسند کرتے ہیں جو خیر سے مخلص کے علاوہ خدمت گزار بھی واقع ہوئی ہے۔ لہٰذا جن لوگوں سے ہم نہیں ملنا چاہتے فوراً پردے کی آڑ میں سے زنانی آواز بنا کر خود ہی کہہ دیتے ہیں۔

"میاں! بھیا نہیں ہیں۔!"

اور اگر کسی نے کہا۔

"کون ہو؟ باہر تو آؤ۔!"

تو نہایت عاجزی کے ساتھ کہتے ہیں۔

"میاں! کیسے آجائیں؟ پردے دار جو ٹھہرے!"

اس کے بعد وہ غریب لاجواب ہو کر رفو چکر ہو جاتا ہے۔ اور جب راستے گلی ان سے صاحب سلامت ہوتی ہے اور وہ بتاتے ہیں کہ "جناب کے دولت خانے پر حاضر ہوا تھا!" تو ہم بڑی لاعلمی کے ساتھ دریافت کرتے "کب؟"

اور جب وہ گا چکتا ہے تو اسے کل پھر بلاتے ہیں۔

ہمارے بہت سے دوستوں کو حیرت ہے بلکہ تعجب ہے آخر ہم سینما کیوں نہیں دیکھتے۔ لیکن شاید انہیں اس بات کا علم نہیں ہے کہ اتنے فلمی ماحول میں دن رات رہنے کے بعد فلم دیکھنے کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کیونکہ ہمیں اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، چلتے پھرتے، صبح شام اور دن رات اپنے محلے اور پڑوس نما بازار کے مکالمے، گانے اور مفت کی موسیقی سننے کے ساتھ ان کی گھریلو اور بازارو مار دھاڑ والی زندگیوں کی پوری پوری ناٹکی فلمیں اور آنے والی فلموں کے ٹریلر تک سننے کو مل جاتے ہیں۔ جس کے بعد الگ سے سینما دیکھنا آخر بد مذاقی نہیں تو پھر کیا ہے؟

پھر بھی آخر میں ہم یہی عرض کریں گے کہ غرض زمانے کو دیکھتے ہوئے جہاں بھی ہمارا گھر ہے۔ بہت غنیمت ہے۔ جس کے لئے ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتے کہ خدا اسے آباد اور ہمیں شاد رکھے۔

# غزلیں





## ظفر ادیب

لاکھوں ہی آرزوئیں ہیں ہر آدمی کے ساتھ!
لیکن یہ قافلہ ہے فقط زندگی کے ساتھ
رنگینیاں بھی تو ہیں غمِ عاشقی کے ساتھ
کیا کیا خوشی نہیں ہے اس آزردگی کے ساتھ
پیمانہ دور میں ہے تو ہے زندگی کا دور
ہر ایک بات میں ہے کشش مے کشی کے ساتھ
بھولا نہیں ہوں میں تو نہیں وہ بھی بھولیں گے
دل کی لگی بھی ہوتی ہے کچھ دل لگی کے ساتھ
اُن کی جفا کا ردِ عمل ہے مری وفا
شاید ہمیشہ وہ نہ رہیں برہمی کے ساتھ
یہ ہم ہی تھے کہ سہتے رہے تیری بے رُخی
کیا کیا زخم اُٹھائے ہیں ہم نے خوشی کے ساتھ
بس اک نگاہِ لطف کی ہے تجھ سے آرزو
آخر طلب ظفر کو ہو کتنی کمی کے ساتھ

## عبدالحمید حمید عظیم آبادی

دل میں سوزش ہے مرے آگ لگی ہو جیسے
اور دھواں بھی ہے کوئی چیز جلی ہو جیسے
دل کو پژمردہ زمانے نے کیا ہے ایسا
شاخِ گل میں کوئی مرجھائی کلی ہو جیسے
مسکراتا تری محفل سے رقیب اٹھا ہے
اس کے مطلب کی کوئی بات بنی ہو جیسے
پی کے آنکھوں سے تری مست ہیں میکش ساقی
ساری مستی تری آنکھوں میں بھری ہو جیسے
تیری تصویر سے ہو جاتی ہے دل کو تسکیں
ہے تو تصویر مگر بول رہی ہو جیسے
جس گلی سے میں گزرتا ہوں جنوں میں جب بھی
وہ گلی لگتی ہے تیری ہی گلی ہو جیسے
آنکھیں پتھرائیں مگر جانبِ در ہیں پھر بھی
اُن سے ملنے کی ابھی آس لگی ہو جیسے
ضبطِ غم پر کوئی کیونکر نہ کرے رشک حمید
ہنستے رہتے ہو تم ایسے کہ خوشی ہو جیسے

## دل ایوبی ٹونکی

منظرِ دیدۂ نمناک ہے جل تھل کی طرح
دل سے گزری ہے تری یاد ابھی بادل کی طرح
دوستو صبح کے آثار مبارک لیکن
آج بھی شام نہ ہو جائے کہیں کل کی طرح
سرفروشوں کو دعا دے کہ انہیں کے دم سے
سرخرو ہے ترا کوچہ کسی مقتل کی طرح
شام ہوتے ہی اندھیرے مری تنہائی میں
پھیل جاتے ہیں تیری آنکھ کے کاجل کی طرح
لب سے وا ہیں مری آنکھوں کے دریچے ظالم
کب سے ویران ہے دل بیتِ مقفل کی طرح
ڈھانے والے در و دیوارِ تمنا یہ نہ بھول
دل مقدس ہے، مرا قبلۂ اول کی طرح
اُن کے دم سے جو کبھی رشکِ ارم تھا اے دل
وہی گھر ہے کسی سنسان سے جنگل کی طرح



# مقالہ کیا ہے

ہماری زُبان کے نثری حصے میں جس صنف ادب کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے وہ افسانے کے بعد مقالہ ہے —— اگر پچھلے پونے دو سو سال کی ادبی کائنات کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں اپنے ادبی سرمایہ کی بے بضاعتی شدید طور پر محسوس ہوگی۔ یہ کہنا بڑی حد تک صحیح ہوگا کہ پچھلا سرمایہ نظم، داستان اور مضمون جیسی مقبول انام نگارشات پر مشتمل تھا۔ ہر نوع کے جذبی و فکری کوائف کی شعری قلم بندی کی صورت "نظم" تھی، وہ نظم جو نثر کی ضد سمجھی جاتی اور جس میں مختلف شعری سانچے داخل تھے —— اخلاقی، مذہبی و نیم مذہبی واقعات و حکایات کی نثری قلم بندی کی صورت "داستان" تھی، وہ داستان جو فرضی اور غیر فطری، قیاسی اور غیر حقیقی واقعات کا مجموعہ تھی۔ مختلف قسم کے علمی و ادبی سنجیدہ اور اہم موضوع و مسائل کے بیان و اظہار کا اسلوب "مضمون" تھا —— بساطِ ادب پر صنفی لحاظ سے نگارشات کی یہی تین شعری و نثری قسمیں بحیثیت مجموعی ہمارے اہلِ قلم کا سرمایۂ ذہن و زبان تھیں۔

مقالہ "مضمون" کی ایک قسم ہے، مگر منفرد اور مہتم بالشان قسم ہے عام زبان میں ہر بات یا خیال جو نثر میں پیش کیا جائے، مضمون سے موسوم کر دیا جاتا ہے ۔ پھر، ہر نثری تحریر کو ہم مقالہ نہیں کہہ سکتے —— مقالہ تحریر کی ایک منظم و مستحکم صورت ہے، جو انشائیہ، سوانح، خاکہ اور رپورتاژ جیسے دیگر نثری اصناف کی طرح ادب میں اپنا خاص مرتبہ و منصب رکھتا ہے۔ مقالہ نگار ایک بھرپور علمی و ادبی شخصیت کا مالک ہوتا ہے۔ یہ صاحب قلم ہوتا ہے اور صاحب فکر و نظر بھی۔ مقالہ نگاری میں صنفی ضوابط اور فنی شرائط کا التزام ضروری ہے۔ یہ کسی عالم و فاضل کی قلم کاری ہے جو پارۂ ادب کہے جانے کی مستحق ہے۔

—— مقالہ ایوانِ ادب میں روزن کی مثال ہے، روشن، کھلا اور ہوادار! اچھے معیاری مقالوں سے ہمیں ذہنی تابانی حاصل ہوتی ہے۔ یہ ہمارے ذہن کی تاریکی کو دور کرتا اور دماغ کے بند دریچے کھول دینے کی قوت رکھتے ہیں۔ ایک کامیاب مقالہ کلید گنجِ علم ہوتا ہے۔ یہ وہ صاف و شفاف شیشہ ہے جو نہایت اعتماد کے ساتھ دوربینی اور خوردبینی میں کام آتا ہے۔

(الف) علمیت مقالہ کی بنیادی خصوصیت ہے۔ علمیت اس تحریر کا وہ اساسی وصف ہے جو اس صنف کو دوسری نثری تحریروں سے حسبًا و نسبًا مختلف کر دیتا ہے —— اچھے اور اونچے مقالوں کے مطالعہ سے ہمیں علم و دانش کی دولت حاصل ہوتی ہے۔ یہ مفید اور اہم معلومات کی زرّیں دولت ہے۔ یہ علمیت کا بیش بہا خزانہ ہے اور غیر فانی خزانہ بھی۔ مقالہ کا نفس کسی مخصوص بات یا خیال سے معمور رہتا ہے۔ ایسی بات یا غیر مسئلہ، نکتہ یا پہلو جو ہماری ذات یا زندگی سے علاقہ رکھتا ہے، کبھی بالواسطہ اور کبھی بلاواسطہ وہ خاص بات جس کی جان پہچان اس جلتی پھرتی اور بنتی بگڑتی دنیا میں ہمارے لئے بہت ضروری ہے۔ وہ اہم بات جسے جانے پہچانے بغیر کبھی زندگی گزارنا بھی دوبھر ہو جاتا ہے۔

علمیت مقالہ کا جوہر ہے۔ کامیاب مقالہ قلم کار کی ذی علم شخصیت اور اس کے تبحر علمی کا پَرتَو ہوتا ہے۔ اس تحریر میں اس کے شعور و نظر کی بلندیاں ابھرتی ہیں۔ وہ عالم ہوتا ہے اور طلب علم کا جذبہ صادق رکھتا ہے۔ مطالعہ اور کثرتِ مطالعہ اس سے

جیسا مشغلہ ہوتا ہے ۔ کتابیں، اچھی کتابیں اس کی مونس و ہمدم رہتی ہیں۔ مقالہ نگار کے مطالعہ میں جس قدر وسعت و گہرائی ہوگی، موضوع تحریر پر جس قدر اس کی ذاتی نظر ہوگی، مقالہ میں اسی قدر علمیت کا انداز، عمق اور روشنی ہوگی۔

مقالہ کا ماخذ قول ہے جس سے مراد بیان، کلام، گفتگو یا بات چیت ہے ـــ یہی گفتگو یا کلام مقالہ نگار کا مقصد و مدعا ہے۔ وہ ہمیں کچھ کہتا یا سناتا ہے ـــ یہ "کچھ" واقعہ نہیں۔ یہ شاعری نہیں ـــ یہ گپ شپ بھی نہیں ـــ یہ کچھ کوئی مفید علمی بات ہوتی ہے۔ تسکین بخش اور فکر انگیز ـــ یہ ایسی اہم اور سود مند بات ہوتی ہے جسے ہم نہیں جانتے یا کم جانتے ہیں جس کے نہ جاننے سے ہماری خواندگی یا خردمندی پر حرف آتا ہے اور ہم ذہنی مفلسی کا شکار ہو جاتے ہیں ـــ

علمیت مقالہ کی بنیادی خصوصیت ہے۔ مقالہ نگار کسی موضوع پر عالمانہ اور فاضلانہ اظہار خیال کرتا ہے۔ لیکن انداز گفتگو یعنی موضوع تحریر کے بیان کے طریقہ کار سے علمیت کی ماہیت بدل جاتی ہے، اور علمیت کی تاثیر و عمل میں بھی فرق پیدا ہو جاتا ہے ـــ دوسرے الفاظ میں اس بات کو یوں سمجھئے کہ علمیت مقالہ میں ایک رقیق مادہ کی مثال ہے جس سے قاری کی تشنگی دور ہوتی ہے۔ یہ رقیق مادہ کہیں صرف ٹھنڈا پانی ہے، کہیں کیف افزا شربت اور کہیں حیات بخش عرق ـــ علمیت کی اس نوعیت اور خاصیت کے بموجب مقالوں کو تین مختلف طبقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ جو مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ معلوماتی مقالے
۲۔ تاثراتی مقالے
۳۔ فکری مقالے

معلوماتی مقالے علوم یا سائنس سے متعلق ہوتے ہیں۔ یہ تاریخ، فلسفہ، منطق، سیاست، عمرانیات، نفسیات، اخلاقیات جیسے سنجیدہ علوم سے علاقہ رکھتے ہیں۔ نیز یہ کیمیات، طبعیات، فلکیات، ریاضیات، نباتیات و دیگر سائنسی موضوعات پر بھی مبنی ہوتے ہیں۔ بنفسہ ہر معلوماتی مقالہ میں کسی علمی یا سائنسی بات پر اظہار خیال کیا جاتا ہے جس طرح کسی شعبہ کی نمائش گاہ کی سیر و مشاہدہ سے ہم اس شعبہ کے وجود، اہمیت اور اہل شعبہ کی کارگزاریوں سے اچھی طرح روشناس ہو جاتے ہیں اسی طرح معلوماتی مقالوں کے ذریعے ہمیں علوم اور سائنس کی سیر و سیاحت کے مواقع نصیب ہوتے ہیں۔ ان کے مطالعے سے ہم مختلف علمی یا سائنسی مسائل و امور سے باخبر اور آگاہ ہو جاتے ہیں۔

معلوماتی مقالے قاری کے لئے ابتدائی اسباق کی مثال ہیں۔ معلوماتی مقالوں میں عموماً قلم کار کا اپنا زاویۂ نظر یا نقطۂ نگاہ نہیں ہوتا۔ ان تحریروں میں اس کی ادبی شخصیت کا عکس و نقش نہیں ملتا۔ وہ ایک ذی علم لائق اور مشفق مدرس کی طرح سنجیدگی کے ساتھ مصروف تعلیم و تدریس رہتا ہے۔ مقالہ کی سب سے عام قسم معلوماتی ہے۔ معلوماتی مقالے، بالخصوص ابتدائی منزل و منہاج کے معلوماتی مقالے، کثرت سے لکھے اور پڑھے جاتے ہیں۔

(۲) مقالوں کی دوسری قسم تاثراتی ہوتی ہے۔ ان مقالوں کے مطالعے سے بھی ہمیں علمیت حاصل ہوتی ہے۔ مگر ان میں علمیت کی خاصیت و تاثیر مختلف ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر کسی بات کا جاننا اور کسی بات کا پہچاننا ایک نہیں ہوتا، یا کسی چیز کو دیکھنا اور اس کو سمجھنا علم و آگہی کی دو منزلیں ہیں، جیسے گھڑی پر ایک نظر ڈالنا اور گھڑی کی دو سوئیوں کے عمودی قیام کو دیکھنا : ـــــــ مقالہ معلوماتی ہو یا تاثراتی، بلاشبہ اس کے مطالعہ سے ہمیں کچھ حاصل ہوتا ہے۔ مگر معلوماتی مقالے کی علمیت ظاہری شناسائی ہے، محض چلتی پھرتی۔ تاثراتی مقالے کی علمیت گہری ہوتی ہے اور دیرپا۔ کہہ سکتے ہیں معلوماتی مقالوں میں علمیت کی تاثیر کسی شخص سے چند ساعتوں کی ملاقات کی مثال ہے اور تاثراتی مقالوں میں یہ تاثیر اس شخص سے رفاقت کی مثال ہے۔

علمیت کی یہ تاثیر یا گہرائی تاثراتی مقالہ میں قلم کار کے تخلیقی طریقہ کار سے پیدا ہوتی ہے۔ ان تحریروں میں وہ اپنی شخصیت کو علیحدہ رکھ کر قلم نہیں اٹھاتا، بلکہ قلم بندی میں اس کی عالمانہ شخصیت کے ساتھ ادبی مزاج بھی حرکت میں آجاتا ہے۔ اظہار خیال میں وہ خارجیت اور داخلیت دونوں سے مصرف لیتا ہے۔ اس طریقہ کار سے باتوں کی خشکی روکھے پن اور بے کیفی میں کمی ہو جاتی ہے۔ ان میں جذباتی کوالف کی نمی آجاتی ہے۔ اور تحریر میں نت نئے رنگ پھوٹ پڑتے ہیں۔ معلوماتی مقالے میں خارجیت کی تیزی ہوتی ہے اور موضوع کے ساتھ قلم کار کا ایسا شعوری ضبط و احتیاط جس سے باتیں زیادہ سنجیدہ اور ارتکازی ہو جاتی ہیں۔

معلوماتی مقالہ ہمارے علم میں اضافہ کا سبب فی الفور ہوتا ہے۔ یہ ہمیں بیدار و ہوشمند بناتا ہے۔ تاثراتی مقالہ ہماری پسند و خاطر میں استواری و پائیداری لاتا ہے۔ تاثراتی مقالوں سے بینائی کو مشاہدہ کی قوت اور بصارت کو بصیرت کا زور حاصل ہوتا ہے۔ معلوماتی مقالے ہمیں راہ بتاتے ہیں۔ تاثراتی مقالے اس راہ پر چلنے کی توانائی اور توفیق بخشتے ہیں۔

(۳) مقالوں کی تیسری قسم فکری ہے۔ فکری سے یہ مراد نہیں کہ اس نوع کے مقالوں کا موضوع فلسفہ و حکمت ہوتا ہے بلکہ یہاں قلم کاری کا انداز فلسفیانہ ہوتا ہے یعنی موضوع تحریر پر مقالہ نگار عالمانہ اور مفکرانہ انداز سے قلم اٹھاتا ہے اس کی علمی شخصیت اوسط نہیں، غیر معمولی ہوتی ہے اس کی ذہنی قوتیں قدرت کی فیاضی کا نمونہ ہوتی ہیں۔ اسے بصیرت ہوتی ہے اور ژرف نگاہی بھی۔ علاوہ بریں، اس کا اپنا مطمح نظر ہوتا ہے، واضح اور روشن۔ یہ مطمح نظر کثرت مطالعہ، غور و خوض اور تفکر سے پیدا ہوتا ہے۔

داخلیت فکری مقالوں میں بھی ہوتی ہے۔ یہ داخلیت تاثراتی مقالوں

جیسی سریع التاثیر نہیں ہوتی۔ یہ معتدل اور مناسب ہوتی ہے صنف مقالہ ہمیں یہ بھولنا چاہیے۔ ادب کی نہایت سنجیدہ صالح اور دقیع تحریر ہے جس میں قلم کار کے لئے ضبط، صبر اور متانت اولین شرط ہے جذبی کوائف کے اظہار میں اس نے مقالہ نگار کو انتہائی احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔ جذبات کی تیزی، جوش و خروش یا شدت سے مقالے کی تاثیر میں فرق آجاتا ہے۔ جس طرح انتشار خیال سے نظم کی مدنی گھٹ جاتی ہے یا کثرت واقعات سے افسانہ کا حلیہ بدل جاتا ہے، جذبات کے افراط و افزونی سے یہ صاف ستھری تحریر بھی بدصورت اور بدانجام ہو جاتی ہے۔

فکری مقالوں میں داخلیت کی وجہ سے کبھی ہجو و طنز اور درد و رقت کی کیفیتیں بھی نمودار ہو جاتی ہیں۔ یہ مناسب نہیں پر ان میں اعتدال ضروری ہے بلند پایہ فکری مقالوں میں ان کا استعمال نہایت ماہرانہ ہوتا ہے۔ ان میں بالخصوص ہجو اور طنز کے براق و براّن نمونے ملتے ہیں جیسے شگفتہ لبوں پر خفیف سا تبسم اور چشم سے گوں میں آنسوؤں کی نمی۔

فکری مقالے مقالوں کی سب سے بزرگ و اعلیٰ قسم ہیں۔ معلوماتی یا تاثراتی مقالوں کی طرح یہاں قلم کار کا مقصد علمیت کی تدریس و تعلیم ہے۔ علمیت کی نوعیت ان تحریروں میں نہایت ارفع و ادق ہوتی ہے۔ یہ ایسی معنویت ہوتی ہے جسے تحریر میں تحلیل کرنا ہر مقالہ نگار کے بس کی بات نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فکری مقالوں کے قاری عوام نہیں خواص ہوتے ہیں۔ یہ وہ غذائیں نہیں جو ہر دل و دماغ کو راس آجائیں — ان کا لکھنے والا ایک بیدار دماغ انسان ہوتا ہے، بڑا مفکر اور زمانہ شناس عالم جس کی پیری میں جھلکتا ہے سحر مثل شباب! — یہ حکمت کو ادب اور ادب کو حکمت میں تبدیل کرنے کا سحر جانتا ہے۔ معیاری فکری مقالے زبان و ادب کی وہ قیمتی دستاویزیں ہیں۔ جو ادب و تہذیب کو لازوال بناتے ہیں۔

(ج) سنجیدگی اور متانت مقالے کی تیسری اہم خصوصیت ہے۔ یہ تحریر بنفسہٖ نہایت سنجیدہ ہوتی ہے۔ یہ تفریحی یا انشائی نہیں ہوتی۔ نثری ادب کے تمام اصناف کے مقابلے میں اس لحاظ سے مقالہ کا وجود منفرد ہے۔ مقالہ نگار کسی علمی موضوع جو ادبی یا سائنسی ہو، پر سیر حاصل گفتگو کرتا ہے اور عالمانہ اور فاضلانہ انداز سے کرتا ہے سنجیدگی اور سنجیدہ بیانی اس کی خلقی صفت ہے۔

مقالہ کی سنجیدگی دراصل مقالہ نگار کے مزاج و طبع کا پرتو ہوتی ہے یہ سنجیدگی اس کی شخصیت کے وہ رخ سامنے لے آتی ہے جس میں بزرگی ہوتی ہے اور بلندی بھی، ایثار ہوتا ہے اور عاجزی بھی۔ اخلاص و دیانت اور راستی فی الحقیقت اس کی سیرتی اوصاف میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ ہمیں کچھ بخشتا ہے بے مانگے دیتا ہے اور ہمارے ظرف کے بموجب دیتا ہے۔ جتنا وہ جانتا ہے، بتاتا ہے اور ہمیں جتنا جاننا چاہئے اس کے بتانے میں دریغ نہیں کرتا، قاری کو اپنی برتری سے مرعوب کرنا، اس کے ذہن کو غیر متعلق باتوں میں الجھاتا، اس کی ذہانت اور فراست کو جھٹلانا، اس کا شعار ہوتا نہیں۔ وہ الجھنوں کو سلجھاتا ہے، گرہوں کو کھولتا ہے، لاعلموں کو بیدار، کم علموں کو باخبر اور ذی علموں کو ہوشیار و کاردار بناتا ہے۔ یہی مقالہ نگار کی دیانت، راستی اور اخلاص ہے۔

مقالہ نثری ادب کی واحد تحریر ہے جو قلم کار کی عالمانہ و مفکرانہ شخصیت کا ضامن ہوتی ہے۔ یہ تحریر قلم کار کے تبحر علمی، وسعت نظری، نکتہ رسی، دقیقہ رسی، حافظہ اور خیال آفرینی کی صحت و ثبات کا آئینہ ہوتی ہے۔ اس تحریر میں قلم کار کا مجلا ستھرا ذہن، واضح مطمع نظر اور تجزیہ حق بیں ریڈیو میں ڈائل کے نقش کی مثال ہیں۔ مقالہ معلوماتی ہو، یا تاثراتی ہو یا فکری، اگر مقالہ نگار طبعاً و خلقاً سنجیدگی و متانت اوصاف سے مبرا ہے تو وہ مقالہ نگار کے فرائض انجام دینے کا اہل نہیں۔ ایسے مقالہ نگار بجھے چراغ ہوتے ہیں، جن کی جگہ اس معمورہ علم میں ممکن نہیں۔

وہ مقالے جو تحقیقی یا تنقیدی ہوتے ہیں اور جن میں اس نوع کے موضوعات پر اظہار خیال کیا جاتا ہے۔ ان میں خصوصاً اس خصوصیت کی تب و تاب پر پہلی نگاہ جاتی ہے تحقیقی و تنقیدی مقالوں میں قلم کار کے اخلاص و دیانت کی وہی حیثیت ہے جو نمازی کے لئے تازہ وضو کی یا زن پاکدامن کے لئے حیا و حجاب! ان مقالوں میں عدم اخلاص و دیانت سے مقالہ نگار سفلی جذبات کا اسیر ہو جاتا ہے۔ وہ عصبیت، ریا، جانبداری اور تنگ نظری کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس میں سہل انگاری عجلت روی، اور کج بینی آجاتی ہے وہ محنت و مشقت اور عدل و انصاف کی راہ سے دور اور رعایت و مروت کا بندہ ہو جاتا ہے — ادبی تنقید میں مقالہ نگار عادل و منصف کی طرح قلم اٹھاتا ہے وہ دو ٹوک اور بے لاگ باتیں کہتا ہے اور نہایت تیقن کے ساتھ کہتا ہے۔

مقالہ کسی سنجیدہ موضوع پر سنجیدہ تحریر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تحریر دیگر اصناف سے صورتاً و مزاجاً مختلف نظر آتی ہے کہ ان جیسی دلکشی یا جذب و جمال اس میں نہیں ہوتا، لیکن اس غیر شاعرانہ یا غیر فسوں کارانہ سرشت کے باوجود یہ تحریر ادبی رنگ و آہنگ سے معرا نہیں ہوتی۔ تعمیم علم اس کا فریضہ ہے اور اس سے عہدہ برآ ہونا واقعی آسان نہیں — اس کا کام محض بلند و بالا اور انجانی و غیر معمولی باتوں کی تفہیم و تشریح نہیں بلکہ ان باکار و سودمند باتوں کو قاری تک حسن و خوبی پہنچانا ہے۔ یعنی ایسی ترسیل کہ یہ باتیں قابل قبول ہو جائیں، یہی مقالہ نگار کی کامرانی اور سلیقۂ قلم کاری ہے — یہ دشوار کام مقالہ نگار انشا کے ذریعہ انجام دیتا ہے۔ انشا کے چھینٹوں سے وہ سوکھی اور بے سواد باتوں کو رس دار بنا دیتا ہے، ان کی خشکی اور بے رونقی کو زائل کرتا ہے۔ انہیں عسیر الفہم ہونے سے بچاتا اور ان کی پذیرائی کو بڑھاتا ہے۔

صنفِ مقالہ میں اس طرح قلم کار کی دُہری شخصیت ہوتی ہے اور عموماً یہ ہم کار نظر آتی ہے۔ پہلا ایک عالم و دانشور ہوتا ہے۔ دوئم ایک ہوش مند انشا پرداز۔ اس کی ناموری اور بہا آوری کے دو اسباب ہیں، دولتِ علم اور قوتِ قلم۔ انشا پردازی پر مقالہ نگار کے لئے عمل ناگزیر ہے۔

انشا، شاعر و ناثر کی ایک اعلیٰ لیاقت ہے۔ یہ قدرتی ہنر ہے اور قابل قدر سلیقہ بھی جس کے عمل سے قلم کاری آرٹ کا منصب حاصل کرتی ہے مگر انشا، تحریر کے لیے عیب بھی بن جاتی ہے جب یہ تحریر کے مقصد اور اس کے صنفی ضابطے کی پابند نہیں ہوتی۔ مقالہ میں انشا کا غیر مستحسن عمل عموماً دو مواقع پر نظر آتا ہے۔ اولاً جب مقالہ نگار کا ذخیرۂ علم عامیانہ ہوتا ہے، مختصر اور اوسط۔ اُسے زبان و بیان کی قدرت تو حاصل ہوتی ہے، مگر ذہنی طور پر وہ نادار ہوتا ہے کسی سنجیدہ موضوع پر وہ سنجیدگی کے ساتھ اظہار خیال شروع کرتا ہے۔ بات سامنے آتی۔ یہ آگے نہیں بڑھتی، محض گھومتی رہتی ہے اور جُوڑ ازکار امور کے جلو میں گھومتی ہے۔ نفسِ تحریر میں کوئی حرکت نہیں ہوتی۔ عبارتیں خوش نما و دل افروز عبارتیں، لکہ ہائے ابر کی طرح صفحۂ قرطاس پر گزرتی رہتی ہیں — یہ انداز قلم کاری مقالہ نگاری نہیں، عبارت آرائی ہے۔ یہ خیالات کی تحریری زیب و زینت ہے، محض سج دھج، اور یہی انشا کا ناقص عمل ہے جو اس صنف کے لیے قطعاً مناسب نہیں۔

دوئم جب مقالہ نگار جذباتی ہو جاتا ہے اور انشا جب اس کی قلم کاری پر مسلط ہو جاتی ہے۔ مقالہ نگار کی رہبری پھر دماغ کے عوض دل کے سپرد ہو جاتی ہے۔ وہ خیالات کی بجائے جذبات کی طرف راغب اور بات سے زیادہ بیان کا بندہ ہو جاتا ہے۔ یہ صورت بھی انشا کی بے اعتدالی کا نتیجہ ہے جو اس صنف کے لئے معیوب ہے تاثراتی مقالوں میں انشا کے دخیل ہونے کا بڑا خطرہ رہتا ہے۔

انشا گری مقالہ نگار کی قلم کا ایک رُخ ہے۔ یہ رُخ ہمیں نہ بھولنا چاہئے ضمنی ہے اساسی و اصلی نہیں۔ اس صنف میں انشا کا دخل و عمل ملبوسات میں نفاست کی مثال ہے۔ انشا کے استعمال میں اگر پاسِ احتیاط نہ ہو تو پھر انشا تحریر کے لیے کامیل نہیں کالکھ بن جاتی ہے —!

(د) مقالہ سنجیدہ اور بلند و برتر خیالات و افکار کا نہایت مرتب و مستحکم تحریری اسلوب ہے اس صنف کی امتیازی خصوصیت جو اس کے اسلوب کو دوسری تمام نثری تحریروں سے ممتاز کر دیتی ہے، سالمیت و جامعیت — یہ خیالات کی یکجہتی ہے جو ترتیبِ ذہنی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ مقالہ کی کامیابی کا راز باتوں کی تنظیمی خوش سلیقگی اور تحریری شستگی ہے۔ ہر اچھا مقالہ، خصوصاً فکری مقالہ، ایک پختہ کار اور تربیت یافتہ دماغ کا عمل ہوتا ہے۔

مقالہ نگار چند مخصوص ذہنی قوتوں کا مالک ہوتا ہے۔ یہ قوتیں حافظہ، ادراک تسویہ اور ذہانت ہیں۔ اس کی قوتِ نقد درجہ اوسط سے بالا ہوتی ہے اور اس میں صبر و ضبط کا مادہ بدرجہ اتم ہوتا ہے۔ دوسرے قلم کاروں کی طرح مقالہ نگار کسی عنوان پر بے ساختہ قلم نہیں اٹھاتا۔ قلم برداشتہ اظہار خیال اس کا شعار نہیں۔ وہ احتیاط، اطمینان اور اعتماد کے ساتھ اپنی باتیں سپردِ قلم کرتا ہے ذاتی مطالعہ کی روشنی میں وہ اس عنوان پر اچھی طرح غور و خوض کرتا ہے۔ دماغ میں باتیں آتی ہیں۔ یہ جوش و خروش کے ساتھ نمودار ہوتی ہیں اور کبھی ہجوم و انبوہ کے ساتھ بھی آتی ہیں۔ لیکن مقالہ نگار ان کے نمود اور ورود سے غافل نہیں ہوتا۔ ان کی یورش اور شورش کو روکتا ہے۔ انہیں ربط و یابس سے پاک کرتا ہے۔ باتوں کو قلم بند کرنے سے پہلے ان کی یکجائی و یکسانی اور پیوستگی و پذیرائی پر وہ اچھی طرح توجہ دیتا ہے — حافظہ تسویہ و تمیز جیسے عوامل سے لائق و سود مند مواد کی فراہمی اور انتخاب کے کام سرانجام پاتے ہیں۔ دلائل اور با کار مثالوں کے ذریعہ باتوں کو تنومند اور قابل قبول بنایا جاتا ہے — یوں پاس اہتمام و التزام کے ساتھ ساری مبسوط باتیں عالمِ خیال سے عالمِ وجود میں لائی جاتی ہیں بالترتیب و بتدریج یہی خیالات و افکار کی وہ شیرازہ بندی اور تنظیمی خوش سلیقگی ہے جو اس صنف میں سالمیت و جامعیت پیدا کر دیتی ہے اور اس نثری تحریر کو نہایت صاف ستھرے سجل اور ہموار اسلوب کا حامل بنا دیتی ہے جیسے فرش پر بچھی ہوئی نئی اور بے داغ سپید چادر!

مقالہ کے اس پختہ و مستحکم اسلوب کا اصل سبب وحدتِ خیال ہے — اس صنف میں باتوں کا اتحاد ہوتا ہے۔ انتشار نہیں ہوتا، انشائیہ کی طرح۔ مقالہ میں باتیں وحشی و پرفشاں یا آزاد و مختار نہیں ہوتیں۔ یہ وابستہ و پیوستہ ہوتی ہیں اور پھول کی پنکھڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے الگ ہو کر بھی ایک واحد مرکز سے ملحق رہتی ہیں۔ باتیں جو بظاہر مختلف پیراگرافوں میں منقسم نظر آتی ہیں، ان میں نظامِ عصبی جیسا گہرا عضویاتی تعلق ہوتا ہے۔ یہ تعلق جس مقالے کا بنیادی خیال کہئے، جوہر مقالہ ہوتا ہے اور اسی جوہر میں مقالہ نگار کا مطمحِ نظر محلول رہتا ہے۔

مرکزی خیال اس تحریر اور تحریر کے رگ و ریشے میں پیوست رہتا ہے۔ یہ باتوں کے مختلف حصوں کو قابو میں رکھتا ہے اور انہیں مطلق العنان نہیں ہونے دیتا۔ آپ غور کریں جب ہم مقالہ شروع کرتے ہیں۔ اور ہماری نگاہیں تحریر کے مختلف پیراگراف سے گزرتی ہیں اور خیالات کے تانے بانے ابھرنے شروع ہونے لگتے ہیں۔ باتیں کھلتی ہیں، نیاز کھلتی ہیں اور اختتام پر نفسِ تحریر کے سارے نقوش نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ہماری وہ نگاہ جو ابتدا میں محض عنوانِ مقالہ سے آشنا ہوئی تھی، بعد مطالعہ یہ اس نکتہ نہاں کو

بھی دیکھ لیتی ہے جو حاصلِ مقالہ یا جوہرِ مقالہ ہے ــــ اس لمحہ طمانیت و آسودگی میں آپ اتفاق کریں گے، ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آپ نے کچھ پا لیا، نئی بات، راحت خیز اور فکر بخش زرّیں بات ـــ!

اچھے اور کامیاب مقالوں میں خیالات کی مختلف منزلیں ہوتی ہیں۔ یہ منزلیں بالترتیب و بتدریج سامنے آتی ہیں اور قاری اُنہیں زینہ بہ زینہ طے کرتا ہے۔ مقالہ کا چھوٹے چھوٹے متعدد پیراگرافوں میں منقسم ہونا نہ صرف قلم بند خیالات کی نفیس ذہنی تنظیم کی دلیل ہے بلکہ یہ مقالے کے فورم یا اسلوب کی مضبوطی اور استحکام کی علامت بھی ہے۔ مقالے کے اس مستحکم اسلوب کی وضاحت نظم اور غزل کے اسلوب کے موازنہ سے کی جا سکتی ہے۔ غزل کے فورم میں جیسی لچک اور ملائمیت ہے وہ نظم میں نہیں ہوتی۔ اشعارِ غزل کی ترتیب میں تبدیلیاں اور من موجی تبدیلیاں ہمیشہ ممکن ہیں مگر نظم کے اشعار کے مصرعوں میں بھی ردّو بدل دشوار ہے۔ خیالات کا جیسا ارتقا اور سیلِ جذبات کی جیسی متوازن روانی صنفِ نظم میں ہوتی ہے تقریباً اسی پایہ کی ساخت مقالے کے اسلوب میں بھی شرط ہے۔

کامیاب اور معیاری مقالہ میں اچھی نثر کے تمام محاسن موجود ہوتے ہیں چھوٹے نرم رو جملے، ہلکا آہنگ، سادہ و سہل عبارت، متوازن انشا، اور ترتیب پذیر انداز اس تحریر کے شمائل و خصائل ہیں۔

مقالہ میں کوئی بات مبسوط بات، قلم بند کی جاتی ہے مگر اس صنف کا اسلوب طول طویل باتوں کا متحمل نہیں ہوتا۔ اس تحریر کا سانچہ مختصر ہوتا ہے جیسے قطعہ یا رباعی کی ارامی۔ یہاں باتوں کثرتِ صفات کی حاجت نہیں۔ طول بیانی اور تفصیلات سے مقالہ نگار کو احتراز لازمی ہے جو طویل مقالے مقالے نہیں ہوتے یہ بذاتِ خود سالم تصنیفات کی حیثیت رکھتے ہیں جنہیں پڑھنے سمجھنے اور ذہن نشین کرنے سے زیادہ وقت اور زیادہ محنت کی ضرورت پڑتی ہے۔ مقالہ اس کے برعکس، ادب کی وہ مختصر و لبستہ جامع تحریر ہے جو قارئین سے کم از کم وقت کی طالب ہوتی ہے اور اس کے دماغ کو عمدہ و اعلیٰ باتوں سے روشن کر دیتی ہے۔

(ک) نثری ادب میں جو صنف آج سب سے زیادہ معروف و مقبول ہے، وہ افسانہ کے بعد مقالہ ہے۔ اس مقبولیت کا سبب اس صنف کی ذہن پذیری اور جذب و اثر ہے۔ یہ وہ خمخانۂ ادب ہے جس کا دروازہ ہر بادہ نوش کے لئے ہمیشہ کھلا رہتا ہے اور جہاں بادۂ قدح خوار دیکھ کر بڑھایا جاتا ہے ـــ فی زمانہ مسائلِ حیات کے ہجوم اور نت نئی باتوں کی کثرت نے مقالہ کو نہایت کشادہ اور وسیع کر دیا۔ مقالہ نگاری وقت کا ایک اہم مطالبہ ہوگئی ہے جیسے یہ ہماری خواندگی کا ایک تقاضہ ہوگئی ہو۔ وقت کی برق روی سے آج صدیاں دہائیوں میں سمٹی جا رہی ہیں۔ گوناگوں بدلتے ہوئے حالات نے مجبور کر دیا ہے کہ ہم زمانہ کی روش و رفتار سے باخبر رہیں گرد و پیش کے معاملات و مسائلات کو جانیں اور سوچیں۔ ان اہم تبدیلیوں سے جو بابرکات ہیں استفادہ حاصل کریں۔ انہیں اپنی لیاقت اور انفرادی و اجتماعی زندگی کی ترقی کے لئے تجویز کریں ـــ اس عظیم مقصد کے لئے مقالے اور صرف مقالے ہی ہمارے کام آ سکتے ہیں۔ کائنات کے موجود و مشہود کا نقشہ ہو یا سیرت و سرشت کی تعمیر و تشکیل کا مسئلہ ہو ہر نقشہ اور ہر مسئلہ مقالہ کے شفاف شیشے سے صاف صاف دیکھا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ صنف ہر موضوع کے معمولات کا ایک جزو لاینفک بن گئی ہے۔ ہر طبقہ اور طبیعت کا انسان مقالہ کا مطالعہ ضرور کرتا ہے، خواہ یہ مقالہ سیرِ دنیا کی دعوت دے یا سفرِ آخرت کا پیغام سنائے ـــ!

موضوع کے بموجب مقالہ نگار کے لئے کوئی پابندی نہیں۔ وہ مکمل آزاد ہوتا ہے۔ ادبی تخلیقات و تحقیقات علمی مضامین، سائنسی ضابطے و مسائل، فنون اور اُن کی صورتیں غرض ہماری متمدن زندگی کا ہر باب کبیر و صغیر مقالہ نگار کے لئے وا رہتا ہے۔ وہ اگر ان باتوں کو سمجھتا ہے۔ اپنی سمجھی ہوئی بات کو دوسرے تک پہنچاتا ہے، اسے باتوں کی پہچان اور پرکھ کی تمیز ہے، تو وہ مقالہ نگار کے فرائض بحسن و خوبی انجام دے سکتا ہے۔

موضوعات کے اس تنوّع اور رنگا رنگی کی وجہ سے مقالے آج کئی مختلف ٹولیوں میں بٹ گئے ہیں۔ صفحاتِ گزشتہ میں مقالہ کی جن قسموں (یعنی معلوماتی، تاثراتی اور فکری) کا ذکر کیا گیا تھا یہ تقسیم قلم بند باتوں کی مخصوص نوعیت کے تحت کی گئی تھی۔ اس تقسیم سے دراصل علمیت کی اس خاصیت کا بیان مقصود تھا جو مزاجاً اور کچھ حد تک سیرۃً ان سنجیدہ تحریروں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیتی ہے ـــ بادی النظر میں ہر مقالہ اپنے موضوع اور عنوان کے تحت کسی ذیلی گروپ میں داخل رہتا ہے۔ مثلاً مذہبی مقالہ، سیاسی مقالہ، تاریخی مقالہ، تنقیدی مقالہ، تحقیقی مقالہ، سیرتی مقالہ، وغیرہ اور علیٰ ہٰذا القیاس مختلف سائنسی مضامین سے متعلق مقالے۔

مقالوں کی مقبولیت اور مقالہ نگاروں کے فروغ کے کئی اسباب ہیں۔ اولاً طباعت کی جدید سہولتیں ہیں۔ یعنی، ہر طرح کی نئی و غیر معمولی باتیں نہ صرف واضح اور مکمل طور پر ضبط تحریر میں آ جاتی ہیں۔ بلکہ مطبوعہ نقش و تصویر اور جدول و خاکہ کی مدد سے ان انجانی و ادق باتوں کو مقبول عام اور موثر بھی بنا دیا جاتا ہے۔ دوئم، نشر و اشاعت کی آسانیاں ہیں جن سے باتوں کو ترسیل و رسائی کی نئی قوت حاصل ہوگئی ہے۔ اب ہمیں عمدہ اور اعلیٰ مقالات نہ صرف پڑھنے کو بہ آسانی مل جاتے ہیں، بلکہ ان بلند و برتر باتوں کو بالمشافہ سننے کے مواقع بھی نصیب ہیں ـــ اس ضمن میں ٹیپ ریکارڈ کا ذکر ضروری ہے جس سے اس صنف ادب کو مستقبل قریب میں خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ اس جدید ایجاد کے ذریعہ متکلم کی باتوں اور خیالات کو محفوظ کر لینا مطلق دشوار نہیں ان لفظ بہ لفظ

بالآخر تقریر یا مستقل کہ کے مقالہ کی صورت دیدینا بھی سہل ہے، اور یوں ہر تقریر یا خطبہ بالآخر یہ مقالہ کا اسلوب حاصل کر سکتی ہے ـــــ مگر، یہ طریقہ کار اس صنف ادب کے زوال کا سبب بن جائے گا ہمیں یہ بھولنا چاہیے کہ مقالہ نگار مقرر یا خطیب یا صحافی نہیں ہوتا۔ یہ صحیح ہے کہ مقرر، خطیب یا صحافی کی طرح مقالہ نگار بھی کسی مخصوص موضوع پر اظہار خیال کرتا ہے اور عالمانہ انداز سے اس موضوع پر روشنی ڈالتا ہے، مگر ان دونوں کی شخصیتیں اور منصب علیحدہ ہیں اور ان کے اغراض و اسالیب بھی مختلف ہیں۔ مقالہ نگار کسی وقتی مطالبہ یا مسلک کے تحت اظہار خیال نہیں کرتا اور نہ وہ فی البدیہہ گہر افشانی کرتا ہے اس کا اسلوب تحریری ہوتا ہے تکلمی نہیں ہوتا۔

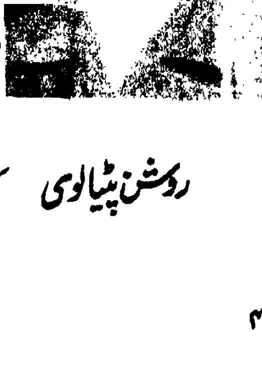
نئے علوم و مضامین کی دریافت سے بھی مقالہ کے عروج و مقبولیت میں بڑی مدد ملی ہے۔ ہماری زندگی اس قدر پھیل گئی ہے اور مادی ترقی نے زندگی کو اس قدر میکانکی بنا دیا ہے کہ انسان کا دماغ کل کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔ مجبوراً اب ہم جز کی جانب زیادہ مائل ہو گئے ہیں۔ ہماری خرد مندی، یہ ایک تلخ حقیقت ہے، اب محدود بین ہو گئی ہے اور لازماً ہم تخصیص کار کی طرف ضرورت سے زیادہ متوجہ ہوتے جا رہے ہیں۔ ادب میں بھی یہ روش جڑ پکڑ چکی ہے، صنفِ مقالہ میں تخصیصیت عام ہو گئی ہے۔ جنسیات، معاشیات، اور سائنس جیسے مخصوص رسائل کے اجرا سے مقالہ کو زیادہ توانائی نصیب ہو سکتی ہے۔ جو اس صنف ادب کے لئے بڑی اچھی علامت ہو گی۔

ان سازگار حالات کے باوجود ایسے مقالوں کی تعداد آج بھی حوصلہ شکن ہے جو ایوانِ ادب میں روزن کی مثال ہوں جنہیں کلید گنجینۂ علم کہا جا سکے اور جو ادبی دستاویز کا مرتبہ پا سکیں۔

بات یہ ہے کہ جس طرح پچھلی تین چار دہائیوں تک ہمارے شعراء "نظم" کے صنفی اور فنی تصور سے نابلد تھے اور طبعاً و خلقاً یہ غزل نگار تھے تقریباً یہی صورت ہمارے نئے اور جدید مقالہ نگاروں کی ہے۔ "مقالہ" اور "مضمون" کے امتیاز و افتخار کی بات ان کے لئے جیسے بے معنی بات ہے ـــــ اگلے شعراء جس طرح ہم معنی اشعار پر محض ایک سرخی دے کر اس شعری تخلیق کو نظم سمجھ لیتے ہیں۔ اسی طرح کسی سنجیدہ علمی و ادبی موضوع پر مختصر نثری قلم بندی عام طور پر "مقالہ" سے موسوم کر دی جاتی ہے ـــــ بد ترتیبی، انتشار خیال، طوالت، رمزیت، انشاء کی افراط و تفریط، ارتقائے خیال کا فقدان، غیر واضح زاویۂ نظر، نیم بحث و مجہول، مبہم، نارسا اور عامیانہ باتیں، لاحاصل حوالے اور مثالیں، شخصیت کی نمود و نمائش، بے جا مبالغہ آمیزیاں ـــــ آج کے مقالوں کی عام روپ ریکھا ہیں۔

# پنڈت نہرو

امن عالم کے عقیدے سے تھا نہرو جی کو پیار
امن کی خاطر انہوں نے زندگی کر دی نثار
انکے دم سے اہل بھارت کا ہوا رتبہ بلند
ذات اُن کی تھی یقیناً باعثِ صد افتخار
ملک کی عزت کا رہتا تھا انہیں ہر دم خیال
وہ فدائے ملک و ملّت تھے وطن کے جاں نثار
پیار کی خوشبو سے دُنیا کو معطر کر دیا
ان کی ہستی واقعی تھی اک شگفتہ لالہ زار
خوش بیاں، شیریں دہن، رنگیں نوا، جادو رقم
اُن کے اوصاف حمیدہ کا نہ تھا کوئی شمار
وہ کسی حالت میں بھی تفریق کے حامی نہ تھے
سب سے یکساں تھا سلوک اُن کا، محبت تھا شعار
رہنمائی جو خلوصِ دل سے دنیا کی کریں
ہستیاں ایسی نہیں آتیں جہاں میں بار بار
چپے چپے پر تھا رقصاں انکے دم سے رنگ و نور
فیض سے ان کے گلستان وطن تھا پُر بہار
ہر قدم اُن کا رہا دُنیا میں یکسر کامیاب
وہ تھے میدانِ سیاست کے پُرانے شہسوار
سب کے سب ملکی مسائل اُن کے تھے پیشِ نظر
جن کو حل کرنے کی خاطر رہتے تھے وہ بے قرار
زندگی سادہ تھی ان کی اور اونچا تھا خیال
وہ تھے ایثار مجسم اور سراپا انکسار
چالبازی اور ریاکاری سے وہ رہتے تھے دُور
انکی ہستی صدق کے انوار سے تھی جلوہ بار
پھول جو پژمردہ تھے وہ مسکرانے لگ گئے
باغِ قومی پر اُنہیں کے دم سے آیا تھا نکھار
کر دیا روشن انہوں نے پھر محبت کا چراغ
نور سے جس کے ہوئی ہے بزمِ ہستی جلوہ زار



روشن پٹیالوی

# دو ہاتھ پانچ کھیت

بالی چوپڑا

راجو کی ماں نے دو چار پونیاں کات لیں تو کنّو سے کہنے لگی۔ "بیٹا اگر دال پک گئی ہو تو اپنے بھیا کے لئے تھوڑا سا آٹا گوندھ لے۔ راجو مکئی کی روٹی بہت خوش ہو کر نہیں کھاتا۔ سویرے بھی اس نے مشکل سے آدھی روٹی کھائی تھی۔ بھوک نہیں بھوک نہیں جب بھی پوچھو یہی بات کہتا ہے۔ نجانے کس چیز کے سہارے جی رہا ہے یہ ——" کنّو دال کو دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔ "ماں مجھے تو کچھ بیمار دکھائی دیتا ہے زیادہ تر چپ چاپ ہی رہتا ہے۔ پہلے تو ایک پل کے لئے بھی چین سے نہیں بیٹھتا تھا۔ پر اب تو صبح سویرے ہی کھیتوں کو نکل جاتا ہے اور شام ڈھلے گھر لوٹتا ہے۔ مان چاہے نہ مان راجو رات کو بھی جاگتا رہتا ہے۔ نہ جانے کن خیالوں میں ڈوبا رہتا ہے اس کو کوئی نہ کوئی فکر ضرور ہے ——"

اور یہ سچ ہے کہ راجو کو ایک نہیں کئی فکر تھے اس کی بھوک ختم ہو گئی تھی اس کا دل بجھ چکا تھا اس کی نیند حرام ہو گئی تھی وہ زیادہ چپ ہی رہتا تھا اس کی آنکھوں کی چمک مدھم پڑ چکی تھی اس کے چہرے کی سرخی پھیکی پڑ چکی تھی وہ کسی گہری سوچ میں ہمیشہ ڈوبا رہتا تھا۔ اس کی آنکھوں کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے وہ ابھی ابھی رویا ہو

راجو کی مرجھائی صورت اور بگڑی ہی حالت نے گاؤں والوں کو غلط فہمی میں ڈال دیا تھا کہ شاید راجو کو کسی سے پیار ہو گیا ہے۔ اس کے دوست اس کو مذاق ہی مذاق میں مجنوں بھی کہنے لگے۔ مگر کوئی بھی راجو کی خاموشی کے بارے میں کچھ نہ جان سکا۔

راجو کو چنتا کسی ہیرے کے بچھڑنے کی نہیں بلکہ اپنی ماں کی صحت کی تھی۔ اس کے دل میں جو غم تھے کسی لڑکی کے جھوٹے وعدوں کے نہیں بلکہ اپنی جوان بہن کی شادی کے تھے۔ اس کی نیند حرام تھی کسی کے آنے کے خیال سے نہیں بلکہ شاہ کے قرض کی چبھن سے، وہ قرض جو اس کے باپ نے آج سے ۲۰ برس پہلے لیا۔ وہ قرض جس کو چکانے کے لئے راجو نے اپنی بہن کا بیاہ روک رکھا تھا، ماں کا علاج نہ کرا سکا تھا

اور اسی قرض نے راجو کی امنگوں کو جوان ہونے سے پہلے ہی مرجھا دیا تھا۔

راجو کے پانچ کھیت شاہ کے پاس گروی پڑے تھے۔ شاہ کو فکر تھی کھیت ہڑپ کرنے کی اور راجو کو چنتا تھی اپنی دھرتی کو شاہ کے کھاتے سے آزاد کرانے کی۔ دونوں ہی اپنی اپنی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ لوگ کہا کرتے۔ یہ تو شیطان اور انسان کا مقابلہ ہے دیکھیں جیت کس کی ہوتی ہے۔ کچھ دنوں بعد راجو نجانے کیا سوچ کر شاہ کی حویلی گیا۔ اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔ "شاہ جی میں آپ کے پاس ایک عرض لے کر آیا ہوں۔ اگر آپ مان جائیں تو میں آپ کا احسان جیون بھر نہ بھولوں گا۔" شاہ نے بے پروائی سے جواب دیا "بول کیا کہنا چاہتا ہے تو ——" راجو اور بھی نرمی سے بولا —— "شاہ جی میری بہن جوان ہے اور شادی کے لئے ایک لڑکا بھی اچھا سا مل گیا ہے مگر اس کے ہاتھ پیلے کرنے کے لئے میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔" شاہ نے بات کاٹتے ہوئے جواب دیا "تو کیا میرے پاس کوئی خزانہ رکھا ہے۔ میں تم لوگوں کی ہر روز کی ضرورت کہاں تک پورا کروں گا ——" راجو بولا "میں آپ سے ادھار مانگنے نہیں آیا بلکہ یہ کہنے آیا ہوں کہ اگر آپ ایک سال کے لئے مجھ سے قرض وصول نہ کریں تو میں اسی رقم سے لڑکی کے ہاتھ پیلے کر دوں گا۔ کیونکہ شادی ہو جائے تو پھر مجھے کوئی فکر نہیں ہم دونوں ماں بیٹے سوکھی روٹی کھا کر آپ کی رقم چکا دیں گے"
شاہ نے راجو کی بات سن کر گرگٹ کی طرح کئی رنگ بدلے اور کہنے لگا "کیوں بھئی کیا ہمارا مال چوری کا ہے۔ میں تو ایک سال کیا ایک مہینے کے لئے بھی نہیں رک سکتا"

راجو کے دل پر گہری چوٹ لگی اور وہ اپنے سپنوں کی ارتھی سمیٹ کر حویلی سے باہر نکل آیا —— اس دن سے راجو اور بھی چپ رہنے لگا۔ گاؤں والے اس کے چپ کو پیار کا نام دینے لگے اور اسے بیمار سمجھتے مگر کسی کو بھی اس کے اصلی روگ اور دل کے درد کا پتہ نہ چل سکا۔

راجو شام ڈھلے تک اپنے کھیتوں کی منڈیر پر بیٹھا رہتا اور کیاریوں کی طرف

دیکھتا رہتا مگر اس کے دل کو تسکین اور آنکھوں کو ٹھنڈک کبھی نصیب نہ ہوئی آخر ربیع کی فصل بونے کا وقت آگیا۔ راجو نے اپنے بیلوں کو ہاتھ کی تھاپ دے کر پکارا۔ بھگوان کا نام لے کر ہل چلانا شروع کر دیا بیلوں کے گھنگروؤں کی آواز میں راجو نے اپنے لوک گیتوں کی آواز کو شامل کر دیا۔ ہل چلتا گیا پسینہ بہتا گیا اور مٹی مکھن بنتی گئی۔ اس نے دیسی اور ولایتی کھاد ڈالا۔ بیج چھڑکا اور پلیٹا پھیر دیا۔

فصل نے جنم لیا تو راجو نے گوڑائی کر دی۔ اس کی فصل ناگ کی طرح اٹھی اور کسی الھڑ جوانی کی طرح جھومنے لگی۔ راجو نے اپنی فصل کو دیکھا تو اُسے یوں لگا جیسے اُس نے زندگی میں پہلی بار نشہ کیا ہو۔

راجو اپنی فصل کو جوں جوں پانی دیتا توں توں اُس کی فصل ہری بھری نکلتی آتی۔ اُس کی فصل نے سارے علاقے میں دھوم مچا دی۔ اب تو راجو خوش تھا۔ اُس کی آنکھوں کی چمک اور چہرے کی رونق لوٹ آئی تھی وہ سوچنے لگا اگر بھگوان نے سب ٹھیک کر دیا تو اس دفعہ شاہ کا اُدھار ضرور چکا دوں گا۔ کمو کے ہاتھ پیلے ہو جائیں گے اور ماں کا علاج کسی امرتسری حکیم سے کراؤں گا۔ وہ مستی میں آکر گنگنانے لگا۔

جو علاقہ تھا کبھی ساگر بڑا ایک ریت کا

آج نقشہ بن گیا ہے لہلہاتے کھیت کا

راجو دیر تک مینڈھ پر بیٹھا اپنے کھیتوں کی ہریالی کو کسی مندر کے پجاری کی طرح دیکھتا رہتا۔ لمبی لمبی گیہوں کی فصل اُس کو کبھی کبھی بالکل اُس حسینہ کی طرح لگتی جو اپنے گیلے بالوں کو سکھانے کے لئے کھیتوں میں آگئی ہو۔

ایک دن راجو اپنے بیلوں کے ساتھ بیٹھا دکھ سکھ کی باتیں کر رہا تھا کہ چودھری جی زراعت آفیسر کو لے کر اُس کے کھیتوں میں آگئے۔ چودھری جی کہنے لگے "راجو تمہاری فصل کی تعریف سن کر اپنے زراعت انسپکڑ صاحب بھی آگئے ہیں۔ راجو ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "چودھری جی سب بھگوان کی کرپا ہے۔ ورنہ میں اکیلا کیا کر سکتا ہوں"

زراعت انسپکڑ ہنسنے لگا اور راجو کی پیٹھ تھپتھپاتا ہوا بولا "راجو ہم تمہاری فصل کے ایک نپے تلے حصے میں سے گیہوں کی بالیاں توڑ کر لے جانا چاہتے ہیں۔ ذرا دیکھیں تو فی ایکڑ کیا پیداوار ہوتی ہے تمہاری فصل کی" راجو بولا — "آپ مالک ہیں چاہے ساری بالیاں ہی توڑ کر لے جائیں —— اور زراعت والے اپنے حساب سے بالیاں توڑ کر لے گئے۔ راجو لوک گیت گاتا اور بیلوں کو متا متا کرتا ہوا گھر لوٹ آیا ——

کچھ دنوں بعد بیساکھی آئی۔ ڈھول بجا کسانوں نے لوک گیت کے ساتھ بھنگڑا کیا اور فصل کی کٹائی شروع ہوئی۔ راجو نے بھی کٹائی کر کے اپنا کھلیان بنا دیا۔ گھر لوٹتے ہوئے راستہ میں اُس نے اپنے خیالوں کی دُنیا میں شاہ کا اُدھار چکا دیا کمو کا بیاہ کیا اور ماں کا علاج بھی کسی اچھے حکیم سے کرا لیا۔ اُس نے خیالوں میں ہی اپنے بیلوں کے نئے گھنگرو خریدے اپنے نئے کپڑے بنوائے اور رامو حلوائی کی دکان سے گرم گرم جلیبیاں کھائیں۔ اُس کو لگا جیسے وہ سنسار میں سب سے زیادہ سکھی ہو۔

گھر پہونچا تو ماں اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ کمو نے راجو کو خوش دیکھا تو کہنے لگی۔ "بھیا فصل بیچ کر مجھے سونے کے بُندے لے کر دُنیا نہیں تو میں رُوٹھ جاؤں گی" راجو کو اپنی بہن کی باتیں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ وہ کمو کی چٹیا کھینچ کر کہنے لگا۔ "کمو اس بار تمہارے لیے سب کچھ آئے گا۔ کپڑے، گہنے اور ایک چھیل چھبیلا دولہا بھی۔

کمو کچھ نہ بولی اور بھیا کے لئے تھالی پروس کر لے آئی۔ راجو ہاتھ منہ دھو کر بیٹھ گیا۔ ابھی اُس نے روٹی کا نوالہ منہ میں ڈالا ہی تھا کہ کچھ گاؤں والے بھاگے بھاگے آئے اور کہنے لگے۔ راجو تمہارے کھلیان کو کسی نے آگ لگا دی ہے یہ سنتے ہی راجو کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا آگیا۔ اُس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ دماغ نے چکر کھایا اور وہ بیہوش ہو کر گر گیا۔ بہت دیر بعد جب اس کو ہوش آیا تو وہ بھاگا بھاگا اپنے کھیتوں کو گیا مگر وہاں راکھ کے سوا اب بچا ہی کیا تھا۔ راجو کی اُمنگیں ایک بار پھر کھلنے سے پہلے ہی مرجھا گئی تھیں۔

سارا گاؤں راجو کے دُکھ میں شامل تھا اکیلا راجو نہیں رو رہا تھا شیطان نے انسان کی کمر توڑ دی تھی۔ مگر بڑ کے درخت کے نیچے بیٹھا سادھو برابر یہی کہہ رہا تھا کہ جیت انسان کی ہوگی۔ کمو کا پھول جیسا چہرہ رو رو کے مرجھا گیا تھا اور ماں مر مر کے جی رہی تھی۔

راجو اپنے مکان کی چھت پر بیٹھا تھا۔ کہ چودھری بھاگا بھاگا آیا اور کہنے لگا۔ راجو بدھائی ہو۔ چودھری کی بدھائی سن کر راجو تڑپ اٹھا اور تلملا کر کہنے لگا۔ کیوں چودھری جی کیا کچھ کسر باقی رہ گئی تھی جو جلے پر نمک چھڑکنے آئے ہو۔ چودھری ہنس پڑا اور کہنے لگا تم جو چاہو کہہ سکتے ہو کیونکہ جتنے دکھ تمہیں اٹھانے پڑے ہیں کسی اور کو نہیں مگر اب تمہارے دُکھ ہمیشہ کے لئے کٹ جائیں گے۔ راجو تمہارے کھیتوں کی فی ایکڑ پیداوار دیش بھر میں سب سے زیادہ ہوئی ہے اس لئے سرکار نے تمہیں پانچ ہزار روپیہ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ جلدی کرو محکمہ زراعت والے تمہیں دہلی پہنچانا چاہتے ہیں۔

راجو کے چہرے پر کھیتوں کی ہریالی پھر چھا گئی۔ اُس کا دل بلیوں اچھلنے لگا وہ خوشی سے جھومتے ہوئے بولا — چودھری جی لگتا ہے بھگوان کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں اور دونوں ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔

# ای ـــ مار

# ـــ ہ ں ؟

رنگ برنگے ڈبوں میں بند گھی میں ملاوٹ
ہوسکتی ہے۔

باسمتی چاولوں کی بوری میں
بہت سی مٹی اور دیگر ایسی ہی فالتو
چیزیں ہوسکتی ہیں۔

اچھے نظر آرہے انڈے اندر سے گندے
نکل سکتے ہیں۔

بہترین مال خریدنے کے لئے

## ایگ مارک کی مہر ضرور دیکھئے

تمام ایگ مارک مصنوعات کی لیبل
پر چھپے نمبروں کے مطابق درجہ
بندی کی جاتی ہے۔
بڑھیا اور خالص اشیاء کیلئے
**ایگ مارک**
مصنوعات ہی خریدیئے۔

A
G
AGMARK
A
R
K

**ایگ مارک**
چیز کے بڑھیا ہونے کا
ثبوت ہے
پوری جانچ پڑتال کے بعد
یہ گارنٹی دی جاتی ہے

# چھٹی حس

سیوک شرما

غیب میں جھانکنے کی خواہش انسان میں ازل سے رہی ہے اور اس تمنا کی تکمیل کے لیے انسان نے کئی قسم کے پاپڑ بیلے ہیں جبکہ اس کے حصول کا بہترین ذریعہ چھٹی حس کے روپ میں خود انسان کے اندر موجود ہے۔

چھٹی حس، حواسِ خمسہ سے بالاتر، انسان کی وہ مخفی صلاحیت ہے جو غیب کے اسرار ظاہر کرتی ہے۔ کچھ ہی برس پہلے چھٹی حس کے بارے میں کچھ کہنا سننا اپنے آپ پر حماقت اور توہم پرستی کا لیبل لگوانے کے مترادف تھا، مگر اب تو سائنسی طور پر نہایت ترقی یافتہ ممالک میں سرکاری سطح پر اس سلسلے میں تحقیق اور تجربات کے پروگرام جاری ہیں۔ امریکہ میں ڈیوک یونیورسٹی کے ڈاکٹر جے۔ بی۔ رائن DR. J. B. Rhine اور دوسرے ماہرینِ نفسیات نے چھٹی حس سے متعلق ٹھوس اور گراں قدر تحقیق کی ہے اور روسی سائنس دانوں نے روز کلیشوا نامی روسی خاتون پر، جس میں آنکھوں کے علاوہ ہاتھ کی انگلیوں سے بھی دیکھنے کی صلاحیت ہے، آزمائشی تجربات سے سائنسی تحقیق کی دنیا میں نئے باب کا آغاز کیا ہے۔

دنیا کے بارے میں ہماری واقفیت کا دارومدار ہمارے حواسِ خمسہ یعنی دیکھنے، سننے، سونگھنے، چھونے اور چکھنے کی حسوں پر ہے۔ زمانہ حال میں ہمارے آس پاس جو کچھ موجود یا ظاہر ہے اس کا علم ہمیں حواسِ خمسہ کے ذریعہ ہوتا ہے لیکن جو ظاہر نہیں ہے یا جو ابھی مستقبل کے شکم میں ہے وہ ہمارے حواسِ خمسہ کی پہنچ سے باہر ہے۔ لہٰذا اس سے متعلق ہم بالکل بے بہرہ ہیں۔ جو کچھ ہمارے حواسِ خمسہ کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا اس کے وجود یا حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے ہم تیار نہیں ہوتے۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ حقیقت ہمارے علم ہی کی حد تک محدود رہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جو کچھ ہمیں معلوم نہیں وہ اس کی نسبت کہیں زیادہ ہے جس کا ہمیں علم ہے۔ نیوٹن کی طرح دنیا کے بڑے سے بڑے مفکروں سائنس دانوں کو زندگی بھر کے مطالعہ اور تحقیق کے بعد یہی کہنا پڑا کہ وہ علم کے بے پایاں سمندر کے کنارے صرف کنکر ہی چن سکے ہیں۔

جہاں پر ہماری پانچوں حسیں بے بس ہو کر رہ جاتی ہیں، وہاں سے چھٹی حس کی فرماں روائی شروع ہوتی ہے۔ یہ ہماری چھٹی حس ہے جو غیب یعنی نامعلوم دنیا کے اسرار سے ہمارے لئے پردہ ہٹاتی ہے اور مستقبل میں پیش آنے والے واقعات سے ہمیں آگاہ کرتی ہے۔ مثال کے طور پر مشہور جرمن جرنیل رومیل کی زندگی کا یہ واقعہ ہی لیجئے۔

دوسری جنگِ عظیم میں جنرل رومیل ایک بار لیبیا کے صحرا میں اپنے ایک ماتحت افسر کے ساتھ جنگی صورتِ حال کا جائزہ لے رہے تھے۔

کہ اچانک جنرل روڈمیل نے اپنے ساتھی کو بازو سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔ "بھاگو یہاں خطرہ ہے" تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ انہیں اپنے پیچھے ایک دھماکہ سنائی دیا۔ پیچھے مڑ کر انہوں نے دیکھا کہ ایک بم عین اس جگہ پر گرا تھا جہاں چند لمحے قبل وہ دونوں کھڑے تھے۔ اگر وہ وہاں سے نہ ہٹے ہوتے تو دونوں کے پرخچے اڑ گئے ہوتے۔ محض اتفاق؟ ممکن ہے ایسا ہی ہو لیکن انگریز بریگیڈیر ڈیسمنڈ ینگ نے جنرل رومیل کی سوانح حیات میں لکھا ہے کہ جنرل موصوف کی زندگی میں ایسا اتفاق بارہا ہوا کہ انہیں ناگہانی آفت کا عین وقت سے پہلے علم ہو گیا اور وہ موت کا شکار ہونے سے بال بال بچ گئے۔ اس میں ان کی عقل یا ہوشیاری کا دخل نہیں تھا بلکہ یہ کرامات جنرل رومیل کی غیر معمولی طور پر تیز چھٹی حس کی تھی۔

چھٹی حس کیا ہے اس کی صحیح تعریف یا تشریح مشکل ہے اس کا تعلق نہ تو دل سے ہے اور نہ دماغ سے۔ نہ تو اس کا دلیل یا منطق سے کوئی واسطہ ہے اور نہ ہی جذبات سے کوئی سروکار۔ اس لئے اسے کوئی مخصوص تکنیکی نام دینے کی بجائے سمجھنے کی غرض سے اگر ہم اسے اندر کی آواز کہیں تو زیادہ آسان اور بہتر ہوگا۔ اور عام بول چال میں اسے دل کی آواز کے نام سے ہی پکارا جاتا ہے۔ آپ چاہے اسے تحت الشعور کے ساتھ منسلک کر دیں یا روح اور ضمیر کے ساتھ اس کا رشتہ جوڑ دیں، بہرحال یہ اپنے اندر کی آواز ہے جو بڑی غیر مبہم اور واضح ہوتی ہے۔

اس اندر کی آواز یا چھٹی حس کی بنیاد توہمات یا اٹکل پچو قیاس آرائیوں پر نہیں بلکہ ٹھوس اور مسلمہ سائنسی حقائق پر ہے۔ سائنس یہ مانتی ہے کہ ہماری دنیا لہروں کا ایک مجموعہ ہے۔ مسلسل اور متواتر حرکت کرنے والے ذرات پر مشتمل اس دنیا کی ہر جاندار اور غیر جاندار شے سے ہر وقت لہریں یا شعاعیں ابھرتی رہتی ہیں۔ ان میں سے کچھ، بلکہ بہت سی، لہریں اس قدر لطیف ہوتی ہیں جنہیں دیکھنے، سننے یا چھو کر محسوس کرنے کی اہلیت انسانی آنکھ، کان یا کھال میں نہیں ہے۔ مثلاً مقناطیس کی جو شعاعیں لوہے کو اپنی طرف کھینچتی ہیں، وہ انسانی آنکھ کو دکھائی نہیں دیتیں لیکن مقناطیسی شعاعوں کی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اینسی فالوگرافک میٹر Encephalographic meter آلے کے ذریعے دماغ میں ابھرنے والی خیالات کی لہروں کو ریکارڈ کیا جا چکا ہے۔ اب تو ڈاکٹر کلنر Dr. Kilner نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جس طرح آگ سے گرمی کی شعاعیں نکلتی ہیں اسی طرح ہمارے جسم کے ہر عضو سے ہر وقت لہریں نکلتی رہتی ہیں۔

فضا میں ان گنت لطیف لہریں تیرتی رہتی ہیں۔ ان میں ہماری اپنی دنیا کی ہر شے سے ہر لمحہ نکلنے والی لہریں بھی شامل ہیں۔ گوناگوں قسم کی ان لہروں کے ملاپ یا ٹکراؤ سے فضا میں تغیر و تبدل کے ساتھ ساتھ ہماری دنیا میں بھی ہر لمحہ تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اگرچہ ہمارے حواس خمسہ ان لہروں کا علم حاصل کرنے سے قاصر مگر جس طرح روشنی اور آواز کی لہروں کی پہچان کے لئے ہمارے جسم میں آنکھ کان جیسے اعضا ہیں اسی طرح قدرت نے لطیف تر لہروں اور ان کے اثرات محسوس کرنے کا بندوبست بھی انسانی جسم میں کر رکھا ہے۔ یہ کام ہماری چھٹی حس انجام دیتی ہے۔

ماہرین کے خیال میں انسانی جسم میں چھٹی حس کا اہم ٹھکانہ ریڑھ کی ہڈی کے دونوں طرف بچھے ہوئے اعصابی ریشے ہیں۔ عصبی ریشوں کا یہ سلسلہ جسے Sympathetic nervous system کہتے ہیں ماحول میں منتشر ہوئی مختلف قسم کی لطیف لہروں اور شعاعوں کا علم ہمارے دماغ تک پہنچاتا ہے۔ اور ہمارا دماغ ایک ایسا ریڈیو ہے جو پیغامات نشر بھی کرتا ہے اور موصول بھی۔

چھٹی حس کا ظہور مختلف صورتوں میں ہوتا ہے۔ مثلاً عام طور سے دکھائی دینے والی اشیا، جیسے روحوں وغیرہ کا دیکھنا، غیبی آوازیں سننا، دوسروں کے خیالات جاننا اور اپنے خیالات دوسروں تک پہنچانا۔ خواب کے ذریعے مستقبل یا مخفی موجودات کا علم اور اچانک احساس یا خواہ مخواہ آنے والے خیال کے ذریعے غیب کا علم ہونا۔

پہلی نظر میں شاید یہ باتیں شعبدہ بازی یا کالے علم کا تذکرہ معلوم ہوں لیکن ذرا غور کرنے پر یہ واضح ہو جائے گا کہ ہم ایک حقیقی انسانی قوت کا ذکر کر رہے ہیں جو عجیب و غریب اور ناقابل یقین اس لئے لگ رہی ہوگی کیونکہ انسان نے اپنی اس حیرت انگیز صلاحیت کی طرف بہت کم توجہ دی ہے۔

غیبی اشیا دیکھنے یا آوازیں سننے اور دوسروں کے خیالات جاننے یا اپنے خیالات دوسروں تک منتقل کرنے کی اہلیت قدرت کے خاص عطیے کے طور پر خال خال اشخاص ہی میں پائی جاتی ہے لیکن ایسے اشخاص کی تعداد خاصی ہے جنہیں ان کے ساتھ پیش آنے والے اہم واقعات کی پیش آگاہی خواب میں ہو جاتی ہے اور خواہ مخواہ کے خیال یا اچانک احساس کے ذریعے غیبی خیالات کا علم ہونے کی کم و بیش صلاحیت تو قدرت نے ہر انسان کو دے رکھی ہے۔ زیر نظر مضمون کا تعلق خاص طور پر موخر الذکر حالتوں سے ہے۔

لارڈ ڈفرن کا وہ خواب کافی مشہور ہو چکا ہے جس کی وجہ سے وہ موت کے منہ میں جانے سے بچ گئے تھے۔ ہندوستان کا وائسرائے بننے سے پہلے لارڈ ڈفرن فرانس میں انگلستان کے سفیر تھے۔ فرانس میں سفیر کا عہدہ سنبھالنے سے پیشتر وہ آئیرلینڈ میں اپنے ایک دوست کے پاس چند روز قیام کرنے کے لئے گئے۔ دوست

[illegible] پہلی ہی رات انہوں نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص لڑکھڑاتا ہوا اُن کے کمرے میں داخل ہو رہا ہے۔ اس نے اپنی پیٹھ پر ایک بکس اٹھا رکھا تھا جس میں ایک لاش تھی۔ بوجھ کی وجہ سے وہ شخص دوہرا ہو کر چل رہا تھا۔ جب وہ کمرہ پار کر کے باہر نکلنے لگا تو لارڈ ڈفرن نے ہمت کر کے اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلا کر پوچھا "تم کون ہو اور کیا لے جا رہے ہو"؟ اس پر اس شخص نے مڑ کر دیکھا تو لارڈ ڈفرن خوف کے مارے دم بخود ہو کر رہ گئے کیونکہ انہوں نے ایسا بھیانک چہرہ اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

کئی برس بعد ایک دن لارڈ ڈفرن پیرس کے گرانڈ ہوٹل میں ایک تقریب میں شرکت کے لئے گئے۔ گیٹ پر خیر مقدم کرنے کے بعد ان کا میزبان انہیں لفٹ کی طرف لے کر چلا۔ لارڈ ڈفرن لفٹ کے اندر داخل ہونے ہی کو تھے کہ ان کی نظر لفٹ چلانے والے ملازم کے چہرے پر پڑی۔ ایک لمحے کے لئے وہ کھڑے کے کھڑے ہی رہ گئے۔ یہ اسی کفن بردار کا خوفناک چہرہ تھا جسے انہوں نے خواب میں دیکھا تھا۔ انہوں نے اپنے سیکریٹری کو، جو لفٹ میں قدم رکھنے والا تھا، ایک طرف کھینچ لیا۔ لفٹ سواریوں سے بھر گئی اور بالائی منزلوں کے لئے روانہ ہو گئی۔ لارڈ ڈفرن تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے منیجر کے کمرے کی طرف چل دیئے۔ حیرانی کے عالم میں ان کا میزبان بھی ان کے پیچھے ہو لیا۔ لارڈ ڈفرن نے منیجر سے پوچھا کہ اُس لفٹ کو چلانے والا شخص کون تھا۔ اس سے پیشتر کہ منیجر کوئی جواب دیتا ہوٹل کی عمارت ایک خوفناک دھماکے سے لرز اٹھی۔ لفٹ کا رسّہ ٹوٹ جانے کی وجہ سے لفٹ کا خول دھڑام سے نیچے فرش پر گر گیا تھا۔ لفٹ میں سوار مسافروں میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچ سکا۔

دوسری صبح اس سانحہ کی خبر فرانس اور انگلستان کے اخباروں کی نمایاں سرخی تھی۔ کچھ اخباروں نے اس حادثے کو ایک سیاسی سازش قرار دیا جس کا مقصد لارڈ ڈفرن کو قتل کرنا تھا لیکن کسی کو بھی یہ پتہ نہیں چل سکا کہ لفٹ چلانے والا شخص کون تھا۔؟

بعض اوقات چھٹی حس مہلک حادثوں سے خبردار کرنے کی بجائے ایسے واقعات کی محض اطلاع ہی دیتی ہے۔ امریکہ کے صدر ابراہیم لنکن کا خواب اسی نوعیت کا تھا۔ صدر لنکن کو قتل ہونے سے کچھ دن پہلے اپنی آخری گھڑی کی خبر مل گئی تھی۔ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ وہ وائٹ ہاؤس کے کمروں میں گھوم رہے ہیں۔ تمام عمارت خالی پڑی ہے لیکن ہر ایک کمرے سے سسکیوں کی آوازیں آ رہی ہیں۔ ایک کمرے میں انہیں کفن میں لپٹی ہوئی ایک لاش دکھائی دی جس کے گرد فوجی پہرے دار چپ چاپ کھڑے تھے لیکن پہرہ داروں کے قریب کھڑے دوسرے کچھ لوگ رو رہے تھے۔ صدر لنکن نے پوچھا "وائٹ ہاؤس میں کس کا انتقال ہو گیا ہے"؟ جواب ملا صاحب صدر کا۔ انہیں قتل کر دیا گیا تھا۔"

صبح ہونے پر ابراہیم لنکن نے اپنی اہلیہ اور اپنے قریبی دوست وارڈ ہیمن کو یہ خواب سنایا اور کہا کہ اگرچہ یہ محض ایک خواب ہی تھا لیکن اس وقت سے یہ دہشت آمیز خیال ان کا پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا کہ ان کا وقت اب آ گیا ہے۔

نہ صرف اپنے آپ کے بارے میں بلکہ اپنے عزیزوں، دوستوں یا محض واقف کاروں اور پڑوسیوں تک کے بارے میں اس قسم کے الہامی خواب لوگوں کو اکثر آتے رہتے ہیں۔ کچھ کو تو ان کی روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات خواب میں پہلے سے ہی دکھائی دے جاتے ہیں اور کبھی کبھی تو معمولی واقعات بھی جوں کے توں نظر آ جاتے ہیں۔

چھٹی حس کا کام موت اور مہلک حادثوں جیسے ہولناک واقعات کی اطلاع دینا ہی نہیں ہے بلکہ یہ تو روزمرہ کی زندگی میں ہماری پاسبانی کے فرائض انجام دیتی ہے اور اپنی خاموش لیکن صاف طور پر سمجھ آنے والی آوازمیں قدم قدم پر ہماری رہنمائی کے لئے ہمیں قیمتی مشورے دیتی ہے۔ ان مشوروں کو نظرانداز کر کے اگر کوئی کف افسوس ملنا چاہتا ہو تو یہ اور بات ہے۔ یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اپنی چھٹی حس کے اشاروں پر عمل کر کے ہم بہت سی پریشانیوں سے بچ سکتے ہیں۔ ایک عام فہم مثال کے مطابق اگر ہم پانی کے بہاؤ کے ساتھ تیرتے ہیں تو تھوڑی محنت سے ہم کافی فاصلہ تیر کر طے کر سکتے ہیں۔ جبکہ پانی کے بہاؤ کے خلاف تیرنے سے کافی محنت کرنے پر بھی ہم ایک تو مقابلتاً کم فاصلہ طے کر پائیں گے اور دوسرے تھک بھی جائیں گے۔ عین اسی طرح چھٹی حس کے اشاروں کے مطابق چلنے سے راحت اور کامیابی اور خلاف چلنے سے تکلیف اور ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

روزانہ زندگی سے متعلق نیچے دی گئی مثال پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ کس طرح اچانک خیال یا خواہ مخواہ کا احساس ہماری رہنمائی کے لئے مستقبل کی پیش آگاہی کرتا ہے۔

آپ ایک کمرے میں داخل ہوتے ہیں جہاں پر موجود کچھ اشخاص کے ساتھ آپ کا تعارف پہلی بار کرایا جاتا ہے۔ ان میں دو ایک افراد آپ کو کچھ اچھے لگتے ہیں اگرچہ بظاہر شکل و صورت اور ادا و اطوار کے لحاظ سے ان میں دلا ویزی یا دلکشی کا کوئی پہلو دکھائی نہیں دیتا پھر بھی وہ آپ کو اچھے لگ رہے ہیں۔ ان میں آپ کو کچھ اپنا پن سا محسوس ہوتا ہے۔ اور آپ ان سے مل کر واقعی خوش ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس وہاں پر موجود ایک دو اشخاص آپ کو پسند نہیں آتے۔ کیوں؟ یہ آپ نہیں جانتے۔ لیکن یہ لوگ آپ کو اچھے نہیں لگے۔ ان سے ملتے وقت "آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی"

کا رسمی تعارف آپ سے ہوتا ہے تو آپ کا ردعمل ویسا ہی ہوتا ہے ورنہ خوشی کی بجائے ان اشخاص کی موجودگی سے آپ کچھ بیزاری سی محسوس کرتے ہیں۔

پہلی ملاقات پر مختلف اشخاص کی طرف متضاد ردعمل کی وجہ شعوری طور پر آپ نہیں جان سکتے۔ (تجربے اور مشاہدے کی بنا پر شعوری فیصلہ تو بعد کی بات ہے) لیکن آپ کی چھٹی حس کو یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ آئندہ زندگی میں اول الذکر افراد آپ کے دوست یا معاون ثابت ہوں گے۔ اور موخرالذکر مخالف یا دشمن۔ لہٰذا آپ کی چھٹی حس نے مختلف نوعیت کے احساسات کے ذریعے آپ کو یہ جتانے کی کوشش کی کہ مستقبل میں آپ کو ان اشخاص سے کس کس قسم کے رد عمل کی توقع رکھنی چاہیئے۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ احساسات بالکل صحیح ثابت ہوتے ہیں۔

روزانہ زندگی میں چھٹی حس کی کارفرمائی کی ایسی بیسیوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ آپ یقین جانئے کہ آپ کی چھٹی حس کو اتنا کچھ معلوم ہے کہ آپ گمان بھی نہیں کر سکتے۔

چھٹی حس کی تھوڑی بہت صلاحیت تو تقریباً ہر شخص کو میسر ہے لیکن کبھی کبھی قدرت ایسے نادر شاہکار پیدا کرتی ہے کہ عقل دنگ رہ جائے۔ مثال کے طور پر امریکہ کے ایڈگر کیس EDCAR CAYCE ہی کو لیجئے۔ کیس ایک نیم خواندہ شخص تھا جسے علم طب سے کسی طرح کا دور کا بھی واسطہ نہیں تھا لیکن قدرت نے اسے ایسی خوبی عطا کر رکھی تھی کہ کسی بھی قسم کے مرض میں مبتلا کسی شخص کا نام اور پتہ سن کر وہ اس کی بیماری کی صحیح تشخیص کرنے کے علاوہ اس مرض کو دور کرنے کی بے خطا دوا بھی بتا دیتا۔ ناک کے بالوں سے لے کر پاؤں کے ناخنوں تک کے امراض کے ماہرین کے اس دور میں لاعلاج قرار دیئے گئے دنیا بھر سے ہزاروں مایوس مریض ایڈگر کیس کی اس خدا داد نعمت سے فیضیاب ہوئے۔ ۱۹۴۵ء میں ایڈگر کیس کی وفات سے گویا دنیا سے لاعلاج اور مایوس مریضوں کا ایک مسیحا اٹھ گیا۔

روسی خاتون روزا کلیشوا Roza Kuleshova بھی اپنی مثال آپ ہی ہے۔ روزا روس میں کوہسار یورال کے علاقے میں نیزہی کے مشہور صنعتی شہر کی باشندہ ہے۔ وہ اس وقت تیس برس کی ہے۔ انسان کیا ہر جاندار میں دیکھنے کا کام آنکھ ہی کرتی ہے۔ لیکن روزا کلیشوا کے ہاتھوں کی انگلیوں میں بھی قوت بینائی موجود ہے۔ اپنے ہاتھ کی انگلیوں سے وہ اسی طرح دیکھ سکتی ہے جس طرح عام انسان اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ یہ بچوں کا دل بہلانے والی پریوں کی کسی کہانی کا قصہ نہیں بلکہ ایک مسلمہ حقیقت ہے جسے روس کے ڈی۔ ڈی۔ فیڈوٹو D.D.FODOTOV اور پی۔ کے۔ انوخن P.K.ANOKHIN اور امریکہ کے ڈاکٹر گریگوری رازران Gregory Razran جیسے ممتاز ترین سائنس دانوں نے ۱۹۶۳ء کے دوران روزا پر سینکڑوں تجربات کے بعد تسلیم کیا ہے۔

۱۹۶۳ء میں امریکہ کے مشہور رسالے لائف انٹرنیشنل کے نامہ نگار باب برگھم Bob Brigham نے روزا سے انٹرویو لیا۔ باب برگھم کی موجودگی میں روزا نے نہ صرف ہاتھ کی انگلیوں بلکہ اپنی کہنی سے اخبار پڑھ کر سنایا۔

ہالینڈ کے پیٹر ہرکوس Peter hurkos کا ذکر کئے بغیر عجائب روزگار کا تذکرہ ادھورا رہ جائے گا۔ ایک حادثے میں دماغی چوٹ کے باعث ان حضرت کی کوئی ایسی رگ بیدار ہو گئی کہ یہ ولی بن گئے۔ کسی شخص کو دیکھ کر اس کا ماضی اور مستقبل انہیں نظر آنے لگا۔ اس وقت کئی ممالک کی پولیس قاتلوں کا سراغ لگانے کے لئے ہرکوس کی امداد طلب کرتی ہے۔ مقتول کی فوٹو دیکھ کر یہ قاتل کا پورا حلیہ بتا دیتے ہیں اور بعض اوقات نام بھی۔ اور تو اور پیٹر ہرکوس کی آنکھ زمین کی تہ کے نیچے بھی دیکھ سکتی ہے۔ شاید یہ الف لیلیٰ کی کہانی معلوم ہو لیکن یہ بالکل سچ ہے کہ ان دنوں پیٹر ہرکوس صاحب سونے کی ایک بہت بڑی کان سے ملنے والی رائلٹی پر شان سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہرکوس نے سونا تلاش کرنے والی ایک کمپنی کو اس کان کا پتہ بتایا تھا۔

قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ سب کچھ چھٹی حس ہی کی بدولت ہے تو پھر ایسے کرشمے ہم سب میں کیوں رونما نہیں ہوتے۔ اس کی دو وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ جیسے مختلف انسانوں کی جسمانی اور دماغی صلاحیتوں میں فرق ہے اسی طرح چھٹی حس بھی ہر شخص میں یکساں نہیں پائی جاتی۔ بعض اشخاص میں چھٹی حس غیر معمولی طور پر تیز اور بعض میں نسبتاً کم ہوتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر آپ اپنے ایک بازو کو ایک برس کے لئے پلاسٹر آف پیرس میں باندھ دیں اور ہلانا جلانا بالکل بند کر دیں تو ایک برس کے بعد آپ کے چاہنے کے باوجود آپ کا یہ بازو حرکت نہیں کر سکے گا۔ بے کار رہنے سے یہ بازو سوکھ کر مفلوج ہو چکا ہوگا۔ یہی حال چھٹی حس کا ہے جسے بچپن سے ہم نے استعمال کرنے کے بارے میں سوچا ہی نہیں بلکہ اس کے اشاروں کو محض اتفاق یا وہم سمجھ کر ٹالتے رہے ہیں۔

مشاہدے سے ثابت ہوا ہے کہ کسی بھی برس میں اٹھارہ فروری سے لے کر بیس مارچ، بائیس اکتوبر سے اٹھائیس نومبر، اور بائیس جون سے چھبیس جولائی کے درمیان پیدا ہونے والے افراد میں چھٹی حس مقابلتاً تیز ہوتی ہے۔

اسی طرح سات کے ہندسے کو بھی چھٹی حس سے خاص تعلق دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً کسی بھی سال کے کسی بھی مہینے میں سات، سولہ اور پچیس (سولہ اور پچیس کے ہندسے جمع کرنے سے سات کا ہندسہ بنتا ہے) تاریخ کو پیدا ہونے والے اشخاص کی چھٹی حس نمایاں طور پر تیز ہوتی ہے

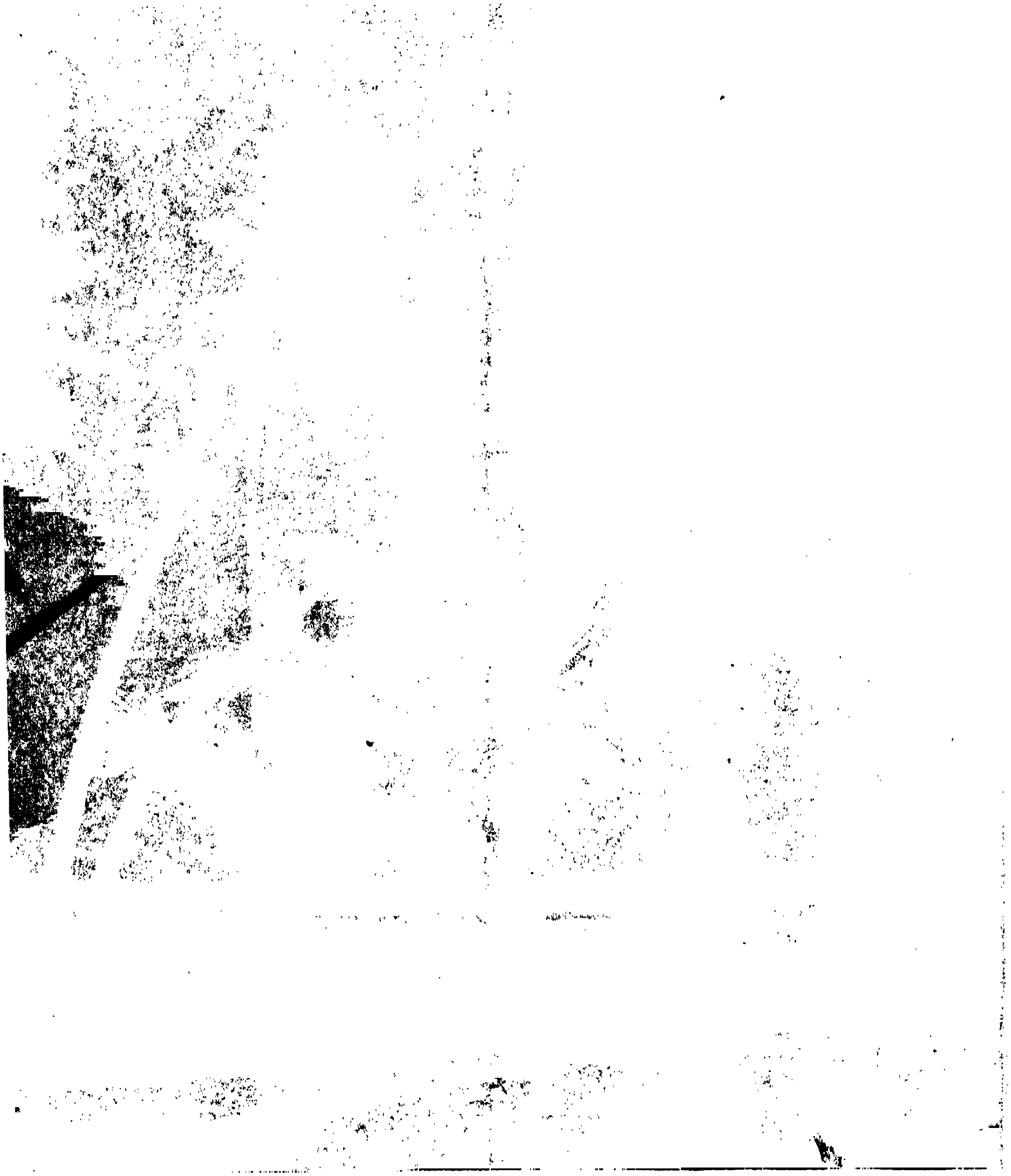


شریمتی اندرا گاندھی نے ۱۸ مارچ کو وزیر اعظم ہند
کے عہدے کا حلف لیا۔ صدر جمہوریہ آپ کو حلف
دلا رہے ہیں۔



صدر جمہوریہ ہند شری وی وی گری پارلیامنٹ کے
مشترکہ اجلاس (منعقدہ ۲۳ مارچ) سے خطاب
کرنے کے لئے تشریف لے جا رہے ہیں۔ آپ کے
آگے (بائیں طرف) نائب صدر ہند شری گوپال
سروپ پاٹھک اور (دائیں طرف) لوک سبھا کے
اسپیکر سردار گوردیال سنگھ ڈھلوں ہیں۔

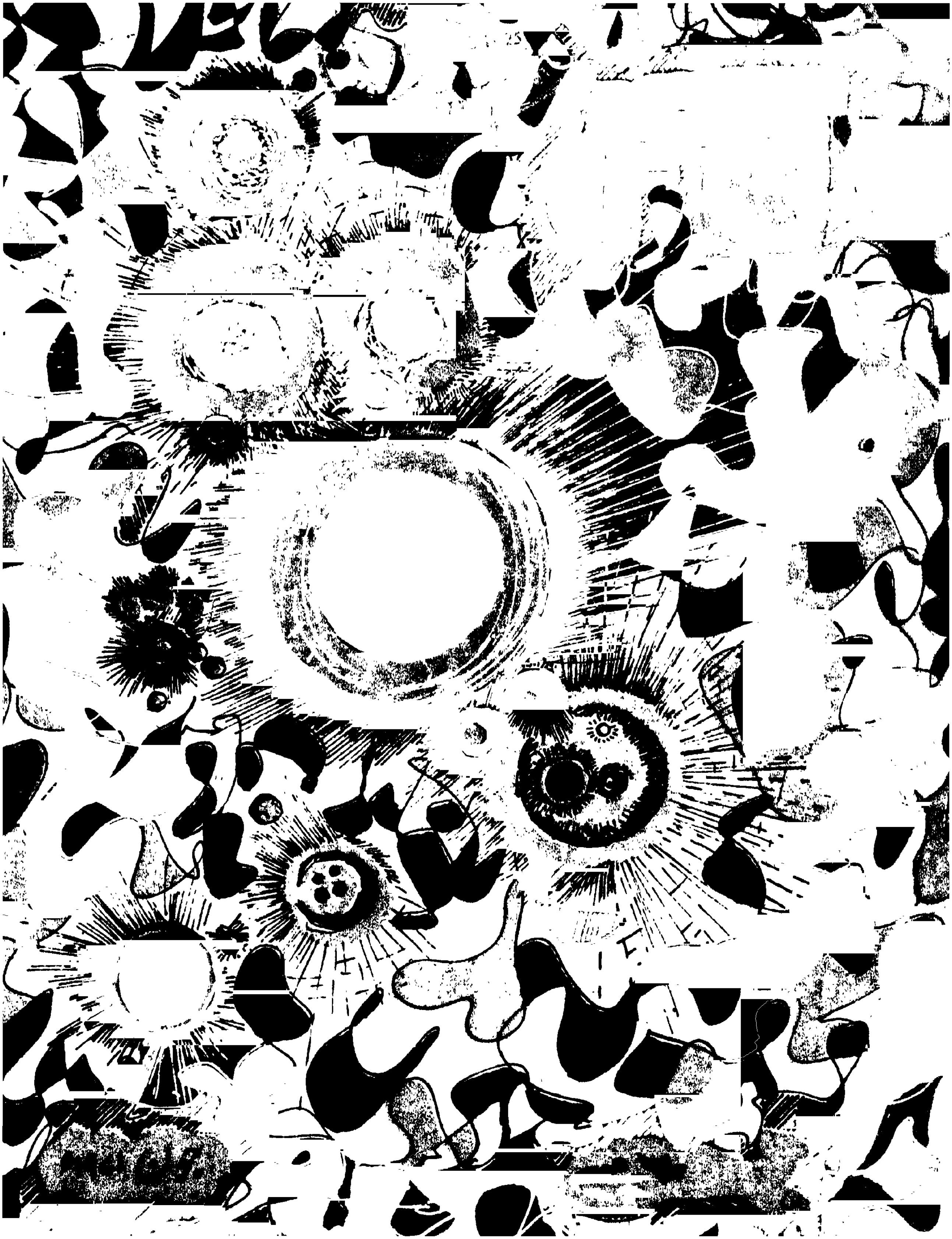




**Vol. 29 No. 10** **A J K A L (Monthly)** **May 1971**

**Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi.**
**Printed by Skylark Printers, 11355 Idgah Road, New Delhi-55**

**Regd. No. D-509**



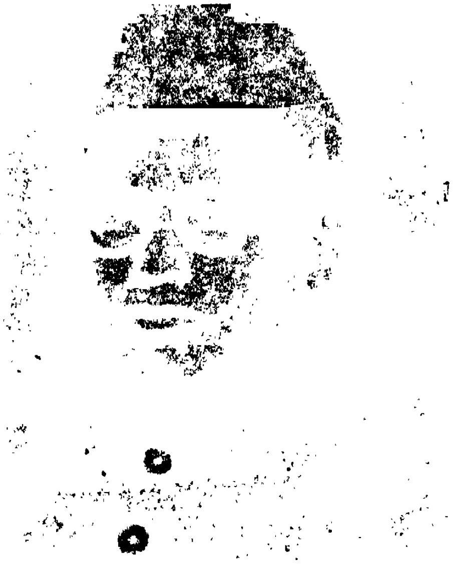
پلاننگ کمیشن کے سابق ڈپٹی چیرمین اور مشہور ماہر معاشیات پروفیسر ڈی۔ آر۔ گیڈگل کا ۳ مئی کو انتقال ہوگیا۔ آپ دہلی سے بمبئی تشریف لا رہے تھے کہ راستے میں ہی دل کا دورہ پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا۔

صدر جمہوریۂ ہند نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا ہے کہ مجھے ان کی موت سے بے حد صدمہ پہونچا ہے۔ وہ ایک ممتاز ماہر معاشیات تھے۔ اور اپنی علمیت کی وجہ بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ وہ امداد باہمی کی تحریک کے روح رواں تھے اور خصوصی طور سے مہاراشٹر اور عمومی طور سے پورے ہندوستان میں اس تحریک کو پھیلانے اور بڑھانے میں انہوں نے غیر معمولی حصہ لیا ہے۔

وزیر اعظم ہند نے بھی اپنے گہرے دکھ کا اظہار کیا ہے اور انہیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہندوستانی ماہرین معاشیات میں انہیں نہایت ممتاز مقام حاصل تھا۔ تقریباً چالیس برسوں تک انہوں نے ہمارے معاشی مسائل کو سمجھانے اور ملک کے لئے معاشی پالیسیاں مرتب کرنے میں بڑا نمایاں حصہ لیا ہے۔

ڈاکٹر دھننجے رام چندر گیڈگل اپریل ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے تھے۔ انگلینڈ میں اعلا تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ ۱۹۳۰ء میں گوکھلے انسٹی ٹیوٹ آف پالٹیکس اینڈ اکنامکس (پونا) کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے اور اس عہدے پر ۱۹۶۶ تک مامور رہے۔ وہ راجیہ سبھا کے ممبر اور پونا یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے۔ ۲۴ مارچ ۱۹۶۷ء کو آپ پلاننگ کمیشن کے ڈپٹی چیرمین مقرر کئے گئے تھے۔ اور اس عہدے سے سبک دوش ہونے کے بعد آپ وطن جا رہے تھے راستے میں آپ کا انتقال ہوگیا۔





۱۲ اپریل ۱۹۷۱ء کو صبح پانچ بجے اُردو کے ممتاز ادیب و شاعر علامہ اختر علی تلہری کا بلرام پور اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ آپ متعدد بلند پایہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے حکومت نے ان کی تصنیفات پر انعام دیئے تھے۔ اور ان کی ادبی پنشن بھی مقرر کر دی تھی۔

ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد آپ آخیر دم تک لکھنؤ میں رہے۔ ان کی موت اُردو کے لئے ایک بڑا سانحہ ہے۔

REGD. NO. D-309

# آجکل

شہباز حسین

مدیر

[illegible]

جلد ۲۹ ــــــ شمارہ ۱۱

جون ۱۹۷۱ء

جیشٹھ شک ۱۸۹۳

سرورق عمل: قیصر سرمست

## فہرست



شائع کردہ

ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ

ایڈیٹر آج کل (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

# ملاحظات

مشرقی بنگال میں "سالمیت" اور قومی اتحاد کے نام پر جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ دنیا میں اتنے بڑے پیمانے پر نہتے اور بے گناہ لوگوں پر ظلم و ستم ڈھانے کی مثالیں بہت کم ملیں گی۔ یہ سب کچھ جس انداز سے ہوا اور جس شدت سے ہوا اس سے یہ بات بخوبی سامنے آجاتی ہے کہ پاکستان کی فوجی آمریت نے مجبوری میں نہیں بلکہ ارادی طور پر یہ قدم اٹھایا جس کا مقصد فوجی اقتدار کو برقرار رکھنا تھا۔

ہندوستان کی یہ روایت رہی ہے کہ اس نے ہمیشہ ہی مظلوموں کا ساتھ دیا ہے۔ خلافت کا مسئلہ رہا ہو یا تبت میں چینی جارحیت کا یا مغربی ایشیا میں اسرائیل کی توسیع پسندی کا، ہر موقع پر ہندوستانی عوام نے ظلم کے خلاف آواز اٹھائی ہے لہٰذا اس دردناک انسانی المیئے سے متاثر ہونا جو بالکل ہمارے پڑوس میں ہے ایک قدرتی امر تھا لہٰذا کروڑوں عوام کی ترجمانی کرتے ہوئے لوک سبھا نے ۳۰ مارچ کو ایک قرارداد منظور کی جس میں مشرقی بنگال کے حالیہ واقعات پر "گہری تشویش اور رنج و غم" کا اور مشرقی بنگال کے عوام سے "دلی ہمدردی" کا اظہار کیا گیا۔

قرارداد میں کہا گیا "حکومتِ پاکستان نے نہ صرف قانونی طور پر منتخب شدہ نمائندوں کو اختیارات منتقل کرنے سے انکار کیا ہے بلکہ من مانے طور پر قومی اسمبلی کو اپنے جائز اور مقتدر حیثیت کو اختیار کرنے سے بھی باز رکھا ہے۔ مشرقی بنگال کے لوگوں کو سنگینوں، مشین گنوں، ٹینکوں، توپوں، اور ہوائی جہازوں کے ذریعے دبایا اور کچلا جا رہا ہے۔

" حکومتِ ہند اور ہندوستانی عوام ہمیشہ اس بات کے خواہش مند اور کوشاں رہے ہیں کہ پاکستان کے ساتھ پُرامن اور برادرانہ تعلقات قائم ہوں۔ تاہم ہندوستان اپنے محلِ وقوع کے اعتبار سے اور اس پورے برصغیر کے لوگوں کے درمیان صدیوں پرانے تاریخی اور ثقافتی بندھن اور روایات کی بنیاد پر اس دردناک المیئے کو نظر انداز نہیں کر سکتا ہے جو اس کی سرحدوں کے اتنے قریب ہو رہا ہے۔ ملک کے طول و عرض میں ہمارے عوام نے ان مظالم کی سخت مذمت کی ہے جو نہتے اور معصوم لوگوں پر اتنے وسیع پیمانے پر کئے جا رہے ہیں جس کی مثال نہیں ملتی۔

" ہندوستان کو ہمیشہ امن و امان سے دلچسپی رہی ہے اور ہم انسانی حقوق کو باقی رکھنے اور اس کے تحفظ کرنے کا وعدہ کئے ہوئے ہیں۔ لہٰذا یہ ایوان مطالبہ کرتا ہے کہ طاقت کا استعمال اور نہتے اور بے یار و مددگار لوگوں کا قتلِ عام فوراً بند کیا جائے۔ یہ ایوان دنیا کے تمام لوگوں اور تمام حکومتوں کو متوجہ کرتا ہے کہ وہ فوری اور تعمیری قدم اٹھائیں اور حکومتِ پاکستان پر زور ڈالیں کہ وہ بے گناہ عوام کی باقاعدہ قتل غارت گری سے، جو نسل کشی کی مترادف ہے، باز آئے۔"

مشرقی بنگال کے عوام کو اس قرارداد میں یقین دلایا ہے کہ ان کی اس جدوجہد میں انھیں ہندوستانی عوام کی مکمل حمایت حاصل ہے۔ دنیا کے متعدد ملکوں اور دانشوروں کے ردِ عمل سے ہندوستانی موقف کی پوری پوری تائید ہوئی ہے۔

---

اقلیتوں کے مسائل شروع سے ہی حکومتِ ہند کی توجہ کا مرکز رہے ہیں اس سلسلے میں وقتاً فوقتاً مناسب کارروائیاں ہوتی رہی ہیں جس سے ان مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے میں مدد ملتی ہے۔

اپریل کے آخری ہفتے میں نئی دلی میں انڈین لا انسٹی ٹیوٹ (ادارۂ قانون) نے "قانون اور اقلیتیں" کے عنوان سے ایک سیمی نار منعقد کیا تھا جس میں ملک کے ممتاز ماہرینِ قانون، حکومت کے نمائندے اور دانشور شریک ہوئے۔ متعدد مقالے پڑھے گئے۔ اور اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی۔ سیمی نار کا افتتاح کرتے ہوئے نائب صدر جمہوریہ ہند شری گوپال سروپ پاٹھک نے فرمایا کہ اقلیتوں کے مسئلے کا حل یہ ہے کہ عوام کو تعلیم دی جائے، رائے عامہ ہموار کی جائے اور لوگوں کے اندازِ فکر میں تبدیلی لائی جائے۔ آپ نے مزید کہا "دستور میں اقلیتوں کے تحفظ کے لئے کافی دفعات موجود ہیں لیکن اقلیتوں سے متعلق مختلف رپورٹوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان قوانین سے خصوصی واقفیت نہ ان لوگوں کو ہے جو متاثر ہوتے ہیں اور نہ ہی اُن لوگوں کو جن میں قانون کے نفاذ کی ذمہ داری ہے۔

آپ نے فرمایا کہ سماج کی اخلاقی اور سیاسی کارگزاری کی کسوٹی یہ ہے کہ آیا ... کے بھید بھاؤ ختم ہوں اور اقلیتوں کے مسائل کا حل کچھ تو خود اقلیتوں پر ہے مگر ... حد تک غالب گروہوں پر ہے۔ نائب صدر جمہوریہ نے کہا کہ فرقہ واریت اور چھوت ... کو ختم کرنے کے لئے قانونی پہلو کے ماسوا ضرورت اس بات کی ہے کہ مختلف ... اور غالب گروہوں میں آپسی تعاون اور میل جول ہو۔

سیمی نار میں بہت سی مفید باتیں زیرِ بحث آئی ہیں۔ مرکز اور ریاستی ... کے نمائندوں نے ان اقدامات کا جائزہ لیا جو اس سلسلے میں اٹھائے جا رہے ہیں۔ اس ... توقع کی جاتی ہے کہ مناسب رائے عامہ اور چوکس انتظامیہ کے تال میل سے ملک میں ... پسند طاقتوں کی بیخ کنی کی جا سکے گی۔

سردار جعفری

# غزل

شاخِ گل ہے کہ تلوار کھنچی ہے یارو
باغ میں کیسی ہوا آج چلی ہے یارو

کون ہے خوف زدہ جشنِ سحر سے پوچھو
رات کی نبض تو اب چھوٹ چلی ہے یارو

تاک کے دل سے، دلِ شیشہ و پیمانے تک
ایک اک بوند میں سو شمع جلی ہے یارو

چوم لینا لبِ لعلیں کا رندوں کو روا
رسم یہ بادۂ گلگوں سے چلی ہے یارو

صرف اک غنچے سے شرمندہ ہے عالم کی بہار
دلِ خوں گشتہ کے ہونٹوں پہ ہنسی ہے یارو

وہ جو انگور کے خوشوں میں تھی مانندِ نجوم
ڈھل کے اب جام میں خورشید بنی ہے یارو

یہ زمیں جس سے ہے ہم خاک نشینوں کا عروج
یہ زمیں چاند ستاروں میں گھری ہے یارو

جرعۂ تلخ بھی ہے جام گوارا بھی ہے
زندگی جشن گہہ بادہ کشی ہے یارو

# غبار کارواں

## حمیدہ سلطان

( ١٦ )

سالہا سال کی گرد جھاڑ کر جب میں نے اپنے لڑکپن پر بھرپور نظر ڈالی تو احساس ہوا کہ میری شخصیت بنانا جس عظیم ہستی کا کارنامہ ہے وہ میری نانی اماں کی ذات گرامی ہے،

رات کو کھانے کے بعد ان کے پاس لیٹ کر کبھی میں ۱۸۵۷ء کی شہر آشوب کی کہانی سنتی جس کو وہ یوں شروع کرتیں۔

"اماں، شہر آبادی کے زمانے میں جب جہاں پناہ تھے لال قلعہ آباد تھا، دلی کا راج سہاگ قائم تھا اور اس کی گود ہری بھری تھی۔"

یا پھر حضرت غالب کے لطیفے مزے لے لے کر بیان کرتیں۔ نانی اماں بیاہ کر غالب کے گھر گئیں۔ مرزا صاحب نے نئی نویلی دلہن کے وہ تمام چاؤ چونچلے کئے جو بڑے خاندان کا طرۂ امتیاز ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کو اپنی آن برقرار رکھنے اور ایک اللوتللو میں پرورش پاتی ہوئی نواب زادی بہو کے لئے کتنا کچھ کرنا پڑا ہوگا۔

---

؎ نواب معظم زمانی بیگم بنت نواب ضیاءالدین احمد خاں نیر رخشاں بیگم باقر علی خاں کامل

مجھے مرزا سے لگاؤ اور اُن پر کام کرنے کی دھن محترمہ موصوفہ کی بدولت دوسری بزرگ ہستی جس نے مجھ پر اثر ڈالا وہ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد۔ مولانا بہت کم آمیز تھے لیکن والدہ صاحبہ اور مولانا آزاد کی دونوں بہنیں فاطمہ آبرو بیگم سے بہت دوستی تھی آپس میں ربط اتنا گہرا تھا کہ بیگم آزاد بالکل نندوں کی طرح والدہ صاحبہ سے برتاؤ کرتیں اور یہ بھی سگی بھاوج ہی کی طرح سے چہل اور مذاق کرتی رہتیں۔

مجھے پڑھنے کی لت اوائل عمری سے ہے ۱۹۳۴-۳۶ء میں جب ہم نوگر میں تھے برابر مولانا آزاد کے ہاں آنا جانا تھا مولانا اس زمانے میں بالی گنج کی ایک دو منزلہ کوٹھی میں رہتے تھے میں جب بھی جاتی۔ ان کی لائبریری میں گھس جاتی پڑھتی رہتی تھی۔ وہیں میں نے مولانا کو ایک دن مطالعے میں مصروف پایا۔ انہوں بڑی محبت سے مجھے مخاطب کیا اور میری پسند کی کتابیں مجھے نکال کر دیں۔

مراثی انیس اور طلسم ہوش ربا اوائل عمری سے لے کر اب تک میرے کا باعث ہیں۔ لکھنے کی لت مجھے طلسم ہوش ربا کو پڑھنے کے بعد بارہ سال کی عمر سے افسانوں کی دنیا سے مجھے میرے محترم استاد ڈاکٹر وزیر حسن عابدی صاحب نکالا اور ادبی ذوق کو اُن کی تربیت نے صحیح راستہ پر ڈالا۔ عابدی صاحب خیال کرنے کے بعد میں نے پے درپے ادبی مضامین لکھے، نواب زین العا خاں عارف پر بھاری بھرکم مقالات تحریر کئے۔ یہ تعلی نہیں حقیقت ہے ذات کے بنانے میں اس پر فسوں ماحول کا بہت زیادہ اثر ہے جس میں بالغ ہوا میں نے اپنے بچپن میں نواب احمد سعید خاں طالب کو بیت بزم شعروادب میں سرگرم سخن دیکھا ہے، سائل صاحب سے وہ دلی

[illegible] کہا جائے تو بجا ہے۔ سائل کی طرح کا ترنم کسی اور شاعر [illegible] میں سائل صاحب کی وجیہہ صورت، دلکش شخصیت اور دلپذیر [illegible] کہ مشاعرہ اکثر ان کے ہاتھ رہتا۔

[illegible]ستان کے اور گھرانوں سے ہمارا ماحول بالکل مختلف تھا۔ نانی اماں کی [illegible] بیگمات بیٹھے پردے کشیدہ کاری ہی میں مصروف نہیں رہتی تھیں بلکہ [illegible] ان سب میں تھا۔ والدہ صاحبہ کی فرمائش پر سائل صاحب نے زہرہ جہاں [illegible] پر مثنوی لکھی جس میں بارہ ہزار شعر تھے۔ یہ مثنوی اکثر سائل صاحب اپنے [illegible] صحن میں سناتے تھے۔ ان کے بھانجے نواب لوہارو اپنی مثنوی کے بند جب بھی لوہارو سے آتے ضرور سنا کر جاتے۔

بسنت رت آتے ہی ڈومنیاں سرسوں کے پھول لے کر بسنت کی مبارکباد دینے آتیں، ہولی کے دنوں میں روزانہ رات کو ہولیاں گاتیں۔ اور ساون کی پھوار پڑتے ہی رات گئے تک اناتیں ملاریاں کجری گاتیں اور لڑکیوں بالیوں کو جھولے جھلاتیں۔ محرم کے آتے ہی سوگ کی فضا محلسرا پر طاری ہو جاتی، روزانہ عصر کی نماز کے بعد مرثیے انیس منجھلی خالہ صاحبہ بہت سوز و گداز سے پڑھتیں۔ دس دن تک برابر مجلس عزا ہوتی اور شربت اور کھانوں پر نیاز دے کر شہدا کی نذر دی جاتی۔

میرے لڑکپن میں اس اجڑے دیار کی شام تھی۔ وہ لوگ ابھی باقی تھے۔ جنہوں نے لال قلعے کی بہاریں دیکھی تھیں، یہاں ہر فن کے باکمال موجود تھے۔ میں نے باقر داستان گو کی داستان بھی سنی ہے اور قلعے کی شاہی ڈومنی دلدار جان کی پوتی بسم اللہ کے گلے سے مورچنا بھی نکلتے سنا ہے۔ بسم اللہ نے ایک ٹھمری کا نرت پورے آٹھ گھنٹے کیا تھا۔ سچ پوچھئے تو وہ زمانہ بہت حسین تھا جب نہ ریڈیو تھا نہ ٹیلی وژن۔ شریف گھروں کی خواتین سینما اور تھیٹر سے بیگانہ تھیں۔ لیکن ہر فن مولا لوگ دلی میں موجود تھے۔ جب کسی کے یہاں ولادت ہوتی تو چالیس دن تک ناچ گانا ہوتا، باہر ہیجڑے بھانڈ گاتے اندر ڈومنیاں ہونے والیاں نقلیں اتارتیں نیچے گھریاں گاتیں۔ گھر گھر سٹورا اور پان بتاشے بانٹے جاتے شادیاں ہوتیں تو مہینوں پہلے شادی والے گھر میں مہمان داری کا سلسلہ شروع ہو جاتا انہیں خوشبو سے بسایا جاتا۔ ڈھول پٹتا۔ پندرہ بیس روز پہلے سے باقاعدہ مہمان نوازی شروع ہو جاتی۔

میرے لڑکپن میں جینے کے علاوہ مرنے کا بھی لطف تھا اگر کوئی بیمار ہوتا تو عیادت کا سلسلہ دنوں چلتا جو کوئی دوست رشتہ دار آتا گھڑی دو گھڑی کے لئے نہیں، سارے دن نہیں تو چار پانچ گھنٹے ضرور بیٹھتا اور تیمار داری میں گھر والوں کا ہاتھ بٹاتا کسی گھر میں غمی ہو جاتی تو قریبی رشتہ دار اور دوست تین دن تک بیٹھے رہتے۔ اپنے گھر سے کھانا پکوا کر لاتے اور سوگ والوں کو خوشامد کر کے کھلاتے۔ تین دن کے بعد بھی چہلم تک برابر تعزیت کرنے والوں کا تانتا بندھا رہتا اس موقع پر امرا کے گھروں میں اتنی خیرات کی جاتی کہ بہت سے لوگ مہینوں کے لیے [illegible] کی فکر سے آزاد ہو جاتے۔ لیکن دوسری جنگ عظیم نے پرانی قدروں میں دیمک لگا دی اور رہی سہی آن ۱۹۴۷ء نے ختم کر دی۔ اب تو ان باتوں کی طرف اس گرانی کے زمانے میں کوئی دھیان ہی نہیں دے سکتا۔ میں نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اس میں مشرق و مغرب کا بڑا حسین امتزاج تھا۔ کیونکہ ابا جان مرحوم پہلے مسلمان آئی۔ ایم۔ ایس تھے اور اس وقت لیفٹننٹ کرنل ہوئے تھے جب انگریزوں کے علاوہ یہ عہدہ کسی ہندوستانی کو مشکل ہی سے نصیب ہوتا تھا۔ اس لئے ہمارے گھر کا انداز نیم مغربی تھا میرا بچپن زیادہ دلی کے سول لائن میں گزرا، یہاں ڈرائنگ روم، بیرہ، خانساماں اور دوسرے لوازمات زندگی مغربی تھے۔ ابا جان مرچ مسالہ بالکل نہیں کھا سکتے تھے اس لئے کھانا ہمارے یہاں انگریزی ہندوستانی دونوں وضع کا پکتا تھا۔

والدہ صاحبہ کے میکے والے ان بیچاری سیدھی سادی بیوی کو طنز سے میم صاحبہ اور بچوں کو بابا لوگ کہتے تھے۔ میں اپنے کوٹھی کے وسیع گراؤنڈ میں درختوں میں بھائیوں کے ساتھ چڑھتی، گھوڑے کی سواری کرتی اور بیڈمنٹن کھیلتی تھی۔ ابا جان کی فرمائش پر اکثر ان کے دوستوں کو کریما اور خالق باری جو مجھے ازبر تھی سناتی تھی غرضیکہ دونوں طرح کی زندگی مجھے میسر رہی، لیکن نانی اماں کی محل سرا کے عجائبات اب نظروں سے بالکل غائب ہو چکے ہیں۔ ان کی مصاحب عزیز خانم سے کالی پری کی کہانی ہم نے ڈیڑھ مہینے تک سنی جس کو وہ دو موں کے ساتھ روزانہ ایک گھنٹہ رات کے کھانے کے بعد سناتیں۔ بڑی خالہ اماں کی مصاحب عائشہ خانم کو طلسم ہوش ربا کی ساتوں جلدیں زبانی یاد تھیں۔ ان عورتوں کی ذہانت حاضر جوابی، بذلہ سنجی اب بی اے۔ ایم اے خواتین میں بھی نظر نہیں آتی۔ میں نے

---

نواب احمد سعید خاں طالب خلف اکبر نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں

بیت الضیاء نیر رخشاں کا دیوان خانہ تھا۔

مرزا سراج الدین خاں سائل ابن نواب شہاب الدین خاں ثاقب میری والدہ کے ماموں زاد بھائی

نواب اعز الدین اعظم مرزا خلف سرامین الدین خاں ابن نواب علاؤ الدین احمد خاں علائی جوشش گو شاعر تھے۔ ایک دیوان اور مثنوی نگار اعظم اپنا ادبی ترکہ چھوڑ کر ایام جوانی میں وفات پائی۔

# غزل

## عزیز قیسی

دشت میں شورِ ہا و ہو بھی نہیں
وحشتیں ، شرمندۂ رفو بھی نہیں

اُجلی اُجلی قبا ہے قاتل کی
دامنِ تیغ پر لہو بھی نہیں

زخم ہی زخم ہے ۔ نگاہِ کرم !
دل میں گنجائشِ رفو بھی نہیں

اُن سے ملئے تو کس لیے ملئے
اب تو جینے کی آرزو بھی نہیں

حبس ہی حبس دل سے آنکھوں تک
ہائے وہ دشت جس میں لو بھی نہیں

کس پہ الزام دیں تباہی کا
بے وفا میری جان تو بھی نہیں

آبروِ رفتہ بھی نہیں قیسی
شہر میں اس کی آبرو بھی نہیں

---

اپنی دونوں بڑی بہنوں کی طرح تعلیم گھر پر حاصل کی۔ ابا جان باوجود آزاد خیال ہونے کے یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ اُن کی بیٹیاں عام لڑکیوں کی طرح اسکول جائیں۔ گھر پر اُردو فارسی مولوی صاحب سے اور انگلش گورنس سے پڑھی۔ میٹرک بعد میں پرائیوٹ میں نے اپنے شوق سے انیس سال کی عمر میں کیا۔ پھر ڈاکٹر وزیر الحسن عابدی صاحب سے پڑھ کر ادیب فاضل کا امتحان ۲۱ سال کی عمر میں دیا۔

میرے لڑکپن میں گھر گھر مشنری یورپین عورتیں خوشامد کرتی پھرتی تھیں کہ مسلمان شریف گھرانے کی لڑکیوں کو وہ مفت پڑھا سکیں۔ مگر آخر بزرگ خواتین ناک بھوں چڑھا کر انکار کر دیتی تھیں۔ یہ خیال ان کو رہتا تھا کہ ہماری لڑکیاں کرسٹان عورتوں سے پڑھ کر مذہب سے بیگانہ ہو جائیں گی۔ کنواری لڑکیوں پر اس زمانے میں بہت نظر رکھی جاتی تھی۔ میں نے جب ادبی مضمون رسالہ ہمایوں میں دیا۔ تو ایک قریبی [illegible] دار خاتون نے طنز کی "اوئی توبہ! اب ہمارے خاندان کی لڑکیاں بھی اخباروں میں چھپنے لگیں اور کسی کو کیا نام رکھیں" مگر میرے آقا بھائی[1] نے ہمیشہ میری ہمت افزائی کی اور میرے اَدبی شغف کو تحسین کی نظر سے دیکھا۔

مجھے شعروادب سے فطری لگاؤ ہے، اس لئے سولہ سال کی عمر میں نے اپنی ہم سن لڑکیوں کی ایک انجمن بنائی۔ جس کے ماہانہ جلسے ہوتے تھے۔ ان جلسوں میں اَدبی مضامین پڑھے جاتے، بیت بازی ہوتی، تقاریر کا مقابلہ ہوتا تعلیم نسواں پر مباحثے ہوتے بلکہ مشاعرے کیے جاتے۔ ہم سب تک بندی کرکے خوب غزل سرائی کرتے تھے۔ ان طرحی مشاعروں میں ایک مرتبہ میں طرح کا مصرع جو دیا تھا وہ اب تک یاد ہے،

" آیا ہے ابر جھوم کے رحمت خدا کی ہے "

میرا لڑکپن ہندوستان کی سیاسی بیداری کا زمانہ تھا۔ ان دنوں حکیم اجمل خاں کو دلی کا بے تاج بادشاہ کہا جاتا تھا۔ ڈاکٹر انصاری کا بھی یہاں طوطی بول رہا تھا اور ہر گھر میں عورتیں یہ نظم بہت جوش وخروش سے گاتی تھیں۔

" بولیں اماں محمد علی کی ۔ جان بیٹا خلافت میں دیدو "

کانگریس کی میٹنگیں حکیم اجمل خاں کی حویلی شریف منزل کے دیوان خانے میں ہوا کرتی تھیں۔ مولانا آزاد کا قیام بھی یہیں رہتا تھا ایک مرتبہ سُنا کہ گاندھی جی نے جامع مسجد میں تقریر جمعہ کی نماز کے بعد کی اور ہندو مسلمانوں نے دوش بدوش بیٹھ کر سُنی، لیکن افسوس ہے کہ یہ بھائی چارے کی فضا زیادہ عرصے قائم نہ رہ سکی۔ انگریز اس قومی ایکتا سے گھبرا گئے انہوں نے ایسی شاطرانہ چالیں چلیں اور مذہبی تعصب کو وہ ہوا دی کہ فضا پھر ایسی بگڑی کہ آزادی ملنے کے اتنے سال بعد بھی یہ بھٹکے ہوئے فرقہ پرست ابھی تک راہ راست پر نہ آسکے۔

سنہ ۱۹۵۰ء میں میں نے انجمن ترقی اُردو کا کام کرنا شروع کیا تو علامہ کیفی کو قریب سے دیکھنے کا موقع مجھے ملا۔ پنڈت جی کے ہمت و حوصلے کو بڑھاپے میں دیکھ کر مجھ پر کافی اثر ہوا اور اُردو کے لیے ان کا عزم و ولولہ مجھے حوصلہ دیتا رہا۔ دیکھنے میں یہ زار و نزار جسم کا بوڑھا انسان جب اُردو کے حقوق کے لئے رفتار مرد میدان بن جاتا۔ کیفی صاحب کی دھیمی اور شیریں آواز میں اُردو کی وکالت کرنے کے لیے ایسا کرارا پن آجاتا اور لہجہ اتنا تند ہو جاتا تھا کہ ان کے گرد و پیش کے لوگوں کا حوصلہ بلند ہو جاتا تھا اور وہ کام کرنے کی دھن میں مگن ہو جاتے

---

[1] فخرالدین علی احمد

# میر انیس کی غزل گوئی

میر انیس نے عام دستور کے موافق شاعری غزل سے شروع کی۔ اُن کے والد میر خلیق مرثیہ گوئی کے علاوہ غزل گوئی کے بھی اُستاد سمجھے جاتے تھے۔ تذکرہ نگار جب تک فیض آباد میں رہے اپنی غزلوں پر میر خلیق سے اصلاح لیتے رہے۔ لکھنؤ میں آنے کے بعد مُلک ناسخ[1] کے اور رند آتش کے شاگرد ہو گئے۔[2] میر انیس نے بھی اپنی غزلوں پر میر خلیق سے اصلاح لی ہوگی۔ مرزا قادر بخش صابر دہلوی نے انیس کے بارے میں لکھا ہے "غزل گوئی میں دست گاہ تمام اور قدرت مالا کلام ہے"[3] اور اُن کی غزل کا یہ مطلع بھی نقل کیا ہے۔

ہوا ہے ، ابر ہے ، ساقی ہے ، مے ہے
پر اک تو ہی نہیں افسوس ہے ہے

ناسخ کا قول ہے کہ انیس "سوائے مرثیے کے کسی اور صنف میں مطلق دخل نہیں رکھتے"[4] مگر انیس کی غزلوں کے تین شعر نقل کر کے اپنے قول کو خود ہی رد کر دیا ہے۔ ان تین شعروں میں ایک تو وہی مطلع ہے جو مرزا صابر دہلوی نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے اور اوپر نقل کیا جا چکا ہے۔ باقی دو شعر اس غزل کے ہیں جو کلب حسین خاں نادر نے اپنے مجموعہ مخمسات مسمٰی بہ دیوان غریب میں درج کیا ہے اور یہاں نقل کی جاتی ہے۔

وجد ہو بلبل تصویر کو جس کی بُو سے
اس سے گل رنگ کا دعویٰ کرے پھر کس رُو سے

شمع کے رونے پہ بس صاف ہنسی آتی ہے
آتشِ دل کہیں کم ہوتی ہے چار آنسو سے

کس سے اے شوخ ہوئی رات کو ہاتھا پائی
نورتن آج جو ڈھلکے ہیں ترے بازو سے

کل تو آغوش میں شوخی نے ٹھہرنے نہ دیا
آج کی شب تو نکل جاؤ مرے قابو سے

ایک دن وہ تھا کہ تکیہ تھا کسی کا زانو
اب سر اٹھتا ہی نہیں اپنے سرِ زانو سے

نزع میں ہوں مری مشکل کرو آساں یارو
کھولو تعویذ شفا جلد مرے بازو سے

شوخیٔ چشم کا تو کس کی ہے دیوانہ انیس
آنکھیں ملتا ہے جو یوں نقش سُمِ آہو سے[5]

میر انیس

تذکرہ بزم سخن کے مؤلف نے انیس کو مرثیہ گوئی میں شہرۂ آفاق اور مرثیہ خوانی میں یگانہ وطاق لکھ کر ناسخ کی طرح یہ لکھا ہے کہ "اما بر دیگر اصناف سخن دستے نہ داشت"۔ پھر ناسخ کے پیش کیے ہوئے غزل کے دو شعروں میں سے ایک شعر پیش کر کے ناسخ کی طرح اپنے قول کو خود رد کر دیا ہے۔[6]

سعادت خاں ناصر نے تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا میں میر انیس کے حال میں لکھا ہے:

"عالم شباب میں چندے مشق غزل گوئی رہی اور اصلاح اس کی اپنے پدر بزرگوار سے لی مگر اب زبان تا شب اور دل مرثیہ گوئی پر راغب۔

---

[1] خوش معرکہ زیبا قلمی [2] گل دستۂ عشق ص ۱۶۸ [3] گلستان سخن ص ۱۲۹
[4] سخن شعراء ص ۵۶

[5] دیوانِ غریب ص ۶۲ [6] بزم سخن ص ۱۹

یہ دو تین شعر معرفت میر علی اوسط صاحب کے ہاتھ آئے

یہی باعث ہے اس بے رحم کے آنسو نکلنے کا
دھواں لگتا آنکھوں میں کسی کے دل کے جلنے کا

رہا تن میں نہ خون باقی گیا موسم جوانی کا
شتاب آخر ہوا روغن چراغ زندگانی کا

جو میں رگڑا سر ترے پاؤں پر مرا دفعتہ گیا درد سر
یہ تو امر متدل مُرخ ہے مری جان رنگ حنا نہیں"

راقم نے پہلے شعر کا مصرع اولی معتبر بزرگوں سے یوں سنا "دکھلا باعث یہ اس بے درد کے آنسو نکلنے کا" تیسرے شعر میں "میں رگڑا" انیس کی زبان نہیں۔ ممکن ہے بالکل ابتدائی مشق کا کلام ہو۔

تذکرہ خوش معرکہ زیبا کا جو قلمی نسخہ پٹنہ میں ہے اس کے حاشیے پر یہ عبارت ملتی ہے:۔

عہد شباب میں جب کہ فیض آباد میں تھے اوائل میں چند غزلیں بھی کہی تھیں جب سے لکھنؤ تشریف لائے۔ شوق مرثیہ گوئی کا ہوا۔ وہ سب غزلیں یک قلم دھو ڈالیں، منسیاً منسیاً کیں ۔ ۔ ۔ غزل میر صاحب کی صفت عنقا نایاب ہے۔ بہت تلاش سے ایک غزل دستیاب ہوئی ہے

شہید عشق ہوئے قیس نام ور کی طرح
جہاں میں عیب بھی ہم نے کئے ہنر کی طرح

کچھ آج شام سے چہرہ ہے فق سحر کی طرح
ڈھلا ہی جاتا ہوں فرقت میں دوپہر کی طرح

سیاہ بختوں کو یوں باغ سے نکال لے چرخ
کہ چار پھول تو دامن میں ہوں سپر کی طرح

تمام خلق ہے خواہاں آبرو یارب
چھپا مجھے صدف قبر میں گہر کی طرح

تجھی کو دیکھوں گا جب تک ہیں برقرار آنکھیں
مری نظر نہ پھرے گی تری نظر کی طرح

انیس یوں ہوا حال جوانی و پیری
بڑھے سے نخل کی صورت گرے ثمر کی طرح

اس غزل کے بعد یہ دو شعر بھی لکھے گئے ہیں۔

خموش اے بلبل شوریدہ اس میں کیا ہے بس میرا
یہ اپنی اپنی قسمت ہے چمن تیرا قفس میرا

بنے ہیں یوں یہ در صفا کے اندر
کہ ششدر ہو گئی سد سکندر

اخبار صدائے وطن، دہلی وطن مورخہ ۲۸ جنوری [illegible]
کی ایک غزل شائع کی گئی ہے جس کے ابتدائی دو شعر تو وہی ہیں جو [illegible]
نسخۂ پٹنہ سے اوپر نقل کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد تین شعر اور ہیں۔

ہماری قبر پہ کیا احتیاج عنبر و عود
سلگ رہا ہے ہر اک استخواں اگر کی طرح

نحیف و زار ہیں کیا زور باغباں سے چلے
جہاں بٹھا دیا بس رہ گئے شجر کی طرح

تمہارے حلقہ بگوشوں میں ایک میں بھی ہوں
پڑا ہے یہ سخن کان میں گہر کی طرح

آخری شعر ذرا سے لفظی تغیر کے ساتھ جلال کی ایک غزل میں بھی موجود ہے۔

ایک قلمی بیاض یا کشکول چمنستان بلاغت میں لکھا ہے: "مطلع بطور رسالہ انیس مرحوم سے

مجھے ثبات نہیں ایک دم شرر کی طرح
تڑپنے پر ہے دل مضطرب ثمر کی طرح

اور تیرہ شعر کی میر انیس کی غزل نقل کی ہے جس میں سات شعر تو وہی ہیں جو آچکے ہیں اور چھ شعر یہ ہیں ۔

تم اس جہاں میں وہ بلقیس ہو کہ خط جو لکھو
تو سر پہ رکھ لے سلیماں ہما کے پر کی طرح

نہیں ہیں کام کے قابل اٹھائے کون ہمیں
گرے ہیں خاک پہ سوکھے ہوئے شجر کی طرح

بلا تو بھیجئے دوری ہے آپ کے نزدیک
ابھی پہنچتے ہیں ہم ڈاک میں خبر کی طرح

خدا رکھے تجھے آباد خلق میں اے قبر
کہ سوئے پاؤں کو پھیلا کے اپنے گھر کی طرح

بتا تو دیجے صاحب کہاں کا بوسہ لیں
دہن بھی آپ کا ملتا نہیں کمر کی طرح

---

ؔ۔ خوش معرکہ زیبا قلمی

[ یہ مصرع پڑھا نہیں گیا ]

کہ بند بند کو باندھے ہوں نیشکر کی طرح

یہ مطلع ذرا سے لفظی تغیر کے ساتھ یوں لکھا گیا ہے ؎

انیس یہ ہوا حال جوانی و پیری

بڑھے شجر کی طرح اور گرے ثمر کی طرح

سید علی حیدر نظم طباطبائی شرح دیوان غالب میں رقمطراز ہیں۔

میر انیس مرحوم کے سامنے ایک صاحب نے یہ مصرع پڑھا چہکتے چہکتے بلبل کی زباں سوکھ گئی، میر صاحب نے یہ مصرع لگا دیا۔

عرق گل ہے مناسب اسے دینا صیاد

چہکتے چہکتے بلبل کی زباں سوکھ گئی

اس کا چرچا لکھنؤ میں ہوا اکثر لوگوں نے طبع آزمائی کی۔"[3]

افضل حسین ثابت مصنف حیات دبیر نے اپنے خط بنام حامد علی خاں بیرسٹر مورخہ ۱۴ اپریل ۱۹۱۲ء میں میر انیس کا یہ مطلع نقل کیا ہے۔

نہ روکا ہم کو پھولوں نے چلے خالی ہی گلشن سے

گلوں سے خار ہی بہتر کہ لپٹے آکے دامن سے[4]

مولوی مہدی حسن رضوی[5] نے اپنے والد مولوی حامد علی صاحب سے میر انیس کی غزل کے متعدد اشعار سنے تھے جن میں سے صرف ایک شعر یاد رہ گیا۔

پہلے سے ہلال جھک گیا ہے ؏ آمد آمد کمال کی ہے

انہیں مولوی مہدی حسن نے میر امجد حسین شاگرد میر مونس سے میر انیس کی ایک غزل کا یہ مطلع سنا تھا

چمن کے افشاں نظر اس مہ نے جو کی تاروں پر

آسمان شام سے ٹوٹا کیا انگاروں پر

---

[3] شرح دیوان غالب ص ۱۸۵ [4] یادگار حامد ص ۱۰۴

[5] لکھنؤ کے ذی علم، ذی اثر اور حکام رس نیرنگ خان بہادر نواب مولوی مہدی حسن رضوی نے ۲۳ مارچ ۱۹۵۵ء کو پچاسی برس کی عمر میں انتقال کیا۔ ان کے والد میر حامد علی میر انیس سے انتہائی عقیدت رکھتے تھے اور روزانہ رات کو دو تین گھنٹے ان کی صحبت میں صرف کرتے تھے وہ میر انیس کا بہت ذکر کرتے تھے تو مولوی مہدی حسن کو چند باتیں یاد رہ گئی تھیں جو انہوں نے آج سے کوئی تیس برس پہلے میرے دریافت کرنے پر بیان کر دی تھیں۔ ایک مدت کے بعد میں نے ان کا بیان ایک مضمون کی صورت میں ہفت روزہ سرفراز لکھنؤ مورخہ ۹ نومبر ۱۹۶۹ء میں شائع کر دیا تھا مضمون کا عنوان ہے "کچھ میر انیس کے بارے میں" اور ذیلی سرخی ہے "ایک عقیدت مند رفیق کا بیان"

سید محمد عباس جنہوں نے اپنے استاد نامی شاعر اور مرثیہ گو سید محمد کاظم جاوید سے میر انیس کا یہ شعر سنا تھا

ہلال و ماہ دونوں ہیں تری تصویر کے خاکے

وہ نقشہ ہے لڑکپن کا یہ صورت ہے جوانی کی

مندرجہ ذیل اشعار بھی میر انیس سے منسوب کئے جاتے ہیں۔

دل لے لیا ہے یار نے مٹھی میں بند ہے

کھلتا نہیں پسند ہے یا ناپسند ہے

جب مسیحا دشمن جاں ہو تو ہو کیونکر علاج

کون رہبر ہو سکے جب خضر بہکانے لگے

رکھ کے منہ سو گیا ان آتشیں رخساروں پر

دل کو چین آیا تو نیند آگئی انگاروں پر[1]

سید زوار حسین مرحوم جو میر انیس کی بہن کے حقیقی پوتے تھے۔ انہوں نے مجھ کو نہایت قابل قدر کاغذات عنایت کئے تھے۔ جو اُن کو اپنی دادی سے وراثت میں ملے تھے۔ ان کاغذات میں ایک پرچے پر غزل غالباً میر انیس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ اس غزل کا ایک شعر یہ تھا۔

دیکھ کر شکل اُس کی اسکندر کو یہ حیرت ہوئی

بن گیا آئینۂ تصویر پشت آئینہ

اس شعر کے پہلے مصرع کو ذرا سا بدل کر اور مونس کا تخلص ڈال کر غزل کا مقطع کر دیا یہ طولانی غزل ذیل میں نقل کی جاتی ہے۔

کھینچتے ہیں آپ وہ تصویر پشت آئینہ[2]

ہے چمک پر ان دنوں تصویر پشت آئینہ

گر پسند آئے نہیں تصویر پشت آئینہ

رو سے ہو جائے سوا توقیر پشت آئینہ

دیکھ کر شکل اس کی مونس کو بس حیرت ہوئی ؏ بن گیا آئینہ تصویر پشت آئینہ

---

[1] اسی زمین میں آتش کا مطلع ہے: پڑ گئی آنکھ جو آتشیں رخساروں پر جلوٹتے کیک نظر آگئے انگاروں پر۔ [2] تصویر پشت آئینہ۔ میرا سن اس وقت ۱۹۷۰ء میں ستر برس کا ہے۔ دس بارہ برس کی عمر میں مجھ کو اپنی دادی صاحبہ مرحومہ کے سامان میں ایک منہ دیکھنے کا آئینہ ملا تھا قلعی دار جلی شیشے کی پشت پر ایک ہی چوکھٹے میں ایک دوسرا شیشہ تھا جس میں سنہری اور رنگین تصویر ایک درخت کی تھی جس پر چڑیاں بیٹھی ہوئی تھیں یہ تھی تصویر پشت آئینہ۔ غالباً اس زمانے میں آئینے کی زینت کے لیے اس کے ساتھ ایسا با تصویر شیشہ لگانے کا عام رواج تھا اور آئینے کو لٹکانے کے لیے اس کی پشت پر ایک زنجیر بھی ہوتی تھی۔

[illegible] پیچاں کو رخ روشن کے پیچھے دیکھ کر
میں نے یہ جانا کہ ہے زنجیر پشت آئینہ

زانوئے خوش بو پہ رکھ کر تم نے دیکھا ہے جو منہ
کیا مہکتے ہیں گل تصویر پشت آئینہ

سلسلہ حیرت زدوں کی قید کا اچھا نہیں
کہہ رہی ہے صاف یہ زنجیر پشت آئینہ

دور کیا ہے گر تمہارے دیکھنے کے شوق میں
پھوٹ نکلے اس طرف تصویر پشت آئینہ

عہدۂ آئینہ داری تو اگر بخشے اسے
گردن یوسف میں ہوں زنجیر پشت آئینہ

گر نظر آئے تمہارے گلشن رخ کی بہار
مثل طوطی بول اٹھے تصویر پشت آئینہ

حال اسکندر نظر آجائے جس کو دیکھ کر
چاہئے اس رنگ کی تصویر پشت آئینہ

ہنس کے وہ بولے جو بکھرے پیٹھ پر چوٹی کے بال
دیکھ کر دیکھی نہ ہو زنجیر پشت آئینہ

سخت حیراں ہوں کہ روئے یار دیکھا کس طرح
- - - - - .. تصویر پشت آئینہ

اس کے پیچھے رات دن رہتا ہوں میں حیرت زدہ
بن گیا ہوں آج کل تصویر پشت آئینہ

دیکھتے ہیں آپ اس کو اور مجھے آتا ہے رشک
ڈھانپ دیجے دیدۂ تصویر پشت آئینہ

اس کو آئینہ دکھانے میں عجب نقشہ ہوا
بن گیا حیرت سے میں تصویر پشت آئینہ

آپ کوئی بات تو کیجیے لب جاں بخش سے
بول اٹھے گی ابھی تصویر پشت آئینہ

دولت عکس رخ محبوب سے محروم ہے
پڑھ لیا ہم نے خط تقدیر پشت آئینہ

آپ کے چہرے سے ہم چشمی کا دعویٰ واہ واہ
لائیے کو ڈالیے تعزیر پشت آئینہ

شاہ نصیر دہلوی مشکل طرحوں میں غزل کہنے میں بڑے مشاق تھے وہ ایک زمانے میں لکھنؤ آئے تو یہ طرح "گل تصویر پشت آئینہ" [illegible] شعرا نے طبع آزمائی کی، جن میں سے بارہ شاعروں کی ہم طرح غزلیں [illegible] میں درج کر دی گئی ہیں۔ ان شاعروں کے تخلص یہ ہیں۔ نصیر [illegible] ناقب آباد، شاگردان ناسخ، محسن۔ شاگرد وزیر، عشق [illegible] شاگرد دبگر، حیر، شاگرد نسیم دہلوی، اسیر، فاضل، [illegible] علاوہ مسلم عظیم آبادی کا بھی ایک شعر اسی طرح میں ہے۔ امانت [illegible] تکبیر، گل گیر، تدبیر کے قافیے ان کے سوا کسی اور نے نہیں کہے ہیں۔[1]

اس زمین اور ان غزلوں کا بڑا چرچا رہا ہوگا اور اس زمین میں غزل کہنا شاعر کی قادر الکلامی کا امتحان قرار پایا ہوگا۔ اس صورت حال سے میر انیس کا جوش بھی ابھرا اور انہوں نے اس مشکل زمین میں بہت سے شعر کہہ ڈالے لیکن چونکہ غزل گوئی ترک کر چکے تھے اور غزل گویوں سے مقابلہ کرنا منظور نہ تھا۔ اس ایک شعر کا پہلا مصرع بدل کر اس میں میر مونس کا تخلص ڈال دیا۔ بہرحال یہ قیاس ہیں۔ اصل حقیقت تک پہنچنے کی بظاہر کوئی صورت نہیں ہے۔

انیس کے غزل گوئی ترک کرنے کے بارے میں آزاد نے لکھا ہے کہ میر خلیق نے انیس کی ایک غزل سن کر کہا کہ "اب اس غزل کو سلام کرو"[2] اس جملے کے دو [illegible] ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اسی زمین میں سلام کہو، دوسرے یہ کہ اب غزل گوئی [illegible] کرو۔ سعادت مند فرزند نے ان دونوں معنوں میں باپ کے حکم کی تعمیل کی۔ [illegible] نے نہیں لکھا ہے کہ وہ کون سی غزل تھی۔ لیکن میر انیس کی ایک غزل کے چند [illegible] اسی طرح میں ان کا ایک سلام ملتا ہے۔ غزل کے اشعار حسب ذیل ہیں۔

اشارے کیا نگہ ناز دل ربا کے چلے ؛ ستم کے تیر چلے نیمچے قضا کے [illegible]
پکارے کہتی تھی حسرت سے نعش عاشق کی ؛ صنم کدھر کو ہمیں خاک میں ملا کے [illegible]
مثال ماہی بے آب موجیں تڑپا کیں ؛ حباب پھوٹ کے روئے جو تم نہا کے

سلام میں چودہ شعر ہیں۔ چند شعر درج کیے جاتے ہیں۔

گنہ کا بوجھ جو گردن پہ ہم اٹھا کے چلے ؛ خدا کے آگے خجالت سے سر جھکا کے [illegible]
مقام یوں ہوا اس کارگاہ دنیا میں ؛ کہ جیسے دن کو مسافر سرا میں آ کے [illegible]
بلا جنھیں انھیں افتادگی سے اوج بلا ؛ انھیں نے کھائی ہے ٹھوکر جو سر اٹھا کے [illegible]
ملی نہ پھولوں کی چادر تو اہلبیت امام ؛ مزار شاہ پہ لخت جگر چڑھا کے [illegible]

اس سلام کا مقطع بہت مشہور ہوا۔

انیس دم کا بھروسا نہیں ٹھہر جاؤ ؛ چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے

---

[1] سراپا سخن ص ۲۳۱-۲۳۵ [2] آب حیات ص ۴۲۲

[illegible] کی نظر میں تھا۔

غالب کی طرح میر انیس نے بھی اپنی غزلوں کو شہرت نہیں دی اور غالباً تمام غزلوں کو ضائع کر دیا [illegible] شعر ادھر ادھر نقل کئے گئے ہیں ان کے علاوہ کسی اور شعر کا [illegible] البتہ [illegible] صاحب کے سلاموں میں ایسے بہت سے شعر ملتے ہیں جن کا [illegible] ہیں [illegible] نے اپنی کتاب حیات انیس میں انیس کے سلاموں سے [illegible] غزلیں بنا کر پیش کی ہیں مگر ان میں تغزل کا خاص عنصر یعنی حسن اور عشق کے معاملات کا ذکر معدوم ہے۔ اس لئے کہ سلام کی متانت [illegible] کے بیان کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ مرثیوں میں تغزل کا موقع اور بھی نہ تھا مگر غزل کا مذاق عام طور پر [illegible] میں ایسا بس گیا تھا کہ مرثیوں میں بھی تغزل کا عمل پیدا کر لیا گیا، خاص کر تلوار کی تعریف میں، جیسا کہ ذیل کی مثالوں سے ظاہر ہے۔

چلنے میں مزہ قامت معشوق حسیں کا
انداز ہر اک ناب میں تھا چین جبیں کا
کیا قہر تھا شمشیر کے ابرو کا اشارہ
اک چشم زدن میں اسے مارا اسے مارا
کچھ ہو کے وہ چلنا، وہ ٹھہرنا، وہ لچکنا
شعلہ تھا، بجلی، گو وہ تھا بجلی کا چمکنا
ندی کے قریں خون کا دریا سا بہا تھا
کیا چال غضب تھی کہ ہر اک لوٹ رہا تھا
حوروں میں یہ گرمی نہ لگاوٹ یہ پری میں
بے دم کیا لاکھوں کو اسی عشوہ گری میں
بسمل ہوا جس کو لچک اس کی نظر آئی
اٹھکیلیاں کرتی ادھر آئی ادھر آئی
چمک ایسی کہ حسینوں کا اشارہ جیسے

اس کرشمے سے وہ لیلی ظفر راہ چلی ؛ گہ تھمی گاہ رکی، گاہ بڑھی گاہ چلی
زخم سینوں کے گریباں کی طرح پھٹتے تھے ؛ چال کیا تھی کہ ہزاروں کے گلے کٹتے تھے

میر انیس کے غزل گوئی ترک کرنے کا سبب جو اوپر بیان کیا گیا ہے یعنی ان کے والد میر خلیق کا حکم، وہ وقتی اور ظاہری سبب تو ہو سکتا ہے لیکن اصلی سبب تو وہ غیر معمولی ملکۂ شاعری تھا جس کا اظہار غالب نے یوں کیا ہے۔

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے

بعض غزل گویوں اور ان کے شعروں کے بارے میں میر انیس کے چند جملے جو ہم تک پہنچے ہیں وہ بھی سن لیجئے۔ محمد حسین آزاد نے ذوق کے بارے میں میر انیس کی رائے دریافت کی۔ "فرمایا کہ میاں میر کے بعد پھر دل میں ایسا شاعر کون ہوا ہے"[2]

ایک دن آزاد نے میر انیس کے سامنے ذوق کا یہ مطلع پڑھا:

کوئی آوارہ تیرے نیچے اے گردوں نہ ٹھیرے گا
مگر تو بھی اگر چاہے کہ میں ٹھیروں نہ ٹھیرے گا

میر صاحب نے یہ مطلع دو مرتبہ پڑھوایا اور کہا "صاحب کمالوں کی یہ بات ہے کہ جو لفظ جس مقام پر اس نے بٹھا دیا ہے اسی طرح پڑھا جائے تو ٹھیک ہوتا ہے نہیں تو شعر رتبے سے گر جاتا ہے۔"[3]

میر قربان علی سالک شاگرد غالب نے اپنی بیاض میں ۱۸۶۹ء کی یادداشت میں میر انیس سے اپنی ملاقات کا حال بیان کیا ہے اور اس سلسلے میں لکھا ہے: "مرزا غالب کو لگا نہ فن کے لفظ سے یاد کیا اور ذوق و مومن کی نسبت فرمایا کہ ذوق شاہی دربار کے شاعر اور مومن اپنی طبیعت کے بادشاہ ہیں۔ پھر حکیم مومن خاں کا یہ شعر پڑھا۔

نہ کچھ شوخی چلی باد صبا کی ؛ بگڑنے میں بھی زلف اسکی بنا کی

پڑھنے کے بعد ایک چپ سی لگ گئی جیسے کوئی حسین صورت سامنے ہے اور ہوا سے اس کی زلف اڑ رہی ہے اور میر صاحب اس کو دیکھ دیکھ کر کلام کے مزے لے رہے ہیں۔" ایک روز فرمانے لگے دلی کا کچھ کلام سناؤ۔ میں نے مرزا غالب کی یہ غزل پڑھی۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے ؛ ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر ؛ کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

پھر اپنی غزل پڑھی اس کا ایک شعر یہ ہے۔

دنیا میں مجھے خاک اڑانے نے ڈبویا ؛ ہر بار نکل آتا ہے دریا مرے آگے

اس شعر پر فرمایا خوب کہا ہے۔ یہ کہہ کر فرمانے لگے لکھنؤ والے روکے ہے کھینچے ہے نہیں لکھتے۔"

میر انیس کے ایک عقیدت مند رفیق مولوی میر حامد علی کا ذکر اوپر آچکا ہے ایک مرتبہ انہوں نے میر انیس کے سامنے یہ شعر پڑھا۔

روشن ہے اس طرح دل ویراں میں داغ ایک ؛ اجڑے نگر میں جیسے جلے ہے چراغ ایک

میر صاحب لیٹے تھے یہ شعر سن کر اٹھ بیٹھے، ایک آہ کی اور فرمایا کہ اب میں بڑھاپے میں ایسے شعروں کی تاب نہیں لا سکتا اس فن میں ایسے تیر نہیں کھا سکتا پھر میر صاحب نے اس شعر کی شرح کے سلسلے میں فرمایا کہ پرانے زمانہ میں جب کسی بستی پر شاہی عتاب نازل ہوتا تھا تو وہ بستی ویران کر دی جاتی تھی اور اس میں کسی نمایاں مقام پر ایک چراغ جلا دیا جاتا تھا۔

[1] حیات میر انیس ص ۱۳۸-۱۴۳

[2] حیات ص ۵۴۵ ، [3] آب حیات ص ۴۷۵ ، [4] حیات انیس ص ۲۵۴-۲۵۵

# مشرقی بنگال کا مسئلہ اور دانشور

آج کل جو کچھ مشرقی پاکستان میں ہو رہا ہے اس کی ہر شریف اور حساس شخص کے دل پر گہری چوٹ ہے ۔ اگر یہ اس قسم کا واقعہ ہوتا جس کو سیاست کی مروجہ زبان میں ملک کا اندرونی معاملہ کہا جاتا ہے۔ تو مغربی پاکستان کے ریڈیو اور اخباروں کا یہ کہنا ٹھیک ہوتا کہ بین الاقوامی قانون کے مطابق ہندوستان یا کسی دوسرے ملک کو اس میں دخل دینے کا حق نہیں ہے۔

لیکن مشرقی پاکستان کا معاملہ کس طرح ایک اندرونی معاملہ ہو سکتا ہے وہ تو انسانیت کا معاملہ ہے۔ شرافت کا معاملہ ہے۔ انصاف کا معاملہ ہے۔ فوجی ظلم و ستم اور بظاہر نسل کشی کو روکنے کا معاملہ ہے۔ چاہے بنگلہ دیش پاکستان کے ساتھ رہے یا نہ رہے۔ پاکستان کی فوجی حکومت کو حق نہیں پہونچتا کہ اس کے خلاف انسانیت سوز سلوک کرے۔

اس وقت ضرورت یہ ہے کہ پاکستان کے حساس اور دانشور لوگ جو قومی ضمیر کے امانت دار ہیں احتساب نفس کریں اور قومی حالات کو سختی اور غیر جانب داری کے ساتھ پرکھیں۔ سقراط نے کہا تھا کہ وہ زندگی جس کی پرکھ نہ کی جائے۔ انسان کے شایانِ شان نہیں اور قوموں کی کامرانی ناکامی کا معیار شاعر نے یہ بتایا ہے کہ

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

میں ادھر یا اُدھر کی تمام خبروں کا یقین نہیں کرتا ۔ جانتا ہوں جب جنگ شروع ہوتی ہے تو اس کا سب سے پہلا وار راست گوئی پر پڑ[تا ہے] لیکن خدا کو دیکھا نہیں تو عقل سے پہچانا ضرور ہے اور اس عقل کے ذریعہ بین الاقوامی نامہ نگاروں اور غیر ملکی باشندوں کی معرفت یہ صاف ہو گ[یا ہے] کہ بنگلہ دیش میں اس وقت امن نہیں ہے۔ قبرستان کا امن بھی نہیں۔ پا[کستان] ریڈیو کا یہ دعویٰ کہ چند شورش پسندوں کی گڑبڑ تھی جس کو فوج نے پاک کر دیا ہے اور اس کارِ خیر میں اسے تمام وطن دوستوں کی جن میں گویا د[یگر] حصوں کے لوگ شامل ہیں تائید حاصل ہے، گلے سے نہیں اترتا اگر دنیا غیر مصدقہ اور مبالغہ آمیز خبریں گشت کر رہی ہیں تو ذمہ داری کس کی ہے پاکستان کی فوجی حکومت نے تمام ملکوں کے اخباری نمائندوں کو بیک د دو گوشش نکال دیا اور از راہِ احتیاط اُن کے نوٹس تصویریں اور کیم[رے] بھی ضبط کر لئے اگر کوئی اس سے یہ نتیجہ نکالے کہ وہ ان گستاخ، غدار، ... کروڑ بنگالیوں کو ایک ایسا سبق پڑھانا چاہتی ہے جس کو وہ برسوں تک بھول سکیں لیکن اس تعلیمی تجربے کی خونی تفصیلات کو دُنیا کی نظر سے پوش[یدہ] رکھنا چاہتی ہے تو کیا یہ بہت بعید از قیاس ہوگا

ایک دن تو صدر یحییٰ خاں عوامی لیگ کے لیڈر شیخ مجیب الرحمٰن ۔ گفت و شنید کر رہے تھے اور خیال ہوتا تھا کہ جلد سمجھوتہ ہو جائے گا یا

[illegible] اپنے مغربی پاکستان کے مشیروں کے ساتھ وہاں سے تشریف لے جانے کے دن ایک تقریر نشر کی جس میں فرمایا کہ "مجیب (اور اب شیخ [illegible] سکتے) غدار ہے اور میں نے فوج کو حکم دے دیا ہے کہ وہ [illegible] بحال کرے" اور گویا بزورِ شمشیر صوبۂ بنگال میں مکمل امن قائم کر دیا [illegible] مرکزی حکومت کی زیرِ نگرانی جو انتخابات ہوئے تھے اُن میں اِس پارٹی نے تقریباً سو فیصدی ووٹ حاصل کئے تھے اور اس کے ممبر اپنے صوبے کی [illegible] نمائندگی کرتے تھے لیکن اِس پوری پارٹی کو بیک جنبشِ لب اور جنبشِ قلم خلافِ قانون قرار دے کر تمام صوبے کو فوج کے حوالے کر دیا۔ اگر مارشل لا کے احکام پہلے سے تیار نہ تھے تو قابلِ داد ہے۔ اہلکارانِ دفتر کی کارگزاری کہ چند گھنٹے کے اندر اندر مارشل لا کے شاید سو سے زیادہ احکام تیار کرکے جاری کر دیئے گئے۔ لوگوں کے خیال پر، اظہارِ خیال پر، نقل و حرکت پر، لکھنے پڑھنے پر تقریباً سانس کی آمد و شد پر اور غرض کہ دی ہوئی ہر آزادی پر سخت ترین پابندیاں لگا دی گئیں۔ تعلیم گاہیں بند کر دی گئیں۔ کیونکہ تعلیم ظلم کے خلاف بغاوت بھی سکھا سکتی ہے۔ کیا اچھا موقع تھا پاکستانی حکومت کے پاس کہ گفت و شنید کے دوران میں گزشتہ پالیسی کی غلطیوں کو ایمانداری کے ساتھ تسلیم کر لیتی (ایک دفعہ تو یادش بخیر بھٹو صاحب نے بھی ازراہِ مصلحت کہہ دیا تھا کہ بنگالیوں کے ساتھ ماضی میں زیادتی ہوئی ہے ) اور آئندہ کے لئے انصاف کی پالیسی اختیار کرتی اس طرح شاید پاکستان کی سالمیت بھی قائم رہتی اور اس خون کے غسل کی نوبت بھی نہ آتی دوستو، تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ بندوقوں اور توپوں اور ہوائی جہازوں کے ذریعے کروڑوں انسانوں کی محبت، وفاداری اور تعاون حاصل کیا گیا ہو۔ ہوسکتا ہے کہ جبر و طاقت کے ذریعے اس تحریک کو عارضی طور پر دبا دیا جائے لیکن فوجی حکومت کی اس پالیسی نے پاکستان کی سالمیت پر جو ضرب لگائی ہے۔ وہ ہندوستان کیا دنیا کے تمام ملک بھی نہیں لگا سکتے تھے۔ بنگالی تو اُردو کم جانتے ہیں اگر جانتے تو آپ کے شاعر فیض کے ان اشعار سے انہیں کس قدر تقویت ملتی۔

نثار میں تیری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے جسم و جاں بچا کے چلے
یونہی ہمیشہ اُلجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ اُن کی رسم نئی ہے نہ اپنی ریت نئی!
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ اُن کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی

اگر مغربی پاکستان کے لوگ اُن کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کا ٹھیک اندازہ لگانا چاہتے ہیں تو اس کا ایک سہل طریقہ یہ ہے کہ وہ خود کو اُن کی جگہ رکھ کر دیکھیں۔ اگر خدانخواستہ بنگالیوں کے پاس ایک باضابطہ اور مسلح فوج ہوتی اور مغربی پاکستان کے باشندے نہتے ہوتے اور اُن کی فوج اُن کے یہاں دھاوا بولتی ہزاروں بچوں کو یتیم اور ہزاروں عورتوں کو بیوہ بناتی اور خاص کر نوجوانوں اور یونیورسٹیوں کے پروفیسروں اور دانشوروں کو نشانہ بناتی تو اُن کے دل پر کیا گزرتی؟ انسانیت کے رشتے سے وہ اور اہلِ بنگال ایک ہی خدا کے بندے اور اُن میں سے بیشتر اسی خدا کے ماننے والے ہیں۔

اہلِ بنگال غالباً پاکستان میں اس نیت سے شریک ہوئے تھے کہ ایک اسلامی ملک کے آزاد شہری بنیں گے اور اپنا کلچر اور اپنی سماجی اور اقتصادی زندگی کو اپنی جینیس کے مطابق شکل دیں گے کوئی ملک بھی جو اس قسم کی جبر کی پالیسی اختیار کرے وہ قابلِ شرم ہے فرق صرف اتنا ہے کہ سیکولر حکومت ایسا کرے تو خود کو ذلیل کرتی ہے۔ اگر کوئی مذہبی ریاست خواہ وہ اسلامی ہو یا مسیحی یا اسرائیلی، ایسا کرے تو وہ اپنے مذہب کو بھی ذلیل کرتی ہے۔ ایک اسلامی حکومت ایسا کرے تو وہ اسلام کی ایک غلط تصویر دنیا کے سامنے پیش کرے گی۔ اسلام جو دینِ امن ہے جو دُنیا کے لئے پیغامِ رحمت ہے۔ جو اخوت، دوستی اور مساوات کی تبلیغ کرتا ہے جس نے قرنِ اوّل کے مسلمانوں سے کہا تھا کہ اس نے تمہارے دل میں ایک دوسرے کی الفت ڈال دی۔ اس طرح کے لوگ، جو ایک دوسرے کے دشمن تھے صبح کو بیدار ہوئے تو وہ آپس میں بھائی بھائی بن گئے۔ اسلام تو زندگی کا اس درجہ احترام کرتا ہے کہ اس نے کہا ہے کہ "جو شخص ایک آدمی کو ناحق قتل کرتا ہے وہ گویا تمام نوعِ انسان کا خون کرتا ہے اور جو ایک آدمی کی جان بچاتا ہے گویا تمام نسلِ انسانی کی جان بچاتا ہے"۔ اسلام میں تو جنگ کی اجازت ہی نہیں سوائے اس کے کہ وہ آزادیٔ ضمیر کا حق قائم رکھے یا جارحانہ حملے کی مدافعت میں کی جائے۔ اگر آپ روزِ قیامت پر یقین رکھتے ہیں۔ (جیسا میں سمجھتا ہوں ) تو اس روز جواب دہی صرف فوجی حکومت کے اراکین اور افسروں اور سپاہیوں کو نہیں کرنی ہوگی۔ بلکہ ہم آپ سب کو بھی جنہوں نے ظلم کو دیکھا اور خاموش رہے جب آپ کے مذہبی عالموں اور دانشوروں اور اربابِ اختیار و سیاست سے سوال کیا جائے گا۔ تو آپ کیا جواب دیں گے۔ کیا یہ کہیں گے کہ "بار الٰہا" ہم نے تو سیاسی اغراض سے ایسا کیا تھا، ہم نے تو اپنی سالمیت کو شمشیر کے زور سے قائم رکھنے کی کوشش کی تھی۔ میں آپ کو بشارت دیتا ہوں کہ خدا کے دربار میں کوئی عذر، کوئی دلیل قابلِ قبول

نہیں ہوتی جو انسانیت شرافت اور رحم کے ساتھ ہم آہنگ نہ ہو سکے۔ اور اگر آپ کی فوجی حکومت محض قوت اور سیاست کا کھیل کھیل رہی ہے جس میں ہزاروں بےگناہوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی ہے تو خدارا اس میں اسلام کے مقدس نام کو ہونٹوں پر نہ لائیے۔

ریڈیو پاکستان کہتا ہے کہ یہ سب شورش ہندوستانیوں نے کرائی ہے۔ غیب کا علم خدا کو ہے۔ اور نہ میں حکومت کا رازداں ہوں نہ اس کا وکیل لیکن اتنا جانتا ہوں کہ یہ خیال دانش مندی کا ثبوت نہیں تعصب کی دلیل ہے دنیا کی کوئی خارجی طاقت اس قدر زبردست قومی تحریک کو جنم نہیں دے سکتی اس کے لئے مکمل جذباتی یک جہتی کی ضرورت ہے جس کا مشرقی بنگال نے ایک بے نظیر ثبوت دیا ہے۔ اگر ان کو مرکزی حکومت کی پالیسی سے واقعتاً شدید شکائتیں نہ ہوتیں، تو لاکھوں مرد عورتیں نوجوان کس طرح اپنی جان کی بازی لگا سکتے تھے۔ اور حکومت کس منہ سے انہیں چند شورش پسند کہہ سکتی ہے میں کوئی درس اخلاق پڑھانے یا سیاسی تقریر کرنے کا آرزومند نہیں۔ صرف جذبۂ خیرخواہی سے متاثر ہوں اور اس کے تحت حق گوئی کے لئے کوشاں ہوں۔ قرآن شریف میں لکھا ہے۔ "سچ بولو — خواہ وہ خود تمہارے خلاف ہو" حق گوئی سے ملک کے اندر آزاد تنقید کا دروازہ کھلتا ہے اور اس کی سیاسی اور اخلاقی نجات کی راہیں سنورتی ہیں۔ یہ صرف ایک جمہوری راج میں ہو سکتا ہے لیکن جہاں تنقید کی آواز گھونٹ دی جاتی ہے۔ جہاں اس کو حق کی حمایت میں بلند نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں وہ جبر کے سامنے ادب سے چپ ہو جاتی ہے۔ وہاں ملک کے سچے خیرخواہوں کا فرض ہے کہ وہ خطرے کا الارم بجائیں اور وہی دراصل احتجاج کا نقطہ ہے۔ اگر اب بھی حکومت پاکستان قوت کے عریاں تصور کو سینہ سے لگانے کے بجائے انصاف اور رواداری اور انسانیت کا سہارا نہ لے گی تو سات کروڑ بندگان خدا کی قوت ارادی اور خواہش آزادی کو وہ دیر تک نہیں دبا سکتی۔ فوج کے مظالم کو نگاہِ عالم سے پوشیدہ رکھ سکتی ہے اور

زبان خنجر کو چپ کیا جا سکتا ہے لیکن لہو بھری آستین کا کیا ہوگا۔

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی)



# غزل

## سلام مچھلی شہری

امیدوں، حوصلوں، بےتاب ارمانوں کا شہزادہ
مبارک ہو کہ ہوں میں اب بھی افسانوں کا شہزادہ
خردمندانِ شہرِ زر کو حیرت بھی ہے الجھن بھی
ابھی تک جی رہا ہے کیسے، بےخانوں کا شہزادہ
وہ لمحہ غور کے قابل بھی ہے، جب بزم دانش میں
یونہی بس مسکرا دے کوئی دیوانوں کا شہزادہ
میں اُن لوگوں میں ہوں، جن کو طلاطم راس آتا ہے
ہمیشہ ہی رہا ہوں سخت طوفانوں کا شہزادہ
"مشینی دور" نے آدم کو بھی حیوان بنا ڈالا
پرستش اُس کی — جو اب بھی ہو انسانوں کا شہزادہ
خدا کے کام دیو! پتھروں میں پریم بھرنا ہے
ابھی مرنے نہ پائے آپ کے بالوں کا شہزادہ
میں کہتا ہوں، اگر کردار غربت خوبصورت ہو
تو "بن جاتا ہے" بھی بن سکتا ہے ایوانوں کا شہزادہ
بس اک افواہ تھی، پڑ با غباں" اب تک ہیں افسردہ
— بھلا گلشن میں کیوں آئے گا ویرانوں کا شہزادہ
گلابوں سے کہو لوٹے دلوں میں رقص فرما ہوں!
وگرنہ آنے ہی والا ہے، بیابانوں کا شہزادہ
سلام! اب پوچھتے ہیں مہ رخان بزم پاکستاں"
کہاں ہے،" لکھنؤ کے ان شبستانوں کا شہزادہ

# پرستان

صالحہ عابد حسین

اس سے پہلے تو زندگی اتنی بوجھل نہ تھی !!

بچے کو ایک کولہے سے دوسرے پر منتقل کرتے ہوئے بھی ننھا "پرستان" ہی کو گھورے جا رہی تھی سال بھر کا بچہ کسی طرح سنبھل ہی نہ رہا تھا۔ بار بار کھسک جاتا، بار بار وہ شلوار اور بچے دونوں کو اوپر کھسکاتی۔

سرخ اور زرد اور کاسنی پھولوں سے بھرے باغیچے کے لدے پھندے پیڑوں کے پیچھے سونے کی گول تھالی دھیرے دھیرے سرک رہی تھی —— کتنی گول، کتنی سُندر جیسے تورے نکلی گول گول سُرخ سُرخ روٹی !

پیٹ میں زور سے مروڑ اٹھی۔ کئی روز سے یہ روٹی بھی تو پیٹ بھر کر نہیں کھائی تھی۔ اس نے آسمان کی طرف نظر اٹھائی —— وہ — وہ دیکھ بھیا جیسے اپنے ساتھ بچے کا بھی دھیان بٹانا چاہتی تھی، سورج سے رنگ اور روشنی چرا کر بادلوں کے ٹکڑے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ "آج یہ سب لڑکے لڑکیاں کیا مر گئے" ؟" اس نے چاروں طرف پڑوسی بچوں کو ڈھونڈا۔ جانے وہ سب شور پر چھوکرے جو اُسے دیکھ کر آوازیں توازے کستے تھے، وہ ہم عمر لڑکیاں جو اپنے اپنے بھائی بہنوں کو گود میں لٹکائے اسی کے ساتھ باتیں ملکایا کرتی تھیں، وہ اُن کے چھوٹے بہن بھائی —— کہاں گئے یہ سب ؟ بس ایک ننھی سی سُرخ دم کی نیلی چڑیا اِدھر سے اُدھر پھدک رہی تھی —— اس کی طرح تنہا — مگر وہ اُداس نہ تھی ! کیسی چہک رہی ہے —— اس کے کولہے پر کوئی بچہ نہیں ہے نا اُسے اس خوبصورت رنگین سنہری نقش و نگار بنے جھولے پر اچکنے سے کوئی روکنے والا ہے —— سارے ارے —— وہ تو ان ریشمی گدوں اور تکیوں پر بیٹھ گئی جن سے ٹک کر وہ فیشن والی — سندر سندر چھوکریاں، اور وہ خوبصورت لونڈا اور اس کے یار دوست بیٹھ کر دھیرے دھیرے جھولا جھولتے ہیں اور پھر کبھی کالی گول بڑی سی میز یا غیچہ میں بچھ جاتی اور کیرم" —— ہاں ہاں شانو نے یہی نام تو اُسے بتایا تھا —— کھیلیں سے —— کتنا اچکیں ہیں، کتنا کودیں، قہقہے لگا دیں اور چیخیں ماریں ہیں۔ —— اور جانے وہ کیا کھیل ہے —— ؟ لمبی سی میز، بیچ میں چھوٹا سا جال اور سفید سفید گیند اور چھوٹے چھوٹے بلے ! شانو کو اس کا نام تو یاد نہیں رہا —— ٹنگ ٹانگ —— یا جانے کیا کہے تھی ! اور کیسے کیسے سندر کپڑے پہنے ہیں یہ لونڈیاں —— مگر نانی کہے ہے یہ ننگی رہو ہیں ہیں !! ننگی ! ہنہ ! ننگی تو وہ ہے —— اُس نے اپنی دس جگہ سے پھٹی اور سلی شلوار، تار تار اوڑھنی اور پیوند پڑے پھٹے جمپر پر حسرت بھری نظر ڈالی ! بڑی آئیں انھیں ننگی کہنے والی ! کیسی کیسی خوبصورت فراکیں، کیسی کیسی چمکتی پھولدار قمیض پہنے ہیں۔ وہ تو —— کیا ہوا باہیں نہیں —— ان کرتوں میں —— یا "ٹانگیں ننگی ہوں ہیں —— یہ تو سبھی میموں کا سبھی بڑے آدمیوں کا پہناوا ہے ! دادی کا کیا ہے۔ باتیں بناتی ہے۔" یہ شریف زادیوں کا پہناوا نا ہے —— نہ یہ ہرونگا پن، یہ ناچ گانا، یہ اچھل کود شریف زادیاں اور بھلے گھر کے لونڈے ریں ہے —— توبہ توبہ —— اس سے تو اپنے قصبے میں بھلے تھے —— دیکھ عزیزن —— اپنی بیٹی کو سنبھال کر رکھ —— تیرہ برس کی جوان چھوکری —— اس محلے میں بگڑ نہ جاوے ——" ماں چپ چاپ دادی کو دیکھتی . . . . سامنے لیٹے کھانستے ہوئے دادا پر نظر ڈالتی — اپنے پانچ چھوٹے چھوٹے بچوں کا دھیان کرتی اور اس مفلسی میں ککڑی کی بیل کی طرح بڑھنے والی اپنی اس بیٹی کو دیکھتی جو اس حال میں بھی غضب کا رنگ روپ نکال رہی تھی اور ٹھنڈی سانس لے کر چپ ہو جاتی ——"

" تو اسے گھر سے نکلنے نہ دیا کر۔ دادی اور جلے پر نمک چھڑکتی ۔۔ خود تو سارے دن کھوپڑی پر برقعہ کی ٹوپی ٹکائے گھر گھر پھرتی رہو ہے ۔۔ اور ہمیں گھونٹ کر مار دینا چاہے ہے !

" ماں جی ۔۔ یہ ذرا سی تو کوٹھری ہے ۔۔ اور ہم چھ سات دم ۔۔ دن میں دو چار گھنٹے بچے باہر سڑک اور میدان میں بھی نہ کھیلیں تو گھٹ کر مر نہ جادیں گے !" دبی زبان سے ماں نے کہا ۔۔ میں تو پہلے ہی نہیں چاہتی تھی۔ اپنے قصبے سے اس شہر میں آنا ۔۔ پر سبھی سر ہو گئے ۔۔ اور سب سے زیادہ تم ۔۔ کہ شہر میں چلیں، چار روپے روز مزدوری ملے گی پر آٹا کتنا مہنگا ہے ۔۔ پانی تک پیسوں سے ملے ہے ۔۔ ہوا بھی نصیب نہیں ۔۔ نمک، مرچ، دال ترکاری کو ترس ترس کر بچے رہ جاویں ہیں ۔۔ اور وہ جب سے یہاں آئے ۔ مزاج اور بھی خراب . . . . "

ماں نے رونا شروع کر دیا تھا۔ دادی بڑبڑانے لگی ۔۔ وہ چپکے سے پھر کوٹھری سے باہر نکل آئی۔

بھیا کندھے سے لگ کر سو گیا تھا۔ "پرستان" میں بڑی چہل پہل نظر آ رہی تھی ۔۔ اونچی سرخ دیوار جس پر چلے، نیلے اور گلابی پھولوں کی بیلیں چڑھی تھیں اُس کو چھپائے تھیں مگر دو سرخ سرخ بڑے بڑے پھاٹک اس کی جھلک دکھا دیتے تھے ۔۔ وہ اکثر بھیا کو لے کر پھاٹک کے سامنے سڑک کے دوسری طرف میدان میں بیٹھی یا کھڑی اُدھر تکا کرتی تھی۔

"پرستان" کے دونوں چھوٹے حسین بچے آیا کے ساتھ جھولے کے پاس کھیل رہے تھے اور ان کے ارد گرد آس پاس کی کوٹھیوں کے کئی صاف ستھرے بچے رنگ برنگے سندر سندر کپڑے پہنے ہنس کھیل رہے تھے ۔۔ اس نے سوچا ۔۔ اسی طرح کھیلنا کبھی اُس کی قسمت میں نہ تھا ؟ ہوش سنبھالتے ہی ایک نہ ایک بچہ اس نے اپنی گود یا کندھے یا کولہے پر پایا تھا ۔۔ ایک پیروں چلنے لگتا تو دوسرا اس کی جگہ آن موجود ہوتا ! مگر وہاں ۔۔ اپنے گاؤں میں یہ بات بُری نہ لگتی تھی۔ اس کی سب ہم عمر لڑکیاں اور لڑکے یونہی بھائی بہنوں کو لئے کھیلا کرتے تھے ۔۔ ان کی ہنسی اُن کی پیاری پیاری باتیں، اُن کی معصوم شرارتیں، اُن کی چہلیں ۔۔ اُسے اچھی لگا کرتی تھیں۔ سب بچے کھیلتے کودتے، شرارت کرتے، پاس گزرتی سائیکل یا تانگے پر کنکر پھینکتے، کبھی کوئی ٹرک یا لاری گزر جاتی تو دُور تک اُس کی دھول کے پیچھے بھاگتے ۔۔ اور اگر کوئی موٹر کار آ جاتی تو ۔۔ واہ وا ۔۔ سب مل کر اُسے گھیر ہی لیتے تھے ۔۔ وہ منگلو بدذات تو پتھر پھینکا کرتا تھا۔ بھاگتی کار پر ۔۔ کتنا مزا آتا تھا . . . .

مگر یہاں ۔۔ اس بڑے شہر کی یہ بڑی بڑی کوٹھیاں اور بنگلے محل نما مکان ۔۔ یہ ہزاروں موٹریں اور ٹیکسیاں اور اسکوٹر اور سائیکلیں اور یہ جھلملاتے ریشمی اور جانے کیسے کیسے رنگوں اور وضع کے کپڑے پہنے حسین لڑکیاں جن کی کمر میں سونے کی چھن چھن کرتی زنجیریں اور کھٹ کھٹ کرتے جوتے اُسے بہت ہی اچھے لگتے تھے ۔۔ اور لڑکے توبہ ۔۔ یہ لڑکے ہیں یا لونڈیاں ؟ رنگین ریشمی کرتے یا بنیان اور ایسی پھنسی پھنسی پتلونیں یا غرارے جیسے پاجامے پہنے اور غضب یہ کہ زیور بھی تو پہنے زیور : اپنے قصبے کے لالہ جی کے کانوں میں مندریاں تو دیکھی تھیں اور بڑی کے رائے صاحب کے لڑکے کے گلے میں سونے کا کنٹھا بھی مگر یہ عورتوں سے زیور، انگوٹھیاں اور ہار ۔۔ بس اُسے تو پرستان کا "شہزادہ" لگتا تھا۔ عمر میں شاید اس سے دو ایک سال چھوٹا ہی ہوگا ۔۔ کیسا بھولا چہرہ ہے اس کا ۔۔ مگر ماشاء اللہ سے ۔۔ اتنا موٹا تازہ، اتنا لال لال دن بھر کھاتا بھی تو رہتا ہے۔ سیب، کیلے اور انگور اور مٹھائی اور کیک اور نہ جانے کیا اور کیا ۔۔ مگر کبھی ان لڑکیوں اور دوسرے لونڈوں کی طرح بد دماغ تو نہیں ہے ۔۔ وہ جب بھی سڑک پر سے گزرتا اس کو اور اس کے بھائی بہنوں کو بائی بائی یا ہاؤ ہاؤ یا کچھ اور کہہ کر ضرور مسکرا دیتا ۔۔ کتنے کھلونے تھے اس کے پاس۔ بندوق اور تیر کمان، اور سائیکل، ہوائی جہاز اور ریل گاڑی اور کتنی اور چیزیں۔ کبھی کبھی وہ اپنی لمبی لمبی ٹانگوں پر اچک کر دیوار پر بیٹھ جاتا اور وہاں کھڑے بچوں کو زور سے "ہاؤ" کر کے ڈرا دیتا ۔۔ مگر اُسے دیکھ کر ہمیشہ پوچھتا تھا ۔۔ اے لڑکی ۔۔ اے بیوٹی فل گرل ۔۔ یہ بچہ ۔۔ یہ تمہارا بچہ ۔۔؟

وہ شرما جاتی ۔۔ " توبہ توبہ " ۔۔ یہ تو میرا بھیا ہے"

" بھیا ہے ؟ تو اسے آیا کیوں نہیں رکھتی ۔۔ آؤ تم میرے ساتھ کھیلو "

" آیا ۔۔ آیا کون ؟ "

وہ حیران ہو کر پوچھتی ہے وہ خود بھی حیران سا ہو جاتا ہے "آیا ۔ آیا ہے اور کون" اور دھم سے دیوار پر سے سڑک پر کود پڑتا ۔۔ کتنی کتنی پیاری ہو تم لڑکی ۔۔ بیوٹی فل ۔۔" وہ شوخ نظروں سے اُسے دیکھتا۔ وہ گھبرا جاتی ہے ۔۔ شرما جاتی ہے اور عین اس وقت کسی لمبے تڑنگے گورے جوان آدمی کا چہرہ دیوار پر ابھرتا ہے "پرنس، ڈارلنگ ۔۔ وہیر آر یو ۔ کم اِن ۔۔" اور اُسے پاس کھڑا دیکھ کر یہ محبت و مسرت بھرا چہرہ ایک سرخ اور خوفناک ہو جاتا ہے "کم اِن کم اِن ۔۔ وہاں کہاں کھڑے ہو

[illegible] لڑکے لڑکیوں کے ساتھ کھیلنا . . . !"

مگر شہزادہ " اپنے ابا کی بات مانتا ہی کب تھا ــــ جب [illegible] پھاٹک کے پاس آکر، کبھی دیوار پر چڑھ کر کبھی نظر بچا کر اپنی [illegible] سائیکل سڑک پر لا کر اس سے اور دوسرے لڑکے لڑکیوں سے [illegible] لگا تھا: "کتنا پیارا ہے یہ لڑکا ــ جیسے شہزادہ ہو ــ" ایک دن اس نے کہا تھا اور شانو نے بتایا تھا اس کا انگریزی نام جو ہے اس کا مطلب شہزادہ ہی ہے مگر شہزادہ کا چھوٹا بھائی اور ممی بہن اور بڑی آپا ــ اور وہ سب تو بڑے ہی بد دماغ تھے ــ بات بے بات ان لوگوں پر غراتے ــ سڑک پر کھڑا ہونا مشکل تھا ــ ایک دن تو اس کے بھیا کو غصہ آگیا: "سڑک تمہارے باپ کی ہے کیا ــ ہم تو ضرور کھیلیں گے ــ" وہ اُسے گھسیٹتی رہی ــ مگر بھلا جگنو کس کے قابو میں آنے والا تھا ــ بڑی اچھل کود مچائی اس گھر کے بچوں نے جانے انگریزی میں کیا کیا کہا ــ جگنو نے اپنی دیسی زبان میں خوب گالیاں بکیں اور پھر کئی آدمی اڑوس پڑوس سے نکل آئے ۔ بابو نے جگنو کے دو چپت مارے ماں نے اُسے برا بھلا کہا اور کئی دن تک وہ لوگ ادھر آنے کی ہمت نہ کر سکے ۔

اصل میں جگنو سے سب یوں بھی تو جلے ہوئے تھے کہ وہ غلیل سے اُن کے باغ کی چڑیاں مار گراتا تھا اور اپنے ایک پتنگ سے ان کے دس پتنگ کاٹ چکا تھا ــ اور جب شہزادہ اور چھوٹا لڑکا چیخا چلایا تو اُن کے نوکر نے سمجھایا " صاحب یہ تو قاعدہ ہے ــ کوئی بھی کسی کی پتنگ کاٹ سکتا ہے ــ آپ بھی کاٹ لیجیے گا اُن کی پتنگ !"

وہ پھر خیالوں میں کھو گئی تھی مگر گود کے بچے کی ٹیں ٹیں نے اُسے چونکا دیا ــ جب بھی وہ کچھ اچھی اچھی باتیں سوچنے لگتی ہے یہ منحوس رونا چلانا شروع کر دیتا ہے ــ اس نے بھیا کو کندھے سے لگایا اور پھاٹک میں سے اندر کی طرف جھانکا !

سبز سبز لان پر لال، پیلی، نیلی اور سبز کرسیاں اور میزیں بچھی تھیں ۔ ریشمی اور بنارسی ساڑھیاں پہنے عورتیں ان پر بیٹھی تھیں، مرد سوٹ اور اچکن پہنے ہنس رہے تھے ــ اِن میں شہزادے کی ممی، ڈیڈی، بہنیں اور اُن کی سہیلیاں اور بہت سے لڑکے بھی تھے ۔ ہائے اللہ ــ کتنا شور مچاتے ہیں یہ ـ باجے پر ریکارڈ چڑھا رکھا تھا اور کئی لڑکے لڑکیاں ناچ رہے تھے ــ توبہ ــ ناچ رہے ہیں کہ بندر اچک رہے ہیں ــ کبھی اکیلے اکیلے کودتے کبھی ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیتے کبھی ایک دوسرے کو چپٹا لیتے ــ اس کا منہ سرخ ہوگیا ــ جو کہیں دادی دیکھ لیتی تو مار ہی ڈالتی ۔ اس نے گھبرا کر رخ بدلا ــ

ــ اب سب عورتیں اور مرد ایک میز کے پاس جمع ہو گئے تھے ۔ ــ کیسے سندر سندر برتن ہیں یہ ــ اور کھانے کی کتنی بہت سی چیزیں میز پر لگی ہیں ــ یہ بیچ میں بڑا سا مکان سا کیا بنا ہے جس پر موم بتیاں جل رہی ہیں ــ ہاں ہاں ــ شانو نے بتایا تھا نا ــ کہ سالگرہ کا کیک بننے والا ہے جس پر موم بتیاں جلیں گی اور چھوٹی بی بی اُسے پھونک سے بجھا دیں گی ــ ہاں ــ یہ دیکھو وہ سب تالیاں بجا رہے ہیں ــ اور کچھ گا رہے ہیں ــ کیا گا رہے ہیں ؟ سمجھ میں نہیں آ رہا وہی انگریزی گانا ہوگا اور کیا ــ اپنے یاں تو ڈھولک پر ایسے سندر سندر گیت گائے جاتے ہیں ۔

اُس نے پھر اندر جھانکا ــ سب کی پلیٹوں میں کھانے کی چیزیں بھری ہوئی تھیں ۔ پوریاں اور کباب اور مٹھائی اور پکوڑے اور جانے کیا اور کیا ــ بیرے سب کے پاس اور چیزیں لے کر جا رہے ہیں اور وہ انکار کر رہے ہیں ۔ ــ وہ ہوتی تو ــ وہ ہوتی تو ــ پیٹ میں زور سے آگ کا گولہ اٹھا ــ آج دوپہر پیاز کی ڈلی اور چٹنی کے ساتھ ایک ہی روٹی تو کھائی تھی ــ آٹا ختم ہوگیا تھا . . . بابو کو مزدوری نہ ملی تھی ــ راشن کے لئے قرضہ بھی تو نہ ملا تھا ــ

ایک لڑکے نے کتے کو دو کباب ڈالے جو وہ گرنے سے پہلے ہی ہڑپ کر گیا ایک عورت نے بلی کو کچھ دیا اور وہ لپ لپ کھانے لگی ۔

شہزادہ کے چھوٹے بھیا کے ہاتھ سے پلیٹ گر گئی ۔ وہ رونے لگا ۔

" کوئی بات نہیں ڈارلنگ ــ کوئی بات نہیں ۔ ــ بیرا اور پلیٹ لاؤ بابا کے لئے ــ اور یہ صاف کر دو سب ۔"

" ارے ہے قالین خراب ہوگیا " موٹی چھوٹی کالی آیا نے کہا

" ہوگیا تو ہوگیا بلا سے ــ کیا میرے بچے سے زیادہ ہے " ممی نے بدمزاجی سے کہا ــ

جانے منہ میں یہ اتنا پانی کہاں سے بھر آیا ــ اور پیٹ میں مروڑ سی کیوں اٹھ رہی ہے ؟

اس نے پیٹھ موڑ لی ــ اگر کہیں دادی سن لے ؟ ہائے اللہ ندیدہ پن ــ کتنی بری بات ہے ــ جس دن اُن کے گھر روٹی نہیں پکتی اس دن تو ماں گھر سے چھوٹے بچوں کو بھی نکلنے نہیں دیتی ۔

" اے لڑکی یہاں کیوں کھڑی ہے ؟" مالی نے جھڑکا

" کھڑے ہیں ــ تم سے مطلب ــ سڑک ہے ــ سب کھڑے ہوتے ہیں" اُس نے گھور کر کہا ــ مگر پھر آہستہ سے کھسک کر شانو کی ماں

کے کوارٹر میں گھس گئی۔ شانو کا باپ "محل" میں باورچی تھا اس لیے تو شانو، زیبو اور شریف ان کے ہاں بے تکلف آتے جاتے تھے!

"کیا پکا رہی ہو خالہ" چولہے پر دھری ہنڈیا کھولی۔

"ارہر کی دال ہے بیٹی" شانو کی ماں نے روٹیاں سینکتے ہوئے کہا۔ "لے کھا لے ذرا سی"

وہ کبھی کسی کے ہاں کھاتی نہ تھی مگر اس وقت اس کے اصرار کے سامنے دو نوالے اُسے کھانے ہی پڑے۔ "ہائے خالہ کتنی مزے کی دال ہے" اُس نے تعریف کی۔

"خالہ۔ شانو، زیبو سب کہاں گئیں۔ خالہ کا گھر ہمیشہ اپنے اور پڑوس کے بچّوں سے بھرا رہتا تھا۔ یہ آج خالی خالی کیوں ہے؟

"چھوٹے بچّوں کو اُن کا چاچا لے گیا ہے — اور شانو اور زیبو — صاحب کے ہاں تماشا دیکھنے گئی ہیں۔"

"تم نہیں جاتیں خالہ تماشا دیکھنے؟"

"نا بچی — مجھے کہاں فرصت —"

اس کا دل مچل اُٹھا — سب جاتے ہیں سب دیکھتے ہیں۔ شانو، زیبو، شریف — اور یہ ساری گٹ پٹ کرنے والی لڑکیاں .... پھر وہ کیوں نہیں جا سکتی؟ مگر ماں خفا ہو گی، پھر دادی نے کئی بار سمجھایا تھا "بیٹی اپنی عزت اپنے ہاتھ — ان امیروں رئیسوں سے بچ کر رہنا چاہئے — جانے کب جھڑک دیں۔ ڈانٹ دیں — پھر ہم غریب لوگ ہمارا ان کا کیا مقابلہ؟

"شانو اور زیبو جو جاتی ہیں۔" اس نے روہانسی ہو کر کہا تھا۔

"بھاڑ میں ڈال انہیں — وہ تو ان کی باورچی کی لڑکیاں ہیں — پھر دیکھا نہیں کیسی بگڑتی جا رہی ہیں اُترن سترن پہن کر — منہ ٹیڑھا کر کے بولنے لگی ہیں، اللہ ماریاں — ایک دن ماں سر پہ ہاتھ رکھ کے رووے گی —" اور دادی نے اپنا راگ شروع کر دیا تھا۔

ہُنھ یہ نانی دادیاں —

وہ باہر نکلی تو سڑک سنسان پڑی تھی صرف پرلی کوٹھی کا نوکر لڑکا کھڑا تھا۔

"آج سب کہاں گئے جمیل؟"

"وہی بنگلہ میں تماشہ دیکھنے ٹی۔ وی کا —"

"کیسا ہو ہے؟"

"بس جیسا سینما کا تماشہ — ہم نے تو شہر میں دیکھا تھا —"

"ہم نے سینما بھی نہیں دیکھا — باولے میں فلم بھی نہیں دیکھا —" ہو کر اُس نے کہا اور روتے بھیا کو زمین پر بٹھا دیا اس سے اور لڑکا دوسری طرف جا چکا تھا۔ اُس نے پھاٹک پر سے جھک کر دیکھا — نیلی اور پیلی اور سنہری روشنی لان پر پڑ رہی تھی اور بہت سے رنگ برنگی پتلونیں، بل بوٹم۔ جھلملاتے فراک، رنگین چھپے ہوئے کرتے، "پرستان" میں جا رہی تھیں۔ سب جاتے ہیں — تو وہ کیوں نہیں جا سکتی — مگر . . . اُس نے گھبرا کر خود پر نظر ڈالی۔ شاید اس لیے کہ اس کی شلوار جس میں کئی پیوند لگے ہیں۔ کرتا پھٹا ہوا ہے اور دوپٹہ کا رنگ کچھ ایسا ہے کہ کوئی بھی پتہ نہیں چلا سکتی — اس کے سنہری بکھرے بال پھٹے دوپٹے سے جھانک رہے تھے — ہُنھ!

بچہ بلک کر رویا — ایک کتّا اس کا پاؤں چاٹ رہا تھا — لپک کر گود میں اُٹھایا — اور پھر یہ روتا بسورتا بھیا — بھلا مجھے کون گھسنے دے! اس نے پھاٹک پر سر ٹیک دیا۔

پرلی سڑک کے اُدھر ایک چھوٹے سے گھر میں رہنے والی خالہ بی جن سے وہ قرآن پڑھنے جاتی تھی اس طرف آ رہی تھیں — "کیا ہے گلابو" ؟ نام تو جمّو تھا مگر خالہ بی اُسے گلابو کہتی تھیں۔ "بالکل گلاب کا سا رنگ ہے اس بچی کا — اور آنکھیں جیسے جھیل کے کنول — بڑی ہو کر نور جہاں نکلے گی —" انہوں نے اپنی سہیلی سے کہا تھا۔

"رو کیوں رہی ہے۔ ٹی۔ وی دیکھنا چاہتی ہے؟" اس نے جلدی جلدی گردن ہلائی۔ اندر سے آنے والی چھم چھم کی آوازیں دل چھینے لے رہی تھیں۔

"آ جا میرے ساتھ — آج میں بھی جا رہی ہوں —" اور وہ ان کے ساتھ یوں کھنچی چلی گئی جیسے لوہا مقناطیس کے ساتھ — لان اور باغیچہ پار کر کے بڑے سے برآمدے میں ایک بہت بڑا سا ریڈیو رکھا تھا — مگر اس کے بیچ میں کپڑا نہ تھا — اس میں سے روشنی اور آوازوں کی پھواریں سی نکل رہی تھیں — سامنے فرش پر بہت سے بچے اور لڑکے اور لڑکیاں بیٹھے تھے۔ بڑے سب باہر کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ خالہ بی اُدھر چلی گئیں اور وہ چپکے سے فرش کے ایک کونے میں ٹک گئی۔ کیسا گدگدا فرش ہے بچے ہنس رہے تھے، شرارتیں کر رہے تھے۔ اچھل کود رہے تھے۔ لڑکیاں قہقہے لگا رہی تھیں — وہ پیچھے مڑ کر بڑے آدمیوں کو دیکھ لیتی، کبھی ان لڑکے لڑکیوں کو جو تماشہ دیکھ رہے تھے اور چیخ چلا زیادہ رہے تھے۔ کئی بار اس کی نظر "پرستان" کے شہزادے کی طرف اُٹھ گئی جو ادھر اُدھر بھاگتا دوڑتا، کھاتا پیتا، لڑکیو

پرستان لوگوں سے جگمگاتا پھر رہا تھا — مگر اس کے ہونٹوں کی مدھر مسکراہٹ اس کے حلق میں اترتی چلی جاتی تھی ۔ مگر یہ کیا بات ہے — اسے کوئی کچھ نہیں کہتا۔ سب چپ رہتے ہیں ۔ وہ یا چھوٹا بھیا شرارت کریں تو ماں یا بابو مارنے لگتے ہیں۔

پھر یہیں اس کی توجہ ریڈیو نے کھینچ لی ۔ ایک بڑی سندر لڑکی ، خوبصورت کپڑے پہنے ایک پیڑ کی ڈال پکڑے گا رہی ہے ۔ ایک لمبا سا لڑکا چھنسی چھنسی پتلون اور اونچا اونچا بنیان پہنے درخت کے آس پاس گھوم گھوم کر اسی کی آواز میں آواز ملا رہا تھا جانے کب وہ فرش کے سرے سے اٹھ کر بچوں کے بیچ میں جا بیٹھی جانے کب وہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ ہنسنے لگی . . . . وہ تو سب کچھ بھول گئی تھی ۔ اپنے گوگو دکے بھیا کو ، ارد گرد کے ان شاندار لوگوں — سندر شہزادے اور پرستان کو — اور پیٹ میں اٹھتی آگ کو . . . .

" ارے رے — یہ کیا ہے — کیا ہے بھئی "

" کون بچہ رو رہا ہے "

" نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا —"

" آخر یہ ہے کون کم بخت "

آوازیں کان میں آتی رہیں مگر وہ اپنی جنت میں گم تھی ۔

ایک کالی ، موٹی ، چھوٹی ، عورت نے اسے جھنجھوڑ ڈالا — ارے چھوکری — کون ہے تو ۔

" اے ہے بیگم صاحب جانے کون باولی سی چھوکری ہے —"

" آپا جی — یہ میرے ساتھ آئی ہے — " پیچھے سے خالہ بی کی آواز سنائی دی —

" جو ہے وہ منہ اٹھائے چلا آتا ہے ۔ جانے کیا کیا انفکشن ساتھ لاتے ہیں یہ گلی کوچوں کے بچے " ایک بھاری مردانی آواز کان میں آئی :

" اے ہے غضب — اس موئے چھوکرے نے قالین پر موت دیا ۔

" آخر یہ ہے کون — ؟ "

" گٹ آؤٹ — یو ڈرٹی تھنگ "

وہ آسمان سے زمین پر آپڑی — بھیا اس کی گود سے قالین پر پڑا تھا اور ایک گول گیلا نشان اس کے جرم کو افشاں کر رہا تھا — اس نے گھبرا کر بچے کو گود میں اٹھا لیا !

کون ہے — کہاں سے آئی ہے ؟ بیگم صاحبہ نے سب کو کھلی چھوٹ دیدی — چلو — نکلو باہر — بھانت بھانت کی آوازیں اس کے کانوں میں آرہی تھیں —

" پڑوس کی کوئی بچی ہوگی " ایک مہربان سی آواز سنائی دی ۔

" پڑوس میں تو ہزاروں بچے ہیں — فیملی پلاننگ کے باوجود —" کسی نے طنز کیا " کیا سب یہاں آکر موذ پریشان کیا کریں گے ؟ "

" اے ہے یہ مائیں جن جن کر چھوڑ دیتی ہیں ۔ انہیں فکر ہی کیا ہوتی ہے " موٹی آپا کی زبان چلے جا رہی تھی ۔

لڑکیاں قہقہے لگا رہی تھیں ۔ لڑکے سیٹیاں بجا بجا کر کچھ کہہ رہے تھے ۔ عین اس وقت کہیں سے " شہزادہ " اس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا " اوہ بیوٹی — کیسی بگی پکچر — ؟

مگر اس نے جواب نہ دیا ۔ اس کی آنکھیں دھندلا چکی تھیں ۔ اور وہ اندھا دھند سب کو الانگتی پھلانگتی باہر کی طرف دوڑ رہی تھی — پیچھے سے خالہ بی پکار رہی تھیں ۔ گلابو — اری گلابو — ذرا ٹھہر تو بچی —" مگر اس نے کچھ نہیں سنا — گلاب کی جھاڑیوں سے الجھتی ، نرم کیاریوں میں گرتی وہ پھاٹک کے باہر جا چکی تھی ۔

گھر میں گھستی تو ماں کی گالیاں سواگت کو موجود تھیں !

اس نے بھیا کو جھلنگے پلنگ پر دے مارا اور زمین پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ۔

دس دن تک وہ بخار میں پھنکتی رہی ۔ غفلت میں اول فول بکتی رہی — پرستان شہزادہ ۔ ریڈیو — سیب ، مٹھائی — خالہ بی — منا — مر جانے منا بھیا — جاؤ — جاؤ — نکل جاؤ — کہاں سے آکر مر جاتے ہیں یہ لوگ گٹ آؤٹ ، گٹ آؤٹ . . . . ڈرٹی تھنگ . . . .

ماں رو رو کر دعائیں مانگتی رہی ، باپ قرض لے کر علاج کرتا رہا ، خالہ بی اس کے لئے دودھ اور پھل بھیجتی اور دعائیں دم کرتی رہیں ۔ اور منا بھیا اپنی ننھی سی ماں کے لئے پھڑکتا رہا . . . .

اور کوٹھیوں کی چہل پہل بدستور رہی !

بنگلوں میں دعوتیں ہوتی رہیں ۔

پرنس سائیکل اڑاتا ، کرکٹ کھیلتا رہا ۔

شہزادیاں پنگ پونگ کھیلتی اور ڈانس کرتی رہیں ۔

ریڈیو بجتے رہے :

ٹی ۔ وی دیکھے جاتے رہے ۔

پکوان اور پلاؤ پکتے رہے ۔

شیشے چھلکتے رہے ۔

گلاس ٹکراتے رہے !

اور وہ بخار میں جلتی بڑبڑاتی رہی ۔ ان دیکھے پرستان کے خواب —

دیکھ رہی ہے —

اور آج وہ اپنے باپو اور بڑے بھیا اور چھوٹی بہنو کے ساتھ سچ مچ کے پرستان کی سیر کرکے آئی تھی۔

باپو نے بیماری میں اُس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اُسے فلم دکھائے گا اور جب وہ ٹکٹ لایا تو دادی نے بہت صلواتیں سنائیں، ماں روئی پیٹی کہ دو وقت کی روٹی چلے اتنے روپوں میں — مگر باپو نے بیار بچی سے وعدہ کیا تھا — ضرور پورا کرے گا —

اور تین گھنٹے وہ سچ مچ کے پرستان کی سیر کرتی رہی تھی۔

اتنے سندر گھر، ایسی خوبصورت عورتیں اور مرد، اتنے جھلملاتے کپڑے اور زیور ایسے پیارے پیارے بچے، اتنے بہت سے میٹھے میٹھے گانے اور دیہاتی ناچ — اور پھر پھول لدا باغ، سبز سبز پہاڑ اور سفید سفید برف، بڑی بڑی موٹریں — اور وہ دولہا، دولہن — اور وہ پھولوں سے لدا چھپر کھٹ — اور وہ شہزادہ . . . .

وہ آپ ہی آپ شرما گئی تھی اُسے دیکھ کر :

واپس آئی تو نہ روکھی روٹی بری لگی جو ماں نے غصے میں پکا کر رکھی تھی اور نہ تنگ کوٹھری میں دم گھٹا نہ بھائی بہنوں کی چیں چیں نہ ماں کی گھڑکیاں —

صبح وہ پھر بھیا کو گود میں لئے کوٹھی کے پھاٹک کے سامنے کھڑی تھی :

شانو اور زیبو اُسے رحم بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

اس کے سر کے سنہری لمبے لمبے بال بکھر گئے تھے۔ آنکھوں کے نیچے گہرے سیاہ گڑھے پڑ گئے تھے۔ گلابی رنگ سنولا گیا تھا — اور ہاتھ پاؤں سوکھی لکڑی جیسے ہو گئے تھے۔

پرستان میں آج بھی لڑکے لڑکیاں ٹی۔وی دیکھنے جا رہے تھے۔ مگر اس نے نظر اٹھا کر نہیں دیکھا —

اور پھر اچانک شہزادہ سامنے آگیا — ہنہ — نقل شہزادہ !

" ارے ہے — تم — تم — ؟ " وہ حیران ہو کر اُسے دیکھ رہا تھا۔

" تم — وہ ہونا — جس کے بچے نے — پیشاب کر دیا تھا — " اس نے منہ پھیر لیا۔

" مگر — وہ — وہ تو بڑی پریٹی — بیوٹی فل تھی — اے گنجی کالی لڑکی ! وہ خوبصورت لڑکی کہاں ہے " اس نے چڑایا !

" تمہیں کیا مطلب ! "

" آج آؤ گی فلم دیکھنے ہمارے ہاں " اس نے ... کہا

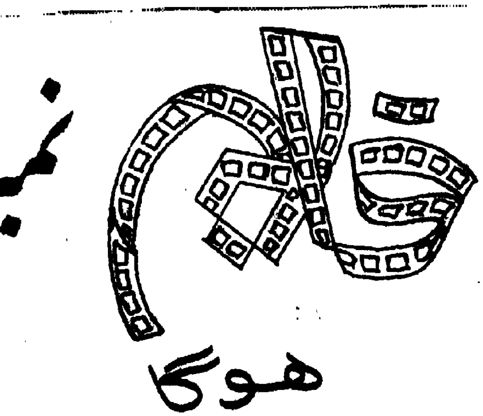
" ہنہ — کیا دھرا ہے تمہارے گندے ریڈیو — میں — ... لونڈیاں، ذرا ذرا سی موٹریں — ہم خود اپنے باپو کے ساتھ دیکھ آئے ہیں — اب ہم روز پکچر دیکھا کریں گے — پرستان کی " اس نے منہ چڑھا کر انگوٹھا دکھایا اور پیٹھ موڑ کر چل دی !

" پرنس — ڈارلنگ — وہیر آر — یو — ادھر آؤ — کہاں کھڑے ہو — "

" نہیں نہیں ڈیڈی — ہم تو — اس گنجی کالی لڑکی کے ساتھ پکچر دیکھیں گے " شہزادے نے بچوں کی طرح مچل کر کہا۔ وہ اپنی کوٹھری جاتے جاتے ہنس پڑی۔ اس کی آنکھوں میں ایک نئی چمک، ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی : ننھا بھیا جھٹکے پر پڑا رو رہا تھا۔ اُس نے اُسے گود میں اُٹھایا اور اپنے برگِ گل سے ہونٹ اُس کی چاند ایسی پیشانی پر رکھ دیئے۔

---

آج کل کا اگست ...




اس خصوصی شمارے میں ہندوستانی فلمی صنعت کے تمام پہلوؤں کا مکمل اور بھرپور جائزہ شامل ہوگا۔ مشہور فلمی ناقدین کے علاوہ فلمی صنعت کے ممتاز افراد کے مضامین بھی شامل ہوں گے۔ ضخامت، متعدد تصاویر، خوبصورت سرورق اور آفسیٹ کی طباعت کے باوجود قیمت ایک روپیہ ہوگی اور سالانہ خریداروں سے زائد قیمت نہیں لی جائے گی

" آج کل " کے سابقہ نمبروں کی طرح یہ شمارہ بھی آپ کو بے حد پسند آئے گا۔

# کچھ اسد اور غالب تخلص کے بارے میں

——— عابد پشاوری

جناب اکبر علی خاں عرشی زادہ نے دیوانِ غالب نسخۂ عرشی زادہ میں استدلال کیا ہے کہ مرزا غالب نے ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۶ء میں اسد تخلص ترک کر کے غالب تخلص اختیار کیا ان کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے کہ مرزا نے ۱۲۳۱ھ میں یکے بعد دیگرے دو مہریں نقش کرائیں۔ ایک پر:

اسد اللہ خاں عرف میرزا نوشہ ۱۲۳۱ھ

اور دوسری پر: ——— اسد اللہ الغالب ۱۲۳۱ھ

گویا ہوا ایک ہی سنہ میں دو مختلف مہریں نقش کرانے کا جواز ہونا چاہئے۔ ایک وجہ اس عمل کی یہ ہو سکتی ہے کہ پہلی مہر گم ہو گئی ہو اور نئی مہر کی ضرورت پیش آئی ہو۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ صاحب مہر کو کسی بھی ضرورت سے پہلی مہر کی عبارت میں کوئی ترمیم منظور ہو۔ لے پہلی وجہ اس لئے درست نہیں کہ ان کے قول کے مطابق پہلی مہر غالب کے پاس ۲۸ جمادی الاول ۱۲۳۹ھ تک بہرحال موجود تھی۔" اب دوسری صورت باقی رہ جاتی ہے کہ غالب کو عبارت میں ترمیم کرنا تھی۔ اس ترمیم کی وجہ یہ تھی کہ ۱۲۳۱ھ کی کسی تاریخ کو انہوں نے غالب تخلص اختیار کیا تو باتخلص مہر نقش کرانے کا بھی خیال آیا۔" لے اس بحث سے یہ نتیجہ نکلا کہ مرزا غالب نے ۱۲۳۱ھ میں کسی وقت بجائے اسد، غالب تخلص اختیار کیا۔

جناب مالک رام نے اس غلط فہمی پر ان الفاظ میں اظہار خیال کیا ہے۔

" غالب نے ۱۲۳۱ھ میں دو مہریں تیار کروائی تھیں۔ اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ اور اسد اللہ الغالب۔ بعض لوگوں نے استدلال کیا ہے کہ اسد اللہ الغالب مہر سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے اس سال (۱۲۳۱ھ میں) غالب تخلص اختیار کیا۔ حالانکہ نہ اُن کا نام اسد اللہ تھا اور نہ تخلص الغالب۔ صحیح بات یہ ہے کہ اس مہر میں لفظ غالب بطورِ تخلص استعمال ہی نہیں ہوا، بلکہ یہ مہر انہوں نے بطور سجع تیار کروائی تھی۔ دراصل اسد اللہ الغالب، لقب ہے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا۔ چونکہ میرزا کا نام اسد اللہ خاں تھا، اور وہ عقیدے کے لحاظ سے شیعی تھے، اس لئے انہوں نے یہ سجع والی مہر بنوا کر گویا حضرت علی سے اپنی عقیدت کا اعلان بھی کر دیا۔ غرض اس مہر سے یہ استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ ۱۲۳۱ھ میں انہوں نے غالب تخلص اختیار کر لیا تھا۔" ٹہ

مالک رام کی پوری بحث دیکھنے سے نتیجہ نکلتا ہے کہ میرزا نے غالب تخلص سنہ ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۶ء کے بعد اور ۱۲۳۷ھ/۱۸۲۱ء (تاریخ کتابت نسخہ بھوپال) سے پہلے اختیار کیا۔ لیکن اس ضمن میں عیار الشعراء مولفہ خوب چند ذکا دہلوی کے بیان سے کچھ شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ ذکا کا بیان ہے۔

" مرزا اسد اللہ عرف مرزا نوشہ المتخلص بہ غالب ولد مرزا عبد اللہ عرف مرزا دولہ نبیرۂ غلام حسین خاں کمیدان، ساکن بلدۂ اکبرآباد۔ شاگرد مولوی معظم، شاعر ہندی و فارسی:

اس بیان میں تین باتیں غور طلب ہیں (۱) مرزا کا تخلص غالب ہے (۲) وہ اکبرآباد (آگرہ) میں مقیم ہیں اور (۳) وہ مولوی معظم کے شاگرد تھے۔ لے سے گمان ہوتا ہے کہ مرزا نے عام درسیات کے علاوہ مولوی معظم سے شعر میں بھی اصلاح لی ہو۔ نیز ذکا کا بیان سرور سے مقدم ٹھہرتا ہے۔ اس لحاظ سے پہلا تذکرہ ذکا کا ہے جس میں غالب کا ذکر آیا ہے نہ کہ سرور کا تذکرہ جیسا کہ اکبر علی خاں صاحب نے نسخۂ عرشی زادہ میں لکھا ہے۔ خوب چند ذکا، دہلی کے رہنے والے تھے اور مرزا کے معاصر بھی۔ اس لئے ان کی

---

لہ ٹہ: نسخۂ عرشی زادہ مرتبہ اکبر علی خاں، مباحث ص ۱۵-۱۶

ٹہ گل رعنا مرتبہ مالک رام مقدمہ ص ۳۵

جیسا کہ وہ اطلاع پر مبنی ہے۔ کہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں جب ذکا نے غالب کا ذکر درج کیا وہ آگرے میں مقیم تھے جس کا مطلب یہ ہے کہ قیام آگرہ کے دوران ہی مرزا نہ صرف غالب تخلص اختیار کر چکے تھے بلکہ یہ تخلص اس قدر مشہور بھی ہو چکا تھا کہ تذکرہ نگار ان کا ذکر اسد کے بجائے غالب کے نام کے تحت کرتا ہے۔

جہاں تک مجھے معلوم ہو سکا ہے، عیار الشعراء کا ایک قلمی نسخہ انڈیا آفس لندن میں ہے اور دوسرا انجمن ترقی اردو، علی گڑھ کے کتب خانے میں۔ اس تذکرے کے تالیف کے زمانے سے متعلق محققوں کو اول تو اطلاع نہیں اور اگر ہے تو وہ غلط ہے پروفیسر محمود شیرانی مرحوم مجموعہ نغز کے مقدمے میں لکھتے ہیں "... عیار الشعراء از خوب چند ذکا ... جو ۱۲۰۸ھ یا ۱۲۱۳ھ میں شروع ہوا اور مولف برابر تیس سال تک اس میں اضافہ کرتا رہا۔ آخری تاریخ ۱۲۴۷ھ بتائی جاتی ہے۔ اس تصنیف میں پندرہ سو شاعروں کا ذکر ہے اور ایک ہزار صفحات ہیں۔"[1]

اس بیان میں کئی باتیں محل نظر ہیں۔ عیار الشعراء پروفیسر شیرانی مرحوم کی نظر سے نہیں گزرا۔ اس میں نہ پندرہ۱۵۰۰ سو شاعروں کا ذکر ہے، نہ ایک ہزار صفحات جن کا ۱۲۰۸ یا ۱۲۱۳ھ میں درست نہیں۔ شیرانی مرحوم کا بیان اسپرنگر سے ماخوذ ہے اور اسپرنگر کی معلومات کا ماخذ گارساں دتاسی ہے۔ گارساں دتاسی نے اس کی تالیف کے بارے میں لکھا ہے :-

"ذکا نے اپنا تذکرہ بہ زبانِ فارسی ۱۲۴۷ھ/۲-۱۸۳۱ء یا ۱۲۰۸ھ/۱۷۹۳ء سے لے کر ۱۲۴۷ھ/۱۸۳۱ء کے درمیان مرتب کیا۔"

یہ بیان واضح نہیں ہے خود دتاسی اس ضمن میں مشکوک معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے بیان میں کوئی قطعی تاریخ نہیں دی۔ چنانچہ فرمان فتح پوری نے نگار "تذکروں کا تذکرہ نمبر" میں لکھا ہے کہ:

"ذکا نے عیار الشعراء کے دیباچے میں اس کے لکھنے کا سال خود اس طور پر بیان کر دیا ہے :-

تاریخ تذکرہ کہ بدیہہ خاطر گزشتہ ر ) نیز درج نمودہ باللہ التوفیق

اے ذکا، ہو چکا جس روز یہ نسخہ تیار

آگے ہاتف کے کیا پیرِ خرد نے مذکور

منصفی کر کے وہیں اس نے (اونے) یہ تاریخ کہی

آفریں کہہ کر کیا اسم سبھوں کا مشہور

چوتھے مصرع سے اس کا سال تصنیف یا تکمیل ۱۲۱۳ھ نکلتا ہے۔"

فرمان صاحب کے پیشِ نظر انڈیا آفس کے مخطوطے کا مائیکرو فلم تھا لیکن اس میں مندرجہ قطعہ نہیں ہے۔ چنانچہ عیار الشعراء کے زمانہ تصنیف سے متعلق ان کا بیان نسخۂ انجمن کے بارے میں ان معلومات پر مبنی ہے جو انہیں سیفی پریمی صاحب سے ملی تھیں چوتھے مصرع سے ۱۲۱۳ھ نہیں ۱۲۱۸ھ نکلتا ہے۔ آج سے تقریباً تین سال قبل محض چند لمحوں کے لیے مجھے نسخۂ انجمن کی زیارت ہوئی تھی میری یادداشت میں بھی قطعے کا آخری شعر درج ہے اور اس کے سامنے ۱۲۱۳ھ لکھا ہے۔ اس سے یقینی ہے کہ ۱۲۱۳ کاتب نسخہ نے لکھا ہو جسے میں نے بھی نوٹ کر لیا اور سیفی پریمی صاحب نے بھی یہی تاریخ لکھ کر فرمان صاحب کو بھجوا دی اور انہوں نے اسے بعینہٖ شائع کر دیا اگر وہ چوتھے مصرعے کے اعداد خود شمار کرتے تو یہ غلطی واقع نہ ہوتی۔

جیسا کہ قطعہ ہذا میں بصراحت لکھا ہے عیار الشعراء ۱۲۱۸ھ میں مکمل ہو گیا تھا لیکن اس میں اضافے یقیناً بہت بعد تک ہوتے رہے جس کی دلیل اس میں خود مرزا غالب کے ذکر کی موجودگی ہے۔ ۱۲۱۰ھ میں غالب چھ برس کے تھے اور اس عمر میں بحیثیت شاعر کسی تذکرے میں ان کا ذکر ہونا ممکن نہیں لہٰذا یہ بعد کا اضافہ ہے۔ اس کا ایک مزید ثبوت یہ ہے کہ قاسم نے مجموعہ نغز ۱۲۲۱ھ میں مکمل کیا۔ قاسم نے ذکا کے ترجمے میں لکھا ہے کہ "تذکرہ ہم تالیف کردہ" قاسم نے ذکا کا تذکرہ ضرور دیکھا ہوگا اور اگر نہ بھی دیکھا تو بھی اُن کے پیش نظر نواب اعظم الدولہ سرور کے عمدہ منتخبہ کا نسخہ تھا۔ سرور نے بظاہر ۱۲۱۹ھ میں اپنا تذکرہ ختم کیا لیکن اضافے کم و بیش ۱۲۴۳ھ تک کرتے رہے۔ سرور نے مرزا کا ذکر اسد تخلص کے تحت کیا ہے لیکن انتخاب میں ایسے شعر بھی ہیں جن میں غالب بطور تخلص آیا ہے۔ تذکرہ سرور کے لیے اسپرنگر کا قول ہے کہ یہ عیار الشعراء کا ایک اصلاح یافتہ مرتبہ ہے" اور کہ قاسم کا تذکرہ سرور کے تذکرے پر مبنی "لیکن چونکہ قاسم نے غالب کا ذکر کیا ہے نہ اسد کا۔ اس سے ظاہر ہے کہ نہ صرف ذکا نے بلکہ سرور نے بھی غالب کا ترجمہ ۱۲۲۱ھ کے بعد شاملِ تذکرہ کیا۔ سرِ دست اگرچہ یہ طے کرنا ممکن نہیں کہ ذکا نے کب تک اپنے تذکرے میں اضافے کیے اگرچہ اضافے کرنا طے ہے تاہم مرزا غالب کا ذکر بہرحال ۱۲۲۸ھ سے پہلے ان کے تذکرہ میں ہوا ہوگا۔ اس لئے کہ ۱۲۲۸ھ میں مرزا غالب آگرہ چھوڑ کر دلی میں مقیم ہو چکے تھے (کم و بیش غالب کے سب سوانح نگار اس پر متفق ہیں)

اب سوال یہ ہے کہ اگر مرزا قیام آگرہ ہی کے دوران غالب تخلص اختیار کر چکے تھے (اور ترک آگرہ ۱۲۲۸ھ کا واقعہ ہے) تو انہوں نے اسد اللہ الغالب والی مہر (۱۲۳۱ھ) کندہ کروانے کے بعد کیونکر تخلص تبدیل کیا اور صاحب ذکر غالب کا یہ بیان کہ "وہ قیام دلی کے ابتدائی زمانے میں بھی اسد تخلص کرتے رہے" او "یہ درست ہے کہ بعد کو انہوں نے اسد تخلص سے بیزار ہو کر نیا تخلص رکھنے کا فیصلہ کیا

---

[1] مجموعہ نغز: مولفہ قدرت اللہ قاسم مقدمہ از پروفیسر محمود شیرانی

نے بحث نے اُن کی مشکل حل کر دی اور انہوں نے یہ سامنے کا لفظ بطور تخلص اختیار کر لیا (گلِ رعنا) کہاں تک درست ہے ماہرینِ غالب و غالبیات اگر اس مسئلے پر اپنا خیال ظاہر فرمائیں تو پھر ایسے کئی طالب علموں کی رہنمائی ہوگی۔

یہ بحث تو عیار اسقرار کے بیان کی روشنی میں تھی۔ اس ضمن میں مرزا غالب کے بیانات کے علاوہ ان حقائق پر بھی نظر رہے تو فیصلہ کرنا اور آسان ہو جائے گا کہ غالب نے اُردو اور فارسی شاعری کی ابتدا ساتھ ساتھ کی بلکہ ممکن ہے کہ فارسی گوئی کی ابتدا اُردو سے پہلے کی ہو۔ طالب علمی کے زمانے میں "اگرچہ" ردیف والی غزل کا ذکر ملتا ہے اگرچہ غزل دستیاب نہیں ہوئی اب تک محققینِ غالب کا یہ مذہب رہا ہے کہ مرزا اُردو میں اسد اور فارسی میں ابتدا ہی سے غالب تخلص کرتے تھے۔ لیکن نئی تحقیق کی روشنی میں یہ بات غلط ٹھہرتی ہے۔ اگر مالک رام صاحب کے اس بیان کو تسلیم کر لیا جائے (اور فی الحال تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں) کہ دیوانِ غالب کے دریافت مخطوطے کی تاریخ کتابت تک (جو ۱۲۳۱ھ طے کی گئی ہے مگر مشکوک ہے، اس کی بحث آگے آتی ہے) مرزا کا کل فارسی کلام اُن ۱۳ رباعیوں پر مشتمل تھا جو مذکورہ مخطوطے میں شامل ہیں، تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ وہ پہلے فارسی میں بھی اسد ہی تخلص کرتے تھے۔ رباعی میں تخلص کی گنجائش کم ہوتی ہے تاہم ان تیرہ میں سے ایک رباعی میں بھی لفظ اسد کا استعمال (ع گفتم کہ اسد بگفت دل آشفتہ من) ہوا ہے جو ہمارے قول کی تصدیق کے لئے کافی ہے۔ مندرجہ دلائل کی روشنی میں یہ بیان نہایت عجیب معلوم ہوتا ہے کہ اُردو میں جب بعد کو انہوں نے اسد تخلص سے بیزار ہو کر نیا تخلص رکھنے کا فیصلہ کیا تو اس سجع نے اُن کی مشکل حل کر دی اور انہوں نے یہ سامنے کا لفظ بطور تخلص اختیار کر لیا" (گلِ رعنا مرتبہ مالک رام)

اس طرح یہ لطیفہ بھی بے وقعت معلوم ہوتا ہے کہ تخلص بیزاری کا سبب میر امانی اسد کا ایک شعر ہوا۔ اگر مرزا فارسی میں غالب تخلص کرتے تھے تو اُردو میں اُسے اختیار کرنے میں کیا چیز مانع تھی جب فارسی میں کسی سجع کی ضرورت نہیں پڑی تو اُردو میں وہی تخلص جو فارسی میں پہلے ہی سے موجود تھا زیادہ سامنے کی چیز تھی یا مذکورہ سجع :

اسد تخلص کے بارے میں مرزا کا اپنا بیان ہے۔

" میں نے کوئی دو چار برس ابتدا میں اسد تخلص رکھا ہے ورنہ غالب ہی لکھتا رہا ہوں۔ (بحوالہ غالب از غلام رسول مہر) اپنی شاعری کی ابتدا سے متعلق مرزا کے بیانات مختلف اور متضاد ہیں۔ کبھی انہوں نے پندرہ برس کی عمر سے شعر گوئی کی آغاز کی بات کہی ہے۔ کبھی بارہ، تیرہ برس کی کہیں دس برس کی عمر کا ذکر کیا ہے اور کہیں گیارہ برس کا۔ مالک رام صاحب موخر الذکر کو ترجیح دیتے ہیں۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ مرزا نے ۱۱-۱۲ برس کی عمر میں شاعری شروع کی تو اُن کے اپنے بیان کے مطابق دو چار برس جس کی آخری حد چار برس ہے یعنی ۲۷-۱۲۲۸ھ تک وہ اسد تخلص کرتے رہے اور اس کے بعد (غالباً ۱۲۲۸ھ میں) انہوں نے غالب تخلص اختیار کیا لیکن بقول خود چونکہ غالب کلمۂ عامی ہے اور بعض بحور میں درست نہیں بیٹھتا۔ اس لئے وہ اسد کو جو اُن کے نام کا مخفف ہے، بطور تخلص تقریباً آخر عمر تک استعمال کرتے رہے۔

مندرجہ بحث کا ایک منطقی اور لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نو دریافت مخطوطۂ دیوانِ غالب کی تاریخِ کتابت ۱۲۳۱ھ نہیں ہو سکتی۔ اکبر علی خاں صاحب نے اس سلسلے میں ذرا عجلت سے کام لیا ہے۔ انہوں نے جزوی تحقیق سے نتائج اخذ کئے ہیں۔ اس لئے اس قسم کی لغزش کچھ تعجب انگیز نہیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلے نثار احمد صاحب فاروقی نے آج کل، جون ۱۹۶۹ء میں تقویم کی مدد سے طے کر کے اس نسخے کا سنہ کتابت ۱۲۳۳ھ لکھا تھا۔ لیکن جب آج کل کے جولائی ۱۹۶۹ء کے شمارے میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا مضمون شائع ہوا اور انہوں نے ۱۲۳۱ھ کو تاریخِ کتابت قرار دیا تو نثار صاحب نے اپنا پہلا بیان بدل دیا اور بغیر کسی مزید تحقیق کے ۱۲۳۱ھ کو شاید اس لئے تسلیم کر لیا کہ یہ ایک جید محقق اور ایک مستند ماہرِ غالبیات کی تحقیق تھی۔ مولانا عرشی کا مرتبہ تسلیم لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ تحقیق میں کسی کا قول حرفِ آخر مشکل ہی سے ہو پاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ نثار صاحب کے پیشِ نظر جو تقویم تھی وہ صحیح نہیں تھی۔ (اگرچہ اس میں ۱۲۳۳ھ میں ۱۴ رجب کو منگل کا دن درج ہے) لیکن یہ بھی درست ہے کہ ۱۴ رجب کو منگل کا دن ۱۲۳۱ھ میں بھی نہیں ہے لیکن اگر بہ فرضِ محال یہ درست بھی ہوتا تو بھی نو دریافت دیوان کی کتابت اس سنہ سے پہلے ہی ہو جانی چاہئے کیونکہ ۱۲۳۱ھ کی بنیاد تخلص کی تبدیلی پر ہے اور یہ اس سنہ سے پہلے کا واقعہ ہے۔

یہاں بجا طور پر سوال کیا جا سکتا ہے کہ میں جو اس قطعیت سے نثار احمد فاروقی مولانا امتیاز علی عرشی اور اکبر علی خاں عرشی زادہ صاحبان کے پیشِ نظر تقاویم کو غلط قرار دے رہا ہوں، اس کا جواز کیا ہے؟ میرے پیشِ نظر آخر ایسی کون سی تقویم ہے جسے معتبر مانا جائے۔ مجھے اعتراف ہے کہ بدقسمتی سے میری دسترس کسی مشہور و معروف یا مستند تقویم تک نہیں ہو سکی۔ فی الحال پیشِ نظر "ایتہاسک تتھی پترک" (ऐतिहासिक तिथि पत्रक) یا Historical Calander" ہے۔ یہ اگست ۱۹۶۲ء میں جودھپور سے طبع ہوا ہے۔ اس میں فصلی، ہجری، عیسوی، شک، بکرمی اور کولم سنہ درج ہیں۔ سنین کی ابتدا ۱۷۰۱ بکرمی سے اور اختتام ۱۹۰۰ پر ہوتا ہے گویا یہ دو سو برس پر مشتمل ہے۔ مجھے یہ بھی تسلیم ہے کہ اس میں عجیب افراتفری کا عالم ہے کہیں تاریخیں بالکل مطابق ہیں اور کہیں ایک سے چار دن تک کا فرق ہے۔ مجھے صحیح نتائج تک پہنچنے کے لئے خاصا طویل اور بالواسطہ طریقہ اختیار کرنا پڑا ہے۔ مثلاً جب میں یہ کہتا ہوں کہ ۱۲۳۳ھ میں ۱۴ رجب کو بدھ کا دن تھا نہ کہ منگل کا۔ جیسا کہ نثار صاحب نے جون ۶۹ء کے

آج کل میں لکھا تھا تو اس کے لئے مجھے مولا قتیل کی تاریخ وفات کا سہارا لینا پڑتا ہے قتیل کی وفات ۲۲ ربیع الاول ۱۲۳۳ھ کو ہفتے کے دن ہوئی مولانا امتیاز علی عرشی نے دستور الفصاحت کے دیباچے میں اسے درست مانا ہے۔ نشترِ عشق میں قتیل کی وفات یہی درج ہے میرے پیشِ نظر تحفۂ تبرک میں بھی یہ تاریخ اسی دن کے سامنے درج ہے یعنی ۲۲ ربیع الثانی کو ہفتہ درج ہے جس کا مطلب ہے کہ کم از کم ۱۲۳۳ھ کی حد تک تحفۂ تبرک میں مندرج تاریخیں درست ہیں چنانچہ اس مضمون میں میں جتنی تاریخیں پیش کروں گا ان سب کی تحقیق و تصدیق اسی سال میں رونما ہونے والے کسی دوسرے واقعے کی تاریخ سے مطابقت کر کے کر لی گئی ہے۔ اس طرح غلطی کا امکان کم سے کم رہ گیا ہے۔ یوں میں بھی انسان ہوں اور اسی نسبت سے سہو و خطا کا پتلا۔ مجھے یہ دعویٰ ہرگز نہیں کہ جو تاریخیں میں نے تجویز کی ہیں۔ وہی اور صرف وہی درست ہیں بلکہ میری یہ التماس ہے کہ ماہرین میرے شبہات اور دلائل کے پیشِ نظر ان تاریخوں کی چھان بین کر کے کسی صحیح نتیجے پر نہ صرف خود پہنچیں بلکہ اپنے نتائج کو شائع بھی فرمائیں۔ تاکہ مجھ ایسے طلبا مستفید ہو سکیں اور یہ کہ بظاہر ایک معمولی لیکن اہم مسئلہ طے ہو جائے۔ اب میں اصل مسئلے کی طرف رجوع کرتا ہوں فی الوقت مسئلہ زیرِ بحث تو دریافت مخطوطۂ دیوانِ غالب کی تاریخِ کتابت ہے لیکن اس کے لئے جیسا کہ بیان ہو چکا ہے ایک بالواسطہ طریقہ اختیار کرنے پر مجبور ہوں۔

مرزا غالب نے اپنی تاریخ پیدائش یکشنبہ ۸ رجب ۱۲۱۲ھ بتائی ہے غالباً ۱۹۶۹ء فروری سے جب سے کہ سید محمد حسین رضوی نے "غالب کی صحیح تاریخ ولادت" کے عنوان سے مضمون لکھا اور ۸ رجب ۱۲۱۱ھ کو غالب کی تاریخ ولادت قرار دیا تو اس مسئلے پر از سرِ نو غور ہونا شروع ہوا اور محققینِ غالب کی توجہ اس طرف مبذول ہوئی۔ مذکورہ مضمون پر تبصرہ کرتے ہوئے مالک رام صاحب نے "عیارِ غالب" کے مقدمے میں لکھا:

غالب نے بلا مبالغہ بیسیوں جگہ اپنی ولادت کی تاریخ ۸ رجب ۱۲۱۲ لکھی ہے۔ پھر اس نے کلیاتِ نظم فارسی کی تقریظ میں اپنی ایک رباعی درج کی ہے جس میں تاریخِ ولادت دو مرتبہ آگئی ہے۔ رباعی ہے۔

غالب! چو ز ناسازیِ فرجام نصیب ÷ ہم بیم عدو دارم و ہم ذوقِ حبیب
تاریخِ ولادتِ من از عالمِ قدس ÷ ہم شورشِ شوق آمد و ہم لفظ غریب

شورشِ شوق اور غریب دونوں سے ۱۲۱۲ برآمد ہوتے ہیں اسی طرح کسی موقع پر حضرت صاحبِ عالم مارہروی نے کہا کہ میری تاریخِ ولادت لفظ تاریخ سے نکلتی ہے (جس کے عدد ۱۲۱۱ ہوتے ہیں) تو غالب نے بطورِ مزاح (یہ مزاح) لکھا:- ہاتفِ غیب سن کے یہ چہکا ان کی تاریخ میرا تاریخا، یعنی تاریخ پر الف کا ایک عدد بڑھا جائے تو میری ولادت ۱۲۱۲ نکل آئے گی۔" (مقدمہ عیارِ غالب) چنانچہ آج کل جولائی ۱۹۶۹ء میں جب مولانا امتیاز علی عرشی نے غالب کے نو دریافت مخطوطے پر مضمون لکھا تو حاشیے میں مرزا کی تاریخ ولادت کے باب میں فرمایا۔

"یہاں ضمناً یہ عرض کرتا چلوں کہ مرزا صاحب نے اپنی تاریخ پیدائش یکشنبہ ۸ رجب بتائی ہے نیز کلیاتِ فارسی میں شائع شدہ زائچے میں اسے ۱۷۹۸ء کے مطابق کہا ہے۔ از روئے حساب نہ تو ۸ رجب کو یکشنبہ پڑتا ہے اور نہ تاریخ آغاز ۱۷۹۸ء کے مطابق ہوتی ہے مختلف اہلِ علم نے اس بارے میں مختلف توجیہیں کی ہیں۔ میری دانست میں مرزا صاحب کی تاریخ پیدائش ہشتم نہیں بلکہ بیشتر دہم رجب ہے اس تاریخ کو یکشنبہ بھی تھا اور یہ ۷ جنوری ۱۷۹۸ء کے مطابق ہوتی ہے جو بقول غالب آغازِ سال قرار دیا جا سکتا ہے (ص ۳۰)

لیکن یہ آغازِ سال بہ قولِ غالب نہیں بلکہ بقولِ نواب ضیاء الدین احمد خاں ہے ملاحظہ ہو:

"کلیاتِ فارسی طبع دوم میں جو زائچہ شامل ہے وہ بہت بعد کی چیز ہے۔ خدا معلوم یہ کس نے تیار کیا تھا، لیکن میں نے طبعِ دوم کا اصل مسودہ دیکھا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس کے عنوان کی عبارت (زائچہ ولادت سعادت مطالع جناب غالب مدظلہ العالی کہ بوقت شب چار گھڑی پیش از طلوعِ صبح روز یکشنبہ ہشتم رجب ۱۲۱۴ھ مطابق آغاز ۱۷۹۸ع روی دادہ) نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے جن کا یہ نسخہ تھا۔ یوں بھی غالب اپنے نام کے ساتھ مدظلہ العالی اور جناب کے الفاظ کیونکر لکھ سکتے تھے۔" (مقدمہ عیارِ غالب) مندرجہ تبصرے سے برسوں پہلے نواب ضیاء الدین احمد خاں کے اسی بیان پر تنقید کرتے ہوئے مالک رام صاحب نے لکھا تھا۔

"اس تحریر میں کئی غلطیاں ہیں۔ ہجری تاریخ اور مہینا ٹھیک ہے، البتہ سال میں کاتب کی مہربانی سے ۱۲۱۲ کی جگہ ۱۲۱۴ لکھا گیا ہے۔ یہ ہجری تاریخ جو یقیناً میرزا نے انھیں بتائی ہوئی درست ہے۔ اس کی تائید اور کئی جگہ سے ہوتی ہے باقی سب باتیں نیر رخشاں نے اضافہ کیں، اور بدقسمتی سے سب غلط ہیں۔ دن یکشنبہ نہیں بلکہ چہار شنبہ تھا۔ عیسوی سال ۱۷۹۷ء، اور وہ بھی اواخر۔ غالب نے اپنے جو حالات تذکرہ مظہر العجائب کے لیے لکھے تھے (احوالِ غالب بلاک مولف ذوق) وہاں نیر رخشاں ہی کا تتبع کرتے ہوئے انہوں نے بھی یومِ ولادت یکشنبہ لکھ دیا ہے۔ اس سلسلے میں بنیادی چیز ۸ رجب ۱۲۱۲ کی تاریخ ہے۔" (ذکرِ غالب طبع چہارم حاشیہ ص ۲۵)

لیکن مولانا امتیاز علی عرشی نے اس کے برعکس یکشنبہ کے دن کو بنیاد اہم گردانا ہے اور اس سے جو نتائج اخذ کئے ہیں۔ ان کا اظہار ہماری زبان موسومہ ۸ جولائی ۱۹۶۹ء

... صاحب سے کیا فرماتے ہیں:

"غالب نے اپنی تاریخ پیدائش یکشنبہ ۸ رجب ۱۲۱۲ھ بتائی ہے نیز کلیات نظم فارسی کے قطعۂ تاریخ میں اسے آغاز ۱۷۹۸ء کے مطابق کہا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ . . . . از روئے حساب نہ تو ۸ رجب کو یکشنبہ پڑتا ہے اور نہ یہ تاریخ آغاز ۱۷۹۸ء کے مطابق ہوتی ہے . . . میں نے دو سال ہوئے ایک مضمون اس موضوع پر لکھا تھا . . . مگر اس وقت بھی اس اختلاف کا کوئی حل پیش نہیں کر سکا تھا۔

"حال ہی میں پھر یہ مسئلہ میرے زیرِ غور رہا ہے اور ایک حل سمجھ میں آیا وہ یہ کہ غالب کی تاریخ پیدائش ہشتم نہیں ہژدہم رجب ہے اور مرزا صاحب کو اپنے بزرگوں سے سنی ہوئی تاریخ میں التباس ہو گیا یعنی انھیں ۱۸ کی بجائے ۸ تاریخ یاد رہ گئی چونکہ سال عیسوی کا آغاز دہ نہ ہوئے تھے اس لئے مذکورہ التباس کا پتہ چل گیا چنانچہ از روئے تقویم ۱۸ رجب کو یکشنبہ بھی تھا اور یہ ۷ جنوری ۱۷۹۸ء کے مطابق بھی ہے جسے بقولِ غالب آغاز ۱۷۹۸ء قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کی التباس کی مثالیں اگر عام نہیں تو نادر بھی نہیں۔"

اصل یہ ہے کہ ایسی مثالیں نہ صرف نادر بلکہ معدوم ہیں ۱۸ کے ۸ یاد رہنے کا کوئی قرینہ نہیں۔ یہ صرف ایک صورت میں ممکن ہے یعنی ۱۸ بزرگوں سے سُنا نہ ہو بلکہ کسی زائچے میں پڑھا ہو اس صورت میں ایک کا ہندسہ دھندلا جانے یا مٹ جانے یا سرسری طور پر دیکھنے سے نظر چوک سکتی ہے اور ۱۸ کو ۸ پڑھا جا سکتا ہے۔ جہاں تک آغاز ۱۷۹۸ء کا تعلق ہے یہ بھی مشکوک ہے۔ آغازِ سال یکم جنوری سے ہوگا نہ کہ ۶، ۷ یا ۸ جنوری سے، اس ضمن میں مالک رام صاحب کا قول زیادہ قرینِ قیاس ہے کہ یہ باتیں نواب ضیاء الدین احمد خاں نے خود اضافہ کی ہیں۔ تاہم عرشی صاحب کی حالیہ . . . تحقیق کی روشنی میں (ذرا سی ترمیم کے ساتھ) یہ ممکن ہے کہ مرزا غالب نے جس زائچے سے اپنی تاریخ ولادت پڑھی اس میں ایک کا ہندسہ دھندلا گیا اور انہوں نے ۱۸ کو ۸ پڑھ لیا۔ اس صورت میں ان کی مشہور تاریخ ولادت پر دس دن کا اضافہ کرنا ہوگا اور جو نتیجہ برآمد ہوگا وہ عرشی صاحب کے بیان سے مختلف ہوگا۔ اس لئے مولانا عرشی کا یہ جملہ "از روئے حساب نہ تو ۸ رجب کو یکشنبہ پڑتا ہے . . . الخ" درست نہیں۔ یہاں از روئے حساب کی بجائے "از روئے تقویم" ہونا چاہئے جیسا کہ محولہ بالا اقتباس کے خط کشیدہ جملے میں ہے اگر ۸ رجب کو چہارشنبہ تھا (اور یہ ہر لحاظ سے درست ہے، از روئے تقویم بھی، از روئے حساب بھی) اور یہ مطابق تھا ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کے۔ اس میں دس دن جمع کیجئے۔ حاصل جمع ۱۸ رجب روز شنبہ ۱۲۱۲ھ مطابق ۶ جنوری روز شنبہ ۱۷۹۸ء ہوگا نہ کہ یکشنبہ ۷ جنوری[1]

اب نسخۂ عرشی زادہ میں غالب کی تاریخ ولادت کی طرف آیئے جناب عرشی زادہ نے مرزا کی تاریخ ولادت اس طرح درج کی ہے۔

تاریخ پیدائش: آگرہ، یک شنبہ ۱۸ رجب ۱۲۱۲ھ / ۷ جنوری ۱۷۹۸ء

اور حاشیے میں لکھا ہے کہ تاریخ پیدائش مولانا عرشی کی تحقیق کے مطابق درج کی گئی ہے۔ خود مولانا عرشی نے اسے کسی تقویم سے مطابق کیا ہے۔

**ایک شبہہ:** اگرچہ مولانا عرشی نے یہ نہیں لکھا کہ انہوں نے اس تاریخ کی مطابقت کے لئے کس تقویم کو پیشِ نظر رکھا ہے لیکن قیاس یہ ہے کہ اُن کے پیشِ نظر وہی تقویم ہو جس سے بعد میں جناب عرشی زادہ نے ۱۴ رجب سہ شنبہ کا سنہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے اور اگر یہ قیاس درست ہے تو اس تقویم کا معتبر ہونا مشکوک ہے اس لحاظ سے ۱۴ رجب کو سہ شنبہ کا ۱۲۲۱ھ میں واقع ہونا مشکوک بلکہ غلط ہے۔ اکبر علی خاں صاحب اس پر مزید غور فرمائیں، تو دریافت دیوان کی تاریخ کتابت کے سلسلے میں انہیں نہ صرف مرزا کے تخلص کی تبدیلی کی تاریخ پر مندرجہ دلائل کی روشنی میں غور کرنا ہوگا بلکہ کسی زیادہ مستند اور معتبر تقویم سے اس کی مطابقت بھی کرنا ہوگی۔

جیسا کہ بیان ہوا مرزا غالب کی مروجہ تاریخ ولادت ۸ رجب ۱۲۱۲ھ بروز چہارشنبہ ہے۔ تتھی پترک میں یہ دن تاریخ اور مہینا سب مطابق ہے۔ اس لئے کم از کم ۱۲۱۲ کی حد تک تتھی پترک معتبر رہا۔ چنانچہ ۶ جنوری ۱۷۹۸ اور ۱۸ رجب ۱۲۱۲ کو بھی شنبہ ہے یکشنبہ ۷ جنوری اور ۱۹ رجب کو پڑتا ہے جو از روئے حساب بھی درست اور تتھی پترک کے لحاظ سے بھی۔ مجھے ۱۲۲۱ھ میں رونما ہونے والے کسی دوسرے واقعے کی کوئی معتبر تاریخ نہیں مل سکی۔

بہو بیگم صاحبہ کا انتقال ۲۵ محرم ۱۲۲۱ھ کو ہوا لیکن اس تاریخ کی تصدیق مختلف

---

[1] ۸ جولائی ۱۹۶۹ء کے ہماری زبان میں مولانا عرشی کا مراسلہ جس روز میری نظر سے گزرا میں نے اُسی وقت مرزا کی رائج تاریخ ولادت میں دس روز کا اضافہ کیا تو معلوم ہوا کہ انگریزی تاریخ ۶ جنوری ہونی چاہئے۔ مولانا عرشی کی تحقیق کی روشنی میں جس کا ذکر ابھی آیا ہے جب میں نے غور کیا تو پتہ چلا کہ مولانا کو دس دن کے جوڑنے میں سہو ہوا ہے اصلاً ۶ جنوری ہونا چاہئے۔ چونکہ مولانا کا جملہ از روئے تقویم میرے ذہن سے اتر گیا تھا اس لئے میں نے اُسے کوئی خاص اہمیت نہیں دی تھی۔ اب جب کہ ضرورت پڑی تو میرے ذہن نے ۶ جنوری کو جو خود میرے حساب کے مطابق تھی مولانا کی تحقیق سے منسوب کر دیا۔ نسخۂ عرشی زادہ میں جب ۷ جنوری کو مولانا عرشی کی تحقیق سے منسوب پایا تو مولانا کے مضمون کی تلاش ہوئی۔ اور جب اس مضمون میں بھی ۷ جنوری لکھا پایا تو معلوم ہوا کہ یہ بھی ایک ذہنی التباس تھا۔

نہ کو ضخیم ہے نہیں ہو سکتی معلوم کو از روئے حساب بدھ کا دن تھا۔ ہمارے تقی پترک میں کچھ بھی ہے لیکن سوانح حالات سلاطین اودھ میں جمعرات لکھا ہے۔ اگرچہ اس کتاب میں اکثر غلطیاں درج ہیں تاہم احتیاط کا تقاضا ہے کہ جب تک کوئی دوسری تاریخ نہ ملے اس پر اعتبار نہ کیا جائے لیکن میں نے ابھی از روئے حساب کی بات کہی ہے اتفاق سے زیر نظر مضمون کی تکمیل کے بعد مجھے ایک مختصر رسالہ جسے مصنف ہلالیہ کا نام دیتا ہے اور جو نول کشور پریس سے ۱۳۰۸ھ میں طبع ہوا ہے، دستیاب ہو گیا اس میں ایک نقشہ دیا ہے جو ۱۱۴۹ھ سے ۱۲۶۵ھ تک کے سنین کو محیط ہے۔ نقشے کے ساتھ ایک ضابطہ بھی بیان کیا ہے جس کی رُو سے ان برسوں میں پڑنے والے کسی بھی مہینے میں رویت ہلال کا دن معلوم کر سکتے ہیں۔ میں نے اس ضابطے کا اطلاق مذکورہ سنین کے علاوہ دوسرے سنین پر کیا تو معلوم ہوا کہ قاعدہ حیرت انگیز طور پر درست ہے میں نے اس قاعدے کی مدد سے ۱۲۲۸ھ سے ۱۲۳۶ھ تک ہر سال میں ۱۴ رجب کو پڑنے والا دن نکال کر دیکھا اور ان کی مطابقت تقی پترک میں دی ہوئی تاریخوں اور دنوں سے کر کے اُن کی صحت کی تصدیق کر لی ہے۔ ذیل میں یہ نقشہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ ماہرین اسے دیکھ کر کسی صحیح تقویم کی مدد سے ان تاریخوں اور دنوں کی صحت و مطابقت طے کر سکیں اس ضابطے کے باب میں مجھے صرف اتنا اور کہنا ہے کہ میں نے بلا مبالغہ بیسیوں تاریخوں میں پڑنے والے دنوں پر اس کا اطلاق کیا اور ایک بھی غلطی واقع نہیں ہوئی۔ مثال میں صرف ایک تاریخ کا ذکر کر دوں گا۔ مالک رام صاحب نے غالب کے یوم وفات کے لئے کہا ہے کہ ۲ ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ بروز دوشنبہ واقع ہوئی لیکن تقویم میں نہ یہ ۲ ذی قعدہ ہے اور نہ دوشنبہ کا دن۔ بلکہ ہم عصر لوگوں نے چاند دیکھ کر شہادت دی ہوگی کہ آج ۲ ذی قعدہ ہے۔ میں نے ۲ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ کا دن اس ضابطے کی رُو سے نکالا تو معلوم ہوا کہ یہ دوشنبہ ہی تھا اس لئے مجھے یقین ہے کہ ذیل کے نقشے میں دی ہوئی تاریخیں اور ایام درست ہیں۔

| سال | مہینا | تاریخ | دن |
|---|---|---|---|
| ۱۲۲۸ھ | رجب | ۱۴ | سہ شنبہ |
| ۱۲۲۹ھ | 〃 | 〃 | شنبہ |
| ۱۲۳۰ھ | 〃 | 〃 | پنج شنبہ |
| ۱۲۳۱ھ | 〃 | 〃 | دوشنبہ |
| ۱۲۳۲ھ | 〃 | 〃 | شنبہ |
| ۱۲۳۳ھ | 〃 | 〃 | چہارشنبہ |
| ۱۲۳۴ھ | 〃 | 〃 | یکشنبہ |
| ۱۲۳۵ھ | 〃 | 〃 | جمعہ |
| ۱۲۳۶ھ | 〃 | 〃 | سہ شنبہ |

## غزل

ناز جھنوی

میں زندگی کی تمنا میں در بدر تنہا
خبر نہیں کہ گیا ہوں کدھر کدھر تنہا

کچھ آج کل ہے مری یوں گزر بسر تنہا
کہ قافلے میں ہو خود جیسے راہ بر تنہا

بس ایک بار مٹا دو ملال تنہائی
پھر اس کے بعد رہوں چاہے عمر بھر تنہا

نصیبِ عشق ہے آوارگی و کج راہی!
بھٹک رہا ہوں میں کب سے اِدھر اُدھر تنہا

میں زندگی کے تصور سے کیوں نہ گھبراؤں
کہ جیتے جی مجھے درپیش ہے سفر تنہا

گزارنے کی حدوں تک گزار آیا ہوں
میں امتحانِ محبت کی رہ گزر تنہا

مرا مذاق اُڑایا ہے اہلِ دُنیا نے
ترے بغیر گیا ہوں کہیں اگر تنہا

کچھ اس لئے بھی گراں ہے رہائی زنداں سے
کہ میرے بعد رہیں گے یہ بام و در تنہا

وہ رنگِ لالہ و گل ہو کہ نورِ ماہ و نجوم
کرشمہ ساز ہے سب میں تری نظر تنہا

ترے بغیر ملی بھی تو یوں ملی ہے خوشی
کہ جیسے روٹھے کوئی اپنے حال پر تنہا

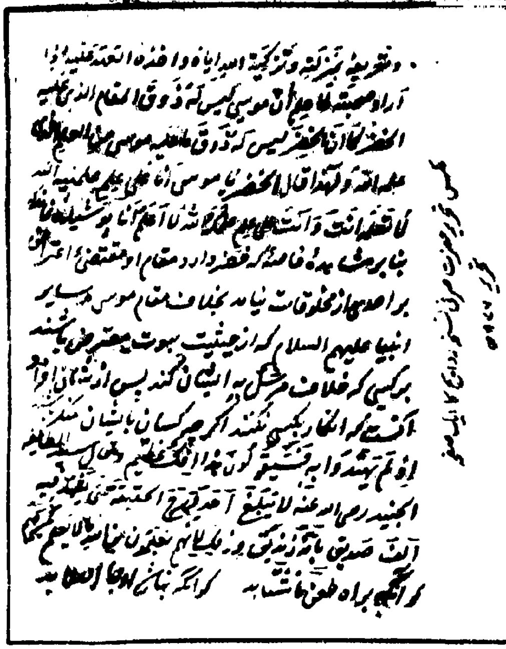
حیات جب سے ہوا ہے کوئی جدا مجھ سے
تمام شہر مجھے آتا ہے نظر تنہا

جیسا کہ مندرجہ نقشے سے ظاہر ہے ۱۴ رجب کو سہ شنبہ صرف دو برسوں میں واقع ہوا ہے یعنی ۱۲۲۸ھ اور ۱۲۳۶ھ میں۔ اب یہ ماہرین پر ہے کہ وہ خود دریافت دیوانِ غالب کی تاریخ کتابت ۱۲۲۸ھ مانیں یا ۱۲۳۶ھ۔ فی الحال کسی مزید ثبوت یا مواد کی عدم دستیابی کی صورت میں ۱۲۲۸ھ قرین قیاس ہے۔

ان تاریخوں پر اکبر علی خاں صاحب خصوصاً غور فرمائیں اگر مرزا کی تاریخ ولادت سے (جسے کم از کم از روئے حساب غلط فہمی قرار دیا جا سکتا ہے) انہیں اتفاق ہو تو وہ نسخۂ عرشی زادہ کے آئندہ ایڈیشن میں اس کی تصحیح کر دیں اور اسی طرح تاریخ کتابت دیوان کی بھی۔

(باقی آئندہ شمارے میں)





وتقربه بتزکیته وتزکیته ابدا یاه وا فذه التعمد علیه
آرا و صحبته علیه ان موسی لیس له ذوق العلم الذی علیه
الخضر کما ان الخضر لیس له ذوق ما علیه موسی من العلم
علمه الله و لهذا قال الخضر یا موسی انا علی علم علمنیه الله
لا تعلمه انت و انت علی علم علمکه الله لا اعلمه انا
بنا بر شد که خضر دارد مقام او مقتضی اعتراض
بر احدی از مخلوقات نیامد بخلاف مقام موسی و سایر
انبیاء علیهم السلام که از حیثیت نبوت معترض باشند
بر کسی که خلاف شرع کند
آن که انکار بکسی نکنند اگر چه کسان با ایشان منکر
الجنید رضی الله عنه لا یبلغ احد درجة الحقیقة
آنک صدیق
را بگوی براه طعن

عکس تحریر حضرت صرفی

● از فنون شعر آگاه و بگوناگوں دانش آشنا بود — ابوالفضل

● مجمع فضل وکمالات — ملا عبدالقادر بدایونی

● ملک سخن راست از و فتح یاب

● یک سخنش فاتحہ صد کتاب — ملا محسن فانی

حضرت صرفی کی پیدائش کے وقت سرزمینِ کشمیر میں شاہ میری خاندان کے بارہویں بادشاہ محمد شاہ کی حکومت تھی جو چار سال قبل ۸۸۹ھ میں تخت نشین ہوا تھا۔ صرفی کا زمانہ وہ زمانہ تھا کہ انہوں نے اپنی عمر کے چہتیاسٹھویں سال یعنی ۹۹۳ھ تک شاہ میریوں کے چھ حکمرانوں اور چک خاندان کے دورِ حکومت کے سبھی بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔ ۹۹۳ھ میں مغلیہ حکام نے کشمیر کو اپنی سلطنت کے ساتھ ملا دیا اور ریاست میں مکمل طور پر مرکز کی حکومت قائم ہو گئی۔

اس عرصہ میں کشمیر کے نظام میں اتنی کمزوریاں اور اس نوع کی خامیاں پیدا پیدا ہو چکی تھیں کہ کوئی بھی فرماں روا مشکل سے چند سال تک تخت پر قائم رہ سکتا۔ کئی بادشاہ اپنی بادشاہی کو صرف چند مہینوں تک سنبھالنے میں کامیاب ہوئے اور چکوں کے ایک حاکم حسین شاہ کو محض چار دن حکومت کرنا نصیب ہوئی۔ اس افراتفری کا ایک خاص سبب یہ تھا کہ ملک حکام کے ہاتھوں باہمی رسہ کشی کا میدان بنا ہوا تھا اور وہ ہر لحظہ ایک دوسرے کو مار گرانے کی تاک میں لگے رہتے تھے۔ اس خانہ جنگی کے نتیجہ کے طور پر ملک کی اقتصادیات اور اس کے تحفظ اور عوامی خوش حالی کی طرف ان کی توجہ مبذول نہ ہو سکی جس کی وجہ سے لوگ بھی اپنے حاکموں سے بدظن ہوتے گئے۔ عوام کی رگ رگ میں ایک ایسی غیر یقینیت اور تنفر کے جراثیم سرایت کرتے گئے کہ انہوں نے ہر صاحبِ اقتدار کو شک اور حقارت کی نظروں سے دیکھنا شروع کیا۔

حضرت شیخ محمد یعقوب گنائی متخلص بہ صرفی ۹۲۸ھ مطابق ۱۵۲۱ء سری نگر (کشمیر) کے ایک آسودہ حال ادبا و فارغ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کی ولادت کا سال "شیخ حق" سے بھی نکلتا ہے۔ صرفی کے اسلاف اعیانِ کشمیر میں سے تھے۔ ان کے جدِ امجد سلطان زین العابدین کے دربار میں ایک عزت دار عہدے پر فائز تھے۔ صرفی کے والد کا نام میر حسن اور گنائی لقب تھا۔ وہ بھی شاہ میری دور میں درباری اور رئیس تھے۔ صرفی قبیلہ عاصمی سے تھے اور لقب کے لحاظ سے آپ گنائی کہلاتے۔ صرفی کے قبلہ گاہ میر حسن کے سات فرزند میر کمال، میر یعقوب، میر محمد شریف، میر نوروز، میر محمد میر ابراہیم اور میر حیدر تھے۔ ان میں سے پانچ صرفی سے چھوٹے تھے اور اول الذکر کی عمر ان سے زیادہ تھی۔

ابتدا میں صرفی کی تربیت گھر پر خود ان کے والد نے کی۔

پدرِ بسکہ مشفق بمن بودہ است ؛ مرا علم و آداب فرمودہ است
بتعلیم خود بندہ را کرد خاص ؛ ز تشویش استاد و مکتب خلاص

صرفی نے چھ سال کی عمر میں گھر میں قرآن حفظ کیا۔ مولانا غلام رسول لاہوری کا بیان ہے کہ "در عمرِ دہ سالگی حفظِ قرآن نمود"۔ جب انہوں نے آٹھویں سال میں قدم رکھا تو فارسی زبان میں شاعری شروع کی اور پہلے پہل والد صاحب ہی سے اشعار پر اصلاح لیتے رہے۔ "مغازی النبی" میں خود فرماتے ہیں:

چو در سالِ ہشتم نہادم قدم ؛ ز طبع رواں گشت شعرِ عجم
پدر کرد ے اصلاحِ اشعار من ؛ باصلاح بود ے مددگارِ من

---

* شہنامہ کشمیر کے مصنف عبدالوہاب شائق کا کہنا ہے کہ صرفی نے اول اول قصائد اور نعتیں لکھیں۔

چوں شد ہشت سالہ قصائد گفت
ہفت چیبرہ گہر ہا بسُفت

خواجہ حبیب اللہ نوشہری نے "مقاماتِ حضرت الشان" میں بیان کیا ہے
صرفی نے ان ہی دنوں وہ غزل لکھی جس کا مطلع ہے۔

اے نسخۂ مہر آئینہ روئے توام
میلِ خیال در ہوائے روئے نیکوئے توام

ان دنوں مولانا جامی کے شاگرد ملا محمد آنی کشمیر میں مدرسۃ العلوم کے سربراہ تھے ان کا شمار مولانا جامی کے ممتاز شاگردوں میں ہوتا تھا۔ صرفی کو والد نے ان کی خدمت میں بھیج دیا اور انہوں نے ملا آنی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا مولانا آنی سے صرفی نے علم معما میں مہارت حاصل کی اور اس کم عمری ہی میں معما پر ایسے ایسے اشعار قلم بند کیے کہ استاد بھی حیران رہ گیا۔ خواجہ حبیب نے ان اشعار کی تعداد تیس بتائی ہے ؎

بیست بیت از معما گفت بہ گفت اما بدیہہ آنرا گفت

شیخ صرفی نے علم صرف و نحو میں بھی کمال حاصل کیا تھا اسی مناسبت سے حضرت آنی نے انہیں صرفی تخلص کرنے کی ہدایت کی۔ جب تحصیل علوم میں صرفی نے آنی کے سامنے اپنے جوہر کمال اور قابل داد صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا تو استاد نے شاگرد کو "جامی ثانی" کا لقب عطا کیا۔ اس کے بعد آنی نے مولانا میر رضی الدین سے صرف و نحو میں مہارت نامہ حاصل کیا اور درس فقہ میں بھی ان سے استفادہ کیا۔ پھر ملا حافظ بصیر خندہ بیونی کے شاگرد ہوئے۔ صرفی نے اس عالم سے علم صوفیہ، منطق، بیان و معانی سیکھے۔ ۹۲۲ھ میں جب ملا بصیر نے سرینگر میں وفات پائی تو شاگرد رشید نے ایک پُراثر مرثیہ لکھا جس کا آخری شعر یوں ہے ؎

"آں حافظ علم و ادب بود بصیر از فضل رب
تاریخ نوشتش زاں سبب شد عالم تفسیر داں"

اُنیس ۱۹ سال کی عمر تک ان تمام علوم سے بہرہ ور ہونے کے بعد صرفی زیادہ تر مطالعہ میں مشغول ہو گئے۔ لیکن اسی زمانے میں بدقسمتی سے اُن کا اٹھنا بیٹھنا چند اوباش قسم کے نوجوانوں سے ہو اجن کی صحبت سے صرفی کے اوصاف حمیدہ بگڑنے لگے۔ اسی دوران میں ہادیٔ حق نے اُن کی ہدایت کی اور ایک روز جب کہ وہ صبح کی نماز پڑھ رہے تھے تو سنت ادا کرنے کے بعد دوسری رکعت کو اُٹھے ہی تھے کہ یک بیک زور سے نعرہ مارا اور بے ہوش ہو کر دھڑام سے زمین پر گر پڑے۔ بعد میں پتہ چلا کہ انہوں نے اُس عالم میں قطب ربانی حضرت سید میر علی ہمدانی کو سید خلیل اللہ محتسب کے ساتھ اپنے سا [illegible] حضرت رح نے محتسب کو حکم دیا تھا کہ وہ اس گریزپا کے پاؤں کاٹ [illegible] تاکہ وہ دوبارہ راہِ معبود سے بھٹکنے نہ پائے۔ چنانچہ حضرت خلیل محتسب نے [illegible] میں اُن کے پاؤں پر شمشیر سے ضرب لگائی تھی۔ اور اہل جماعت نے دیکھا کہ شیخ صرفی کے پاؤں واقعی زخمی ہوئے تھے اور ان کا جامہ خون آلود ہو گیا [illegible] روز بعد عالم خواب میں حضرت امیر کبیر رح پھر اُن کے سامنے آئے اور صرفی کو حکم دیا کہ وہ حضرت شیخ حسین خوارزمی رح کی خدمت میں پہنچ کر اُن سے تربیت لیں۔ حضرت شیخ کا قیام اُن دنوں خوارزم میں تھا۔

صرفی نے اس حکم کی تعمیل میں خوارزم کے سفر کا عزم کیا۔ والدین اور رفیقوں نے اس کٹھن سفر کی صعوبتوں اور دشوارگزار راستے کے خوف و خطر سے خبردار کیا لیکن جب صرفی اپنے ارادے پر بدستور قائم رہے تو انہوں نے بھی بادلِ ناخواستہ اجازت دے دی۔

حضرت صرفی اس طویل سفر پر سرما کے دنوں میں روانہ ہوئے وہ اپنے حقیقی برادر میر نوروز، یوسف کوکہ اور دو خدمت گاروں بوڑھ صوفی اور شیخ بہرام کو ہمراہ لے گئے۔ یہ چھوٹا سا قافلہ جب خوارزم پہنچا تو اُن دنوں جاڑے کا موسم عروج پر تھا اور برف و باران اور تیز ہوا کے دن تھے۔ حضرت شیخ نے سب سے پہلے صرفی کو خانقاہ کے مطبخ کے لئے جنگل سے لکڑی لانے کے کام پر مامور کیا۔ کچھ عرصہ جب یہ کام بطریق احسن انجام دیتے رہے تو مرشد نے ان کو چلہ کش درویشوں کے غسل خانے صاف کرنے پر لگایا۔ صرفی یہ ذمہ داری بھی بڑی تن دہی کے ساتھ اٹھاتے رہے۔ پھر انہیں لنگر کے لئے پانی لانے پر تعینات کیا گیا۔ آخر میں صرفی نے اُستاد کے کہنے کے مطابق خانقاہ ہی کے ایک تنگ حجرے میں چلہ کشی اختیار کی اور حضرت شیخ سے علوم و فنون اور روحانی و دنیوی مسائل میں جانکاری حاصل کرتے رہے۔ اس دوران میں حضرت خوارزمی نے زیارت حرمین کے لئے مکہ معظمہ کا عزم سفر کیا تھا اور صرفی بھی مرشد سے اجازت لے کر اپنے وطن روانہ ہوئے۔

حضرت صرفی جتنی دیر سفر میں رہے، اس دوران میں اُن کی شہرت کشمیر کے گوشے گوشے میں پھیل رہی تھی اور لوگ غائبانہ طور ان کے علمی و روحانی کمالات کا چرچا سن کر گرویدہ ہو رہے تھے۔ چنانچہ جب آپ وارد کشمیر ہوئے تو عقیدت مندوں نے جوق در جوق ان کی خدمت میں آنا شروع کیا اور صرفی انہیں اپنے ارشادات سے مستفید کرتے رہے۔

کشمیر اب بھی افراتفری میں مبتلا تھا اور ملک کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ حضرت صرفی ملکی نظام کی اس برہمی کے جھگڑے میں پھنسنے سے بچنے کی خاطر

[illegible] الله دو گھر میں شیخ سلطان کشمیری کی تعمیر کردہ خانقاہ میں جاگزیں [illegible] جہاں انہوں نے درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری کیا اور اکثر طالبین یہیں [illegible] یاب ہوا کرتے تھے۔ انہی ایام کا ذکر ہے کہ حاکم کشمیر یعقوب شاہ چک نے [illegible] یوسف میر کے بیٹے میر محمد کو حکم دیا کہ وہ حضرت صرفی کو قتل کرے۔ میر محمد [illegible] رات کے وقت خانقاہ میں پہنچا تو دیکھا کہ حضرت تہجد میں مشغول ہیں۔ صرفی نے سلام پھیرتے ہی میر محمد کی طرف نظر اٹھا کر اس سے کہا کہ وہ اپنا کام کیوں نہیں کرتا؟ حضرت کے پُر جلال اور روحانی نور سے معمور چہرہ دیکھ کر میر محمد مبہوت رہ گیا اور دوسرے دن حضرت سے معافی مانگ کر آن کے حلقہ ارادت میں شامل ہوا۔ حالات کی اس ابتری اور زبوں حالی سے دل برداشتہ ہو کر صرفی نے پھر کشمیر سے ہجرت کا قصد کیا اور میر محمد ہی کو اپنا خلیفہ اول اور جانشین مقرر کر کے آپ دوبارہ کشمیر سے روانہ ہوئے۔ کچھ دیر گجرات میں ٹھہرنے کے بعد صرفی قندھار پہونچے اور پھر خراساں کی راہ لی۔ پھر کابل، بدخشاں اور بلخ و بخارا کا سفر کر کے جب شیخ صرفی سمرقند پہنچے تو معلوم ہوا کہ حضرت خوارزمی زیارت حرمین الشریفین کو گئے ہیں۔ صرفی بھی یثرب روانہ ہوئے اور روضۂ رسول اللہ ؐ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ اس سفر میں آپ مشہد بھی گئے جہاں حضرت امام شاہ علی موسیٰ رضاؓ کا روضۂ پاک دیکھا۔ جام میں حضرت شیخ احمد جامی سے فیض پایا۔ انہی ایام میں حضرت صرفی نے بہت سے علمائے دین اور اولیاء اور مشائخ سے ملاقات کر کے ان کی صحبت کا شرف پایا۔ ایران میں حضرت صرفی نے شاہ طہماسپ سے ملاقات کی اور اُسے امورِ دینی اور فرمانِ الٰہی سے آگاہ کیا یہاں سے وہ پھر حج کو گئے اور مکہ معظمہ میں شیخ المحدثین حضرت علامہ شہاب الدین احمد بن حجر المکیؒ اور حضرت شیخ عبدالعزیز سے تفسیر حدیث کی سند حاصل کی اور پھر مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ اس سفر میں شیخ صرفی نے دیگر علماء و فضلاء کے علاوہ فتح پور سیکری میں شیخ الاسلام حضرت شیخ سلیم چشتیؒ سے بھی ملاقات کی اور سلسلہ چشتیہ کے اس عالم و فاضل کے ارشادات سے بہرہ ور ہوئے۔ حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ نے اسی زمانے میں حضرت صرفی سے سرہند میں حدیث اور تصوف میں درس لیا۔

حضرت صرفی کی کشمیر میں واپسی کے زمانے میں بھی والیانِ کشمیر کی خانہ جنگیوں سے ملک میں تباہی کا بازار گرم تھا۔ یعقوب شاہ چک نے مخالفوں کو رفع دفع کرنے کے ساتھ ہی کسی قدر تنگ نظری کا ثبوت دیا اور بہت سے معاملوں میں اختلافات کو مذہبی نقطۂ نگاہ سے جانچا جس کی وجہ سے خاص کر اہلِ سنت والجماعت اس سے متنفر ہو گئے اور انہوں نے سلطان کو گرا دینے کی راہیں نکالنے کے لئے سازشیں کرنا شروع کیں نتیجے کے طور پر سرکار کی مخالفت کیلئے ایک خفیہ سیاسی جماعت وجود میں آگئی جس میں ریاست کے وہ اہلِ قلم اور فضلاء اور مشائخ شامل ہوئے جو یعقوب شاہ کے طریقۂ کار سے اختلاف رکھتے ہوئے اور اس کی سیاسی پالیسیوں کے مخالف ہو کر کشمیر کے نظام میں اہم تبدیلیوں کے خواہاں تھے۔ اس گروہ کی سرکردگی صرفی کرنے لگے۔ کچھ عرصہ بعد وہ چند ہمرائے مصاحبوں کو ساتھ لے کر اس خیال سے آگرہ چلے گئے کہ دربارِ اکبری میں کشمیر کو چک حکومت کی فرمانروائی سے آزاد کروانے کی طرف کوئی خاطر خواہ قدم اٹھائیں۔ صرفیؒ کے ہم عمر خالہ زاد بھائی حضرت بابا داؤد خاکی بھی ملتان سے آکر اس وفد کے ساتھ آملے۔ وفد کے دیگر اراکین میں حیدر خاں، بہرام نایک اور فتح خاں شامل تھے وفد نے اکبر شاہ کو تسخیر کشمیر کی ترغیب دی اور اپنی طرف سے اُسے مکمل تعاون کا یقین دلایا۔ کشمیر پر دھاوا بولنے اور اُسے مرکز کے ساتھ ملانے کی خاطر وفد نے اکبر کے سامنے چند شرائط پیش کیں جنہیں اکبر نے فوراً قبول کیا۔ یہ معاہدہ یوں تھا۔

(الف) ریاست میں عبادت کرنے کی مکمل آزادی ہوگی اور مذہبی معاملات میں کسی قسم کی دخل اندازی نہیں کی جائے گی۔

(ب) تجارتی اشیاء کی خرید و فروخت کا کام آزادانہ طور پر ہوگا اور اناج کے نرخ مقرر کرنے میں کوئی مداخلت نہیں ہوگی۔

(ج) کشمیریوں کو غلام نہیں بنایا جائے گا اور نہ ہی کشمیری عورتیں کنیزیں بنائی جائیں گی۔

(د) اہلِ کشمیر سے نہ تو بیگار ہی لی جائے گی اور نہ ہی انہیں کسی طریقے پر پریشان کیا جائے گا۔

(ہ) جن کشمیریوں نے ملک میں افراتفری پھیلانے والے عناصر کو ہوا دی ہے۔ ان کا ملکی نظام سے بلاواسطہ یا بالواسطہ کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ ان شرائط کے تحت اکبر نے پہلے مرزا شاہ رُخ کی سرکردگی میں ایک فوج کشمیر روانہ کی پھر فوج کی کمان مرزا قاسم خاں میر بحریہ کو سونپ دی گئی۔ یہ فوج چالیس ہزار سواروں اور بیس ہزار پیادوں پر مشتمل تھی۔ جنگ میں ایک بار مغلوں کو شکست فاش ہوئی تو چک سرداروں کے ہاتھوں صرفی کے قید ہونے کا بھی ذکر ملتا ہے۔ یعقوب شاہ نے آخر کار شکست کھائی اور اس طرح سے سلطنتِ کشمیر ذی قعدہ ٩٩٤ھ بموجب جولائی ١٥٨٦ء میں مغلیہ حکومت کے ساتھ مدغم ہو گئی۔

اکبر کی عملداری کشمیر میں شروع ہونے کے بعد حضرت صوفی نے کسی قدر اطمینان کا سانس لیا اور پھر سے حرمین کی زیارت کا ارادہ کیا۔ اس سفر میں انہوں نے کم و بیش ایک سال گزارا اور جب واپس آئے تو اپنے ساتھ مختلف ملکوں سے تفسیر، فقہ و

یہاں مدرسہ علم کے بیش بہا کتابیں اور مشاہیر علماء کی چیدہ چیدہ تصانیف یہاں سے کیا جاتا ہے کہ صرفی کے ذاتی کتب خانے میں نوادر روزگار مخطوطات کی تعداد دہ ہزار سے زیادہ تھی۔

اپنی عمر کے پچھتر سال بسر کرنے کے بعد حضرت صرفی نے ۲۷ ذی قعدہ ۱۰۰۳ھ مطابق ۲۵ جولائی ۱۵۹۵ء بروز پنجشنبہ رات کو نماز عشاء ادا کرتے ہوئے انتقال کیا۔ اُن کی وفات کا سال "شیخ امم بود" بہ حافظ "شیخ الباطن" "فخر الانام" اور "فضل انام" سے نکلتا ہے۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے جب اُن کی رحلت کی خبر سنی مرثیہ کا یہ قطعہ کہا ؎

یاراں ہمہ رفتند رہِ کعبہ گرفتند
ماست قدم بردرِ خمار بماندیم !
از نکتۂ مقصود نشد فہم حدیثے
لا دین ولا دنیائے بیکار بماندیم

حضرت صرفی نے پڑھنے لکھنے میں اپنی زندگی گزار دی۔ جب فارغ ہوتے تو اپنے ہم عصر علماء سے دینی و مذہبی مسائل پر تبادلۂ خیال کیا کرتے اور اپنے شاگردوں کو درس دیا کرتے۔ اُن کے جامع الکمالات ہونے کی شہرت اُن کی زندگی ہی میں دُور و نزدیک پھیل چکی تھی۔ چنانچہ کشمیر اور بیرونِ کشمیر کے ہزاروں طالبین اور شوقین شاگردوں نے اُن کی اُستادی سے فیض اُٹھایا۔ اس طرح سے اُن کے حلقۂ ارادت میں ایک ہزار سے زیادہ طلباء شامل رہے۔

حضرت صرفی اپنے عہد کے اُن بلند پایہ عالموں اور مفکروں میں شمار ہوتے ہیں جو اپنی خداداد صلاحیتوں سے جس مضمون پر قلم اُٹھاتے ہیں تو اس کی فنی اور علمی باریکیوں کی گرہیں کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ صرفی نے تصوف و معرفت، دین و مذہب علم تفسیر و حدیث (اور شعر و شاعری) غرض ہر سنجیدہ مضمون پر خامہ فرسائی کی اور اپنے کمالِ تفکر اور ذہنی اُپج کی بدولت ہم عصر علماء اور اصحابِ قلم میں اس درجہ ممتاز ہوئے کہ "آئینِ اکبری" کے مصنف کے بقول "در تمام انواع شعر و علوم مختلف تسلط کامل داشت"۔

صرفی کی تصانیف کی تعداد دُو درجن کے قریب ہے جن میں سے اکثر تاحال زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہو سکی ہیں بلکہ صرف قلمی نسخوں کی صورت میں کہیں کہیں منتشر حالت میں موجود ہیں۔ اس فہرست سے صرفی کی ان تصانیف کو خارج سمجھنا چاہیے جن کے مسودات یا تو زمانے کی دست برد کا شکار ہو چکے ہیں یا جو محض کرم خوردہ اوراق کی صورت میں طاقِ نسیاں کی زینت ہیں۔

نظامی کے پنج گنج، امیر خسرو کے خمسہ اور جامی کے سبعہ کے اتباع میں صرفی نے بھی ایک پنج گنج تصنیف کیا ہے جس میں ان کی پانچ مثنویاں مسلک اخیار، وامق و عذرا، لیلیٰ مجنوں، مغازی النبی اور مقاماتِ مرشد شامل ہیں۔

خمسہ کے علاوہ حضرت صرفی کی یہ تصانیف ہیں:

۱۔ شیخ فیضی نے اپنی بے نقط تفسیر سواطع الالہام دربارِ اکبری میں صرفی کو پیش کی تو انہوں نے فی البدیہہ اس کے آخری دو پاروں کی عربی زبان میں ایک تقریظ تفسیر لکھ ڈالی جو مفسرانہ اصول اور رموز و نکات کا ایک خزینہ ہے۔

۲۔ صحیح بخاری کے احادیث کی مبسوط شرح و تفسیر

۳۔ مناسک الحج۔ صرفی نے اس کتاب میں قرآن اور حدیث کی روشنی میں حج کے اُن تمام مسائل اور فرائض پر عالمانہ بحث کی ہے جن سے واقف ہونا ایک مرد مومن کے لئے اشد ضروری ہے۔ یہ تصنیف عربی زبان میں ہے۔

۴۔ حاشیۂ توضیح و تلویح۔ علامہ شیخ سعد الدین تفتازانی کی علم فقہ پر مشہور 16
کتاب "توضیح و تلویح" پر حاشیہ۔

۵۔ اربعین۔ حضرت علی مرتضےٰ رض اور اہلِ بیت کی شانِ اقدس میں صحاح ستہ سے احادیث جمع کر کے صرفی نے چالیس چالیس حدیثیں فارسی نظم میں پیش کی ہیں۔

۶۔ کنز الجواہر: فنِ تعبیر پر ایک محققانہ کتاب جس کا سن تصنیف ۹۸۱ھ ہے۔

۷۔ ید بیضا:۔ مولانا صرفی نے اپنے تمام معمے اس کتاب میں جمع کر دیئے ہیں اور ان میں ان کی شرح بھی شامل ہیں۔

۸۔ ثلاثیاتِ بخاری کی تمہید اور شرح:۔ صحیح بخاری شریف کی تین راویوں والی احادیث کے معنی اور اُن کی شرح۔

۹۔ روایح:۔ یہ کتاب صرفی نے حضرت جامی کی روایح کی تقلید میں لکھی ہے۔ ان میں ۴۵ رایحہ ہیں جن میں معرفت کے راز اور سلوک اور تصوف کے مدارج کا بیان ہے۔ مولانا نے یہ کتابچہ ۹۵۹ھ میں قلمبند کیا۔

۱۰۔ رسالہ ذکریہ:۔ اس منظوم و منثور رسالہ میں بھی سلوک و تصوف کے رازوں کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔

۱۱۔ حضرت نے عمر کے آخری دنوں میں تفسیر کبیر کی طرز پر قرآن حکیم کی ایک شرح لکھنا شروع کی تھی۔ شیخ عبدالقادر بدایونی نے اس کے مسودہ کو دیکھ کر اس کام کی داد دی تھی لیکن ابھی صرفی نے اس کام کو ہاتھ لگایا تھا کہ دنیا نے دفا نہ کی اور آپ کا انتقال ہوا۔

۱۲۔ مناقب الاولیاء۔ اس مجموعہ میں حضرت صرفی کے وہ مناقب درج ہیں جو انہوں نے خلفائے راشدین۔ صحابۂ کبار، اہلبیت اور اولیائے کاملین کی شان

۳۔ قصائد: مولانا صرفی نے وقتاً فوقتاً چاریارانِ باصفا، حضرت امیر کبیرؒ، اولیائے ... حضرت شیخ نور الدین کی تعریف و توصیف میں چند قصیدے لکھے جن کے ... کی تعداد ۱۲۰۰ سے زیادہ ہے۔

۴۔ رباعیات و قطعات: ان میں سے اکثر سال ۹۹۷ھ کی تخلیق ہیں۔ رباعیات ... تعداد ... سو اور قطعات پچیس سے زیادہ ہیں۔ صرفی نے عوارف المعارف، فصوص الحکم ... اور لمعات کے اعلیٰ مضامین کا مختصر ترجمہ بھی رباعیات کی شکل میں پیش کیا ہے اور اس پر اپنی طرف سے شرح بھی لکھی ہے۔

۵۔ دیوانِ صرفی: مولانا کی فارسی غزلیات کا مجموعہ جو ساڑھے آٹھ سو غزلیات پر مشتمل ہے۔ اس میں سنہ ۹۹۵ھ تک کی لکھی ہوئی غزلیات درج ہیں۔ ایک غزل ملاحظہ ہو:

غزل

شد لالہ عذارے دگرم جلوہ گر امشب
دارم بردل سوختہ داغ دگر امشب
او را ز کفِ اغیار کشد ساغر گلگوں
ما را مئے گل رنگ ز خونِ جگر امشب
خورشید اگر شب بہ بہ نور نخوا اہم!
خواہم مہِ رخسار ترا در نظر امشب
پروانہ بگرد سر آں شمع چہ گردی
از دودِ دلِ سوختہ ام کن حذر امشب
پیش از شبِ دیدار دلم بردی و جاں ہم
برپائے تو از دیدہ بریزم گہر امشب
عمر گفت چہ جانکاہ بود صحبت ناجنس
باید کہ طرب راکنی از دل بدر امشب
صرفی و ترش در قدم یار شب وصل
یارب کہ تیا بند رقیباں خبر امشب


کمال سرہندی کا لکھا ہوا ... مولانا کی مثنوی "وامق عذرا" کا ایک مصور صفحہ

مولانا صرفی کا مقام شعر و شاعری، فلسفہ و تصوف خاص کر دین و معرفت اور فقہ و حدیث کے میدان میں بلند اور برتر ہے۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے ان کو "جمع فضل و کمالات" اور مذہبی معاملات میں سب سے بڑی سند قرار دیا۔ صرفی نے تمام مضامین پر قلم اٹھاتے وقت حکمت و فراست کے وہ موتی پروئے ہیں کہ ان کو "علم ظاہر و باطن کے جامع" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ان کا شمار آج بھی کشمیر کے جلیل القدر عالموں اور سخن وروں میں ہوتا ہے۔

# کیا ہوا اے صبا

## ثوبان فاروقی

ہاں اے صبا
مجھ کو معلوم ہے
تو سمندر کے اس پار کی صبح کا
ایک پیغام لے کر چلی تھی
تیرے ملبوس پر کالی موجوں نے تھوکا
تیرے رخسار پر تیز کرنوں کے نیزے سجائے گئے
اک تماشا ہوا
اور سجوری نوکیلی چٹانوں پہ کچھ گیت پائے گئے
اور سوکھے درختوں کی الجھی ہوئی ٹہنیوں پر
زرد پتوں میں لپٹی ہوئی آخری چیخ بھی مل گئی!

تو کیا ہوا
چاند کالی رتوں کی اداسی تھے، ہاں اداسی سہی
چمکتا تو ہے
صبح کی میز پر روزناموں کی ہلچل، ہلچل سہی
صبح ہوتی تو ہے
شام ہوتی تو ہے
رات آتی تو ہے
دن گزرتا تو ہے
میرے آنگن میں یوں بھی بلاناغہ چھوٹے بڑے حادثے
وارداتیں، وقوعے،
گناہوں کے کمزور لمحوں کے، دہشت دھماکوں کے قصے
ہوتے رہتے ہیں، ہوتے رہیں گے

کیا ہوا آج کے دن کا آغاز بھی
زرد سورج کے لب کی فغاں بن گیا!



## گوربخش سنگھ

"صاحب . . . صاحب . . . صاحب جی!"

رات کے بارہ بجے ہیں۔ کمل اسکوٹر کے ساتھ ایکسی ڈنٹ ہونے کی وجہ سے ایک ہفتہ ہسپتال میں رہ کر آج ہی آئی تھی اور اُسے گرم پانی والی بوتل سے سینک کرتے ہوئے یشونت کی آنکھ لگ گئی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا

"کیا ہے رامے؟"

"صاحب . . . ٹرنک کال . . . لدھیانہ سے۔"

"ہیلو . . . ہیلو . . . کون ستی . . . ایکسی ڈنٹ کہاں ہوگیا ہے۔ سیریس تو نہیں۔ . . . او مائی گاڈ! . . . کیا کمل بھی آئے . . . وہ آج ہی ہسپتال سے واپس آئی ہے۔ . . . امیتا کو ہوش تو ہے . . . او مائی گاڈ! ہماری موٹر بھی ورکشاپ میں ہے . . . ٹیکسی منگواتا ہوں۔"

"کیوں لیش جی . . . ایکسی ڈنٹ . . . امیتا کو میں بھیج نہیں رہی تھی . . ."

"جا رامے . . . فوراً جا . . . جیسے بھی ملے ٹیکسی لے آ۔" (پیچھے سے آواز دے کر) "لیکن دیکھنا کسی سردار کی ٹیکسی نہ لانا۔ سردار بڑے رشی ہوتے ہیں۔ جیسے کمل کہتی ہے۔" یشونت نے سوٹ کیس میں دونوں کا ایک ایک سوٹ ڈال دیا مبادا ایک دن وہاں رہنا ہی پڑ جائے۔

ٹیکسی کا ہارن ہوا۔ ڈرائیور باہر نکل کر پاس کی بالٹی سے بھر کے ریڈی ایٹر میں ڈال رہا تھا۔ یشونت نے کھڑکی میں سے دیکھا۔

"اوہ! پاگل راما! کسی سردار کو ہی لے آیا ہے۔" راما سوٹ کیس اٹھانے کے لئے اندر آیا۔

"تجھے کہا تھا . . . سردار کی ٹیکسی نہ لانا۔"

"صاحب میں نے بڑی کوشش کی . . . دو ڈبل پر گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور کئی تھے لیکن کوئی جانے کے لئے تیار نہ ہوا۔ ایک دو سرداروں سے بھی پوچھا سب انکار کر دیتے تھے۔ میں نے ستر روپے بھی دینے کے لئے کہا . . . اتنے میں یہ سردار آگیا اور اپنی گاڑی اڈے کے نیچے کو لے ہی رہا تھا کہ میں نے اُس سے منت سماجت کی۔ کہنے لگا نہیں جا سکتا مجھے ابھی گاؤں جانا پڑ رہا ہے۔ میں نے ساری بات بتائی، ہماری اکلوتی امیتا کے ساتھ خطرناک ایکسی ڈنٹ ہوگیا ہے۔ بروقت وہاں پہنچنے سے شاید وہ بچ جائے۔ سردار سوچ میں پڑ گیا میں نے ستر روپے سنائے لیکن اس نے کوئی توجہ نہ دی۔ البتہ چابی منیجر سے مانگ لی اور مجھے ٹیکسی میں بیٹھنے کے لئے اشارہ کیا۔ میں نے کہا کہ صاحب بہت اچھے ہیں، ستر سے بھی زیادہ دے دیں گے . . . اُس نے پھر بھی کوئی توجہ نہ دی . . . اور کوٹھی کا نمبر پوچھ کر چل دیا۔"

"اچھا ہماری قسمت سے چکر پڑ گیا ہے۔ لیکن رامے! تو ہوشیار بیٹھنا۔ اس کے ساتھ بیٹھنا۔ سونا بالکل نہیں۔ اس کی ہر حرکت پر نظر رکھنا۔ ان ٹیکسی ڈرائیوروں کی کہانیاں سنتا ہی رہتا ہوں۔ کمل چابی دینا۔ اپنا ریوالور بھی ساتھ لے لوں۔ کل ہی پڑھا تھا کہ راستہ میں ٹیکسی ڈرائیور نے سامان سنبھال کے سواریوں کو ٹیکسی سے نیچے اتار دیا اور چلتا بنا۔"

یشونت اور کمل ٹیکسی میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے، اور راما ڈرائیور کے ساتھ۔ ڈرائیور کچھ ضرورت سے زیادہ ہی خاموش تھا۔ کسی بات میں حصہ نہیں لے رہا تھا۔ گاڑی چل دی۔

یشونت اور کمل ایک دوسرے کو بیدار رکھنے کے لئے آہستہ آہستہ گفتگو کر رہے تھے۔ امیتا خود بھی جانا نہیں چاہتی تھی۔ قسمت اُسے گھیر کے لے گئی۔ ماسی زور دے رہی تھی۔ انہوں نے تماس کیا۔ تماس ماسی کے حق میں پڑ گئی۔ امیتا مجھے پیار دے کر چلی گئی۔ میری خوش مزاج امیتا!

"اتنا ظلم ہمارے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ ہماری اکلوتی امیتا اس دنیا میں ہے۔ چوٹ ووٹ کی کوئی بات نہیں۔ بڑی سے بڑی چوٹ بھی ڈاکٹر ٹھیک کر دیتے ہیں۔"

ان کے خوف کے برعکس سردار ڈرائیور گاڑی بڑی احتیاط کے ساتھ چلا رہا تھا لیکن کوئی پچاس ساٹھ میل طے کرنے کے بعد یکدم اُس نے ٹیکسی روک لی۔

"[illegible] ٹھیک رہا ہے نا؟" یشونت نے یکدم محتاط ہوکر کہا۔ اور اپنا پستول [illegible]

"[illegible] رک کیوں گئے ہو؟ گاڑی تو ٹھیک ہے نا؟" یشونت [illegible] انداز میں پوچھا۔

"گاڑی ٹھیک ہے۔ میں ہی آج کچھ ٹھیک نہیں ہوں میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں میں آپ کے لئے کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔ ذرا رک گیا اب ٹھیک ہوں ۔۔۔"

ڈرائیور نے کچھ دیر رک کے پھر ٹیکسی چلا دی۔

گاڑی چلتی رہی لیکن پچاس میل چل کے پھر رک گئی۔ اس مرتبہ آس پاس دور و نزدیک کوئی آبادی نہیں تھی اور اندھیرا بھی گہرا ہو گیا۔ یشونت نے پستول پر سے ہاتھ نہیں ہٹایا تھا۔ راستے کا کندھا تھپک کے اُسے ہوشیار کر دیا۔

"آپ فکر نہ کیجئے۔" ڈرائیور نے کہا۔ میری حالت کچھ ٹھیک ہو جائے تو چلتا ہوں جتنی دیر ٹیکسی رکنے سے وقت ضائع ہوتا ہے۔ سب کی کمی پوری کر دوں گا۔۔۔ لیکن آپ کی حفاظت کی مجھے بہت فکر ہے۔ رات اندھیری اور سڑک سنسان ہے۔"

ڈرائیور کے الفاظ بڑے تسلی بھرے تھے لیکن یشونت کی پوری تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ اُس نے پستول کو مضبوطی سے تھامے رکھا۔

انہوں نے ٹیلیفون پر معلوم کر لیا تھا کہ ایکسی ڈنٹ چنڈی گڑھ کے قریب ہی ہوا تھا۔ بس امیتا کی کھلی جیپ ٹکرا گئی تھی۔ امیتا جیپ سے باہر گر پڑی تھی۔ اور بس کے کسی سخت حصے سے چوٹ لگنے کی وجہ سے اس کا سر پھٹ گیا تھا۔

ہسپتال پہنچ کر معلوم ہوا کہ امیتا کی موت موقع واردات پر ہی ہو گئی تھی۔ اٹھارہ برسوں کی خوبصورت لڑکی کی لاش تمام بستر پر پھیلی ہوئی تھی۔ کمل اُس کے ساتھ لپٹ گئی۔ یشونت اس کی طرف دیکھ نہیں رہا تھا۔ اس نے منہ دوسری جانب کر لیا اور آنسو پونچھنے لگا۔

"اپنی امیتا دیوی کے آخری درشن کر لیجئے۔" کمل نے یشونت سے کہا۔

"نہیں! میں امیتا کا ہمیشہ خوبصورت اور ہنس مکھ چہرہ ہی اپنی آنکھوں میں رکھنا چاہتا ہوں۔ یہ چہرہ موت کا نہیں۔ اس ظالم بس ڈرائیور کا ہے جس نے ہماری امیتا کو مار کے پیچھے گھوم کے دیکھا تک نہیں۔ یہ چہرہ میری امیتا کا نہیں۔ ہاتھ اسی کے ہیں۔ میں ان خوبصورت ہاتھوں کو چوم لیتا ہوں۔"

سردار ڈرائیور کے رونے کی آواز تو نہیں آ رہی تھی لیکن رومال سے اس کا جلدی جلدی آنکھیں پونچھنا یہ بتا رہا تھا کہ اس سے اپنے آنسو روکے نہیں جا رہے تھے۔

امیتا کو اسٹریچر پر ڈال دیا گیا تھا۔ قریب ہی دو نرسیں بھی تھیں۔ اسٹریچر کو ایک طرف سے امیتا کے ماموں نے تھاما اور دوسری جانب سے سردار ڈرائیور نے اور ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بڑے احترام کے ساتھ لٹا دیا۔ اگلی سیٹ پر یشونت اور کمل ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گئے۔ ڈرائیور کے ہاتھ کئی مرتبہ کانپے مگر وہ رکا نہیں ہاتھوں کو مضبوط کر کے وہ گاڑی چلاتا رہا۔

لدھیانہ میں امیتا کے ننھیال میں صبح امیتا کے داہ سنسکار کی تیاری ہو رہی تھی۔ تمام رشتہ دار اُس ہنس مکھ امیتا کی باتیں کر کے سسک رہے تھے۔ ایک طرف سردار ڈرائیور کے آنسو دوسروں کی طرح چھم چھم تو نہیں بہہ رہے تھے بلکہ ایک ایک کر کے ٹپک رہے تھے۔ اور وہ رومال سے پونچھ لیتا تھا۔

سب نے اس سے کھانے پینے کے لئے اصرار کیا اس کے سامنے کھانا لا کر بھی رکھا گیا، لیکن اس نے کوئی چیز منہ میں نہیں ڈالی۔ چتا پر امیتا کو لٹا دیا گیا۔ رشتہ دار چتا پر لکڑیاں چن رہے تھے۔ بھاری لکڑیاں سردار ڈرائیور نے چتا پر رکھیں اور جب آخری بار چہرہ دیکھا جا رہا تھا۔ تب سردار ڈرائیور بھی آگے بڑھا اور ہاتھ جوڑ کر سر جھکا کر لوٹ آیا۔

امیتا کا داہ سنسکار ہو گیا۔ یشونت اور کمل جس طرح آئے تھے اسی طرح ٹیکسی میں واپس لوٹ آئے لیکن اس بار یشونت نے پستول پر ہاتھ نہیں رکھا تھا۔ سوٹ کیس میں اُسے بند کر دیا تھا نہ ہی اُس نے ڈرائیور کی ہر حرکت پر نظر رکھی۔ بلکہ وہ اور کمل ڈرائیور کی احتیاط، خوبصورت ڈرائیونگ اور اُس کے درد بھرے دل کی من ہی من میں تعریف کر رہے تھے۔

ڈرائیور حسب معمول راستے میں کہیں رکا نہیں۔ کمل سارا راستے اُس کی چوڑی پشت کی جانب تاکتی رہی اور سوچتی رہی کہ اس سردار کی مراد ٹیکسی ڈرائیور سے کتنی مختلف اور انوکھی بھی۔ یشونت نے سردار ٹیکسی ڈرائیوروں کے بارے میں بڑی غلط رائے قائم کر رکھی تھی۔

کوٹھی پہنچ کر ڈرائیور نے کمل کی طرف کا دروازہ خود کھولا۔ کمل کی آنکھیں پُر آب تھیں۔ شاید امیتا کی اس یاد کی وجہ سے کہ اب کبھی اس کی ہنسی کی روپہلی جھنکار اس بدقسمت کوٹھی میں سنائی نہیں دے گی۔

یشونت نے اپنے بٹوے میں سے اسّی روپوں کے نوٹ نکال کر ڈرائیور کے ہاتھ میں تھما دیئے۔ ڈرائیور نے دس دس کے پانچ نوٹ جیب میں ڈال کر باقی تین یشونت کو واپس کر دیئے۔

"نہیں سردار جی۔ یہ میں نے آپ کو انعام کے طور پر نہیں دیئے۔ یہ آپ کا حق ہے . . . ."

"میرا حق آپ پر بالکل نہیں بنتا" ڈرائیور نے مضبوط سی آواز میں کہا "آپ کے لیے جانے سے میں نے ایک دم انکار کر دیا تھا صرف جب آپ کے نوکر نے بتایا کہ بروقت پہونچنے پر شاید کسی کی جان بچ جائے تو میں تیار ہو گیا۔"

"آپ اسی کی طرف سے لے لیجیے" یشونت نے تین نوٹ ڈرائیور کی جیب میں ڈال دیے لیکن اس نے جلدی سے نکال کر واپس کر دیئے۔

"وہ اگر بچ جاتی تو میں اس سے لے لیتا . . . آپ سے میں نہیں لوں گا کیونکہ آپ کے لیے میں نے دو دکھا انکار کر دیا تھا . . . . وہ دکھائی کسی انعام کی حق دار نہیں۔"

یشونت ایک کوشش اور کرنے والا ہی تھا کہ کمل نے روک لیا "یش جی انہیں مجبور نہ کیجیے ان کا احسان ہم تین نوٹوں سے ادا نہیں کر سکتے۔ ان کا یہ احسان میں انھیں یقین دلاتی ہوں، ساری عمر ابیتا کی ناقابلِ فراموش یاد کی طرح سنبھال کر رکھوں گی۔" اور کمل کا گلا بھر آیا۔

ڈرائیور کمل کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ یشونت کے ساتھ اس نے باتیں کی تھیں لیکن اس کے چہرے کی طرف ایک بار بھی نہ دیکھا تھا کمل کی طرف دیکھ کر اس نے ایک کاغذ اپنی جیب سے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا "میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ یہ کاغذ میں آپ میں سے کسی کو نہیں دکھاؤں گا لیکن بی بی جی کے لفظوں میں ایسا کچھ ہے کہ میں اپنے فیصلے پر قائم نہیں رہ سکا"

کمل نے وہ کاغذ کھول کے پڑھا۔ وہ ایک تار تھا۔ پڑھتے ہی کمل کی آنکھیں یوں بہہ پڑیں جیسے آسمان سے کوئی بادل ٹوٹ پڑتا ہے۔ تار نم بھیگ گیا —

یشونت نے کمل کے ہاتھ سے تار پکڑ کے پڑھا۔

"پتا اچانک مرگیا — فوراً پہنچو"

"یہ تار ایک گھنٹہ قبل مجھے ملا اور گاڑی اڈے پر سے کر مجھے بارہ بجے کی ریل سے گاؤں جانا تھا۔ مگر جب آپ کے نوکر نے بتایا کہ موقع واردات پر فوراً پہونچنے سے آپ کی بچی کی جان بچ سکتی ہے۔ تو میں نے سوچا کہ پتاجی کو تو واپس نہیں لا سکتا لیکن اگر بی بی کی جان بچ جائے تو واقعی ایک بات ہوتی اور راستہ میں پتا کی یاد گاڑی کی وھیل پر میرے ہاتھ مضبوط نہیں رہنے دیتی تھی۔"

کمل اور سسک پڑی اور ساڑھی کے کونے سے آنکھیں اور منہ پونچھ کر اس نے ہاتھ جوڑے اور کہا "اچھے سردار جی کیا آپ مجھے اپنے چرنوں کو چھو لینے دیں گے"

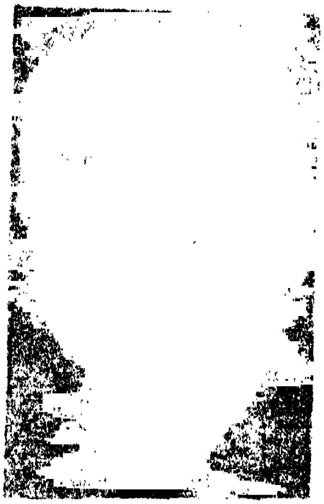
ڈرائیور نے کمل کے جڑے ہاتھوں کو پکڑ کر اپنی آنکھوں سے لگایا اور اپنی آنکھیں پونچھتا ہوا وہ ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔

سڑک کی بجری پر پہیوں نے کرچ کرچ کی۔ کمل ٹکٹکی لگائے ٹیکسی کو دیکھتی رہی۔ ٹیکسی پھاٹک سے گزری۔ کمل کے پاؤں لڑکھڑائے۔ یشونت نے اسے سہارا دینے کے لیے بازوؤں میں لے لیا۔ "اندر چلو کمل . . ."

لیکن کمل اتنی دیر تک وہیں کھڑی رہی جب تک ٹیکسی اسے نظر آتی رہی۔

( ترجمہ: سرجیت )

## مہیش پٹیالوی



# مانگے کا اجالا

کالے چشمے کی آنکھوں سے
آج کی دنیا دیکھ رہا ہوں
اور سکھی ہوں
دن کا خوف نہ رات کا غم ہے
اور نہ اس کی فکر ہے مجھ کو
کون ہے اپنا کون پرایا
کون ہے پیلا کون ہرا ہے
باغ میں جتنے پھول کھلے ہیں
سب پر ایک ہی رنگ چڑھا ہے
کالے چشمے کے شیشوں کا۔
ننگی آنکھ سے،
اس دنیا کو
اصلی روپ میں دیکھ سکیں جو
کس کے پاس ہیں ایسی آنکھیں؟
کس کے پاس ہیں اپنی آنکھیں؟؟

# کٹک

حفیظ اللہ نیولپوری

کٹک اڑیسہ کا بہت قدیم شہر ہے۔ تیرہویں صدی عیسوی میں اس شہر کی بنیاد رکھی گئی۔ یہ شہر اڑیسہ کی مشہور و معروف دریائے مہاندی کے کنارے واقع ہے — — — — — — اور شمال میں مہاندی بہتے ہے کر جنوب میں کاٹھ جوڑی تک ۱۵ مربع میل کی سطح پر پھیلا ہوا ہے یہاں جنوبی مشرقی ریلوے شہر کٹک سے ہو کر گزرتی ہے اس کے علاوہ کلکتہ سے مدراس تک کی گرینڈ ٹرنک روڈ بھی کٹک کی راہ سے گزرتی ہے۔ یہ سڑک کٹک میں دریائے مہاندی کو ہندوستان کے طویل ترین پل "مہاندی برج" کے ذریعہ عبور کرتی ہے ان تمام سہولتوں کی بنا پر زمانہ قدیم سے کٹک اڑیسہ کی راجدھانی رہا۔ کٹک کے شمال میں چودوار اور جنوب میں سارنگا گڑھ کے مسمار قلعوں کا نشان اب بھی باقی ہے۔ چودوار کا قلعہ بروپا ندی کے بائیں ساحل پر اور سارنگا گڑھ کا قلعہ کاٹھ جوڑی ندی کے داہنے ساحل پر واقع ہے۔ زمانہ قدیم سے شاہراہوں کی سہولت کے پیش نظر کٹک کو کافی تجارتی اہمیت بھی حاصل رہی ہے۔

سنسکرت میں کٹک کے معنی قلعہ، دارالسلطنت یا سرکاری مرکز کے ہیں جو فوجی حفاظت میں ہو۔ اڑیسہ کے تخت پر تیرہویں صدی کے اوائل میں اننگ بھیم دیو قابض ہوا۔ اس دور میں شمال کی جانب سے مسلمان حکمرانوں کی یورش کے خوف سے اننگ بھیم دیو کو اپنے ملک کی حفاظت کا خیال پیدا ہوا۔ اور اس نے دارالسلطنت کے لئے عظیم دریائے مہاندی اور کاٹھ جوڑی سے محصور خطہ ارض کو منتخب کیا۔ یہ جگہ حفاظتی نقطۂ نظر سے بے مثل تھی۔ اننگ بھیم دیو نے اپنی راجدھانی کا نام ابھی نو وارانسی کٹک" رکھا۔

شہر کٹک کے قیام اور گھوڑے کی نعل نما اس کی وضع سے قدیم زمانے کے انجینیروں کے کمال کا اظہار ہوتا ہے۔ کٹک سے متعلق مہاندی اور کاٹھ جوڑی کے ساحلوں پر دیو ہیکل سنگی پشتوں کی بنیاد رکھی گئی ہے جو ایک طرف شہر کو فطرت کے سیلابی حملوں سے بچاتے ہیں تو دوسری طرف شہر کو فوجی نقطۂ نظر سے قابل اطمینان طور پر محفوظ رکھتے ہیں انجینیرنگ کے اس عظیم کارنامے میں تیرہویں صدی کے اڑیا انجینیروں نے کونارک کی تعمیر کے ساتھ ساتھ شہر کٹک کی حفاظت کے لئے سنگی پشتے قائم کر کے یہ ثابت کر دیا کہ فطرت کے دہشت ناک حملوں سے کس طرح عوام کو بہ آسانی محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔

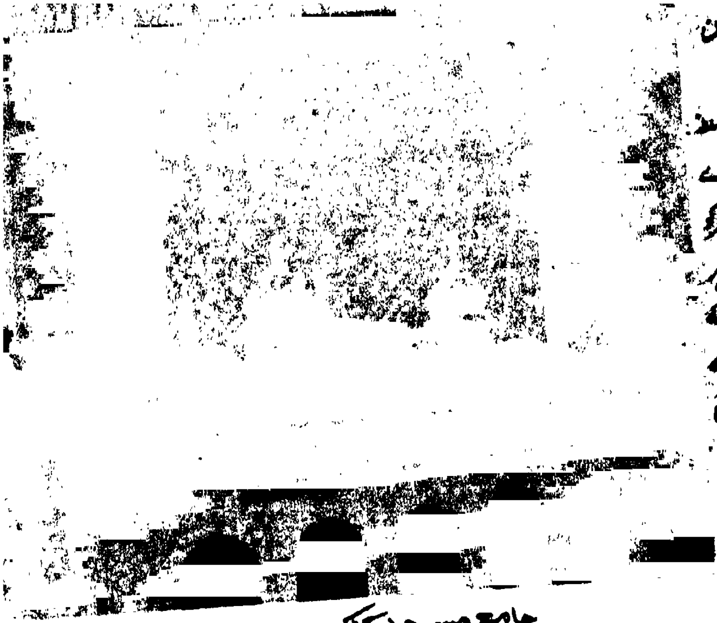
اننگ بھیم دیو کے بعد اس کا لڑکا نرسنگھ دیو اول ۱۲۳۸ء میں اڑیسہ کے تخت پر قابض ہوا اور ۱۲۴۳ء سے ۱۲۴۹ء تک بنگال کے خلجی سلاطین سے برسر پیکار رہا۔ کونارک کا عظیم سوریہ مندر جو غالباً بنگال کے سلطان کے ساتھ جنگ کے بعد ہی تعمیر ہوا تھا نرسنگھ دیو اول کا ایک عظیم کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ نرسنگھ دیو کی کل کارکردگی کا مرکز اڑیسہ کا دارالسلطنت "ابھی نو وارانسی کٹک" ہی تھا۔ اڑیسہ کے تخت پر فیروز شاہ اور اس کے بعد حسین شاہ بھی کچھ عرصہ تک قابض رہے لیکن بھانو دیو کے سپہ سالار کپلیشور دیو نے ۱۴۳۵ء میں اڑیسہ کے تخت پر قبضہ کر لیا بعد میں کپلیشور دیو نے خود کو ایک عظیم حکمراں ثابت کیا۔ اس نے نہ صرف اپنے دور حکومت میں داخلی امن و تحفظ بدرجہ اتم قائم کیا بلکہ دور دراز جنوبی ہند کے علاقوں پر بھی قبضہ کرتا چلا گیا اور مسلم سلاطین کے حملوں سے بھی اڑیسہ کو بچائے رکھا۔ اس ضمن میں خود کپلیشور دیو کا تصنیف کردہ ایک ایکٹ کا سنسکرت ڈرامہ "پرسورام وجے" قابل ذکر ہے۔ اس ڈرامے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے گیت اڑیا ہی میں منظوم ہیں۔ اس کے علاوہ کپلیشور دیو کے عہد حکومت میں اڑیا زبان کے اولین شاعر اعظم سارلا داس

... اس طرح سے ثابت ہوتا ہے کہ اڑیا زبان اور ادب کی ترویج و بقا کے لئے کپلیشور دیو کا عہد حکومت ایک زریں عہد تھا۔

ملک کی آزادی کے بعد شہر کٹک میں گنجان آبادی کے پیش نظر اڑیسہ کا دارالسلطنت کٹک سے بھوبنیشور منتقل ہوا۔ بھوبنیشور کٹک سے ۱۸ میل کی دوری پر واقع ہے۔ دریائے مہاندی اور کوکھائی پر دو پلوں پر سے ہوتی ہوئی پختہ سڑک کٹک سے بھوبنیشور کو منسلک کرتی ہے۔ اڑیسہ کی راجدھانی کے بھوبنیشر چلے جانے کے باوجود اب بھی شہر کٹک کو ثقافت، تجارت اور صنعت و حرفت کا ایک اہم مرکز سمجھا جاتا ہے۔ پچھم کے بازاری علاقوں کے لئے کٹک کی حیثیت صدر دروازہ کی ہے۔ اس کے علاوہ شہر کے اطراف میں چھوٹی بڑی نہروں کا گویا کہ جال سا بچھا ہوا ہے جس کی وجہ سے ندیاں پاری کے لئے سہولتیں میسر ہیں اور کٹک کو تجارتی اہمیت بھی حاصل ہے۔ کٹک چاندی کی تارکشی، طرح طرح کے زیورات اور سینگ کی چیزوں کے لئے سارے ملک میں مشہور ہے۔

اڑیسہ کی راجدھانی کے بھوبنیشر منتقل ہونے کے باوجود اڑیسہ کا ہائی کورٹ ابھی کٹک ہی میں ہے یہاں ایک میڈیکل کالج اور اس سے متعلق بہت بڑا اسپتال قائم ہے۔ اتکل یونیورسٹی کے "بھوبنیشر وانی بہار" میں تبدیل ہو جانے کے باوجود بھی کٹک کو تعلیمی مرکز سمجھا جاتا ہے۔ فی الحال کٹک میں ایک میڈیکل کالج کے علاوہ راونشا کالج، کرائیسٹ کالج، اسٹیورٹ سائنس کالج، مدھوسودن لاء کالج، شیل بالا ویمنز کالج اور رادھاناتھ ٹریننگ کالج درس و تدریس کا مرکز سمجھے جاتے ہیں۔ کٹک میں ایک انجینئرنگ اسکول بھی ہے۔ شہر میں قابلِ لحاظ تعداد میں ہائی اسکولز ہیں۔ ان میں کرائیسٹ کالجیٹ (مشن اسکول) سب سے قدیم سمجھا جاتا ہے۔ ان کے اسکولوں اور کالجوں میں اسٹیوارٹ سائنس کالج اور کرائیسٹ کالج کے ماسوا مخلوط تعلیم کا عام رواج ہے۔ لیکن لڑکیوں کے لئے الگ کئی اسکولز و کالج بھی ہیں۔ یہاں عام طور پر سیکنڈری اسکول تک ذریعۂ تعلیم صوبائی زبان ہے لیکن اڑیا بازار اردو گرلز اسکول" اور سعید سمنری میں ذریعۂ تعلیم اردو ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کے کئی اسکولوں میں اردو اور فارسی (بحیثیت اختیاری





جامع مسجد کٹک

مضمون) کی تعلیم کا انتظام بھی ہے۔ راونشا کالج میں بی۔ اے تک فارسی میں "آنرز" کی تعلیم دی جاتی ہے اور پروفیسر سید مسیح اللہ صدر شعبۂ اردو و فارسی کی کد و کاوش سے طلبا میں فارسی کی تعلیم کا رجحان یہاں اب بھی زندہ ہے۔ شہر کٹک میں اردو ٹیچرز ایلیمنٹری ٹریننگ اسکول زمانہ قدیم سے قائم تھا۔ جو آج کل سیکنڈری ٹیچرز ٹریننگ اسکول میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اس اسکول میں پرائمری اسکول، مڈل اسکول اور ہائی اسکول کے لئے اساتذہ کو ٹریننگ دی جاتی ہے اس اسکول کا ذریعہ تعلیم بھی اردو ہے۔

کٹک میں قدیم طرز کی مسجدیں اور منادر ہیں۔ یہاں کی مسجدوں میں دیوان بازار کی مسجد، قلعہ کی شاہی مسجد، اجابی خاں کی مسجد اور جامع مسجد سب سے قدیم تصور کی جاتی ہیں۔ اُن سے دیوان بازار کی مسجد شاہجہاں کے دورِ حکومت میں قلعہ کی شاہی مسجد شاہ عالم ثانی کے دورِ حکومت میں اور جامع مسجد انگریز کے دورِ حکومت میں تعمیر ہوئی تھیں۔

شہر کٹک کے درگاہ بازار میں "قدم رسول" بہت بڑی اہمیت کا حامل مقام ہے۔ ۱۷۵۰ء میں شاہ عالم کے دورِ حکومت میں نواب شجاع الدین محمد خاں نے اس زیارت گاہ کی تعمیر کروائی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نقش پا حاصل کر کے یہاں محفوظ کیا۔ قدم رسول کا احاطہ بہت ہی وسیع و عریض ہے۔ اسی احاطہ میں نواب محمد تقی خاں کا مزار بھی ہے۔ اس کے علاوہ یہ حصہ قبرستان کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور عرفِ عام میں ایک عظیم زیارت گاہ بن کر رہ گیا ہے۔

راونشا کالج

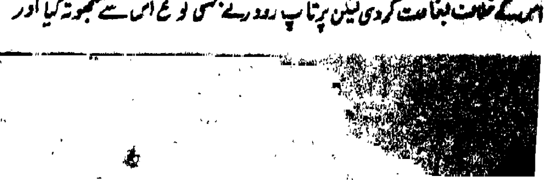
میں ... ایک مسجد بھی موجود ہے اور دروازے کے
... ایک عبادت خانہ بھی ہے جہاں ہر
... کا اژدہام ہوا کرتا ہے
کٹک کے مشہور علاقہ بخشی بازار کے پہلے
... کے مشہور و معروف اسٹوڈیو فوٹو
... کے پاس امر سنگھ مندر واقع ہے۔ یہ مندر
ایک بہت ہی قدیم مندر ہے اور ہر تہوار کے موقع
پر یہاں میلہ بھی لگتا ہے۔ کٹک میں دوسرا مشہور مندر
چنڈی کا ہے اور اس مندر کی مناسبت سے اس علاقہ کا
نام کٹک چنڈی ہوگیا ہے بخشی بازار سے کٹک چنڈی کو متصل کرنے
والی سڑک (مشن روڈ) پر مدھو پور ہاؤس میں آل انڈیا ریڈیو کے اسٹوڈیوز ہیں
اور اس کا ٹرانسمیٹر بارا باٹی قلعہ کے اندر نصب ہے۔ بارا باٹی کا یہ قلعہ اننگ بھیم دیو
کے دور حکومت میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اور مختلف ادوار میں حکمرانوں کے قیام گاہ کے طور
پر استعمال ہوتا رہا تھا۔ اس قلعہ کے چاروں طرف حفاظتی نقطہ نظر سے گہری کھائی کھدی
ہوئی ہے جو ہمیشہ پانی سے لبریز رہا کرتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کبھی اس قلعہ کے دیو ہیکل
دروازے پر کافی کشادہ آہنی کواڑ لگے ہوئے تھے۔ اس قلعہ کے اندر بھی ایک شاہی مسجد موجود
ہے جس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے مسجد کے علاوہ اس قلعہ کے اندر بخاری بابا کا مزار بھی ہے
جو لوگوں کے لئے زیارت گاہ کا درجہ رکھتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پرتاپ رودر دیو کو اس کی
حکومت کے اولین دور سے ہی والئ بنگال حسین شاہ سے زبردست مخاصمت رہی
بنگال میں حسین شاہ سے جنگ کے دوران پرتاپ رودر کے وزیر گووند ودیا دھر نے
اس کے خلاف بغاوت کردی لیکن پرتاپ رودر نے کسی نوع اس سے سمجھوتہ کیا اور

بالآخر حسین شاہ کو شکست دی لیکن حسین شاہ کو شکست دینا
بھی پرتاپ رودر کے اطمینان کا باعث نہ بن سکا —
دوسری جانب جنوب میں اس کے دو عظیم دشمنوں
یعنی وجے نگر کے کرشن دیو رایا اور گول کنڈا کے
قلی قطب شاہ نے اڑیسہ پر زبردست حملہ
کیا اور نتیجہ کے طور پر پرتاپ رودر کو اپنی
سلطنت کا وہ علاقہ جو دریائے گوداوری
کے اس پار تھا، اپنے دشمنوں کے حوالہ کرنا
پڑا۔ پرتاپ رودر کی وفات کے بعد اس کے
سرکش وزیر گووند ودیا دھر نے پرتاپ رودر کی کل
اولاد نرینہ کو ہلاک کردیا اور خود اڑیسہ کے تخت پر قابض
ہو کر کٹک کے اسی قلعہ میں رہنے لگا۔ اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ
یہ ہے کہ گووند دیو کی وفات کے بعد اس کے وزیر مکند دیو نے اڑیسہ کی عنان حکومت اپنے
ہاتھوں میں لے لی۔ مکند دیو کے دور حکومت میں سلیمان کرانی کے افغان جنرل کالا
پہاڑ نے اڑیسہ پر بہت ہی دہشت ناک حملہ کیا جس سے متعلق آج بھی اڑیا میں
ایک کہاوت مشہور ہے۔

"آسی لا کلا پہارو، بھانگی لا دہارو بارو، پی لیلا مہاندی پانی،
سونو تھالی رے ہیرہ پرسی رے مکند دیبنک رانی"

(کالا پہاڑ نے کٹک میں داخل ہو کر قلعہ کے آہنی دروازہ کو توڑ دیا، مہاندی سے پانی
پیا اور مکند دیو کی رانی نے طلائی طشت میں اس کے سامنے ہیرے پیش کئے۔)

شہر کٹک قدیم اور جدید اقدار کا امتزاجی نمونہ ہے۔ بارابائی قلعہ کے سامنے ایک
بہت بڑا میدان ہے جس میں ہر سال نومبر کے وسط میں کارتک پورنیما کے موقع پر "بالو
جاترا" کے نام سے ایک بہت بڑا میلہ لگتا ہے اور اس وسیع و عریض میدان میں ملک
کے قومی رہنماؤں کی آمد پر جلسے ہوتے ہیں۔ اس میدان کے مقابل
سڑک کی دوسری جانب بارابائی اسٹیڈیم ہے۔ اس اسٹیڈیم کی
عمارتیں اور گیلریز کافی خوبصورت اور نہایت دلکش ہیں اور اس اسٹیڈیم
کا شمار برصغیر ایشیا کے عظیم ترین اسٹیڈیمز میں ہوتا ہے۔ اس
اسٹیڈیم میں ہر طرح کے میچ اور کلچرل پروگرامز ہوا کرتے ہیں۔ اس کے
علاوہ کئی مرتبہ ہندوستان کے قومی کھیل بھی یہاں ہوچکے ہیں۔
کٹک چنڈی سے ایک سڑک شمال سے جنوب کی جانب



کٹک کا بارابائی قلعہ — بیرونی دروازہ

بارا بٹی اسٹیڈیم (مشرقی بلاک) — کٹک

بڑھتی ہے اور آگے بڑھ کر چاندنی چوک کو متصل کرتی ہے اسی چاندنی چوک میں دریائے کاٹھ جوڑی کے ساحل پر عظیم سنگی پشتوں سے متصل کٹک کی مشہور تاریخی عمارت "لال باغ" واقع ہے۔ اڑیسہ کے مغل گورنر معتقد خاں مرزا مکی نے ۱۶۳۳ء میں اپنی شہرت اور مقبولیت کی ایک عظیم یادگار کے طور پر "لال باغ" تعمیر کروایا تھا۔ لال باغ محل ۱۷۵۱ء تک مغل صوبے داروں کے زیر استعمال رہا اور اس کے بعد ناگپور کے بھونسلہ صوبے دار ۱۷۹۱ء سے ۱۸۰۳ء تک اس محل پر قابض رہے۔ ۱۸۰۳ء میں بھونسلہ راجہ رگھوجی ثانی پر فتحیابی کے بعد لال باغ انگریزوں کے قبضہ میں آیا۔ اس کے بعد مختلف دور میں لال باغ کٹک کے کمشنروں اور کلکٹروں کی رہائش گاہ بنا رہا۔ پھر ۱۹۴۲ء سے ۱۹۶۱ء تک یہ محل اڑیسہ کے گورنر کی قیام گاہ کے طور پر استعمال ہوتا رہا۔ ۱۹۶۱ء میں گورنر ہاؤس نئی راجدھانی بھونیشور منتقل ہو جانے کے بعد اس عظیم عمارت میں بچوں کا ہسپتال اور "بال بھون" قائم ہوا جو اب تک جاری ہے۔

لال باغ محل کے بعد کٹک کی دوسری عظیم عمارت اڑیسہ ہائی کورٹ کی ہے۔ ہائی کورٹ کی اس عظیم عمارت کی تعمیر ۱۹۱۳ء میں ہوئی تھی لیکن اس وقت سے اس میں صرف سول کورٹ قائم تھا۔ اب ۱۹۴۸ء میں یہاں ہائی کورٹ کا قیام عمل میں آیا۔ اور ۱۹۶۷ء میں کلکتہ ہائی کورٹ کی وضع پر ایک برج قائم کیا گیا ہے جس کی وجہ سے اس عمارت کی دلکشی دوچند ہو گئی ہے۔ یہ علاقہ شہر کا سب سے گنجان علاقہ ہے جہاں پر ہر وقت بھیڑ بھاڑ رہتی ہے۔

کچہری کا علاقہ ختم ہونے پر نیم چوڑی کا بازار ہے۔ جہاں زیادہ تر صرافوں کی بڑی بڑی دکانیں ہیں اس سے متصل بالو بازار کا علاقہ ہے۔ جہاں زیادہ تر کتابوں کی دکانیں ہیں۔ کٹک کی مشہور و معروف

اڑیسہ ہائی کورٹ — کٹک

جامع مسجد بھی شاہراہ بالو بازار پر واقع ہے۔ بالو بازار [illegible] عام میں "بنیا سڑک" کے نام سے مشہور ہے یہاں سڑک کی [illegible] کی بڑی بڑی بارونق دوکانیں ہیں اور اس کے علاوہ چند تھوک [illegible] اسی بازار میں ہیں۔ یہاں سے آگے بڑھئے تو چودھری بازار [illegible] شہر کی حیثیت حاصل ہے، اپنے اژدہام کے ساتھ ساتھ [illegible] اسٹیشنری، ملبوسات، جوتے، ادویات اور بینکوں کا تجارتی مرکز [illegible] بازار کے اختتام پر سڑک سے متصل ایک قدیم و وسیع پارک ہے جو [illegible] شنکر پارک" کے نام سے موسوم ہے۔ کٹک کا دوسرا بڑا پارک "گوپ بندھو باغ" ہے جو بخشی بازار مارکیٹ سے متصل اڑیسہ کی قدیم عربی درسگاہ "مدرسہ سلطانیہ" کے مقابل واقع ہے۔ یہاں سڑک کی دوسری جانب اڑیسہ کے مشہور و مقبول اڑیا روزنامہ "سماج" کا اشاعتی دفتر گوپ بندھو بھون میں واقع ہے۔ گوپ بندھو بھون سے پچاس قدم آگے اسی سڑک پر سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی بلڈنگ ہے۔ وائی۔ ایم۔ سی۔ اے کی بلڈنگ کے اختتام پر شاہراہ سے ایک پتلی سڑک پولیس لین کی طرف جاتی ہے اور ایک بہت ہی وسیع و عریض مصور میدان "پولیس گراؤنڈ" کے نام سے موجود ہے۔ اس گراؤنڈ میں عموماً پولیس پریڈ اور خصوصاً یوم آزادی کی تقریبات انجام پاتی ہیں۔

مندروں اور مسجدوں کے ساتھ ساتھ شہر کٹک میں کئی گرجے بھی ہیں اور شہر کے ایک سرے میں مہاندی کے کنارے کالیا بودہ کے پاس ایک گوردوارے کی تعمیر بھی عرصۂ دراز سے عمل میں آئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ گورو نانک جی پوری جاتے ہوئے کچھ دیر کے لئے اس مقام پر ٹھہرے تھے اور انہوں نے وہاں مراقبہ بھی کیا تھا۔ اور اسی جگہ پر اپنا مسواک بھی گاڑ دیا تھا۔ اس لئے یہ گوردوارہ "داتون صاحب"

... معروف ہے۔
... دارالمطالعے اور لائبریریاں بھی ہیں۔ ان میں سب سے بڑی
... لائبریری کی ہے جو راونشا کالج سے متعلق ہے۔ اس میں بیش قیمت
کتابوں کا ایک عظیم ذخیرہ موجود ہے۔ ابھی چند سال ہوئے اڑیسہ کے مشہور پنڈت
... پردیش کانگریس کمیٹی کے سابق صدر (۱۹۴۰-۴۱ء) پنڈت پران کرشن پڑھیاری
کے نام پر ... پارک کے پاس "پڑھیاری لائبریری" قائم ہوئی ہے جس کے ساتھ
ایک ... دارالمطالعہ بھی موجود ہے۔ عرصہ دراز سے قدم رسول کے احاطہ میں
انجمن کی لائبریری "اقبال میموریل لائبریری" کے نام سے موجود ہے۔ ادھر جناب معین الدین
احمد (ریٹائرڈ آئی۔ اے۔ ایس) اور دوسرے کئی علم دوست حضرات کی بے لوث
کدوکاوش کی وجہ سے "اردو لائبریری آف اڑیسہ" کے نام سے ایک عظیم لائبریری
کی تعمیر زیرِ انتظام ہے۔ یہ لائبریری صرف شہر کٹک ہی نہیں بلکہ پورے صوبہ کے
لئے قومی یکجہتی، علمی و ادبی خدمات کے علاوہ ثقافتی فرائض بھی ادا کرے گی۔

شہر کٹک سے سماج، کلنگا، پرجا تنترا اور مارو بھومی جیسے موقر روزنامے اڑیا
زبان میں شائع ہوتے ہیں اس کے علاوہ بہت سارے ہفتہ وار، پندرہ روزہ اور
ماہوار، ادبی، سیاسی، ثقافتی اور فلمی رسالے شائع ہوتے ہیں۔ ان رسائل میں صوبہ
کا واحد اردو رسالہ شاعسار قابلِ ستائش ہے جو اڑیسہ کے بزرگ شاعر اور ادیب
جناب احمد نجمی کے زیرِ ادارت چھ سال سے شائع ہو رہا ہے۔ پروفیسر کرامت علی کرامت
نے اڑیسہ کے اردو شعراء کا تذکرہ "آبِ خضر" کے نام سے تالیف کیا ہے جس سے
یہاں کی ادبی سرگرمی کے ساتھ یہاں کی شاعری کے مزاج کا بھی پتہ چلتا ہے۔ علمی و
ادبی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ کٹک سیاسی سرگرمیوں کی بھی آماجگاہ بنا رہا ہے
اب ادھر چند سال سے فلمی صنعت میں بھی کٹک کو خاطر خواہ ترقی ہوئی ہے یہاں کئی
فلم ساز کمپنیاں موجود ہیں جنہوں نے اڑیا کی اچھی اچھی فلمیں تیار کی ہیں اور قبولِ
عام کا شرف بھی حاصل کیا ہے۔ اس شہر میں اچھی تعداد میں سینما ہال موجود ہیں۔
اور اس کے ساتھ ساتھ کئی تھیٹر ہال بھی ہیں۔ جن میں عام طور سے اڑیا ڈرامے منعقد
ہوا کرتے ہیں اور کبھی کبھی اردو ڈرامے بھی اسٹیج ہوتے ہیں۔

کٹک کے شمالی مغربی گوشہ کا دور افتادہ علاقہ تلسی پور کے نام سے موسوم
ہے جو دریائے مہاندی کے بالکل کنارے واقع ہے۔ یہاں کی دوسری خوبی یہ ہے
کہ قدیم کٹک کی آبادی کا مرکز بھی یہی علاقہ تھا کٹک کے مشرقی کنارے پر جو یرا آئی کٹ
طلوعِ آفتاب کے وقت بڑا ہی دلکش منظر پیش کرتا ہے۔ زمانہ قدیم میں یہی
جگہ اڑیا تاجروں کے بحری سفر کی آماجگاہ تھی۔

کٹک شہر کی آبادی ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ڈیڑھ لاکھ سے اوپر
تھی جو اب تخمیناً دو لاکھ ہو چکی ہے۔ یہاں عام طور پر علاقائی زبان اڑیا بولی جاتی ہے۔ اور
دوسرے نمبر پر تیلگو اور تیسرے پر اردو کا شمار ہوتا ہے۔ یہاں کے لوگ بنگلہ اور
ہندی سے بھی آشنا ہیں خصوصاً ہندی زبان کی اشاعت کے لئے یہاں مدت مدید سے
آنکل پرانتی راشٹر بھاشا پرچار سبھا "کام کرتی ہے۔ اس سبھا کے زیرِ اہتمام ہندی کے
امتحانات ہوا کرتے ہیں۔ اڑیا کتابوں کا ہندی ترجمہ کیا جاتا ہے اور اس کے علاوہ اس
سبھا کا ایک اشاعتی شعبہ بھی ہے جس کا ترجمان ایک ہندی ماہنامہ یہاں سے
شائع ہوتا ہے۔ ادھر چند سال ہوئے "گاندھی بھون" کے نام سے ایک عظیم ہال کی
تعمیر عمل میں آئی ہے۔ شہید بھون کے بعد یہ کٹک کا عظیم ترین ہال سمجھا جاتا ہے۔

یہاں شہر کے اندر آمد و رفت کی سہولت کے لئے بسیں، ٹیکسیاں اور بے شمار
رکشے موجود ہیں جہاں اس شہر کی دوسری کئی خصوصیتیں ہیں وہاں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ
اس نے نیتاجی سبھاش چندر بوس جیسے عظیم قومی رہنما اور بین الاقوامی شہرت یافتہ
تیراک مہر سین کو پیدا کیا۔ یہاں کے مقامی رہنماؤں میں آنجہانی بیرسٹر مدھو سودن داس
کا سارا صوبہ معترف ہے۔ موصوف کی اڑیسہ میں صنعت و حرفت کی ترقی کے لئے کدوکاوش
کی یادگار کے طور پر کٹک کے صنعتی علاقہ کا نام مدھو پٹنہ رکھا گیا ہے۔ یہاں کی صنعتی پیداوار
میں لکڑی کے نہایت ہی نفیس فرنیچرز، اسپورٹس کا سامان، طباعت کے لئے بلاک
ادویات لوہے کے اوزار وغیرہ بہت ہی مشہور ہیں۔ اسی علاقہ میں ایک سرے پر
اڑیسہ گورنمنٹ پریس اور دوسرے سرے پر انڈسٹریل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کی عمارتوں
کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔

مرکزی کٹک سے ذرا ہٹ کر سینٹرل رائس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی عمارتیں دور
دور تک پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں ہر قسم کے دھان
کے پودوں اور دھان کی مجموعی اقسام پر ابتدائی تحقیق کا کام ہوتا ہے اور اناج کی
پیداوار کے سلسلہ میں معلوم فراہم کی جاتی ہیں۔ ادھر حال ہی میں اس انسٹی ٹیوٹ میں
دو اور شعبے کھلے ہیں جن میں سے ایک Rice Technology
سے متعلق ہے اور دوسرا Soil Technology سے۔

اڑیسہ کے قدیم دارالسلطنت کٹک کو نئی راجدھانی بھوبنیشور سے قریب ترلانے کے
لئے دول منڈائی چوک کے بعد راجہ باغیچہ کے قریب تعمیر شدہ لنک روڈ بڑی اہمیت
رکھتا ہے۔

اڑیسہ میں بسنے والوں کے بارے میں ایک روایت یہ ہے کہ زمانہ قدیم میں دیر گھاتما
نامی ایک مشہور و معروف سادھو رہتا تھا۔ اس کے پانچ لڑکے تھے۔ انگ، بنگ، کلنگ
پونڈرہ اور سہم۔ سادھو کے تیسرے لڑکے کلنگ نے ہندوستان کے جنوب کی طرف کوچ
کیا اور مشرقی ساحل پر آپہنچا۔ یہاں ایک پہاڑ کی چوٹی پر سے اس نے اس علاقہ کی

دلکش فضا اور سرسبز اراضی کو دیکھا۔ اس علاقہ میں فطرت کے دلکش نظارہ نے اس کا دل موہ لیا اور بلآخر للنگ نے اپنے لوگوں کے ساتھ اس علاقہ میں بسنے کا تہیہ کر لیا لیکن آثارِ قدیمہ کی تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ اوڈرا ( UDRA ) نامی ایک غیر آریہ نسل کے لوگ اس علاقے کے سب سے قدیم باشندے ہیں۔ مختصر یہ کہ اڑیسہ کے ساحلی علاقوں میں بسنے والے لوگ نسلی اعتبار سے زیادہ تر آریہ ہیں اور دیگر مقامات پر بسنے والے لوگوں میں سے بڑی تعداد قبائلیوں کی ہے۔ اڑیسہ کے باشندے نسلی اعتبار سے فی الحال اس قدر مخلوط ہو چکے ہیں کہ انہیں ہندوستانی مخلوط تہذیب کا ایک نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ مختلف تاریخی ادوار میں یہاں مختلف قوم اور نسل کے لوگ شمالی ہند سے بغرض تجارت اور مشنری تبلیغ کے یہاں آئے۔ اور اس علاقے میں بس گئے۔

اڑیسہ کی راجدھانی بھوبنیشور سے پانچ میل کی دوری پر دیا "ندی کے کنارے دھولی پہاڑ واقع ہے۔ اس پہاڑ پر اشوک کے کلنگ پر حملہ کر کے فتحیابی کے بعد کئی سنگی کتبے نصب کئے گئے ہیں ان کتبوں میں سے ایک کتبے پر مہامنتروں کے نام اشوک کا پیغام موجود ہے اور دوسرے میں شہزادہ (توشالی کے گورنر) کے نام ایک پیغام ہے۔ ان کتبوں میں بالائی حصے میں ایک ہاتھی کا خاکہ منقش ہے۔ یہ کتبے ۲۶۱ ق م اڑیسہ کی قدیم ترین تاریخ کا ماخذ سمجھے جاتے ہیں۔

اڑیسہ میں بسنے والے عوام نوّے فی صدی دیہات میں بستے ہیں اور عام طور پر اُن کی معیشت کا ذریعہ کاشتکاری ہے۔ ادھر تجارت کو بھی فروغ حاصل ہوا ہے

اڑیسہ کی اہم زراعتی پیداوار دھان ہے۔ اس کے علاوہ آلو، مونگ پھلی اور گنا بھی پیدا ہوتا ہے۔ آبپاشی کی موجودہ سہولتوں کی بنا پر ان دنوں یہاں سال میں دھان کی دو فصلیں ہوتی ہیں اور یہاں سے دوسرے صوبوں کو چاول برآمد کیا جاتا ہے۔ یہاں کے لوگوں کی مرغوب غذا چاول ہے۔

کٹک اپنی قدامت اور ماضی کی شاندار روایات کے ساتھ ساتھ ملک میں ہونے والی ترقیوں کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل رہا ہے۔

●●





# غزل

وہ نہ آئے ادھر ہوا کیا ہے
بات اتنی سی ہے گلہ کیا ہے؟

بھول کر آ گیا تھا محفل میں
میں نے آخر گنہ کیا کیا ہے؟

ایک دو پل گزر ہی جائیں گے
آنے جانے کا فاصلہ کیا ہے؟

جس کو کہتے ہیں زندگی اے دوست
تیری یادوں کے ماسوا کیا ہے؟

حُسنِ زیبا! مرے جنوں کی قسم
میں ترا ہوں تو پھر مرا کیا ہے؟

ہم تو وعدہ وفا کریں گے مگر
کون جانے مدِ جفا کیا ہے؟

آج ہنستے ہو کیوں بخاری تم؟
روتے روتے تمہیں ہوا کیا ہے؟

سجاد بخاری

# دُمدار تارے اور شہاب

قیصر سرمست

یہ دُمدار ستارہ ۲۴ مارچ ۱۹۷۰ء کو دہلی اور بلاسپور میں نظر آیا تھا وہی ۲۰ مارچ کو صبح کے پانچ بجے حیدرآباد میں بھی نظر آیا۔ رصدگاہ نظامیہ کی اطلاع کے مطابق یہ دُمدار ستارہ مشرقی افق سے تقریباً ۲۰ ڈگری کی بلندی پر نظر آرہا تھا۔ اور یہ بھی بتایا گیا تھا کہ اس ستارہ کی دُم اتنی طویل نہیں ہے جتنی کہ ۱۹۶۵ء میں دکھائی دینے والے "اکیاسیکی" ستارہ کی تھی

یہ حقیقت بھی ہے اس لئے کہ میں نے بھی ۳۰ مارچ کی صبح سوا پانچ بجے اس دُمدار ستارے کو دیکھا تھا۔ مناسب تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ دُمدار تارے اور شہابیوں کے متعلق اظہارِ خیال سے پہلے کیوں نہ آپ کو کائنات کی وسعت کے بارے میں کچھ بتاتا چلوں ہم میں سے کون ایسا ہوگا جس نے کبھی نہ کبھی رات کے وقت آسمان کی طرف نہ دیکھا ہوگا اور آسمان کی نیلگوں چادر پر بے شمار ننھے منے تارے ٹمٹمے دیکھ کر حیرت زدہ نہ ہوا ہوگا۔ مگر بہت کم ایسے ہیں جنھوں نے حقیقی معنوں میں ان پر غور کیا۔ دُنیا کا کوئی بھی انسان سادہ آنکھ سے سارے آسمان کو محیط نہیں کرسکتا۔ ہم صرف آسمان کے نصف حصّے کو ہی دیکھ سکتے ہیں اور نصف حصّہ ہماری آنکھ سے اوجھل رہتا ہے جو نصف حصّہ ہماری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے اس میں ستاروں کی تعداد ۲۰۰۰ کا تخمینہ لگایا گیا ہے اور اگر اسی نصف حصّے کو دُوربین سے دیکھیں تو ستاروں کی تعداد ۳۵۰۰ سے بڑھ کر ایک لاکھ بیس ہزار تک پہنچ جاتی ہے۔ اور اسی حصّے کو مونٹ ولسن کی رصدگاہ میں جو ۱۰۰ انچ والی دُوربین نصب ہے سے دیکھیں تو یہ تعداد ۱۵۰۰ ملین (ایک ارب ۵۰ کروڑ) ہوجاتی ہے مگر اس کے باوجود بے شمار ستارے ایسے رہ جاتے ہیں جہاں تک کسی بڑی سے بڑی دوربین کی رسائی ممکن نہیں۔

"بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اتنے ستاروں کی موجودگی سے فضا میں تنگی ہوگئی ہوگی لیکن اربوں ستاروں کے ہوتے ہوئے بھی فضا کی وسعت ایسی ہے جیسے تمام کرۂ ارض پر چند مکھیاں پرواز کررہی ہوں۔"

کرۂ ارض کی تباہی کی جو مختلف وجوہات بیان کی جاتی ہیں ان میں سے ایک صورت یہ ہے کہ وہ کسی بھی دوسرے کرۂ سے ٹکرا جائے گی۔ فضائے بسیط میں بکثرت چھوٹے بڑے دُمدار ستارے گردش کررہے ہیں۔ ازل سے یہ ستارے نحوست کی علامت متصور کئے جاتے ہیں اور اُن کے نظر آنے کے معنی یہ ہوتے تھے (اور اب بھی بعض حضرات کے پاس ہوتے ہیں) کہ دنیا میں کوئی تباہی آنے والی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عہدِ قدیم میں کئی ستارے کرۂ ارض سے ٹکرا کر تباہیاں مچا چکے تھے چنانچہ عہد قدیم کی بعض تصاویر سے اس کی تصدیق ہوجاتی ہے کہ ان تصاویر میں تباہی کے فرشتہ کو دُمدار ستارے کی شکل میں دکھلایا گیا ہے۔

آج سے کوئی ساڑھے چار سو سال پہلے ڈنمارک میں ایک نجومی اور سائنسداں ٹائیکو براہی ( Tychobrahe ) نے بتایا تھا کہ اس وقت جتنے بھی دُمدار ستارے کائنات میں موجود ہیں وہ سب زمین کی کشش سے باہر ہیں۔ اس لئے ان کے ٹکرا جانے کا کوئی امکان نہیں ہے، اور اب یہ بھی سنئے کہ جدید تحقیق ٹائیکو براہی کے اس خیال کی تائید نہیں کرتی۔ جدید سائنس نے دمدار ستاروں کی ماہیت اور اصلیت بھی دریافت کرلی ہے۔ یہ تمام ستارے چھوٹے چھوٹے ذرات پر مشتمل ہوتے ہیں اور اُن کی گردش کا مدار زمین سے چونکہ بہت دُور ہے اس لئے وہ نظر نہیں آتے اُن کی دُم کے بارے میں ماہرینِ فلکیات کا

یہ کہنا ہے کہ جب کوئی دمدار ستارہ سورج کے قریب آتا ہے تو سورج کی گرمی اس کے مادے کے تھوڑے حصے کو گیس کی شکل میں تبدیل کر دیتی ہے چنانچہ سورج کی گرمی کا دباؤ جب ستارے پر پڑتا ہے تو وہ مادہ جو سورج کی شدید حرارت کی وجہ سے گیس میں تبدیل ہو چکا تھا سورج سے پرے ہٹنے کی کوشش کرتا ہے مگر بالکل الگ تو نہیں ہو سکتا اس لئے دُم کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سورج کے مخالف سمت میں رہتا ہے۔ خیال ہے کہ دمدار ستارے کے یہ ذرات سوئی کے سرے سے

( تصویر-۱ )




دمدار تارے کی دم ہمیشہ سورج کی مخالف سمت میں ہوتی ہے

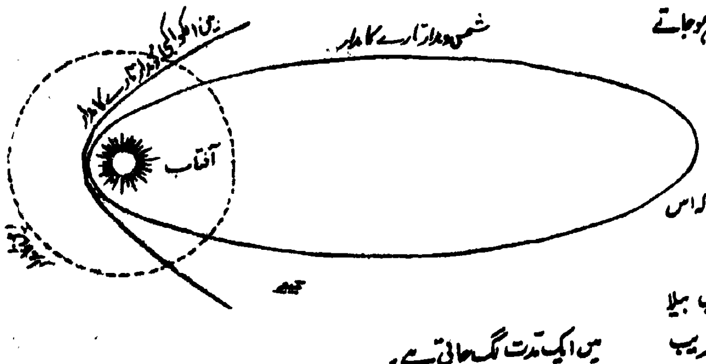
زیادہ بڑے نہیں ہوتے۔ لیکن اس کے برخلاف مرکز کے اجزاء چند من سے لے کر چھوٹے چھوٹے گرد کے ذرات کی طرح کے ہوتے ہیں" دمدار ستاروں کی ماہیت اور تحریک دریافت کرنے کے لئے ان میں طیف پیمائی کی گئی اور شہابی ٹکڑوں کی نوعیت کو جانچا گیا تو اس بات کا پتہ چلا کہ یہ بھی ایسے ہی عناصر سے بنے ہیں جن سے زمین بنی ہے۔

آپ نے زحل کے اطراف جو حلقے ہیں اُن کے بارے میں سُنا ہوگا جب کوئی جسم سیارے سے ایک معینہ فاصلہ پر آجاتا ہے تو اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں" اسی طرح خیال ہوتا ہے کہ سیاروں کی پیدائش کے وقت وہ چھوٹے چھوٹے اجرام بھی وجود میں آئے ہوں گے جو بعد میں ٹوٹ پھوٹ کر دمدار ستارے بنے۔ پھر بڑے دمدار ستاروں کے ٹوٹنے سے چھوٹے چھوٹے دمدار ستارے بنے۔" چنانچہ ہمارے نظامِ شمسی کے بارے میں خیال ہے کہ اس کے تحت سوا لاکھ سے زیادہ دمدار ستارے ہیں۔

دمدار ستارے حقیقتاً ٹوٹتے ہیں اس بات کی تصدیق ۱۸۴۶ء میں بیلا Biela کے دمدار ستارے سے ہوئی۔ یہ ستارہ سورج سے اتنا قریب آگیا تھا کہ ٹوٹ کر دو حصوں میں بٹ گیا دمدار ستارے کا جسم دو حصوں پر مشتمل

ہوتا ہے۔ ایک سر یا مرکز یعنی سر اور دوسرا حصہ دُم کہلاتا ہے۔ مرکز ... ہے لیکن عام طور سے اس کا حجم زمین کے قطر سے چار ... ہوتا ہے لیکن بعض ستاروں کے مرکز سے بہت بڑے بھی دیکھے گئے ہیں چنانچہ ... یہ دیکھے گئے۔ دمدار ستارے کا مرکز سورج سے بھی بڑا تھا ستارے کا یہی حصہ بہت زیادہ روشن ہوتا ہے جو سورج کی روشنی کی وجہ سے چمکتا ہے۔ مگر بعض ایسے بھی دمدار ستارے ہیں جو خود اپنی روشنی سے منور نظر آتے ہیں۔ اس کی دُم نہایت لطیف اور ایک ذرات پر مشتمل ہوتی ہے یہ اتنی لطیف ہوتی ہے کہ دوسری طرف کے ستارے صاف طور پر نظر آتے ہیں ایک مرتبہ تو ہماری زمین خود اس کے درمیان سے نکل گئی تھی لیکن کسی کو خبر نہیں ہوئی سوائے ماہرینِ فلکیات اور سائنسدانوں کے۔ اس کے مرکز کی طرح دم کی لمبائی بھی مقرر نہیں ہوتی۔ بعض دمدار ستاروں کی دم ۶ لاکھ میل لمبی بھی دیکھی گئی ہے اور بعض دمیں اتنی بھی بڑی دیکھی گئی ہیں کہ اگر سورج کو اس کے مقام سے ہٹا کر دمدار ستارے کو اس کی جگہ رکھ دیں تو اس کی دم ہماری زمین تک بآسانی پہنچ سکتی ہے اور آپ تو جانتے ہیں کہ زمین سے سورج کا فاصلہ ۹ کروڑ انتیس لاکھ میل ہے۔ اب یہ بھی سنئے کہ دمدار ستارے روز کیوں نظر نہیں آتے۔ یہ سمجھنے کے لئے آپ کو خاکہ ۲ پر غور کرنا ہوگا آپ نے دیکھا کہ زمین کا مدار گول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ ایک ہی فاصلے پر سورج کے گرد گھومتی رہتی ہے۔ اس کے برعکس شمسی دمدار ستارے کا مدار انتہائی بیضوی ہے۔ چنانچہ اس کا ایک حصہ سورج کے بہت قریب ہے تو دوسرا حصہ لامحدود فاصلہ پر ہے یہی وجہ ہے کہ دمدار ستارہ اپنے مدار پر گردش کرتے ہوئے جب سورج کے قریب آجاتا ہے تو ہمیں اس کی زیارت ہو جاتی ہے اور جب وہ اربوں میل کے فاصلہ پر چلا جاتا ہے تو ہماری آنکھیں اور دوربینیں اس کے دیکھنے سے محروم رہ جاتی ہیں اور پھر یہ طویل ترین فاصلہ طے کرنے

( ۲ )




میں ایک مدت لگ جاتی ہے۔
اس کے مدار کی وسعت کا اندازہ اس سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے کہ

ہے کہ اس ستارے کا مدار سورج سے ..... ۲،۹۳۵ میل دور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ستارے کو سورج کے گرد ایک چکر پورا کرنے کے لیے ۱۰۵ سال لگ جاتے ہیں لیکن دُمدار ستارے کا مدار جنہیں کے مدار سے کوئی بیس گنا دُور ہے آپ یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ۲۰ گنا بڑے مدار والے ستارے کو ایک چکر مکمل کرنے میں کتنا عرصہ درکار ہوگا ایسے ہی دُمدار ستاروں کو سورج کے گرد ایک چکر پورا کرنے میں چالیس پچاس ہزار برس لگ جاتے ہیں۔ اور کچھ ایسے بھی ہیں جن کا مدار خاصا چھوٹا ہے اور وہ ہر چوتھے یا پانچویں سال دکھائی دے جاتے ہیں۔ اِن سے ہٹ کر بعض ایسے بھی دُمدار ستارے بھی ہیں جن کا مدار ٹوٹا ہوا ہے یعنی اُن کے دونوں سرے کہیں نہیں ملتے۔ ایسے دمدار ستارے قطعی مہمان ہوتے ہیں۔ اور اس مدار کو مسافر خانہ سے زیادہ نہیں سمجھتے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مرتبہ نظر آجانے کے بعد کائنات کی بے کراں وسعتوں میں گم ہوجاتے ہیں اور پھر کبھی نظر نہیں آتے۔

بیلا Biela کے دُمدار ستارے کے بارے میں اوپر عرض کرچکا ہوں کہ وہ ٹوٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہوچکا تھا چار مہینے تک اس ستارے کے یہ دونوں حصے دو دمدار ستاروں کی صورت میں آگے پیچھے تقریباً ڈیڑھ لاکھ میل کے فاصلے پر چلتے رہے۔ مگر ۱۸۵۲ء میں یہ پھر جب نظر آئے تو اُن کا درمیانی فاصلہ بڑھ کر ۵ لاکھ میل ہوگیا تھا۔ وقت مقررہ پر لوگ انہیں دیکھنے کے لیے بے چین تھے کہ دُمدار ستارے کے بجائے انہیں شہابیے نظر آئے اس سے ماہرین نے یہ قیاس قائم کیا کہ یہ دُمدار ستارے کسی دُوسرے سیارے کی زد میں آکر ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے اور "مسلسل" نامی شہابی جھنڈ میں تبدیل ہوگئے۔ اس طرح ۱۹۱۶ء میں ٹیلر Taylor کا دمدار ستارہ ٹوٹ کر دو حصوں میں بٹ گیا اور ۱۸۸۹ء میں ایک اور دُمدار ستارہ ٹوٹ کر چار ہوگیا۔ اسی طرح دمدار ستارے ٹوٹ پھوٹ کر وہ اجرام وجود میں آتے ہیں جنہیں ہم شہابیہ یا شہابِ ثاقب کہتے ہیں۔

یہ شہابات دُو قسم کے ہوتے ہیں ایک لوہے سے مرکب ہوتے ہیں اور دوسرے پتھر سے۔ سائنسدانوں نے دونوں ہی شہابیوں کا کیمیاوی تجزیہ کرکے یہ معلوم کیا کہ ان میں اول الذکر شہابات میں نکل کے ساتھ ایک آمیزہ کی شکل میں لوہا ہوتا ہے اور یہ دھات ایسی ہے کہ ہماری زمین پر قدرتی حالت میں کہیں نہیں پائی جاتی۔ اِن کے علاوہ ایک درجن مادی اجزا ایسے بھی ہیں جو زمین پر نہیں پائے جاتے اور صرف شہابات میں پائے جاتے ہیں۔ لوہے کے شہابات میں نکل، میگنیشیم، آکسیجن، سلیکان، المونیم، گندھک اور فاسفورس موجود ہوتے ہیں بعض اوقات ان کے علاوہ میگنیز، تانبہ، قلعی، ہیڈروجن، نیٹروجن اور کوبالٹ کی بھی قلیل مقدار پائی گئی ہے۔ شاذ ہی شہابات کی صورت میں پلاٹینم، سونا اور ایریڈیم بھی پائے گئے ہیں اس کے برخلاف پتھر کے شہابات کا بیشتر حصہ پتھر ہی پر مشتمل ہوتا ہے اور یہ ان ہی اجزا سے مرکب ہوتا ہے۔ جو لاوا وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔ اِن دونوں قسموں سے ہٹ کر کچھ شہابات ایسے بھی ہوتے ہیں جو پتھر اور لوہے سے مرکب ہوتے ہیں۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ بعض شہابات میں کاربن بھی پائی گئی ہے چنانچہ ایک شہابیے میں ½ انچ قطر کا ہیرا برآمد ہوا تھا اور بعض شہابات سیاہ ہیرے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے مزین بھی ہوتے ہیں: تابکار ذرائع سے دونوں قسم کے شہابات کی عمر کا جو اندازہ لگایا گیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ کسی شہابیے کی عمر زمین کی عمر سے زیادہ نہیں ہے۔ چنانچہ اسی خیال نے ماہرین کو یہ سوچنے پر مجبور کردیا کہ شہابات ہمارے نظام شمسی کے پیدا کردہ ہیں اور اُن کی پیدائش کا اُن اجرام فلکی سے قطعی کوئی تعلق نہیں جو ہمارے نظام شمسی کے حدود سے باہر ہیں۔

اکثر آپ نے دیکھا ہوگا کہ آسمان پر ایک تارا ٹوٹ کر روشن لکیر بناتا ہوا تھوڑی دُور پر ختم ہوجاتا ہے بعض اوقات تو ایسے مناظر بڑے ہی دیدہ زیب اور شاندار ہوتے ہیں۔ اسی کو عرفِ عام میں "تارا ٹوٹنا" کہتے ہیں۔ مگر حقیقتاً کوئی تارا ٹوٹتا نہیں بلکہ زمین اور دوسرے سیاروں کی طرح بیسیوں چھوٹے چھوٹے اجسام بھی سورج کے گرد چکر لگا رہے ہیں جب کبھی ان چھوٹے چھوٹے اجسام میں سے ایک آدھ زمین کے قریب آجاتا ہے تو زمین اسے پوری قوت سے اپنی طرف کھینچتی ہے اور یہ اجسام اتنی تیزی سے زمین کی طرف آتے ہیں کہ فضا میں سے گزرتے وقت ہوا کی رگڑ سے پہلے وہ گرم ہوتے ہیں پھر اس کے بعد مشتعل ہوکر چمکنے لگتے ہیں۔ مگر اکثر ایسے ہیں جنہیں زمین دیکھنا نصیب بھی نہیں ہوتا اور درمیان ہی میں جل کر راکھ ہوجاتے ہیں اور یہ راکھ فضا میں منتشر ہوجاتی ہے مگر جو بڑے بڑے شہابیے ہیں وہ جلنے کے باوجود زمین تک پہنچ ہی جاتے ہیں۔ ایسے شہاب ثاقب کو "حجر شہابی یا شہابیہ" کہا جاتا ہے۔ اس وقت وہ بہت زیادہ گرم اور انگارے کی طرح روشن ہوتے ہیں بعض اوقات اُن کا بیرونی حصہ اس قدر گرم ہوجاتا ہے کہ وہ زبردست دھماکے کے ساتھ پھٹ پڑتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہزاروں کی تعداد میں آسمان پر کسی نے آتش بازی چھوڑ دی۔ چنانچہ ۱۹۴۰ء میں اجمیر کے قریب ایک بہت بڑا اور چمکدار شہابیہ مشرق سے مغرب کی طرف گزرا اور اس سے سفید چنگاریاں نکل رہی تھیں اُس کے بعد ایک زبردست دھماکہ ہوا اور اس دھماکے کی آواز تیس بتیس میل تک سنائی دی۔ ۱۸۰۳ء کو فرانس کے علاقے نارمنڈی میں ایک شہاب تیزی سے گزرتا ہوا نظر آیا اس کے بعد ہی زبردست دھماکے سے پھٹ پڑا۔ اس دھماکے کی آواز اسّی میل تک سنی گئی۔ اکثر و بیشتر وہ گر کر زمین میں دھنس جاتے ہیں اور سطح زمین پر وہ دھانے وجود میں آجاتے ہیں



اری زونا کا "شہابی دہانہ" (ہوائی جہاز سے لی گئی تصویر کی نقل "

جنہیں "شہابی دہانے" کہتے ہیں گرے ہوئے شہابیئے جو اب تک دستیاب ہوئے ہیں اُن کا وزن چند سیر سے لے کر سینکڑوں من تک ہے۔ کوئٹہ میں ایک شہابیہ ۱۹۲۳ء میں گرا تھا جس کا وزن چھ ٹن تھا۔ تاریخی عہد کا سب سے بڑا شہابیہ "ہوبا" کا شہابیہ ہے جس کا وزن ساٹھ ٹن کے قریب تھا۔

شہابی دہانے اکثر ممالک میں پائے گئے ہیں ان تمام شہابی دہانوں میں سب سے بڑا دہانہ امریکہ کے علاقے "اری زونا" میں پایا گیا ہے جو تین میل کے رقبہ پر پھیلا ہوا ہے اور ۵۰۰ فٹ گہرا ہے۔ اب یہ بھی سنئے "اتنا عظیم اور زبردست دہانہ بنانے والے شہابیہ کے بارے میں کہ یہ کب گرا، اس کے گرنے سے اطراف واکناف کے علاقوں کی کیا حالت ہوئی ہوگی اور یہ کن مرکبات پر مشتمل تھا اس کا وزن کتنا تھا اور یہ زمین میں دھنسنے کے بعد اتنے رقبہ زمین کی کیا حالت ہوئی وغیرہ کچھ معلوم نہیں۔ ابتداء میں جن لوگوں نے یہ غار دیکھا تو اُن کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ اتنا زبردست غار زمین میں کس طرح بن گیا لیکن کھوج کرنے پر اس کے اطراف میں شہابی لوہا پایا گیا۔ تب لوگوں کو شبہ ہوا کہ شہابیئے کے گرنے کی وجہ سے ایسا ہوا ہو۔ مزید تحقیقات نے شک وشبہ کو یقین میں بدل دیا۔ اس یقین کی وجہ یہ ہوئی کہ" دہانے کے اطراف کی چٹانیں افقی حالت میں ہیں۔ لیکن غار کے کنارے کی بعض چٹانیں عمودی حالت میں سیدھی کھڑی ہیں جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ کسی زبردست چیز کی ٹکر سے یہ چٹانیں اُٹھ کھڑی ہوئی ہیں۔ غار میں جو نرم چٹانیں تھیں وہ پس کر سفوف ہو گئیں۔ . . . اس جگہ سے اتنا شہابی لوہا جمع کیا گیا کہ دُنیا بھر کے جمع شدہ شہابی لوہے سے زیادہ تھا"

غار کی چوڑائی اور گہرائی سے اندازہ لگایا گیا کہ اس شہاب کا وزن کم از کم ۱۴۰۰۰۰۰ ٹن ہوگا اور ۵۰۰ فٹ یقیناً چوڑا تھا جب لوگوں کو یہ یقین ہوگیا کہ غار شہاب ثاقب کی وجہ سے بنا ہے تو اس شہاب سے لوہا، پلیٹنم وغیرہ جیسی قیمتی دھاتیں نکالنے کی سوجھی۔ چنانچہ غار کی تہ میں کھدائی کا کام شروع ہوا تاکہ نمونے نکال کر اس کی جانچ کر سکیں۔ مگر ۲۹ سوراخ کرنے کے باوجود جب کچھ نہ نکلا تو لوگ متعجب ہوئے کہ شہابیہ کہاں غائب ہو گیا۔ بعد کی تحقیقات نے لوگوں کو سمجھایا کہ شہابیہ غائب نہیں بلکہ ترچھا گرا ہے۔ چنانچہ غور کرنے سے [illegible] جنوبی کنارا اور کناروں کی بہ نسبت سو فٹ زیادہ اونچا [illegible] حقیقت بھی تھی کہ شہاب یا مدار تارہ شمالی سمت سے [illegible] میں دھنس گیا تھا۔ جنوبی کنارے کو پون میل تک اُدھیڑ ڈالنے کے بعد [illegible] کہیں جاکر شہابیہ کا پتہ چلا۔

اس واقعہ کے تعلق سے ماہرین میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ کچھ تو اسے پانچ ہزار برس پہلے کا کہتے ہیں اور کچھ اس بات پر مصر ہیں کہ دو ہزار برس سے زیادہ کا نہیں جس وقت یہ گرا ہوگا تو اطراف کے علاقوں کی کیا حالت ہوئی ہوگی، کس قدر بھیانک آواز سے دوچار رہنا پڑا ہوگا۔ اس کا صحیح اندازہ لگانے سے سائنسداں عاجز ہیں۔ ایک دوسرا واقعہ سنیئے اور خود ہی اندازہ لگانے کی کوشش کیجئے۔

یہ واقعہ شمالی سائبیریا کے علاقے کانسک میں ۱۹۰۸ء میں پیش آیا تھا اس دھماکے کی آواز چار سو میل تک سُنی گئی تھی۔ ہوا میں جو موجیں پیدا ہوئیں ان کا اثر کیمبرج تک پہنچا۔ ہزاروں، لاکھوں درخت جل گئے، تیس میل تک پودے جھلس کر رہ گئے اور جس مقام پر یہ گرا چند میل تک کی حالت ایسی ہوگئی تھی جیسے بڑی بڑی توپوں سے گولہ باری کی گئی ہے۔ کانسک ایک غیر آباد علاقہ تھا۔ مگر اس کی جگہ گنجان آبادی ہوتی تو آج کل کی جنگ کے نقصانات اس کے سامنے ہیچ ہوتے۔

اب یہ بھی سُن لیجئے کہ شہابیوں اور دُمدار تاروں کا گہرا تعلق ہے شہاب ثاقب کے بہت سے مشہور جھنڈ مختلف دُمدار تاروں کے مدار پر چلتے ہیں خیال کیا جاتا ہے کہ سورج، زمین اور مختلف سیاروں کی زد میں آکر دمدار تارے ٹوٹتے پھوٹتے رہتے ہیں اور اس کھینچ تان اور توڑ پھوڑ کے عمل سے کچھ چھوٹے بڑے ذرے اور ٹکڑے جو آزاد ہو جاتے ہیں وہ شہابیوں کی شکل میں فضا میں اپنے پرانے مدار ہی میں رہتے ہیں اور کبھی کبھی ہم تک پہنچتے ہیں۔

ماہرین کا خیال ہے کہ شہابی بوچھاڑ کا منبع وہ دمدار ستارے ہیں جن کا وجود قریب الختم ہوتا ہے اُن کے جسم کے ذرات علیحدہ ہو کر خلا میں منتشر ہونے لگتے ہیں۔ یہ عمل آہستہ آہستہ ہونے لگتا ہے۔ حتیٰ کہ پورا دمدار ستارہ فنا ہو جاتا ہے۔ اس عمل کے مکمل ہونے کے لئے لاکھوں سال درکار ہوتے ہیں۔

# غزلیں

کیا ہے میرے ہی لئے درد کا ساغر تنہا
تیری محفل میں جو پیتا ہوں برابر تنہا

مجھ غریب اس کی ہے قاتل سمجھے، کتنے دل کو
کر گیا قتل ترے ناز کا خنجر تنہا

کون اٹھائے گا ستم بعد مرے اس کا ہے غم
ہو نہ جائے کہیں دنیا میں ستم گر تنہا

کیوں کیا ترکِ تعلق دلِ ناداں اس سے
ہم نہ کہتے تھے کہ رہ جائے گا ہو کر تنہا

کارواں چھٹنے پہ بھی عزم تو دیکھے کوئی
چل پڑے ہیں رہِ منزل پہ ہم اکثر تنہا

دیکھتا کیا ہے تو اے موجۂ طوفانِ بلا
کتنی طغیانی سے گزرا ہے یہ لشکر تنہا

اے کریم اب تو ہے بس لاج جنوں کے ہاتھوں
سنگ صدہا ہیں اُدھر اور اِدھر سر تنہا

کریم اسعدی

چشمِ میگوں نے نہ چاہا کوئی زنہار گرے
اپنی افتادِ طبیعت سے قدح خوار گرے

ہوں سزایاب نہ اعدائے مسیحِ مصلوب
ہم نہیں چاہتے اوجِ رسن و دار گرے

جشنِ معمارِ حرم، عالمی پیمانے پر
صنمِ کبر وہ ٹوٹے بتِ پندار گرے

دورِ تیرہ سے نہ انساں کی قیمت مانگو
شام کے وقت کا دستور ہے بازار گرے

مستیٔ فصلِ بہاراں کو ذرا چونکا دو
گل کا منصب یہ نہیں ہر قدم خار گرے

عزتِ نفس پہ اس دورِ جنوں کے ہاتھوں
وقت آیا ہے کہ دامن کا ہر اک تار گرے

مسندِ گل کو دی ترجیح ہوس کاروں نے
آگ میں سوزِ محبت کے پرستار گرے

لب پہ آئی ہے شگوفوں کے دعائے سحری
برق دریا پہ گرے یا سرِ کہسار گرے

اُن کے آنسو نہیں مانی مرے دامن کے لئے
بجھ گئے راہ میں تارے جو شبِ تار گرے

مانی ناگپوری

چشمِ لطف ایک طرف، لطفِ ستم سے بھی گئے
ایک تبسم ہی نہیں دیدۂ نم سے بھی گئے

جانے کیا بات ہے اٹھتے ہی نہیں دستِ طلب
یعنی آج تماشائے کرم سے بھی گئے

بیدلی ہائے تمنا کا یہ عالم ہے کہ ہم
عشرتِ زیست تو کیا لذتِ غم سے بھی گئے

اپنی سوگند نہ کھانے کی قسم دیتے ہیں
ہم گنہگارِ وفا اُن کی قسم سے بھی گئے

سنتے ہیں عشق میں مرنا ہے حیاتِ جاوید
یہ اگر سچ ہے تو ہم خوابِ عدم سے بھی گئے

خود پرستی نے کہیں کا بھی نہ رکھا ہم کو
اپنے در سے بھی گئے دیر و حرم سے بھی گئے

رامش و رنگ میں گم ایسے ہوئے ہیں میکش
صاحبِ سیف و قلم، سیف و قلم سے بھی گئے

میکش [illegible]

تاباں واسطی

سمٹ گئے جو شرارے تو آفتاب بنے
بھٹک گئے تھے خلاؤں میں ہم سحاب بنے

وہ سانپ بن کے جو دوڑا رہے تھے پانی میں
وہی تو بیٹھے ہیں ساحل پہ مرغِ آب بنے

بسرتے بھولتے لمحات کا تناؤ نہ پوچھ
خلا میں تیرتے ذرّے بھی آفتاب بنے

کسی نے مڑ کے نہ دیکھا پھر ان نظاروں کو
وہ ریگزار میں ثریا کے سراب بنے

ہزار حلقۂ انجم ہے پھر بھی ہم تاباں
بھٹکتے پھرتے ہیں تنہا سے ماہتاب بنے

# نئی کتابیں

**بمبئی میں اردو (۱۹۴۷ء تک) از ڈاکٹر میمونہ دلوی**

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی ۲۵

صفحات: ۲۳۲، قیمت ۱۲ روپے ۵۰ پیسے

بمبئی میں اردو ڈاکٹر میمونہ دلوی کی کتاب ہے جس میں انہوں نے ۱۹۴۷ء تک بمبئی میں اردو شعر و ادب کی نشو و نما کا جائزہ لیا ہے اردو زبان اس معنی میں ہندوستان گیر زبان ہے کہ یہ کسی ایک خطّے یا علاقے تک محدود نہیں۔ اردو ادب کے کئی علاقائی جائزے، مثلاً دکن میں اردو، بہار میں اردو، بھوپال میں اردو، اب تک شائع ہو چکے ہیں بمبئی اگرچہ مرہٹی کا علاقہ ہے لیکن اس کی شہری آبادی میں اردو جس طرح مختلف زبانیں بولنے والوں کے درمیان لسانی رابطے کا کام دیتی رہی ہے۔ اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں بمبئی کی اولین تصنیف قاسم مہری کی طویل مثنوی عروس المجالس ہے جو ۱۷۰۹ء میں لکھی گئی۔ ڈاکٹر میمونہ دلوی نے لگ بھگ اس زمانہ سے اپنی معلومات مخطوطات اور مطبوعات کی روشنی میں پیش کی ہیں۔ قدیم دور میں بمبئی کے گہرے تعلقات گجرات اور دکن سے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے قدیم مصنفین اپنی زبان کو دکنی کہتے ہیں۔ اگرچہ لسانی اعتبار سے ان کی زبان دکنی سے مختلف ہے اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں بمبئی کو اردو کے مرکز کی حیثیت حاصل نہیں تھی، اس وقت اردو کے نام کا ڈنکا دہلی لکھنؤ اور شمالی ہندوستان کی بعض ریاستوں میں بج رہا تھا یہی وجہ ہے کہ اس جائزے میں اعلیٰ پایہ کے ادبیات کا تذکرہ نہ ہونے کے برابر ہے بمبئی کی ادبی اہمیت ۱۹۱۴ء کے بعد بڑھی ہے۔ جب یہاں فلمی صنعت کو فروغ ہوا ہے اور اردو کے کئی ادیب اور شاعر یہاں پہنچ گئے۔ کتاب میں نثر، نظم، صحافت، تھیٹر، تعلیمی ادارے، علمی تحریکیں ہر پہلو پر محنت سے لکھا گیا ہے اس دور میں اگر بمبئی کا کوئی کارنامہ ہے تو وہ دراصل تھیٹر ہے مصنفہ نے اردو ڈرامہ نگاروں کا تو تذکرہ کیا ہے چاہئے تھا کہ ڈراموں کا تجزیہ بھی شامل کیا جاتا۔ اس کتاب کی اہمیت، بہرحال اس میں ہے کہ بیسویں صدی میں اردو کا مرکز بننے سے پہلے بمبئی میں اردو کی جو روایت اور تاریخ تھی وہ اس کتاب کی مدد سے سامنے آ گئی ہے۔

(گوپی چند نارنگ)

## سیاہ، سرخ، سفید

ناشر: نیشنل بک ڈپو مچھلی کمان حیدرآباد ۲ قیمت: [illegible]

پچھلے تین چار برسوں میں اردو میں جو ناول شائع ہوئے ہیں۔ اُن میں آمنہ ابوالحسن کا ناول "سیاہ، سرخ، سفید" غالباً پہلا ناول ہے جو اپنے موضوع اور اچھوتے Treatment کے اعتبار سے قارئین کی توجہ فوری طور پر اپنی جانب کھینچنے میں کامیاب ہو سکا ہے۔ ناول میں قاری کو چونکانا بہت آسان کام ہے لیکن ایک بار اُسے چونکا دینے کے بعد ناول کے دائرے سے نکلتے وقت قاری کے اچنبھے پن کو فطری سکون یا منطقی طمانیت عطا کرنا بہت مشکل ہے اور یہی وہ مقام ہوتا ہے جہاں بہت سے قاری ناول نگار کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں آمنہ ابوالحسن کے ناول کی بنیادی خوبی یہی ہے کہ انہوں نے اپنے قاری کو غیر ضروری Strains اور دھاکوں سے گزرنے نہیں دیا ہے۔

آمنہ ابوالحسن کے ناول کا تھیم ویسے تو کوئی نیا نہیں ہے۔ فرانسیسی ناول نگاروں نے اس موضوع پر شاہکار ناول لکھے ہیں۔ یہ داستان ایک مثلث کی داستان ہے اور مثلث جب انسانی رشتوں کی بنیاد بنتا ہے تو ایک بھیانک روپ اختیار کر لیتا ہے یا پھر اس کی شکل بگڑ جاتی ہے لیکن آمنہ ابوالحسن کے ناول کا جو مثلث ہے وہ بکھرنے کی منزل پر پہنچ کر بھی اپنے زاویوں کو باقی رکھتا ہے۔ داستان کے سارے کردار انتشار میں اتحاد کی ایک تلاش میں مصروف ہیں جس میں وہ ٹوٹتے پھوٹتے ہیں بشدید ہیجانوں سے گزرتے ہیں لیکن انجانے طور پر اس مثلث کو نقصان نہیں پہونچانا چاہتے۔ "نشاط" عیب مربھی جاتی ہے تو الطاف اور فرخ صرف اپنے ذہن کے بل بوتے پر اس مثلث کو باقی رکھنا چاہتے ہیں اور اس کا مرکز صرف نشاط ہی ہوتی ہے جو اس دُنیا میں موجود نہیں ہے۔

ناول کے تینوں بنیادی کرداروں کے علاوہ ایک اور کردار بھی اس ناول میں موجود ہے۔ وہ ہے اس ناول کا "میں"۔ اس "میں" کا کوئی مادّی وجود نہیں ہے۔ بلکہ یہ اصل میں نشاط کا "ضمیر" ہے جو سایہ کی طرح اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ اور زندگی کے ہر پیچیدہ موڑ پر اس کے مقابل آ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کردار کی وجہ سے اظہار بیان میں بڑا تنوع اور شدت پیدا ہو گئی ہے اور یہی کردار بالآخر نشاط کے کردار کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

"سیاہ سرخ سفید" اپنے مخصوص موضوع اپنے اچھوتے Treatment کے باعث اردو ادب میں یقیناً ایک اہم مقام حاصل کرے گا۔

(حسن عسکری)

**کینسر وارڈ** : مصنف : الیگزنڈر سولنسٹین - مترجم : گوپال متل ساز : ۲۲×۱۸/۱۶
صفحات : ۵۰۴ صفحات - قیمت : تین روپے - ناشر : نیشنل اکاڈمی، ۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، دہلی ۶

روسی مصنف الیگزنڈر سولنسٹین کی شہرت ایک ناول نگار کی حیثیت سے ۱۹۶۲ء میں اُن کے ناول "آیوان ڈینی سووچ کی زندگی کا ایک دن" کی اشاعت کے ساتھ شروع ہوئی اور بعد میں ان کے دوسرے ناولوں کی اشاعت کے ساتھ ساتھ بیرون روس تک جا پہنچی۔ زیر تبصرہ ناول ان کی ان تصنیفات میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے جن پر انہیں ۱۹۷۰ء میں سویڈش اکاڈمی نے ادب کا نوبل پرائز دیا۔ یہ ناول روس کے ایک دور افتادہ صوبائی ہسپتال کے اندر کے ماحول کی تصویر کشی سے شروع ہوتا ہے اور مختلف سماجی سطحوں پر زندگی بسر کرنے والے پارٹی ممبروں کی نفسیات اُن کے باہمی تضادات اور تعصبات، معافی کے دور میں جبری مشقت کے کیمپوں سے رہائی پانے والے ان لوگوں کے احساسات جن کی عمر کا بہترین حصہ کیمپوں میں بسر ہوا، کے ذہنی تذبذب کا انعکاس ہے۔ شہری اور دیہی معیشت کے فرق زندگی اور موت کی کش مکش میں مبتلا مریضوں کے اندیشے اور خواہشات اور موت کے سرد ماحول میں بھی گاہ بگاہ محبت، زندگی اور اس کی خوبصورتی سے محبت کی نیم جاں چنگاریوں کا بھڑک اُٹھنا ——— ان سب باتوں کو ناول میں اس طرح ایک لڑی میں پرو دیا گیا ہے کہ عام انسانی زندگی کے بارے میں بہت سے بنیادی سوالات بھی قاری کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لیتے ہیں۔

ترجمہ شگفتہ، سلیس اور بامحاورہ اُردو میں ہے۔

——— فضل الرزاق

**منزل کی طرف** (شعری مجموعہ) دِواکر راہی

قیمت: پانچ روپے ، ناشر : بزم شعراء رام پور - دو محلہ روڈ رام پور

زیر تبصرہ مجموعۂ کلام "منزل کی طرف" میں جناب دِواکر راہی نے ایک طرف خارجی حالات کو اپنی محسوسات میں شامل کر کے پیش کرنے کی کوشش کی ہے تو دوسری طرف اپنے داخلی محسوسات اور جذبات کو ایسے خلوص سے بیان کیا ہے کہ قاری اپنی محسوسات سمجھ بیٹھے۔ ایک طرف غم جاناں کی تاریکی میں زخموں کے چراغ جلائے ہیں تو دوسری سمت غم دوراں کی چیخ بھی سنائی پڑتی ہے۔ ان کے اشعار میں رند و پارسا، تصوف و فلسفہ، اخلاق و تہذیب، راز و نیاز، ہجر و وصال اور شوق و انتظار جیسے تمام موضوعات ملتے ہیں۔ مگر کہیں بھی غزل کی کیفیت کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ راہی صاحب کی شاعری میں کہیں بھی مایوسی اور کم حوصلگی نظر نہیں آتی بلکہ جگہ جگہ حوصلہ اور امید ملتی ہے۔

کلام میں پختگی اور سنجیدگی کے ساتھ ساتھ دلکشی اور رندانہ سرمستی بھی ہے۔ راہی صاحب شاعری کو صرف تفریح کا مشغلہ نہیں سمجھتے۔ بلکہ جذبات ابھارنے اور بیدار کرنے کا ذریعہ بھی مانتے ہیں۔

مجموعے کی کتابت اور طباعت بہت اچھی ہے۔ گٹ اپ اور سرورق بھی دیدہ زیب ہے۔ متعدد تصاویر اور اہلِ قلم کی رائیں شامل ہیں۔ امید ہے ادبی حلقوں میں یہ مجموعہ مقبول ہوگا۔

(شاہد ماہلی)



ہندوستان کی مسجدیں

... گنو کیلئے [illegible] - مجھ کو اس بات کی خوشی ہے کہ
اُس کا بیٹا گریجویٹ ہو گیا۔
سب مائیں یہ خواہش کرتی ہیں کہ ان کے بیٹوں کو تعلیم اور عزت ملے۔
لیکن تعداد زیادہ ہونے پر سبھی ماں باپ اپنے بچوں کو
زندگی میں یہ مواقع فراہم نہیں کر سکتے۔
اگر آپ اپنے خاندان کو دو یا تین تک محدود رکھیں تو اپنے
بچوں کو بہتر تعلیم دلا سکتے ہیں۔

خاندانی منصوبہ بندی کے لیے مفت مشورے
اور خدمات آپ کو فیملی ویلفیئر پلاننگ سینٹروں سے
دستیاب ہیں۔ اُن کی پہچان لال تکون سے
ہو سکتی ہے۔

**خاندانی**
**منصوبہ بندی**
**بہتر تعلیم کے لئے**

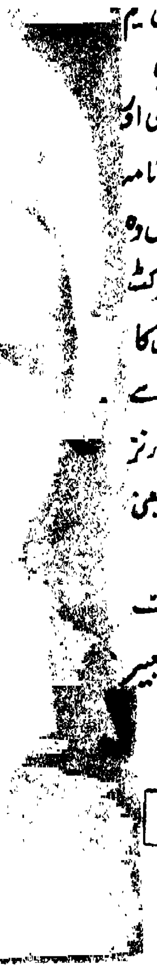
# پُرمسرّت دن



70/248

ویسٹ انڈیز کے خلاف کرکٹ ٹیسٹ میچوں میں ہندوستانی ٹیم کی جیت بڑی تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔ اس تاریخی جیت کے ہیرو ہیں بلہ باز کھلاڑی سنیل گواسکر، سرڈیسائی اور سولکر، وینکٹ، بیدی اور پرسنا جیسے باؤلر۔ اس ٹیسٹ سیریز کے سلسلے میں گواسکر کا کارنامہ خصوصی توجہ چاہتا ہے۔ اس نے اس سیریز میں چار سنچریاں بنائیں وہ دُنیا کا ایسا نواں کھلاڑی ہے جس نے یہ امتیاز حاصل کیا دنیا کی کرکٹ ٹیسٹ میچوں کی تاریخ میں زیادہ رنز بنانے والے کھلاڑیوں میں اس کا مقام نواں ہے۔ اس نے ۷۷۴ رنز بنائے لیکن وہ دنیا کا سب سے کم عمر کھلاڑی ہے جس نے ویسٹ انڈیز کے خلاف کھیلتے ہوئے اتنے رنز بنائے۔ اس سے پہلے ہندوستانی کھلاڑیوں میں سب سے زیادہ یعنی ۶۸۵ رنز بنانے کا ریکارڈ وجے منجریکر کا تھا۔

ہندوستانی ٹیم کی اس جیت کو ہندوستان کے سابق کرکٹ کپتان لالہ امرناتھ نے "ہندوستانی کرکٹ کے سنہرے دن" سے تعبیر کیا ہے۔



سنیل گواسکر

آج سفر صعوبت نہیں۔ سہولت ہے۔ اور اس کی تازہ ترین مثال ہے: ایر انڈیا کے بیڑے میں شامل جمبو جیٹ ۷۴۷ جہاز — ایمپرر اس میں مسافروں کی سہولت کے متعدد سامان فراہم ہیں۔ نشستیں کم رکھی گئی ہیں۔ نشستیں اس انداز کی ہیں کہ سفر میں ہونے کا احساس نہیں ہوتا، اندرونی آرائش بھی جو ہندوستانی روایات کا بے مثل نمونہ ہے۔ اسی احساس کو تقویت پہنچاتی ہے۔ اس جہاز میں مسافروں کی تفریح کے لئے فیچر فلمیں دکھانے کا انتظام ہے۔ نیز مسافر اپنی نشست پر بیٹھے بیٹھے بٹن دبا کر اپنی پسند کا سنگیت سن سکتے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ ایر ہوسٹس راجستھانی لباس میں میزبانی کے فرائض انجام دیتی ہے اس جہاز میں ۳۴۶ مسافروں کے بیٹھنے کا انتظام ہے اور اس کی رفتار ۵۸۰ میل فی گھنٹہ ہے۔

**Vol. 29 No. 11** **AJKAL (Monthly)** **June 1971**

**Edited and Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi.**
**Printed by Skylark Printers, 11355 Idgah Road, New Delhi-55**

**Regd. No. D-509**

**A sum of 5 Paise on general books and 25 Paise on text-books, per day, shall be charged** for books not returned on the date **last stamped.**

اجکل ۔ نئی دہلی ڈائرکٹر پبلیکشنز ڈویزن

ماہنامہ

لائبریری میں موجود ۔

ج ۱ - جنوری — جون ۱۹۷۱ء

# DUE DATE

Cl. No.________ Acc. No. 225668

Late Fine **Re. 1.00** per day for first 15 days.
**Rs. 2.00** per day after 15 days of the due date.

| | | | |
|---|---|---|---|
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | 60 | 2001-02 | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |

[illegible]

آجکل کی فائل سے:

ڈاکٹر امرناتھ جھا

# اکبر الہ آبادی

سید اکبر حسین بار ضلع الہ آباد میں ۱۶ر نومبر ۱۸۴۶ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے آباء کا ابتدائی وطن نیشاپور، ایران تھا۔ ان کے پردادا فوج میں صوبے دار تھے۔ انہوں نے جنگ پلاسی میں حصہ لیا تھا۔ ان کے دادا سید فضل محمد عالم آدمی تھے۔ انہیں اودھ کے نواب آصف الدولہ سے جاگیر ملی تھی۔ ان کے والد سید تفضل حسین نے نائب تحصیل داری تک ترقی حاصل کی اور ۱۸۸۸ء میں وفات پائی۔ ان کی والدہ صوبہ بہار کے ضلع گیا کی رہنے والی تھیں۔

اس عہد کے طبقہ وسطی کے نمائندہ گھرانے کے نوجوانوں کی طرح اکبر نے فارسی اور عربی پڑھی۔ لیکن وہ انگریزی کی جانب بھی کھنچے۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ جب شروع شروع انگریزی تعلیم ہندوستان میں رواج پانے لگی تو من حیث الجماعت مسلمانوں نے نئے اسکولوں سے کنارہ کشی اختیار کی تا آنکہ سر سید احمد خاں سامنے آئے اور ان کوششوں کے نتیجے میں مسلمانوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اب وہ انگریزی تعلیم کے فائدوں سے متمتع ہوں گے۔

۱۸۶۷ء میں وہ نائب تحصیل دار مقرر ہوئے۔ ۱۸۷۳ء میں انہوں نے پلیڈری کا آخری امتحان پاس کیا اور کچھ عرصے تک وکالت کرتے رہے۔ ۱۸۶۷ء میں وہ ملازمت عدلیہ میں منصف کی حیثیت سے لئے گئے۔ وہ ترقی کر کے ضلع جج بنے اور ملازمت سے سبکدوش ہو کر الہ آباد میں بس گئے۔ 'عشرت منزل' میں رہتے تھے۔ انہوں نے ۹ر ستمبر ۱۹۲۱ء کو ۷۵ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ اکبر کی تدفین خسرو باغ کے قریب کالا ڈنڈا میں ہوئی تھی۔ ان کے مقبرے پر مندرجہ ذیل اشعار کندہ ہیں

قبر میں آئی تجلی روئے جاناں کی مجھے
زہر سمجھے تھے جسے وہ شربت دیدار تھا

کلیات اکبر کی تین جلدیں ان کی زندگی میں چھپی تھیں۔ چوتھی جلد ۱۹۴۸ء میں کراچی میں چھپی۔ ان کے علاوہ اقبال اور اکبر کے خطوں کا ایک مجموعہ، نیز 'عورت نامہ' اور 'گاندھی نامہ' ہیں۔ اکبر پر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سب سے مفصل سید طالب علی کی کتاب ہے۔ علی گڑھ میگزین کے اکبر نمبر میں قیمتی تنقیدی اور سوانحی مواد خاصا مل جاتا ہے۔ چند دلچسپ خطوط اور حکایتیں پدم سنگھ شرما کی "پدم پراگ" میں دستیاب ہوتی ہیں۔ اکبر کے متعلق تازہ ترین کتاب "ونود اور ویگ" ہے۔ اس میں شری پارس ناتھ سنہا نے اکبر کے سبھی مشہور اشعار کو جمع کر دیا ہے۔ مناسب نوٹ بھی دئے ہیں۔ ترتیب مضامین کے لحاظ سے کی گئی ہے اور ایک باخبر تفصیلی مقدمہ بھی شامل ہے جس میں ہمدردانہ سمجھ بوجھ کی بھلی سی تنقید کلام ہے۔

شخصی لحاظ سے اکبر اتنے ہی دلچسپ تھے جتنے وہ شاعر کی حیثیت سے تھے۔ ان کی صحبت میں بے کیفی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ نہایت دلنواز اور جوش آفریں گفتگو کرنے والے تھے۔ لطیفے پر لطیفے سنائے جاتے۔ اشخاص و واقعات کے متعلق عیارانہ اشارات کئے جاتے۔ یادِ ایام کی باتیں ہوتی تھیں۔ چٹکلے، زندگی بداماں کہاوتیں، اقوال اور فی البدیہہ اشعار پیش کئے جاتے تھے۔ ان کی گفتگو شراب و کباب کی طرح کی ہوتی تھی، نشہ خیز اور مقوی۔ مجھے کئی بار انہیں دیکھنے کا فخر حاصل ہوا۔ لیکن میں صرف ایک بار دو محترم دوستوں کے ساتھ ان سے ملنے ان کے گھر پر حاضر ہوا۔ افسوس! یہ دونوں حضرات مسٹر کچلو اور مولوی نصیر انتقال فرما چکے۔ وہ ہم سے بڑی بے تکلفی سے باتیں کرتے رہے۔ وہ اپنے بیٹے عشرت سے ملنے حال ہی میں پرتاب گڑھ گئے تھے۔ اس ملاقات کا مفصل طور پر ذکر کرتے رہے اور ہم لوگوں کو ایک گھنٹہ تک اپنی باتوں سے مسحور کئے رکھا۔ اس وقت وہ اپنی زندگی کے آخری سال میں تھے۔ لیکن ان کی گفتگو کی جانداری اور ولولہ سے ان کے آنے والے انجام کا ہلکا سا اشارہ بھی نہیں ملتا تھا۔ ہم نے پوچھا کہ پرتاب گڑھ کے لوگوں نے آپ کا دھوم دھام سے خیر مقدم کیا ہوگا۔ جواب ملا۔ "ایک دفعہ خدا نے شہر لنڈن کی سیر کی۔ دن بھر وہ سرگرداں رہے۔ گلی گلی کی خاک چھانی۔ دربدر دستک دیتے پھرے۔ لیکن ہر جگہ وہ دھکے دے کر نکال دئے گئے۔ کسی نے پانی بھی انہیں پینے کو نہ دیا۔ تھکے ہوئے اور بھوکے آخرش وہ ایک دکان پر پہنچے اور لوگوں کو بتلایا کہ وہ خدا ہیں۔ پھر انہوں نے ایک گلاس پینے کو پانی مانگا۔ لیکن یہ بات رد کر دی گئی۔ پھر وہ ادھر ادھر بھٹکنے پر مجبور ہوئے۔ تھکے ہارے وہ ایک اور مکان میں جا داخل ہوئے۔ انہیں شدت سے پیاس لگی ہوئی تھی۔ فرمایا—مجھے تھوڑا پانی پلاؤ۔ میں یسوع مسیح کا باپ ہوں۔ یہ سن کر گھر کے مالک نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی اور خاطر تواضع کی بارش سے انہیں ششدر کر دیا۔ بھائی! پرتاب گڑھ میں کسی نے اکبر کی طرف پھوٹی آنکھوں سے بھی نہیں دیکھا لیکن ڈپٹی صاحب کے والد کی بڑی قدر ہوئی۔" یہ ہماری اکبر الہ آبادی سے گفتگو کا محض ایک ٹکڑا تھا جو میرے حافظے میں باقی رہ گیا۔ اسی وقت انہوں نے ایک شعر کہا اور ہمیں سنایا۔ ملاحظہ ہو:

میں کسی چیز کا نہیں عادی
ایک عادت ہے سانس لینے کی

ایک دفعہ کوئی نوجوان شاعر ان سے ملنے گئے۔ فرمایا:

تحفۂ شب برات کیا بھیجوں؟
تم تو اے جان خود پٹاخہ ہو

اکبر نے روایتی انداز میں بہیتری غزلیں لکھیں جن میں اردو دنیا کے معروف عشقیہ تجربے پیش کئے گئے ہیں۔ آرزوئے ناکام، گریز محبوب، رقیب پر مہربانیاں، پروانے کا شمع سے لگاؤ۔ بہار میں قید قفس کی سختیاں، غم دوراں سے نجات کے لیے ساقی کی نوازشیں، حسن کافر اور مسجد کی خانہ ویرانی، واعظ کی حماقتیں، وغیرہ وغیرہ غرض یہ کہ یہی گھسے پٹے ہوئے استعارات اور علامتیں، جنہیں ہر پشت میں نئی زندگی مل جاتی ہے، اکبر نے بھی برتی ہیں۔ مثلاً جس نے اکبر کی صرف تفریحی شاعری کا مطالعہ کیا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار کو اکبر کی کاوش کا نتیجہ تسلیم نہیں کرے گا۔

جو ذبح کرنا ہے پر کھول دے مرے صیاد
کہ رہ نہ جائے تڑپنے کی آرزو باقی

ذیل میں چند اور اشعار درج ہیں جن میں تغزل کا رنگ نمایاں ہے:

نگاہ ناز سے تم نے اگر دیکھا نہیں مجھ کو
تو پھر میں کیوں تڑپتا ہوں نہ زخمی ہوں نہ بسمل ہوں

ایک بین الاقوامی ادبی اور ثقافتی ماہنامہ

# آجکل

نئی دہلی

ISSN 0971 - 846 X

ایڈیٹر
محبوب الرحمٰن فاروقی
فون 3386994

اسسٹنٹ ایڈیٹر
ابرار رحمانی
فون: 3386789 Ext. 259

سب ایڈیٹر
محمد کاظم

جلد: ۶۰ شمارہ: ۱
اگست ۲۰۰۱ء ساون بھادوں شک ۱۹۲۳

سرورق: وگیان ورت
بیک کور: الکا نائر
کمپوزنگ: افتخار احمد

جوائنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن): ڈی این گاندھی
بزنس منیجر: شکنتلا
منیجر اشتہارات: پی۔ سی آہوجہ





فی شمارہ: سات روپے سالانہ: ۷۰/روپے
دو سال: ۱۳۵/روپے تین سال: ۱۹۰/روپے
امریکہ یورپ اور دوسرے ممالک کیلئے بذریعہ ہوائی ڈاک ۷۰۰/روپے سالانہ
پڑوسی ممالک کے لئے بذریعہ ہوائی ڈاک ۵۰۰/روپے سالانہ

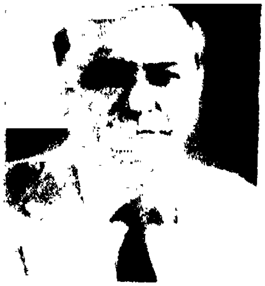
خریداری اور اشتہار کے لیے منی آرڈر، چیک ڈرافٹ، پوسٹل آرڈر، ڈائریکٹر، پبلی کیشنز ڈویژن کے نام اس پتہ پر بھیجیں
سرکولیشن منیجر 'آجکل' ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر کے پورم نئی دہلی ۔ ۶۶
رسالے سے متعلق استفسار اور شکایتوں کیلئے بھی سرکولیشن منیجر کو ہی لکھیں

صرف تخلیقات سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:
ایڈیٹر 'آجکل' (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۔ ۱




# ترتیب

گوپی چند نارنگ



# زبان کے ساتھ کبیر کا جادوئی برتاؤ

**کبیر** کا درجہ ہندی کے سنت کویوں میں بہت اونچا ہے۔ ان کی پیدائش سمت ۱۴۵۵ وکرمی (۱۳۹۸ء) لی بتائی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ پوری پندرہویں صدی اور کچھ بعد تک زندہ رہے۔ وہ کاشی میں پیدا ہوئے۔ اس زمانے کی پوربی یعنی اودھی اور بھوجپوری کا قدیم روپ جیسا اس وقت کاشی اور اس کے نواح میں بولا جاتا ہوگا، وہی کبیر کے بچپن کی زبان رہا ہوگا۔ لیکن چونکہ وہ زندگی بھر جوگیوں، سادھوؤں، سدھوں اور فقیروں کے ساتھ جگہ جگہ گھومتے رہے، اس زمانے کی عوامی زبان بھی ان کی زبان پر چڑھ گئی ہوگی۔ ان کی شاعری، شاعری کے لیے تھی ہی نہیں، بلکہ عام لوگوں تک اپنا روحانی پیغام پہنچانے کا وسیلہ تھی۔ چنانچہ اس زمانے میں جو بولی یا بھاشا عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہوگی، کبیر نے کاشی کی بولی کے علاوہ اس کا اثر بھی قبول کیا ہوگا۔ اسی لیے کبیر کی بھاشا ملی جلی بھاشا ہے۔ اس میں پوربی کا پٹ تو ہے ہی، کھڑی کا انداز بھی ہے جس نے ان کی شاعری کی قبولیت میں خاص کردار ادا کیا اور کبیر کے بول ملک کے طول و عرض میں ہر دل کی دھڑکن بن گئے۔

کھڑی بولی کی پرانی مستند تاریخ نہ ہونے کے برابر ہے۔ کھڑی کے قدیم نمونے نایاب ہیں۔ کھڑی کی جو بھی قدیم تاریخ قائم کی جاتی ہے، وہ زیادہ تر بالواسطہ اور قیاسی ہے جب کہ کھڑی کے مقابلے میں برج، اودھی یا راجستھانی کی قدیم تاریخ دستاویزی طور پر آسانی سے مرتب کی جا سکتی ہے۔ امیر خسرو کا زمانہ (۱۲۵۳-۱۳۲۵) کبیر سے لگ بھگ ایک صدی پہلے کا ہے۔ کھڑی کے نقاش اول امیر خسرو ہیں۔ وہ ریختہ اور ہندوی کے پہلے شاعر مانے جاتے ہیں۔ امیر خسرو کے ہندوی کلام کی بنیاد کھڑی پر ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ کلام انہوں نے تفریحاً کہا یا دوستوں کے تفنن طبع کے لیے کہا، اصل شاعر تو وہ فارسی کے تھے اور ان کی عظمت کی بنیاد ان کی فارسی شاعری ہے، جب کہ کبیر کی عظمت کی بنیاد ان کی یہی ملی جلی نوزائیدہ زبان کی شاعری ہے۔ وہ بولی جس کو دوسروں نے تفریحاً منہ لگایا یا جس سے عارضی طور پر کام لیا، یا جو اس وقت ان گھڑ، ناپختہ، اور خام حالت میں تھی، یا گیلی مٹی کی طرح تھی، کبیر نے اسی ملی جلی، ان گھڑ، گری پڑی، ناپختہ زبان سے وسیع پیمانے پر کام لیا، حتیٰ کہ یہ ان کی

ڈی ۲۵۲ سروودیا انکلیو، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۱۷

شاعری کی عظمت کی بنیاد بن گئی۔ یہ معلوم ہے کہ کبیر کی شاعری کا تانا بانا اسی ناپختہ، معمولی اور خام زبان سے بُنا گیا ہے۔

کبیر اور اس عہد کے دوسرے بڑے شاعروں میں ایک فرق اور بھی ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو اس زمانے کے صوفیا اور مشائخ میں علمی روایت نہایت وقیع تھی اور صوفیا میں جتنے بھی شعرا ہوئے ان میں اکثر فارسی کی کلاسیکی شعریات سے کما حقہ واقف تھے اور اس کے امین تھے۔ یہی کیفیت ہندی کے بڑے شاعروں کی ہے جو سب کے سب کبیر کے بعد آئے، نیز ان میں سے کسی کی زبان کھڑی بولی نہیں ہے۔ مثلاً سورداس (۱۴۷۸-۱۵۸۰) اور رس کھان (۱۵۴۰-۱۶۳۰) برج کے شاعر تھے۔ ملک محمد جائسی (۱۴۷۷-۱۵۴۲) اور تلسی داس (۱۵۳۲-۱۶۲۳) اودھی کے شاعر تھے، اور یہ بولیاں سنسکرت میں رچی بسی تھیں جب کہ کھڑی ابھی بن رہی تھی۔ ان عالم شعرا کے مقابلے میں سنت کوی زیادہ تر اَن پڑھ تھے۔ کبیر نے نہ خود کو کبھی شاعر سمجھا نہ کبھی شاعری کا دعویٰ کیا۔ ان کی شاعری ان کے اندر کی آگ تھی، ذات پات کی تفریق، برہمنیت کی اجارہ داری یا فرقہ واریت کے خلاف ایک نعرۂ جنگ۔ چنانچہ سنسکرت کی کلاسیکی شعریات سے اس کے رشتے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بلکہ اگر کوئی رشتہ ہو سکتا تھا تو وہ انحراف اور بغاوت کا تھا جس نے کلاسکیت کے status quo کے ہر آثار کو ٹھکرا دیا تھا، لسانی آثار کو بھی اور شعری آثار کو بھی۔ کیونکہ پہلے کی شعریات کو ماننا زبان کو ماننا تھا اور زبان کو ماننا اس نظام کو ماننا تھا جس کے جبر کے خلاف یہ شاعری ایک نعرۂ جنگ تھی۔ خیال رہے کہ پندرہویں صدی کے صوفیا اور سنت کویوں میں کسی دوسرے نے اس ان گھڑ اور ناپختہ زبان کو اس وسیع پیمانے پر نہیں برتا جس وسیع پیمانے پر کبیر نے اسے برتا اور نتیجتاً اسے قبول عام پر فائز کر کے اسے سب کی زبان بنا دیا۔ چنانچہ اگر یہ کہا جائے کہ کبیر کے شعری سفر کے دوران رفتہ رفتہ ایک نئی شعری زبان وجود میں آ گئی اور نیا شعری محاورہ اور روز مرہ بنتا چلا گیا، نیز کلاسیکی شعریات سے ہٹ کر ایک الگ عوامی شعریات کی بنیاد بھی پڑ گئی، تو غلط نہ ہوگا۔

سر دست ہمارا مسئلہ اس نکتے پر غور کرنا ہے کہ کبیر کے زمانے میں "ہندی" یا "اردو" یا "ہندوستانی" نام کی زبانیں تو نہیں تھیں، فقط بولیاں تھیں، یا یہی کچی پکی،

ناپختہ، ان گھڑ کھڑی بولی جو ابتدائی حالت میں تھی۔ لیوائی سٹراس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ زبان کیسی بھی ابتدائی حالت میں کیوں نہ ہو، بنیادی جذبات کو ادا کرنے کے لیے مکمل ہوتی ہے۔ سو تو ٹھیک ہے، کبیر کی بھاشا میں دھرتی کا جو نمک اور جڑوں کی جو طاقت ہے وہ تو سمجھ میں آتی ہے، لیکن حیرت ہوتی ہے ایسے سیکڑوں ہزاروں مصرعوں اور بندشوں پر جو نہایت پختہ ہیں اور جن میں اقوال کا ایجاز اور کہاوت کی طاقت ہے۔ اگر اس وقت کی "ان گھڑ" زبان میں یہ سب کچھ تھا جسے کبیر نے برتا تو پھر وہ زبان "ان گھڑ" کیونکر تھی؟ یا اگر واقعی اس وقت کی زبان اتنی ہی ترقی یافتہ تھی تو پھر کبیر کے علاوہ دوسروں کے یہاں اس کی یہ شان کیوں نظر نہیں آتی۔ ایک دو صدی آگے پیچھے تک اگر کبیر ہی اکیلا ایسا شاعر ہے جس کے یہاں معمولی زبان اپنے اس غیر معمولی پن کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے تو پھر اس کا credit کسی اور چیز کو نہیں بلکہ کبیر اور فقط کبیر کے اختراعی ذہن اور اس کی تخلیقیت کو دینا پڑے گا۔ (واضح رہے کہ شعری تخلیق کے ساتھ ساتھ یہ زبان کو خلق کرنے کا عمل ہے، محض رائج محاوروں کو نظم کر دینے کا عمل نہیں۔)

کہاوتیں ہوں، اقوال یا امثال دراصل زبان کے fossils ہیں، یا زبان کی archeology ہیں جن کے گرد زبان کے معیار یا عوامی دانش کی تہیں تاریخی طور پر چڑھتی رہتی ہیں۔ یہ زبان کا core یا بنیادی حصہ ہیں جو کثرت استعمال سے وجود میں آتا ہے۔ کبیر کی زبان نوزائیدہ تھی، یعنی اس کی تاریخ تھی ہی نہیں، لیکن تعجب ہے کہ یہی عنصر یعنی قول اور کہاوت کی طاقت رکھنے والا عنصر جو اصولاً قدیمی عنصر ہونا چاہیے، کبیر کے یہاں خاصا نمایاں ہے۔ حیرت ہے کہ ایک ناپختہ، ان گھڑ، نوزائیدہ زبان میں یہ امثالی اور کہاوتی کیفیت کس طرح سے پیدا ہو گئی کہ زبان چلتا ہوا جادو بن گئی۔ اس مسئلہ پر کبیر کے ماہرین نے ضرور غور کیا ہوگا، لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس کا کوئی آسان جواب ممکن نہیں ہے۔ ذرا ان دوہوں کو دیکھئے (متن "کبیر وچناولی" پنڈت ایودھیا سنگھ اپادھیائے ہری اودھ کی معتبر کتاب، مطبوعہ ناگری پرچارنی سبھا، کاشی، سمت ۲۰۰۳ سے لیا گیا ہے)

جاکو راکھے سائیاں مار سکے نہیں کوئے
بال نہ بانکا کر سکے جو جگ بیری ہوئے

لوٹ سکے تو لوٹ لے ستّ نام کی لوٹ
پاچھے پھر پچھتائیں گے پران جانہہ جب چھوٹ

یہ تو گھر ہے پریم کا خالہ کا گھر نانہہ
سیس اتارے بھوئیں دھرے تب پیٹھے گھر مانہہ

جب میں تھا تب گورو نہیں اب گورو ہیں ہم نانہہ
پریم گلی ات سانکری تا میں دووھ نہ سمانہہ

جن ڈھونڈھا تن پائیا گہرے پانی پیٹھ
میں بپرا ڈوبن ڈرا رہا کنارے بیٹھ

ستّ نام کڑوا لگے میٹھا لاگے دام
دبدھا میں دوو گئے مایا ملی نہ رام

رات گنوائی سوئی کے دوس گنوایا کھائے
ہیرا جنم امول تھا کوڑی بدلے جائے

آچھے دن پاچھے گئے گورو سے کیا نہ ہیت
اب پچھتاوا کیا کرے چڑیاں چگ گئیں کھیت

کالہہ کرے سو آج کر آج کرے سو اب
پل میں پرلے ہوئے گی بہر کرے گا کب

کبیر کے یہ دوہے زبان زد خاص و عام ہیں۔ یہ ہمارے اجتماعی حافظے کا حصہ ہیں اور عوامی لاشعور میں اس قدر رچے بسے ہوئے ہیں کہ ہم سرسری ان سے گزر جاتے ہیں اور بالعموم غور ہی نہیں کرتے کہ کس طرح ہماری زبان کی صدیوں کا سنگیت کبیر کی زبان کی تہوں میں سمویا ہوا ہے۔ سو سوالوں کا سوال یہی ہے کہ پندرہویں صدی میں جب زبان ان گھڑ اور ناپختہ تھی، اس میں امثال کی چستی اور کہاوت کی طاقت کہاں سے پیدا ہو گئی؟ امثالی انداز بیان زبان کے صدیوں کے چلن کی پختگی کا مظہر ہوتا ہے اور کہاوتیں صدیوں کے انسانی تجربے کا نچوڑ ہوتی ہیں اور زبان کے متمول اور ترقی یافتہ ہونے کی نشانی ہیں۔ لیکن ایک نوزائیدہ ان گھڑ ناپختہ زبان میں ان کا ظہور اور وسیع پیمانے پر استعمال کس طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ شاعری اندر کی آگ ہے لیکن اس آگ کو سماج یا قاری کے دل میں دہکانے کے لیے واحد حربہ تو زبان ہی ہے اور اگر زبان ہی ان گھڑ اور ناپختہ ہو تو شاعری جادو کیسے بن سکتی ہے۔ مگر یہ بھی صحیح ہے کہ یہی معمولی زبان کبیر کے یہاں غیر معمولی بن جاتی ہے اور شاعری معنی کا چراغاں کرتی ہے۔ ایک امکان یہ ہے کہ یہ امثال اور کہاوتیں بولیوں میں پہلے سے موجود تھیں، کبیر نے اپنی شاعری میں ان سے کام لیا، یا اس کے برعکس کبیر کی تخلیقی آگ ایسی تھی کہ اس نے معمولی شبدوں میں روح پھونک دی یا کبیر کی تخلیقی تپش نے لفظوں کو پگھلا دیا اور ان میں ایسی تاثیر اور دردمندی بھر دی کہ عوامی مقبولیت اور استعمال عام کے باعث صدیوں کے چلن میں زبانوں پر چڑھ کر ان اظہاریوں کا درجہ اقوال اور ضرب الامثال کا ہو گیا۔

اوپر مثالوں میں پہلے دوہے میں مصرعے پیوست ہیں۔ پہلے مصرعے میں بیان ہے / جاکو راکھے سائیاں مار سکے نہیں کوئے / دوسرے حصے میں ثبوت یا مزید وضاحت کہ / بال نہ بانکا کر سکے جو جگ بیری ہوئے /۔ پورا دوہا بطور قول / کہاوت استعمال ہوتا ہے۔ بال بیکا (یا بانکا) نہ ہونا عام محاورہ بھی ہے جو زبان میں رائج ہو چکا ہے۔ دوسرے دوہے کا دوسرا مصرع / پاچھے پھر پچھتائیں گے پران جانہہ جب چھوٹ / بھی بطور ضرب المثل رائج ہے۔ کہاوت کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ انسانی تجربے اور دانش کا پارہ ہوتی ہے اور اپنے اصل متن سے الگ ہو کر بھی ان گنت تناظر میں برتی جا سکتی ہے اور ہر موقع پر تناظر کے اعتبار سے اس میں معنی کی نئی شان

# DUE DATE

Cl. No.____________ Acc. No. 225668

Late Fine Re. 1.00 per day for first 15 days.
**Rs. 2.00** per day after 15 days of the due date.

| | | | |
|---|---|---|---|
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | 60 | 2001-02 | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |